

تفسير

الحمد

Ketabton.com

امین الدین «سعیدی - سعید افغانی»

جزء - (30)

فہرست مضامین اور موضوعات

30 ویں پارے کی سورتیں

شمارہ	نام سورہ	سورتوں کی معانی اور مشتملات	صفحہ
	سورہ النَّبَا	- النَّبَا - قیامت کی خبر - - سورہ کی مضامین : یہ سورہ قیامت کے ایک بڑے واقعہ کے بارے میں خبر ہے، جو ایک سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے، اور آسمان اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر، نیکوکاروں کے لئے الہی نعمتیں اور بدکاروں اور کافروں کے لئے دردناک عذاب کی بات کی گئی ہے۔	
1		- وجہ تسمیہ	
2		- سورة النبأ کا سورہ مراسلات کے ساتھ ربط و مناسبت۔	
3		- سورة النبأ کی آیات ، الفاظ اور حروف کی۔	
4		- سورة النبأ کا سبب نزول ۔	
5		- سورة النبأ کے مشتملات۔	
7		- سورت کا لفظی ترجمہ۔	
7		- آیات مبارکہ (1 تا 30) زندہ ہونے کی خبر کے بارے میں ہیں ، اس کے دلائل کے اثبات ، قیامت کے دن کی خصوصیات اور اس کی نشانیاں ، اور عذاب کی قسمیں زیر بحث آئی ہیں -	
8		- قرآن میں بادل کی بحث	
9		- مبارک آیات (31 تا 40) میں سعادت مندوں کی حالت، اللہ کی عظمت اور رحمت، قیامت کا دن اور کافروں کو تنبیہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔	
10		- دوزخ والوں کا المناک عذاب	
11		- چھ دن میں کائنات کی تخلیق	
	سورہ النازعات	- النازعات - جانیں سختی سے نکالنے والے فرشتے -- - النازعات کی مضامین : یہ سورہ معاد سے متعلق مسائل پر مبنی ہے اور اس میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعے کا ذکر بھی ہے، اور یہ کہ کوئی اللہ کے سوا روز قیامت کی تاریخ کو جاننے والا نہیں ہے۔	

1	- وجہ تسمیہ۔
2	- سورة النازعات کا سورة النبأ کے ساتھ ربط و مناسبت
3	- سورة النازعات کی آیات ، حروف اور الفاظ کی تعداد۔
4	- اسباب نزول ، آیت "12" کا سبب نزول۔
5	- اسباب نزول آیت 42 تا 44۔
6	- سورہ النازعات کی تعریف
7	- سورہ النازعات کی ترجمہ اور تفسیر
8	- آیات مبارکہ "1 تا 14" اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر پے در پے قسموں کے بارے میں آخرت میں زندہ ہونے کے ثبوت کیلئے ہے، اسی طرح مشرکین کے احوال اور ان کے انکار کو رد کرنے پر بحث کی گئی ہے۔
9	- بابرکت آیات (15 تا 22) موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعے کا مختصر ذکر کیا گیا ہے:
10	- ملک الموت کی ذمہ داری
11	- پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت۔
12	- ملک الموت کا تیزی سے عمل کرنا۔
13	- جنتیوں کی حالت۔
14	- دوزخیوں کی صورتحال۔
15	- قیامت کے دن کفار و مشرکین کے بچوں کی حالت۔
16	- قیامت کے دن دیوانوں کا حال۔
17	- قیامت میں چار آدمیوں کی حالت۔
	عبس = تیوری چڑھائی اور منہ موڑا - سورہ عبس کا موضوع: معاد کا مسئلہ، ایک شخص کا تذکرہ جس نے ایک نابینا کے ساتھ مناسب رویہ نہ رکھا، قرآن کریم کی قدر و قیمت اور اہمیت کو واضح کرنا۔
1	- وجہ تسمیہ۔
2	- سورہ عبس کا سورہ النازعات کے ساتھ تعلق۔
3	- سورہ عبس کی آیات، لفظوں اور حروف کی تعداد۔
4	- سورہ عبس کا سبب نزول۔
5	- صحابہ بننے کی شرائط۔
6	- سورہ عبس کا عمومی خلاصہ۔
7	- مبارک آیات (1 تا 10) اسلام جیسے مقدس دین میں مساوات اور برابری کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

8	کسی یقینی کام کو ظنی کام کی وجہ سے نہیں چھوڑا جاسکتا ہے
9	- آیات مبارکہ (11 تا 23) میں ان موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے، کہ (1) یہ قرآن ہدایت ہے، (2) خدا کی نعمتوں کی ناشکری، (3) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا۔
10	- (آیات مبارکہ: 24 تا 42) میں: الہی نعمتیں جن کی انسانوں کو ضرورت اور احتیاج ہے، اور قیامت کے دن کا خوف اور ڈر زیر بحث آیا ہے۔
11	- اس سورہ کے مخاطب کون ہے؟
12	- انبیاء کا معصوم ہونا
13	- انبیاء علیہم السلام کن امور میں معصوم ہیں؟
14	- ہم لوگوں کے جنت میں جانے کے ذمہ دار نہیں ہیں!
	التکویر = لپیٹنا۔
	- سورة التکویر کا مضمون: قیامت کے مسئلے کا بیانیہ، اس دنیا کی بڑی تباہی کی یاد دلانا، قرآن کریم کی شان کی یاد دہانی۔
	- وجہ تسمیہ۔
1	- سورة التکویر کے نزول کا وقت۔
2	- مکی سورتوں کی بعض خصوصیات۔
3	- سورہ تکویر کا سورہ عَبَسَ سے ربط و مناسبت۔
4	- سورة التکویر کی آیات، کلمات اور حروف کی تعداد۔
5	- سورت سے واقفیت۔
6	- سورة التکویر کی فضیلت۔
7	- اس سورت کی تلاوت کی فضیلت۔
8	- سورت کا خلاصہ۔
9	- اس سورت کا سیاق۔
10	- سورہ تکویر کے اخلاقی اور معاشرتی نکات۔
11	- سورة التکویر کا ترجمہ اور تفسیر۔
12	- آیات مبارکہ (1 تا 14) میں قیامت کے دن کے ابتدائی حالات، جمع ہونا، خوف اور ڈر اور بولناکی اور دہشت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔
13	- بیٹیوں کی فضیلت۔
14	

15	- بچیوں کو زندہ دفنانے کے بھانے .
16	- زمانہ جاہلیت کی اصطلاح.
17	- آیات مبارکہ (10 تا 29) قرآن کے نزول کا ثبوت، اور نبوت کا ثبوت کے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔
18	جانوروں کا حشر قیامت کے دن
19	- قسم کے دلائل.
20	- جبریل کی صفات.
21	- قضا و قدر.
22	- جبرئیل امین قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کے حامل.
23	- دیگر فرشتے.
	- الانفطار = پھٹنا - سورہ الانفطار کا موضوع : یہ سورہ بھی قیامت کے مسائل پر مبنی ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فرشتوں کے مکمل اکرام و احترام سے آگاہ کرتی ہے، جو انسانوں کے اعمال کی نگرانی کی ذمہ داری رکھتے ہیں۔
1	- وجہ تسمیہ.
2	- سورة الانفطار کا سورة المطففين اور سورة الانشقاق کے ساتھ تعلق اور مناسبت.
3	- سورة الانفطار کی آیات کی تعداد ، الفاظ، اور حروف.
4	- آیت "6" کا سبب نزول.
5	- سورہ الانفطار کی فضیلت.
6	- سورت کا تعارف.
7	- با برکت آیت "1 تا 8" میں قیامت کی نشانیوں ، جزا و سزا، خدا کی نعمتوں سے انکار کرنے والوں کی مذمت کے بارے میں بحث ہے ۔
8	- آیات مبارکہ 9 " تا 19 " میں موضوعات : (۱) انکار قیامت، (۲) نامہ اعمال کے کاتبین، (۳) نیک لوگوں کی جماعت، (۴) اور گنہگاروں کی جماعت کے بارے میں بحث کی گئی ہے ۔
9	- کیا پیغمبروں کے ساتھ بھی کراما کاتبین ہوتے ہیں ؟
10	- فرشتے انسانوں کا ارادہ اور نیت بھی لکھتے ہیں.

11	- قیامت کے دن کے بارے میں مختصر وضاحت۔
12	- زمین ، سمندر اور پہاڑوں کی حالت۔
13	- آسمان اور ستاروں کی حالت۔
14	- صور پھونکنا۔
15	- قیامت کی صفات ۔
16	- فرشتوں پر ایمان لانا واجب۔
17	- انسان کی زندگی میں فرشتوں پر ایمان کی نشانی اور اثرات۔
18	- فرشتوں کے اعمال اور شیطان کے اعمال میں کیا فرق ہے ؟
19	- ملائک کا مذاق اڑانا۔
20	- وہ جگہیں جہاں فرشتے جاتے ہیں۔
21	- وہ جگہیں جہاں شیاطین جاتے ہیں۔
22	- بنی نوع انسان کے ساتھ شیطان کی دشمنی کی تاریخ۔
	- المطففین = ناپ تول
	- سورہ مطففین کا موضوع : اس سورہ میں کم فروشان کا ذکر ہے اور ان کو وعید سنائی گئی ہے ، اور اس کے ساتھ ساتھ بدکاروں کا روز قیامت کا حال اور نیکوکاروں کے لئے اللہ کی عظیم نعمتوں کا بیان کیا گیا ہے۔
1	- وجہ تسمیہ۔
2	- سورہ المطففین کا سورہ الانفطار کے ساتھ ربط و مناسبت۔
3	- سورة المطففین کی آیات ، کلمات اور حروف کی تعداد۔
4	- سبب نزول
5	- سورت کا مجموعی خلاصہ۔
6	- مختصر ترجمہ اور تفسیر۔
7	- آیات مبارکہ "1 تا 6" ناپ تول میں کمی کر کے بیچنے والوں کی سرزنش اور تنبیہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔
8	- قرآن کریم میں کمی کر کے بیچنے سے متعلق حکم۔
9	- عبادت میں تطفیف۔
10	- موت کے بعد کی زندگی پر یقین کا فقدان۔
11	- جنت والے کون ہیں اور دوزخ والے کون ہیں ؟
12	- آیات مبارکہ "7 تا 17" میں کافروں کے اعمال نامے اور بد کاروں کے حالات کے بارے میں بحث کی گئی ہے ۔

سورہ
مطففین

13	- بابرکت آیات " 18 تا 28 " مؤمنوں کے اعمال نامہ اور ان کے انجام کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔
14	- روحوں کی آرام گاہ اور منزل
15	- بابرکت آیات (29 تا 36) کافروں کے ہنسی مذاق مؤمنوں کے ساتھ اور مسلمانوں کے مقابلہ بالمثل قیامت کے دن کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔
16	- کاروبار میں نبی کا طریقہ۔
	- الانشقاق = پھٹ جانا ، - سورہ الانشقاق کا موضوع : اس سورہ میں عموماً قیامت کا مسئلہ ذکر ہے اور روز قیامت کے خوفناک واقعات بیان کیے گئے ہیں۔
1	- وجہ تسمیہ۔
2	- سورۃ الانشقاق کی آیات ، حروف اور الفاظ کی تعداد۔
3	- سورۃ الانشقاق کا ربط و مناسبت ماقبل سورتوں سے۔
4	- سورۃ الانشقاق کا تعارف۔
5	- سورہ الانشقاق کی فضیلت۔
6	- مختصر ترجمہ اور تفسیر۔
7	- بابرکت آیات " 1 تا 15 " میں خوف، دہشت، روز قیامت اور دو جگہوں کی طرف لوگوں کے جانے کے بارے میں بحث کی گئی ہے، اور اس کی تصویر کشی ، اور اس کی مثال دی گئی ہے، اسی طرح ان مصائب اور مشکلات پر بھی بحث ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوں گے، جس کا تصور ہی پریشان کن ہے۔
8	- مبارک آیات (16 سے 25) تک میں قیامت کے واقع ہونے اور یقینی ہونے کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔
9	- بشارت۔
10	- قیامت اور اس کی علامات۔
11	- قیامت کے دن ضروری سوالات۔
12	1- کفر اور شرک۔
13	2- انہوں نے دنیا میں کیا کیا ہے؟
14	3 وہ نعمتیں جن سے فائدہ حاصل کیا جاتا تھا ۔
15	4- عہد اور میثاق
16	5 - کان، آنکھ اور دل کی حالت

		سورہ البروج	- البروج = برجوں کا تذکرہ - سورہ البروج کا موضوع: اس سورہ میں اخدود کے لوگوں کا ذکر ہے، فرعون اور ثمود کا واقعہ، اور قاتل اور فسادی قوموں کا ذکر، قرآن کریم کی عظمت کا بیان اور اس کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔
1			- وجہ تسمیہ۔
2			- سورة البروج کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد:۔
3			- سورة البروج کا سورة الانشقاق سے ربط و مناسبت۔
4			- سورہ البروج کی فضیلت۔
5			- سورہ البروج کا نزول کا وقت۔
6			- سورة البروج کا سبب نزول: ۔
7			- سورة بروج سے متعلق معلومات۔
8			- أصحاب اخدود۔
9			- اس واقعے کو بیان کرنے کا عمومی مقصد۔
10			- سورت کا لفظی ترجمہ و تفسیر۔
11			- آیات مبارکہ (1 تا 11) میں اصحاب اخدود اور جزاء و سزاء جیسے موضوعات سے متعلق بحث کی گئی ہے۔
12			- لغات اور اصطلاحات کی تشریح۔
13			- آنے والی آیات مبارکہ (12 تا 22) میں اس کے بارے میں بحث کی گئی ہے کہ مکمل قدرت کاملہ اور اختیار اللہ کے پاس ہے۔
14			- فرعون۔
15			- قرآن کریم کے لیے لفظ «مقدس» کا استعمال
16			- لوح محفوظ۔
			- آدم علیہ السلام سے پیغمبر اسلام تک انبیاء کا تسلسل
		سورہ الطارق	- الطارق = رات کو طلوع ہونے والا ستارہ - سورة طارق کا موضوع: معاد کی باتوں کی طرف اشارہ اور قرآن مجید کی اہمیت اور شان کی وضاحت۔
1			- وجہ تسمیہ
3			- سورہ طارق کے نزول کا وقت۔
4			- سورة الطارق کا سورة البروج سے تعلق اور مناسبت۔
5			- سورة الطارق کے الفاظ، حروف اور آیات کی تعداد۔
6			- سورة الطارق کا سبب نزول۔
7			- سورة الطارق سے متعلق معلومات۔
8			- سورت کے اہم ترین موضوعات۔
9			- سورة کی مختصر ترجمہ و تفسیر۔

10	- آیات مبارکہ (1 تا 17) میں فرشتے انسان کے نگران، انسانی تخلیق، رب تعالیٰ کا بنایا ہوا شاہکار، قرآن حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا، کافروں کو تھوڑی سی مہلت ایک معین وقت تک جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔
11	- جنین میں مرد اور عورت کے انڈوں کا کردار۔
	- الاعلیٰ = بلند ترین۔
	سورہ الأعلى
1	- وجہ تسمیہ ۔
2	- سورة الاعلیٰ کے الفاظ، حروف اور کلمات کی تعداد
3	- سورة الاعلیٰ کا سورة الطارق سے ربط و مناسبت۔
4	- سورة الاعلیٰ کی فضیلت
5	- سورة الاعلیٰ کا سبب نزول
6	- سورة الاعلیٰ کا موضوع اور مندرجات: بلندی والے رب کی تسبیح اور پروردگار کے پیغام کی ادائیگی، فرمانبردار مومنین اور بے گناہوں کی خوشی، اور کافرین کی بددیانتی اور رنج کی باتیں۔
7	- سورت کا مختصر ترجمہ
8	- صحف ابراہیمی کے موضوعات اور مضامین
9	- حضرت موسیٰ کے صحیفوں کے موضوعات
10	- آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم
11	- آسمانی کتابوں پر ایمان واجب ہونے کی دلیل ۔
12	- ضروری اور جاننے کے قابل نکات
13	- آسمانی کتابوں کے احترام کا حکم ۔
14	- تحریف شدہ کتابوں کے بارے میں اعتقاد
	- الغاشیہ = ڈھانپنا
	- سورہ الغاشیہ کا موضوع: معاد کی بات، توحید کی اہمیت، آسمان کی پیدائش، پہاڑوں اور زمین کی تخلیق، نبوت کی بات کی گئی ہے۔
	سُورَہ الغاشیہ
1	- وجہ تسمیہ۔
2	- سورہ غاشیہ کے بحث کا محور۔
3	- سورة الغاشیہ کا سورة الاعلیٰ سے ربط و مناسبت۔
4	- سورة الغاشیہ کے الفاظ، آیات اور حروف کی تعداد۔
5	- سورة الغاشیہ کا خلاصہ۔
6	- سورہ کا ترجمہ اور تفسیر۔

7	بابرکت آیات "1 تا 7" میں قیامت اور جہنم میں لوگوں کی حالت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
8	- ضریع کیا ہے؟
9	- بابرکت آیات 8 تا 28 میں ہمارا عظیم رب اپنی قدرت اور وحدانیت کے دلائل بیان کرتا ہے، اور وہ تنبیہ کرتا ہے کہ وہ بلند آسمان، وسیع زمین، اونٹوں کی حیرت انگیز تخلیق، پہاڑوں اور چیزوں کو دیکھیں اور اچھی طرح سوچیں اور خدا کی شان و عظمت کو یاد کریں۔
10	- کیا جنت کی مروج زبان عربی ہے؟
11	- کیا دن کی بے برکتی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے؟
12	- معنوی نزدیکی۔
13	- حسی نزدیکی۔
14	- جنت میں پرندوں کی موجودگی۔
15	- خمر یا جنت کی شراب۔
16	- جنت میں شہوت اور جماع۔
17	- کیا عورتوں کے لیے بھی حوریں ہیں؟
18	- جنتی غلمان۔
19	- دنیاوی عورتوں کا حوروں میں تبدیل ہونا۔
20	- جنت میں حوروں کا حجاب۔
	- سورۃ الفجر = سپیدہ ی صح - سورۃ الفجر کا موضوع: کافروں کو دھمکی دے کر کے، ان سے عذاب کا وعدہ، عاد، ثمود اور فرعون جیسے لوگوں کا ذکر، انسان کی آزمائش اور معاد کی بات کی گئی ہے۔
1	- وجہ تسمیہ۔
2	سورۃ الفجر کا خلاصہ۔
3	- سورۃ الفجر کی آیات، حروف اور تعداد۔
4	- سورۃ الفجر کا سورۃ الغاشیہ سے ربط و تعلق۔
5	- سورۃ فجر کی فضیلت۔
6	- سورۃ فجر کا سبب نزول۔
7	- سورۃ فجر کا موضوع اور محور
8	- سورۃ کا ترجمہ اور تفسیر۔
9	- آیات مبارکہ (1 تا 16) میں کفر اختیار کرنے والوں کی جزا و سزا یقینی بتائی گئی ہے، اور ان میں سے بعض کو اسی دنیا میں جزا و سزا دی جائے گی اس کے بارے میں بھی بحث کی گئی ہے۔

سورۃ الفجر

10	- والفجر کی تفسیر میں مفسرین کے نظریات و آراء
11	- دس راتوں کے بارے میں مفسرین کے نظریات۔
12	- رمضان کے آخری عشرے کے بارے میں علماء کی دو رائے۔
13	- قوم عاد۔
14	- حضرت صالح۔
15	- مغضوب زمین۔
16	- "سَوَط" کیا ہے؟
17	- آیات مبارکہ 15 تا 30 میں آخرت کی طرف توجہ نہ کرنے پر انسان کی مذمت، حد سے زیادہ حرص، دنیا کی محبت اور دنیا کی پرستش کرنا، دنیاوی مال سے بے نیازی اور قیامت کے دن کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔
18	- نفس مطمئنہ۔
19	- نفس مطمئنہ کی بعض خصوصیات۔
20	- اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی قضا و قدر پر اطمینان۔
21	- عاجزی اور خوف خدا۔
22	- اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا۔
24	- انسانی روح کی اقسام۔
25	- نفس اور شیطان میں کیا فرق ہے؟
	- البلد = شہر - سورہ البلد کا موضوع: انسان کی زندگی کی مشکلات، خدا کی بخششوں کی ناقدری، مومنین اور کافروں کا ذکر، ان کی قسمت کی بات کی گئی ہے۔
1	- وجہ تسمیہ۔
2	- سورۃ البلد کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔
3	- سورۃ البلد کا سورۃ الفجر سے ربط و مناسبت۔
4	- سورۃ "البلد" سے اخذ کردہ نکات۔
5	- سورت کا تفسیر و ترجمہ
6	- مبارک آیات (1 تا 7) میں انسان کے مصائب و مشکلات کے ساتھ جڑے رہنے کی بات کی گئی ہے اور ساتھ ہی، طاقت اور دولت کے ذریعے اس کے بہکانے جائے جانے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
7	- آیات مبارکہ (8 تا 20) میں آخرت کے لیے نجات کے راستے کے انتخاب اور اختیار کے بارے میں بات کی گئی ہے۔
8	- دل کا اندھا ہونا
9	- زیادہ نعمتوں کا مالک ہونا۔

10	- صبر کی اہمیت اور مقام .	
11	- صبر کا لغوی معنی.	
12	- اصطلاح میں	
13	- حساب و کتاب سے پہلے جنت میں جانا .	
14	- لوگوں کے ساتھ صبر اور حوصلہ.	
	- شمس = آفتاب	سورہ شمس
1	- سورہ الشمس کا موضوع: نفس کی تربیت، قلب کی پاکیزگی، قوم ثمود کا تذکرہ.	
2	- وجہ تسمیہ	
3	- سورہ شمس کو اس نام سے مسمیٰ کرنے کی وجہ.	
4	- سورة الشمس کا سورة البلد سے ربط و مناسبت.	
5	- سورہ شمس کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد.	
6	- سورہ شمس کا موضوع اور فضیلت.	
7	- ترجمہ اور تفسیر	
8	- حضرت صالح کی اونٹنی کا واقعہ.	
9	- خدا کی عبادت کی دعوت .	
10	- قرآن میں قسم .	
11	- قرآنی قسموں کی اقسام.	
12	- خدا کی قسم اور انسان کی قسم میں فرق .	
13	- سورہ شمس کی قسموں کی گیارہ قسمیں اور تزکیہ نفس	
14	- عالم کو روشن کرنے والا سورج	
15	- سورج کی روشنی کے اثرات اور راز	
16	- انسان کی روح کی قسم	
17	- سعادت کیا ہے؟	
18	- انسان حقیقی سعادت تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟	
19	- غیر اللہ کی قسم کھانا.	
20	- عصر کی قسم کھانے کی حکمت.	
	- اللیل = رات	سورہ اللیل
	سورہ اللیل کا موضوع: انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے: ایماندار جو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور بخیل جو خدا کی بخششوں کے منکر ہیں.	
1	- وجہ تسمیہ.	
2	- سورة اللیل کا سورة الشمس سے ربط و مناسبت	
3	- سورة اللیل کے الفاظ، آیات اور حروف کی تعداد.	
4	- سورة اللیل کی آیات کا مکی اور مدنی ہونا .	
5	- سورة اللیل کا سبب نزول.	

6	- سورة الیل کی آیات مبارکہ کا موضوع۔
7	- سورہ "لیل" کا تاریخی موضوع۔
8	- ترجمہ اور تفسیر۔
9	- آیات مبارکہ (۱ تا ۱۱) میں لوگوں کی جستجو اور مختلف کوشش جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔
10	- انفاق۔
11	- انفاق قرآن میں ۔
12	- انفاق میں اخلاص اور دکھلاوا۔
13	- بخل۔
14	- بخل کے مضر اثرات۔
15	- اجنبی کے باغ کے پھل کا استعمال۔
	- ضَحٰی = صبح کی روشنی سورة ضحٰی کا مضمون :یہ سورہ حضرت محمد (ص) کو خوشخبری دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کبھی نہیں چھوڑا ہے اور پھر آپ سے بڑی عطا اور بخشش کا وعدہ دیتا ہے۔
1	- وجہ تسمیہ ۔
2	- سورة الضحٰی اور سورة الیل کے درمیان ربط و مناسبت۔
3	- سورة الضحٰی کے الفاظ، حروف اور آیات کی تعداد۔
4	- سورة الضحٰی کا سبب نزول۔
5	- سورة الضحٰی کا خلاصہ۔
6	- سورة الضحٰی کا ترجمہ اور تفسیر۔
7	- اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔
8	- شکر کیا ہے ؟
9	- اسلام اور شکر ۔
10	- اللہ اور والدین کا شکر۔
11	- دل کا شکر۔
12	- زبان کا شکر ادا کرنا۔
13	- عملی طور پر شکر کرنا۔
14	- شکر ادا کرنے کی ترغیب۔
15	- کفران نعمت ۔
16	- وحی کیا ہے ؟
17	- وحی کی زبان۔
18	- نزول وحی کے وقت پیغمبر اسلام کی حالت ۔
19	- وحی کے مختلف طریقے۔

20	- شہد کی مکھی کو وحی کی حکمت۔	
	الشرح = گشادگی، وسعت سورۃ انشراح کا مضمون: اس سورہ میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی احسانات بیان کیے گئے ہیں۔	الشرح الانشراح
1	- وجہ تسمیہ۔	
2	- سورۃ «الشرح» کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔	
3	- سورہ مبارکہ کا سبب نزول۔	
4	- سورۃ «انشراح» کا تعارف۔	
5	- سورۃ الشرح کا مختصر ترجمہ و تفسیر	
6	- اس سورہ کی مبارک آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر احسانات اور احکام کے بارے میں بحث ہے۔	
7	- لغات کی تشریح۔	
8	- اسلام میں صبر کی تلقین کا تصور۔	
9	- إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کا مفہوم۔	
10	- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا مقصد۔	
11	- گناہ کے اثرات۔	
	- التَّيْنِ = انجیر - سورۃ التین کا مضمون: یہ سورہ انسان کی خوبصورت کی پیدائش، اس کے تکامل کے مراحل اور انحطاط کے عوامل پر بات کرتی ہے، اور اللہ کی حاکمیت کا ذکر کرتی ہے۔	سورہ التَّيْنِ
1	- وجہ تسمیہ	
2	- «تین» اور «زیتون» کے بارے میں مفسرین کی روایات	
3	- کوہ زیتا یا کوہ زیتون۔	
4	- سورۃ التین کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد	
5	- سورۃ التین اور سورہ انشراح کے درمیان ربط و مناسبت	
6	- سورۃ التین کا سبب نزول	
7	- سورہ تین کے نزول کا وقت	
8	- سورہ تین میں زیر بحث موضوعات	
9	- ترجمہ و تفسیر سورہ التین۔	
10	- ایمان اور علم صالح کا تعلق	
11	- ایمان اور عمل صالح کو جوڑنے کے اثرات اور فوائد	
12	- گناہوں کو مٹانا اور دور کرنا	

13	- سعادت اور نجات کا ذریعہ	
14	- محبت اور دوستی پیدا کرنا	
15	- سورہ التین کا پیغام	
16	- پھل اور میوہ جات کا ذکر قرآن کریم میں	
17	- جنت کے پھل اور باغات	
	العَلَقُ = خون کا لوتھڑا سورۃ علق کا مضمون : اس سورت کا نام "علق" رکھنے کی وجہ اس کی دوسری آیت ہے، اسی طرح اس سورت کو "اقرا" اور "قلم" بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان.....	سورہ العَلَقُ، اِقْرَا
1	- وجہ تسمیہ.	
2	- سورہ علق کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد.	
3	- سورہ علق اور سورہ تین میں ربط و مناسبت.	
4	- سورہ علق کے مشتملات.	
5	- تاریخ اسلام میں وحی کا آغاز.	
6	- سورت کے عمومی اور بنیادی مقاصد.	
7	- سورت کا ترجمہ.	
8	- آیات مبارکہ "1 تا 5" تک انسانی تخلیق کی حکمت اور اسے لکھنا پڑھنا سکھانے جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔	
9	- قلم سکھانے کا پہلا اور سب سے اہم ذریعہ ہے.	
10	- قلم کی اقسام.	
11	- مبارک آیات "6 تا 19" میں نافرمان، منحرف اور بے پرواہ انسان کی بغاوتوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔	
12	- ابوجہل کون ہے.	
13	- اسلام میں قلم کی اہمیت.	
	- القدر = قدرت، اہمیت، اندازہ	سورہ الْقَدْر
1	سورۃ القدر کا مضمون : یہ سورہ قرآن مجید کی شب قدر میں نازل ہونے کی بات کرتی ہے اور پھر شب قدر کی اہمیت اور اس کی برکات اور اثرات کو یاد کرواتا ہے۔	
2	- وجہ تسمیہ.	
3	- سورہ قدر کا موضوع.	
4	- سورہ "القدر" کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد.	
5	- سورۃ القدر اور سورۃ العلق کے درمیان ربط و مناسبت.	
6	- سور قدر کی فضیلت.	
7	- شب قدر کی فضیلت.	

8	- قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت۔
9	- قرآن کے بتدریج نزول کا فلسفہ۔
10	- سورہ قدر کا پیغام۔
11	- الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح۔
12	- ألف شہر "کے بارے میں نوٹ 83 = سال اور 4 مہینے۔
13	- مختصر انسانی زندگی کا مفہوم۔
14	- اس مہینے میں شیطان کے قید ہونے کے بارے میں علماء کی آراء۔
15	- شب قدر اور قرآن کریم کا سبب نزول۔
16	- مبارک کا کیا مطلب ہے؟
17	- قدر کے معنی۔
18	- شب قدر کو پانے کی کوشش اور جستجو۔
19	- شب قدر کیوں متعین نہیں ہوئی؟
20	- ہر سال شب قدر کا اعادہ۔
21	- شب قدر کی عبادت ہزار مہینہ سے بہتر ہے!
22	- شب قدر کی فضیلت اور برتری۔
23	- اس رات کی نمایاں نشانیاں اور علامات۔
24	- شب قدر میں قرآنی دعائیں۔
25	- فرشتے شب قدر میں کیوں اور کس کے لیے اترتے ہیں۔
26	- وہ اعمال جو شب قدر میں کرنے چاہیئں۔
27	- رمضان المبارک میں تمام مقدس کتابوں کا نزول۔
28	- فرشتوں کا نزول خاص لوگوں کے لیے ہے۔
29	- کون سے انسان فرشتوں سے افضل ہیں؟
30	- کیا واقعی شیطان فرشتوں کا استاد تھا؟
31	- فرشتوں اور جنوں میں فرق۔
32	- ان فرشتوں کے نام جو عرش الہی کو اٹھانے کے ذمہ دار ہیں۔
33	- البتہ بعض فرشتوں کے نام کتاب و سنت میں آئے ہیں مثلاً۔
34	- کیا فرشتے مجسم ہیں؟
35	- ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہیں۔
	الْبَيِّنَةُ = روشن دلیل یا واضح حجت سورہ البینہ کا مواد: یہ سورہ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمی دعوت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اسلام مخالف اہل کتاب اور مشرکین کے مختلف روابط کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

سورہ
البینہ

1	- وجہ تسمیہ .
2	- اس سورت کے تمام نام
3	- سورة البينة کا سورة القدر سے ربط و مناسبت.
4	- سورة البينة کے الفاظ ، آیات اور حروف کی تعداد.
5	- سورة البينة کی فضیلت
6	- سورة البينة کا سبب نزول
7	- سورة البينة کے مشتملات .
8	- سورت کا ترجمہ.
9	- سورت کی تفسیر
10	- خشیت کیا ہے ؟
11	- محبت اور خوف سے اللہ کی عبادت کرنا
12	- کافر اور مشرک کے درمیان فرق.
13	- کفر کی دو قسمیں ہیں
14	- شرک بھی دو قسم کا ہوتا ہے.
15	- نواقض اسلام کیا ہے ؟
16	- انسانی قوانین کو خدائی قوانین پر مقدم اور اس سے بہتر جاننا .
17	- تکفیر سے دوری کے بارے میں سلف کے چند اقوال
18	- تکفیر کے ضابطے ، یا قوانین
19	- تکفیر کی شروط اور موانع.
20	- حکم تکفیر کے موانع
	الزلزلة = زلزلہ یا لرزنا سورہ الزلزلہ کا مواد : یہ سورہ قیامت کے انتہائی خوفناک واقعات کا ذکر کرتی ہے۔ پھر زمین کی شہادت پر انسان کے اعمال کی بحث ہے اور لوگوں کو دو گروہوں " نیکوکار " اور " بدکار " میں تقسیم کیا جاتا ہے اور یہ کہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے گا۔
1	- وجہ تسمیہ.
2	- سورة الزلزال کا ربط و مناسبت سورة البينة کے ساتھ.
3	- اس سورت کی آیات ، الفاظ اور حروف کی تعداد.
4	- سورة الزلزال کے نزول کا وقت .
5	- سورت کا سبب نزول.
6	- سورہ زلزال کی فضیلت .
7	- سورہ زلزال کا پیغام.
8	- سورة الزلزال کے مشتملات.

9	- سورة الزلزال کا ترجمہ اور تفسیر	
10	- لفظ ذرہ کے بارے میں علماء کی رائے .	
11	- یوم حشر کو شیطان کا فریضہ .	
12	- قیامت کے دن لوگوں کو جمع کرنے کا طریقہ .	
13	- عرش الہی کے پناہ گزین .	
14	- زلزلہ کو دفع کرنے کی خاطر نماز پڑھنا	
	العادیات = تیزی سے حرکت کرنے والا یا مجاہدین سورہ العادیات کا مواد : یہ سورہ انسان کی مختلف صفات جیسے بخل اور دنیا پرستی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور آخرت کا موضوع بھی واضح کرتی ہے۔	العادیات العَدِیت
1	- وجہ تسمیہ .	
2	- سورة العادیات کے نزول کا وقت .	
3	- سورة العادیات کا ربط و مناسبت سورة الزلزال سے .	
4	- اس سورت کی آیات ، الفاظ اور حروف کی تعداد .	
5	- سورة العادیات کی تمہید .	
6	- سورہ مبارکہ کا سبب نزول .	
7	- سورة العادیات کے مشتملات .	
8	- سورت کی مبارک آیات کی تقسیم .	
9	- سورة العادیات کا ترجمہ اور تفسیر	
10	- تشریح لغات و اصطلاحات .	
11	- قرآن کی قسمیں .	
12	لفظ "الشَّهِيدُ" کے بارے میں علماء کی رائے .	
13	- اللہ تعالیٰ سے ڈر اور خوف .	
	القارعة = کھڑکھڑانے والی سورہ القارعة کا مواد : یہ سورہ عموماً قیامت اور خاص کر اس کی ابتدائیات کے بارے میں بات کرتی ہے اور عمل کرنے والوں کے بہترین اجر اور گناہ گاروں کے عذاب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔	سورہ القارعة
1	- وجہ تسمیہ .	
2	- سورة القارعة کا مرکزی نکتہ .	
3	- سورہ کی آیات ، الفاظ اور حروف کی تعداد .	
4	- سورة القارعة اور سورة العادیات کا ربط و تعلق .	
5	- سورة القارعة کے مشتملات اور فضیلت .	
6	- سورة القارعة کے پیغامات .	
7	- سورہ قارعة کی آیات مبارکہ کی عمومی تقسیم .	
8	- سورت کا ترجمہ .	

9	- سورہ القارعہ کی مبارک آیات میں: قیامت کا خوف، انسان کی نیکی اور بدی کا پیمانہ زیر بحث ہیں۔
10	- قیامت اور اس کی نشانیاں۔
11	- علامات قیامت۔
12	- پہلی علامت: مہدی کا ظہور۔
13	- دوسری علامت: مسیح دجال کا ظہور۔
14	- تیسری علامت: عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، آسمان دنیا سے زمین پر۔
15	- چوتھی علامت اور نشانی: یاجوج و ماجوج کا ظاہرنا۔
16	- پانچویں نشانی: کعبہ کا انہدام اور اس کے زیورات کا چوری ہونا۔
17	- چھٹی علامت: دخان: یعنی دھواں۔
18	- ساتویں نشانی: قرآن کریم کے حروف کا زمین سے آسمان کی طرف اٹھ جانا۔
19	- آٹھویں علامت: سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔
20	- نویں نشانی: زمین سے دابة الارض کا ظہور۔
21	- دسویں نشانی اور علامت: ایک بڑی آگ کا ظہور۔
22	- قیامت کی حتمی تاریخ پوشیدہ رکھنے کی حکمت۔
23	- قیامت کے واقع ہونے کی پیشین گوئی۔
24	- قیامت اور شب و روز کی بے برکتی کی نشانی۔
	- التکاثر = کثرت کی طلب اور فخر سورہ التکاثر کا مواد: یہ سورہان لوگوں کی سرکشی کا تذکرہ کرتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ غیر حقیقی چیزوں پر فخر کرتے ہیں اور پھر سورت میں آخرت کا ذکر ہوتا ہے۔
1	- وجہ تسمیہ:
2	- سورۃ التکاثر کے سورہ القارعہ سے ربط و مناسبت۔
3	- سورۃ التکاثر کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔
4	- سورۃ التکاثر کے نزول کا وقت۔
5	- سورہ تکاثر کا محور۔
6	- سورہ تکاثر کی فضیلت۔
7	- سورت کے بارے میں مختصر وضاحت۔
8	- سورۃ تکاثر کا ترجمہ اور تفسیر۔
9	- اسلام میں فخر۔
10	- شیخی مارنا اور گھمنڈ کرنا۔
11	- شیخی مارنے کا علاج۔

12	- علم الیقین کیا ہے؟ اور کن لوگوں کے لیے مخصوص ہے؟
13	- مسلمان بھائی پر مسلمان کے حقوق
14	- سورۃ تکاثر کا پیغام۔
	سورہ العصر
	- العصر: وقت، بعد از ظہر، زمانہ
1	- سورہ عصر کا مضمون: یہ سورہ اشارہ کرتی ہے کہ سوائے ایمان والوں کے، تمام انسان زیاں کاری اور نقصان میں ہیں۔
2	- وجہ تسمیہ۔
3	- سورہ عصر کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔
4	- سورہ عصر کی فضیلت۔
5	- سورہ عصر کے پیغامات۔
6	- اس سورت کے عمومی مضامین۔
7	- سورہ "عصر" کی تفسیر کا خلاصہ۔
8	- سورت کا ترجمہ۔
9	- عمل صالح کا قرآنی تصور۔
10	- خسران میں جنات بھی شامل ہیں۔
11	- جنت کا راستہ۔
12	- مدعیان نبوت۔
13	- صدر اسلام میں جھوٹے دعویدار ان نبوت۔
14	- مسیلمہ بن ثمامہ۔
	سُورَةُ الْهُمَزِ
	- الہُمزۃ = طعنہ دینے والا
1	- سورہ ہمزہ کا مضمون: یہ سورہ ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مال جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اور غریبوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں، پھر ان غرور انگیز دولت مندوں کی دردناک داستان بیان کی جاتی ہے۔
2	- وجہ تسمیہ۔
3	- سورہ الہُمزہ کا سورۃ (العصر) سے ربط و مناسبت
4	- سورہ "ہمزہ" کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد
5	- سورہ ہُمزہ کا سبب نزول۔
6	- سورہ ہمزہ کی تمہید۔
7	- سورہ ہُمزہ کے دروس اور عبرتیں۔
8	- سورہ ہمزہ کے مشتملات اور فضیلت۔

9	- سورہ ہمزہ کے اہم پیغامات۔
10	- مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح۔
11	- سورت کا مختصر مفہوم۔
12	- سورت کا ترجمہ
13	- کیا اسلام میں مال دولت جمع کرنا حرام ہے؟
14	- غیبت اور اس کا کفارہ۔
15	- چغل خوری۔
16	- چغل خور کے متعلق ہمارا فرض کیا ہے؟
17	- چغل خور سے متعلق ہوشیار رہنا۔
	سورہ الفیل
	- الفیل = ہاتھی
1	سورہ فیل کا مضمون: یہ سورہ ایک مشہور تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو پیغمبر اسلام جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے دن ہوا، جب خدا نے مکہ کو کفار کی فوج کے بڑے حملے سے بچا لیا جو یمن سے ہاتھیوں پر بڑے فوج کے ساتھ آئی تھی۔
2	- وجہ تسمیہ۔
3	- سورت فیل کے نزول کا وقت۔
4	- سورة الفیل کا سورة الہمزہ سے رابطہ و مناسبت۔
5	- سورة الفیل کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔
6	- سورة الفیل کا مکمل موضوع۔
7	- سورہ فیل دو حصوں پر مشتمل ہے۔
8	- لغات اور اصطلاحات کی تشریح
9	- اصحاب فیل کا واقعہ (ہاتھی کی سواری)
10	- ابابیلوں کی آمد۔
11	- سورت کا ترجمہ۔
12	- فطری طریقے یا اللہ کی قدرت سے کنکریوں کا اثر۔
13	- عام الفیل پیغمبر اسلام کی ولادت کا سال۔
14	- عام الفیل میں نبی ﷺ کی ولادت کے بارے میں روایات۔
15	- پیغمبر ﷺ کی تاریخ وفات۔
16	- کیا کعبہ بھی منہدم ہوگا۔
17	- کیا آخری زمانے میں کعبہ منہدم ہو جائے گا؟
18	- فرشتوں کا کعبہ۔
19	- سبق سیکھنا یا عبرت حاصل کرنا۔
20	- اسلام کے سوا عربوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟

سُورَةُ الْقُرْشِ	القريش : الفت دينا	
1	- سورہ قریش کا مضمون : یہ سورہ خدا کی ان رحمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو قریش کو دی گئی تھیں اور آخر میں انہیں اپنے رب کی شکر گزاری اور عبادت کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔	
2	- وجہ تسمیہ۔	
3	- سورہ قریش کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔	
4	- سورہ قریش کا سورہ فیل سے ربطہ و مناسبت۔	
5	- سورہ قریش کی تمہید۔	
6	- سورہ قریش کے مشتملات۔	
7	- سورہ قریش کی تلاوت کی فضیلت۔	
8	- سورہ قریش کا سبب کا نزول	
	- تفسیر کا خلاصہ	
9	- لغات اور اصطلاحات کی تشریح۔	
10	- سورہ قریش کی آیات کی تقسیم۔	
11	- سورت کا ترجمہ۔	
12	- قریش کا موسم سرما اور بہار کا سفر۔	
13	- کعبہ کا رب۔	
14	- قریش کے بارے میں مختصر معلومات۔	
15	- قریش کے مشہور ترین بازار۔	
16	- سورہ قریش سے حاصل شدہ اسباق۔	
سورہ الماعون	- الماعون = ظرف غذا ، اوزار ، سامان۔	
1	- ماعون سورہ کا موضوع : اس سورہ میں قیامت کے منکرین کی صفات اور اعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔	
2	- وجہ تسمیہ۔	
3	- سورہ ماعون کے دیگر نام	
4	- سورة الماعون کے نزول کا مقام	
5	- سورة الماعون کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد	
6	- سورة الماعون کا سورہ قریش سے ربطہ و مناسبت	
7	- سورة الماعون کا سبب نزول	
8	- سورہ ماعون کا عمومی مواد	
9	- لغات اور اصطلاحات کی تشریح	
10	- ترجمہ اور تفسیر۔	
11	- مسکین اور فقیر	
12	- ریا کی چند اقسام	

13	منافق اور ریا کار میں فرق:
14	- سورة الماعون سے حاصل شدہ اسباق
15	- اسلام میں نماز چھوڑنے والے کا حکم
16	- ائمہ اہل السنة و الجماعة کے نزدیک نماز چھوڑنے والے کا حکم.
17	- نماز ترک کرنے والے سے متعلق امام شافعی اور امام مالک کا حکم
18	- شیخ عثیمین کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم.
19	- دوسرے گروہ کے متعلق احکام
20	- امام ابو حنیفہؒ کا نماز چھوڑنے والے سے متعلق حکم.
21	- امام احمد کا تارک نماز کے بارے میں حکم
22	- نماز چھوڑنے والے کے بارے میں امام شعرانی کی نصیحت
23	- شیخ حبیب ابن عبد اللہ کا تارک الصلاة سے متعلق حکم .
24	- نماز ترک کرنے والے کے بارے میں ابن قیمؒ کا حکم.
25	- جابر بن عبد اللہ کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم.
26	- امام بن تیمیہؒ کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم.
27	- شیخ ابن بازؒ کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم.
28	- شیخ محمد بن صالح العثیمین کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم.
29	- شیخ ناصر الدین البانی کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم.
30	- نماز چھوڑنے والے کے بارے میں عمومی نتیجہ
	سورہ الکوثر
	الکوثر = بہترین نعمت
1	- سورة الكوثر کا موضوع: اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر کی بشارت دی، جو اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، اور آپ کے دشمنوں کو عذاب کی وعید سنائی۔
2	- وجہ تسمیہ.
3	- سورة "کوثر" نام رکھنے کی وجوہات.
4	- سورة الكوثر اور ماعون کے درمیان ربط و مناسبت.

5	- سورة الكوثر کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد.
6	- سبب نزول.
7	- سورہ کوثر کی تمہید.
8	- لغات اور اصطلاحات کی تشریح.
9	- کوثر عربی زبان میں.
10	- ترجمہ اور تفسیر.
11	- اس سورت میں دو غیبی خبریں ہیں
12	- آیت "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنُحْز" سے معلوماتی اسباق
13	- سورة کوثر کی تفسیر انس بن مالک کی حدیث کے تناظر میں
14	- «ابتدأ» کون ہے؟
15	- سورة الكوثر کا پیغام.
16	- سورہ کوثر پڑھنے کا ثواب.
17	- حوض کوثر.
18	- حوض کوثر کا طول و عرض.
19	- حوض کوثر کے بارے میں مذکور احادیث.
20	- حوض کوثر پر کون لوگ آئیں گے اور کون اس سے روکے جائیں گے؟
	- الْكَافِرُونَ = کافر
	- سورة الكافرون کا موضوع: اس سورہ میں کافروں کی درخواست پر اللہ تعالیٰ نے سختی سے جواب دیا ہے، جنہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے خلاف سازش کرنے کی خواہش تھی لیکن پیغمبر نے ان کی درخواست کو سختی سے رد کیا۔
1	- وجہ تسمیہ.
2	- اس سورت کے دیگر نام.
3	- سورة الكفرون اور سورة الكوثر کے درمیان ربطہ.
4	- سورة الكفرون کے الفاظ، آیات اور حروف کی تعداد.
5	- سورة الكافرون کی فضیلت.
6	- سورت کا سبب نزول.
7	- سورت کا خلاصہ.
8	- ترجمہ اور تفسیر.
9	- لغات اور اصطلاحات کی تشریح.
10	- عقیدہ کی بنیادی باتوں اور اصولوں میں سمجھوتہ کی کوئی جگہ نہیں ہے.
11	- ایمان اور کفر کی اصطلاح.
12	- اسی طرح ایمان کی تعریف میں مزید اضافہ کرتے ہیں کہ

سُورَةُ الْكَافِرُونَ

13	- کفر۔	
14	- جزيرة العرب میں بت پرستی کے اسباب۔	
15	- بتوں کی تنوع کی وجہ۔	
16	- نتیجہ خیز اسباق کا خلاصہ۔	
	- النصر = مدد	سورہ النصر
1	- سورة النصر کا موضوع: اس سورہ میں خدا تعالیٰ پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم فتح کی خوشخبری اور مدد کی بشارت دیتا ہے جس کے بعد لوگ خدا کے دین کی طرف راغب ہونے لگتے ہیں۔	
2	- وجہ تسمیہ	
3	- اس سورت کے دیگر نام۔	
4	- سورة النصر کے نزول کا وقت۔	
5	- سورة النصر کی آیات، الفاظ اور حروف۔	
6	- سورة النصر اور کافروں کے درمیان ربط و مناسبت۔	
7	- سورة النصر کے نزول کے اسباب۔	
8	- سورة النصر کے عمومی موضوعات۔	
9	- سورت کا موضوع۔	
10	- لغات اور اصطلاحات کی تشریح۔	
11	- ترجمہ اور تفسیر۔	
	- اللہب-المسد = تَبَّتْ (ٹوٹ گئے)	مَسَد (اللہب)
1	- سورة مسد کا موضوع: اس سورہ میں ایک مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں اسلام کے دشمنوں میں سے ابو لہب کا ذکر ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ اور اس کی بیوی جہنمی ہیں۔	
2	- وجہ تسمیہ۔	
3	- سورة مسد کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔	
4	- سورة مسد کا سورة النصر سے ربط و مناسبت۔	
5	- سورة مسد کا موضوع۔	
6	- سورة مسد میں اہم ترین پیغام۔	
7	- سورة مسد سے واقفیت۔	
8	- سورة مسد کی فضیلت۔	
9	- سورة مسد کا شان نزول۔	
10	- سورت کا ترجمہ۔	
11	- سورت کی تفسیر۔	
12	- کیا واقعی ابو لہب کے ہاتھ کاٹے گئے تھے؟	

13	- کیا ابو لہب جہنمی ہے؟	
14	- قیامت اور ان سے سوالات و جوابات کا موضوع.	
15	- پیغمبر اسلام کی بیٹیوں کا ابو لہب کے بیٹوں سے نکاح.	
16	- ابو لہب کون ہے؟	
17	- سخت ہلاکت.	
18	- سورہ مسد سے حاصل شدہ عبرتیں اور اسباق.	
	الاخلاص = خالص کرنا. - سورہ اخلاص کا مواد: یہ سورہ خدا کی توحید اور اس کی وحدانیت کی بات کرتی ہے۔	سورہ الاخلاص
1	- وجہ تسمیہ.	
2	- سورہ اخلاص کے دیگر نام.	
3	- سورہ اخلاص کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد.	
4	- سورہ اخلاص کا سورہ مسد کے ساتھ ربط و تعلق.	
5	- سورہ اخلاص کا خلاصہ.	
6	- سورہ اخلاص کا سبب نزول (شان نزول).	
7	- سورہ اخلاص کی فضیلت.	
8	- سورہ اخلاص کی فضیلت میں مذکور تمام احادیث.	
9	- معلوماتی ملاحظہ.	
10	- سورة الاخلاص کا تفسیر و ترجمہ.	
11	- "اللہ الصمد" کے بارے میں تمام مفسرین کی تفسیر.	
12	- سورة الاخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے.	
13	- سورہ اخلاص کی فضیلت کو سمجھنے کے لیے ایک اور سادہ سی مثال.	
14	- سورہ اخلاص سے علاج .	
15	- رقی کیا ہے؟	
16	- اس کے شروط.	
17	- ممنوع رقیہ .	
18	- رقیہ سے علاج بہتر ہے یا ڈاکٹر کے پاس جانا.	
	الفلق = صبح	سورہ الفلق
1	- سورہ فلق کا مواد: یہ سورہ اللہ کی پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی طور پر اور مسلمانوں کو عموماً تعلیم دیتی ہے کہ برے لوگوں اور شیاطین سے بچنے کے لیے خدا کی پناہ میں آؤ۔	
2	- وجہ تسمیہ.	

3	- سورة الفلق کا سورة الاخلاص سے ربطہ۔
4	- سورة الفلق کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد۔
5	- سورہ فلق کی آیات کی تقسیم۔
6	- سورہ الفلق کی فضیلت۔
7	- معوذتین کی فضیلت۔
8	- معوذتین کا سبب نزول۔
9	- سورہ فلق کا مرکزی محور اور مشتملات۔
10	- سورة فلق کا ترجمہ وتفسیر۔
11	- انسان رات کے اندھیرے سے کیوں ڈرتے ہیں؟
12	- خیر اور شر۔
13	- حسد کی بیماری کا علاج۔
14	- حسد کے خلاف جدوجہد۔
15	- کیا واقعی پیغمبر اسلام پر جادو کیا گیا تھا؟
16	- جادو کی اقسام۔
17	- سحر کی اقسام۔
18	- جادوگر، نجومی اور کاہن کے پاس جانا۔
19	- جادو اور ٹونے کا عمومی حکم
20	- شریعت میں جادوگر کی سزا۔
21	- چغل خوری۔
22	- چغلی کی وجوہات۔
23	- حسد اور بغض۔
24	- چغل خور کا انجام قرآن کی نظر میں۔
25	- سورہ مبارکہ فلق سے حاصل شدہ اسباق۔
	سورہ الناس
	- الناس = لوگ
1	- سورہ ناس کا مواد: یہ سورہ پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ ہر طرح کے بدکاروں کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگیں۔
2	- وجہ تسمیہ۔
3	- سورة الناس کی آیات ، الفاظ اور حروف کی تعداد۔
4	- سورہ الناس کی آیات کی مجموعی تقسیم۔
5	- سورة الناس کا عمومی خلاصہ۔
6	- سورة الناس کا ترجمہ۔
7	- سورة الناس کی تفسیر
8	- شیطان کو انسان پر مسلط کرنے کی وجہ۔
9	- سورہ ناس میں خدا تعالیٰ کی تین صفات۔
10	- اس سورت میں قابل بحث موضوعات۔

11	- استغاثہ کی اقسام۔
12	- استغاثہ کی دو قسمیں ہیں۔
13	- الف: اسباب اور چیزوں میں استغاثہ۔
14	- ب: اسباب اور وسائل سے اوپر مدد طلب کرنا۔
15	- استعاذہ (پناہ مانگنا)
16	- مشرکین قریش کی پناہ مانگنے کی عادت۔
17	- انسان کے دودشمن، انس اور جن، اور ان کا مقابلہ کرنا۔
18	- شیطان کو "خناس" کیوں کہا گیا؟۔
19	- خناسوں کا گروہ۔
20	- شیطان اور انسان پر اس کا تسلط۔
21	- گمراہوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔
22	- فرعون کی توبہ کیوں قبول نہ ہوئی۔
23	- شیطان خبیث۔
24	- قرآن میں بعض شیطانی بری صفات۔
25	- شیطان سے نمٹنے میں قرآن کریم کی ہدایت و رہنمائی۔
26	- رب تعالیٰ نے شیطان کو وسوسے کی اجازت کیوں دی؟
27	- شیطان کے وسوسے کو دور کرنا۔
28	- شیطان کا مکر بہت کمزور ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله، وعلى آله وصحبه ومن والاه. أما بعد:

تفسیر احمد کے ۳۰ ویں پارے کی تفسیر جو آپ کے ہاتھ میں ہے، الحمد للہ ایک ایسی تفسیر ہے جس کا ترجمہ بہت محنت اور مشقت کے بعد افغانی دری زبان سے اردو زبان میں رواں اور سلیس انداز میں کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کو دری زبان میں افغانستان اور بیروں افغانستان میں علماء اور طلباء میں، خاص طور پر جامعات اور طلبہ کرام کے مراکز میں اور ائمہ مساجد اور علمی اداروں میں بڑے پیمانے پر پذیرائی ملی ہے، یہ تفسیر دو مرتبہ ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، اور الحمد للہ یہ سلسلہ جاری ہے، اسی طرح یہ تفسیر مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور قطر کے علمی مراکز میں اور جامع الازھر شریف کے علمی مرکز میں سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہے اور علوم قرآنی کے مطالعہ کے پیاسے اس سے استفادہ کر رہے ہیں، اور یہ تفسیر ۲۰۱۹ میں بیت المقدس کی زیارت کے دوران بیت المقدس کے کتب خانہ اور شہر الخلیل میں ابراہیم خلیل اللہ کے کتب خانہ میں ہدیہ کر کے رجسٹر کیا گیا جہاں لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

بیت المقدس کے خطباء اور ائمہ میں سے ایک نے تجویز کیا کہ اس تفسیر سے مؤثر طریقے سے فائدہ اٹھانے کے لیے بہتر ہوگا کہ اس تفسیر کا ترجمہ کر کے اردو بولنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد کے استفادہ کے لیے پیش کیا جائے۔

لہذا اس سمت میں پوری احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ اس کے اردو ترجمہ پر کام شروع کر دیا گیا، اب اس تفسیر کے ۳۰ ویں پارے کا اردو زبان میں قابل اعتماد با عزت اور جید علماء کرام کے ذریعے ضروری احتیاطی تدابیر کے بعد ترجمہ کیا گیا ہے، یہ اب شائع ہو کر آپ عزیزان محترم کے لیے دستیاب ہے۔

ہم اس ترجمے میں تعاون کرنے والوں کے لیے نیک دعائیں کرتے ہیں اور بہت احترام کے ساتھ، ان کی عظیم کاوشوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں، اب آپ کے سامنے اس تفسیر کے خصوصیات کے بارے میں مختصر معلومات پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی یہ تفسیر "تفسیر احمد" ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے، اور ہر جلد میں اوسطاً ۱۰۰۰ صفحات ہیں، جو افغانستان میں طبع ہو چکی ہے۔

"تفسیر احمد" کے ترجمے میں سورتوں میں موجود موضوعات کی تشریح و توضیح کے لیے بڑی محنت کی گئی ہے، جس میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ صاف، سادہ، سلیس، روانی اور مستند زبان میں قرآنی آیات کی تفسیر قرآن سے اور صحیح احادیث نبوی ﷺ سے کی جائے، اور جہاں تک ممکن ہو فقہاء کی متضاد آراء سے دور ہو۔

۱۔ اس تفسیر میں اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ماخذ اور حوالہ جات مستند ہوں، اور ضعیف، غریب اور غیر معتبر روایات اور احادیث سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے۔

۲۔ نیز تمام روایات کے ماخذ اور منابع علمی انداز میں واضح کیے گئے ہیں۔

۳۔ اس تفسیر میں ان مطالبات اور مسائل کی طرف زیادہ اہتمام اور توجہ دی گئی ہے کہ جو نوجوان نسل کے لیے ضروری اور ناگزیر ہیں، خاص طور پر اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ علم کے لیے اور ایسے موضوعات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے جو دور حاضر سے متعلق ہوں۔

۴۔ جدید دور میں نوجوانوں اور طلباء کے ماحول اور افکار کو جان کر ان نوجوانوں کے اذہان میں موجود سوالات کی فطری تفصیلات اور وضاحتیں دی گئی ہیں۔

۵۔ قرآنی آیات کے مفہوم کا بیان اور اس کے رہنماء پیغام کی وضاحت مذہبی تفصیلات اور فرقہ وارانہ رجحانات سے ہٹ کر کی گئی ہے، تعبیرات میں موجود مختلف مفاہیم کو ممکن حد تک واضح کیا گیا ہے۔

چنانچہ اس تفسیر کی تحریر میں آیات کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے یہ کوشش کی گئی ہے کہ آیات مبارکہ میں موجود لغات، مفردات اور آیات مبارکہ میں موجود مشکل الفاظ کو آسان اور قریب تر الفاظ میں پیش کیا جائے۔

۶۔ قارئین کو بہتر طور پر سمجھانے کے لیے، موضوع کے شروع میں سورتوں کی تفسیر اور مواد کا خلاصہ، ترجمہ و تشریح شروع کرنے سے پہلے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

۷۔ آیات مبارکہ کی تفسیر میں، آیت میں موجود موضوعات کا خلاصہ اور موضوعات کی وضاحت جامع انداز میں کی گئی ہے، جب کہ آیت مبارکہ کے پیغامات اور ان پیغامات کے مد نظر مسلمانوں کے فرائض کیا ہیں، اس پر پوری توجہ مرکوز کر کے اس کی تعریف کی گئی ہے، اس صورت میں سورتوں اور آیات میں مختلف موضوعات سے متعلق ضروری تدریسی مواد کی صورت میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

۸۔ موضوعات کو پیش کرنے اور مندرجات کی وضاحت میں نادر غریب احادیث اور روایات کے ذکر سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے، اور میں نے ایسے معاملات میں کوشش کی ہے کہ آیت کی ظاہری شکل کی بنیاد پر ترجیحی رائے پیش کروں، اور ایسے موضوعات کو نہ چھیڑوں جو پڑھنے والے کے ذہن کو الجھادیں، اور ان کے سوالات لاینحل باقی رہ جائیں، ان مباحث میں وحی الہی کے نزول کی عظمت کو احادیث، منابع کتب اور مستند و معتبر روایات سے ثابت کیا گیا ہے اور دیگر اہم ماخذ بھی پوری امانت داری کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں، نیز تفسیر "احمد" کے لکھنے کے طریقے میں اہم اور عمومی موضوعات کے متن کے اندر ضروری ماخذ اور ماخذ کو اس تفسیر کے آخری حصے میں جمع کیا گیا ہے۔

اس تفسیر کو تحریر کرتے ہوئے آیات کی تعداد، الفاظ کی تعداد اور آیات مبارکہ کے حروف کی تعداد کو معتبر ذرائع سے بیان کرنے اور خلاصہ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۹- ہم نے سوچا کہ اس تفسیر میں مسائل کی وضاحت اور تشریح اہل سنت و جماعت کے نقطہ نظر سے کی جائے اور زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے کہ فرقہ وارانہ اور مسلکی اختلافات میں نہ پڑیں۔

آخر میں، میں محترم استاد حبیب المرسلین راسخ اور فضیلت الشیخ عبدالعظیم حسن زئی جنہوں نے اردو ترجمے میں میری مدد کی، اور اسی طرح میں اپنے معزز اور دانشور بھائیوں جن میں دکتور صلاح الدین سعیدی "سعید افغانی" اور محترم انجنئر عتیق اللہ "یاسر" کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنہوں نے اس تفسیر کو لکھنے اور مکمل کرنے میں علمی اور تعمیری خیالات اور مشورے دے کر مدد کی۔

اسی طرح ضروری ہے کہ اپنے بیٹوں اور نور چشم میں سے احمد سعیدی، عزیز الدین سعیدی، نجیب جان سعیدی، سید مسعود "پروانی" اور اپنے بھائی انجنئر رفیع الدین سعیدی، اور ڈاکٹر مصباح الدین سعیدی، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک حمزہ سعیدی، ہارون سعیدی، بی بی دیوہ سعیدی، بی بی جیدا سعیدی، اور بی بی نگینہ سعیدی، سومایہ سعیدی، جنہ سعیدی، سورہ سعیدی اور نورہ سعیدی، اور میرے بھائی شمس الدین شکوری اور قاضی نثار احمد مصلح کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے اس عمدہ تفسیر کی طباعت اور اشاعت میں ہماری مدد کی۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ وہ ہم سب کو اللہ کے کلام کو سمجھنے، سمجھانے اس کی وضاحت اور تفسیر کرنے اور اسے دوسروں تک کی توفیق دے پہنچانے اور دین کی صحیح معرفت عطا فرمائے، ہمارے قول و فعل میں محبت اور اخلاص قائم کرے۔

اللهم صل علی محمد وآلہ وصحبہ وسلم تسلیاً کثیراً.

آمین یا رب العالمین

امین الدین «سعیدی - سعید افغانی»

مؤلف تفسیر «احمد»

ایمیل: saidafghani@hotmail.com

ادرس:

Aminuddin Saidi

Wittelsbacher Strasse 34

Bruhl 50321

Germany

بسم الله الرحمن الرحيم

جزء - (30) سورة النبأ

یہ سورت مگہ میں نازل ہوئی ہے ، اور اس کی چالیس آیتیں ہیں
قرآن عظیم الشان رب تعالیٰ کی کتاب اور سب سے بڑا معجزہ ہے ۔

قرآن کریم وہ کتاب ہے جس کے نورانی صفحات پر گرد و غبار کے دھول نہیں
بیٹھ سکتی ، اور نہ ہی وقت گزرنے کے ساتھ پرانا اور بیکارا ہوگا ، بلکہ
ہرگزرتے وقت کے ساتھ اس کے علوم و معارف واضح ہوتے جائیں گے ، قرآن
کریم امت اسلامیہ کے لیے ایک پختہ قانون ہے ، اور اسی وجہ سے پوری تاریخ
میں دشمنوں نے طرح طرح کی شیطانی سازشوں سے امت اسلامیہ کو اس کی
حیات بخش تعلیمات سے ہمیشہ محروم کرنے کی کوشش کی ہے ، اور انسانیت
کو سدھارنے والی اس کتاب سے انسان کو الگ تھلگ رکھنے کی سازش کی
ہے ۔

لیکن ان کی سرتوڑ اور مسلسل کوششوں کے باوجود قرآن کریم تمام تر انقلابات
اور تحریکوں اور باطل کے خلاف ڈٹ جانے کا سرچشمہ رہا ، اور اس کی
نورانی آیات کی چمک نے وقت کے چمکادڑوں کے آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے ۔

قرآن کریم کی روشنی ہمارے لیے امید کی کرن ہے {إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ
أَفْوَمٌ} ترجمہ: یہ قرآن وہ راستہ دکھا تا ہے جو سب سے سیدھا ہے ۔

قرآن کریم جتنی روشنی کوئی اور ذریعہ نہیں دے سکتا، جس سے انسانی دل
منور ہو جائے ، کوئی اور عمل قرآن کریم کی طرح انسانی اخلاق کو سدھار نہیں
سکتا، قرآن عظیم ہمیں صحیح اور صحت مند طرز زندگی سکھا تا ہے ، اور
صحیح سیدھا راستہ دکھا تا ہے ۔

محترم قارئین:

سب سے اہم مسئلہ قرآن کریم کے تیسویں پارہ میں جس کی اکثر سورتیں تقریباً
بالانفاق مکی ہیں ، وہ قیامت کا مسئلہ ہے ، اور قیامت کے دن انسانی حالات کی
تشریح و تفصیل بیان کی گئی ہے ، یہ اس لئے کہ انسان کی اصلاح کے لیے پہلا
قدم یہ ہے کہ وہ اس بات کو اچھی طرح جان لے کہ حساب کتاب بھی ہے ۔

اور ایسی عدالتیں بھی موجود ہیں جن کے قاضی اور جج پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، ایسی عدالت ہے جہاں نہ ظلم ہوگا اور نہ نا انصافی ہوگی، اور نہ ہی کسی غلطی کی گنجائش ہے، نہ وہاں کوئی سفارش اور رشوت کار آمد ہے، اور نہ جھوٹ بولنا ممکن ہے اور نہ ہی کسی بات سے انکار کرنا۔

مطلب یہ کہ وہاں عذاب کی چنگل سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اس دنیا میں نجات کا راستہ گناہوں کو چھوڑنے میں ہے۔

ایسی عدالت کی وجود پر ایمان لانا انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، اور سوئی ہوئی روحوں کو جگادیتا ہے، یہ انسانوں میں تقویٰ و عزم اور احساس ذمہ داری کو زندہ کر دیتا ہے، اور اسے اپنے منصب کی پہچان اور اس کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔

کسی ملک اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہونے کے بنیادی اسباب دوہی ہوسکتے ہیں:

1- پولیس اور دیگر اداروں کی کمزوری۔

2- یا عدلیہ کی کمزوری۔

اگر نگرانی کرنے والے یعنی: پولیس وغیرہ ذمہ داران ہوشیار و تیز نظر ہوں کہ لوگوں کی درست نگرانی کریں، اور مجرموں کے جرائم کی چھان بین کریں، اسی طرح عدلیہ بھی اپنے فرائض بخوبی انجام دے کہ کوئی جرم اور مجرم بغیر سزا کے نہ رہے، ایسے ماحول میں بدعنوانی، سرکشی جرائم اور بغاوتیں کم سے کم ہوجائیگی۔

جب مادی زندگی اپنے محافظوں اور عدالتوں کی زیر نگرانی ایسی ہو، اور پھر وہاں انسان کا کردار اور عمل صحیح راہ پر آجاتا ہے، تو اگر ایسی ذات کے وجود پر ایمان لانا جو مبدی ہے، یعنی جس نے پیدا کیا ہے اور جو ہر جگہ اس کے ساتھ ہے (لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ) ذرہ بھر کے اندازے سے کوئی بھی چیز اس کے علم سے مخفی نہیں ہے، (سورہ سبأ- 3)۔

اور جو معادی ہے: یعنی آخرت میں دوبارہ زندہ کرنے والا، اس کے وجود پر ایمان کہ جہاں اعمال کے بارے میں فرمایا: (فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ) ترجمہ:

جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا (وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا

يَرَهُ) ترجمہ: اور جس نے ذرہ بھر بُرائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا (سورہ

زلزال : (7-8)۔

اللہ کی ان دونوں صفات پر ایمان انسان کو ہر قسم کے گناہ سے اسی طرح روکتا ہے جس طرح مستعد پولیس اور عدلیہ کا خوف انسان کو جرائم سے روکتا ہے ، جبکہ اللہ کی نگرانی تو دنیا کے اداروں کی بنسبت اور بھی بہت اعلیٰ ہے ۔

کہ جہاں اچھے اور برے اعمال ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھلائے جائیں گے ، بلکہ اس کے سامنے انہیں پیش کیا جائیگا ، اللہ تعالیٰ پر اس طرح کا ایمان انسان کو ایسا متقی اور متدین بنادیتا ہے کہ زندگی بھر اسے خیر و بھلائی کے راستے پر چلاتا ہے ۔

تیسویں پارہ میں دوسرا محور جو کہ واقعتاً قابل غور و فکر ہے وہ ہے اپنے پیغمبر کی تائید و نصرت ، جیسا کہ اس مضبوط و فیصلہ کن تائید و نصرت کو آپ سورہ ضحیٰ ، سورہ انشراح اور سورہ کوثر سورہ علق اور دیگر بے شمار سورتوں میں دیکھیں گے ، ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سورت (والضحیٰ) میں اپنے نبی کی مدد و نصرت کا اعلان فرماتے ہیں ، کہ ہرگز اپنے نبی کو تنہا نہیں چھوڑا۔

دوسرا زیر بحث مسئلہ تیسویں پارہ میں جو قابل ذکر ہے ، مشرکوں ، کافروں اور جھوٹوں کے خلاف رب تعالیٰ کی قدرت و طاقت کا تذکرہ ہے اور یہ کہ وہ لوگ اپنی منزل تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے ، ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بظاہر ضعف کی حالت میں تھے ، لیکن ان مکی سورتوں میں خدا تبارک و تعالیٰ کافروں اور مشرکوں کو ہر قسم کی تنبیہات اور ڈانٹ ڈپٹ دیتا اور انہیں ڈراتا ہے ، ان تنبیہات اور دھمکیوں کی ایک جھلک ہم سورہ ہمزہ میں دیکھتے ہیں (وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝۱) اور سورہ مطففین میں دیکھیں: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝۱ (ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے) نیز سورہ لہب میں (تَبَّتْ يَدَايَ لِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝۱) (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو) یا سورہ علق میں دیکھتے ہیں کہ رب تعالیٰ تنبیہ فرماتے ہیں: كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۝۱ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱ (ترجمہ: دیکھو اگر وہ باز نہ آئے گا ، تو ہم (اس کے) پیشانی کی بال پکڑ کر گھسیٹیں گے) نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱ (ترجمہ: یعنی اس جھوٹے خطا کار

کی پیشانی کے بال) -

لہذا یہ سورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کے ذہنی اور روحانی تقویت کاسب سے اہم ذریعہ ہیں، مگہ کے اس سخت ماحول میں یہ مؤمنین کے لیے امن اور روحانی تقویت کا باعث بن گئیں، جو کہ ہمہ وقت ہر زمان و مکان میں ان آیات اور سورتوں کے تلاوت میں مشغول رہتے -

لہذا تیسویں پارہ کی سورتوں کا مقصد بھی توحید اور قیامت کے مراحل کے بارے میں یقین کو مضبوط کرنا ہے، اور روحانی و معنوی بنیاد کی رُو سے انسان کے تعلق کو خدا کے ساتھ تقویت پہنچانے میں یہ سورتیں نہایت مفید و مؤثر ہیں۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ ان سورتوں کی تفسیر و ترجمہ جو علمی و تحقیقاتی مقالوں کی شکل میں تفسیر احمد کے عنوان کے تحت تیسویں پارہ کی تفسیر مرتب کر کے آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، یہ تفسیر ان شاء اللہ آپ کو ایک بہترین موقع مہیا کرے گی کہ آپ معزز و محترم حضرات ان قرآنی معلومات سے مستفید ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ (رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸) ترجمہ: اے پروردگار جب تونے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر دیجیو اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما تو تو بڑا عطا فرمانے والا ہے (آل عمران: 8)۔

سورہ نبا کے بارے میں مختصر معلومات

سورة النبأ قرآن کریم کے تیسویں پارہ کا آغاز ہے ، یہ مکی سورتوں میں سے ہے جس کے دو رکوع اور چالیس آیتیں ہیں۔

ایک سو چوہتر (۱۷۴) الفاظ ہیں ، آٹھ سو ایک حرف ہیں ، اور تین سو تریسٹھ نقطے ہیں،

اس سورت کا نام دوسری آیت میں دی گئی تعبیر و تشریح کی وجہ سے ہے۔

اس سورت کو ، پہلی آیت کی مناسبت سے "سورہ عم" بھی کہا جاتا ہے ۔

اسباب نزول

عالم اسلام کے مشہور و معروف مفسر و مؤرخ محمد بن جریر طبری اور مسلمانوں کے معروف محدث ابن ابی حاتم حسن سے روایت کرتے ہیں کہ: پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رسالت کے ساتھ مبعوث ہوئے اور مکہ والوں کو رب تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینے لگے، اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے بارے میں بتایا، اور ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کرنا شروع کی تو کفار مکہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

محمد کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ کیا چیز اپنے ساتھ لایا ہے؟ پھر رب نے یہ آیت نازل فرمائی، (عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ) (ترجمہ: (کفار) کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں؟) (عَنِ النَّبِيِّ الْعَظِيمِ) (ترجمہ: ایک عظیم واقعہ اور حادثہ کے بارے میں سوال کرتے ہیں) اور ان کے سوالات کا جواب دے دیا۔

وجہ تسمیہ:

اس سورت کا نام "عم" اور "نبأ" ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق کہ (عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ) (عَنِ النَّبِيِّ الْعَظِيمِ) اس سے مراد قیامت کی خبر ہے، جس سے اس سورت کا آغاز کیا گیا ہے۔

اس سورت کی مشتملات

اس سورت کے مشتملات کا ذیل میں دئیے گئے چند نکات میں خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے:

- 1- وہ سوال جو سورہ کے آغاز میں قیامت کے عظیم واقعہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔
- 2- پھر زمین و آسمان اور انسانی زندگی میں خدا کی قدرت کے مظاہر کو وقوع قیامت اور حشر کے لیے بطور دلیل پیش کرنا۔
- 3- دوسرے مرحلے میں قیامت کے آغاز کی بعض اور نشانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔
- 4- دوسرے حصے میں سرکشوں اور باغیوں کے دردناک عذاب کے کچھ حالات کو بیان کیا گیا ہے۔
- 5- اس کے بعد جنت کی کچھ نعمتوں اور فوائد کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

6- آخر میں قریب الوقوع عذاب سے ڈرانا اور پھر کافروں کے عبرت ناک انجام کے بیان کے ساتھ سورت کا اختتام ہوتا ہے۔

مختصر ترجمہ و تفسیر سورة النبأ

بسم الله الرحمن الرحيم	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے
عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝۱	(کفار) کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں؟ (۱)

عَمَّ دو حرف "عن" اور "ما" سے مرکب ہے، ما استفہام کیلئے آتا ہے، اس ترکیب میں الف "ما" سے ساقط ہو گیا ہے، اس کا ترجمہ ہے کہ: وہ لوگ کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں؟ پھر خود ہی جواب دے دیا ہے کہ :

عَنِ النَّبِیِّ الْعَظِیْمِ ۝۲	ایک عظیم واقعہ اور حادثہ کے بارے میں سوال کرتے ہیں (۲)

نبأ: مفسرین نے اس لفظ کی متعدد تفسیریں کی ہیں مثلاً قیامت، قرآن، دین کے اصولی عقائد، لیکن مجموعہ آیات میں موجود قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس کی تفسیر قیامت سب سے اصح ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اہل مکہ خبر عظیم قیامت کے بارے میں کچھ سوال و جواب کرتے ہیں، اور اس سے متعلق باہمی اختلاف رکھتے ہیں۔

الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُونَ ۝۳	کہ وہ خود اس میں اختلاف کرتے ہیں (۳)

ایک حدیث میں ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن عظیم الشان کے نزول کا آغاز ہوا تو کفار مکہ اپنی محفلوں اور مجالس میں بیٹھ کر قیاس آرائیاں کرتے تھے، کہ قرآن کریم میں قیامت کو بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ اہل مکہ کے نزدیک وقوع قیامت ناممکنات میں سے تھا، اس لیے قیامت کے متعلق بحث و مباحثے شد و مد کے ساتھ جاری رہتے تھے۔

کچھ لوگ اس کی تصدیق کرتے تھے ، اور بعض لوگ اس کی تکذیب پر دلائل دیتے تھے ، اس لئے اس سورت کی ابتدا میں ان کی اس کیفیت و حالت کو بیان فرمایا، اور پھر اس کے وقوع پذیر ہونے کو بیان فرمایا، اور وہ لوگ اس کے آنے کی متعلق جو اشکالات رکھتے تھے ان کا جواب دیا۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ : کفار کی یہ بحث و مباحثے اور سوال و جواب اس کے واقعیت کو جاننے کی تحقیق کی صورت نہیں تھی، بلکہ یہ سب کچھ بطور استہزا و تمسخر کے تھا ، قرآن کریم نے اس کے جواب میں اس جملہ کو تاکیداً دوبارہ تکرار کے ذکر کیا۔

کَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٣﴾	ایسا نہیں ہے جس طرح کے مشرکین سمجھتے ہیں "عنقریب وہ جان لینگے" اس امر کی حقیقت کو (۴)
ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٥﴾	پھر بھی ایسا نہیں ہے ، "بہت جلد جان لینگے" (۵)

یعنی: اس کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے کہ قرآن یا قیامت کے بار میں اختلاف کریں، اس لیے کہ قرآن کریم اور اس دین مبین کے عقائد حق پر ہیں ؛ لہذا جو لوگ ان کا انکار کرتے ہیں بہت جلد اپنی تکذیب کا انجام دیکھ لینگے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عجیب و غریب چیزوں اور حیرت انگیز مظاہر کی تخلیق پر اپنی قدرت عظیم کے چند مظاہر کا ذکر کیا ہے، جو قیامت کے دن وغیرہ پر اس کی قدرت کی دلیل ہے، اور ان عجائب و مظاہر کو اللہ تعالیٰ اس طرح شمار کر کے بیان فرماتے ہیں۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهْدًا ﴿٦﴾	کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا؟ (۶)

مہاد: نیچے بچھانے والے گدے یا بچے کا پنگھوڑے اور جھولے کو کہتے ہیں ۔

وَالْجِبَالِ أَوْتَادًا ﴿٧﴾	اور پہاڑوں کو میخیں (۷)

پہاڑوں کو زمین کیلئے میخیں بنادیا ہے تاکہ آرام پکڑ لے اور نہ ہلے ، جیسے خیموں کو میخوں کے ذریعہ مضبوط کیا جاتا ہے،

وَحَلَقْنٰكُمْ أَرْوَاجًا ﴿٨﴾	اور تم کو ہم نے جوڑے بنایا (۸)

عورت کو دانا حساس طبیعت اور بہت زیادہ مہربان بنایا تاکہ وہ تعلیم و تربیت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا سکے اور اس کو بام کمال تک پہنچا دے۔

خدائے عورت کو جو جمال الہی کا مظہر ہے پیدا کیا اور اسے آرام و سکون کا ہم پلہ قرار دیا، تاکہ گھر اور خاندان کے لوگوں کو اپنی ہمدردی و مہربانی کے سایہ میں لائے، کیونکہ مہربانی اور محبت زندگی کے بقا کا ذریعہ ہے۔

اور تمہاری نیند کو تمہارے آرام و راحت کا ذریعہ بنایا (۹)	وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝

طبیعی مسائل میں سے ایک مسئلہ نیند ہے، نیند انسانی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگر کسی بھی وجہ سے انسان کو نیند نہ آئے تو ممکن ہے اس کا ذہنی توازن خراب ہو جائے، ہر حالت میں انسان کو طبیعتی طور پر نیند کی اشد ضرورت ہے، بلکہ نیند کا نہ آنا انسان کے قلب کے رُک جانے اور موت واقع ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔

اسی لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان بھوک اور پیاس سے نہیں مرتا، لیکن بے خوابی کی وجہ سے مر سکتا ہے، اس وجہ سے رب تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت نیند ہے، بہترین نیند وہ ہے جو سکون والی جگہ میں آجائے، اور سونے کی جگہ میں روشنی کم سے کم ہو۔

اس لحاظ سے قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے رات دن کی گردش اور آنے جانے کو بیان کرتا ہے، کہ استراحت اور کامل آرام کا موقع انسان کو میسر آتا ہے، اور دن میں تلاش رزق و روزی اور کام کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

اور بنایا ہم نے رات کو اور ٹھنا	وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰

قرآن کریم نیند کی حقیقت کو جسم سے خروج روح انسانی سے تعبیر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ: (وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ) خداتعالیٰ وہ ذات ہے جو رات کو تمہیں موت دیتا ہے۔ (سورہ انعام آیہ: 60)

نیز فرماتا ہے: (اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۝ فِيمِصُّكَ الَّتِي قَطَعَتْ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝۴۲)

ترجمہ: خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحيں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں (انکی روحيں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم ہو چکا ہوتا ہے ان کو روک رکھتا ہے، اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے، جو لوگ فکر کرتے ہیں ان کے لئے اس میں نشانیاں ہیں (سورہ زمر آیہ: 42)۔

ان آیات میں اور بالخصوص آخری آیت میں موت کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، قرآن کے تجزیہ کے مطابق موت اور نیند ایک ہی چیز ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ موت اور نیند کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی جان مکمل طور پر انسانی جسم سے باہر نکل جائے، اس لحاظ سے نیند کی حالت میں بدن اور روح کے درمیان جو تعلق ہے وہ بھی کسی حد تک ختم ہو جاتا ہے، اور موت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جان کو جسم سے نکال کر دوسری جگہ لے جاتا ہے، جو کہ انسانی جسم سے باہر اور ایسی جگہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے پاس کا نام دیتا ہے، البتہ موت اور نیند کے درمیان فرق یہ ہے کہ موت کی حالت میں جان اور جسم کا رابطہ مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے، ہر قسم کا تعلق و رابطہ بدن اور روح کے درمیان میں سے حذف ہو جاتا ہے۔

اس حالت میں انسان کے بدن و جان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، اور جب روح انسانی جسم سے الگ ہو جاتی ہے، تو دوبارہ پلٹنے کی اجازت نہیں پاتی، جہاں گئی ہے وہاں پر اس کی نگرانی ہوگی لیکن نیند اس طرح ہے کہ یہ رابطہ دوبارہ مکمل طور پر بحال ہو جاتا ہے، اور جان کو بدن کی طرف بھیجا جاتا ہے، تا کہ انسانی حیات کی سرگرمیوں کی رہنمائی کرتی رہے۔

قرآن کریم ہر نیند کو موت کہتا ہے کیونکہ اس میں روح قبض ہوتی ہے، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ موت کی حالت میں روح کی نگرانی ہوتی ہے، لیکن نیند میں روح کو واپس کیا جاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت تک جسم کی رہنمائی کرے۔

اس اعتبار سے نیند کی حقیقت کو موت کی طرح روح کا بدن سے خارج ہونا کھاجا سکتا ہے، اس مناسبت سے نیند ایسی موت ہے جس کا دوام نہیں ہوتا، اور روح کے جسم میں دوبارہ آنے سے آدمی بیدار ہو جاتا ہے۔

اس وجہ سے جاگ جانا روح کا بدن کی طرف دوبارہ واپسی ہے، جو بندہ

نیند میں ہو وہ کسی قسم کا اختیار اور تسلط اپنے جسم پر نہیں رکھتا، اور روح اور جسم میں وہ رابطہ و تعلق نہیں رکھتا، جو بیداری کی حالت میں ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ روح اور جسم کے درمیان تعلق اندرونی نہیں، بلکہ بیرونی ہے، یعنی جسم اور روح دو الگ الگ حیثیت رکھتی ہے، جیسے کوئی شخص باہر سے کسی چیز یا جسم کی رہنمائی کرے۔

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱	اور بنایا ہم نے دن کو معیشت کے واسطے

دن قرآن کریم میں ان اہم ترین مواضع میں سے ہے جس پر پروردگار با عظمت نے دو سورتوں میں قسم کھائی ہے۔

1- سورة الشمس کی آیت "3" وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى ۝۳ قسم ہے دن کی جب اس جہاں کو روشن کر دے۔

2- سورة الليل کی آیت "۲" میں (وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى ۝۲) قسم ہے دن کی جب اپنے ظہور سے دنیا میں اجالا کر دے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ نور اور روشنی پر ربّ تعالیٰ کی قسم کھانے کا مقصد انسان کو اس کے بے شمار اور اہم فوائد کی طرف متوجہ کرنا ہے، تاکہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور اس روشنی کے قدر کریں۔

دن پر قسم کھانا یہ بتاتا ہے کہ دن میں رب تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں، اگر ہمیشہ اندھیرا ہوتا تو خدا تعالیٰ کی مخلوق کیلئے رزق کی تلاش میں مشغول رہنا مشکل ہو جاتا، اگر ہمیشہ دن ہوتا تو پھر آرام و سکون اور راحت سے محروم ہو جاتے، اس لئے دو سورتوں (الیل والشمس)

میں دن رات کے موضوعات تکرار کے ساتھ مذکور ہوئے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکمت کے لحاظ سے ان دونوں کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

رب تعالیٰ کا قسم کھانا قرآن مجید کے بیان کردہ اہم موضوعات میں ہے۔

سورہ (الشمس اور اللیل) اس کے متعلق تفصیلی بحث ہوتی ہے، یہاں میں مختصرًا عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جو سورتیں قرآن عظیم الشان میں قسم سے شروع ہوئی ہیں ان کی اپنی ایک

حیثیت ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ نے قسم کیوں کھائی ہے؟ اور یہ کہ طبیعی اشیاء کی قسمیں کیوں کھائی ہیں؟

ہم جب رب تعالیٰ کی قسم کھاتے ہیں، کہتے ہیں کہ قسم ہے خدا کی، تو ہمارا مقصد کسی یقین دلانا ہوتا ہے، مگر تو خدا جل جلالہ کیوں قسم کھاتا ہے؟ رب کو تو قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

مفسرین اس کی وجہ لکھتے ہیں کہ قسم والے الفاظ اکثر و بیشتر مکی سورتوں میں نازل ہوئے ہیں، یہ سورتیں ایسی فضاء میں نازل ہوئی ہیں کہ قرآن کریم جن افراد سے مقابل و مخاطب ہے وہ لوگ قرآن کا انکار کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ کلام الہی نہیں ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر نہیں ہے، اس لیے کہ رب تعالیٰ بشر سے اپنا رابطہ نہیں جوڑتا، انسان اس وقت قسم کھاتا ہے جب منکر آدمی سے سامنا ہو جائے، ورنہ تو ہمیں قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، ہم ایسے ہی اپنی بات کر لیتے ہیں قسم نہیں کھاتے، ہم اس وقت قسم کھاتے ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ سامنے والا بندہ ہماری بات پر یقین نہیں رکھتا، یا ہماری بات کا انکار کرتا ہے، یا یہ کہ ہماری بات کو سیرے سے اہمیت ہی نہیں دیتا، تو قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اترا ہے ہماری عقل و افکار کی حد تک، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام عظیم مخاطبین کی سمجھ بوجھ کی سطح کے مطابق اتارا، اس لئے قرآن کریم چاہتا ہے کہ اپنے مخاطبین سے رابطہ برقرار رکھے، اور انہیں اپنے زیر اثر رکھے، اور ان کے انکار و استبعاد جو کہ وہ کہتے ہیں خدا بشر سے رابطہ نہیں جوڑتا ختم کر دے، اس وجہ سے خدا تعالیٰ قسم کھا تا ہے، قرآن کریم میں رب تعالیٰ کے قسم کھانے کی وجوہات یہی ہیں۔

اور بنائے ہم نے تمہارے اوپر ساتھ مضبوط آسمان (جو کہ اپنی خلقت و پیدائش کے اعتبار سے بہت مضبوط ہیں)	وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲
اور بنایا ہم نے ایک چراغ چمکتا ہوا (اس سے مراد سورج ہے)	وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝۱۳
اور اتارا ہم نے نچڑنے والے بادل سے پانی کا ریلا	وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجًّا ۝۱۴

معصرات: ایسے بادل ہیں جو پانی میں ڈبوئے ہوئے ہوں لیکن اب تک نہ برسے ہوں ثجاج: جوزیادہ بہ گیاہو۔

بادل کا ذکر قرآن میں

قرآن عظیم الشان نے بادل کے لیے مختلف الفاظ ذکر کیے ہیں جن میں چند حسب ذیل ہیں:

1- سحب: "سحب" سے کھینچنے کے معنی میں ہے، بادل کو سحب کہتے ہیں، اس لئے کہ آسمان میں ہوا کے ذریعہ اسے کھینچا جاتا ہے، یا اس وجہ سے کہ پانی کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے لیجاتا ہے، سحب بادل کا مطلق نام ہے، برسنے والا بادل ہویا نہ برسنے والا (مفردات ص: 399 سَحَب) یہ لفظ (9) نو مرتبہ قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے، (سورة البقرة آیت: 164) (سورة الاعراف آیت: 57)، (سورة رعد آیت: 12)، (سورة نور آیت: 40) (سورة نمل آیت: 88)، (سورة روم آیت: 48)، (سورة فاطر آیت: 44)۔

2- غمام: غم سے بے کسی چیز کو ڈھانپنے کے معنی میں ہے، بادل کو غمام اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سورج کی روشنی اور آسمان کو ڈھانپ لیتا ہے، (مفردات ص: 613) "غم" یہ کلمہ قرآن کریم میں چار مرتبہ آیا ہے، (سورة بقرہ آیات: 57 و 210)، (اعراف: 160)، (فرقان آیت: 25)۔

3- عارض: عرض سے ہے کسی چیز کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں، اس لئے بادل کو عارض کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کی نظروں کے سامنے ظاہر و آشکار ہوتا ہے، یہ کلمہ دو جگہ آیا ہے سورة احقاف میں آیت: 24 - 46)۔

4- ظلہ: "ظل" سے ہے سایہ کا معنی دیتا ہے، اور سایہ رکھنے والے بادلوں کو کہا جاتا ہے، (مفردات صفحہ: 536)۔

"ظل" قرآن کریم میں یہ لفظ عذاب لانے والے بادلوں کیلئے استعمال ہوا ہے، یہ لفظ دوبار مفرد کے طور پر آیا ہے، (سورة اعراف آیت: 171)، (سورة شعراء: 189)، اور ایک بار جمع کے طور پر سورة بقرہ کی (آیت: 210) میں آیا ہے۔

5- حاملات: حمل سے ہے بادل کو حاملات اس لئے کہا جاتا ہے کہ اپنے ساتھ پانی اٹھا تاہے، (مفردات ص: 257) حمل: یہ لفظ ایک بار سورة ذاریات آیت: 51 میں آیا ہے۔

6- معصرات: عصر سے بمعنی نچوڑنے کے ہے، (التحقیق، ج-8 ص: 146 عصر)

اس سے مراد بارش والے بادل ہیں، ان بادلوں کو معصرات کہنے کے وجہ

یہ ہے کہ بارش برسنے کے دوران ہوا ان بادلوں کو نچوڑتی ہے، بعض لوگوں کے رائے کے مطابق مُعصر اعصار سے ہے، جو کہ طوفان کے معنی میں ہے، اور ان بادلوں کو کھاجاتا ہے جو طوفان کے ساتھ آجائیں، (مفردات ص: 569) عصر پانی کے بڑے بڑے قطروں اور موسلا دھار بارش کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور "تَجَّاجًا" والی صفت (فراوان اور پے درپے کے معنی میں ہے) یہ صفت قرآن کریم نے اس قسم کی بارشوں کیلئے استعمال کی ہے کہ جن کو اس طرح بادل لے آتے ہیں، یہ لفظ ایک ہی بار ذکر ہوا ہے، آیت (14) سورہ نبأ)۔

7- مزن: چمکدار، روشن اور پانی والے بادل کو کہتے ہیں، مفردات ص: 766 (مزن)۔

(القاموس المحيط جلد 2- ص: 1621 مزن) یہ کلمہ صرف ایک بار سورہ واقعہ آیت: 69 ذکر ہوا ہے۔

8- صَوْب: اس کا معنی گرنا ہے، بادل کے علاوہ بارش پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، (مقاییس جلد 3 صفحہ: 317 صوب)۔

بعض نے اس کو بارش والے بادل کہا ہے، یہ لفظ ایک بار سورہ بقرہ آیت: 19 میں ذکر ہوا ہے۔

9- سماء: "سمو" سے ہے رفعت وبلندی کے معنی میں ہے یعنی ہرچیز سے اوپر، اس کا اطلاق ان بادلوں پر ہوتا ہے، جو انسان پر سایہ کرتا ہے، (الصاحح، جلد 6، صفحہ 2382 سمو)۔

بعض اس کا اطلاق بادل پر مجازاً کرتے ہیں اور بعض حقیقی طور پر (مقاییس ج 3 ص: 98) "سمو" بعض کے مطابق آسمان مقصود ہے، سورہ بقرہ کی (آیت: 22) میں اس کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔

لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝	تاکہ نکالیں ہم اس سے اناج اور سبزہ

یعنی: اس بادل سے بہنے والے پانی کے ذریعے ہم نے زمین سے ایسے اناج اگائے جو تمہارے لئے قوت اور غذا ہے، جیسے: گندم، جو وغیرہ، نبات: اس سے مراد چوپایوں کا چارہ، اور سارے کھائے جانے والے پودے ہیں۔

وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝	(تاکہ ہم اگائے اس جاری پانی کے ذریعے) باغات لپٹے ہوئے اور گھنے (16)

بیشک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت
ہے (17)

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝۱۷

یعنی : فیصلے اور حساب و کتاب کا دن ، اس سے مراد قیامت کا مؤقت و معین دن ہے ، کہ صور پھونکے جانے کے بعد دنیا اپنی انتہا کو پہنچے گی ، دوسرے آیتوں سے یوں معلوم ہوتا ہے صور دومرتبہ پھونکا جائیگا۔

پہلے نفخہ سے سارا عالم فنا ہو جائیگا ، اور دوسرے نفخہ سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا، جب کہ دوسری نفخہ پھونکے جانے کے بعد تمام لوگ اور اس دنیا کے گذری ہوئی تمام چیزیں ٹولियों کی شکل میں اللہ کے حضور دست بستہ حاضر ہوں گی۔

جس دن پھونکا جائے صور میں پھر
تم آؤ گے فوج در فوج

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ۝۱۸

صور: ایک نرسنگھا ہے ، جو اسرافیل علیہ السلام کے ذریعہ پھونکا جائیگا، اور اس میں خوفناک آواز ہوگی، (پھر تم آؤ گے فوج در فوج) یعنی : سب جماعت جماعت اور ٹولियों کے شکل میں ہر اُمت اپنے پیغمبر کے ساتھ قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں حساب و کتاب کیلئے جمع ہو جائے گی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ : قیامت کے دن لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے ، ایک گروہ بھرے پیٹ کے ساتھ لباس میں ملبوس اپنے سوار یوں میں سوار ہو کر میدان حشر میں آئے گا، جب کہ دوسرا گروہ پیدل چل کر میدان حشر میں حاضر ہوگا۔

تیسرا گروہ چہرے کے بل کھنچتے ہوئے میدان حشر میں حاضر کیا جائے گا (مظہری نے نسائی اور حاکم و بیہقی کے حوالے سے روایت ذکر کی ہے)۔

بعض روایات میں "افواج" کی تشریح دس گروہوں سے کی گئی ہے یعنی دس قسم کے گروہوں کے ، بعض نے کہا ہے کہ حاضرین میدان حشر میں اپنے اعمال و کردار کے اعتبار سے بے شمار گروہوں میں تقسیم ہونگے ، ان اقوال میں کسی بھی قسم کا کوئی تضاد نہیں پایا جاتا ہے ، سب میں تطبیق دی جاسکتی ہے۔

اور کھولا جائیگا آسمان اور ہونگے اس میں
بے شمار دروازے (19)

وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝۱۹

اور چلائے جائیں گے پہاڑ اور ہو جائیں گے
چمکتے ہوئے ریت کی طرح

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝۲۰

یعنی: پہاڑ اپنی جگہ سے چلائے جائیں گے ہوا میں، حالانکہ وہ میخ کی طرح مضبوط تھے، اکھاڑے جائیں گے اور ہوا میں اڑائے جائیں گے غبار کی طرح کہ دیکھنے والا یہ گمان کریگا کہ وہ پہاڑ ہے، حالانکہ وہ پہاڑ نہیں ہوں گے محض غبار ہوں گے۔

بیشک جہنم ایک گہات ہے

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۱

یہاں جہنم سے مراد جسر جہنم ہے، یعنی: پُل صراط، وہاں ثواب و عذاب کے فرشتوں کے دو گروہ انتظار میں ہوں گے، عذاب کے فرشتے جہنم والوں کو پکڑ لیں گے، اور ثواب والے فرشتے بہشت والوں کو اپنے مقام پر پہنچائیں گے، (مظہری)۔

حسن بصری نے کہا ہے کہ: جہنم کے اس پل کے نگرانی پر مقرر فرشتے، جس آدمی کے ہاتھ میں جنت میں جانے پروانہ ہوگا، اس کو جانے دینگے، اور جس کے ہاتھ میں یہ اجازت نامہ نہ ہو تو اسے روک لینگے، (مظہری)۔

سرکشوں اور شیر پروں کے لیے
ٹھکانہ ہے (22)

لِّلظَّالِمِينَ مَا بَأْسًا ۝۲۲

رہینگے اس میں صدیاں

لِّلَّذِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝۲۳

باغی اور سرکش لوگ اپنی بغاوت و سرکشی کے انجام سے بے خبر لا پرواہی سے آگے چلیں گے، وہ نہیں جانتے ہوں گے کہ دوزخ چند قدم آگے ان کے گہات میں ہے، جس میں صدیوں تک یہ لوگ رہیں گے، یہ چند دن کی قیام گاہ نہیں ہے، یہ اس وقت سے مطابقت رکھتا ہے کہ اگر ظالم عناصر کو دنیا میں رہنے دیا جائے تو وہ اس میں اپنی سرکشی سے باز نہیں آئیں گے، انہوں نے ہمیشہ سرکشی میں رہنے کا تہیہ کر رکھا ہے، اب انہیں جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے۔

نہ چکھیں گے اس میں مزہ ٹھنڈک کا اور نہ
پینے کو کچھ ملے (24)

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝۲۴

مگر گرم پانی اور بہتا پیپ

إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ۝۲۵

حمیم: گرم کھولتا ہوا گندہ پانی، اور غساق جہنمیوں کے زخموں سے بھنے والے پیپ کو کہتے ہیں۔

جَزَاءٌ وَّفَاقًا ۝۲۶	بدلہ ہے ان کا پورا پورا

یعنی : ان کا عذاب ان کے اعمال و کردار کے موافق و مناسبت سے ہوگا، جیسے کہ شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے تو آگ سے بڑا عذاب بھی کوئی نہیں، جیسے ان کے گناہ ویسے ہی اللہ تعالیٰ ان کے موافق ان کو عذاب چکھائیگا۔

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۝۲۷	وہی تھے جو کسی حساب و کتاب کی توقع نہیں رکھتے تھے (27)
وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ۝۲۸	اور ہماری آیتوں کو سخت جھٹلاتے تھے (28)

یعنی : وہ قرآنی آیات کو اور ان دلائل و براہین کو جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ اپنے بندوں پر نازل کیے تھے انہیں شدت سے جھٹلاتے تھے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۝۲۹	ہر چیز کو ہم نے لکھ کر گن رکھا ہے (29)

یعنی : ہر چیز کو ہم نے لوح محفوظ میں گن کر لکھ رکھا ہے، تاکہ فرشتے اسے پہچانیں، یا اس سے مراد بندوں کے اعمال ہیں جنہیں فرشتوں نے لکھا ہے۔

فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۝۳۰	اب چکھو ہم نہیں بڑھائینگے تم پر مگر عذاب (30)
إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝۳۱	بیشک پرہیزگاروں کیلئے کامیابی ہے (31)

مفاز: مراد پانا، کامیابی اور دوزخ کی آگ سے نجات ہے، یا مراد گھومنے پھرنے کی جگہ ہے۔

ابن کثیر نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے، اس لیے کہ اس کے بعد رب تعالیٰ فرماتے ہیں:

حَدَّائِقٍ وَأَعْنَابًا ۝۳۲	باغیچے اور انگور ہیں (جو پھلدار اور ثمر آور ہیں) (32)
وَكَوَاعِبِ أَثْرَابًا ۝۳۳	اور جوان عورتیں ایک ہی عمر کی سب (33)
وَكَأْسًا دِهَاقًا ۝۳۴	اور پیالے چھلکتے ہوئے لبریز (34)
لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذْبًا ۝۳۵	نہ سنیں گے وہاں بیہودہ اور جھوٹی باتیں (35)
جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا ۝۳۶	نیک جزا ان کو تیرے رب کے طرف سے کفایت کرنے والا (36)
رَّبِّ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَنُ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۝۳۷	جورب ہے آسمان و زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیاں ہے، بڑی رحمت والا، قدرت نہیں رکھتا کوئی اس سے بات کرنے کی (37)
يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۝۳۸ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝۳۹	جس دن کھڑی ہوگی روح اور فرشتے صف باندھ کر، اور بات نہیں کر سکیں گے کوئی، مگر جس کو اجازت دے رحمان، اور وہ ٹھیک بات کہے (38)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: روح وہ فرشتہ ہے جو اپنی پیدائش کے لحاظ سے سب سے بڑے فرشتوں میں شمار ہوتا ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ روح زمین و آسمانوں سے بڑا فرشتہ ہے۔

نسفی کہتے ہیں: کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ: وہ جبرئیل علیہ السلام ہے۔

ایک قول کے مطابق: روح خدا کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے فرشتہ نہیں ہے۔

دوسرے قول کے مطابق: وہ بنی آدم کی ارواح ہیں جو صف باندھ کر کھڑی ہوتی ہیں، اور فرشتے دوسرے صف میں، یہ عمل اسرافیل علیہ السلام کے دو پھونکوں کے درمیان ارواح کو جسد کی طرف لوٹائے جانے سے قبل وقوع پذیر ہوگا۔

یہ وہی سچا دن ہے ، پھر جو چاہے بنالے اپنے رب کے پاس ٹھکانہ (39)	ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۝ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا ۝۴۹
ہم نے خبر سنادی تم کو ایک عذاب سے نزدیک آنیوالے ، جس دن آدمی دیکھ لیگا جو آگے بھیجا ہے اس کے دونوں ہاتھوں نے اور کھینچا کافر کاش میں مٹی ہوتا (40)	إِنَّا أَنْزَلْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا ۝ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكُفْرُ يَلَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا ۝۵۰

ابن کثیر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ چوپایوں کو بدلہ لینے کیلئے زندہ کریگا، جب ایک دوسرے سے بدلہ لے لینگے دوبارہ ان کو مٹی میں تبدیل کر دیا جائیگا ، یہ وہ وقت ہوگا کہ کافر بھی ان کی حالت کی سی تمنا و آرزو کرینگے ، جیسا کہ آیت بالا میں مذکور ہوا۔

کفار و مجرمین جس وقت قیامت کا منظر دیکھیں گے اور رب تعالیٰ کی عدالت اور اپنی جزائے اعمال کا مشاہدہ کریں گے تو وہ اپنے ان اعمال کے برعکس اعمال کی آرزو کریں گے اور اپنے اعمال پر افسوس و ندامت کا اظہار کریں گے ، اور اس شدت حسرت میں کبھی کہیں گے : افسوس ہماری حالت پر کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی کی تھی۔

اور کبھی کہیں گے : بار الہا! ہمیں دنیا میں واپس بھیج دو تاکہ ہم نیک اعمال انجام دیں۔

اور کبھی کہیں گے: کاش ہم مٹی ہوتے کبھی بھی زندہ نہ ہوتے۔

اس بڑے دن میں نیک اور صالح لوگوں کا سب سے بہترین بدلہ یہی ہے کہ ان کے اعمال مجسم ان کے ساتھ ہونگے، جی ہاں : انسان اشرف مخلوقات ہے ، مگر کافر انسان گناہوں کی وجہ سے اس حالت تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ یہ تمنا کریگا کہ کاش میں کسی بے روح اور کمتر درجے والی موجودات کی صف میں شامل ہوتا۔

دوزخ والوں کا المناک عذاب

آگ کا عذاب بہت سخت اور ہولناک ہے، جہنم کی آگ کا عذاب ایسا ہے کہ انسان اس سے نجات پانے کیلئے اپنا بہترین سرمایہ بطور فدیہ دینا چاہے گا:

(إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَى بِهِ ۚ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝٩١) (سورة آل عمران : 91)۔

ترجمہ: (وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اور اسی کفر کی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں، اگر زمین بھر سونا ہوتا، جسے وہ فدیہ کے طور پر دے دیں، (اور خود کو چھڑالیں) تو ہرگز ان سے یہ فدیہ قبول نہیں کیا جائیگا، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اور کوئی مددگار نہیں ہے ان کے لیے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: (إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝٣٦) (سورة المائدة: 36)۔

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اگر ہو ان کے پاس جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اور اس کے برابر اور بھی ہو جو بدلہ میں دے دیں عذاب قیامت سے بچنے کیلئے ان سے قبول نہیں کیا جائیگا، اور ان کے واسطے دردناک عذاب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "يُوتَىٰ بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ: يَا ابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ هَلْ مَرَّبِكَ نَعِيمٌ قَطُّ فَيَقُولُ لَا وَاللَّهِ يَا رَبِّ" (صحیح مسلم بحوالہ مشكاة المصابيح: 3-102)

جہنمیوں میں سے ایک شخص کو لایا جائیگا، جسے دنیا میں بہت زیادہ نعمتیں دی گئی تھیں، اور اسے ایک لمحے کے لیے جہنم میں غوطہ دیا جائے گا، اور پھر پوچھا جائے گا اے ابن آدم! کیا تم نے کبھی کوئی اچھی چیز دیکھی تھی (دنیا میں) کیا تمہیں کوئی نعمت ملی تھی؟ وہ کہے گا نہیں اللہ کی قسم میرے رب (کبھی دنیا میں نعمت دیکھی ہی نہیں تھی)

یہ وہ مختصر سی حالت ہے جس کے مشاہدہ کے بعد کفار دنیا کی تمام لذتوں اور خوشیوں کو بھلا دیں گے، اور بخاری و مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ لِأَهْلِ النَّارِ عَذَابًا لَوْ أَنَّ لَكَ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ كُنْتَ تَفْتَدِي بِهِ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: فَقَدْ سَأَلْتُكَ مَا هُوَ أَهْوَنُ مِنْ هَذَا وَأَنْتَ فِي صَلْبِ آدَمَ أَنْ لَا تُشْرِكَ بِي فَأَبَيْتَ إِلَّا الشِّرْكَ) (بخاری کتاب الرقاق: باب صفة الجنة)

والنار، فتح الباری : 22- 416). (مشكاة المصابيح : 3- 102).

اللہ تعالیٰ سب سے کم عذاب والے جہنمی سے پوچھے گا کہ زمین میں جو کچھ ہے اگر یہ سب تیرے پاس ہوتا تو اسے توفدیہ میں دیتا؟ وہ کہے گا ہاں ، رب تعالیٰ فرمائیں گے: اس سے کم کا میں نے تم سے کھا تھا، جب کہ تم اپنے باب آدم علیہ السلام پشت میں تھے ، میں نے چاہا کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ، لیکن تم نے میرے ساتھ شریک ٹھہرایا۔

آگ کی شدت اور خوف انسان کو جہنم کے عذاب سے بچنے کیلئے اپنے تمام دوستوں اور رشتوں کو قربان کرنے کیلئے تیار کر لیتا ہے۔

يُبْصِرُ وَيَصْغُرُ لَهُمُ ۝ يَوْمَ الْمُجْرِمِ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بَنِي ۝ (حالانکہ) ایک دوسرے کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے ، (اس روز) گنہگار خواہش کریگا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دیدے (یعنی) اپنے بیٹے) ۔

(وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيَّةُ ۝ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی۔

وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤَيِّسُ ۝) اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا۔

وَمَنْ فِي الْأَرْضِ بِمَجِيئِهِ ۝ ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝ اور جتنے آدمی زمین میں ہیں (غرض) سب (کچھ دیدے) اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑالے ۔

كَلَّا ۝ إِنَّهَا لَظَى ۝ (لیکن) ایسا ہرگز نہ ہوگا وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

رَّاعَةً لِّلشَّوْءِ ۝ (کھال ادھیڑ دانے والی) (سورة المعارج : 11-16)۔

ایک گنہگار شخص کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ اس دن کے عذاب سے نجات کیلئے کاش اپنے بیٹوں کو بدلہ میں دیدے: اسی طرح اپنی بیوی اور بھائی کو بھی، نیز اپنے رشتہ داروں اور قبیلہ اور خاندان کے لوگوں کو بھی فدیہ کے طور دیدے جنہوں نے اسے پناہ دی ، حتیٰ کہ تمام لوگوں کو جو زمین میں رہتے ہیں، (سب کو قربان کر دے) اور اسے نجات مل جائے ہرگز نہیں: (یہ تمناؤں اور خواہشیں کبھی بھی پوری نہیں کی جائیں گی ، اور کوئی فدیہ و قربانی قبول نہیں کی جائیگی) ۔

یہ شعلوں سے بھری ہوئی آگ جہنم ہے ، یہ جسم سے جلد کو چھیل دیتی ہے ،

اور اسے دور کر دیتی ہے، جی ہاں ، یہ ہولناک اور بے درپے عذاب ان گنہگاروں کی زندگیوں کو ہمیشہ کے لیے اور بغیر کسی وقفہ کے تلخ اور بے سکوں وبے آرام بنادے گا۔

چھ دن میں کائنات کی تخلیق

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ قرآن کریم کی آیات میں مذکور چھ دن میں کائنات کی تخلیق سے کیا مراد ہے؟

یہ بحث قرآن کریم کی سات آیات میں آئی ہے، لیکن تین جگہ آسمان وزمین کے علاوہ (ومابینہما) کا بھی اضافہ ہوا ہے، کہ حقیقت میں یہ پہلے جملے کی وضاحت ہے، اس لیے کہ یہ سب آسمان وزمین والی اس معنی میں شامل ہیں۔ کیونکہ آسمان میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو کہ بلندیوں میں، اور زمین میں اس کے مقابل میں نچلی والی اشیاء شامل ہیں۔

لفظ "یوم" کے مفہوم پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، دیگر زبانوں میں اس کے متبادل جو لفظ آتے ہیں، وہ تو معلوم ہیں (کہ اس کا معنی دن یا دن رات کا کیا جاتا ہے) مگر اکثر اس کا استعمال ایک دور کے لیے ہوتا ہے چاہے یہ دور ایک سال کا ہو یا ایک صدی کا، یا ہزاروں لاکھوں سال کا، قرآن مجید سے یہ بات ثابت ہے کہ لفظ یوم اور ایام صرف دن رات کے لیے استعمال نہیں ہوتے، مثلاً قیامت کے لیے لفظ "یوم القيامة" آیا ہے، حالانکہ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ قیامت ایک طویل مدت ہوگی، مگر اسے یوم القيامة، قیامت کا دن کہا گیا ہے، جبکہ قرآن سے ہی ثابت ہے کہ روز قیامت جہاں اعمال کا حساب کتاب ہوگا وہ پچاس ہزار سال طویل دن ہوگا، لغت میں بھی کبھی لفظ یوم سورج کے طلوع وغروب کے درمیان کے دوران کو کہا گیا ہے، اور زمانے کو بھی کہا گیا ہے چاہے اس کی مدت کتنی بھی ہو۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو لگاتار چھ ادوار میں تخلیق کیا، حالانکہ یہ ادوار لاکھوں یا اربوں سال پر محیط تھیں، سورہ دخان کی آیت (9-12) کے مطابق یہ چھ ادوار درج ذیل ہیں۔

1- وہ دن جب پوری کائنات گیس کے ایک بڑے گولے کی شکل میں تھی جو گردش کرتی ہوئی اپنے مدار سے خود کبھی الگ ہوئی اور دیگر کروں کو بھی تشکیل دیدی۔

2- یہ کرے رفتہ رفتہ مائع چیز کی شکل اور چمکدار یا ٹھنڈی اور رہنے کے قابل بنتے گئے۔

3- ایک اور دور میں نظام شمسی تشکیل پا گیا، اور زمین سورج سے الگ ہو گئی۔

4- دوسرے دور میں زمین ٹھنڈی اور زندگی کیلئے تیار ہو گئی۔

5- اس کے بعد زمین میں گھاس اور درخت نمودار ہو گئے۔

6- آخر کار کہ جب زمین پر حیوان اور انسان نمودار ہو گئے۔

البتہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک لمحے میں کیوں نہیں بنایا، اس کے باوجود کہ اپنی بے انتہا قدرت کے ساتھ زمین و آسمان کو ایک لمحے میں بنا سکتا تھا، پھر کیوں ان دونوں کو طویل ادوار میں بنایا؟

ایک اہم نکتہ اس سوال کے جواب میں یہ ہے کہ اگر تخلیق اس دنیا کی ایک لمحے میں ہوتی تو خالق کی عظمت و علم و قدرت کی حکایت پر کم دلالت کرتی، لیکن جب مختلف مرحلوں میں، اور طرح طرح کی چیزوں اور انسانی چہروں اور حیوانات کی شکلوں کو باقاعدہ اور حسابی منصوبوں کے مطابق انجام دیا تو یہ بہت واضح اور روشن دلیل ہوگی خالق کے پہچانے کی۔

مثلاً اگر انسان کا نطفہ ایک لمحے میں ایک مکمل نوزائیدہ بچہ بن جاتا ہے، تو یہ خلقت عظمت کو اس حد تک نمایاں نہیں کر سکتی جیسا ہونا چاہیئے تھا، لیکن جب نو (9) مہینے میں ہر دن ایک مرحلے اور ہر مہینہ مختلف اشکال میں ظاہر ہوتا جاتا ہے تو یہ جتنے مراحل سے گذرتا ہے اسی حساب سے خالق کی تخلیق کے عظیم اور تازہ نشانیاں نمایاں کرتا رہتا ہے۔

در اصل اس دنیا کی تخلیق مرحلہ وار ہوئی ہے، یہ مرحلہ وار قانون عقلی و طبیعی قانون کے قدم بہ قدم مطابق اور یکساں ہے، اور عقلاء نے بھی اس قانون کو قبول اور پسند کیا ہے، البتہ اس بحث اور تحقیق کے دروازے اسی طرح کھلے ہیں، اس کے متعلق تحقیق کے دروازے بند نہیں ہوئے۔

بہ ہر صورت دنیا کی تخلیق اور فطرت کو چاہیئے کہ طبیعی قانون کے ساتھ یکساں ہو، اگرچہ خدا تعالیٰ کی قدرت و ارادہ "کن فیکون" کا ہے، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، یہ کہ رب تعالیٰ بھی "کن فیکون" رہے، اور

دنیا کی تخلیق بھی طبعی و عقلی قانون کے ساتھ قدم بقدم مطابق اور یکساں رہے۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)
سورة النازعات

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور (۴۶) آیتوں پر مشتمل ہے

مختصر معلومات:

سورة النازعات مکی سوتوں میں سے ہے، اس سورت کو "ساہرہ" بھی کہاجاتا ہے۔

یہ سورۃ النبأ کے بعد اور سورۃ الانشقاق سے پہلے نازل ہوئی ہے ۔
سخاوی رحمہ اللہ اس سورت کے متعلق کہتے ہیں : اس سورت کے دو رکوع
(۴۶) آیتیں ، (۱۸۱) الفاظ ، (۷۹۱) حروف ، اور (۳۴۰) نقطے ہیں۔
اسباب نزول

آیت "12" کا سبب نزول:

سعید بن منصور نے محمد بن کعب سے روایت کیا ہے: جب رب تعالیٰ نے (يَقُولُونَ اِنَّ الْمَرْءَ لَمُذْنُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝۱۰) آیت "10" نازل فرمائی تو کفار قریش نے کہا: اگر مرنے کی بعد دوبارہ زندہ ہو گئے تو ہم سراسر خسارے میں ہونگے ، ان کے اس قول کی بعد یہ آیت نازل ہوئی: (قَالُوْا تِلْكَ اِذَا كُرِهَتْ خَاسِرَةٌ ۝۱۲)۔

اسباب نزول آیت "42 تا 44:

حاکم اور ابن جریر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی بارے میں کافی زیادہ سوال کیا جاتا تھا ، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں : (يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا أُنْذِرُكُم بِذِكْرِهَا ۖ وَإِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَىٰهَا ۝۲۴) اس کے بعد ان کے سوالات کا خاتمہ ہوا۔

ابن ابی حاتم جو بیر کے توسط سے ضحاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ مکے کے مشرکین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استہزاء اور تمسخر کے طور پر پوچھتے تھے کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ پھر آیت (يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ) سے سورت کے آخر تک آیات نازل ہوئیں۔

طبرانی اور ابن جریر طارق بن شہاب سے روایت کرتے ہیں : رسول صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کو بہت یاد کرتے تھے ، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ،

(فِيمَا أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا) (إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَىٰ) نیز ابن ابی حاتم نے عروۃ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

وجہ تسمیہ :

اس سورت کا آغاز رب تعالیٰ کا (النازعات) پر قسم کھانے سے ہوا ہے، جس سے مراد بنی آدم کے ارواح قبض کرنے والے فرشتے ہیں، جس کی مناسبت سے "النازعات" رکھا گیا ہے۔
اس سورت کا دوسرا نام "الساہرہ" یعنی (محشر کی زمین) ہے، جس کا بیان آیت "14" میں آیا ہے۔

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَاللُّزْجَاتِ عُرْقًا ۝۱	قسم ہے ان فرشتوں کی جو (کافر) بندوں کی ارواح سختی کے ساتھ کھینچنے والے ہیں
وَالنَّشِطَاتِ نَشْطًا ۝۲	قسم ہے ان فرشتوں کی جو (مؤمن) بندوں کی جان نرمی و آسانی سے کھینچنے والے ہیں
وَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا ۝۳	قسم ہے تیرنے والے فرشتوں کی جو تیرتے ہیں
فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا ۝۴	پھر حکم بجالانے میں سبقت کرتے ہیں
فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا ۝۵	قسم ہے ان فرشتوں کے جو تمام امور کی تدبیر کرتے ہیں
يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝۶	جس دن کانپے گی کانپنے والی

یعنی: اس دن زلزلہ وقوع پذیر ہوگا۔

تَتَّبِعُهَا الرَّادِفَةُ ۝۷	اس کے پیچھے آئے گی پیچھے آنے والی

پہلے زلزلہ کے پیچھے دوسرا زلزلہ آئیگا، کہ سارے مردے زندہ ہوجائیں گے اور قیامت ومحشر کا آغاز ہوگا، اور ہمیشہ رہنے والی زندگی شروع ہوجائے گی۔

قُلُوبٌ يَّوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝۸	کتنے دل اس دن دھڑکتے اور پریشان ہونگے
أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹	ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہونگی
يَقُولُونَ إِنَّا لَنَرُّدُّوُنْ فِي الْحَا فِرَةِ ۝۱۰	کہتے ہیں: کیا ہم دوبارہ زندگی کی طرف لوٹائے جائیں گے
إِذَا كُنَّا عِظَامًا تَّخِرَّةً ۝۱۱	کیا جب ہم ہوچکے ہوں گے بوسیدہ ہڈیاں (دوسری زندگی کی طرف لوٹائے جائیں گے؟)
قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲	کہتے ہیں: یہ تو پھر سے آناہوگا نقصان کا
فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝۱۳ ﴿۱۳﴾	سوائے اس کے نہیں وہ تو ایک اونچی آواز ہے

(ان کا پلٹنا کوئی مشکل کام نہیں ہے) وہ تو صرف صور میں پھونکنے کی آواز اٹھے گی، اور ان کی واپسی انجام پائے گی۔

فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴	پھر اس وقت میدان حشر میں آ جمع ہونگے
هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ۝۱۵	کیا پہنچی ہے تجھ کو موسیٰ کے واقعے کی خبر؟
إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶	جب اس کے پروردگار نے اس کو طوی کی مقدس زمین پر پکارا (16)
إِذْ هَبَّ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝۱۷	(رب نے کہا) جافرعون کے پاس بیشک اس نے سرکشی کی ہے (17)
فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلَىٰ أَنْ تَزْلَمَ ۝۱۸	کہدو: کیا تو چاہتاہے جس چیز پر تم ہو اس سے نجات پا کر پاک ہو جاو
وَأَهْدِيكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ ۝۱۹	اور تجھ کو تیرے رب کے طرف راہ بتلاؤں تاکہ تجھے ڈر ہو (19)

پھر دکھلایا (موسیٰ نے) اس کو بڑا معجزہ	فَارَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ٢٠
پھر جھٹلایا اس نے اور نافرمانی کی (۲۱)	فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ ٢١
پھر پیٹھ پھیرا اور چلا (موسیٰ سے مقابلے کے لئے) تلاش کرتا ہوا (22)	ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَىٰ ٢٢
پھر (جادو گروں کو) جمع کیا اور لوگوں کو بلایا	فَحَشَرَ فَنَادَىٰ ٢٣
پھر کھا: میں ہوں رب تمہارا سب سے اونچا (۲۴)	فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ٢٤
پھر اسے اللہ نے دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار کیا (25)	فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْأَخْرِقَةِ وَالْأُولَىٰ ٢٥
اس (موسیٰ و فرعون کے واقعہ) میں درس عبرت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے (26)	إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ٢٦
تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا خدا نے اسکو بنایا؟ (27)	ءَاَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا ٢٧
اونچا کیا اس کی بلندی کو پھر اسکو برابر کیا (28)	رَفَعَ سَمَكَهَا فَسَوَّيْنَاهَا ٢٨
اور تاریک کردی اس کی رات اور روشن کر دیا اس کا دن (29)	وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ٢٩
اس کے بعد زمین کو (بیضوی شکل میں) صاف بچھادیا (۳۰)	وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ٣٠
باہر نکالا اس سے اس کا پانی اور چارہ (۳۱)	أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ٣١
اور پہاڑوں کو مضبوط کھڑا کیا (۳۲)	وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا ٣٢
تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدے کیلئے (۳۳)	مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ٣٣

(ہم نے ان سب کو ترتیب دیا ہے، اور ان کو فرمانبردار بنایا ہے)

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۝۳۳	جب آئے وہ بڑے حادثے کا دن (قیامت کی سخت اور ناقابل برداشت مصیبت) (۳۴)
يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ ۝۳۵	جس دن یاد کریگا انسان اپنی کوشش کو جو اس نے کی تھی (۳۵)
وَبُذِّبَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَرَىٰ ۝۳۶	اور دوزخ ظاہر کردی جائے گی دیکھنے والے کیلئے (۳۶)
فَأَمَّا مَنْ ظَلَمَ ۝۳۷	البتہ جس نے سرکشی و نافرمانی کی ہوگی (۳۷)
وَأَثَرُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۝۳۸	اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ہو (۳۸)
فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝۳۹	تو پھر دوزخ اس کا ٹھکانہ ہے (۳۹)
وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝۴۰	اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اپنے نفس کو خواہشات سے (۴۰)
فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝۴۱	یقیناً بہشت ہی اس کا ٹھکانہ ہے (۴۱)
يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۝۴۲	تجھ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کب واقع ہوگی (۴۲)
فِيمَا أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا ۝۴۳	تجھ کو کیا خبر اس سے؟ (۴۳)
إِلَىٰ رَبِّكَ مُنتَهَاهَا ۝۴۴	قیامت کے واقع ہونے کے وقت کی خبر تیرے رب کے پاس ہے (۴۴)
إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَخْشَاهَا ۝۴۵	تم تو ڈرانے والے ہو اس کو جو اس سے ڈرتا ہے (۴۵)
كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا ۝۴۶	جب اس کو دیکھیں گے تو انہیں لگے گا کہ وہ ایک رات یا ایک دن نہیں ٹھہرے تھے (دنیا میں) (۴۶)

سورت کاتعارف

اس سورت میں جن مضامین اور امور پر بحث کی گئی ہے وہ قیامت سے متعلق مضوعات پر مشتمل ہیں۔
موت کے بعد کی زندگی اور اس کے مسائل اور مضبوط و ناقابل تردید دلائل کو اس ضمن میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

اسی طرح اس سورت میں:

- 1- موكد قسمیں جو قیامت سے متعلق ہیں، اور اس عظیم دن کے واقع ہونے پر تاکید کرتی ہے۔
 - 2- اس دن کے هولناک مناظر کے کچھ حصے بیان کیے گئے ہیں۔
 - 3- اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سرکش فرعون کے واقعے کی طرف مختصر اشارہ ہوا ہے، جو حضرت موسیٰ اور مؤمنین کیلئے تسلی کا باعث، اور دھمکی ہے سرکش مشرکوں کیلئے، اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا انکار انسان کو کیسے کیسے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔
 - 4- اس سورت میں خدا تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر اور مثالیں جو آسمان و زمین میں ہیں شمار کی گئی ہیں، جو قیامت اور زندگی پر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر دلیل ہیں۔
 - 5- اس دن کے هولناک واقعات کے ایک اور حصے کی تفصیل، اور سرکشوں کے انجام اور نیک لوگوں کیلئے اچھے بدلے اور اجر کا تذکرہ۔
 - 6- خلاصہ کلام یہ کہ اس سورت میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ اگرچہ کسی کو بھی قیامت کے وقوع ہونے کے وقت کی خبر نہیں ہے، لیکن یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ قریب ہے۔
- سب سے اہم اور فہم و ادراک کو بیدار کرنے والا نکتہ اس سورت میں جس پر تاکید کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت پر یقین رکھنا چاہیئے اور اس کیلئے تیاری کرنی چاہیئے، اور اس کیلئے اس دنیا میں کچھ کام کرنا چاہیئے، لیکن قیامت پر ایمان نہ رکھنے والے شخص کی ضد و عناد پر توجہ نہیں کر نی چاہیئے، اس لئے کہ اس کی ضدتکذیب اور عناد کی وجہ سے ہے، جب وہ اس حالت کو پہنچا ہے تو اس کو جواب دینا عبث کام ہے، اور رب تعالیٰ جو کہ سب سے اعلیٰ و بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ایسے عبث کام کو انجام دینے سے پاک و منزہ ہے۔

سورت کی مختصر تفسیر

(وَالْزُّعْفَرَانُ) قسم ہے ان فرشتوں کی جو بندوں کی روح کھینچنے والے

ہیں سختی کے ساتھ ان کے اجساد سے، یا قسم ہے ان کی چاہے کوئی بھی مراد ہو جو ارواح کو سختی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔
النازعات: باہر کھینچنے والے، باہر نکالنے کے معنی کے لیے یہ پانچوں لفظ مستعمل ہیں۔

نازعات، ناشطات، سابحات، سابقات، مُدَبِّرَات (تفسیر کبیر)
ان سے: فرشتے بھی مراد ہیں، اور آسمان کے ستارے، مجاہدین کے گھوڑے، انسانوں کی ارواح، غازی اور مجاہدین بھی اور انسانی دل بھی مراد لیا گیا ہے اور کبھی ان سب کے مجموعے کیلئے بھی ان کو استعمال کیا گیا ہے۔
البتہ اکثر مفسرین نے ستارے اور فرشتے مراد لیے ہیں، اس میں بہترین رائے "تفسیر المنتخب" کی ہے، اس میں سب کا نچوڑ اور خلاصہ آگیا ہے (تفسیر نور)۔

غرقًا: اس کا معنی ہے مکمل طور پر غرق ہونا، ڈوب جانا، گھرائی میں اترنا۔

وَالنَّشْطِ نَشْطًا ۝۲۱: قسم ہے ان چیزوں کی (جنہیں ایسی طاقت دی گئی ہے کہ جس سے اشیاء کو اپنی جگہوں اور مقامات سے تند ہی اور مہارت کے ساتھ باہر نکالتے ہیں۔

"النَّاشِطَاتِ": وہ جو کام کو سکون و اطمینان کی ساتھ لیکن بڑی مہارت اور تیزی کے ساتھ انجام دیتے ہیں (تفسیر نور)۔

ایسے فرشتے ہیں جو قوت و اور تیزی کے ساتھ جانوں کو نکال لیتے ہیں، یا پھر "نشط" مؤمنین کی ارواح کیلئے اور "نزع" کفار کی ارواح کیلئے ہے۔

"وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا" ۝۲۲ (قسم ہے تیرنے والے فرشتوں کی) یعنی قسم ہے ان سب چیزوں کی ایسی تیز رفتاری ان کو دی گئی ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو بہت تیزی سے اور آسانی کے ساتھ انجام دے دیتے ہیں۔

(فَالسَّبِقَاتِ سَبْقًا) ۝۲۳ قسم ہے ایسے فرشتوں کی جو اللہ کے احکام بجالانے میں دوسرے فرشتوں پر سبقت کرتے ہیں، نیز شیاطین سے سبقت لیجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی وحی اس کے پیغمبر تک پہنچانے میں تاکہ شیاطین اسے چوری نہ کریں۔

(فَالْمَكْرُورَاتِ أَمْرًا) ۝۲۴ قسم ہے ان فرشتوں پر جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت سارے کاموں کی تدبیر کیلئے مقرر کیا ہے عالم بالا میں جنت اور جہنم اور جہان اسفل میں بارش، گھاس، پودے، ہوائیں، دریا، حیوانات وغیرہ۔

(يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ) ۝۲۵ اس دن زلزلہ وقوع پذیر ہوگا، (اور وہ دن قیامت کادن ہے) جس دن پہلا نفخہ صور میں پھونکا جائیگا اور زلزلہ کا آغاز ہوگا، دنیا تباہ ہو جائے گی اور سب مرجائیں گے۔

(تَتَّبِعَهَا الرَّادِفَةُ) اس کے بعد دوسری مرتبہ صور پھونکا جائیگا، پہلے زلزلہ کے بعد دوسرا زلزلہ آئیگا، کہ سارے مردے زندہ ہو جائیں گے، اور قیامت قائم ہوگی، اور محشر بپا ہوگا، اور ابدی جہاں کا آغاز ہو جائیگا۔

(قُلُوبٌ يَّوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ) بہت سارے دل جب اس ہولناک اور سخت دن کو دیکھیں گے تو پریشان ہو جائیں گے اور ڈرنے لگ جائیں گے۔

(أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ) ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، اور ان کے دلوں کو ڈر و خوف نے ڈھانپا ہوگا، اور اس خوف سے لرزتے ہونگے اور ندامت و حسرت ان پر حاوی ہوگی۔

(يَقُولُونَ إِنَّا لَنَرُّدُّونَ فِي الْحَافِرَةِ) کیا موت کے بعد ہم پہلی تخلیق کی طرف لوٹائے جائیں گے؟۔

یہ استفہام انکاری ہے، جس میں تعجب کی انتہا ہے، یعنی ان لوگوں نے موت کے بعد کی زندگی کا انکار کیا، مزید اس کو ناممکن سمجھتے ہوئے کافروں نے تکذیب کی صورت میں کہا کہ:

(إِذَا كُنَّا عِظَامًا مَّخِرَةً) (کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیوں کی صورت میں تبدیل ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ زندگی کی طرف لوٹیں گے؟) (قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ) کہتے ہیں: اس وقت وہ ہمارا زندگی کی طرف پلٹنا سراسر نقصان کا باعث ہوگا۔

اور ہم اس طرح کا نقصان اور اس طرح کا کام کبھی نہیں چاہتے۔ مذاق اراتے ہوئے کہتے تھے: (اگر واقعی زندگی کی طرف دوبارہ پلٹنا پڑا تو) اس صورت میں یہ ہمارا دوبارہ زندہ ہو جانا خسارے کا ہوگا، اور وہ لوگ اس بات کو بعید از امکان سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد اور بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کر سکے گا، کیونکہ وہ لوگ خدا تعالیٰ کی قدرت اور طاقت سے ناواقف تھے، اس لیے اس کے خلاف جسارت کر رہے تھے، مردوں کو زندہ کرنا رب تعالیٰ کیلئے آسان ہے اس بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ) پھر یقیناً وہ ایک اونچی آواز ہے، (انکا پلٹنا کچھ مشکل نہیں ہوگا) صرف اور صرف صور میں پھونکنے کی آواز آئیگی اور دوسری زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔

(فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ) اچانک وہ ایک چٹیل میدان میں ہوں گے اچانک سب کے سب اٹھیں گے اور محشر کے وسیع و عریض چٹیل میدان میں کھڑے ہوں گے۔ اس مقام پر اللہ نے فرشتوں کی قسم کھائی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے سپرد کردہ ذمہ داریوں کو کس تندہی اور رتیزی سے مکمل کرتے ہیں۔

اس قسم میں چند احتمالات ہیں:

1- کہ جس چیز کے اثبات کے لیے قسم کھائی ہے وہ ہے بعد از مرگ زندگی اور سزاء و جزاء۔

2- اثبات قیامت کے لیے قسمیں کھائی ہیں۔

3- جن امور کے اثبات کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور جن کا قسم میں ذکر ہے وہ ایک ہی چیز ہے۔

4- اللہ نے فرشتوں کی قسم کھائی تاکہ فرشتوں کا وجود ثابت ہو، اس لیے کہ فرشتوں پر ایمان لانا بھی ایمان کے چھ ارکان میں سے ایک رکن ہے، اسی طرح ان فرشتوں کے ذمہ لگائے گئے امور سزاء و جزاء کا ایک سبب ہیں، چاہے قبل از مرگ ہو یا بعد از مرگ یا موت کے وقت، یہ سزاء اور جزاء دینا بھی فرشتوں کی ذمہ داری ہے۔

رب تعالیٰ اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں: (هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ۖ) کیا موسیٰ کی خبر تجھ تک پہنچی ہے؟ یہ سوال ایک اہم معاملے سے متعلق ہے، جو واقع ہو چکا ہے، یعنی: کیا اس کی خبر تجھ تک پہنچی ہے؟

(إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۖ) جب اس کے رب نے طوی کی مقدس زمین پر اسے پکارا۔

طوی: وہ مقام ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بات کی، اور انہیں رسالت عطا فرما کر برکت دی، اور وحی کے ساتھ مبعوث فرما کر انہیں برگزیدہ اور منتخب کیا۔

پھر ان سے فرمایا:

(اذهبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۖ) جاو فرعون کی طرف اس نے سرکشی و نافرمانی کی ہے۔

یعنی: فرعون کے پاس جاو اور اس کے ساتھ مشفقانہ اور نرم لہجے میں بات کرو، اور اسے بغاوت و سرکشی اور شرک و نافرمانی سے روکو۔

لَعَلَّہٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ: شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلَىٰ أَنْ تَزْلَمَ ۖ ۝۱۸:

پھر کھدو: (کیا تم چاہتے ہو ایسی خوبصورت و پسندیدہ عادت اپناؤ جسے عقلمند لوگ حاصل کرنے کیلئے ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوش کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ) خود کو پاکیزہ بنالے، اور کفر و شرک و نافرمانی کی آلودگی سے خود کو بچا کر ایمان اور نیک اعمال کی طرف چلے آئے؟

وَأَهْدِيكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ (٧٩) اور تجھے رب تعالیٰ کی طرف راہ دکھاؤں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا و غضب کے عوامل تجھ کو بتاؤں؟ (فتخشی) پھر جب تم سیدھا راستہ پہچان لو گے تو اپنے رب کے سامنے جھک جائے گا، لیکن فرعون نے اس چیز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دعوت دی۔

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ (٨٠) تو (موسیٰ) نے ایک بڑا معجزہ اسے دکھایا، موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گیا اپنے عظیم معجزہ (یعنی لاٹھی کا اڑدبا بننا) اسے دکھایا۔ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ (٨١) لیکن اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا کہا، اور اس کی لائی ہوئی نبوت کو نہیں مانا، اور جو کچھ رب تعالیٰ کے طرف سے ساتھ لایا تھا اس سے انکار کیا۔ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَىٰ (٨٢) پھر پیٹھ پھیرا اور چلا گیا (موسیٰ علیہ السلام سے مقابلے کیلئے) کوشش و تلاش کرنے لگا۔

فَحَشَرَ فَنَادَىٰ (٨٣) پھر (جادوگروں کو) جمع کیا اور لوگوں کو بلایا۔ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (٨٤) فرعون نے اپنے لشکر کو جمع کیا اور پکار کر ان سے کہا: (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) لوگوں نے اس کی بات پر یقین کیا، اور اس کے باطل کو قبول کیا، کیونکہ ان لوگوں کی عقلوں سے کھیل رہا تھا۔ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ (٨٥) رب تعالیٰ نے اسے دنیا و آخرت کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ (٨٦) یقیناً اس میں (موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی واقعے میں درس عبرت ہے ان لوگوں کیلئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اللہ نے موسیٰ اور فرعون کا واقعہ بیان کیا اور اس کے ذریعے یہ یاد دہانی کروائی کہ فرعون کو جو سزاء دی گئی اس میں تمام سرکشوں اور جھٹلانے والوں کے لیے درس عبرت ہے، اسی طرح اس میں قیامت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، قیامت میں دوبارہ زندہ کیے جانے کے امکان کی بھی دلیل ہے، اس کے علاوہ انسانوں کو یہ بھی بتایا گیا اللہ نے انہیں کتنی نعمتیں عطا کی ہیں تا کہ وہ شکر گزاری کریں، یہ شکر گزاری اللہ کی معرفت کا سرچشمہ ہے، سب سے پہلے منکرین بعثت کو استفہام انکاری سے مخاطب کیا یہ توبیخی انداز ہے، یعنی ڈانٹ ڈپٹ ہے کہ کیا تم جو مرنے کے بعد زندہ ہونے کو ناممکن سمجھتے ہو تو کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا اتنے بڑے آسمان۔

(۱) اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاءُ ۝ بَنَاهَا (۲۰۷) (اے قیامت کے منکرو!) کیا تمہاری پیدائش (دوبارہ مرنے کے بعد) زیادہ سخت ہے، یا اس آسمان کی تخلیق جس کو اللہ تعالیٰ نے اس حیران کن عظمت اور حیرت انگیز ترتیب و نظام کے ساتھ تمہارے سروں کے اوپر ایک خیمے اور چھت کی طرح قائم کیا ہے؟
 رَفَعَ سَمَكَهَا فَسُوبَهَا (۲۰۸) اونچا کیا اس کی بلندی کو اور اسے منظم کیا۔
 وَاَغَطَّشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحَاهَا (۲۰۹) اور اندھیرا بنادیا اس کی رات کو اور روشن کیا اس کے دن کو۔

وَالْاَرْضُ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا (۲۱۰) اس کے بعد: اس نے زمین کو (بیضوی شکل میں) پھیلا دیا۔

اَخْرَجَ مِنْهَا مَاءًهَا وَمَرْغَهَا (۲۱۱) باہر نکالا اس سے اس کا پانی اور چارہ۔
 وَالْجِبَالُ اَرْسَاهَا (۲۱۲) اور پہاڑوں کو مضبوطی سے گاڑ دیا۔
 مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۲۱۳) تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدے کیلئے (ہم نے ان سب کو ترتیب دیا ہے، اور ان کو فرمانبردار بنایا ہے)۔
 فَاِذَا جَاءَتِ الطَّامَةُ الْكُبْرَىٰ (۲۱۴) جب آئے گا وہ بڑے حادثہ کا دن (قیامت کا سخت اور ناقابل برداشت دن)۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعَىٰ (۲۱۵) جس دن یاد کریگا انسان اپنی کوشش کو جو اس نے کی تھی۔

وَبُرَزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّزِي (۲۱۶) اور دوزخ ظاہر کر دی جائے گی دیکھنے والوں کیلئے -

فَاَمَّا مَنْ ظَلَمَ (۲۱۷) لیکن جس نے سرکشی و نافرمانی کی ہوگی۔
 وَاثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲۱۸) اور دنیا کے زندگی کو (آخرت کے مقابلے میں منتخب کر کے) ترجیح دی ہوگی -

ان آیات میں انسان کی سعادت و شقاوت کے اصولوں کا نقشہ نہایت خوبصورت اور نصیحت آموز انداز میں کھینچا گیا ہے۔

انسان کی شقاوت و بدبختی کو نافرمانی اور دنیا پرستی کا نتیجہ، اور اس کی خوشی اور سعادت کو خوفِ خدا کا ثمرہ؛ اور نفسانی خواہش کا ترک کرنا بتایا گیا ہے، نیز تمام انبیاء و اولیاء کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے، خواہشات کی پیروی کرنا عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے، اور انسان کے بُرے اعمال کو اس کی نظروں میں مزین کر دیتا ہے، پہچان اور تشخیص کے احساس کو جو اللہ تعالیٰ

کی سب سے بڑی نعمت اور انسان و حیوان میں ایک فرق ہے اسے چھین لیتا ہے، اور انسان کو خود میں مشغول کر دیتا ہے۔

فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْبَاوِي (تو پھر جان لو) دوزخ ہی ٹھکانہ ہے۔

پہلا جملہ ان کے فاسد عقیدے کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس لئے کہ ان کی نافرمانی ان کے تکبر کے وجہ سے ہے، اور ان کا تکبر اللہ تعالیٰ کی عدم معرفت کی وجہ سے ہے، جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت کو پہچانتا ہے وہ اپنے آپ کو حقیر اور کمزور سمجھتا ہے، وہ کبھی بھی اپنے قدم عبودیت کے راستے سے باہر نہیں رکھتا۔

دوسرے جملے میں ان کے فاسد عمل کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ نافرمانی اور سرکشی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اس عارضی اور جلد ختم ہونے والی دنیا کی آسائشوں اور اس دنیا کی رنگینیوں کو بہت قیمتی سمجھنے لگتا ہے اور انہیں ہر چیز پر مقدم رکھتا ہے۔

گویا یہ دونوں (سرکشی اور نتیجہ) ایک دوسرے کے لیے علت اور معلول ہیں۔

عقیدے کا بگاڑ اور نافرمانی عمل میں فساد کا ذریعہ اور ناپائیدار دنیا کی زندگی کو ہر چیز پر ترجیح دینے کا سبب ہے۔

آخر کار یہ دونوں دوزخ کی جلانے والی آگ ہے تیسرے جملے میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کے بعد جنتیوں کے اوصاف کا ذکر دو مختصر اور نہایت پُر معنی جملوں میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ) (۷۹)

اور جو کوئی ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے، اور روکا اپنے نفس کو خواہش سے۔

(فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْبَاوِي) یقیناً جیت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

(يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا) (۸۰) تجھ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کب ہوگا اس کا قیام؟

(فِيمَا أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهِا) (۸۱) تجھ کو کیا کام اس کے ذکر سے؟

(إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْهَلَا) (۸۲) قیامت کے وقت کا علم تمہارے رب کے پاس ہے، (اور اس کے وقوع سے تیرا رب ہی باخبر ہے، تو نہیں)

(أَمَّا أَنْتَ مُنْذِرٌ مَنْ يُخَشِئُهَا) (۸۳) آپ کا فرض صرف اور صرف ڈرانا اور تنبیہ کرنا ہے ان لوگوں کو جو قیامت سے ڈرتے ہیں (اور حق تلاش کرنے اور حق کو اپنانے کا جذبہ رکھتے ہیں)

(كَانَ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَسُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحًى) جس دن اس کو دیکھیں گے ، ایسا لگیگا کہ وہ ایک رات یا ایک دن نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں۔
جس دن قیامت کی قائم ہونے کو دیکھیں گے ایسے محسوس کریں گے جیسے ایک شام یا ایک صبح بھی دنیا میں نہیں رہے۔

ملک الموت کی ذمہ داری

سب سے پہلے یہ کھنا چاہیے کہ ملک الموت کی ذمی داری صرف انسانوں اور دوسری مخلوقات جیسے فرشتوں، جنوں، اور جانوروں کی روحوں کو قبض کرنا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں: (قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ) (سجدہ : ۱۱)

یعنی: کھدیجئے: جس فرشتے کو خدا نے تمہاری روحوں اور سانسوں کو قبض کرنے کیلئے مقرر فرمایا ہے، (وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمہاری موجودگی کی جگہ پر آئیں گے، اور) تمہاری روحن قبض کر لیں گے۔
ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ: پھر رب تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں جزا و سزا ملے گی، اور تم نے مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے سے انکار کیا تھا، اب دیکھو اور سوچو خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ کیا کریگا! اس آیت مبارکہ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ملک الموت انسانوں کی روح قبض کرنے کیلئے مأمور ہے، لیکن حیوانات کی روحن کیسے اور کس کی وساطت سے قبض ہوں گی؟ اس بارے میں کوئی صریح حدیث موجود نہیں ہے۔

لیکن موضوع روایات اس بارے میں موجود ہیں کہ (آجال البہائم کلہا من القمل والبراغیث والجراد والخیل والبغال کلہا والبقر وغیر ذلک، آجالہا فی التسبیح، فإذا انقضی تسبیحہا قبض اللہ ارواحہا ولیس ملک الموت من ذلک شیء)۔

یعنی: ترجمہ: تمام حیوانات جن میں چیونٹی، پسو، ٹڈی، گھوڑا، خچر، گائے، اور دوسرے حیوانات (شامل ہیں) کی موت ان کی تسبیح کی مدت کے ساتھ منسلک ہے، جب بھی ان کی تسبیح کے بیان کرنے کا زمانہ اپنی انتہا کو پہنچا تو رب تعالیٰ ان کی روح قبض کریگا۔

جبکہ ملک الموت کا اس میں کوئی کردار نہیں ہوگا، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ حدیث من موضوعات ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے السلسلۃ الضعیفہ (188/4) میں اس حدیث کو موضوع کھا ہے۔

چنانچہ بعض علمائے کھا ہے کہ: ملک الموت تمام مخلوقات کی ارواح (انسان و حیوانات) کو قبض کریں گے، بعض اہل علم نے کھا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ خود حیوانات کی ارواح کو نکالیں گے، نہ کہ موت کے فرشتے۔

ملاحظہ کریں: (التذکرہ للقرطبی صفحہ (75)، (الفواکہ الدوانی: 100/1) شیخ ابن عثیمین اس مسئلہ پر انسان کو مکلف نہیں سمجھتے، اور اس میں بحث کرنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان سے حیوانات کی روح قبض کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ: (آپ کا نظریہ کیا ہے؟ اگر آپ سے کھاجائے کہ ملک الموت حیوانات کی روح قبض کرنے پر مامور ہے یا نہیں، اس کا کیا فائدہ ہے؟ کیا صحابہ کرام نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا، حالانکہ وہ دوسروں کی بہ نسبت بہت زیادہ سیکھنے اور علم حاصل کرنے میں حریص تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سوال کے جواب دینے میں سب زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور جواب دینا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے، اس کے باوجود صحابہ کرام نے ان سے کبھی بھی ایسا سوال نہیں کیا، جو کچھ رب تعالیٰ اس بارے میں بیان فرماتے ہیں وہ یہ ہے: (قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ..) یعنی ملک الموت انسانوں کی روح قبض کرنے پر مامور ہے، لیکن غیر انسانوں کی ارواح کے بارے میں کچھ بھی ثابت نہیں ہے، اس کا علم صرف اللہ کو ہی ہے۔ (لقاء الباب المفتوح: 11/146)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری روز جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت کی سختیاں آئیں، اور جب اسامہ آپ کے پاس آئے تو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بات نہیں کر سکتے تھے، صرف اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے، پھر اسامہ پر رکھتے تھے، جب اسامہ متوجہ ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کیلئے دعا فرماتے، عائشہ رضی اللہ عنہا پیارے پیغمبر کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھیں۔

اس دوران عبدالرحمن بن ابی بکر داخل ہوئے اس کے ہاتھ میں مسواک تھی، پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس مسواک کو دیکھ رہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: مسواک لے لوں آپ کیلئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے اشارے سے فرمایا: ہاں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی سے مسواک لیکر خوب چبھائی اور نرم کر کے آپ کو دے دی۔ پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک اپنے منہ میں رکھی اور مسواک کرتے ہوئے اس جملے کو دوہراتے رہے: (فی الرفیق الاعلیٰ) یعنی: میں پسند کرتا ہوں کہ رفیق اعلیٰ سے ملوں، اور اپنے دست مبارک کو پانی کے برتن میں جو ان کے پاس رکھا ہوا تھا ڈبو رہے تھے اور اپنے چہرہ

مبارک پرمل رہے تھے، اور فرماتے تھے: (لا اله الا الله ان للموت سكرات) لا اله الا الله ! سكرات موت بہت مشکل ہے (یاسخت ہے) .

جیسے ہی مسواک کرنے سے فارغ ہوئے اپنی انگلی کو گھر کی چھت کی طرف اٹھائی اور آپ کے لب مبارک حرکت میں آگئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا توجہ کے ساتھ سننے لگیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مع الذین انعمت علیہم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین، اللهم اغفر لی وارحمی والحقنی بالرفیق الاعلی، اللهم الرفیق الاعلی)۔

(ان لوگوں کے ساتھ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے: انبیاء صدیقین، شهداء اور صالحین! یا اللہ مجھے بخش دے اور مجھے اپنی رحمت میں شامل کر، اور مجھے رفیق اعلیٰ سے ملادے، یا خدایا: رفیق اعلیٰ) . اس آخری عبارت کو تین مرتبہ آپ نے دوہرایا، اور آپ کے ہاتھ ایک طرف گر گئے اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے، (إِنَّ اللَّهَ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)

بخاری کتاب المغازی: (4437 و 4449) اور باب مرض النبی (دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: (یا اللہ ! موت کی سختیوں میں میری مدد فرما، (ترمذی: کتاب الجنائز حدیث: 978) لیکن سكرات موت سے متعلق اوپر والی حدیث میں اشارہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بات کو آخری دن میں نقل فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لا اله الا الله إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ) یعنی: لا اله الا الله موت کی بہت سختیاں ہیں ۔

ملک الموت کا تیزی سے عمل کرنا:

بہت سے لوگ کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ کس طرح ملک الموت ایک وقت میں بہت سارے انسانوں کی روح قبض کر لیتا ہے؟ سب سے پہلے یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ روح قبض کرنے والے فرشتے کیلئے (عزرائیل) نام درست نہیں ہے، اس کا اصل نام ملک الموت ہی استعمال کرنا چاہیے، اس لئے کہ عزرائیل کے نام سے قرآن عظیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں کبھی بھی ذکر نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ نام اسرائیلیات میں سے لیا گیا ہے بہتر یہ ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے، اور اس کے بدلے میں "ملک الموت" کا نام استعمال کیا جائے، اس لئے کہ یہ نام یعنی "ملک الموت" قرآن اور حدیث میں ذکر ہوا ہے۔

ثانیاً: خدا تعالیٰ نے جو طاقتور اور بڑے فرشتے پیدا فرمائے ہیں جیسے: ملک الموت، جبرئیل، میکائیل، وغیرہ ان کو قوت و طاقت و سرعت ان کے کام کے مطابق عطا فرمائی ہے۔

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

زمین ایک تھال کی طرح ملک الموت کے سامنے رکھی گئی ہے، اس طرح کہ جب چاہے کسی بھی روح کو اس میں سے قبض کر لیتا ہے، قرآن کریم میں روح کا قبض کرنا کبھی خدا تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوا ہے، جیسے آیت: (اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا) (سورة الزمر: 42)۔

اور کبھی قبض ارواح کی نسبت فرشتوں کے طرف ہوئی ہے، جیسے: (الَّذِينَ تَتَوَفَّيْهُمْ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ) يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾ (سورة النحل) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ﴿٦١﴾ (الانعام: 61)

(سورة النساء: 97)

اور کبھی قبض روح کی نسبت ملک الموت کے طرف ہوئی ہے جیسے آیت: (قُلْ يَتُوفَاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ) (سورة السجدة: 11)

ان آیات کا یہ معنی ہے کہ سب سے پہلے خدا انسانوں کو موت دیتا ہے، اور اس کے حکم سے روح جسم سے خارج ہو جاتی ہے۔

اور ثانیاً: ملک الموت کو ایسے ساتھیوں کی مدد حاصل ہے فرشتوں میں سے جو ایک انسان کی موت کے ابتدائی مراحل کی تیاری کرتے ہیں، اس کے بعد ملک الموت روح کو جسم سے الگ کرتا ہے، اور اپنی تحویل میں لیتا ہے، پھر اس کو عذاب یا رحمت کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ روحيں عالم برزخ میں قیامت کے دن تک نعیم میں یا عذاب میں رہیں گی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہمیں یہ سوچنے کے بجائے کہ ملک الموت ایک وقت میں بہت ساری ارواح کیسے قبض کرتا ہے، ہمیں سوچنا چاہیے کہ موت کے وقت اعمال کیا ہونے چاہئیں۔

جنتیوں کے حالات:

جنت والے خوبصورت اور بہترین شکل و صورت کے ساتھ اپنے باب حضرت آدم علیہ السلام کی شکل و صورت میں جنت میں داخل ہونگے، اور کوئی شکل و صورت اتنی خوبصورت اور کامل نہیں ہے، جس شکل و صورت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابوالبشر کی تخلیق کی ہے، خدانے حضرت آدم کو اپنے ہاتھوں

سے بنایا ہے، اس کی تخلیق کی تکمیل فرماتے ہوئے اس کو خوبصورت انداز میں بنایا؛ چنانچہ جو کوئی بھی جنت میں داخل ہو وہ آدم کی صورت میں اور اس کے جسمانی ساخت میں ہوگا۔

خدانے آدم کو بہت بلند قد کھجور کے درخت جیسا بنایاتھا، جس کا طول ساٹھ (60) گز تھا، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدانے آدم کو اپنی صورت میں پیدا فرمایاتھا، جس کے قد کی لمبائی ساٹھ (60) گز ہ تھا؛ لہذا جو شخص بھی جنت میں داخل ہوگا اسی شکل و صورت میں جنت میں داخل ہوگا، کہ اس کی لمبائی ساٹھ گز ہوگی۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد انسانوں کے قد کے ارتفاع میں ہمیشہ کمی ہوتی رہی ہے۔

(صحیح مسلم : کتاب الجنة ، باب یدخل الجنة اقوام افئدتهم مثل افئدة الطیر : (2841)۔

جنتیوں کی صورتوں اور چہروں کی خوبصورتیوں میں سے ایک خوبصورتی یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کی طرح بغیر داڑھی کے ہونگے، ایسا لگیگا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے ہیں، اور وہ تینتیس سالہ (33) بن کر جنت میں داخل ہونگے۔

مسند احمد اور سنن ترمذی میں معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : (یدخل اهل الجنة جرءاً مرداً كأنهم مکحلون ابناء ثلاث وثلاثین)

اہل جنت اس طرح جنت میں داخل ہونگے جیسے مجرد اور بغیر داڑھی کے (بے ریش) ایسے خوبصورت ہونگے، جیسے آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے ہوں، اور 33 سال کے ہونگے، (صحیح مسلم : 7928)

دوزخیوں کی صورتحال:

دوزخ والے بہت ہی ہولناک شکل و صورت میں موٹا فربہ (جن کے حجم کی مقدار کا اللہ کے علاوہ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا) دوزخ میں داخل ہونگے۔

حضرت ابوہریرہ سے ایک حدیث مروی ہے (مابین منکبی الکافر مسيرة ثلاثة أيام للراکب المسرع) صحیح مسلم : باب النار یدخلها الجبارون (2190/4)

یعنی قیامت کے دن کافر کا جسم اتنا بڑا ہوگا کہ ایک تیزگھوڑسوار تین دن میں اس کے دونوں شانوں کے بیچ کا فاصلے طے کرسکے۔

کافر کے جسم کا حجم اس لئے بڑا ہوگا تاکہ اس کے عذاب میں اضافہ ہو۔

امام نووی ان احادیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

یہ سب اس لئے ہے کہ ان کی اذیت آخری حد کو پہنچ جائے ، یقیناً ان سب پر ایمان لانا واجب ہے ، اس لئے کہ رسول صادق المصدق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے۔ (شرح نووی مسلم : 186/17)

ابن کثیر ان احادیث کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (لیکون ذلک انکی فی تعذیبہم، واعظم فی تعذبہم ولہیبہم، کمال شدید العقاب: (لیذوقوا العذاب) (نہایۃ: لابن کثیر) ان کے جسم کی یہ بڑھوتری زیادہ عذاب چکھنے کے لئے ہے ، جیسا کہ شدید العقاب والی ذات نے فرمایا: تاکہ عذاب کو چکھیں)۔

قیامت کے دن بچوں کی حالت:

شرعی حکم یہی ہے کہ: جو مسلمان بچے سن بلوغت سے پہلے وفات پاچکے ہیں ان کا ٹھکانہ جنت ہوگا ان شاء اللہ ، رب تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ۝۲۱) (سورۃ الطور: 21)

جولوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ان کی پیروی کرتے ہوئے ایمان لائی، جنت میں ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملائیں گے ، (تاکہ اپنے بچوں کو اپنی آغوش میں پائیں اور ان سے محبت کا اظہار کر کے فرحت محسوس کریں)، بغیر اس کے کہ ہم ان کے عمل سے بچوں کو دے دیں، یا اس وجہ سے ان کے بچوں کی نیکیوں میں اضافہ کر دیں، یا اس واسطے سے ان کے گناہوں کو ختم کر دیں، کیونکہ ہر شخص اپنے عمل کا گروہ ہوگا جو اس نے کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے: (كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝۳۸) (سورۃ مدثر: 38) مسلمان بچوں کے جنتی ہونے کا استدلال کیا ہے ، اس لئے کہ ان بچوں ایسا کوئی عمل نہیں کیا جس کی ان سے باز پرس ہو ۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے تحت مستقل باب قائم کیا ہے (فضل من مات له ولد فاحتسب) ، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو مندرجہ ذیل تشریح کے ساتھ پیش کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ما من الناس مسلم يتوفى له ثلاث لم يبلغ الحنث الا ادخله الله الجنة بفضل رحمته اياهم) جس مسلمان کے تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں تو خدا اسے اپنے فضل و رحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے معاویہ بن صریم کی بیٹی خنساء سے بسند صحیح روایت کیا ہے وہ اپنے چچا سے روایت کرتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! جنت میں کون جائے گا ؟ آپ نے فرمایا (النبي في الجنة والشهيد في الجنة، والبولود في الجنة) (فتح الباری :

(246/3)

انبیاء ، شہداء ، نوزائیدہ (نابالغ بچے جنت میں ہونگے)، امام مسلم اور امام احمد رحمہما اللہ نے اپنی اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صغارہم دعامیص الجنة. یتلقى أحدهم أباه أو قال أبویہ. فیأخذ بثوبہ أو قال بیدہ کما أخذ أنا بصنفة ثوبک هذا. فلا یتناهی. أو قال: فلا ینتہی حتی یدخلہ اللہ. إیاء الجنة)

مسلمان بچے جنت والوں کے خدمت گار ہونگے ، وہ بچے اپنے والد یا والدہ کو دیکھ کر اس کے کپڑے یا ہاتھ پکڑ لیں گے، جیسا ابھی میں نے تمہارے کپڑے کا کونا پکڑا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس بچے اور اس کے والدین کو جنت میں داخل کر دے گا ۔

قیامت کے دن کفار و مشرکین کی بچوں کے حالت

امام بخاری نے اس عنوان کے تحت (ماقیل فی اولاد المشرکین) باب باندھا ہے، اور ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت ذکر کی ہیں: (سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اولاد المشرکین، فقال: اللہ اذا خلقہم اعلم بما کانوا عاملین).

مشرکین کی نابالغ اولاد کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا آپ نے فرمایا: ان کی تخلیق کے وقت ہی اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ کیا عمل کریں گے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کل مولود یولد علی الفطرة، فأبواه یهودانه أو ینصرانه أو یمجسانہ کبشال البہیمۃ. تنتج البہیمۃ هل فیہا جدعا؟)

ہر بچہ دنیا میں فطرت سالم پر آتا ہے، اس کے ماں باپ اسے یہودی، مسیحی یا مجوسی بناتے ہیں، ایک حیوان سے حیوان پیدا ہوتا ہے، کیا آپ نے ان میں سے کسی حیوان کے بچے کو دیکھا جو کان کٹا پیدا ہوا ہو؟ (بخاری کتاب الجنائز ، فتح الباری 3/296)

ابن حجر کے مطابق امام بخاری رحمہ اللہ ان احادیث کو نقل کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلے میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کر رہے، بلکہ سورہ الروم کی تفسیر کے بعد ان کے جنتی ہونے کا فیصلہ کن طور پر اظہار کر رہے ہیں، انہوں نے اس باب کی احادیث کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ خود مشرکین کے بچوں کے جنتی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس لئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے دلالت کرنے والی احادیث پر توقف کیا پھر ان کے جنتی ہونے پر جو مرجح احادیث ہیں وہ لائے ہیں، اور آخر میں ایسی احادیث بیان کی ہیں، جو ان کے جنتی ہونے کو یقینی بناتی ہے۔

جہاں انہوں نے درج ذیل حدیث بیان کی ہے:

"وأما الوالدان الذين حوله فكل مولود يولد على الفطرة. فقال بعض المسلمين: وأولاد المشركين؟ فقال: وأولاد المشركين" اور وہ والدین جن کے ان کے آس پاس ہیں، چنانچہ ہر بچہ پاکیزہ فطرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، مسلمانوں میں سے بعض نے پوچھا: کیا وہاں مشرکوں کی اولاد ہیں؟ فرمایا: جی ہاں۔

ابن حجر فرماتے ہیں: ابویعلیٰ نے جو حدیث انس سے مرفوع سند کے ساتھ روایت کی ہے وہ حدیث امام بخاری کے موقف کی تائید کرتی ہے۔

(سألت ربی اللہ من ذریۃ البشر ان لا یعذبہم فاعطانیہم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ مشرکین کے نابالغ بچوں کو عذاب نہ دے، پروردگار نے میری دعا قبول کر لی۔

(اللاہین) ابن عباس کی تفسیر کے مطابق چھوٹے بچے ہیں، اسی طرح مشرکین کے بچوں کی جنتی ہونے پر درج ذیل حدیث سے استدلال کیا گیا ہے : (اطفال المشركين خدم اهل الجنة) (سلسلة الاحادیث الصحيحة : 1468)

مشرکین کے بچے اہل جنت کے خدمت کرنے والے ہوں گے۔ یہ نظریہ کہ مشرکین کی اولاد جنت میں ہوگی بہت سارے علماء کی رائے ہے:

جیسے أبی الفرج بن جوزی، اور امام نووی اس بارہ میں فرماتے ہیں کہ : (وهو المذهب الصحيح المختار الذي ذهب إليه المحققون لقوله تعالى: (وما كُنَّا معذبين حتى نبعث رسولا) (اسراء : 15)

جو صحیح اور پسندیدہ مذہب یا رائے جسے محققین نے بھی اپنایا ہے، وہ یہ ہے کہ : مشرکین کی اولاد جنت میں داخل ہوگی، اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ: جب تک ہم کسی قوم میں پیغمبر نہیں بھیجتے ان کو عذاب نہیں کرتے۔

قیامت کے دن دیوانوں کا حال

آخر میں چاہتا ہوں کہ مجنون اور دیوانے کی حالت کے بارے میں اور ان لوگوں کے بارے میں بتا دوں جن کو آپ ﷺ کی رسالت نہیں پہنچی ان کے بارے میں درج ذیل مطالب بیان کر دوں:

شیخ ناصر الدین البانی اپنی کتاب "قرآن کریم کی تفسیر کیسے کریں" میں لکھتے ہیں: ان کے ساتھ قیامت کو ایک خصوصی برتاؤ ہوگا، وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ایک رسول ان کی طرف بھیج دیگا تاکہ ان کو آزمائے، جیسا کہ لوگ دنیا کی زندگی میں آزمائے جاتے ہیں۔

چنانچہ جس نے قیامت کے میدان میں اسے قبول کیا، اور فرمانبردار بنا، اسے جنت میں بھیج دیا جائیگا، اور جس نے نافرمانی کی اور قبول نہیں کیا وہ دوزخ میں جائیگا۔ (سلسلۃ الاحادیث الصحیحة : 24689)

یہ موضوع اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

(اربعة یحتجون یوم القیامة، رجل أصم لا یسمع، ورجلٌ هرم، ورجلٌ أحمق، ورجلٌ مات فی الفترة، وفیه: فیأخذموا ثیقهم لیطیعنہ فی رسل الیہم رسول أن ادخلوا النار، فوالذی نفسی بیدہ لودخلوها لکانت علیہم بردًا وسلامًا" ثم رواہ عن أبی ہریرة وقال فی آخرہ: فمن دخلها کانت علیہ بردًا وسلامًا، ومن لم یدخلها رد الیہا" (مسند امام احمد، صحیح جامع الصغیر البانی)

قیامت کو چار آدمیوں کی حالت:

- 1 - بھرا جو نہیں سنتا
 - 2 - بوڑھا آدمی ،
 - 3 - اور بے وقوف آدمی ، جس آدمی کی عقل نہ ہو احمق
 - 4 - اور وہ جو فترہ میں فوت ہوا (اللہ کے پیغمبروں کی دعوت و رسالت سے بے خبر ہو دعوت نہ پہنچی ہو یا دو پیغمبروں کے درمیان کے وقفے میں تھا کہ جب کسی نبی کی دعوت اور دین نہیں تھا)
- اللہ ان سے اپنی اطاعت کا عہد لے گا، ان کے پاس ایک قاصد بھیج دیگا وہ قاصد ان سے کہے گا آگ میں داخل ہو جاؤ، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ، اگر اس میں داخل ہو جائیں تو ان کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوگی، پھر اسے ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں ، اور حدیث کے آخر میں کہتے ہیں کہ : جو بھی اس آگ میں داخل ہوگا اس میں اس کیلئے وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جائے گی، اور جو داخل نہیں ہوگا، اسے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔
- محمد بن یحیٰ اور بزار نے عطیہ العوفی کے واسطے سے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (الہالک فی الفترة والمعنۃ والبولود یقول الہالک فی الفترة لم یأتنی کتاب، ویقول المعنۃ: رب لم تجعل لی عقلًا اعقل بہ خیرًا ولا شرًا ویقول البولود: رب لم أدرك العقل، فترفع لہم نار فیقال لہم: ردوہا، قال: فیردہا من کان فی علم اللہ سعیدًا لو أدرك العمل، ویمسک عنہا من کان فی علم اللہ

شقیّاً لو أدرك العمل فيقول إياي عصيتم، فكيف لو أن رسلی أتتكم وفي رواية البزار: فكيف برسلی بالغیب قال البزار لا يعرف إلا من طریق عطية عنه) .

ترجمہ: جو حالت فترہ میں وفات پا جائے یا پاگل اور نومولود: پہلا کہتا ہے: کہ دعوت و رسالت مجھ تک نہیں پہنچی، کوئی پیغام مجھے نہیں ملا۔

اور پاگل کہے گا: اے پروردگار! مجھے تونے عقل کے زیور سے آراستہ نہیں کیا تھا کہ میں اس کے ذریعے برائی اور بھلائی کو سمجھتا۔ اور نومولود کہے گا: اے میرے رب! میں عقل نہیں رکھتا تھا، نا سمجھ تھا۔ پھر ان کے لیے آگ تیار کی جائے گی، اور ان سے کھاجائیگا کہ اس میں داخل ہو جاؤ، اس آگ میں وہ شخص داخل ہو جائے گا جو اللہ کے علم میں نیک عمل کرنے والا تھا، اگر اسے عمل کا موقع ملا ہوتا۔ اور وہ شخص اس سے رک جائے گا جو اللہ کے علم میں بدبخت اور برے عمل کرنے والا تھا، اگر اسے عمل کا موقع ملا ہوتا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے میری نافرمانی کی، تو اگر میرے رسول تمہارے پاس آتے تو تم اس وقت کیا کرتے؟ حالانکہ وہ میرے بارے میں بالغیب بتاتے، (جبکہ میں سامنے ہوں اور تم نے میری بات نہیں مانی) بزار کہتے ہیں یہ حدیث صرف عطیہ کی سند سے ہے، کسی اور روایت سے مذکور نہیں۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بسم الله الرحمن الرحيم

جزء - (30)

سورۃ عَبَسَ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے ، اس کی 42 آیات ہیں

وجہ تسمیہ:

یہ سورہ بہ سبب ذکر عَبَسَ کے سورہ عبس کہلاتی ہے عَبَسَ "عبوست" سے ہے ، یعنی منہ چڑھانا، جو کہ انسان کی عادت و اوصاف میں سے ہے ، یہ کیفیت اس وقت انسان پر ظاہر ہوتی ہے ، جب کام میں مصروف ہو ، اس لیے عَبَسَ نام رکھا گیا ۔

اس سورت کا نام پہلی آیت سے لیا گیا ہے ، مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ عَبَسَ صرف اس سورت کا نام ہے ، اس کے مضامین میں سے کسی بھی مضمون کا عنوان نہیں ہے۔

عَبَسَ: عُبُوس یا عُبُوس کے مادے سے لیا گیا ہے ، عُبُوس یا عُبُوس اس کے لیے کہا جاتا ہے جو چہرہ پھیر لیتا ہے یا سکڑ لیتا ہے ، ظاہری منہ موڑنے کی کیفیت اندرونی حالت کی غماز ہے۔

سورہ عَبَسَ کی آیات، کلمات اور حروف کی تعداد:

سورہ عَبَسَ کو سورہ سَفَر بھی کہا جاتا ہے ، اس سورت میں ایک رکوع ، (42) آیتیں اور ایک سو تینتیس (133) الفاظ ہیں ، (552) پانچ سو باون حروف اور (292) دوسو بیانوںے نقطے ہیں۔

سورہ عَبَسَ کا سبب نزول

مفسرین اس سورت کے سبب نزول کے بارے میں کہتے ہیں کہ: یہ سورت بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے خالہ زاد بھائی حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے ، ان کے واقعہ کو مفسرین کرام نے اس انداز سے بیان کیا ہے:

عبداللہ ابن ام مکتوم جو نا بینا تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو اس وقت قریش کے بڑے بڑے سردار جن میں: عتبہ بن شیبہ ، ربیعہ کے

دونوں بیٹے ، ابوجہل بن ہشام ، عباس بن عبدالمطلب ، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے ، اس امید پر کہ ان کے اسلام لانے سے جو کہ قوم کے بڑے ہیں باقی لوگ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔

اسی دوران عبد اللہ بن ام مکتوم نے کہا: اے اللہ کے رسول ! آپ پڑھیے اور مجھے سکھائیے جو کچھ اللہ نے آپ کو سکھایا ہے ، عبد اللہ بن ام مکتوم اپنی بات دوہراتے رہے ، ان کو معلوم نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے سرداروں کو دعوت دینے میں مصروف ہیں ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات ناگوار گذری چہرہ مبارک ناخوشی کے عالم میں پھیر دیا اور منہ موڑا ان سے (جس سے چہرے میں عبوس ظاہر ہو گئی) اسی وقت یہ سورہ نازل ہوئی۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم کی تعظیم و تکریم کرتے تھے ، اور جب ان کو دیکھتے تو فرماتے " مرحبًا بمن عاتبني فيه ربي " خوش آمدید اس کے لیے جس کی وجہ سے رب نے مجھے سرزنش کی۔

پھر ان سے کہتے تھے: کیا آپ کو کوئی کام یا کچھ ضرورت ہے؟ میں تیار ہوں تمہارے کام اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ۔

اہل سیر لکھتے ہیں کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ اسے مدینہ منورہ میں بحیث والی کے مقرر فرمایا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات پر تشریف لیجاتے تھے ۔

ایک روایت میں ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی فقیر سے چہرہ نہیں پھیرا اور نہ ہی کسی سرمایہ دار اور سردار کے کام میں خود کو مشغول رکھا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے غائب کا صیغہ استعمال کیا یعنی کہ پیغمبر اسلام کو مخاطب نہیں فرمایا: (عبس وتولى) (تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ، جب آیا اس کے پاس ایک نابینا) یعنی: رب تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ: تو نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ، اس انداز میں کئی باتیں ہیں جو چند امور کو واضح کرتی ہیں:

- 1- تربیت
- 2- اظہار غصہ

3 - انسان اور اس کی رسالت کے حدود کا تعین اور اس کے لیے رہنمائی یہ بذات خود قرآن کے اعجاز کی ایک صورت ہے کہ ایک خاص انداز تکلم اپنایا گیا ہے۔

صحابی بننے کی شرائط

علماء کرام صحابہ بننے کے بارے میں فرماتے ہیں:

صحابی بننے کی شرائط میں سے ایک شرط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہے، کیا نابینا شخص ابن ام مکتوم جیسے جو پیارے نبی کریم ﷺ کی حضور میں موجود تھا صحابہ میں سے شمار ہوگا یا نہیں؟

اس کے جواب میں یہ کہنا چاہیے کہ صحابی ہونے کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

1 - کوئی بھی شخص جس نے زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو۔

2 - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہو، اور بحالت ایمان دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔

اب اگر اوپر والی دونوں شرائط کسی آدمی میں نہ پائی جائیں تو وہ صحابی شمار نہیں ہوگا۔

لیکن عبداللہ ابن ام مکتوم اگرچہ نابینا تھے، مگر مذکورہ دونوں شرائط رکھتے تھے، اس لیے کہ صحابی ہونے کا شرط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا دیدار نہیں، بلکہ آپ سے ملاقات کا ہے۔

ملاقات: یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محضر میں حاضری، اس لیے ملاقات اور دیدار میں فرق ہے، علماء نے دیدار کی نہیں، بلکہ ملاقات کی شرط رکھی ہے۔

مثال کے طور پر اویس قرنی اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ پر ایمان لائے، اور اسلام پر بھی فوت ہوئے، لیکن چونکہ وہ پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات میں کامیاب نہیں ہوئے، اس لیے وہ صحابی نہیں کہلائے۔

سورہ عبس کا عمومی خلاصہ

اگر ہم سورہ عَبَسَ کے مشتملات پر مجموعی طور پر نظر ڈالیں ، تو ہم دیکھیں گے اس سورت کا خلاصہ پانچ بنیادی عنوانات میں کیا گیا ہے ۔

- 1- خدا تعالیٰ کا سرزنش کرنا توجہ دلانا ایسے بندے کو جس نے حق کے متلاشی نا بینا شخص سے مناسب رویہ نہیں رکھا۔
- 2- قرآن کریم کا مرتبہ و مقام ۔
- 3- انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ۔
- 4- خدا تعالیٰ کی بعض نعمتوں کا اظہار ۔
- 5- یامت ، مؤمنوں اور کافروں کا انجام ۔

سورة عبس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۝١ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۝٢ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى ۝٣ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى ۝٤ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى ۝٥ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّى ۝٧ وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَى ۝٨ وَهُوَ يُخْشَى ۝٩ فَانْتَ عَنْهُ تَلَهَّى ۝١٠ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۝١٢ فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ ۝١٣ مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝١٤ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝١٥ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝١٦ قَتَلَ الْإِنْسَانَ مَا اكْفَرَهُ ۝١٧ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝١٨ مِنْ نُطْفَةٍ ۝١٩ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۝٢٠ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۝٢١ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝٢٢ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ۝٢٣ كَلَّا لَنَا يَقْضُ مَا أَمَرَهُ ۝٢٤ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ۝٢٥ أَتَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝٢٦ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝٢٧ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝٢٨ وَعَيْنَبًا وَقُضْبًا ۝٢٩ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝٣٠ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝٣١ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝٣٢ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَعْمَامِكُمْ ۝٣٣ فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاحَةُ ۝٣٤ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝٣٥ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝٣٦ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝٣٧ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝٣٨ وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرٌ ۝٣٩ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝٤٠ وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ غَبَرٌ ۝٤١ تَرَهَقَهَا فَتْرَةٌ ۝٤٢ أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ ۝٤٣

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
عَبَسَ وَتَوَلَّى ۝١	(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے (۱)
أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۝٢	جب آیا ان کے پاس ایک نا بینا (2)
وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى ۝٣	اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا (3)
أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى ۝٤	یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا (3)
أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى ۝٥	جو پروا نہیں کرتا (۴)
فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى ۝٦	اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو (۵)

وَمَا عَلَيْكَ إِلَّا يَرْحَمُكَ ۝	حالانکہ وہ نہ سنورے تو تم پر کچھ (الزام) نہیں (۶)
وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَى ۝	اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا (۷)
وَهُوَ يَخْشَى ۝	اور (خدا سے) ڈرتا ہے (۸)
فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى ۝	اس سے تم بے رخی کرتے ہو (۹)
كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝	دیکھو یہ (قرآن) نصیحت ہے (۱۰)
فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ ۝	پس جو چاہے اسے یاد رکھے (۱۱)
فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝	قابل ادب ورقوں میں (لکھا ہوا) (۱۲)
مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝	جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں (۱۳)
بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝	لکھنے والوں کے ہاتھوں میں (۱۴)
كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝	جو سردار اور نیکو کار ہیں (۱۵)
قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝	انسان ہلاک ہو جائے کیسا ناشکرا ہے (۱۶)
مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝	اسے (خدا نے) کس چیز سے بنایا (۱۷)
مِنْ نُّطْفَةٍ ۝ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۝	نطفے سے بنایا ، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا (۱۸)
ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۝	پھر اس کے لیے رستہ آسان کر دیا (۱۹)
ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝	پھر اسکو موت دی، پھر قبر میں دفن کرایا (۲۰)
ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ ۝	پھر جب چاہے گا اسے اُٹھا کھڑا کرے گا (۲۱)
كَلَّا لَبَّا يَقْضَىٰ مَا أَمَرَهُ ۝	کچھ شک نہیں کہ خدانے اسے جو حکم دیا اس نے اس پر عمل نہ کیا (۲۲)
فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝	تو انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے (۲۳)
إِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝	بیشک ہم ہی نے پانی برسایا (۲۴)

تُمْ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقَاقًا ۝۲۶	پھر ہم ہی نے زمین کو چیرا پھاڑا (۲۵)
فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝۲۷	پھر ہم ہی نے اس میں اناج اُگایا (۲۶)
وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝۲۸	اور انگور اور ترکاری (۲۷)
وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝۲۹	اور زیتون اور کھجوریں (۲۸)
وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝۳۰	اور گھنے گھنے باغ (۳۰)
وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝۳۱	اور میوے اور چارا (۳۱)
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝۳۲	(یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے چارپایوں کیلئے بنایا (۳۲)
فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاحَّةُ ۝۳۳	تو جب (قیامت کا) غل مچے گا (۳۳)
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝۳۴	اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا (۳۴)
وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝۳۵	اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (۳۵)
وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝۳۶	اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (۳۶)
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝۳۷	ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا، جو اسے بے پروا کر دے گا (۳۷)
وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ مُّسْفَرٌ ۝۳۸	اور کتنے چہرے اس روز چمک رہے ہوں گے (۳۸)
ضَاكِكَةً مُّسْتَبْشِرَةً ۝۳۹	خندان و شادان (یہ مؤمنانِ نیکوکار ہیں) (۳۹)
وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰	اور کتنے چہرے ہونگے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی (۴۰)
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱	(اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی (۴۱)
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ ۝۴۲	یہ کفار بدکردار ہیں (۴۲)

تفسیر سورۃ عبس

محترم قارئین:

مبارک آیات (1 تا 10) اسلام جیسے مقدس دین میں مساوات اور برابری کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم	شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
عَبَسَ وَتَوَلَّى ۝۱	(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے (۱)

یعنی: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے بعض بزرگوں کو دعوت دینے میں مصروف ہونے کی وجہ سے چہرہ پھیر لیا، یعنی: منہ موڑ لیا اور نابینا کے سوال پر متوجہ نہیں ہوئے، اگرچہ ان لوگوں کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ نرمی اور محبت کے ساتھ مخاطب ہوئے۔

أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۝۲	جب آیا ان کے پاس ایک نابینا (۲)

احمد بن محمد الصّاوٰی المالکی الخلوٰتی مؤلف حاشیہ علی تفسیر جلالین فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور احترام کے اظہار کے لیے خدا تعالیٰ نے غایب کے ضمایر "عَبَسَ وَتَوَلَّى" استعمال کیے ہیں، اس لیے سختی اور سرزنش کی جو شدت "تاء" خطاب "عَبَسَتْ و تولیت" میں ہے وہ ناقابل انکار ہے، نابینا شخص کا نام "عبد اللہ ابن ام مکتوم" تھا، سرزنش کرنے والی آیات کے نزول کے بعد جب بھی آپ کے پاس آتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: "خوش آمدید اس کے لیے جس کی وجہ سے رب نے مجھے سرزنش کی، اور اپنی چادر بچھا دیتے تاکہ وہ بیٹھ جائیں، (تفسیر صفوة التفاسیر)۔

"أَعْمَى" عمی کے مادے سے ہے، اور عمی: یعنی: بَصَرَ اور بصیرت کا فقدان، آنکھوں کی بینائی یا دل کی آنکھ کے ختم ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهِ يَرَكَّى ۝۳	اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا (۳)

"لَعَلَّہٗ یَزِکِّی" شاید اس کا دل گناہوں سے پاک ہو کر سچ جائے، "یَزِکِّی": ایسے نیک عمل کرے جو گناہوں کو دھو ڈالیں۔

علامہ عبد الرحمن سعدی عصر حاضر کے مفسرین میں سے ہیں فرماتے ہیں: "ان آیات کریمہ کا سبب نزول یہ ہے کہ: مؤمنوں میں سے ایک نابینا آدمی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تا کہ آپ سے پوچھے اور سیکھے، اسی دوران ایک امیر آدمی بھی آیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کرنے میں بہت زیادہ حریص تھے، اس وجہ سے پیامبر صلی اللہ علیہ وسلم امیر آدمی کے طرف متوجہ ہوئے اور نابینا شخص سے بے توجہی برتی، تاکہ اس امیر و سرمایہ دار آدمی کی رہنمائی کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم امیر شخص کی ہدایت پانے اور پاکیزہ ہونے میں زیادہ دلچسپی رکھی۔

پھر رب تعالیٰ نے پیغمبر اسلام نبی علیہ السلام کو نرمی کے ساتھ متوجہ کیا یا سرزنش کی اور فرمایا: "عَبَسَ وَ تَوَلَّى" فقیر سے منہ موڑا اور اپنا رُخ اس امیر آدمی کی طرف کر دیا، پھر آپ ﷺ کی توجہ کے سبب بیان فرمایا:

"وما یدریک لعلہ یزکِّی" (تجھے کیا معلوم؟ شاید یہ نابینا برے اخلاق سے پاک ہو جائے، اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہو جائے، "أَوِیْذٌ کَرٌّ فَتَنْفَعُ الذِّکْرَ" یا یہ کہ جو کچھ اس کو فائدہ پہنچاتا ہے اسے قبول کر لے، اور اس نصیحت سے فائدہ اٹھالے، یہ بہت بڑا فائدہ ہے، پیغمبروں کی بعثت اور واعظین کے وعظ اور نصیحت کرنے والوں کی نصیحت کا یہی مقصد ہے۔

پھر آپ ﷺ کی توجہ اس شخص کی طرف زیادہ مناسب اور ضروری ہے جو آپ پاس چل کر آیا ہے، خود کو آپ کا محتاج سمجھتا ہے۔

لیکن آپ کا توجہ کرنا اس امیر آدمی کی طرف جو خود کو بے نیاز سمجھتا ہے نہ پوچھتا ہے اور نہ ہی خیر میں دلچسپی رکھتا ہے، اور چھوڑ دینا ایسے شخص کو جو اس امیر آدمی سے زیادہ مستحق ہے یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے، اس لئے کہ اگر وہ امیر آدمی پاک نہ ہو جائے تو آپ پر کوئی گناہ نہیں، اور اس کے برے اعمال کے متعلق آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔

کسی یقینی کام کو ظنی کام کی وجہ سے نہیں چھوڑا جاسکتا ہے

مفسرین کہتے ہیں: یہاں ایک مشہور قاعدہ ہے:

"کسی معین و معلوم چیز کو بے بنیاد اور خیالی چیز کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا" یقینی اور ادراک شدہ مصلحت کو فرضی مصلحت کی بنیاد پر ترک نہیں کرنا چاہیے، وہ طالب علم جو تعلیم میں دلچسپی رکھتا ہے، اور جس کو علم کی ضرورت ہے اس پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، بہ نسبت اس کے کہ جو ایسا نہیں ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ طرز عمل ترک افضل میں شمار ہوتا ہے۔

لہذا پ ﷺ کا یہ کام نہ گناہ تھا اور نہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت سے متصادم تھا، کیونکہ ان سے اس کام کے سرزد ہونے کی وجہ وہ چیز ہے جو انسانی فطرت کے تابع ہے، جیسے: غصہ، رضا، ہنسی، اور رونا، یعنی: ایسے امور جس پر شریعت نے مکلف نہیں بنایا ہے، ابن أم مكتوم کا عذر بھی یہی تھا کہ ان کو معلوم نہیں تھا، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے ساتھ مصروف ہیں، اور اس امید و خواہش کے ساتھ ان سے گفتگو کر رہے ہیں کہ یہ اسلام قبول کر لیں۔

اَوْ يَدَّكَّرْ فَيَنْفَعَهُ الْيَكْرِيُّ ۝۴	یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا (۴)

مفسر تفسیر انوار القرآن اس آیت مبارکہ کے تحت لکھتے ہیں:

لہذا پ ﷺ کا یہ کام نہ گناہ تھا اور نہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت سے متصادم تھا، کیونکہ ان سے اس کام کے سرزد ہونے کی وجہ فطری ہے، جیسے: غصہ، رضا، ہنسی، اور رونا، یعنی: ایسے امور جن پر شریعت نے مکلف نہیں بنایا ہے، ابن أم مكتوم کا عذر بھی یہی تھا کہ ان کو معلوم نہیں تھا، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے ساتھ مصروف ہیں، اور اس امید و خواہش کے ساتھ ان سے گفتگو کر رہے ہیں کہ یہ اسلام قبول کر لیں۔

اَمَّا مَنْ اسْتَعْلَىٰ ۝۵	جو پروا نہیں کرتا (۵)

یعنی: جو شخص اپنے مال اور دولت اور مقام کی وجہ سے خود کو ایمان، علم اور دین سے بے نیاز سمجھتا ہے اور کلمہ حق اور دعوت دین اور اللہ کے کلام کو سننے سے خود کو لاپرواہ اور اسے اپنے لیے غیر ضروری سمجھتا ہے، اور جھوٹی امیری نے اسے سرکش بنا دیا ہے، تو ان کی طرف توجہ کرتا ہے؟

اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو (۶)

فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى ۝۶

یعنی: آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بات کرتے ہیں، جب کہ وہ اپنی دولت اور مالدار کی زیر اثر آپ سے بے نیازی کا اظہار کرتا ہے، اور جو کچھ آپ لے کر آئے اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔

حالانکہ وہ نہ سنوے تو تم پر کچھ (الزام) نہیں (۷)

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزِلَّ ۝۷

اگر وہ اپنے گناہوں سے پاک نہ ہو تو تجھے کوئی نقصان نہیں کہ اس کی وجہ سے اس کی ہدایت پانے کے لیے زیادہ کوشش میں ہو۔

اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا (۸)

وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَى ۝۸

"یَسْعَى" یعنی: خیر کی طلب علم اور رہنمائی کی تلاش میں تمہاری طرف دوڑتا ہے۔

اور (خدا سے) ڈر تاہے (۹)

وَهُوَ يَخْشَى ۝۹

یعنی: وہ اللہ کے عذاب اور اس کی سزا سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی آپ سے سوال کرنے کا سبب بنا تاکہ حلال کو جان لے اور اس پر عمل کرے، اور حرام کو پہچان کر اس سے بچے، جی ہاں! اللہ کے ڈر کے ساتھ نجات مل سکتی ہے۔

اس سے تم بے رخی کرتے ہو (10)

فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى ۝۱۰

ابن کثیر کہتے ہیں کہ: اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ تبلیغ اور تحذیر کے کام میں کسی کو خاص نہ بنائیں، بلکہ برتر اور کمتر، فقیر اور مالدار، آقا اور غلام، مرد اور عورت، چھوٹے اور بڑے سب کو حق کا پیغام پہنچانے میں برابر رکھیں۔

محترم قارئین!

آیات مبارکہ (11 تا 23) میں ان موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے، کہ (1) یہ قرآن ہدایت ہے، (2) خدا کی نعمتوں کی ناشکری، (3) مرنے کے بعد

دوبارہ زندہ ہونا۔

کَلَامُهَا تَذَكُّرٌ ۝۱۱	دیکھو یہ (قرآن) نصیحت ہے (۱۱)

رب تعالیٰ فرماتے ہیں: بے شک یہ وعظ و نصیحت اللہ کی طرف سے ہے، اور اس لیے ہے کہ انسانوں کو نصیحت حاصل ہو، اور یہ وہ چیز ہے جس کی بندوں کی ضرورت ہے، پھر جب یہ واضح ہو گیا تو فرمایا: "فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ" جو شخص چاہے اس پر عمل کرے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے: "وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفِرْ" اور کھدو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، توجو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔"

پھر اس نصیحت کی اہمیت، مقام و مرتبہ کو بیان کر کے فرمایا:

فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ ۝۱۲	پس جو چاہے اسے یاد رکھے (۱۲)

جو شخص پسند کرتا ہے کہ قرآن کریم کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھائے تو ایسا عمل کرے، یعنی: خود کو وحی کے ذریعے مہذب بنائے، اپنے رویے اور عمل کو دین کے ساتھ مضبوط بنائے، اور عمل صالح کے ساتھ نفع بخش علم سے استفادہ کرے۔

فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳	قابل ادب ورقوں میں (لکھا ہوا) (۱۳)

مقدس اور پاک صحیفے جو اونچے مقام و مرتبہ والے اور ہر قسم کی آفت اور شیطان کی دست رس سے دور ہیں، بلکہ یہ صحیفے: "بِأَيِّدِي سَفَرَةٍ" لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں یہ وہ فرشتے ہیں جو اللہ اور بندوں کے درمیان سفیر ہیں۔

مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝۱۴	جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں (۱۴)

"تفہیم القرآن" کے مفسر لکھتے ہیں: یعنی: ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہے، ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے، کسی بھی نوعیت کے باطل اور

فاسد افکار و نظریات ان میں راہ نہیں پاسکتے، جن آلودگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کردی گئی ہیں، ان کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہوسکا ہے، انسانی تخیلات ہوں، یا شیطانی وساوس، ان سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

"مُطَهَّرَةٌ": مُطَهَّر: طہر اور طہارت کے مادے سے ہے، یہ جسم کی پاکیزگی ہوسکتی ہے، اور روح و نفس کی پاکیزگی بھی۔

"مَرْفُوعَةٍ" آسمان میں بلند اور اونچا۔

بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۱۵○	(ایسے) لکھنے والے کے ہاتھوں میں (۱۵)

"سَفَرَةٍ" (سفیر: لکھنے والے) سفرہ: وہ فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کے درمیان وحی پہنچانے کا کام انجام دیتے ہیں، یہ سفارت کے مادے سے لیا گیا ہے جو لوگوں میں اصلاح لانے کے لیے رفت و آمد کرے۔

مفسرین حضرات اس لفظ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

- 1- اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حفاظ قرآن۔
- 2- وہ فرشتے اور ملائک جو انسانوں کے لیے خدا کے سفیر ہیں، وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور مطیع ہیں، جنہوں نے اس قرآن کو لوح محفوظ میں درج کر رکھا ہے، فرشتوں کی ان صفات میں ہر وہ شخص شامل ہے جو مؤمن، نرم دل، پاکیزہ نیت والا، حافظ اور اللہ کی کتاب پر عمل کرنے والا ہو، وہ مؤمن جو قرآن کو ہاتھ میں لے کر اس کی تلاوت کرتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مَثَلُ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَهُوَ حَافِظٌ لَهُ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَّةِ) ترجمہ: "جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس کا حافظ بھی ہو، وہ معزز اور نیک سفراء (فرشتوں) کے ساتھ ہوگا۔"

كِرَامِ بَرَّةٍ ۱۶○	جو سردار اور نیکو کار ہیں (۱۶)

اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اپنے رب کی بارگاہ میں بزرگ اور معزز ہیں، لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ○ جنہیں جو حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کی

نافرمانی نہیں کرتے، اور جو حکم دیا جائے بجالاتے ہیں، وہ گناہوں کی گندگی سے محفوظ ہیں اور عیبوں کے اثر سے آزاد ہیں۔

قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝۱۷	انسان ہلاک ہو جائے کیسا ناشکرا ہے (۱۷)

(قُتِلَ الْإِنْسَانُ) "کافر آدمی پر لعنت" (مَا أَكْفَرَهُ) کیسا ناشکر انسان ہے، کتنا بے ایمان کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ کافر پر لعنت کرے اس کا کفر کتنا شدید اور اس کا انکار کتنا بڑا ہے، احسان فراموش ہے، اور رحمت والے رب کی نافرمانی کرتا ہے، شیطان کی اطاعت کر کے قرآن کو جھٹلاتا ہے۔

شان نزول آیت 17:

ابن منذر عکرمہ سے نقل کر کے فرماتے ہیں: جب ابولہب کے بیٹے "عتبہ" نے کہا: "کفرت برب النجم" میں ستاروں کے رب پر یقین نہیں رکھتا، یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

مِنْ آيٍ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝۱۸	اسے (خدا نے) کس چیز سے بنایا (۱۸)

کہ اس طرح تکبر کر کے انکار کرتا ہے۔

مِنْ نُّطْفَةٍ ۝۱۹ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۝۲۰	نطفے سے بنایا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا (۱۹)

یعنی اس نے اسے ہزاروں نطفوں میں سے کم حیثیت والے پانی سے پیدا کیا، کہ اللہ نے اسے حکم دیا ہے، لہذا اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ تکبر کرے؟ "فَقَدَّرَهُ" اس کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا۔

ابن کثیر فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس کی موت اور عمل کا وقت متعین کر لیا ہے، اور یہ طے کر لیا ہے کہ وہ نیک بخت ہے یا بد بخت۔ (مختصر: 600/3)

مفسرین اپنی تفاسیر میں اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں:

1- اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد کے تناسل کی نالی اور عورت کے رحم میں ایک حقیر نطفے سے پیدا کیا ہے، پہلے نطفہ سے اور پھر علقہ اور خون کے لوتھڑے سے اور پھر گوشت کے ایک ٹکڑے سے تو تم کیوں تکبر کرتے ہو؟

2- اے انسان تو تو ایک حقیر نطفہ تھا، پھر اللہ نے تیرے جسم کے تمام اعضاء بنائے، اور تجھے خوبصورت اور مکمل بنایا تو کیوں غرور کرتا ہے؟

3- اللہ تعالیٰ نے تجھے کھڑے ہونے کی طاقت دی ہے اور تجھے کامل اور نعمتوں سے بھرا ہوا پیدا کیا ہے تو تم کیوں تکبر کرتے ہو؟

4- اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حقیر نطفے سے اور کئی مراحل میں پیدا کیا ہے، سب سے پہلے نطفہ، پھر علقہ، اس کے بعد مضغہ، تو کیا جس کی حالت ایسی ہو اس کے لیے مناسب ہے کہ اللہ کا انکار کر کے متکبر بن جائے، اور رب سے خود کو بے نیاز سمجھے؟ انسان کو چاہئیے کہ اپنی ابتداء، انتہاء اور درمیان کو دیکھے، اس کی ابتداء ایک بوسیدہ نطفہ ہے اور اس کا انجام بدبودار لاش اور ان دونوں کے درمیان نجاست ہے، تو ایسے انسان کیوں کفر کرے اور کیوں تکبر کرے۔

تُمَّ السَّيِّئِلَ يَسَّرَ ۝۲۰	پھر اس کے لیے رستہ آسان کر دیا (۲۰)

یعنی: پھر ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ، اس کے روزی کا راستہ، اس کی خوشی کا راستہ سہل اور آسان بنادیا، اگر اللہ تعالیٰ ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ آسان نہ بناتا تو کیسے پیدا ہوتا؟

حسن بصریؒ فرماتے ہیں: وہ آدمی جو تناسل کی نالی سے دو دفعہ نکلا وہ کیسے تکبر کرتا ہے، (تفسیر قرطبی: 216/19)۔

لیکن جیسا کہ اس نے باہر سے وحی بھیجی ہے، اندر سے اس نے ہنراور صلاحیتیں دی ہیں تاکہ انسان قدم بہ قدم وحی پر عمل کرسکے اور اس کے مطابق زندگی گزارے۔

تُمَّ أَمَاتُهُ فَأَقْبَرَهُ ۝۲۱	پھر اسکو موت دی، پھر قبر میں دفن کرایا (۲۱)

یعنی: اس کے لیے عزت کے طور پر قبر مقرر کی ہے تاکہ اس میں چھپ جائے، ورنہ یہ سڑ جاتا اور بدبو پکڑتا، اور وحشی جانوروں، درندوں اور پرندوں کی خوراک بن جاتا۔

خازن نے کہا: اس طرح اس نے انسانوں کو دوسرے جانوروں پر فضیلت دی ہے۔

ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ۝۲۲	پھر جب چاہے گا اسے اُٹھا کھڑا کرے گا (۲۲)

یعنی: مرنے کے بعد اسے حشر اور جزا و سزا اور حساب کتاب کے لیے زندہ کرے گا، (تفسیر خازن: 210/4)

"إِذَا شَاءَ" جب اللہ تعالیٰ چاہے گا اور حکم کرے گا یہ وقت اور زمانہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔

كَلَّا لَبَآئِقُضٍ مَّا أَمَرَهُ ۝۲۳	کچھ شک نہیں کہ خدانے اسے جو حکم دیا اس نے اس پر عمل نہ کیا (۲۳)

اس کافر کو اپنے غرور اور تکبر سے باز آنا چاہیے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ فریضہ کو ادا نہیں کیا اور وہ عبادات ادا نہیں کیں جو اللہ نے اس پر فرض کی ہیں۔

علامہ ابن کثیرؒ نے "كَلَّا لَبَآئِقُضٍ مَّا أَمَرَهُ" کو "ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ" سے متعلق رکھا ہے، یعنی جب چاہے گا زندہ کر کے اٹھائے گا، اور کسی کو بولنے کی جرأت اور گنجائش نہیں ہے، ابھی ایسا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دنیا کی آبادی کے متعلق اس کا جو حکم کونی و قدری ہے وہ ابھی تک اس نے ختم نہیں کیا، "تفسیر کابلی"۔

(آیات مبارکہ : 24 تا 42) میں: اَلْهٰی نَعْمَتِیْنَ جَن کی انسانوں کو ضرورت اور احتیاج ہے، اور قیامت کے دن کا خوف اور ڈر زیر بحث آیا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ۝۲۴	تو انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے (۲۴)

اس مبارک آیت میں کھانے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے، بلا شبہ آیت کا ظاہری مفہوم وہ جسمانی غذائیں ہیں جن کی طرف آنے والی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن روح کی غذا کے لیے بھی ان آیات سے دلیل لی جاسکتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں : جیسا کہ انسان مرکب ہے روح اور جسم سے ، جس طرح جسم کو مادی غذا کی ضرورت ہے اسی طرح روح کو بھی روحانی غذا کی ضرورت ہے۔

مفسرین کرام اپنی تفسیروں میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کا معنی و مفہوم عام ہے۔

انسان کو چاہیے کہ اس خوراک کو دیکھے جو اس کی زندگی کا سرچشمہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تدبیر سے کیسے کامل ہوا ہے، شاید پھر یہ اللہ کو یاد کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے۔

اِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝۲۵	بیشک ہم ہی نے پانی برسایا (۲۵)

یعنی: اپنی قدرت سے ہم نے شاندار طریقے سے بادلوں سے پانی برسایا، اس میں برکتیں، نشوونما اور زندگی ہے، انسانوں، حیوانوں اور پودوں کو زندگی فراہم کرتا ہے۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝۲۶	پھر ہم ہی نے زمین کو چیرا پھاڑا (۲۶)

اس کے بعد ہم نے زمین کی مٹی کو اس کے سائز کے مطابق پودے اُگا کر، بغیر کسی زیادتی یا کمی کے، بلکہ حکمت کے ساتھ ہم نے اس کو پھاڑا تاکہ پودے کی کونپل اس سے نکل آئے، اس لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھلوں کی اقسام میں سے اٹھ پھلوں کا ذکر کیا ہے۔

فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝۲۷	پھر ہم ہی نے اس میں اناج اُگایا (۲۷)

یعنی: نتیجے کے طور پر ہم نے زمین سے گندم، جو اور جوار کی فصل نکالی، تاکہ متعدد اقسام اور مختلف ذائقوں کے ساتھ انسانوں اور حیوانوں کی خوراک بنیں۔

وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝۲۸	اور انگور اور ترکاری (۲۸)
وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝۲۹	اور زیتون اور کھجوریں (۲۹)

اللہ تعالیٰ نے یہاں تین پہل: انگور، زیتون اور کھجور کا ذکر فرمایا، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان پھلوں کی خصوصیات اور فوائد بہت زیادہ ہیں اور پھلوں کے بادشاہ کے طور پر معروف و مشہور ہیں۔

وَحَدَّٰثٍ غُلْبًا ۝۳۰	اور گھنے گھنے باغ (۳۰)

نخل: غلب: کھجور کا اصلی درخت، یہ مضبوط اور موٹا ہوتا ہے جو کہ بہت زیادہ ثمر آور اور کھجور کے باغات میں بڑی تعداد میں ہوتا ہے۔

وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝۳۱	اور میوے اور چارا (۳۱)

"فَاكِهَةً": ہر وہ چیز ہے جس کا پھل لوگ کھاتے ہیں، اسے عمومی طور پر ذکر کیا تاکہ اس کی تمام اقسام شامل ہوں۔

مفسر قرطبی فرماتے ہیں: "اب" ایسی گھاس کو کہتے ہیں جسے جانور کھاتے ہیں، (قرطبی: 220/19)۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝۳۲	(یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے چارپایوں کیلئے بنایا (۳۲)

ابن کثیر فرماتے ہیں: یہ آیات بندوں کے احسان جھٹلانے پر دلالت کرتی ہیں، اور مردہ نباتات کے اگنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ استدلال کرتا ہے کہ وہ بوسیدہ ہڈیوں اور ٹوٹے ہوئے اعضاء بن جانے کے بعد دوبارہ اس طرح زندہ کئے جائیں گے۔ (مختصر 601/3)

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّآخَةُ ۝۳۳	تو جب (قیامت کا) غل مجھے گا (۳۳)

الصَّآخَةُ: ایک زور دار چیخ ہے، کانوں کے پردے پھاڑنے والی نفخہ ثانیہ ہوگا جس دن اسرافیل کی خوفناک آواز کانوں کو بہرا کر دے گی، اور دلوں میں خوف و ہراس بٹھائے گی، "صخ" ایک لوہے کو دوسرے لوہے پر مارنا، یا لاٹھی کا دوسری لاٹھی پر مارنا کہ جس سے کان پھاڑنے والی آواز پیدا ہو جائے۔

بیان فرمایا: دوسری دنیا میں قیامت اور بنی نوع انسان کے انجام کی وضاحت کی اور فرمایا: (فَإِذَا جَاءَتِ الصَّآخَةُ) شاید قیامت کو "صَّآخَہ" کہنا اس بات کی دلیل ہو کہ

نفخہ ثانیہ اتنی شدید اور سخت ہوگی کہ کانوں کو پھاڑ دے گی اور بہت سارے لوگ بہرے ہوجائیں گے اس کے بعد رب تعالیٰ فرماتے ہیں:

یَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝۳۳	اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا (۳۴)

جس دن انسان اپنے بھائی سے قربت، شفقت اور رشتہ داری کے باوجود دور بھاگے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بھائی چارہ اور فائدہ نفع کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ حالات سب کچھ سے بڑھ کر ہے، قیامت بھاگنے کا دن ہے بھائی کا بھائی سے فرار، اولاد کا ماں باپ سے بھاگنا، شوہر بیوی سے اور باپ بیٹے سے۔

وَأُمُّهُ وَآيَّتُهُ ۝۳۵	اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (۳۵)

یعنی: روز قیامت محشر کے میدان میں حساب کتاب کے لیے کھڑے رہنا اس قدر ہولناک اور شدید ہوگا کہ انسان اپنے والدین سے بھاگے گا اور انہیں اپنی نیکیاں نہیں دیگا، جی ہاں! بعض ایسے امور نے اسے والدین سے مصروف کر دیا ہوگا کہ جس نے اس کی عقل چرا لی ہوگی، اس کے خیالات کو خوف زدہ کر دیا ہوگا، اور انکھوں کو بے حس کر دیا ہوگا۔

وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝۳۶	اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (۳۶)

کیونکہ حد سے زیادہ ڈر اور اس دن کی ہولناکی اور وحشت نے اسے دہشت زدہ کر دیا ہوگا، اپنے بچوں کے ساتھ بے پناہ شفقت و مہربانی رکھنے کے باوجود بھی ان سے بھاگے گا، جی ہاں! ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ اور رحجان ختم ہوجائیں گے، باہم ربط و روابط ٹوٹ چکے ہوں گے اور رشتہ داریاں ختم ہوچکی ہوں گی، ان کے فرار کا سبب زیادہ ڈر اور خوف، قیامت کاشورش اور ہولناکی کے سوا کچھ نہیں، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے: (تَحْشَرُونَ حَفَاةَ عَرَاةٍ مَشَاةٍ غُرَا)، قال: فقالت زوجته: یا رسول الله، ننظر أو یری بعضنا عورة بعض؟ قال: لکل امرئ منہم یومئذ شأن یغنیہ) ترجمہ: "قیامت کے دن لوگ اٹھائے جائیں گے ننگے پاؤں، ننگے بدن، بن ختنہ کئے ہوئے"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ایک دوسرے کے ستر کو دیکھیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہاں ہر

ایک کی ایسی حالت ہوگی کہ اسے دوسرے سے بے پروا کرے گی اس دن ہر کوئی ایسے ڈر، خوف، اور پریشانی میں مبتلا ہوگا کہ کوئی بھی اس کام کی طرف دھیان نہیں دے گا۔

لِکُلِّ أَمْرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝۳۷	ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا، جو اسے بے پروا کر دے گا (۳۷)

اس دن ہر ایک کی مشکل صورتحال ہوگی جس نے اس کے دل کو مصروف اور عقل کو زائل کر دیا ہوگا، اس انداز سے کہ اپنے دوستوں کو بھول کر اپنے یاروں سے غافل ہوگا، اور اپنی رشتہ داریاں اور روابط چھوڑ کر خود میں مصروف ہوگا، قیامت کے دن قرابت داری ختم ہوگی اور دوسروں کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہوگی۔

علماء اور مفسرین نے لوگوں کے ایک دوسرے سے بھاگنے اور ڈر کی دلیل کے طور پر درج ذیل تشریح کی ہے:

- 1- ایک شخص کو یہ خوف لاحق ہوگا کہ اس کی نیکیاں نہ چھین لی جائیں، اس لیے ممکن ہے کہ دنیا میں کسی کا حق اس پر باقی ہو۔
- 2- ہر کوئی ذات میں مشغول ہوگا، اور اپنے بارے میں سوچتا ہوگا، حتیٰ کہ انبیاء اور سب کہیں گے: نفسی، نفسی۔
- 3- ہر کوئی دوسرے سے نیکی مانگے گا۔
- 4- وہ بھاگے گا تاکہ دوسروں کے تقاضوں کا سامنا نہ کرنا پڑے، وہ بھاگے گا تاکہ دوسرے اس کو رسوا ہوتا ہوا نہ دیکھیں۔
- 5- وہ بھاگے گا تاکہ اپنے کام مکمل کرے، اور اس کا فیصلہ جلد از جلد واضح ہو جائے۔

وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸	اور کتنے چہرے اس روز چمک رہے ہوں گے (۳۸)

"مُسْفِرَةٌ" روشن اور چمکدار "ایسا چہرہ کہ دلی خوشی اس کی چمک سے عیاں ہوں، اس دن مؤمنوں کے چہرے ایسے ہوں گے، چمکتے دمکتے، خوشخبری ملنے پر یہ چمک ہوگی، خوشی حاصل ہونے پر اس کو یہ روشنی ملی ہوگی، سرور سے درخشاں، اس کو نور اور روشنی نے احاطہ کیا ہوگا۔

خندان و شادان (یہ مؤمنان نیکوکار ہیں) (۳۹)

صَاحِبَةُ مُسْتَبَشِّرَةٍ ۝۳۹

یعنی وہ خدا کی نعمتوں اور کرم کو دیکھ کر بہت خوش اور سرور ہونگے اور ان دائمی اور ہمیشگی والی نعمتوں کے حاصل ہونے پر خوشحال ہوں گے۔
"مُسْتَبَشِّرَةٌ" اس خوشی کی خبر سننے کے بعد گال اور کھل جائیں گے، نہیں بھولنا چاہیے کہ: قیامت کے دن ہنسنا اور خوش ہونا یہ روشن مستقبل کی بشارت ملنے کی وجہ سے ہے، اس دنیا میں گناہوں سے آلودہ ہونا قیامت کے دن چہرے کو آلودہ کرنے کا سبب بنے گا۔

اور کتنے چہرے ہونگے جن پر گرد
پڑ رہی ہوگی (۴۰)

وَوُجُوهُ يُؤْمِنُ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰

یعنی: بہت سے چہرے اور بھی ہوں گے جو اداسی، ندامت، غم، پشیمانی، اور جرم کی دھول سے ڈھکے ہوئے ہوں گے، اور وہ لکڑیوں کی طرح آدھے جلے ہوئے، اس لیے کہ وہ دیکھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے سخت عذاب ان کے لیے تیار کیا ہے، رب کا عطا کیا ہوا انسانی چہرہ گناہ کی وجہ سے سیاہ ہو جاتا ہے اور بُرے نقاب سے ڈھانپ لیا جاتا ہے۔

"غَبَرَةٌ" اس پر غبار لگا ہوا ہوگا، رنجیدہ خاطر اور غمزدہ۔

(اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی (۴۱)

تَرَهْقُهَا قَرَّةٌ ۝۴۱

یعنی: گناہوں کا اندھیرا، غلطیوں کی سیاہی اور معاصی کی تاریکیوں نے ان کے چہروں کو ڈھانپ لیا ہوگا، کیونکہ انہوں نے عذاب اور سزا دیکھی ہوگی۔
مفسر نسفی لکھتے ہیں: تو اس سے زیادہ خوفناک حالت نہیں دیکھو گے کہ ایک چہرہ میں غبار اور کالا پن اکٹھا ہو۔

یہ آیات قیامت کے دن لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں: (1) اہل سعادت، (2) اور اہل شقاوت: دو گروہ اپنی علامت اور چہروں سے پہچانے جائیں گے، چونکہ انسان کا چہرہ اس کی سیرت کا آئینہ ہے، اس کا اندرونی غم اور خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہے، یہ سورت دنیا میں حق سے منہ پھیرنے سے شروع ہوتی ہے، اور آخرت میں چہرہ دھوئیں سے آلودہ ہونے پر ختم ہوتی ہے۔

یہ کفار بدکردار ہیں (۴۲)

أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

یہ وہی کفار ہیں جو دنیا میں کفر اور گناہوں میں زندگی گزارتے رہے، اور اسی حالت پر فوت ہوئے، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ایمان کو کفر کے پردے سے ڈھانپا ہے، اور اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کو جھٹلایا اور ایسے بدکار ہیں جو معصیت اور گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، اور رسالت کا انکار کر کے گمراہی کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے ایمان مختلف بیماریوں جیسے نفاق اور ریا کے ساتھ خلط ملط ہوئے، اللہ کی اطاعت سے دور، واجبات کو چھوڑ کر ریا، زنا، اور خون ریزی جیسے محرمات کے مرتکب ہوئے۔

مفسر صاوی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں پر سیاہی کے ساتھ ساتھ گرد و غبار کا بھی اضافہ کیا ہے، کیونکہ وہ لوگ کفر کے ساتھ فساد اور تباہ کاری کے بھی ذمہ دار ہیں۔

اس طرح اس سورت کی ابتداء اور انتہا ہم آہنگ ہے۔

سورہ کا آغاز معیار اور پیمانہ کی حقیقت بیان کرتا ہے، اور سورہ کا اختتام اس معیار، کسوٹی اور پیمانے کے نتیجہ پر بحث کرتی ہے، یہ مختصر سورت ان تمام عظیم حقائق، بڑے مناظر اور اہم امور کے بارے میں کانوں تک پیغام پہنچاتی ہے، اور ان تمام امور کو واضح اور عمدگی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

اس سورہ کے مخاطب کون ہے؟

سورہ عَبَسَ کے متعلق صحیح حدیث موجود ہے کہ اس سورہ کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قاضی عیاض اور دوسرے علماء اہل سنت نے کہا ہے کہ یہ سورت کسی اور کے بارے میں نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

امام ترمذی اور حاکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں:

«أُنزِلَتْ: عَبَسَ وَتَوَلَّى» فِي ابْنِ أُمِّ مَكْتُومٍ الْأَعْمَى أَتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يَقُولُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَشِدْنِي، وَعِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنْ عِظَمَاءِ الْبَشَرِ كَيْنَ، فَجَعَلَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم یعرض عنہ، ویقبل علی الآخر. ویقول: تری بما أقول بأسا ففی هذا نزل. ترمذی (3331)۔

یعنی : ابن أم مکتوم نابینا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: اے رسول خدا! سیدھے راستے کے طرف میری راہنمائی کیجئے تاکہ میں کامیاب ہو جاؤں، اسی دوران قریش کا ایک سردار آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن أم مکتوم سے منہ موڑا اس سردار کی طرف اپنا رخ کیا، اور کہا، کیا آپ میری باتوں کی اہمیت وقوت سمجھ رہے ہو؟ اس غافل آدمی نے کہا؟ نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

عصر حاضر کے محدث عبد الرزاق مہدی نے سیوطی کی کتاب "اسباب النزول" کی تحقیق میں کہا ہے: کہ یہ حدیث صحیح ہے، اسے ترمذی 3331، ابن حبان 535، حاکم 2 / 514 اور واحدی نے 845 روایت کیا ہے۔

حاکم کہتے ہیں کہ: یہ حدیث امام بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ شیخ البانی بھی اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں: صحیح الترمذی (3331)۔ ابویعلیٰ نے انس سے ایسی ہی روایت نقل کی ہے، لیکن اس آدمی کا نام انہوں ابن خلف ذکر کیا ہے۔

طبری نے صفحہ 33624 پر قتادہ اور انس سے روایت کیا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے، (مسند ابویعلیٰ 5 / 431 دارالبأمن للتراث دمشق)

عبدالرزاق "تفسیر قرآن" میں صفحہ 3494 پر قتادہ نے انس کو ذکر کئے بغیر روایت کیا ہے، اس تفصیل کے ساتھ سابقہ حدیث کے لیے شاہد ہے، تو متعلقہ صحیح حدیث کی بنا پر (جس کے دوسری شواہد بھی ہیں) معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عبداللہ بن أم مکتوم کے ساتھ سلوک اور رویہ سے متعلق ہے۔

یادر ہے کہ: ابن أم مکتوم کا عذر بھی یہی تھا کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور کے ساتھ باتوں میں مصروف ہیں، اور اس امید کے ساتھ ان سے محو گفتگو ہیں کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو جائے۔

ابن کثیر میں ایک روایت ہے: کہ حضرت عبد اللہ ابن أم مکتوم نابینا صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضا کیا کہ قرآن مجید کی کوئی آیت اُسے

سکھادیں ، اس سوال کے جواب کا فوری اصرار کر رہے تھے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے سرداروں کو تبلیغ کرنے میں مصروف تھے جن میں : عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام اور حضرت عباس بن عبد المطلب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاچا جو کہ اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے شامل تھے۔

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن أم مکتوم کے جلدی جواب لینے پر اصرار سے ناراض ہو گئے، کیونکہ عبد اللہ بن أم مکتوم پختہ مسلمان تھے اور ہمیشہ منظر میں موجود رہتے تھے، کسی دوسرے وقت میں پوچھ سکتے تھے، ان کو تاخیر سے جواب دینے میں کسی دینی خسارے اور نقصان کا ڈر نہیں تھا ، رؤسائے قریش کے برعکس کہ وہ دین سے دور تھے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا دین کو ان تک پہنچا رہے تھے، اور وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سن رہے تھے، اس لیے اس بات کا امکان تھا کہ وہ ایمان لاتے، اگر ان سے گفتگو منقطع ہو جاتی تو ان کی دین سے محرومی واضح تھی۔

اس حالت کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن أم مکتوم کے سوال کا جواب دینے سے منہ موڑا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور کفار قریش کے ساتھ دعوتی گفتگو جاری رکھی۔

اس مجلس کے اختتام پر سورہ عبس کی یہ آیات نازل ہوئیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح کے رویے میں بہتری لانے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال تھا کہ جو مسلمان آداب مجلس کا لحاظ نہیں رکھتا اسے کسی قدر تنبیہ کی ضرورت ہے، تاکہ آئندہ مجلس کے آداب کا خیال رکھے، اس بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن أم مکتوم سے منہ موڑا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ: ویسے تو کفر و شرک سب سے بڑے گناہ ہیں، عبد اللہ بن أم مکتوم کو دین کے فروعی احکام کی تعلیم دینے پر انہیں مقدم کرنا افضل تھا۔

لیکن حق تعالیٰ جلد شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خیال کی تائید نہیں فرمائی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کر دیا کہ یہاں یہ بات اہم ہے کہ

جو شخص آپ سے جواب مانگنے پر مصر ہے، اس کے سوال کا جواب دینے کا فائدہ یقینی ہے۔

جبکہ آپ کی گفتگو ایسے آدمی کے ساتھ کہ جو آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا تو یہ ایک موہوم اور غیر یقینی بات ہے، ایک غیر یقینی امر کو یقینی امر پر ترجیح نہیں دینی چاہیے، عبد اللہ بن ام مکتوم نے جو مجلس کے آداب کے خلاف عمل کیا تھا اس کا عذر قرآن کریم نے لفظ "اعمی" کے ساتھ بیان فرمایا کہ وہ نابینا تھے، جس کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے تھے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس کام میں مصروف ہیں، اور رکن لوگوں سے گفتگو فرما رہے ہیں، اس لیے وہ معذور تھے نظر انداز کرنے کے مستحق نہیں تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی معذور آدمی مجلس کے آداب کے برخلاف کوئی کام کرے تو وہ ملامت و مذمت کا مستحق نہیں ہے۔

(عَبَسَ وَتَوَلَّى) "عَبَسَ" بہ معنی تیوری چڑھا نا، یعنی چہرے پر ناگواری کا ظاہر ہونا، و "وَتَوَلَّى" بہ معنی منہ موڑنے کے ہے۔

یہاں حاضر کے صیغے سے مخاطب کرنے کا موقع تھا، لیکن یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ صیغہ حاضر کی جگہ غائب استعمال ہوا، کہ سرزنش کے موقع پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کا لحاظ رکھا گیا۔

یا اس طرح کہ غائب کا صیغہ استعمال کرنے سے یہ ابہام باقی رہا کہ گویا یہ کسی دوسرے شخص نے کیا ہے، اور اس طرف اشارہ کر دیا کہ ایسا رویہ آپ کے شایان شان نہیں تھا، اور دوسرے جملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عذر کی طرف متوجہ کر دیا:

(وما یدریک) آپ کو کیا معلوم تھا؟ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض کی وجہ بیان فرمائی کہ آپ کو معلوم نہیں تھا، کہ جو کچھ یہ صحابی سیکھیں گے اس کا اثر یقینی ہے، اور دوسروں کے ساتھ کی جانی والی گفتگو کا اثر موہوم اور غیر یقینی ہے۔

نیز بعد والے جملے میں غائب کا صیغہ چھوڑ کر مخاطب کا صیغہ استعمال کیا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم اور تسلی کے لیے ہے، اگر خطاب کے صیغے میں لفظ "کلا" کا استعمال نہیں ہوتا تو یہ شبہ باقی رہتا کہ اس رویہ

کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مخاطب قرار نہیں دیئے گئے، تو یہ معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکلیف دہ ہوتا۔

تو اس بنا پر جیسے پہلے جملے میں غائب کے صیغے لانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم کو ملحوظ خاطر رکھا گیا، بالکل اسی طرح بعد والے جملے میں بھی صیغہ خطاب کا لانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور تکریم و احترام کے واسطے ہے۔

(لَعَلَّہُ یَرْکُبُ، اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرُ) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا معلوم تھا کہ یہ صحابی جو کچھ حاصل کریگا اس کا فائدہ یقینی ہے، چنانچہ اسے تعلیم دینی چاہیے تاکہ اس سے وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے، اور کمال حاصل کرے، اگر یہ نہ ہوتا تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ابتدائی فوائد سے مستفید ہوتا، اور پھر اس کے اثر سے اس کے قلب میں محبت اور خدا تعالیٰ کا خوف زیادہ ہوتا۔

لفظ "ذکری" بہ معنی کثرت ذکر کے ہے، قرآن کریم نے یہاں دو جملے ذکر کیے: "یَرْکُبُ" اور "یَذَّکَّرُ" پہلے کا معنی پاک اور صاف ہونے کا ہے، اور دوسرے کا معنی نصیحت حاصل کرنے اور نصیحت سے متاثر ہونے کا ہے۔

پہلا اتقیاء اور نیک لوگوں کا مقام ہے، کہ اپنے نفس کو ہر قسم کے ظاہری اور باطنی ناپاکی سے پاک و صاف رکھتے ہیں، ورنہ دوسرا مقام ابتدائی سالک کا ہے، جو کہ اس راستے پر پہلی بار چل پڑا ہے، مبتدی بن کر، اسے اللہ تعالیٰ کا ذکر سکھایا جاتا ہے، تاکہ اس سے خدا کی عظمت اور خوف اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم یا اسے سکھا نا کسی بھی حالت میں فائدہ سے خالی نہیں تھا، چاہے وہ کامل نفع ہو، جس سے نفس کا مکمل تزکیہ ہوتا ہے، یا ابتدائی نفع کہ اللہ تعالیٰ کی یاد، ذکر اور خوف اس کے دل میں بڑھ جاتا، دونوں جملوں کے درمیان لفظ تردیدی "او" آیا ہے، تا کہ ان دونوں حالتوں میں سے کوئی ایک حالت حاصل ہو جائے، یہاں "مانعة الخلو" کی صورت ہے، یعنی یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں منافع ایک ساتھ حاصل ہوں، کہ ابتداء میں نصیحت اور تذکیر حاصل ہو، اور آخر میں تزکیہ نفس میسر آجائے، "مانعة الجمع" نہیں ہے کہ دونوں ایک ساتھ جمع نہ ہوں۔ "مظہری"

انبیاء کا معصوم ہونا

اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر دین اور شریعت کی تبلیغ میں معصوم ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ: جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے اس میں کمی بیشی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے بارے میں سورۃ الحاقہ میں فرماتا ہے: وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ * لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ * فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ * وَإِنَّهُ لَتَذَكَّرٌ لِلْمُتَّقِينَ (سورۃ الحاقہ 44-48)۔

یعنی اگر ہم پر جھوٹ باندھتا، تو ہم اسے سختی سے پکڑتے اور ہم اس کے دل کی رگ کاٹ دیتے، اور تم میں سے کوئی بھی اس کو سزا دینے سے نہیں بچا سکتا تھا، اور یہ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے۔

رب تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی علیہ السلام سے فرمایا: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِيكَ مِنَ النَّاسِ (سورۃ مائدہ 67)

اے پیغمبر! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا اس کی تبلیغ کر، اگر ایسا نہیں کیا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا، اور اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

اس بنا پر یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء دین اور شریعت میں سے کوئی چیز بھول جائیں اور لوگوں تک نہ پہنچائیں، یا اسے بدل دیں یا چھپادیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دین کو مکمل طور پر لوگوں تک پہنچادیا اور ان کے سامنے پیش کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حجة الوداع کے موقع پر یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: (الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) (سورۃ المائدہ آیت: 4) ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی، اور اسلام بطور دین کے تمہارے لیے پسند کیا۔

نیز اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر کبائر کے ارتکاب سے معصوم تھے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کھاہے: عالم اسلام کے اکثر علماء اور تمام فرقے کہتے ہیں کہ: انبیاء علیہم السلام کبائر کے ارتکاب سے (نہ کہ صغائر) معصوم تھے، اور اہل تفسیر وحديث اور فقہاء کا بھی یہی کھاہے،

بلکہ اس بات کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ سلف امت او رائمہ دین، صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین میں سے کسی نے اس کے خلاف کوئی بات کی ہو (مجموع الفتاوی جلد : 319/4)۔

تنبیہ

بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ انبیاء کرام سے بعض دینی کاموں یا دین اور شریعت سے متعلق امور میں معمولی سی فروگزاشت ہوئی، مگر فی الفور ان کی اصلاح وحی الہی کے ذریعے کی گئی، تاکہ ایسا نہ ہو کہ رسالت کا کام مشکوک ہو جائے، اس طرح درپیش نقصان کی تلافی کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا جاتا، تاکہ آپ کے ساتھی بھی سیکھ جائیں کہ جب بھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا ازالہ کیسے کیا جائے؟

بالفاظ دیگر: غلطیوں کا سرزد ہوجانا لوگوں کو دین کی تعلیم سے آراستہ کرنے کا ایک طریقہ تھا۔

مثال کے طور پر : ایک روایت میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعت والی نماز میں سہوًا دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو فی الفور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ازالہ کر کے سجدہ سہو کیا، لوگوں نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ سیکھ گئے کہ آئندہ جب کبھی نماز میں سہو ہو جائے تو (نماز دوہرائے بغیر) کیسے اس کا ازالہ کیا جائے، تو اس طرح سہو واقع ہونے کی حکمت لوگوں کو دین سکھانا ہے، اب ہم ایسے واقعات اور روایات کی موجودگی کی وجہ سے جانتے ہیں کہ سہو ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے، اگر یہ روایات اور واقعات نہ ہوتے تو ہم اس کے ازالے کو نہیں سمجھ پاتے۔

ایک اور مثال بدر کے قیدیوں کا واقعہ ہے، امام احمد وغیرہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا: خدا نے ان کو آپ لوگوں کے طاقتور پنجے میں دیدیا ہے، آپ لوگوں کی ان قیدیوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کہا: ان سب کی گردنیں اڑادیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منہ پھیرا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور کھنے لگے: میری رائے یہ ہے کہ ان کو معاف کیا جائے (ان کو قتل کرنے سے صرف نظر کیا جائے) اور ان سے

فدیہ وصول کیا جائے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ کے بدلے ان کو معاف کر دیا، اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی: "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ *لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" (احمد: 13143) ترجمہ: "کسی پیغمبر کیلئے جائز نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں اور وہ ان کا خون نہ بہائے، تم دنیا کا فائدہ چاہتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ (تمہارے لیے) آخرت کا فائدہ چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے، اگر رب تعالیٰ کی طرف سے صادر شدہ فیصلہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو اس فدیہ کے بدلے جو تم نے حاصل کیا تمہیں ایک بڑا عذاب گھیر لیتا"

اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے فدیہ کے بدلے قیدیوں کو آزاد کرنے کا حکم فرمایا، لیکن اس اجتہاد کی وحی کے ذریعہ تائید نہیں ہوئی، اور لوگ سمجھ گئے کہ شارع کا مقصود کیا ہے، اس بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت اور دین کے ابلاغ میں معصوم تھے۔

اگر کبھی عبادت کے معاملے میں ان سے کوئی سہو یا غلطی ہو جاتی، اگر کوئی اجتہادی سہو دینی احکام سے متعلق صادر ہو جاتی تو فوری طور پر وحی کے ذریعہ ان کی اس سہو کی تصحیح کی جاتی، اور لوگوں تک پہنچادی جاتی، اور لوگ دین کے مسائل اس سے سیکھتے۔

لیکن بعض اوقات ان سے دنیا کے معاملات اور کار بار میں بھی غلطیاں ہو جاتی تھیں، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے لیے رسالت کے امور اور دنیاوی امور میں فرق کرنا آسان تھا، اگرچہ دینی امور کی پہچان اور فرق کرنا دنیاوی امور سے ہر انسان کا کام نہیں ہے، اس لیے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام آپ سے سوال کرتے تھے کہ فلاں کام یا امر وحی ہے، یا آپ کی ذاتی رائے؟

جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے لشکر کو حکم دیا کہ مشرکوں سے پہلے بدر کے پانیوں پر پہنچ جائیں، اور انہیں وادی بدر کے پانی کے ذخائر تک نہ پہنچنے دیں، انہوں نے رات کے ایک حصے میں وادی بدر کے قریب ترین پانی کے کنویں پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔

حُبَاب نے ایک عسکری تجربہ کار اور ماهر کی حیثیت سے کہا: (أرأيت هذا المنزل أم نزل أنزله الله ليس لنا أن نتقدمه ولا نتأخره أمر هو الرأى والحرب والمكيدة؟ قال بل هو الرأى والحرب والمكيدة قال يا رسول الله فإن هذا ليس لك بمنزل امض بالناس حتى نأتى أدنى ماء من القوم فنعسكر فيه ثم نغور ما وراءه من الآبار ثم نبني عليه حوضاً فنبلؤه ماءً ثم نقاتل القوم فنشرب ولا يشربون فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لقد أشرت بالرأى ثم أمر بإنفاذه فلم ينجء الليل حتى تحولوا كما رأى الحباب وامتلكوا مواقع الماء» (فقه السيرة) و (دلائل النبوة) البانى نے اسے صحیح قرار دیا ہے) ترجمہ: "اے اللہ کے رسول! اس مقام پر جو ہم ٹھہرے ہیں، کیا اس مقام پر رکنا اللہ تعالیٰ نے (وحی کے ذریعے) ہمارے لیے متعین کیا ہے کہ ہم اس سے آگے جانے کا حق نہیں رکھتے اور نہ اس سے پیچھے جاسکتے ہیں، یا یہ رأی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی حکمت عملی ہے؟ فرمایا: "بل هو الرأى والحرب والمكيدة" نہیں، بلکہ یہ میری رائے اور جنگی حکمت عملی ہے، حُبَاب بن منذر نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، بلکہ لشکر کو حرکت دیں مخالف جماعت کی طرف تا کہ قریب ترین کنویں کے پانی تک پہنچ جائیں، وہاں ٹھہر جائیں، اور اس طرف کے کنوؤں کو کھود کر (حوض) تالاب بنائیں، اور اس میں پانی بھریں، تب مخالفین سے جنگ کریں کہ ہمارے پاس پانی ہو اور ان کے پاس نہ ہو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لقد أشرت بالرأى" تم نے بہترین رائے پیش کی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کو چلنے کا حکم فرمایا، : جاکر دشمن کے قریب ترین کنویں تک پہنچ گئے، اور آدھی رات کو وہاں جا بسے، راتوں رات پانی کے تالاب بنائے اور وہاں کے تمام پانی کے کنوؤں کو کھود کر ان کا پانی اُن تالابوں میں بھر دیا۔

اس معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب حُبَاب بن منذر پر مسئلہ مشتبہ ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل وحی ہے یا ذاتی رائے ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے۔

ایک دوسری صحیح روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن چند آدمیوں کے پاس سے گذر رہے تھے اور وہ لوگ اپنے کھجوروں کی تلقیح

(نرکھجور کے پھول مادے میں ملانا) کر رہے تھے، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: "لَوْلَمْ تَفْعَلُوا الصَّلَاحَ" اگر تم لوگ اس طرح کھجوروں کے نر اور مادے کو ملانے والا عمل نہ کرو تو بہتر ہوگا، تو نبی علیہ السلام کے کہنے پر انہوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا، لیکن اس کے بعد کھجوروں کی پیداوار اچھی نہیں ہوئی۔

کچھ مدت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ ان کے پاس گئے ان سے پوچھا کہ: "مَا لِنُغْلِبُكُمْ؟" کھجور کیسے پھل دے رہے ہیں؟ انہوں نے کھجوروں کے کم پھل دینے کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ: "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ" آپ لوگ اپنے دنیاوی امور کو بہتر جانتے ہو۔

مسند بزار میں آیا ہے کہ فرمایا: «وَإِنِّي قُلْتُ لَكُمْ ظَنًّا ظَنَنْتُهُ، فَمَا قُلْتُ لَكُمْ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فَلَنْ أَكْذِبَ عَلَى اللَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى» یعنی: جو میں نے آپ لوگوں سے کھا یہ میری اپنی ذاتی رائے تھی، لیکن جب میں آپ لوگوں سے کھدوں کہ اللہ رب العزت نے فرمایا، وہ کبھی بھی رب تعالیٰ پر جھوٹ نہیں ہوگا۔ (صحیح مسلم 2363) و مسند البزار (937)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ: «إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي، فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ»۔ صحیح الجامع (2338)۔

ترجمہ: بیشک میں بشر ہوں (تمہارے جیسے) میں تمہیں دین کے معاملے میں کوئی حکم کردوں تو فوراً بجالاؤ، اور اگر اپنی ذاتی رائے سے کچھ کہوں تو تم سمجھو اس میں بشریت کے لحاظ سے غلطی کا احتمال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ :

انبیاء علیہم السلام دین کی تبلیغ میں معصوم عن الخطأ تھے، اور انہوں نے دین سے متعلق تمام احکام کمی بیشی اور کسی قسم کی غلطی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دیئے ہیں، اگر کبھی دین سے متعلق کسی مسئلہ میں ان سے سہو ہو جاتی تو فوری طور پر وحی کے ذریعے سے ان کی اصلاح کرا دی جاتی، اور لوگ اس سے باخبر ہو جاتے، دین کے علاوہ دنیاوی معاملات میں معصوم نہیں تھے، اور اس سے ان کی رسالت میں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا، کیونکہ رب تعالیٰ

نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے لیے ایسا پیغمبر بھیجا ہے جو تاجر اور طبیب یا کسی صنعت سے وابستہ ہے۔

اس لیے کہ ان امور میں غلطی کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں، اور امور رسالت کے معاملات کی پہچان لوگوں کے لیے آسان تھی، جیسا کہ ہم نے چند مثالیں بیان کر دیں کہ دینی مسائل اور دنیاوی مسائل میں فرق کرنا آسان تھا اور دین سے متعلق تمام مسائل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین کے عنوان سے لوگوں کو سمجھا رہے تھے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ فلاں مسئلہ دین کا ہے، اور فلاں مسئلہ (دنیاوی امور سے متعلق ہے) رسالت کے امور میں سے نہیں ہے۔ اس بنا پر فقہائے اسلام نے کہا ہے: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں اصول یہ ہے کہ آپ کا قول شریعت کی قانونی بنیاد ہے، اور وحی کا حصہ ہے۔

البتہ اگر ایسی کوئی دلیل ہو جو ثابت کرے کہ آپ کا فلاں قول آپ کی ذاتی رائے ہے تو الگ بات ہے، اور اگر ایسی کوئی دلیل میسر نہ ہو تو اصل پر عمل کیا جائے گا، یعنی آپ کے اقوال وحی کے تائید کنندہ ہوں گے، اور وہ شرعی حکم ہوں گے۔

جبکہ نبوی افعال میں اصول یہ ہے کہ ہمیشہ شرعی حکم نہیں ہوتا، کبھی قانونی ہوتا ہے، اور کبھی اجتہادی اور کبھی ذاتی رائے۔

انبیاء علیہم السلام کن امور میں معصوم ہیں؟

انبیاء علیہم السلام مخلوقات میں سب سے اشرف اور پاک تھے، سب سے زیادہ تقویٰ والے تھے، رب تعالیٰ سے ڈرنے والے اور وہ منتخب جماعت ہیں جن کی طرف لوگوں کو دیکھنا چاہیے اور ان کی اقتدا کرنی چاہیے۔

خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو خطاؤں اور گناہوں سے عصمت اور حفاظت کا درجہ حاصل ہے، ہم عصمت سے متعلق مسائل کو درج ذیل دو امور میں تقسیم کرتے ہیں۔

- 1- دین کی تبلیغ میں عصمت
- 2- بحیث بشر کے غلطیوں سے پاک ہونا

پہلا امر یعنی: تبلیغ دین میں تمام انبیاء معصوم ہیں، رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ * لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ * فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ * وَإِنَّهُ لَتَذَكُّرٌ لِلْمُتَّقِينَ" (سورہ الحاقہ 44-48)۔

ترجمہ: اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنالائے، تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے، پھر اُن کی رگ گردن کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا، اور یہ (کتاب) تو پرہیزگاروں کے لئے نصیحت ہے۔

اور اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: "يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (سورہ مائدہ 67)۔

ترجمہ: اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچادو، اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے، (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔

شیخ عبد العزیز بن باز رحمہ اللہ (فتاویٰ ابن باز میں: ج 6/371) فرماتے ہیں: تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام دین کی تبلیغ میں غلطیوں سے معصوم ہیں، جیسا کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں: (والنجم إذا هوى * ما ضل صاحبكم وما غوى * وما ينطق عن الهوى * إن هو إلا وحي يوحى * علمہ شدید القوی) (سورہ النجم 1-5) **ترجمہ:** تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے، کہ تمہارے رفیق (محمد) نہ رستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں، اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (انکی طرف) بھیجا جاتا ہے، انکو نہایت قوت والے نے سکھایا (یعنی جبرائیل)۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ دین سے متعلق تمام امور قول، فعل اور تقریر میں معصوم ہیں، اس مسئلہ میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

دوسرا امر: یعنی بشری اور انسانی غلطیوں سے پاک ہونا، یہ مسئلہ دوحصوں میں تقسیم ہوتا ہے:

- 1- کبیرہ گناہوں سے متعلق انبیاء علیہم السلام کی عصمت، کہ تمام انبیاء علیہم السلام کبائر کے ارتکاب سے معصوم ہیں، جیسا کہ شیخ السلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (مجموع الفتاوی: ج-4/319) میں اس پر تاکید فرماتے ہیں۔
- 2- صغیرہ گناہ، بعض اوقات انبیاء علیہم السلام میں سے بعض صغائر کے مرتکب ہوئے ہیں، اس لیے اکثر اہل علم معتقد ہیں کہ انبیاء علیہم السلام صغائر سے معصوم نہیں ہیں۔

اگر انبیاء میں سے کسی نے صغیرہ گناہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے تنبیہ کی ہے اور اس نے توبہ کے لیے پھل کی ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے گناہ کیا اور شیطان نے اسے بھکایا، دلیل کے طور پر رب تعالیٰ کی نازل کی ہوئی اس آیت کو پیش کرتے ہیں: "فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهَا سَوءُ أَلْوَانِهَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجُتَّةِ وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى" (سورہ طہ 121)۔ ترجمہ: تو دونوں نے اُس درخت کا پھل کھالیا تو ان پر انکی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں، اور وہ اپنے (بدنوں) پر بھشت کے پتے چپکانے لگے، اور آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

اور سورہ بقرہ آیت (36) میں فرماتے ہیں: "فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا" ترجمہ: پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلادیا۔

مگر ان لوگوں کی بات غلط ہے اس لیے: کہ یہاں پر آدم علیہ السلام سے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے وہ نبوت سے پہلے ہے، اس کی بنیاد پر آدم علیہ السلام کو طعن کرنا درست نہیں ہے، امام ابوبکر بن فورک کہتے ہیں: یہ معاملہ نبوت سے پہلے کا ہے، اس کی دلیل رب تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "ثُمَّ اجْتَبَاكَ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى" (سورہ طہ 122) ترجمہ: پھر رب تعالیٰ نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول فرما کر اسے ہدایت بخشی۔

کہتے ہیں کہ اسے منتخب کرنا اور ہدایت دینا گناہ ونا فرمانی کے بعد کا ہے، اگر نبوت سے پہلے کا ہو تو یہ اس اکیلے کی لغزش ہے، اور نبوت

سے پہلے انبیاء کیلے کوئی شریعت نہیں ہوتی کہ ہم پر اس کی تصدیق کرنا واجب ہو۔

لیکن جب رب تعالیٰ نے اسے لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا تو پھر دین کے پہنچانے میں امانتدار اور معصوم ہیں، اور سابقہ گناہ سے ان کو نقصان نہیں پہنچتا۔

اگر یہ کھاجائے کہ رونما ہونے والے ان واقعات کا کس طرح آدم علیہ السلام کے قبل نبوت سے ربط دیتے ہو، کیا نبوت رب تعالیٰ کی طرف سے وحی کو نہیں کہتے؟

جب کہ آیات واحادیث یہ بیان کرتی ہیں کہ رب تعالیٰ آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے نکلنے سے پہلے بھی بات کرچکے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ: یہاں نبوت منتفی ہے، اس لیے کہ نبوت صرف وحی نہیں ہے، بلکہ کسی نبی اور پیغمبر کیلئے جدید شریعت کا بھیجنا یا پہلے والے شریعت کی تجدید ہے۔

اور یہ دلائل آدم علیہ السلام کے متعلق نہیں ملتے ہیں کہ جنت میں اپنی بیوی کے ساتھ انہیں شریعت دی گئی ہو۔

اس وجہ سے سب سے صحیح بات آدم علیہ السلام کے ساتھ رونما ہونے والے واقعات میں یہ ہے کہ یہ نبوت اور ان کے مبعوث ہونے سے پہلے تھا۔

صرف وہی چیز جو آدم علیہ السلام کے لیے شریعت کو ممکن بناتی ہے وہ ہے توبہ جو انہوں نے نافرمانی کے بعد کی تھی۔

البتہ یہ توبہ بھی شریعت ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ روح کی پاکیزگی اور آدم علیہ السلام کی طرف سے خالق کے مقام و مرتبہ کے پہچان کی وجہ سے ہوا، رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ

الرَّحِيمُ" (سورہ بقرہ 37)

ترجمہ: پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے (اور معافی مانگی) تو اس نے قصور معاف کر دیا بیشک وہ معاف کرنیوالا (اور) صاحب رحم ہے۔

ان مثالوں میں سے جن کو مخالفین اس بارے میں بیان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے قرآن کریم پر اعتراض کریں، ایک مثال اس

واقعے کی ہے جو نبوت سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق رونما ہوا ، اور وہ قتل کا ارتکاب ہے ، اور اس کے لیے قرآن سے دلیل لاتے ہیں : وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ ۖ هَذَا مِنْ شِيعَتِهِ وَهَذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنَ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ ۚ فَوَكَزَهُ مُوسَى فَقَضَى عَلَيْهِ ۚ قَالَ هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ۝ (سورہ قصص)۔

ترجمہ: شہر کے لوگ بے خبر تھے کہ موسیٰ علیہ السلام شہر میں داخل ہوئے ، اور دیکھا کہ دوشخص آپس میں لڑ رہے ہیں ، ان میں سے ایک موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا دشمن کی قوم سے تھا ، تو پھر جوشخص موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا وہ مدد کیلئے پکارا ، موسیٰ علیہ السلام اس کی مدد کیلئے دوڑے اور ایک مُگے سے اس کا کام تمام کر دیا ، اور کہا یہ کام شیطان کے بھکاوے سے ہوا ، یقیناً شیطان گمراہ کرنے والا اور کھلا دشمن ہے ، اس کے بعد کہتے ہیں کہ: موسیٰ علیہ السلام اس غلطی کے ارتکاب سے کافی پشیمان ہوئے ، یہی ندامت سبب بنی کہ اپنے پروردگار کے حضور قیامت میں شفاعت کرنے سے پیچھے رہیں گے ، جیسا کہ شفاعت والی طویل حدیث میں بیان ہوا ہے: "فَيَأْتُونَ مُوسَىٰ فَيَقُولُونَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ فَضَّلَكَ اللَّهُ بِرِسَالَتِهِ وَبِكَلَامِهِ عَلَى النَّاسِ اشْفَعْ لَنَا إِلَىٰ رَبِّكَ أَلَا تَرَىٰ إِلَىٰ مَا نَحْنُ فِيهِ فَيَقُولُ إِنَّ رَبِّي قَدْ غَضِبَ الْيَوْمَ غَضَبًا لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ وَإِنِّي قَدْ قَتَلْتُ نَفْسًا لَمْ أَوْمَرْ بِقَتْلِهَا نَفْسِي نَفْسِي نَفْسِي" (بخاری)

ترجمہ: قیامت کے دن لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے موسیٰ! آپ تو اللہ کے رسول ہو ، رب تعالیٰ نے آپ کو رسالت دے کر اور آپ سے ہم کلام ہو کر آپ کو فضیلت دی ہے ، اپنے پروردگار سے ہماری شفاعت کریں ، آپ ہمیں نہیں دیکھتے کہ ہم کس حالت میں ہیں ، موسیٰ علیہ السلام جواب میں کہیں گے: میرا رب آج اتنے غصے میں ہے کہ نہ پہلے کبھی تھا اور نہ آئندہ اتنا غصہ ہوگا ، میں نے ایک شخص کو بغیر کسی حکم کے قتل کر دیا تھا ، اس لیے مجھے اپنی فکر لگنی ہے ۔

اس بارے میں بھی امام ابوبکر بن فورک کہتے ہیں کہ : جو کچھ مخالفین موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کرتے ہیں وہ بھی نبوت سے پہلے کا واقعہ

ہے ، جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: «قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ*وَفَعَلْتَ فَعَلَتِكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ*قَالَ فَعَلْتُهَا إِذَا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ*فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَبَا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ» (سورہ شعرا 18-21) .

(فرعون نے موسیٰ سے کہا) کیا ہم نے تم کو کہ ابھی بچے تھے پرورش نہیں کی اور تم نے برسوں ہمارے ہاں عمر بسر (نہیں) کی، اور تم نے وہ کام کیاتھا جو کیا اور تم ناشکرے معلوم ہوتے ہو، (موسیٰ نے) کھاکہ (ہاں) وہ حرکت مجھ سے ناگہاں سرزد ہوئی تھی اور میں خطاکاروں میں تھا، تو جب مجھے تم سے ڈر لگا تو میں تم سے بھاگ گیا، پھر خدانے مجھے نبوت و علم بخشا اور مجھے پیغمبروں میں سے کیا۔

موسیٰ علیہ السلام اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ اپنے قومی بھائی کا دفاع کرنا چاہتے تھے، اس بنا پر وہ قتل عمد کے مرتکب نہیں ہوئے، اس کام کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے بخشش طلب کی، اور خدا نے بھی انہیں بخش دیا، جیسا کہ فرماتے ہیں: قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (سورہ قصص 16)

ترجمہ: بولے کہ اے پروردگار! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے تو خدا نے ان کو بخش دیا بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔
انبیاء علیہم السلام کی طرف جو اعتراضات منسوب کیے جاتے ہیں تو یہ عمل خلاف اولیٰ ہے، یعنی اس کام کو نہ کرنا بہتر تھا۔

ہم لوگوں کے جنت میں جانے کے ذمہ دار نہیں ہیں

قرآن کریم ایک خاص خوبصورتی کی ساتھ کہتا ہے: إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّٰ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهِ ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ۝ (سورہ زمر)

ترجمہ: ہم نے تم پر کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لئے سچائی کے ساتھ نازل کی ہے، تو جو شخص ہدایت پاتا ہے تو اپنے (بھلے کے) لئے اور جو گمراہ ہوتا ہے اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اور (اے پیغمبر) تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔

مفسرین کرام اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر قرآن کریم بشریت کی رہنمائی کیلئے نازل ہوا ہے، "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ"۔

ترجمہ: ہم نے تم پر کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لئے سچائی کے ساتھ نازل کی ہے۔

یقیناً یہ پر عظمت کتاب ہے اور معجزات سے بھری ہوئی ہے، اس میں باطل اور بے معنی چیزیں نہیں ہیں۔

بشریت کی ہدایت اور رہنمائی کیلئے تجھ پر اتارا ہے، اہل علم کا کھنا ہے کہ مذکورہ آیت میں لفظ "حق" کے بارے میں دو تفسیریں ہیں:

1- سب سے پہلے قرآن عظیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول اور ترسیل حق کے ساتھ ہوئی ہے، اور اس میں کسی قسم کا کوئی باطل نہیں ہے۔

2- دوم یہ ہے کہ یہ کتاب حق ہے: (ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ) ہے، قرآن کریم حق اور اس میں کسی بھی قسم کے شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے، اور متقیوں کی رہنمائی کیلئے اتری ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ یہ کتاب: یعنی قرآن عظیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بشریت کی ہدایت اور رہنمائی کے واسطے نازل ہوئی ہے، چنانچہ انسانوں پر لازم ہے کہ ہدایت اور رہنمائی اس کتاب سے حاصل کریں۔ اور جو کچھ انسان کی گمراہی اور ضلالت کا سبب بنتا ہے اس سے بچیں اور دوری اختیار کریں، قرآن کریم کو سمجھنا اور اپنی زندگی کو قرآن کریم کے منطقی فہم پر استوار کرنا ضروری ہے کہ جس چیز کی طرف یہ کتاب ہمیں دعوت دیتی ہے، اس کی طرف جانا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اور جس چیز سے ڈراتی اور منع کرتی ہے اس کی تنبیہات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے، اور ان ممنوعات کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے، جن ممنوعات کو قرآن نے بیان کیا ہے۔

جس چیز کی طرف قرآن کریم ہمیں بلاتا ہے، اسے رُشد و ہدایت جاننا چاہیے اور جس سے ہمیں ڈراتا دھمکاتا ہے اسے باطل سمجھنا چاہیے اور اس سے دوری اختیار کرنا چاہیے۔

اگلی آیت کریمہ میں ہے کہ : "فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ" پھر جو شخص اور انسان ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے، اور دلیل و بُرہان کے ساتھ حق کی طرف دوڑتا ہے، یہ اس کے فائدے میں ہوگا، کیونکہ یہ ایک علمی اصول ہے : کہ حق قبول کرنے کا نتیجہ انسان کو ہی ملتا ہے ۔

(وَمَنْ ضَلَّ فَاتِّمِمْضْ عَلَيْهَا) اور جو شخص گمراہ ہوا حق اور کلام الہی سے سرکشی کی اور منحرف ہوا تو بالآخر یہ اس کے لیے نقصان کا سبب بنے گا، نتیجتاً ایک گمراہ شخص شمار کیا جائیگا۔
دوسرے لفظوں میں وہ اپنی منحرف عمل کی سزا چکھے گا، (وَمَا أَنتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ)

ترجمہ: اے رسول! تو ان پر ذمہ دار نہیں ہے ، یعنی حق کو ان کے دل میں پہنچانے کی ذمہ داری آپ کی نہیں ہے، یا یہ کہ آپ کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کی ہمیشہ سے نگرانی کریں کہ وہ منحرف نہ ہوں۔

کیونکہ آپ ان کو زبردستی اسلام اور ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے، آپ کا کام صرف اور صرف آسمان سے آیا ہوا پیغام ان تک پہنچانا ہے، نہ آپ ان کے دلوں کے نگران ہو اور نہ ان کو حق قبول کرنے پر مجبور کرسکتے ہو۔

ایمان ایک معاہدہ ہے ، اور یہ دل اور باطن کا عزم ہے ، جسے انسان اپنی مرضی سے قبول کرتا ہے، اسی وجہ سے اسلام جو کہ ایک مقدس دین ہے جبری ایمان کو قبول نہیں کرتا، ہمارے رب عظیم نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے تا کہ اپنی تحقیق سے دین منتخب کرے۔

قرآن کریم کے منطقی فہم کے مطابق جن لوگوں نے کسی ناحق دین کا انتخاب کیا ہے، ان کو کافر اور جن لوگوں نے درست اور برحق دین کا انتخاب کیا ہے انہیں مؤمن کہا جاتا ہے ۔

اس حساب سے کوئی مسلمان تو ہوسکتا ہے ، اور حق کے سامنے سرتسلیم خم کرسکتا ہے ، لیکن مؤمن نہیں ہوسکتا ہے، جیسا کہ ہم نے بتایا: مؤمن وہ اندرونی عہد اور معاہدہ اور رشتہ ہے جس معاہدے کی صداقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور خود شخص مؤمن جانتا ہے ۔

دین اسلام نے ایک قاعدہ اور قانون وضع کر دیا ہے دین کے انتخاب کے لیے ، اس قانون کی بنیاد سورہ بقرہ کی آیت "256" میں بہت عمدگی سے بیان کی گئی ہے، رب عظیم فرماتے ہیں: "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ..."

آیت مبارکہ کا شأن نزول : یہ سورہ بقرہ کی آیت ہے اور یہ سورت ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہونا شروع ہوئی، اس سورت کا نزول تب شروع ہوا جب اسلامی حکومت اور نظام تشکیل کے مراحل میں تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ : یہ آیت اہل مدینہ اور بنی سالم بن عوف کے قبیلے سے ایک شخص جس کا نام "حصین" ہے کہ بارے میں نازل ہوئی ہے، قصہ کچھ اس طرح ہے کہ "حصین" خود تو مسلمان ہوا تھا ، لیکن اس کے دونصرانی بیٹے ابھی تک اسلام کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے، اس آدمی نے اس واقعے کا پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ان دونوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہوں، کیونکہ وہ دونوں نصرانیت کے علاوہ کسی دوسرے دین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ؟ اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی : "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ..."

اسی طرح بعض مفسرین اس کے شأن نزول کے بارے میں کہتے ہیں کہ : انصار کے ایک آدمی کا ایک سیاہ فام غلام تھا، جس کا نام "صبیح" تھا، وہ انصاری چاہتے تھے کہ اسے زبردستی اسلام لانے پر مجبور کریں، اسی اثناء میں یہ آیت نازل ہوئی تو "صبیح" اور تمام مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ دین اسلام قبول کرنے کے لیے لوگوں پر کوئی جبر و زبردستی نہ کریں، اور فرمایا کہ : انسانوں کو مکمل آزادی و اختیار حاصل ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوڑھی نصرانی عورت کو اسلام کی دعوت دی، تو بوڑھی عورت نے جواب میں کہا: "أنا عجوزٌ كَبِيرَةٌ وَالْمَوْتُ أَقْرَبُ إِلَيَّ" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بوڑھی عورت کا جواب سننے کے بعد اسے ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ اس آیت مبارکہ کی تلاوت کی: "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ..."

یعنی دین میں کوئی چیز جبری نہیں ہے، اور حقیقت میں ایمان قبول کرانے پر کوئی زور و زبردستی کام نہیں آئے گا۔

دین اسلام نے ایمان کو ظاہری اعضاء کے ساتھ مربوط نہیں رکھا ہے، بلکہ ایمان اور عدم ایمان ان امور میں سے ہے جن کا تعلق انسان کی اندرونی چاہت اور رضا کی ساتھ ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں : "وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۝ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۝" کھدو: حق (وہی ہے جو) رب کی طرف سے (آیا) ہے، (اور میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں جو کہ میرا اور تمام مؤمنین کا مشن ہے) پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جو چاہے اس کا انکار کر دے (سورۃ الکہف : 29)۔

قرآن کریم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حیثیت کو واضح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامقصد فقط تبلیغ کرنا اور دعوت دینا ہے، کسی کو زور و زبردستی کے ساتھ اسلام لانے پر مجبور کرنا نہیں : "أَفَأَنْتُ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝" (یونس: آیہ ۹۹) اے پیغمبر! کیا تم چاہتے ہو کہ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دو، (یہ کام نہ تو درست ہے نہ فائدہ والا ہے اور نہ ہی تیرا کام ہے)۔

پھر سورۃ الغاشیہ (آیت : 22) میں فرماتے ہیں : "لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُضْطَرٍ ۝" آپ ان پر غلبہ نہیں رکھتے۔

اسی طرح سورۃ الشوری میں فرماتے ہیں : "فَإِنْ أَعْرَضُوا لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُضْطَرٍ ۝" ۱۰۲۲ "فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝" ۱۰۲۳ "إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ ۝" اگر مشرکین آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کریں (کوئی مسئلہ نہیں ہے غمگین مت ہو) کیونکہ ہم نے آپ کو ان کی مراقبت اور نگرانی کے لیے نہیں بھیجا ہے، آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں سورۃ مزمل (آیت : 19) میں فرماتے ہیں : "فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝" پھر جو چاہے بنالے اپنے رب کی طرف راہ ۔

اس آیت مبارکہ میں "من شاء" کا جملہ دلیل ہے انسان کی آزادی اور اختیار پر کفر اور ایمان اختیار کرنے پر ، "إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝۳۱" ترجمہ: ہم نے انسان کو راہ دکھائی ہے چاہے شکر گزار بنے (قبول کرے) یا (مخالفت کرے) انکار کرے ۔

حق اور باطل کے راستے ایک دوسرے سے الگ ہو چکے ہیں ، دونوں راستوں کی پہچان کرادی گئی ہے ، ان میں سے ہر ایک کا انتخاب انسان کے اختیار میں ہے ، وہ مجبور نہیں ہے ، جس راستے کا چاہے انتخاب کرے ، البتہ اگر انسان نے حق اور حقیقت کا راستہ اپنایا تو جنت اور ہمیشہ والی سعادت کو پالے گا۔

اور اگر باطل راستے کا انتخاب کیا تو پھر جہنم اور ہمیشہ والی بدبختی میں گرفتار ہوگا ، قرآن کریم نے ایک سو بیس (120) سے زیادہ آیتوں میں یہ تاکید کی ہے کہ اسلام قلبی اطمینان اور خالص پاکیزہ تعلیم کی بنیاد پر پھیلا ہے ۔

اور اسلام کو لوگوں میں متعارف کروانے کے بعد انہیں تمام اور مکمل اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس کے بعد دین کو قبول کرنے میں آزاد ہیں۔

اسی رویہ اور عظیم انسانی منطق کے سبب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد اہل مکہ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا ، اور فرمایا : «اذهبوا فأنتم الطلقاء» جاؤ آپ لوگ آزاد ہو ، اس عظیم فتح کے بعد کسی کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بسم الله الرحمن الرحيم

جزء - (30)

سورة التکویر

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی یہ "29" آیتوں پر مشتمل ہے

وجه تسمیہ:

اس سورت کا آغاز رب تعالیٰ کے فرمان (اذلّشّمسُ کُورَت) کے لفظ "تکویر" سے کیا گیا ہے۔

اس سورت کا دوسرا نام "کُورَت" ہے، لفظ "کُورَت" اس سورت کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے، "کُورَت" ماضی مجہول کا صیغہ "تکویر" کے مصدر سے لپیٹنے کے معنی میں ہے۔

واضح رہے کہ یہ سورہ سورہ "مسد" کے بعد مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

"تکویر" سورج کا لپیٹنا، اور اس کی روشنی ختم کرنا۔

اس سورت کا نام قیامت سے پہلے موجودہ نظام میں رونما ہونے والے حوادث میں سے ایک عظیم حادثے کی طرف اشارہ کرتی ہے، سورج سے متعلق پیش آنے والا واقعہ، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت اور رحمت کے واضح ترین مظاہر میں سے ایک ہے، اور یہ اس مہم کو بیان کرتی ہے کہ انسان اس انجام کو پہنچتا ہے جس کا آغاز اس نے خود ہی کیا ہے، البتہ قیامت سے پہلے بڑے بڑے واقعات کے وقوع پزیر ہونے کے بعد لوگوں کی آزمائش اور حساب ہوگا، اور کرہ ارض میں ایسے لوگوں کا وجود جو خدا کی تدبیر کو قبول نہیں کرتے اور اسے برداشت نہیں کرسکتے، اللہ تعالیٰ کی تدبیر میں ذرہ برابر بھی خلل پیدا نہیں کرسکتے، اگر کوئی شخص سورج کی روشنی نہ دیکھ سکے تو مسئلہ اس کی آنکھوں کا ہے، نہ کہ سورج کی روشنی کا۔

سورة التکویر کے نزول کا وقت:

سورہ مبارکہ کے مشتملات اور طرز بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس سورہ نے بعثت کے ابتدائی دور میں شرف نزول پایا ہے۔

مکی سورتوں کی بعض خصوصیات:

- 1 - زیادہ قسمیں کھانا
- 2 - اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان کا موضوع اور جنت کی صفات
- 3 - چھوٹی آیتیں
- 4 - مشرکین سے بحث اور جدال
- 5 - قصص اور واقعات
- 6 - يَا أَيُّهَا النَّاسُ عبارت کا ذکر
- 7 - جہاد کی بات کرنا

سورہ تکویر کا سورہ عَبَسَ سے ربط و مناسبت:

دونوں سورتیں قیامت کے عظیم اور سخت واقعات کو بیان کرتی ہیں، عَبَسَ (آیات مبارکہ: 33 تا 42) اور سورہ تکویر (آیات مبارکہ: 1 تا 14)

سورة التکویر کی آیات ، کلمات اور حروف کی تعداد:

یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے، اور مکی سورتوں میں سے ہے۔
سورة التکویر کا ایک (1) رکوع ہے، انتیس آیتیں (29)، اور ایک سو چار (104) الفاظ، چار سو چھبیس (426) حروف، اور دوسو انتیس (229) نقطے ہیں۔

(یہ بات ذکر کرنا لازم ہے کہ علماء کے اقوال سورتوں کے حروف کی تعداد گننے میں مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کیلئے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)۔

سورت سے واقفیت:

اس سورت کے جملے مختصر لیکن فیصلہ کن اور دلکش ہیں، اور سورت کے موضوعات سے ہم آہنگ ہیں، سورت کے پہلے حصے میں قیامت کی ابتدائی حالت اور تمام نظام شمسی کے تاریک ہو جانے اور ہر چیز کے ٹوٹنے اور اس دنیا کے موجودہ نظام کے زوال کے بارے میں بات کی گئی ہے، پھر اس نے لوگوں کے قبروں سے ٹولیوں کے شکل میں اٹھنے اور خدا کی طرف جانے کا نقشہ کھینچا ہے۔

زمانہ جاہلیت کا سب سے گھناؤنا گناہ یعنی: لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا تھا، اس کو یہاں ذکر کیا گیا ہے، جنت اور جہنم کے مناظر کا بھی ذکر ہے، جسے دیکھ

کر انسان سوچتا ہے کہ اس نے ان دونوں آخری ٹھکانوں کے لیے کیا تیاری کی ہے، پھر اس دنیا کی وسعت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اور اپنے پیغام کی صداقت کا حوالہ دیتے ہوئے مدعو سامعین کی توجہ اس بات کی طرف دلاتا ہے، کہ اگر اس داعی کے پیغام کا موازنہ دوسرے دعوت دینے والوں کے پیغام کے ساتھ کریں گے، اور پھر اس کے بارے میں فیصلہ کریں گے، تو یقیناً آپ کو اس کی حقانیت کا یقین ہو جائے گا۔

سورة التکویر کی فضیلت :

ایک حدیث شریف میں ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ: (اذلشمس کورت، اذا السماء انفطرت، اذالسماء انشقت،) کو دیکھے۔

اس سورت کی تلاوت کی فضیلت:

ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کو پڑھتے ہیں کہ : جو شخص سورہ (اذلشمس کورت) کی تلاوت کرے اللہ تعالیٰ اس کو اس دن کی رسوائی سے کہ جس دن اس کا نامہ اعمال کھولا جائے گا اس کی حفاظت کرے گا۔

دوسری حدیث ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا : اتنی جلدی بڑھاپے کے آثار آپ پر کیوں نمایاں ہو گئے ہیں ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "سورہ ہود، واقعہ، مرسلات، عمّ، اور اذلشمس کورت" نے مجھے بوڑھا کر دیا، اس لیے کہ ان سورتوں میں قیامت کے ہولناک حوادث کا ذکر اتنا زیادہ ہوا ہے کہ وہ باشعور اور جاگتے انسان کو بہت جلد بوڑھا کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا روایات میں جن تعبیرات کا ذکر ہوا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت سے وہ تلاوت مقصود و مطلوب ہے جو علم، ایمان اور عمل کا سرچشمہ ہو۔

سورت کا خلاصہ :

پہلے مرحلے میں یہ سورت ان افراد کو سرزنش اور ملامت کرتی ہے جو اکثر فرض کی گئی باتوں اور خیالات کی بنیاد پر ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے، عام طور پر اس سورت کے مشتملات میں دو اہم محوروں پر بحث کی گئی

ہے ۔

1- اس سورت کی ابتدائی آیات قیامت کی نشانیوں ، اور اس جہان کے آخر میں بڑی تبدیلیوں کے ساتھ قیامت کے آغاز کو بیان کرتی ہیں ۔

2- سورت کا دوسرا حصہ قرآن اور اس کے لانے والے کی عظمت اور انسانی نفس پر اس کے اثرات بیان کرتا ہے ، یہ حصہ بیدار کرنے والی قسموں اور معافی سے بھرپور ہے ۔

اس سورت کا سیاق:

اگر آیت (1- ۱۴) کا خلاصہ ملاحظہ کریں تو اس کے موضوعات میں شامل ہے: تنبیہ، ڈرانا، اور انسان کو قیامت کے دن اپنے اعمال سے آگاہ اور باخبر کرنا ، اور اس میں یاد دہانی کی گئی ہے کہ : اس دنیا کا موجودہ نظام لپیٹ لیا جائے گا ایک نیا اور پہلے سے معین کردہ نظام اس کی جگہ لے گا: إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ

(۱) وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ (۲) وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳) وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۴) وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (۵) وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶) وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (۷) وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ (۸) بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۹) وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۰) وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (۱۱) وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (۱۲) وَإِذَا الْجَنَّةُ أَزْلَفَتْ (۱۳) عَلِمْتَ نَفْسُ مَا أُحْضَرْتَ (۱۴)

اسی طرح آیت (15 – 29) تک یہ ہے کہ : وحی کے ایک لفظ سے بھی نہ ہٹیں بلکہ اس کو یاد رکھیں۔

انسان کو اس کے روز قیامت کے اعمال سے آگاہی دینا اس کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن جبرئیل امین کے لائے ہوئے الفاظ ہیں اور وحی ہیں، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات اور شیاطین سے دریافت نہیں کیا ہے، پھر کیوں اس سے دوری اختیار کرتے ہو، اس سے دور رہنے سے بہتر ہے کہ اسے یاد رکھو: فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۱۵) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۱۶) وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ (۱۷) وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (۱۸) إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ (۱۹) ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ (۲۰) مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ (۲۱) وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ (۲۲) وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ (۲۳) وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ (۲۴) فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ (۲۵) إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ (۲۶) لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ (۲۷) وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ

يَشَاءُ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۲۹).

سورہ تکویر کے اخلاقی اور معاشرتی نکات

- 1 - مظلوم کا دفاع کرنا کفر اور اسلام سے تعلق نہیں رکھتا، اس لیے کہ زندہ دفن ہونے والی بیٹیاں مسلمان نہیں تھیں، لیکن قرآن کریم نے وَإِذَا الْبُوءُودُهُ سُئِلْتُكَ کے انداز میں ان لڑکیوں کے حق کا دفاع کیا ہے۔
- 2 - سوال کے ذریعے ضمیروں کو جگایا گیا ہے (بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ)۔
- 3 - وقار اور عظمت، قابلیت اور طاقت، فرمانبرداری اور قابل اعتماد قوتوں کا ہونا پیغام اور ارشادات کے پہنچانے کے لیے ضروری شرائط ہیں۔
- 4 - کبھی کبھی تہمتوں اور الزامات کا جواب دیئے بغیر نہیں چھوڑنا چاہیئے، بلکہ ان کا جواب دینا چاہیئے (وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ)۔
- 5 - تبلیغ دین کا طریقہ نصیحت ہے، جبر نہیں: (ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ لِمَن شَاءَ مِنْكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ)
- 6 - انسان نہ بغیر ارادے کے ہے اور نہ ہی مکمل خود مختار۔
- 7 - چونکہ خدا تعالیٰ رب العالمین ہے، اس لیے تمام امور اس کے قبضے میں ہیں، اور انسان کی مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ہے۔

سورة التکویر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴
وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶ وَاِذَا النُّفُوْسُ رُوِّجَتْ ۝۷ وَاِذَا الْمَوْءِدَةُ سُبِلَتْ ۝۸
بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝۹ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰ وَاِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝۱۱ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲
وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝۱۳ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اُخْضِرَتْ ۝۱۴ فَلَا اَقْسَمُ بِالْخَنَسِ ۝۱۵ الْجَوَارِ الْكُنَسِ ۝۱۶
وَاللَّيْلِ اِذَا عَسَعَسَ ۝۱۷ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝۱۸ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝۱۹ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ
مَكِيْنٍ ۝۲۰ مُطَاعٍ ثَمَّ اٰمِيْنٍ ۝۲۱ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲۲ وَلَقَدْ رَاَهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝۲۳ وَمَا هُوَ عَلَى
الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝۲۴ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝۲۵ فَاَيْنَ تَذٰهَبُوْنَ ۝۲۶ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۲۷
لِيُنْشَاَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝۲۸ وَمَا تَشَاەوُنَ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۹

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱	جب سورج لپیٹ لیا جائے گا (1)
وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲	اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے (2)
وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳	اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے (3)
وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴	اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی (4)
وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵	اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے (5)
وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶	اور جب دریا آگ کی طرح بھڑکائے جائیں گے (6)
وَاِذَا النُّفُوْسُ رُوِّجَتْ ۝۷	اور جب روہیں (بدنوں) سے ملادی جائیں گی (7)

وَإِذَا الْبُوءُءُ دَسَّ سَبِيلَكَ ۝٨	اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنادی گئی ہو پوچھا جائے گا (۸)
بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝٩	کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی؟ (9)
وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝١٠	اور جب (عملوں کے) دفتر کھولے جائیں گے (10)
وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝١١	اور جب آسمان کا پردہ ہٹادیا جائے گا (11)
وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِرَتْ ۝١٢	اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی (12)
وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝١٣	اور جب جنت (پرہیزگاروں کے لیے) قریب لائی جائے گی (13)
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أُخْضِرَتْ ۝١٤	تب ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے (14)
فَلَا أَقْسَمُ بِالْخُنُوسِ ۝١٥	ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں (15)
الْجَوَارِ الْكُنُوسِ ۝١٦	(اور) جو سیر کرتے اور غائب ہو جاتے ہیں (۱۶)
وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝١٧	اور رات کی قسم جب ختم ہونے لگتی ہے (۱۷)
وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۝١٨	اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے (۱۸)
إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝١٩	کہ بیشک یہ (قرآن) فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے (۱۹)
ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝٢٠	جو صاحبِ قوت مالکِ عرض کی ہاں اونچے درجے والا (20)
مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝٢١	سردار (اور) امانت دار ہے (21)
وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝٢٢	اور (مگے والو) تمہارے رفیق (یعنی محمد) دیوانے نہیں ہیں (22)
وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ۝٢٣	اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا ہے (23)
وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ۝٢٤	اور وہ پوشیدہ باتوں (کے ظاہر کرنے) میں بخیل نہیں (24)

اور وہ (قرآن) شیطان مردود کا کلام نہیں ہے (25)	وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ۝۲۵
پھر تم کدھر جا رہے ہو (26)	فَإِنَّ تَذَهُبُونَ ۝۲۶
یہ تو جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت ہے (27)	إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝۲۷
(یعنی) اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے (28)	لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ ۝۲۸
اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے (29)	وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝۲۹

تفسیر سورہ تکویر

محترم قارئین:

آیات مبارکہ (1 تا 14) میں قیامت کے دن کے ابتدائی حالات، جمع ہونا، خوف اور ڈر اور ہولناکی اور دہشت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

جب سورج کو لپیٹ لیا جائے گا (۱)	إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱

جب سورج کو لپیٹ لیا جائے گا ، پگڑی لپیٹے اور کپڑے سمیٹنے کی طرح لایا جائے گا، اور اسے دنیا کی تباہی کی اعلان کے طور پر پھینک دیا جائے گا۔

حسن بصری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ : "کورت" تکویر سے مشتق ہے ، بے نور ہونے کے معنی میں ہے ، اور پھینکنے کے معنی میں بھی آیا ہے ، ربیع بن خثیم نے بھی ایسی تفسیر کی ہے ، کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سورج کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا، جس کی حرارت کی وجہ سے سمندر اور تمام دریا آگ پکڑیں گے ، ان دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے ، کہ پہلے سورج کا نور ختم کیا جائے اور پھر سمندر میں ڈالا جائے ۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن چاند اور سورج (بے نور کر دیئے جائیں گے) سمندر میں ڈالے جائیں گے ۔

مسند بزار میں ہے کہ : آگ میں ڈال دیئے جائیں گے ۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا اور ابو الشیخ نے ان آیات کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ : قیامت کے دن خدا تعالیٰ سورج، چاند، اور ستاروں کو بے نور کر کے سمندر میں ڈال دے گا، اور اس کے بعد تیز ہوا چلے گی جس کے اثر سے تمام دریا آگ بن جائیں گے، اسی طرح یہ بھی ٹھیک ہے کہ سورج اور چاند سمندر میں ڈالے جائیں گے، اور یہ بھی درست ہے کہ جہنم میں ڈالے جائیں گے، اس لیے کہ اس وقت سارے دریا جہنم میں پھینکے جائیں گے ۔

(مستفاد من المظہری والقرطبی)

مفسرین کرام "اِذَّ الشَّمْسُ كُوْرَت" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ : سورج کا نور جو ہر جگہ چمک رہا ہوتا ہے، اور میلوں دور دور تک پہنچ رہا ہوتا ہے، اور آب و تاب کے ساتھ تاباں ہے، قیامت کے آتے ہی اس کا نور منقبض ہو کر لپیٹا جائے گا اور نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

سورج ایک چمکتا ہوا اور درخشاں نظام ہے جو کہ تدریجاً ٹھنڈا پڑ جائے گا، اپنی تپش اور روشنی کھودے گا، اور تاریک اور ٹھنڈے ستارے کی شکل اختیار کر جائے گا، جیسا کہ زمین سورج اور دوسرے نظاموں سے الگ ہونے کے بعد پہلے پھل گرم اور روشن اور آگ سے بھری تھی مگر پھر بہ تدریج سرد اور ٹھنڈی پڑ گئی، سرد اور تاریک مادے میں بدل گئی، اور اب نور اور حرارت سورج سے حاصل کرتی ہے، جبکہ اپنے سینے اور دل کی گھرائی میں اپنی حرارت کو محفوظ کیا ہے سب چیزیں اس کے اندر پگھلنے اور جوش مارنے کے مرحلے میں ہیں۔

لیکن اس کی بیرونی سطح ٹھنڈی اور تاریک ہے، سورج بھی زمانہ گزرنے کے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔

"شمس" نور بکھرنے والے سورج کے معنی میں ہے، چمکنا اور روشنی دینا سورج کی صفت ہے، جو کہ (سورہ نباً آیت : 13) بیان کیا گیا ہے۔

"كُوْرَت" لپیٹ لیا جائے اور بے نور ہو جائے، اس وقت جب سورج تاریک ہو جائے ، یعنی :

- 1- اس کی روشنی غائب ہو جائے گی اور اندھیرا ہو جائے گا۔
- 2- زمین پر گر جائے گا۔

3 - اس کی حرکت اور طلوع رک جائے۔

4 - لماء کے نزدیک "کُورَتْ" کے معنی : لپیٹنا، جمع کرنا اور گرجانا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سورج اور چاند دونوں قیامت کے دن آگ میں ہونگے" "إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ يُكَوِّرَانِ فِي النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

اس کی وجہ ان کافروں کے عذاب کو بڑھانا ہے جو اس دنیا میں سورج اور چاند کی پرستش کرتے تھے تاکہ ان کو مزید عذاب اور تکلیف پہنچائے۔ (مشکل الآثار طحاوی : 183) و (الابانة الكبرى ابن بطه : 70) (والسلسلة الصحيحة : 124) حکم البانی: صحیح۔

وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝۲	اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے (۲)

اور ان کا نور ختم ہو جائے گا، یا "انکدار" ان کے گر پڑنے کے معنی میں ہے، یا بکھرنے اور ان کی عمر ختم ہونے کے معنی میں ہے۔

قیامت آنے پر اور چمکتے دمکتے سورج جیسے مشعل تابان کے بجھنے پر تمام تارے تاریک ہو جائیں گے، ستارے جو کافی تعداد میں چمک رہے ہوتے ہیں، دراصل یہ تاریک ہیں، یہ اپنی روشنی دوسرے سرچشموں سے عاریتاً حاصل کرتے ہیں۔

وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳	اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے (۳)

اس دن پہاڑ بکھری ہوئی ریت ہو جائیں گے، اور وہ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوامیں اڑ جائیں گے، پھر وہ متغیر ہو جائیں گے، اور اپنی جگہ سے اکھاڑے جائیں گے۔

"سُيِّرَتْ" پہاڑ اپنی جگہ سے اکھیڑ دیے جائیں گے اور ادھر ادھر دھکیل دیئے جائیں گے، روئی کی طرح پھسلتے ہوئے، اپنی جگہ سے اکھاڑ دیئے جائیں گے اور حرکت کریں گے۔

سورج اور ستاروں کے بعد زمین آہستہ آہستہ بدلتی رہے گی، زمین میں جو پہلے

بدل جائیں گے وہ پہاڑ ہیں، (وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ) کہ پہاڑ مسلسل اور بہت زیادہ حرکت میں ڈالے جائیں گے، سورہ طہ کی دوسری آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت والے پیغمبر سے فرماتا ہے: (وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ) اور تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ ان پہاڑوں کا کیا ہوگا؟ (فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۖ (طہ: 105) کھدو: میرا رب ان کو ٹکڑے ٹکڑے اور ذرات میں تبدیل کریگا، (فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۖ (طہ: 106) "ان پہاڑوں کو مکمل طور پر ہموار کردے گا" زمین کی طرح برابر، (لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۖ (طہ: 107) ترجمہ: "جس میں نہ تم کجی (اور پستی) دیکھو گے نہ ٹیلا (اور بلندی)"

وہ پہاڑ جو زمین اور زمین والوں کا سہارا ہیں، ایسے پہاڑ کہ جہاں بھی ہوں، (استحکام اور استقرار) (سکون اور آرام) کے عوامل میں سے ہیں، انہی پہاڑوں کو چلایا جائے گا، اور اگر ہم ان مناظر کا تصور کر لیں تو یہ بہت اہم اور مؤثر ہوگا۔

وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۖ	اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی (۴)

اس دن لوگ اپنے سب سے قیمتی اموال کو جن کا وہ ہمیشہ خیال کرتے تھے چھوڑ دیں گے، اس لیے کہ ایسی حالت آئی گی کہ وہ اپنے سب سے مہنگی چیز کو بھول جائیں گے۔

عشار: ایسی اونٹنیوں کو کہتے ہیں جن کو تربیت اور نگرانی کر کے سدھا یا گیا ہو، اور ان کے پیٹ میں بچہ ہو، ایسی اونٹنیاں خاص طور پر اس لیے قابل ذکر قرار پاتی ہیں کہ عرب کے نزدیک نفیس ترین اور قیمتی ترین مال سمجھا جاتا تھا، یا یہ کہ قیامت کی ہیبت کے وجہ سے اونٹنیوں کے مالک ان کو یونہی چھوڑ دیں گے۔

عطلت: یعنی بغیر چرواہے اور نگرانی کے چھوڑ دیئے جائیں گے، اس عظیم خوف و ہراس کی وجہ سے جس کا یہ قیامت کو مشاہدہ کریں گے، یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اونٹوں کو بھی دوسرے جانوروں کی طرح وجود میں لایا جائے گا۔

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝	اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے (۵)

یعنی: وحشی جانوروں اور جنگلی درندوں اور چوپایوں کو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا، اور باہمی قصاص کے لیے جمع کیا جائے گا، پھر دوبارہ انہیں مٹی میں تبدیل کر دیا جائے گا، ایک قول کے مطابق: ان کا حشر ان کی موت ہے۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝	اور جب دریا آگ کی طرح بھڑکائے جائیں گے (۶)

بھڑکتے ہوئے شعلے کی صورت اور تباہ کن آگ بن جائیں گے، کوئی بعید نہیں کہ اس سے مراد زمین کے اندر کا پگھلنے والا آتش فشان کے پھٹنے کے وجہ سے خطرناک زلزلے ہوں، جیسا کہ آلوسی جیسے بعض مفسرین کی رائے ہے۔

ابی بن کعب کہتے ہیں کہ: اس اثنا میں لوگ بازاروں میں ہوں گے سورج کی روشنی اچانک چلی جائے گی، اور لوگ اس حال میں ہوں گے کہ پہاڑ زمین پر گر پڑیں گے، پھر زمین میں ایک بڑی جنبش و حرکت برپا ہوگی، اس وقت جنات دہشت زدہ ہو کر انسانوں کی طرف بھاگیں گے، اور انسان جنات کی طرف، اور چوپائے عام جانور، پرندے اور درندے آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے۔

وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝	اور جب روحوں (بدنوں) سے ملا دی جائیں گی (۷)

یعنی: مؤمنوں کے نفوس کو حور عین کے ساتھ ملایا جائے گا، کافروں کو شیاطین کے ساتھ ملایا جائے گا، یا روحوں کو جسموں کے ساتھ ملایا جائے گا۔ حسن بصری اس کی تفسیر میں کہتے ہیں: ہر ایک کو اس کی جماعت کے ساتھ ملایا جائیگا، یہودی کو یہودی کے ساتھ، نصاریٰ کو نصاریٰ کے ساتھ، اور مجوسیوں کو مجوسیوں کے ساتھ، منافقوں کو منافقوں کے ساتھ، اور اسی طرح مؤمنوں کو مؤمنوں کے ساتھ، پھر ہر کسی کو اپنے ہم فکر و ہم مذہب کے ساتھ لاحق کر دیا جائے گا۔

"نفوس" نفس کی جمع، جان اور روح۔

"زوّجت" اپنی اصل کا جوڑا بنایا، اور اپنی اصل یعنی جسم کی طرف لوٹ گیا۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے مرنے کے بعد جان جسم سے الگ ہوگی، اور یہ الگ آزاد طریقے سے رہے گی، جبکہ جسم مٹی میں تبدیل اور دوسرے عناصر میں جذب ہوں گے، اور شکلیں اور چہرے جدید ترکیب اختیار کریں گے۔

ربّ غفور کے حکم سے جب دوسرا صور پہونکا جائے گا، تو پھر روحیں جسم میں واپس پلٹ جائیں گی، اور نئی دنیا میں آنکھ کھولیں گی، وہ ایک معجزے کے طور پر ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

وَإِذَا الْمَوْءِدَةُ سُبِلَتْ ﴿٨﴾	اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنادی گئی ہو پوچھا جائے گا (۸)

کہ کیوں مارا گیا؟ یہ سوال قاتل کی سرزنش اور اس کے ظلم کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾	کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی؟ (۹)

جیسا کہ معلوم ہے کہ عرب کی ایک تعداد زمانہ جاہلیت (دامادی کے) عار سے اور فقر و تنگدستی کے اندیشہ سے اپنی لڑکیوں کو ولادت کے بعد زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، اُن کو بوجھ اور اپنے لیے عار سمجھتے تھے۔

اس جاہلانہ عادت کی وجہ سے ربّ عظیم نے ان کو دھمکی دی (اور ان کی تنبیہ کی) لڑکیوں کے قاتل کو کہ جو بغیر کسی گناہ کے قتل کئے ہیں ان کا مقدمہ کیا جائے گا، اور ان زندہ درگور کی گئی لڑکیوں سے متعلق پوچھا جائے گا کہ کس جرم کی وجہ سے قتل کی گئی تھیں؟ ان کو لڑکیوں کا جواب یہ ہوگا کہ: بغیر کسی گناہ کے زندہ درگور ہوئی ہیں۔

جب یہ جواب ہوگا تو پھر قاتلوں سے حساب لیا جائے گا، یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکین کی اولاد کو عذاب نہیں دیا جائے گا، کیونکہ عذاب گناہ کے بدلے میں ہے، مشرکین کی اولاد جنت میں جائے گی۔

بیٹیوں کی فضیلت:

بیٹیوں کی فضیلت کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے، وہی مائیں، بہنیں، اور بیویاں ہیں، آدھا معاشرہ ان سے تشکیل پاتا ہے، اور باقی آدھا ان سے پیدا ہوتا ہے،

گویا کہ وہ پورا معاشرہ ہیں۔

ملاحظہ کریں "تحفته المولود فی أحكام المولود" ابن القيم (صفحہ 16)

بیٹیوں کی فضیلت پر دلالت کرنے والے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ : اللہ تعالیٰ نے بیٹی کو والدین کے لیے ہبہ قرار دیا ہے ، اور اس آیت میں ان کو لڑکوں سے مقدم رکھا ہے : **يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذَّكَوْرَ** (سورہ شوری: 49) یعنی : (اللہ تعالیٰ جسے چاہے بیٹی عطا کر دے اور جسے چاہے بیٹا)۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت بیان فرمائی ہے ، ان کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کی ترغیب دی ہے ، جیسا کہ فرماتے ہیں: **"مَنْ ابْتُلِيَ مِنْ هَذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ"** (بخاری صفحہ: 1418) اور (مسلم صفحہ 2629) .

یعنی : جس شخص کو خدا تعالیٰ بیٹی عطا فرما کر آزمائش میں ڈال دے (اس کا والد اس کی عمدہ اور اچھی تربیت کرے) اور اس کے ساتھ اچھائی کرے، تو وہ بیٹی اپنے والد کے لیے دوزخ کی آگ سے ڈھال ہوگی، (مأخوذ از کتاب (الایمان بالقضاء والقدر)۔

بچیوں کو زندہ دفنانے کے بھانے

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ : عرب کے دور جاہلیت کی ثقافت میں بیٹے ہونے کو باعث عزت اور فخر جبکہ بیٹی کی پیدائش کو باعث عار سمجھا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : **"وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ"** (نحل آیت: 58)۔ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی تو شدید غصہ کی وجہ سے ان کے چہرے سیاہ ہو جاتے ، وہ غصے سے بھر جاتے ۔

"يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۖ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۖ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ" (سورہ نحل آیہ: 59) یعنی : اس بُری بشارت کے ملنے پر وہ اپنے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور وہ نہیں جانتا کہ) وہ اس بیٹی کو ذلت اور پریشانی کے ساتھ رکھے یا (زندہ) مٹی کے نیچے گاڑ دے ، جی ہاں، یہ لوگ بہت ہی بُرا فیصلہ کرتے ہیں!

قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ : زمانہ جاہلیت میں عرب میں سے کسی کو جب

خبر ملتی کہ اس کے گھر بیٹی پیدا ہوئی ہے تو وہ غصے سے سیاہ ہو جاتا تھا۔

اس خبر کی بُرائی اور عمومی سوچ کے دباؤ سے جس کو وہ بُرا سمجھتے تھے وہ چھپ جاتا، اور اس سوچ میں پڑ جاتا کہ وہ اس نوزائیدہ بیٹی کو پالے، اور تمام ذلت و خواری کو برداشت کرے، یا یہ کہ اس کو زندہ دفنادے، ان میں سے اکثر کی سوچ نوزائیدہ بیٹیوں کے متعلق یہی تھی۔

مفسرین نے زمانہ جاہلیت میں بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی ہیں:

1- لڑکیوں کا معیشت اور پیداوار میں کوئی کردار نہیں تھا اور وہ زندگی کا بوجھ تھیں: وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ... (سورہ انعام آیت: 151) اور اولاد کو بھوک کے ڈر سے قتل نہ کریں؛ ہم تمہیں اور انہیں روزی دیتے ہیں۔

2- زمانہ جاہلیت میں عام طور پر عرب قبائل کے درمیان جنگیں ہوتی تھیں، ان کی فنا و بقاء کا تعین ان جنگوں میں ہوتا تھا، اس لیے ان جنگوں کے لیے وہ بہادر بیٹے چاہتے تھے، یہ کام عورتوں اور لڑکیوں کی استطاعت سے باہر تھا۔

3- جنگوں میں لڑکیاں جب دشمن کی قید میں چلی جاتیں تو جنسی تشدد کے بھینٹ چڑھ جایا کرتیں، ان مشکلات سے بچنے کے لیے ان کو زندہ دفناتے تھے۔

زمانہ جاہلیت کی اصطلاح

زمانہ جاہلیت کا جملہ اسلام کی اصطلاح اور تصور میں ایسا نام ہے جو مقدس دین اسلام کے ظہور سے قبل عرب کی فکری حالت کو بتاتا ہے۔

یہ اصطلاح قرآن میں ہے، اگرچہ اس کی مختلف تفسیریں ہوئی ہیں، اہل سیر اور محققین اپنی اپنی تحریروں میں لکھتے ہیں کہ اس لفظ کو عرب کے زمانہ قبل از اسلام کے لیے اشارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

دور جاہلیت میں جزیرہ نما عرب کے لوگ بت پرست تھے، اور بہت سارے بتوں کی عبادت کرتے تھے، ان کے لیے قربانی کرتے تھے، دین اسلام کے ظہور کے بعد بت پرستی کا رواج مکمل طور پر لپیٹ لیا گیا۔

دور جاہلیت کی ابتدا اور انتہا میں مسلم محققین کے درمیان اختلاف ہے، ان میں سے بعض اس کو حضرت نوح اور ادریس کے درمیان کا دورانیہ کہتے ہیں، اور بعض علماء حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کا دورانیہ، اور بعض دوسرے اس کو حضرت عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا دورانیہ قرار دیتے ہیں۔

بہ ہر حال دور جاہلیت کے اس زمانے کے اختتام کا وقت کچھ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور کچھ لوگ فتح مکہ کو سمجھتے ہیں۔

حوالہ کے لیے دیکھئے (فارسی کے نفوذی راستے جاہلی عرب کی ثقافت اور زبان میں : صفحہ 160)۔

محترم قارئین:

آیات مبارکہ (10 تا 29) قرآن کے نزول کا ثبوت، اور نبوت کا ثبوت کے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

اور جب (عملوں کے) دفتر کھولے جائیں گے (۱۰)	وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰

پھر بعض اپنے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں لیے ہوں گے، اور بعض نے اپنے بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ پیچھے لیے ہوئے ہوں گے۔

"صُفُّ" اعمال نامہ

"نُشِرَتْ" نشر کرنا، علماء کے قول کے مطابق: اسے نشر کیا جائے گا (المفتوح)۔

یعنی: انسان کے اعمال کی کتاب انسان کو کھلی شکل میں دی جائے گی، اور ہم اپنے اعمال کو دیکھیں گے، یہیں اعمال نامے تقسیم کئے جائیں گے اور منتشر ہو جائیں گے۔ (وَكُلُّ إِنْسَانٍ لَّزِمْنَهُ طَرِيقٌ إِلَىٰ عُنُقِهِ ۝۱۰ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝۱۱)

(الاسراء: 13) ترجمہ: "اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورت کتاب) اسکے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اُسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا (کہا جائیگا) " (اقْرَأْ كِتَابَكَ ۝۱۰ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ

حَسِيبًا ۝۱۱) (الاسراء: 14) ترجمہ: "کہ" اپنی کتاب پڑھ لے۔ تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے"

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝۱۱	اور جب آسمان کا پردہ ہٹادیا جائے گا (۱۱)

یعنی : ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا جائے گا، جیسا کہ گھر کی چھت اور مینڈھے کی کھال اتاری جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے سر پر جو چھت ہے وہ ہٹ جائی گی اور آسمان کا اصلی چہرہ ظاہر ہو جائیگا، یہ زمین و آسمان بدل جائیں گے، (يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمُوتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۴۸) (ابراہیم: 48) ترجمہ: "جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دئیے جائیں گے) اور سب لوگ خدائے یگانہ و زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔"

اور یہ کہ آسمان کا چہرہ بدل جائیگا یہ اس تبدیلی کی طرف اشارہ ہے جو سورج کے بے نور ہونے کے بعد رونما ہوگا، ان واضح اور روشن واقعات کے دو اور مسائل سامنے آتے ہیں: ایک جہنم کا مسئلہ اور دوسرا جنت کا۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲	اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی (۱۲)

اللہ کے دشمنوں کو سخت جلانے کے لیے، قتادہ کہتے ہیں کہ: جہنم کو اللہ کا غضب اور انسانوں کے گناہ بھڑکاتے ہیں۔

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝۱۳	اور جب جنت (پریزگاروں کے لیے) قریب لائی جائے گی (۱۳)

اور جنت والے کامیاب قرار پائیں گے، اور جہنمیوں کو جہنم کی طرف لیجایا جائے گا، جبکہ جنت کو جنتیوں تک پہنچایا جائے گا جو کہ اہل جنت کی عزت کی علامت ہے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أُخْضِرَتْ ۝۱۴	تب ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے (۱۴)

یعنی : جب مذکورہ بالا امور واقع ہوں گے، اس وقت اعمال نامے کھولنے کے ساتھ ہر شخص جان لے گا کہ اس نے خیر اور شرمیں سے کیا تیار کیا ہے؟ حدیث مبارکہ میں عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عَنْ عَبْدِ بْنِ حَاتِمٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ، لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ فَيَنْظُرُ أَيْمَنَ مِنْهُ، فَلَا يَرَى إِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنْظُرُ أَشْأَمَ مِنْهُ، فَلَا يَرَى إِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنْظُرُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلَا يَرَى إِلَّا النَّارَ تَلْقَاءَ وَجْهِهِ، فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ" (متفق علیہ) ترجمہ: تم میں سے کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت جلد کلام فرمائے گا، اس طرح کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا، پھر اپنی دائیں جانب دیکھے گا، تو اپنے وہ اعمال دیکھے گا جو اس نے آگے بھیجے تھے، اور اپنی بائیں طرف دیکھے گا تو وہ اپنے اعمال کے سوا کچھ نہیں دیکھے گا، پھر آگ اس کا استقبال کرے گی، جو آدمی یہ طاقت رکھے کہ وہ آگ سے بچے خواہ وہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو تو وہ ایسا کرے، اگر کھجور کے صدقے کی طاقت نہیں رکھتے ہو تو اچھی باتوں سے خود کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

جب یہ سارے ہولناک واقعات رونما ہو جائیں گے تو لوگوں کی شناخت ہو جائے گی، ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنی آخرت کے لیے کیا لایا ہے، اور جواچھائی اور بُرائی کی تھی جان لے گا، اس دن سورج کو لپیٹ دیا جائے گا، اور چاند کی روشنی ختم ہو جائے گی، اور دونوں کو آگ میں ڈالا جائے گا۔

جانوروں کا حشر قیامت کے دن:

مفسرین کرام قرآن وحدیث کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ: چونکہ حیوانات میں بھی روح ہوتی ہے وہ بھی روز محشر زندہ کئے جائیں گے، اور حساب و کتاب کے لیے پیش ہوں گے، پھر دوبارہ وہ ختم ہو جائیں گے، جبکہ جنت اور جہنم انسان اور جنات کے لیے خاص ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ: وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ (سورہ انعام 38)

ترجمہ: اور زمین میں جو چلنے پھرنے والے (حیوان) یا دوپروں سے اڑنے والے پرندے ہیں، وہ بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں، ہم نے کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں کسی چیز کی لکھنے میں کوتاہی نہیں کی، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف جمع کئے جائیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا: وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِنَّ مِنْ ذَابَّةٍ وَهُوَ عَلَى جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (سورہ شوری 29) ترجمہ: اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان جانوروں کا جو اس نے ان میں پھیلا رکھے ہیں ، اور وہ جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر قادر ہے ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ان دونوں آیات سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: سب کا حشر ہوگا جیسا کہ کتا وسنت اس پر دلالت کرتے ہیں۔ (مجموع الفتاوی : ج- 248/4)۔

اور جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ : (إِنَّ اللَّهَ لَيَقْتَضِي لِلشَّاةِ الْجُلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ) (مسلم 2582) ترجمہ: اللہ تعالیٰ بغیر سینگ کے بکری کا قصاص سینگ والی بکری سے لے گا، یہ بھی حشر میں حیوانات کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔

امام نووی مذکورہ حدیث کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ: یہ حدیث قیامت کو حیوانات کے زندہ کیے جانے پر صریح دلیل ہے، اور ان کا پلٹنا انسانوں کی پلٹنے کی طرح ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے: (وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ) **ترجمہ:** اس دن کی قسم جس دن حیوانات کو جمع کیا جائے گا ۔

علماء کہتے ہیں کہ : سزا اور عذاب ان کے پلٹنے اور حشر کے لیے شرط نہیں ہے، اور مذکورہ بالا حدیث میں قصاص سے مراد قصاص تکلیف نہیں ہے، بلکہ قصاص یہاں مقابلہ بالمثل ہے ۔

ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں (۱۵)	فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝۱۵

فَلَا أُقْسِمُ: اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں : (واقعہ/75، حاقہ/38، معارج/40، قیامہ/1 و 2) ۔

(الْخُنَّسِ) خانس کی جمع ہے ، واپس لوٹنے والے ، پیچھے رہنے والے ، اس سے مراد تمام ستارے ہیں، جو سورج نکلتے ہی ہم انسانوں کی نظروں سے خود کو پیچھے ہٹاتے اور اپنے ٹھکانوں کی طرف سرکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

قسم کے دلائل:

- 1- اہل عرب اپنی گفتگو میں زیادہ قسمیں کھاتے ہیں، اور قرآن کریم بھی عربی زبان میں ہے۔
- 2- کافروں سے بات کرتے وقت اللہ تعالیٰ تاکید کے لیے زیادہ قسمیں کھاتا ہے تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔
- 3- کلام کی تاکید کے لیے۔

صرف اللہ کی قسم کھانی چاہئیے، انسان کو غیر اللہ کی قسم نہیں کھانی چاہئیے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات پر قسم کھا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی قسم کی تاکید بنانے کے لیے: "فَلَا أُقْسِمُ" کی اصطلاح استعمال کی ہے، اس کی دلیل سورۃ الواقعة کی یہ دو آیت ہیں: "فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْجِعِ النُّجُومِ ۝۵۰ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ۝۴۹" ترجمہ: "ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم - اور اگر تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے"

○ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝۱۶	(اور) جو سیر کرتے اور غائب ہو جاتے ہیں (۱۶)

مفسر قرطبی کہتے ہیں: وہ ستارے جو دن کو چھپ جاتے ہیں اور رات کو ظاہر ہو جاتے ہیں، اور غروب کے وقت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، جس طرح ہرن غار میں چھپ جاتا ہے (یہ قول حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ اور مجاہدؒ اور حسنؓ کا ہے) تفسیر طبری میں یہی مذکور ہے

"الجوار" جمع جاریہ، جانے والے، سیارے، قرآنی رسم الخط میں

"ياء" تخفیف کے لیے حذف ہوا ہے۔

"الْكُنُوسُ" کانس کی جمع: چھپنے والے۔

اور رات کی قسم جب ختم ہونے لگتی ہے (۱۷)	وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝۱۷

(قسم ہے رات کی جب وہ پاٹے) یہ بھی کھا گیا ہے کہ: "عَسْعَس" کا معنی پیچھے ہٹنے کا ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ "عَسَسَ اللیل" متضاد الفاظ میں سے ہے، اور ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: واپس ہونے کا مفہوم یہاں زیادہ مناسب ہے۔ جیسا کہ مفسرین لکھتے ہیں: "عَسَسَ اللیل" پیچھے جانے اور آگے آنے کے معنی میں ہے، رات کی ابتداء اور انتہاء، جب دن لمبے ہوتے ہیں تو رات دیر سے آتی ہے اور جلدی ختم ہو جاتی ہے، یعنی راتیں چھوٹی ہو جاتی ہے۔

"عَسَسَ" کی تعبیر: یعنی وہ شخص جو رات کی تاریکی میں داخل ہوا اور اندھیرے کے خاتمے تک اس میں رہا، اور روشنی اور صبح میں داخل ہونے والا تھا، (وَاللَّیْلِ إِذَا عَسَسَ) کی تعبیر رات کی اس حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو رات کے ختم ہونے اور انتہا کی دلیل ہے۔

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۝۱۸	اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے (۱۸)

(اور صبح کی قسم جب اس کی علامات نمودار ہو جائیں) اور اس کی روشنی آہستہ آہستہ رات کی تاریکی کو چیر دے، یہاں تک کہ وہ روشنی مکمل ہو جائے اور سورج طلوع ہو جائے، یہ وہ عظیم نشانیاں ہیں کہ خدا تعالیٰ نے قرآن کی عظمت، مقام اور ہر شیطان مردود سے محفوظ ہونے کی ان پر قسم کھائی ہے۔

"تَنَفَّسَ" سانس لیا، (چمکنے لگا) ظاہر ہونے لگا، گویا کہ صبح کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اداسی کے دباؤ سے آزاد ہو کر راحت کا سانس لیتا ہے، اس سے مراد روشن ہونا ہے، (ملاحظہ کیجئے سورة مدثر : 34)۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝۱۹	کہ بیشک یہ (قرآن) فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے (۱۹)

اور وہ جبرئیل علیہ السلام ہے، جس نے قرآن کریم کو رب کے پاس سے اُتارا، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں:

ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝۲۰	جو صاحبِ قوت مالکِ عرض کی ہاں اونچے درجے والا (۲۰)

"ذِي قُوَّةٍ" اس کے پاس زبردست طاقت ہے، "قُوَّةٌ" قدرت اور طاقت کے معنی میں ہے، اور اس قابلیت اور صلاحیت کو کہا جاتا ہے جو کسی آدمی میں کسی کام کو

انجام دینے کے لیے موجود ہوتی ہے، اور تمام مخلوقات میں یہ صلاحیت موجود ہے۔

جبریل کی صفات:

- 1 - رسول: رب کی طرف سے بھیجا ہوا۔
- 2 - کریم: عظیم مرتبہ والا، معزز۔
- 3 - ذی قُوَّة: مضبوط اور طاقتور، اور چھ سو پر والا، قوم لوط کو ایک پر سے آسمان تک اُٹھا کر زمین پہ پٹخ دیا تھا "أَنَّهُ رَأَىٰ جِبْرِيلَ لَهُ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ" (بخاری: 3232 و 4856 و 4857 و مسلم: 174) ترجمہ: "پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل کو دیکھا (اصلی صورت میں) کہ اس کے چھ سو پر ہیں۔"
- 4 - مکین: اللہ کے نزدیک مقام و مرتبہ کا مالک، بڑا باوقار، مُطَاع: رئیس ہیں: اور دوسرے فرشتے اس کی اطاعت کرتے ہیں، جس کی فرمانبرداری کی گئی، وہ فرشتہ کریم ہے، اور اس کی بات بھی کریم و شریف ہے، اور اپنے فرائض کو انجام دینے میں طاقتور اور مضبوط ہے، اور اس پیغام کو مضبوطی سے پہنچاتا ہے، اور عرش والے اللہ کے ہاں عظیم مقام و مرتبہ والا ہے، ایسا مضبوط اور طاقتور ہے کہ کوئی انس اور جن اس سے وحی چھنے اور اس میں کمی اور اضافے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔

مُطَاعٌ ثُمَّ أَمِينٌ ۝۲۱	سردار (اور) امانت دار ہے (۲۱)

"مُطَاع" اس کا حکم مانا جاتا ہے، اس کی فرمانبرداری کی جاتی ہے، "ثُمَّ" وہاں، اس سے عالم بالا اور ملکوت اعلیٰ مراد ہے کہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

ملاء اعلیٰ میں جبرئیل کی اطاعت کی جاتی ہے، اس لیے کہ وہ مقرب فرشتوں میں سے ہے، اس لیے اس کی فرمانبرداری کی جاتی ہے، اور وہ امانت دار بھی ہے، جو حکم اس کو دیا جاتا ہے، بغیر کمی بیشی کے اور مقررہ حد سے نکلے بغیر اس کو انجام دیتا ہے، یہ سب خدا کے نزدیک قرآن کی عظمت و شرافت کی دلیل ہے، خدا تعالیٰ نے قرآن کریم اس عظیم فرشتے کے ذریعے بھیجا ہے جو ایسی کامل صفات سے متصف ہے، اور یہ دستور ہے کہ باد شاہ اس شخص کے ذریعے اہم پیغام بھیجتا ہے جو بادشاہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے محترم، مقرب اور قابل ہوتا ہے، جب حامل قرآن فرشتے کی عظمت

بیان کی تو اب جس انسان پر قرآن کریم اتارا گیا ہے، اور اس پر لوگوں کو دعوت دینے کی ذمہ داری ڈالی ہے اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اور (مگے والو) تمہارے رفیق (یعنی محمد) دیوانے نہیں ہیں (۲۲)	وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝۲۲

اور اس کو اچھی طرح پہچانتے ہو، اور اس کی عقل و فراست، شخصیت اور عظمت کا اعتراف کرتے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیوانہ نہیں ہے، جیسا کہ ان کی رسالت کو جھٹلانے والے دشمن کہتے ہیں اور ان پر تہمت لگا کر چاہتے ہیں کہ ان کے لائے ہوئے قرآن کی طرف دی جانے والی دعوت کو خاموش کر دیں، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ عاقل اور سچا ہے۔

"صَاحِبٌ" (دوست اور ساتھی) مُصَاحِب و مُعَاشِر، صاحب کی تعبیر، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سالوں قریش کے درمیان زندگی گزار رہے تھے، اور وہ اسے امین کہتے تھے، جب تک ان پر وحی نہیں آئی تھی، وہ لوگ اسے عقلمند، ہوشیار، فرزانه سمجھتے تھے، لیکن اس کے بعد اس کو دیوانہ کہنے لگے۔

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا ہے (۲۳)	وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ۝۲۳

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا شبہ یقینی طور پر جبرئیل علیہ السلام کا (عالم بالا، سدرۃ المنتہی میں فرشتے کی صورت میں مشاہدہ فرمایا) "رَأَى مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علی صورته التي خلق علیها" ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو اس شکل و صورت میں دیکھا جس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق فرمائی تھی۔ (تفسیر جلالین)۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جبرئیل علیہ السلام وحی کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے، کیونکہ روایات میں ایسے کافی واقعات مذکور ہیں کہ آپ علیہ السلام فلان کام میں مشغول تھے کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل ہمیشہ آپ کے ساتھ نہیں تھے، اگر جبرئیل

ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوتے تو پھر نزول معنی نہیں رکھتا، اس لیے کہ نزول کا معنی ہے بلند سے نیچے کی طرف آنا، اترنا اور اگر وہ ہمیشہ پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ ہوتے تو پھر نزول کا کوئی معنی نہیں۔

جبرئیل کا ساتھ ہونا یا نہ ہونا آپ علیہ السلام کے بشر ہونے پر اثر انداز نہیں ہوتا، جبرئیل علیہ السلام کا کام صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کرنا تھا، جبرئیل کے ساتھ ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرشتہ ہونے میں کوئی تلازم نہیں ہے (یعنی جبرئیل کے ساتھ ہونے سے رسول کا فرشتہ بننا یا فرشتہ کی صورت اختیار کرنا لازم نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے۔

اور وہ پوشیدہ باتوں (کے ظاہر کرنے) میں بخیل نہیں (۲۴)	وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ۝۲۴

وہ (محمد امین ہے آسمانی وحی کے مطالب تم سے نہیں چھپاتا، اور نہ اس کے اعلان کرنے میں ہچکچاتا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو غیب کی باتیں بتانے میں ہرگز بخیل نہیں کرتے)

"الغیب" سے مراد وحی، یعنی: ہر وہ چیز جو قیامت، اللہ کی ذات و صفات، اور جنت و دوزخ، فرشتے وغیرہ کے بارے میں خدا کی طرف سے رسول کو پہنچایا گیا ہو۔

"ضنین" بخیل، تنگ نظر، اس آیت کا مقصد اصلی یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دین کے امور کی تبلیغ میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے، جو کچھ وہ جانتے ہیں آپ لوگوں کو سکھاتے ہیں، وہ کاهنوں اور جادوگروں کی طرح نہیں کہ اپنی سیکھی ہوئی چیز دوسروں کو نہ بتائے۔

اور وہ (قرآن) شیطان مردود کا کلام نہیں ہے (۲۵)	وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ۝۲۵

غافل لوگ کدھر جا رہے ہو؟

گذشتہ آیات میں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ: قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کیونکہ اس کے موضوع اور طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے، جسے خدانے پوری طاقت اور بھروسے کے ساتھ اس نبی پر نازل کیا جو عقل میں سب سے زیادہ معتدل ہے، یہاں اس عظیم کلام کی پیروی نہ کرنے پر مخالفین کو سرزنش

کرتے ہوئے تو بیخی سوال پوچھا گیا ہے:

فَإِنَّ تَذْهَبُونَ ۝۲۶	پھر تم کدھر جا رہے ہو (۲۶)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ لوگوں کے سامنے حق اور سچ پیش کر کے حجت تمام کر دی ہے، اب اس کے علاوہ جس جگہ اور جس راستے پر چلو گے گمراہی اور الجھنیں ہوں گی۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝۲۷	یہ تو جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت ہے (۲۷)

اس مناسبت سے سب کو نصیحت کرتا ہے، خبردار کرتا ہے، تاکہ غفلت کی نیند سے جاگ جائیں، کیونکہ راہنمائی اور تربیت کے لیے صرف بھاگ دوڑ اور سرگرمی ہی کافی نہیں ہے، بلکہ قابلیت کا ہونا بھی شرط ہے، ایک آیت میں فرماتے ہیں: قرآن کریم بیداری کا ذریعہ ہے تم میں سے اس شخص کے لیے جو صراط مستقیم چاہتا ہو:

لِيَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ ۝۲۸	(یعنی) اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے (۲۸)

گذشتہ آیت اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا فیض بیان کرتی ہے، اور یہ آیت اس فیض سے مستفید ہونے کی شرط بیان کر رہی ہے، دنیا کی تمام نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کا فیض عام ہے، لیکن ان سے فائدہ اٹھانا مشروط ہے انسان کے ارادہ اور عزم کے ساتھ۔

آیت کا سبب نزول :

ابن جریر اور ابن ابی حاتم سلیمان بن موسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ: اس آیت کے نزول کے بعد ابوجہل نے کہا تھا: ہم کو اختیار دیا گیا ہے، اگر چاہیں تو استقامت رکھیں نہ چاہیں تو نہ رکھیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی: "تم نہیں چاہ سکتے ہو مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے" اس آیت کے سبب نزول میں غور و فکر کے بعد ایک اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ مشیت بشری مشیت الہی پر موقوف ہے، البتہ یہ انسان کی مجبوری کی معنی میں نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ازلی علم کے ساتھ پہلے جانتا ہے، پھر چاہتا ہے، اور پھر اپنی قدرت کا اس امر کے ساتھ اظہار فرماتا ہے، اس لیے اس کا علم کشف کرتا

ہے اجبار نہیں، یعنی ربّ تعالیٰ اپنے علم ازلی کے ساتھ جانتا ہے کہ مثلاً زید اپنی زندگی میں کیا کیا کام انجام دے گا، پھر اس کے کاموں کے ہونے کو چاہا، اس کے بعد اپنی قدرت کاملہ سے ان کاموں کو بوقت واقع ظاہر فرمایا۔

قضا و قدر:

اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے (۲۹)	وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۹﴾

مفسرین فرماتے ہیں: یہ مسئلہ قضا و قدر سے مرتبط ہے، اس لیے قضا و قدر کے بارے میں گہری سمجھ ہونی چاہیئے تا کہ اس آیت کا مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آجائے، قضا و قدر کا مسئلہ بہت وسیع ہے، اور مسئلے کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اور ہماری رائے تو یہ ہے کہ ایسے مسائل میں نہ الجھاجائے، کیونکہ علماء نے ایسے مسائل پر بحث کرنے سے منع فرمایا ہے، اور کبھی ایسے سوالات ان کے سامنے آئیں گے، جن کا جواب دینا مشکل ہو گا، لیکن اگر چاہیں تو بعض اشارات قضا و قدر کے مسئلے پر کر سکتے ہیں، سب سے پہلے قضا و قدر کے چھ مراتب کو اور ان چھ مراتب کے باہم ربط کو سمجھنا چاہیئے۔

- 1- سب پہلے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر اس چیز کی تحقیق کو جو ہو چکی ہے، یا آئندہ وقوع پذیر ہوگی جانتا ہے۔
- 2- رب تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر کو لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔
- 3- خدا تعالیٰ کے نہ تبدیل ہونے والے ارادے پر ایمان اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے، اور جو نہ چاہے وہ نہیں ہو گا۔
- 4- تخلیق کرنا اور پیدا فرمانا یہ پروردگار کی طرف سے ہے، اور جو کچھ وہ چاہے گا اس کی تخلیق فرمائے گا، اور جو نہیں چاہے گا نہیں فرمائے گا۔

لیکن شاید بعض لوگوں کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل ہو کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ انسان کے آئندہ کے اعمال سے باخبر ہے، اور دوسری طرف انسان کو صاحب ارادہ بنایا، اسی طرح اللہ یہ بھی جانتا ہے کہ کل لوگ کیا عمل کریں گے، اور ان اعمال کو روز اول سے لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے، اور اسی کانام تقدیر رکھا ہے، مثال کے طور پر دوبھائی ہیں اللہ تعالیٰ روز اول سے

جانتا ہے کہ ان میں سے ایک اپنے ارادے سے شرک اور کفر کو ترجیح دے گا، حالانکہ اسلام کی طرف اس کی راہنمائی کردی گئی ہے، اور اس کے لیے اسلام کو آسان بنادیا گیا ہے، مگر وہ شخص اپنے اختیار کی بنیاد پر اس کو نہیں اپنا تا تو اسی لیے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں اس بندے کی راہ کو شرکی راہ کھا ہے، اگرچہ وہ راہ بندے نے اپنے اختیار سے چنی ہے۔

جبکہ دوسرا بھائی اپنے اختیار سے حق کو تسلیم کر لیتا ہے، اور اسلام کی راہ اپنا لیتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ ازل سے اس کے عمل کو جانتا تھا، چنانچہ لوح محفوظ میں لکھا تھا کہ یہ بھائی راہ سعادت پر گامزن ہوگا، اسی وجہ سے انسان کو صاحب ارادہ و اختیار بنا دیا ہے کہ وہ خیر یا شر کو خود منتخب کرے، چنانچہ فرماتا ہے: **إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا** (سورہ انسان 3)

یعنی: (ہم نے اسے راستہ دکھا دیا) (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا)۔

(وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ) (سورہ کہف 29)

(اور کہدو کہ (لوگو) یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے)۔

اب اگر مذکورہ آیت کی طرف لوٹتے ہیں؛ تو ہمیں معلوم ہو گا کہ مذکورہ بالا وضاحتوں کے مطابق انسانوں کے ارادے تب کار آمد ہوں گے جب ان پر اللہ تعالیٰ کا اذن ہو اجازت ہو، یعنی انسانوں کو اختیار ہے کہ قصد کر لیں، ارادہ کر لیں اور اپنا پسندیدہ عمل انجام دے دیں۔

اپنے عزم پر قدم اٹھانے کے بعد اپنے فیصلہ پر عمل درآمد کرتے ہیں، لیکن اس درمیان میں اب بھی اللہ تعالیٰ کا ارادہ حاکم ہے، اگر اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے گا تو تب انسانی ارادہ جو اس نے اپنی مرضی سے کیا ہے عملی انجام کو پہنچے گا۔

یعنی: صرف انسانوں کے ارادے کسی عمل کو انجام دینے کے قابل نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا اذن انسان کے ارادے کے لیے شرط ہے:

فرض کریں کہ ایک شخص کسی سفر پر جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس لیے وہ اپنے آپ کو تیار کر لیتا ہے، اور سفر کی ضروریات کا بھی بند و بست کرتا ہے، اس حالت میں اگر رب تعالیٰ نے اس آدمی کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا تو اس صورت میں وہ شخص سفر پر جاسکتا ہے، اگر رب تعالیٰ نے

اپنی حکمت کے مطابق ایسا ارادہ نہیں فرمایا تو وہ شخص جتنا بھی ارادہ کرے اگرچہ سفر کی ابتدائی ضروریات بھی تیار کرے، لیکن وہ سفر پر نہیں جا سکے گا۔

اس موقع پر کھاجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ارادہ فرمایا کہ سفر کا ارادہ کرنے والا شخص اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہناسکے۔

مختصر یہ ہے کہ کسی بھی عمل کو انجام دینے کے لیے انسان کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

1 - سب سے پہلے انسان کسی عمل کو انجام دینے کا ارادہ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔

2 - اس کے بعد اللہ تعالیٰ چاہے گا تو انسان کی طرف سے کیا گیا ارادہ انجام پائے گا۔

اس لیے اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے کا ارادہ نہ کرے تو وہ کام انجام نہیں پائے گا، اور اگر کسی کام کے انجام دینے کا ارادہ کر بھی لے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو وہ کام عملی صورت اختیار نہیں کرے گا۔

اس وجہ سے اہلسنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ انسان کے اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اور جو فعل ہم انجام دیتے ہیں وہ ہماری کمائی ہے، لیکن اس کا خالق رب تعالیٰ ہے، ہم ارادہ کرتے ہیں اور مقصد تک پہنچنے کے اسباب کا بند و بست کرتے ہیں، لیکن کام کے نتیجہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے ساتھ ہے۔

جیسے ایک شخص کسی عمارت سے خود کو گرا کر خود کشی کرنا چاہتا ہے، لیکن بعد میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی زندہ ہے مرا نہیں ہے، یا ایک شخص زہر کھالیتا ہے، لیکن وہ زندہ بچ جاتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رب تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا تھا کہ اس شخص کی خود کشی کا ارادہ عملی صورت اختیار کرے، اور اس شخص کا ارادہ اللہ تعالیٰ کا اذن حاصل نہیں کر سکا۔

اس مسئلہ میں غور و خوض کے بعد ایک انتہائی اہم نکتہ پر پہنچتے ہیں: اور وہ یہ ہے کہ بشر کی مشیت اور ارادہ موقوف ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت پر، البتہ یہ انسان کو مجبور کرنے کے معنی میں نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ازلی علم کے ساتھ جانتا ہے، پھر ارادہ کرتا ہے اور اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے، اللہ

تعالیٰ اپنے اس علم کا کشف کرنے والا ہے، مجبور کرنے والا نہیں، پس جاننا چاہئیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ معمول ہے کہ جو ارادہ انسان کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس پر (اذن) اجازت عنایت فرماتا ہے، مگر یہ کہ اس کی حکمت کے مقتضا کے خلاف نہ ہو، اور یہ اس لیے تاکہ انسان اپنا اختیار بھرپور طریقے سے استعمال کرسکے، اور اپنی مرضی سے انجام دینے والے عمل کے لیے جواب دہ ہو۔

مثلاً رب تعالیٰ اپنے ازلی علم کے ساتھ جانتا تھا کہ احمد اپنی زندگی میں کیا کیا کام انجام دے گا، پھر اس کے کاموں کے ہونے کا ارادہ فرمایا، اور پھر اپنی قدرت کاملہ سے ایک موقع پر ان کو ظاہر کیا، اس کی مشیت اور چاہت نافذ العمل ہے، ممکن ہے کوئی چیز اس کی چاہت کے مخالف ہو، یہ آیت اور اسی طرح کی دوسری آیتیں دو فرقوں قدریہ اور جبریہ پر ردھیں جو کہ رب کی چاہت کی نفی کرتے ہیں۔

(وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ) (29).

خدا تعالیٰ نے "الْحُتَّاسِ" کی قسم کھائی ہے، یہ وہ ستارے ہیں جو معمول کی گردش سے مشرق کی طرف واپس چلے جاتے ہیں، یہ سات متحرک ستارے ہیں، جیسے: سورج، چاند، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل، عطارد، یہ سات ستارے دو قسم کی حرکت کرتے ہیں:

1- ان کی ایک حرکت مغرب کی طرف ہے تمام ستاروں اور افلاک کے ساتھ

2- اور دوسری مشرق کی سمت سے الٹی حرکت جو کہ صرف یہ سات ستارے کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے واپس پلٹنے کی صورت اور حرکت کی حالت پر اور چھپ جانے پر قسم کھائی ہے، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ "الْحُتَّاسِ" سے مراد تمام ستارے اور سیارے وغیرہ ہوں۔

جبرئیل امین قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کے حامل

دین ابراہیمی میں جبرئیل علیہ السلام ان چار مقرب فرشتوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں کے درمیان رابط کی حیثیت رکھتا ہے، یہودیت اور مسیحیت اور دین اسلام میں جبرئیل کے کردار کے بارے میں بہت بحث ہوئی ہے، انسانوں میں سے نبی علیہ السلام کے علاوہ کوئی بھی فرشتوں کو اور

خاص طور پر جبرئیل علیہ السلام کو اس کی اصلی صورت میں نہیں دیکھ سکا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ قدرت اور صلاحیت نہیں دی ہے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دومرتبہ جبرئیل کو اس کی اصلی شکل و صورت میں دیکھا ہے۔

پہلی بار: بعثت کے تین سال بعد، صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دن چلتے ہوئے ایک آواز کانوں سے ٹکرائی، سر اٹھا یا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ ہے جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا، زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اس منظر کو دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا، اور میں گھر واپس لوٹا اور کہا: میرے اوپر کوئی چادر یا رضائی ڈال دو، (بخاری: ج- 27/1 نمر: 4)۔

دوسری بار: جب جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات آسمانوں کی طرف لے گیا، "سورہ نجم" میں دونوں مرحلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے: عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى * ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى * وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى * ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى * فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى * فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى * مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى * أَفَتَحْمِلُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ * وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى * عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى * عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى * إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى * مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى (نجم: 5-17)۔ ترجمہ: ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا، (وہ جو پختہ

حکمت اور پاکیزہ خیالات رکھتا ہے)، (یعنی جبرائیل) طاقتور نے پھر وہ اپنی فرشتے والی شکل میں جو اپنے پروں کے ساتھ آسمان کے کناروں کو بھر دیتا تھا (سیدھا اکھڑا ہوا، اور وہ آسمان کے) اونچے کنارے میں تھا، پھر جبرائیل قریب ہوئے اور آگے بڑھے، یہاں تک کہ اس کا فاصلہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فاصلہ دو کمان جتنا یا اس سے کم رہ گیا، پھر جبرئیل نے اللہ کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی پہنچائی، جو وحی پہنچانی تھی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دل نہیں جھٹلایا جس کو اس نے آنکھوں سے دیکھا تھا، کیا تم اس کے ساتھ اس چیز کے بارے میں جھگڑتے ہو جو اس نے دیکھا ہے، اس نے تو دوسری بار (معراج کی رات) اس کو دیکھا ہے، بیری کے درخت کے پاس، وہ جنت جو کہ پرہیزگاروں کی منزل اور ٹھکانہ ہے اس کے پہلو میں ہے، اس وقت ایسی چیزیں تھیں جس نے بیری کو گھیر لیا تھا،

محمد کی آنکھیں دائیں بائیں دیکھنے میں غلط نہیں ہوئیں، اور نہ نگاہ تیز رہی ہوئی اور نہ ہی سرکشی کی۔

عظمت والے رب نے قرآن میں جبرئیل امین کی عظیم صفتوں کے ساتھ تعریف کی ہے: جیسا کہ فرمایا: **فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنُوسِ ۝۱۵ الْجَوَارِ الْكُنُوسِ ۝۱۶ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝۱۷ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۝۱۸ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝۱۹ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝۲۰ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝۲۱** (سورہ التکویر 15 – 21)

ترجمہ: ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں، اور جو چلتے چلتے غائب ہو جاتے ہیں، اور رات کی قسم جب ختم ہونے لگتی ہے، اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے، کہ بیشک یہ (قرآن) فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے، جو صاحب قوت مالکِ عرش کے ہاں اونچے درجے والا، سردار (اور) امانت دار ہے۔

صفت اول: پہلی صفت جبرئیل کی اس کا طاقتور ہونا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ قرآن عظیم الشان میں فرماتے ہیں: (ذی قوۃ عند ذی العرش) (سورہ التکویر 20). اور ایسی طاقتوں والا ہے کہ قرآن کریم اور جو کچھ اسے دیا گیا اسے اٹھانے کی قدرت رکھتا ہے، اور وہ عرش والے کے نزدیک مقام اور مرتبہ والا ہے۔ "ذی العرش" صاحب عرش رب تعالیٰ ہے۔ "ذی قوۃ" طاقتور اور مضبوط فرشتہ۔

دوسری صفت: "مکین" مرتبہ، عرش والے رب کے پاس مقام و مرتبہ والا ہے، یعنی ایسی عزت اور مقام رکھتا ہے، کہ کوئی دوسرا اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

تیسری صفت: "طاعت" (مطاع) فرشتوں کے درمیان حاکم ہے، تمام فرشتے اللہ کے حکم سے اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔

چوتھی صفت: (امین) امانت، قرآن کریم کے لینے اور اس کے پہنچانے میں اور جو کچھ اسے حکم دیا جائے وہ ان میں امین ہے، یعنی وحی پر امین ہے، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا، بلکہ اسے جیسا کہ رب تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے ویسے ہی پہنچاتا ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو دیکھا: رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۚ (سورہ التکویر 22)۔

تمہارے دوست اور ساتھی جو تمہارے درمیان بڑا ہوا ہے، اور اس کو پہچانتے بھی ہو اور اس کی تعریف بھی کر چکے ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیوانہ نہیں ہے، اور اے لوگو! (تمہارا دوست) دیوانہ نہیں ہے، جیسا کہ تم لوگ سوچ رہے ہو: (وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ) (سورہ التکویر 23)۔ ترجمہ: بیشک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (فرشتے) کو (آسمان کے کھلے یعنی) مشرقی کنارے پر دیکھا ہے

دیگر فرشتے:

1 - میکائیل آسمان سے بارش برسانے پر مأمور ہے، کہ رب تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے -

2 - اسرافیل جو کہ صور پھونکنے پر مقرر ہے، جب رب تعالیٰ چاہے گا لوگوں کو قبروں سے اٹھائے گا، اور جسم قبروں سے نکلیں گے، اور مکمل ہو جائیں گے، اور روح کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں بچے گا، اس وقت اسرافیل اللہ تعالیٰ کے حکم فرمانے سے صور پھونکیں گے، اور ارواح ان اجساد میں داخل ہو جائیں گی، جو قبروں سے نکلے تھے اور اٹھے تھے، پھر جس جگہ پر رب نے جانے کا حکم دیا ہے لے جایا جائے گا -

3 - ایسے فرشتے جو ماں کے پیٹ میں موجود نطفے پر مامور ہیں: جیسا کہ عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے: (حدثنا رسول الله وهو الصادق المصدوق: إِنَّ أَحَدَكُمْ يَجْمَعُ خَلْقَهُ فِي بطن أمه أربعين يوماً نطفة ثم يكون علقة مثل ذلك ثم يكون مضغة مثل ذلك ثم يرسل إليه الملك فينفخ فيه الروح ويؤمر بأربع كلمات بكتب رزقه وأجله وعمله وشقي أو سعيد) (متفق عليه) ، رب کے بھیجے ہوئے سچے اور تصدیق شدہ پیغمبر نے فرمایا: یقیناً تم میں سے ایک کی خلقت اپنی ماں کے پیٹ میں اس طرح ہوتی ہے، چالیس دن نطفے کی حالت میں ہوتی ہے، اس کے بعد چالیس دن خون کے لوتھڑے کی صورت میں، پھر اس کے بعد اتنی ہی مدت میں گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے، تین مرتبہ چالیس چالیس دنوں کے بعد (جو کہ

ایک سو بیس دن 120 بن جاتے ہیں)، رب تعالیٰ ایک فرشتے کو اس کی طرف بھیجتا ہے تاکہ اس میں روح پھونکے، اور فرشتہ چار الفاظ لکھنے پر مأمور ہے، اس کا رزق و ورزی لکھنا، عمر کی مدت، اس کے کردار، اور یہ کہ بدبخت ہے یا نیک بخت۔

4 - ایسے فرشتے ہیں جو ارواح قبض کرنے اور جان نکالنے پر مأمور ہیں، جب انسان کی عمر اختتام کو پہنچے، اور وہ (ملک الموت) یعنی موت کا فرشتہ ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں: قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ. (سورہ السجدة: 11) اے نبی کھدیجئے: موت کا فرشتہ تمہاری جان لیتا ہے، اور موت کا فرشتہ وہی (ملک الموت) اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہے۔

5 - ایسے فرشتے ہیں جو بنی آدم کے اعمال کی نگرانی کرنے پر مقرر کئے گئے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: (يَتَعَاقَبُونَ فِيكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ) (متفق علیہ). ایسے فرشتے جو پے درپے تمہارے پاس آتے ہیں، فرشتوں کی ایک جماعت رات کو آتی ہے اور ایک جماعت دن کو۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
جزء - (30)

سورة الانفطار

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی اس کی انیس (19) آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کا "انفطار" نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" سے اس کا آغاز ہوا ہے، سورہ انفطار مکی سورتوں میں سے ہے، اس کی آیتیں چھوٹی اور قیامت کے بارے میں ہیں، سورہ انفطار میں سب سے پہلے اس ہستی میں برپا ہونے والے انقلاب کا بتایا گیا ہے جو قیامت کو رونما ہوگا، پھر ناشکرے انسان کو تنبیہ اور ملامت کی گئی ہے، اور آخر میں منکرین کے انکار کی وجہ بیان کی گئی ہے۔

سورة الانفطار کا سورة المطففين اور سورة الانشقاق کے ساتھ تعلق اور مناسبت:

تینوں سورتوں میں قیامت کے دن اور اس کی مشکلات اور خوف و ہراس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

سورة الانفطار کی آیات کی تعداد، الفاظ، اور حروف:

اس سورت کا نام الانفطار (پھٹنا) ہے، یہ نام اس سورت کی سب سے پہلی آیت سے لیا گیا ہے، سورہ "الانفطار" مکی ہے، اس میں ایک "1" رکوع، انیس "19" آیتیں، ستر "70" الفاظ، تین سو چونتیس "334" حروف، اور ایک سو چوں "154" نقطے ہیں۔

یہ بات ذکر کرنا لازم ہے کہ علماء کے اقوال سورتوں کے حروف کی تعداد گننے میں مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کیلئے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں۔

قابل غور بات: اس سورت کی ابتدائی آیات قیامت کے عظیم واقعات جیسے: آسمان کا پھٹنا، ستاروں کا بکھر جانا، قبروں کو اکھیڑنا، اور مردوں کے زندہ ہونے کے بارے میں بحث کرتی ہے۔

پھر یہ سورت انسانی افعال کا خاکہ دکھاتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ دھوکہ کھایا ہوا انسان جو اپنے رب کو بھول گیا ہے، اور اپنے خدا سے ملنے سے انکار کرتا ہے، حیران کن صیغے اور لہجے میں اس سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے، کس چیز نے تجھے اپنے رب کے متعلق دھوکے میں ڈالا ہے؟ وہ کیسے سوچتا ہے کہ اس کے رب نے پوچھ گچھ کا کوئی دن مقرر نہیں کیا ہے، کہ اس کے اعمال کا بدلہ اس کو دیدے؟ آخر میں نیک لوگوں کا مقام و مرتبہ اور نافرمانوں کے بُرے انجام اور حساب و کتاب کے دن کی حالت بیان کرتی ہے۔

آیت "6" کا سبب نزول :

ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے سورة الانفطار کی آیت "6" کے بارے میں نقل کیا ہے کہ، "يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ" ○ ابی بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ابی بن خلف بن وہب بن حذاقہ بن جمع، در اصل قبیلہ قریش کی بنی جمع والی شاخ سے تعلق رکھتا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔

ابی بن خلف اور اس کا بھائی دور جاہلیت میں قریش کے اشراف میں سے تھے، جو کہ پیغمبر اسلام کی دشمنی میں دوسروں سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ ابی کی زندگی کے دورانیے پر نظر دوڑائیں تو تکبر اور نافرمانی سے بھری ہوئی پائیں گے۔

مؤرخین مزید لکھتے ہیں کہ: امیہ بن خلف جب اپنے ایک غلام پر تشدد کرتا تو ابی کہتا کہ: اس کی سزا (دوگنی کردو) بڑھادو، ابی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کینہ اور دشمنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے آغاز سے ہی عیاں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ابی بن خلف کی دشمنی اس حد تک تھی کہ جب بھی اللہ کے رسول کو مکہ میں دیکھتا تو کہتا: "میں

اپنے گھوڑے کی بہترین دیکھ بھال کرونگا تاکہ اس پر سوار ہو کر تجھے قتل کردوں" وہ مشرکین کے ان سرداروں میں سے ایک تھا جو "دار الندوة" کی مجلس شوری میں شرکت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔

مؤرخین مزید لکھتے ہیں کہ: اُبی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی میں اپنی جان اور مال پیش کیا، اور غزوہ بدر میں مشرکین کے لشکر کو کھانا کھلانے والوں میں شامل تھا۔

اُبی کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی، جنگ احد میں اونچی آواز سے پکارا، اے محمد! تجھے زندہ نہیں چھوڑونگا، یہ الفاظ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوا جس کے نتیجے میں قتل کر دیا گیا۔

سورة الانفطار کی فضیلت:

نسائی جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرمایا: کہ حضرت معاذ قوم کو نماز پڑھا رہے تھے، انہوں نے نماز لمبی کر دی، اسی دوران لوگوں میں سے ایک بندہ جو حضرت معاذؓ کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا تھا، اپنی نماز توڑی، اور مسجد کے کونے میں جا کر انفرادی طور پر نماز پڑھی، اور مسجد سے باہر چلا گیا، جب یہ خبر حضرت معاذ تک پہنچی تو انہوں نے کہا کہ فلاں شخص منافق ہے، جب اس معاملے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا تو آپ علیہ السلام نے اس شخص کو بلا کر وجہ پوچھی کہ کیوں اپنی نماز امام کے پیچھے چھوڑ کر انفرادی طور پر پڑھی؟ تو اس نے کہا کہ: اے اللہ کے رسول! میں آیاتہا اس کی امامت میں نماز پڑھنے، مگر اس نے نماز لمبی کر دی، اس لیے میں لاچار مسجد کے کونے میں جا کر نماز پڑھ کر چلا گیا، تاکہ اپنے اونٹ کو گھاس کھلا دوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے فرمایا: "أَفْتَانُ أَنتَ يَا مَعَاذُ؟ اِنَّ كُنْتَ عَنْ سَبِّحِ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا، وَالضُّحَى، وَإِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ، وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَى."

اے معاذ! کیا تم فتنہ گر ہو؟ کہاں تھا تو ان سورتوں کے پڑھنے سے: سَبِّحِ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا، وَالضُّحَى، إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ، وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَى"

یعنی: کیوں تو ان متوسط سورتوں کی ان پر تلاوت نہیں کرتے کہ وہ لوگ دین کے کام میں مشکلات کا شکار نہ ہوں، اور نماز سے تنگ آکر فتنوں میں نہ پڑجائیں۔

سورت کا تعارف:

اس سورت کا خلاصہ قیامت سے متعلق مسائل کے گرد گھومتا ہے، یہ خلاصہ مندرجہ ذیل پانچ عنوانات میں کیا گیا ہے:

- 1- اس عظیم دن کی مشکلات کا ایک گوشہ۔
- 2- قیامت کے دن نیک اور بُرے لوگوں کا انجام۔
- 3- انسان کی توجہ خدا کی نعمتوں کی طرف جو اس کو سراپا گھیرے ہوئی ہیں۔
- 4- ان فرشتوں کا حوالہ دینا جو انسانوں کے اعمال کو محفوظ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔
- 5- وہ عظیم حوادث جو دنیا کے اختتام پر اور قیامت کے قریب وقوع پذیر ہوں گے۔

سورة الانفطار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۝ عَلِمْتَ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۝ يَأْتِيهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّبَكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالذِّينِ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۝ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۝

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝	جب آسمان پھٹ جائے گا (۱)
وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝	جب تارے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے (۲)
وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝	اور جب دریا ابل پڑیں گے (۳)
وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۝	اور جب قبریں اکھیڑی جائیں گی (۴)
عَلِمْتَ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۝	ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا ہے اور جو پیچھے چھوڑا (۵)
يَأْتِيهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝	اے انسان! تجھ کو کس نے فریب خوردہ بنایا اپنے رب کے بارے میں (۶)
الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّبَكَ فَعَدَلَكَ ۝	وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا اور ٹھیک کیا، اور تیرے مزاج کو متعدل بنایا (۷)
فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝	اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا (۸)

ہرگز نہیں بلکہ تم دین کو جھٹلاتے ہو (۹)	كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالَّذِينَ ۝۹
حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں (۱۰)	وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحَافِظِیْنَ ۝۱۰
معزز کاتب مقرر ہیں (۱۱)	كَرِۤمًا كَاتِبِیْنَ ۝۱۱
جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں (۱۲)	یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲
بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہونگے (۱۳)	اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ۝۱۳
اور بدکار لوگ ضرور دوزخ میں ہونگے (۱۴)	وَاِنَّ الْفَجَّارَ لَفِیۡ حٰجِیۡمٍ ۝۱۴
جزا کے دن اس میں داخل ہونگے (۱۵)	یَّصْلُوۡنَهَا یَوْمَ الدِّیۡنِ ۝۱۵
اور وہ اس سے غائب نہیں ہوسکیں گے (۱۶)	وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِیۡنَ ۝۱۶
اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟ (۱۷)	وَمَا اَدْرٰیكَ مَا یَوْمَ الدِّیۡنِ ۝۱۷
پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟ (۱۸)	ثُمَّ مَا اَدْرٰیكَ مَا یَوْمَ الدِّیۡنِ ۝۱۸
جس روز کوئی کسی کا اختیار نہیں رکھے گا اور حکم اس روز خدا ہی کا ہوگا (۱۹)	یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیۡئًا ۝۱۹ وَالْاَمْرُ یَوْمَ لِلّٰهِ ۝۱۹

سورت کی تفسیر

محترم قارئین !

با برکت آیت "1 تا 8" میں قیامت کی نشانیوں، جزا و سزا، خدا کی نعمتوں سے انکار کرنے والوں کی مذمت کے بارے میں بحث ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں: اس سورت کا بنیادی اور اہم محور قیامت کے آنے سے پہلے ہونے والے واقعات کے سے متعلق ہے، اور اسی کی شروع میں افق اور انفس (روح) کی وسعتوں میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ ہے، اور لوگوں کو اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے منصوبے

سے متعلق ان پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے آگاہ کرنا ہے کہ مواقع ضائع ہونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں، اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کی نشانیوں کو بتانے کے ساتھ ساتھ ہمیں پکڑنے اور سرزنش کرنے کی بھی تنبیہ کی ہے۔

سورة الانفطار لفظ "اذا" سے شروع ہوتی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝۱	جب آسمان پھٹ جائے گا (۱)

یعنی فرشتوں کے اترنے کے لیے دروازے بنائے جائیں گے اور آسمان کا خیمہ پھٹ جائے گا، انفطار: آسمان کا پھٹ جانا اور ریزہ ریزہ ہوجانا، فرشتوں کے اترنے کے لیے ہے۔

آسمان کے پھٹنے کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو پھاڑنے کا ارادہ رکھتا ہو، اور اس کے حکم سے ہی آسمان پھٹ جائے، "انفطرت" یعنی: ٹکڑے ہونے کو قبول کرنا اور اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا، "إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" جب آسمان میں شگاف پڑ جائے گا اور اس کے نتیجے میں اس کا قیام اور استقرار ختم ہوجائے گا۔

وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲	جب تارے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے (۲)

دنیا کے ختم ہونے اور قیامت برپا ہونے کی نشانیوں میں سے ایک ستاروں کے نظام کا تبدیل ہونا، اور شگاف پڑ جانا اور آسمان کا لپٹنا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اور مختلف تعبیروں کے ساتھ اس کا ذکر ہوا ہے، کبھی اس کی تعبیر لفظ "انشقاق" سے ہوئی ہے: "إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ" ترجمہ: جب آسمان پھٹ جائے گا۔ (سورة انشقاق - 1)

اس کے ہم معنی آیت سورہ الحاقہ میں بھی آئی ہے: "وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ" ترجمہ: "اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن کمزور ہوگا"۔

اور سورہ فرقان کی آیت "25" میں یہی معنی معمولی فرق کے ساتھ آیا ہے: "وَيَوْمَ تَشْقَى السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ" ترجمہ: "اور جس دن آسمان ابر کے ساتھ پھٹ جائے گا۔"

ان آیات میں "سما" کا مفہوم وہ آسمانی کرہ ہے جو دنیا کے اختتام کے وقت یکے بعد دیگرے دھماکوں سے پھٹ جائے گا، لیکن بادلوں کے ساتھ پھٹ جانے سے کیا مراد ہے؟ ممکن ہے کہ آسمانوں کے ٹوٹنے سے مراد ان کے غبار کے نتیجے میں بھاری بادلوں کا نمودار ہونا ہو۔

وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳	اور جب دریا ابل پڑیں گے (۳)

اور جب دریاؤں کے راستے ایک دوسرے کی طرف کھل جائیں گے، میٹھا اور کھارا پانی باہم خلط ہو جائے گا اور ایک دریا کی صورت اختیار کر جائے گا۔

وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۝۴	اور جب قبریں اکھیڑی جائیں گی (۴)

اور جب قبریں شق کردی جائیں گی، اور مُردے قبروں سے باہر نکل آئیں گے، ہر شخص اپنا اگلا اور پچھلا عمل جان لے گا، جو شخص جہاں فوت ہوا ہو، وہیں سے اٹھے گا اور محشر کی طرف چلنے لگے گا، ان واقعات کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ انسان خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔

عَلِمْتَ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۝۵	ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا ہے اور جو پیچھے چھوڑا (۵)

اس دن انسان کے اعمال کسی کمی بیشی کے بغیر ہر عمل کا وقت مقام اور طریقہ بہترین انداز میں پیش کیا جائے گا، قیامت کے دن انسان کی استعداد بڑھ جائے گی اور وہ پچھلے تمام اعمال کو یاد کر لے گا، طبری نے کہا ہے کہ: اس دن ہر ایک شخص جان لے گا کہ اس نے کیا نیک عمل انجام دیا ہے، اور کونسا طریقہ اور سنت کی بنیاد رکھی ہے کہ اس کے بعد اس پر عمل کیا جاتا ہے؟ (طبری: 30/54)۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝۶	اے انسان! تجھ کو کس نے فریب خوردہ بنایا اپنے رب کے بارے میں (۶)

یعنی: کس چیز نے تجھے مشغول رکھا اور دھوکہ دیا کہ اپنے رب کریم کا کفر کیا، وہ پروردگار جس نے دنیا میں تیری پیدائش مکمل فرما کر تجھے حواس اور فضل بخشا، تجھے عاقل اور سمجھدار بنایا، اور تجھے روزی دی، اور ایسی نعمتیں عطا فرمائیں کہ ان میں سے کسی ایک کے انکار کرنے کی گنجائش نہیں۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ: انسان کو عفو خداوندی نے مغرور کر دیا، اس لیے کہ اس ذات نے انسان کو اس کی پہلی نافرمانی اور گناہ کے مرتکب ہونے پر فوراً نہیں پکڑا اور سزا نہیں دی۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیت: **يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ** کی تلاوت کرتے تو فرماتے: "انسان کو اس کی جہالت نے دھوکہ دیا اور مغرور بنایا"۔

بعض مفسرین اس آیت کے شأن نزول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: یہ آیت اُبی بن خلف یا اُبی اشد بن کلدہ جمحی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "انسان سے مراد یہاں ولید بن مغیرہ ہے"

محترم قارئین:

اس آیت مبارکہ میں: بعد اس کے کہ قیامت سے متعلق بحث درمیان میں آگئی، ایک اور موضوع کو ہمارے عظیم رب نے بہت عمدہ انداز میں اٹھایا، اور انسان کو خواب غفلت سے جگانا اور اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں اس کی توجہ خدا کی طرف مبذول کرنا ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ اس آیت میں انسان کی رب کی طرف توجہ اور خدا کی طرف سے عائد کردہ اس کی ذمہ داری کی طرف سب سے پہلے مخاطب کیا گیا ہے، اور پھر سرزنش کے ساتھ سوال کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ایک قسم فضل اور محبت کے ساتھ کھائی گئی ہے: "اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے رب کے بارے میں سرکش بنادیا ہے؟" غرور یا خود فریبی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے پاس جو کمالات اور امکانات رکھتا ہے ان سے مطمئن ہے، اور اپنے آپ کو سمجھدار اور مکمل سمجھتا ہے، اور وہ جدوجہد کرنا اور جاننا اور آگے بڑھنا چھوڑ دیتا ہے، اور جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔

غرور کا مطلب ایسی خود فریبی جو مال و دولت اور غیر حقیقی اشیاء کی کشش اور دنیاوی مفادات کے ذریعے بھکادے، جو کہ انسان کو خدا کی یاد سے غافل رکھنے کا باعث بن جائے، اور اپنی روحانیت اور اپنی خوش بختی کو جو اس کا اصل سرمایہ ہے بھول جائے، اور اس کے نتیجے میں وہ ہر قسم کی اخلاقی اور ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے، جیسے تکبر اور خود غرضی وغیرہ۔ "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں لفظ "غرور" (غین کے فتح کے ساتھ معنی وصفی ہے) کو ہر اس چیز کے معنی میں استعمال کرتا ہے، جو انسان کو دھوکے میں ڈالے یا غفلت میں رکھے، چاہے مال اور مقام ہو یا خواہش اور شیطان۔

"صاح اللغہ" میں "غرور" کے معنی اور تفسیر میں ان امور کو بتایا ہے جو انسان کو غفلت میں رکھ کر دھوکا دیتے ہیں، چاہے وہ مال و دولت ہو یا علم اور مقام وغیرہ۔

طریحی کے کہنے کے مطابق بعض ارباب لغت نے کھاہے کہ "غرور" ہر اس چیز کی محبت میں دھوکہ کھانا جو بظاہر اچھی اور خوبصورت لگتی ہو، اور پیاری بھی لگے، لیکن حقیقت میں بہت ناپسندیدہ ہو۔

ارباب لغت کے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد کتاب "التحقیق فی کلمات قرآن الکریم" میں لکھا ہے کہ اس لفظ کا اصل معنی یہ ہے کہ: انسان کا کسی اور چیز کے اثر سے غفلت میں پڑ جانا، جس کے نتیجے میں انسان کو دھوکہ، خود فریبی، نقصان اور شکست حاصل ہوتی ہو اور بس۔

"محجة البیضاء فی تہذیب الأحياء" جس کا شمار اخلاق کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے، اور یہ کتاب تکملہ اور تہذیب ہے امام غزالی کے "احیاء العلوم" کی اس میں لکھا ہے کہ: غرور کی تعبیر یہ ہے کہ: ایسی چیز سے انسان کادل خوش ہو جائے جو اس کی خواہشات کے مطابق ہو، اور انسانی طبعیت کا میلان اس کی طرف ہو، یہ چیز انسان کی غلطی اور شیطان کے دھوکے سے دل میں پیدا ہوتی ہے، اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک اچھا انسان ہے، اور اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے، خواہ روحانی اعتبار سے ہو یا مادی اعتبار سے، یہ عقیدہ یا خیال اس کو غلط سوچ کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، اور وہ آدمی دھوکے میں مبتلا ہے (اسی کو اس آیت میں غرک کیا گیا ہے)، یہ اگرچہ خود کو اچھا آدمی سمجھتے ہیں، جبکہ وہ غلطی

پرھے اس لیے اکثر لوگ مغرور یعنی دھوکے میں ہیں، اگرچہ ان کے غرور اور دھوکے کے مراتب مختلف ہیں۔

اللّٰہِیْ خَلَقَکَ فَسُوْبُکَ فَعَدَلْکَ، ۝	وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا اور ٹھیک کیا، اور تیرے مزاج کو معتدل بنایا (۷)

اے ناشکرے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے بخشنے والے رب کے بارے میں دھوکے میں ڈالا ہے، اس عظیم رب نے تجھے نطفے سے بنایا، تجھے بہترین اعضاء عطا کیے، حواس خمسہ جیسی نعمت دی، جس کے ذریعے اور اس کی برکت سے سن سکتے ہو، دیکھ سکتے ہو اور سمجھ سکتے ہو۔

اس آیت مبارکہ میں انسان کی تخلیق، پیدائش، سیدھا ڈھانچہ، مساوی ساخت، اور جس اعتدال اور توازن کے ساتھ اس کی تخلیق ہوئی ہے بتایا گیا ہے۔

"فَعَدَلْکَ" (تیری خلقت کو معتدل اور درمیانہ رکھا نہ ہاتھ دوسرے ہاتھ سے لمبا ہے، اور نہ پاؤں دوسرے پاؤں سے چھوٹا وغیرہ)۔

فِیْ اٰیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاءَ رَبُّکَ ۝	اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا (۸)

اس عظیم رب نے تمہاری صورت اور ساخت سب سے بہترین اور خوبصورت ترین اور معتدل سانچے میں ڈھالی، قرآن کریم انسانی ساخت کی خوبصورتی اور اس کی شکل و صورت کے بارے میں فرماتا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (سورہ تین: 4) کہ ہم نے انسان کو بہت اچھے سانچے میں پیدا کیا ہے۔

اسی طرح سورہ غافر کی آیت "64" میں فرماتا ہے: "وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوْرَکُمْ" (اور تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی خوب بنائیں)۔

سورہ تغابن کی آیت "3" میں فرماتا ہے کہ: "وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوْرَکُمْ" ۝ وَالِیْہِ

الْمَصِیْرُ ۝ سورہ مؤمنون کی آیت "14" میں ہے: "فَتَبَارَکَ اللّٰہُ الْخَالِقِیْنَ"

ترجمہ: "تو خدا سب سے بہترین بنانیوالا بڑا بابرکت ہے"

حسن صورت عبارت ہے ان اشیاء کے تناسب سے جن کی نسبت ایک دوسرے کے ساتھ ہو، اور ان اسباب کے مجموعے کا تناسب اس غرض کے ساتھ جس کے لیے اسے ایجاد کیا گیا ہے، یہ ہے حسن کا معنی، صرف ظاہری خوبصورتی نہیں، اس لیے حسن کا معنی عام ہے، جو تمام موجودات میں پایا جاتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: انسان کو سب سے خوبصورت شکل میں پیدا کیا ہے، یعنی: معتدل اور سیدھے قامت والا بنایا گیا ہے، دوسرے جانوروں کی طرح پراگندہ اور منہ کے بل جھکا ہوا نہیں۔

(تفسیر المیزان) "احسن التقویم" انسانوں کو اپنے نفس میں مکمل اور اعضاء و جوارح میں معتدل پیدا کیا ہے، جو بولنے اور پہچاننے میں اور کاموں کی تدبیر کرنے میں دوسرے موجودات سے الگ ہے (سورہ حجرات: 85)

محترم قارئین !

آیات مبارکہ 9 " تا 19 " میں موضوعات : (۱) انکار قیامت، (۲) نامہ اعمال کے کاتبین، (۳) نیک لوگوں کی جماعت، (۴) اور گنہگاروں کی جماعت کے بارے بحث کی گئی ہے۔

ہرگز نہیں بلکہ تم دین کو جھٹلاتے ہو (۹)

كَلَّا بَلْ تُكْذِبُونَ بِالَّذِينَ ۝۹

دین سے مراد : قیامت کے دن اعمال کی سزا، یا دین اسلام ہے۔

کلا: ایسا لفظ ہے جو کافر انسان کی تنبیہ اور خبردار کرنے اور اس کی سرزنش کرنے کے لیے ہے کہ انسان کو خدا جلّ جلالہ کی مہربانی اور کرم پر مغرور نہ ہو، اور یہ کہ اللہ کی نعمت اور فضل کو کفر کرنے کا وسیلہ نہ بنائے۔

قیامت کی نشانیوں کے بیان اور انسان پر اپنی نعمتوں کے گننے اور اس انسان کی طرف سے اس کا انکار اور ناشکری کے بعد اس انکار کی وجوہات جو کہ قیامت کی دن کا جھٹلانا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں (۱۰)

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝۱۰

یعنی: تیری تردید اور تکذیب کاکوئی فائدہ نہیں، نہ توقیامت کو موخر کر سکتا ہے، اور نہ اپنے حساب و کتاب کو روک سکتا ہے، باخبر رہو کہ تجھ پر ایسے نگہبان مقرر ہیں جو مکمل توجہ کے ساتھ تیری اور تیرے اعمال کی نگرانی کر رہے ہیں، اور تیرے اچھے اور برے اعمال کو لکھ لیتے ہیں۔

قرطبی کہتے ہیں کہ: وہ نگران فرشتے جو انسان کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی: 245/9)۔

کِرَامًا كَاتِبِينَ ﴿١١﴾	معزز کاتب مقرر ہیں (۱۱)

صرف انسان کے اعمال کی یادداشت نہیں لکھتے، بلکہ اس کو اکسانے والی حرکات اور نیت اور اس کے مقصد کی بھی خبر دیتے ہیں۔

يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ﴿١٢﴾	جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں (۱۲)

یہاں رب تعالیٰ ان لوگوں سے مخاطب ہے جو روز جزاء اور قیامت اور مرنے کی بعد دوبارہ زندہ ہونے کی تکذیب اور انکار کرتے ہیں ان کے بارے میں اللہ فرماتا ہے: یاد رکھو: رب تعالیٰ کی طرف سے تم پر فرشتے مقرر کئے گئے ہیں، تمہارے اعمال لکھتے ہیں تا کہ قیامت کے دن ان اعمال کے حساب سے تم سے پوچھا جائے، اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں اور لکھتے ہیں، باخبر رہو تمہاری کوئی حرکت اور نیت اور ارادہ ان سے چھپا نہیں رہتا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ يَنْهَاكُمُ عَنْ التَّعْرِى، فَاسْتَحْيُوا مِنْ مَلَائِكَةِ اللَّهِ الَّذِينَ مَعَكُمْ، الْكَرَامِ الْكَاتِبِينَ، الَّذِينَ لَا يَفَارِقُونَكُمْ إِلَّا عِنْدَ ثَلَاثِ حَالَاتٍ: الْغَائِطُ، وَالْجَنَابَةُ، وَالْغَسْلُ، فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ بِالْعَرَاءِ فَلْيَسْتَتِرْ بِثَوْبِهِ أَوْ بِجَرَمِ حَائِطٍ، أَوْ بِبُعِيرَةٍ"۔

خدا جلّ جلالہ نے تم لوگوں کو بے لباس ہونے (ننگے) سے منع فرمایا ہے، حیاء کرو اللہ کے ان فرشتوں سے جو تمہارے ساتھ ہیں، معزز لکھنے والے، جو تین موقع کے علاوہ تم سے الگ نہیں ہوتے، قضاء حاجت کے وقت، ہمبستری کے وقت، اور نہانے کے دوران، اور جب تم میں سے کوئی

شخص کھلی فضاء میں نہائے تو چاہئیے کہ اپنے کپڑے سے یا دیوار کی یا اپنے اونٹ کی آڑ لیکر نہائے۔

کیا پیغمبروں کے ساتھ بھی کراما کاتبین ہوتے ہیں؟

شرعی نصوص کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام انسانوں کے ساتھ دوفرشتے ہوتے ہیں، جو انسان کے حالات اور روز مرہ کے معمولات محفوظ کرتے ہیں، ان میں سے ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف ہوتا ہیں۔

دائیں طرف والا انسان کی نیکیاں لکھتا ہے، اور بائیں طرف والے فرشتے کا امیر بھی ہے، بائیں طرف والے کی ذمہ داری انسان کی برائیاں لکھنے کی ہے، اور جب انسان کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو بائیں طرف والا لکھنے لگتا ہے، لیکن اس کا امیر دائیں طرف کا فرشتہ اسے روکتا ہے، اور کہتا ہے کہ صبر کرو، اسے مہلت دو، شاید یہ توبہ کر لے۔

اور جب کوئی نیک عمل کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ فوراً لکھتا ہے بغیر کسی وقفے اور تاخیر کے، خداتعالیٰ فرماتا ہے: "إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۚ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝۱۸" (سورہ ق)

ترجمہ: "جب (وہ کوئی کا کرتا ہے تو) دولکھنے والے جو دائیں بائیں بیٹھتے ہیں لکھتے ہیں"، کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے"

لیکن اس معاملے میں کہ کیا انبیاء کے ساتھ بھی کراما کاتبین ہوتے ہیں؟ رجوع کریں گے عبد اللہ بن مسعود کی اس حدیث کی طرف: "عن عبد اللہ ہوا بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما منکم من أحد إلا وقد وكل به قرينه من الجن، وقرينه من الملائكة. قالوا: وإياک یا رسول اللہ قال: وإیای، ولكن اللہ أعاننی علیہ فلا یأمرنی إلا بخیر" (امام أحمد): عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ساتھی جنات سے اور ایک ساتھی فرشتہ میں سے (اعمال لکھنے والا) ہے، پوچھا گیا: کیا آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا: یہاں تک کہ میرے ساتھ بھی، لیکن خدا تعالیٰ نے اس پر میری مدد کی ہے، چنانچہ وہ خیر کے

علاوہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتا، اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام انسان حتیٰ کہ پیغمبروں کے ساتھ بھی اعمال لکھنے والے کاتب فرشتے ہیں۔

فرشتے انسانوں کا ارادہ اور نیت بھی لکھتے ہیں

ایک حدیث میں آیا ہے کہ فرشتے بنی آدم کے ارادہ اور نیت اور جو کچھ انسان کے دل میں ہے اسے لکھتے ہیں، اور کسی کام کے کرنے کا ارادہ کر لے تو اسے بھی لکھتے ہیں، اس لیے انسان جب اچھی نیت کرے تو اسے ثواب ملتا ہے، اور بُری نیت پر اسے سزا ہوتی ہے، کیونکہ نیت قلب کا عمل ہے، فرشتے اس بات پر مأمور ہیں کہ جب ایک انسان سن بلوغت کو پہنچتا ہے تب سے دنیا میں جو نیت اور کردار اور گفتگو کرتا ہے دنیا سے رحلت کرنے تک سب لکھتے ہیں۔

فجر اور عصر کی نماز کا مقام و مرتبہ باقی نمازوں کی بہ نسبت :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : يتعاقبون عليكم ملائكة بالليل وملائكة بالنهار يجتمعون في صلاة العصر وفي صلاة الفجر... (متفق علیہ).

وہ فرشتے جو دن اور رات کو پے درپے تمہارے پاس آتے ہیں، ان کا ایک گروہ رات کو آتا ہے اور ایک گروہ دن کو، اور یہ گروہ فجر اور عصر میں ایک دوسرے کی ساتھ جمع ہوتے ہیں، رب تعالیٰ فرماتے ہیں : "وَقُرْآنَ الْفَجْرِ" یعنی: صبح کی نماز، اور فرماتے ہیں : "إِنْ قرآنَ الْفَجْرِ كَانَ مشهودًا" (سورة اسراء: 78) ترجمہ:

رات اور دن کے فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں، اور نماز میں جو قرآن کی تلاوت ہوتی ہے سنتے ہیں، اور عصر کی نماز میں بھی اکٹھے ہوتے ہیں، رب تعالیٰ انسانوں کی حالت جانتے ہوئے بھی فرشتوں سے پوچھتا ہے کہ: میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے؟ وہ کہیں گے: ہم نے ان کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے، اور جب ہم ان کے پاس گئے تھے تو نماز پڑھ رہے تھے، یعنی فرشتے جب نازل ہوتے تو ہم نماز میں تھے، عصر کی نماز ادا کر رہے تھے، اور ہمارے ساتھ عصر کی نماز میں حاضر تھے، اور پھر جب اوپر گئے تو ہم فجر کے نماز میں تھے، اس وجہ سے عصر کی نماز کو "وسطی" درمیان والی نماز کہا گیا ہے اور

رب تعالیٰ نے اس کی تاکید کی ہے: "حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ" (سورہ بقرہ : 238)

ترجمہ: پانچ وقت کی نمازوں کی پابندی کیجئے، اور خاص طور پر درمیان والی نماز کی (یعنی عصر کی نماز) کیونکہ اس نماز میں دن اور رات کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔

اسی طرح بعض مفسرین نے کھاہے کہ: "الصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ" سے مراد فجر کی نماز ہے، اس وجہ سے کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد دو دونمازیں ہیں۔

بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہونگے (۱۳)	إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝۱۳

وہ حقیقی مؤمن اور پرہیزگار جو اچھے عمل کرتے، اپنے تمام کاموں میں تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور رب تعالیٰ سے ڈرتے ہیں "نعمتوں میں ہوں گے" یعنی: بہشت کی نعمتوں میں ہوں گے، اور بدکار لوگ یقیناً آگ میں رہیں گے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ حساب و کتاب کا دن آنے والا ہے، جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا، اور اپنے ٹھکانے تک پہنچے گا۔

"الابرار" نیکی کرنے والے اور پاک دامن مؤمن ہیں، "جمع بر" وہ لوگ جو خیر کے کام زیادہ کرتے ہیں، گناہ اور شر کے کام نہیں کرتے۔
نیکی کرنے والے دو نعمتوں کے مالک ہوں گے، "نعیم" قلبی اور جسمانی اطمینان۔

اور بدکار لوگ ضرور دوزخ میں ہونگے (۱۴)	وَالْفُجَّارُ لَفِي جَحِيمٍ ۝۱۴

فُجَّار: فاجر کی جمع ہے، یعنی: وہ کفار جنہوں نے شریعت الہی کو ترک کر دیا ہے، (دوزخ میں ہوں گے) اس لحاظ سے "فجَّار" سے مراد کفار ہیں، اس میں کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کرنے والے شامل نہیں ہیں۔

جزا کے دن اس میں داخل ہونگے (۱۵)	يَصَلُّونَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝۱۵

اللہ تعالیٰ نے مکمل جزا و سزا کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے جس کا نام "یوم الدین" رکھا ہے،

فاجر اور کافر اس دن حساب و کتاب کے بعد جہنم میں داخل ہوں گے، اور اس کی بھڑکتی ہوئی آگ میں سختیاں جھیلیں گے اور عذاب چھکیں گے۔

"یوم الدین" کے معنی جزا، حساب اور اطاعت کے ہیں، شریعت اور قانون کو اس لیے "دین" کہا گیا ہے کہ اس میں اطاعت، جزا اور سزا ہے، فاتحۃ الكتاب کی آیت: 4، اور حجر کے: 35، شعراء کی آیت: 82، صافات: 20، ص: 78، ذاریات: 12، اور واقعہ: 56، المعارج: 26، مدثر: 46، مطفین: 11، التین: 7، ماعون کی آیت: 1) میں قیامت کے دن کو "یوم الدین" کہا گیا ہے اور قیامت کو "دین" کہا ہے۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ قیامت کے قیام کا سب سے واضح منصوبہ اور بنیادی مقصد دین کا منصوبہ ہے، یعنی سزا و جزا اور انسانی اعمال کا الہی حساب۔

جی ہاں! "یوم الدین" وہ دن ہے جب اعمال اور سچائیوں سے پردہ اٹھایا جائے گا، اور اعمال کا صحیح حساب ہوگا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزاء اور سزا دی جائے گی، یہ ہے "یوم الدین" کی حقیقت۔

امام رازی نے نقل کیا ہے: اموی خلیفہ سلیمان بن عبد المالک مکے کی طرف سفر کر رہے تھے، راستے میں مدینہ سے گذر ہوا اور ابو حازم سے ملاقات ہوئی تو ان سے پوچھا کہ: کل قیامت کو رب کے سامنے پیش ہونا کیسا ہے؟

ابو حازم نے کہا: نیک لوگ، اس شخص کی طرح ہیں جو سفر سے واپس اپنے خاندان کے پاس لوٹتے ہیں، جبکہ بدکار، اس بھگوڑے غلام کی طرح ہے جس کو آقا کے پاس گھسیٹتے ہوئے لایا جاتا ہے۔

راوی کہتا ہے: سلیمان رونے لگے اور کہا: اے کاش (میں جانتا) کہ اللہ سبحانہ میرے ساتھ کیا معاملہ فرمائے گا؟ ابو حازم نے کہا: یہ تو آسان کام ہے اپنے عمل کو قرآن کریم پر پرکھو، تب جان لو گے کہ وہ تیرے ساتھ کیا معاملہ فرمائے گا۔

سليمان نے کہا: آپ کی یہ نصیحت اور توصیہ قرآن کریم میں کس جگہ اور مقام پر آیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝۱۳ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝۱۴ سليمان نے کہا: اس صورت میں اللہ جلّ جلالہ کی رحمت کہاں ہے؟ ابو حازم نے جواب دیا: أَنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ " (اعراف " 56) بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝۱۶	اور وہ اس سے غائب نہیں ہوسکیں گے (۱۶)

نہ اتنے جلیں گے کہ خاکستر ہو جائیں اور نہ جلنے کے درد سے رہائی ملے گی، یعنی: کافر و فاجر کبھی بھی جہنم سے دور نہیں ہوں گے، اور ان کا عذاب ہلکا بھی نہیں ہوگا، بلکہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے، دوزخ کو اللہ نے عذاب اور گرمی اور حرارت کے اعتبار سے تمام جہنمیوں کے لیے یکساں نہیں بنایا ہے، بلکہ مختلف ہے، عذاب اور حرارت کی شدت ایک جیسی نہیں ہیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے: " إِنَّ الْمُنْفِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۝ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝۱۴۵ النساء . ترجمہ: "یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔"

لفظ "الدَّرَك" عرب کی لغت میں ہر اس چیز کو جو نچلے مقام پر ہو کہتے ہیں، اور "الدرَج" ہر اوپر والی چیز اور مرتبہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس بنا پر جنت کے لیے درجہ اور درجات اور دوزخ کے لیے درک اور دَرَکات استعمال ہوا ہے، جہنم جتنا نیچے کی طرف ہوگا اتنے ہی اس کے شعلے شدید اور گرم ہوں گے، منافقین کا حصّہ دوزخ کی آگ میں سے زیادہ ہوگا، اس لیے دوزخ کے "درکِ اسفل" میں ہوں گے، کبھی دوزخ کے مراتب پر لفظ "درجات" کا اطلاق بھی ہوتا ہے، رب تعالیٰ سورہ انعام میں اہل بہشت اور اہل دوزخ کے ذکر کے بعد فرماتا ہے: " وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا . الانعام . ترجمہ: "ہر شخص (نیک ہو یا برا) کا درجہ ہے درکات اور اکرام و عزت اور ذلت اس کے عمل کے لحاظ سے ہے۔"

"أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۝ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝۱۶۲ هُم دَرَجَتٌ عِندَ اللَّهِ ۝ وَاللَّهُ بَصِيرٌ مِّمَّا يَعْمَلُونَ ۝۱۶۳" (آل عمران) .

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانہ جہنم ہو جو بدترین ٹھکانہ ہے؟ (162) اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں درجہ فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے (163)"

عبدالرحمن بن زید بن مسلم فرماتے ہیں: جنت کے درجات بلندی اور دوزخ کے درجات بلندی اور پستی دونوں طرف جاتے ہیں (تخويف من النار لابن رجب: صفحہ 50)۔

بعض سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ: گنہگار موحدین جو دوزخ میں جائیں گے وہ درک اعلیٰ میں ہوں گے، یہود درک دوم میں، نصاریٰ درک سوم میں، صائبیں (بے دین لوگ) درک چہارم میں، مجوس درک پنجم میں، مشرکین اعراب درک ششم میں، اور منافقین درک ہفتم میں ہوں گے، بعض کتابوں میں ان درکات کے نام بھی ذکر ہوئے ہیں۔

پہلا درک: جہنم، دوسرا درک: لظی، تیسرا درک: حطمہ، چوتھا درک: سعیر، پانچواں درک: سقر، چھٹا درک: جحیم، اور ساتواں درک: ہاویہ ہے۔ لیکن لوگوں کی یہ تقسیم مذکورہ تقسیم کی بنیاد پر ٹھیک نہیں، اسی طرح دوزخ کے مراتب کے نام رکھنا بھی اس شکل پر درست نہیں ہے، جیسا کہ بیان ہوا ہے، راجح اور صحیح قول یہ ہے کہ مذکورہ اسماء بھی جہنم کے نام ہیں جیسے: جہنم، لظی، حطمہ..... یہ جہنم کے طبقات کے نام نہیں ہیں، البتہ یہ مطلب کہ لوگ گناہوں کے اعتبار سے الگ اور مختلف مراتب رکھتے ہیں درست ہے۔

اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟
(۱۷)

وَمَا آذْرُكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝۱۷

ان آیات میں "یوم الدین" کی سب سے اہم خصوصیت رب تعالیٰ کی قدرت ہے، اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور سلطنت کے ظہور کو یوم الدین کی اہم ترین خصوصیات میں ذکر کیا ہے، فرماتا ہے:

پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟
(۱۸)

ثُمَّ مَا آذْرُكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝۱۸

مطلب یہ ہے کہ قیامت کی حقیقت کوئی نہیں جان سکتا اگرچہ اسے تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یعنی اے پیغمبر اگرچہ آپ اس آیت کے اولین مخاطب ہیں مگر اس دن کی عظمت کی حقیقت کا ادراک آپ کو بھی صرف اتنا ہی ہے کہ جتنا ہماری معیشت کا تقاضہ تھا۔

یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۝ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۝۱۹	جس روز کوئی کسی کا اختیار نہیں رکھے گا اور حکم اس روز خدا ہی کا ہوگا (۱۹)

سزا اور جزا کا دن، ایسا دن ہے کہ کسی کو کسی بھی چیز کا اختیار نہیں ہوگا، قیامت کا دن ایسا دن ہوگا کہ کوئی شخص کسی دوسرے (کا دفاع نہیں کرسکے گا) دفاع کرنے کی طاقت اور صلاحیت نہیں رکھے گا بلکہ، صرف اپنی نجات کی فکر میں ہوگا، اور وہ دنیا کی طرح نہیں ہے کہ ظالم اور طاقتور لوگ اپنے غلط مقاصد حاصل کرسکیں، اور جو کچھ چاہیں کرگذریں۔

"وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ" (اس روز حکم محض اللہ واحد کا ہوگا) جی ہاں! اُس دن بندوں کے درمیان فیصلہ کرنا اور تنازعات کا خاتمہ، مظلوم کا حق ظالم سے لینا، راست بازوں اور انصاف کے متلاشیوں کو بہتر انعام فراہم کرنا اور گناہگاروں کی بخشش اور درگزر کرنا یا سزا دینا، یہ سب صرف خدا کی طرف سے ہوگا اور بس۔

کوئی شخص (کوئی بھی ہو) قیامت کے دن کسی دوسرے کو فائدہ پہنچانے کا اختیار نہیں رکھے گا، وہاں پروردگار عالم کے علاوہ کوئی اور حکم جاری نہیں کرسکے گا اور نہ کوئی اور کام کرسکے گا، یعنی خدا کی کاملہ اور لامحدود قدرت کا قیامت کے دن ظہور ہوگا۔

قیامت کے دن کے بارے میں مختصر وضاحت

قرآن کریم زمین، آسمان اور انسان کی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے قیامت کے دن کے اوصاف کے بارے میں فرماتا ہے، قیامت کا دن فرار اور بھاگنے کا دن ہے، جس دن انسان اپنی ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، اولاد اور اپنے کنبے سے بھاگے گا، اور یہ کہ ہر کوئی اپنے کام میں مصروف ہوگا، درحقیقت محشر کا دن رشتہ داروں سے قطع تعلق اور رشتے ناتے توڑنے کا

دن ہے، قرآن کریم فرماتا ہے کہ حشر کے دن صرف انسانوں کے جی اٹھنے تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اہم واقعات کا سلسلہ بھی ہے، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

1- زمین، سمندر اور پہاڑوں کی حالت

سورہ مبارکہ تکویر، زلزال، دخان، اور واقعہ کی آیات کے مطابق قیامت کے دن زمین میں شدید زلزلہ برپا ہوگا، جو کچھ زمین پر ظاہر ہے، وہ منہدم ہو جائے گا، زمین پھٹ جائے گی، اور مُردے اس سے باہر آئیں گے، تا کہ قیامت کے دن وہ جمع ہوں، دریا ایک دوسرے سے الگ ہو کر جوش مارتے ہوئے ابل پڑیں گے۔

پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اکھاڑا جائے گا، اور وہ غیر متوازن حرکت کریں گے، اور وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح ہوجائیں گے، اور انہیں اُون کی طرح دھنا جائے گا، وہ نرم اور لچکدار ہوجائیں گے۔

آخر میں، وہ دھول کے ذرات کی طرح منتشر ہوجائیں گے، اور یہ فلک بوس پہاڑ سراب کے سوا کچھ نہیں بچے گے۔

2- آسمان اور ستاروں کی حالت

آسمان اور ستاروں کی حالت کے بارے میں "تکویر، انفطار، طور، الرحمن" کی سورتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ آسمان کی حالت بدل جائے گی، اور ستارے جڑ سے اکھڑ جائیں گے، آسمان لہروں اور حرکتوں کی وجہ سے پارہ پارہ ہو جائے گا، اور یہ سرخ پھولوں اور مائع پگھلے ہوئے دھات کی طرح ظاہر ہو جائے گا۔

آخر کار دھوئیں میں تبدیل ہو کر لپیٹا جائے گا، سورج اور چاند کی روشنی ماند پڑ جائے گی، ان کی ترتیب میں خلل پڑ جائے گا، اور زمین کی طرف پھینک دیئے جائیں گے۔

3- صور پھونکنا:

قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں قیامت کی نشانیوں میں صور پھونکنے کا ذکر بھی ہے، اور وہ دو پھونکیں ہیں، جس میں سے ایک موت کا نفخہ ہے، جو کہ عام قیامت سے پہلے پھونکی جائے گی۔

یعنی قیامت کے برپا ہونے سے پہلے ایک ہولناک آواز تمام موجودات کے

کانوں سے ٹکرائے گی جس کے نتیجے میں ان سب کی موت واقع ہوگی، اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اور دوسرا نفخہ زندگی کا ہے، قیامت قائم ہوگی اور دنیا کا منظر خدا کے نور سے منور ہو جائے گا، اور تمام انسان حتیٰ کہ حیوانات بھی ایک لمحے میں زندہ کئے جائیں گے۔

قرآن کریم سورہ زمر کی آیت "68" میں صور پھونکنے کے بارے ارشاد ہے: اور صور پھونکا جائے گا، پھر وہ سب مرجائیں گے جو آسمان اور زمین میں ہیں، سوائے ان کے جن کو خدا چاہے گا، پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا، اچانک سب کھڑے ہو جائیں گے اور دیکھنے لگیں گے۔

قیامت کی صفات

قرآن کریم نے قیامت کے دن کے لیے مختلف نام اور صفات ذکر کی ہیں، جن میں سے ہر ایک سچائی پر دلالت کرتی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں:

1- وقوع پذیر ہونے والی اور ناقابل تردید ہے:

قرآن کریم نے سورہ واقعہ کی آیت "2" اور سورہ حج کی آیت "7" میں قیامت کو ایک ایسی چیز قرار دیا ہے جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

2- قریب ہونا

سورہ معارج کی آیت "7" میں قیامت کو قریب کہا گیا ہے، بعض تعبیرات میں لفظ "غَد" یعنی:

"کل" کے ساتھ ذکر ہوا ہے، جیسے سورہ حشر کی آیت "18" میں -

3- قیامت کا حق ہونا:

سورہ نبا کی آیت "39" میں قیامت کے دن کو برحق کہا گیا ہے، اور وہ ایسا دن ہوگا جس میں خالص حق کا ظہور ہوگا، اور باطل کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی، ہر ایک کو اس کا بدلہ ملے گا۔

4- بڑی (عظیم) خبر:

سورہ "ص" کی آیت "67" سورہ یونس کی آیت "15" اور (سورہ ہود کی

آیت "3" میں قیامت کو بڑی خبر کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، اور "عظیم دن" بھی کھا ہے، کیونکہ اس میں بڑے بڑے واقعات رونما ہوں گے، اسی طرح (روز کبیر) بڑا دن بھی کھا ہے۔

5- پکار کا دن:

محشر کے دن کے منظر کو پکار کا دن اور "یوم التناد" کہتے ہیں، یہ نام اس لیے ہے کہ جہنمی لوگ اس دن جنتیوں کو پکاریں گے (سورہ اعراف : 50)۔

6- بوڑھا کرنے والا:

قیامت وہ دن ہے جس میں بچے اور نوجوان بوڑھے ہو جائیں گے، اس کی وجہ شاید اس دن کی طوالت اور رونما ہونے والے واقعات ہیں۔ (سورہ مزمل آیت 17)۔

رازوں کا افشاء ہو جانا

قیامت کے دن انسانوں کے تمام راز اور اعمال کھل جائیں گے، اور مؤمن و بدکار اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے، اور انسانوں کے اعمال نامے کھل جائیں گے، ایک ایسا اعمال نامہ جس میں تمام اعمال درج ہوں گے، اور ہر شخص اپنے کیے ہوئے ہر اچھے اور بُرے عمل کو دیکھے گا، (سورہ طارق آیت "9" اور سورہ تکویر آیت "10")۔

فرشتوں پر ایمان لانا واجب :

اسلام کے اصول پنجگانہ میں سے ایک فرشتوں پر ایمان لانا ہے، کچھ فرشتے وہ ہیں جن کے نام رب تعالیٰ نے ہمیں بتائے ہیں، جیسے: جبرائیل، میکائیل، اور مالک جو جہنم کا نگران ہے،

وَنَادُوا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رُبُّكَ " (سورة الزخرف : 77)۔

جہنمی لوگ مالک جو جہنم کا نگران ہے کو پکار کر کہیں گے: "اے مالک! اپنے پروردگار سے کہدے کہ ہمیں موت دیدے تاکہ ہم مرجائیں اور سکون حاصل کریں"۔

تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان فرشتوں پر ایمان لائیں، چاہے وہ فرشتے ہوں جن کے نام ذکر ہوئے، یا وہ جن کے نام ذکر نہیں ہوئے، اور ان کے ان عمل اور ذمہ داریوں پر بھی جن کو یہ فرشتے اللہ کے حکم کے مطابق

انجام دیتے ہیں، اور ایسے فرشتے بھی ہیں آسمان میں جو اپنے رب کی عبادت، رکوع اور سجود میں مصروف ہیں، اور آسمان میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے مگر وہاں پر کوئی نہ کوئی فرشتہ رکوع اور سجدے کی حالت میں ہے، اور ایسے فرشتے بھی ہیں جن کے بارے میں رب کے علاوہ کسی کو کوئی علم نہیں ہے۔

ہم اجمالی طور پر ان فرشتوں پر ایمان لاتے ہیں جن کے ناموں کا ذکر نہیں کیا گیا، اور ان فرشتوں پر جن کے نام ذکر کیے گئے ہیں تفصیل کے ساتھ، اور ان سے محبت کرتے ہیں، اور یہ وہ فرشتے ہیں جو بنی آدم کو نیکی اور خیر کی نصیحت کرتے ہیں، اور نیکی کام حکم کرتے ہیں، اور ان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: "الَّذِينَ يَحْمِلُونَ

الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا" ترجمہ: "عرش الہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں، اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔"

انسان کی زندگی میں فرشتوں پر ایمان کی نشانی اور اثرات:

فرشتوں پر ایمان لانا انسانوں کی روز مرہ زندگی میں اہم کردار اور اثر رکھتا ہے، کیونکہ جب کوئی انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے، یا اس کی نگرانی کی جا رہی ہے، تو وہ اپنی زندگی میں محتاط رہے گا۔

اگر وہ جان لے کہ ایسے فرشتے اس پر مأمور ہیں جو دن رات اس کی نگرانی کر رہے ہیں، اس صورت میں وہ زیادہ احتیاط کرے گا، جیسا کہ دنیاوی امور میں ایسا کرتا ہے، جب انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے، تو وہ احتیاط سے قدم اٹھا تا ہے، اس لیے ہمیں فرشتوں کی نگرانی کے معاملے میں بھی محتاط رہنا چاہیئے۔

دنیا میں نگرانی اور جاسوسی کرنے والوں کو انسان کم از کم دیکھ سکتا ہے، اور خود کو ان سے چھپا بھی سکتا ہے، جبکہ فرشتوں کی نگرانی اور نظر سے خود کو پوشیدہ اور مخفی رکھنا یا راہ فرار اختیار کرنا بہت ہی مشکل

بلکہ ناممکن کام ہے، انسان ان فرشتوں کی نگرانی اور نظروں سے بھاگ نہیں سکتا، فرشتے انسان کا ہر جگہ پیچھا کرتے ہیں، اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں، رب تعالیٰ نے ان کو یہ قدرت و صلاحیت دی ہے کہ جہاں رب تعالیٰ ان کو پہنچنے کا حکم فرمائے یہ وہاں پہنچ جاتے ہیں، اس لیے رب تعالیٰ فرماتا ہے: **وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝۱۱** (سورة الانفطار)۔

خدانے یہ اس لیے کہا تا کہ ہم اپنا خیال رکھیں اور اپنے اعمال کی پابندی کریں۔

فرشتوں پر ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان اپنے بُرے قول و فعل میں محتاط رہے گا، تا کہ اس کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے، نہیں تو قیامت کے دن اسے عذاب دیا جائیگا۔

فرشتوں کے اعمال اور شیطان کے اعمال میں کیا فرق ہے ؟

1 - فرشتے رب تعالیٰ کی تسبیح، تقدیس اور شکر ادا کرتے ہیں، اور زمین والوں کے لیے طلب استغفار کرتے ہیں، اور وہ بنی آدم کے لیے خدا تعالیٰ کی سب سے زیادہ خیر خواہ مخلوقات میں سے ہیں، جبکہ شیاطین بنی آدم کے لیے سب سے زیادہ خیانت کرنے والی مخلوقات میں سے ہیں، اس لیے کہ شیاطین نے بنی آدم کو گمراہ کرنے اور دھوکہ دینے کے لیے جس قدر وہ کرسکتے ہیں عہد کر رکھا ہے، تا کہ بنی آدم کو ہلاکت میں ڈال دے۔

2 - فرشتے نیکی اور اچھائی کی طرف بلاتے ہیں، اور شیاطین بُرائی اور فساد کا حکم دیتے ہیں، چنانچہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: **"وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقِضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۝۳۶"** ترجمہ: "اور جو شخص رحمن کے ذکر سے غفلت برتتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے"۔

پھر جولوگ قرآن سے منہ موڑتے ہیں اور اسے پیٹھ پیچھے ڈالتے ہیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے، اس طرح کہ ایک شیطان کو اس پر مقرر اور مسلط کر کے اس کا ساتھی بنادیتا ہے، تاکہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے، اسی طرح رب تعالیٰ فرماتا ہے: **"وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ**

وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُونَ ۝۳۷ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدُ الْمَشْرِقَيْنِ فَيُحْسَبُ

الْقَرِیْنُ ۝۳۸" ترجمہ: "یہ شیاطین ان لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں، جبکہ وہ اپنی جگہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں " ۝۳۷ " آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب جتنی دوری ہوتی تو بدترین ساتھی ہے ۝۳۸ "۔

اللہ تعالیٰ کی یاد کے سوا کوئی چیز انسان کو شیطان سے دور نہیں رکھ سکتی۔

3۔ یہ کہ خدا کا ذکر شیطان کو اس سے دور کر دیتا ہے اور فرشتے اس کے قریب ہوتے ہیں، اسی وجہ سے شیطان کو " الوسواس الخناس" کھاجاتا ہے، اور جب بھی انسان ذکر خداوندی کو ترک کر دیتا ہے تو شیطان اس کی طرف آتا ہے، اور جب خدا کی یاد میں مشغول ہو تو فرشتے اسے گھیر لیتے ہیں۔

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ: (ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینہم الا نزلت علیہم السکینۃ وغشیتہم الرحمۃ وحفتہم الملائکۃ و ذکرہم اللہ فیہن عندہ)۔ (مسلم)۔

ترجمہ: " جب بھی لوگوں کا ایک گروہ خدا کے گھروں میں سے کسی ایک مسجد میں اکھٹا ہو جاتا ہے، تاکہ خدا کی کتاب قرآن مجید پڑھ لیں اور اس کے اسباق ایک دوسرے کو سکھائیں تو ان کے دلوں پر سکون نازل ہوتا ہے، اور خدا کی محبت اور رحمت ان کا احاطہ کرتی ہے اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں، اور خدا انہیں اپنے ساتھ والوں کے سامنے یاد کرتا ہے۔

علماء کرام کی ایک بڑی تعداد نے قرآنی آیات اور احادیث نبوی سے استنباط کرتے ہوئے فرشتوں میں سے کسی ایک کے مذاق اڑانے یا استہزا کرنے کو کفری عمل قرار دیا ہے۔

ملائک کا مذاق اڑانا:

جیسا کہ ہم کہتے آئے ہیں: فرشتوں پر ایمان لانا اور ان کی تعظیم و احترام کرنا ایمان کے ارکان میں سے ہے؛ لہذا فرشتوں کا مذاق اڑانا یا تمسخر کرنا

شریعت کی رو سے ناجائز ہے، اور جو شخص ایسا کرے وہ کفری عمل کا مرتکب ہوتا ہے، اور وہ کافر ہوجاتا ہے۔

ان کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ ایسا کام کرتے ہیں تو یہ عمل ایک شخص کے اسلام سے خارج ہونے کی وجہ اور مرتد ہونے کا سبب بنتا ہے۔

سورہ توبہ کی آیت (65 اور 66) سے علماء نے استنباط کیا ہے: وَلَیِّنْ سَأَلْتَهُمْ

لَیْقُولَنَّ اِمَّا كُنَّا تَخُوْضٌ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ اَبَا اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶۵ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ

كَفَرْتُمْۚ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ ۚ اِنْ تَعْفُ عَنْ طَآیِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآیِفَةًۭ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ۝۶۶ "

ترجمہ: اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے، کھو کیا تم خدا اور اسکی آیتوں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہنسی کرتے تھے؟ (65) بھانے مت بناؤ، تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو، اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کردیں تو دوسری جماعت کو سزا بھی دینگے، کیونکہ وہ گناہ کرتے رہے ہیں (66)

جلیل القدر عالم ابن حزم فرماتے ہیں:

نص شرعی سے یہ بات ثابت ہے کہ جو شخص خداتعالیٰ کو یا کسی فرشتے یا انبیاء علیہم السلام یا قرآن کریم کی کسی آیت کو یا دینی فرائض میں سے کسی ایک فریضہ کا مذاق اڑائے یا تمسخر کرے، اگر اس پر حجت تمام ہو چکی ہے تو وہ کافر ہے، کیونکہ یہ سارے اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی طرف سے وحی ہے، (الفصل فی الملل والاهواء والنحل: 143/3).

پھر کہا: جو کوئی خدا کو گالی دے یا مذاق اڑائے یا کسی فرشتے کا مذاق اڑائے یا استہزا کرے، یا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو گالی دے یا مذاق اڑائے، یا قرآن کریم کی کسی بھی آیت کا مذاق اڑائے یا گالی دے، وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے کافر اور مرتد ہوجائیگا، اور اس پر مرتد کا حکم جاری ہوگا، اللہ کی شریعت اور قرآن کریم سب خدا کی آیات ہیں۔ (المحلی: 413 / 11).

ابن نجیم حنفی کہتے ہیں کہ: فرشتوں میں سے کسی ایک پر اعتراض کرنے یا اسے ہلکا سمجھنے سے انسان کافر ہوجاتا ہے، (البحرائق: 131 / 5)

حتی کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ : آدمی ایسے ہر لفظ سے کافر ہو جاتا ہے، جس سے استہزاء اور تمسخر محسوس ہوتا ہو، جیسا کہ ابن نجیم نے لکھا ہے: اگر کوئی دوسرے سے کہے: میرا دیکھنا تیری طرف ملک الموت کے دیکھنے کی طرح ہے، بعض اہل علم نے اکثریت کے برخلاف لکھا ہے کہ اس طرح کہنے سے بھی کافر ہو جاتا ہے۔

وہ جگہیں جہاں فرشتے جاتے ہیں:

ایسے فرشتے ہیں جو دنیا میں گھومتے اور سفر کرتے ہیں، اور ذکر اور درس کے حلقے اور مجالس تلاش کرتے ہیں، اگر کسی ایسے حلقے کو دیکھیں جس میں ذکر اور درس ہو رہا ہو تو کہتے ہیں کہ اُو ہمیں اپنی ضرورت مل گئی، ذکر کے حلقے بہت سارے ہیں مثال کے طور پر:

1- تلاوت قرآن، پس جس نے قرآن کی تلاوت کی اس نے خدا کا ذکر پورا کیا۔

2- جس نے نماز پڑھی اس نے خدا کا ذکر کیا۔

3- جس نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تہلیل، تکبیر، استغفار اور شکر ادا کیا اس نے خدا کا ذکر کیا، اس صورت میں فرشتے ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں جبکہ شیاطین ان سے دور ہو جاتے ہیں۔

4- جس نے علمی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس کے لیے مجالس تشکیل دیئے تاکہ علم سیکھیں تو اس نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا، فرشتے اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں۔

وہ جگہیں جہاں شیاطین جاتے ہیں:

1- جو اپنا وقت بے مقصد ضائع کرتے ہیں، جیسا کہ: موسیقی، گیت اور فحاشی، ڈانس اور گانے وغیرہ کی محفل، شیاطین ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں جبکہ فرشتے ان سے دور ہو جاتے ہیں۔

2- جو جاندار اشیاء کی تصاویر گھر میں لٹکاتے ہیں، فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: "إِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ" (متفق علیہ)۔ ترجمہ: "جس گھر میں کُتا اور تصویر ہو اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے" رحمت والے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوں گے جس میں تصویر ہو۔

بنی نوع انسان کے ساتھ شیطان کی دشمنی کی تاریخ

قرآن کے فرمان کے مطابق شیطان انسان کے ساتھ ایک طویل تاریخ رکھتا ہے، جیسا کہ قرآن عظیم اس سلسلے میں کہتا ہے: "إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ" (سورہ فاطر آیت 6) ترجمہ: "شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو - وہ اپنے (پیروؤں کے) گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخ والوں میں ہوں۔"

ہم نے کہا کہ شیطان کی انسان سے دشمنی کی تاریخ طویل ہے، یہ شیطان ہی تھا جس نے اپنی مکاری اور چالاکی سے آدم اور حوا کو ورغلا کر جنت سے نکالا: "كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ" (سورہ اعراف: 27) تمام لوگوں کے سامنے یہ اعلان کر دیا جائے کہ شیطان ایک خطرناک دشمن ہے اور ایسی جگہ ہے کہ اسے دیکھا نہیں جاسکتا، جبکہ وہ تمہیں دیکھتا ہے: "إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مَن حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۚ" اسلامی روایات میں واضح طور پر کھا گیا ہے کہ شیطان ایسا دشمن ہے جس نے قسم کھائی تھی، "فَبَعَثْنَا" اور وہ ہر طرف سے حملہ کرتا ہے: "مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ" (سورہ اعراف: 17)

لوگوں کو منحرف کرنے کے لیے اس کا ذریعہ غربت کا وعدہ اور فحشاء پر اکسانا ہے: "الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۚ" (سورہ بقرہ: 268) وہ لوگوں کو جہنمی بنانے کے علاوہ کسی بات پر راضی نہیں ہوتا: "إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۚ"۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورۃ المطففین

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اسکی "36" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ: اس سورت کو اللہ تعالیٰ کے فرمان "وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ" سے شروع ہونے کی وجہ سے مطففین کہا گیا، مطففین وہ لوگ ہیں جو ناپ تول میں دھوکہ کرتے ہیں خریدار کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

سورۃ المطففین کا سورہ الانفطار کے ساتھ ربط و مناسبت:

الف- سورہ انفطار کی سب سے آخری آیت " ۱۹ " قیامت کے بارے میں ہے، اور سورہ مطففین بھی آغاز میں مہنگے دام بیچنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے، جو لوگوں کا مال کم قیمت پر خریدتے ہیں اور اپنا مال مہنگے داموں بیچتے ہیں۔

ب - دونوں سورتیں قیامت کے دن کی حالت پر بحث کرتی ہیں۔

ج- سورہ انفطار کہتی ہے: **وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝۱۱** اور سورہ مطففین کہتی ہے: **كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝۹**

د- دو نوں سورتوں میں لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے :

1 - نیک لوگ

2 - برے لوگ

سورۃ المطففین کی آیات، کلمات اور حروف کی تعداد:

اس سورت کا نام المطففین (چھپ چھپا کر کمی کرنے والے) ہے، جو کہ اس سورت کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے، اس سورت میں ایک (1) رکوع، سات سو اسی (780) حروف، اور ایک سو انہتر الفاظ (169)، چھتیس آیتیں (36) اور ایک سو اٹھاون (158) نقطے ہیں۔

(یہ بات ذکر کرنا لازم ہے کہ علماء کے اقوال سورتوں کے حروف کی تعداد گننے میں مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کیلئے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)۔

مفسرین کے درمیان "مطففین" کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک راجح قول یہی ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے۔

(وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ) خرید و فروخت میں خیانت کرنا ان بری خصلتوں میں سے ہے جس کے مرتکب کو رب نے سرزنش کی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اسے نہ چھوڑے تو اس کا انجام دردناک عذاب ہوگا اور کہا کہ یہ بہت ہی بری عادت ہے۔

پروردگار نے اپنے رسول کو اس کام کے مرتکبین کی طرف بھیجا تاکہ ان کو ایمان کی دعوت دے، اور اس بری عادت سے ان کو روکے، اسی طرح ان کو تنبیہ کرے کہ عدم ترک ان کی ہلاکت کا سبب بنے گا۔

قرآن عظیم کہتا ہے:

- 1 - خرابی ہے گھٹانے والوں کے لیے۔
- 2 - وہ لوگ کہ جب ماپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں۔
- 3 - اور جب ماپ کر یا تول کر ان کو دیں تو گھٹا دیں۔
- 4 - کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ (ان کو اٹھنا ہے) وہ اٹھائے جائیں گے۔
- 5 - اس بڑے دن میں۔
- 6 - جس دن کھڑے رہیں گے لوگ راہ دیکھتے جہاں کے مالک کی۔

سبب نزول:

اس سورت کے سبب نزول کے بارے میں نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: (لما قدم النبي صلى الله عليه وسلم المدينة كانوا من أخبث الناس كيلاً، فأنزل الله تعالى: (ويل للمطففين) فحسنوا الكيل بعد ذلك)۔

ترجمہ: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اس وقت مدینہ کے لوگ ناپ تول کے اعتبار سے سب سے زیادہ برے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ" اس کے بعد انہوں نے پیمائش میں انصاف قائم کیا، قرطبی اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ: کچھ لوگوں نے کہا، یہ

آیات ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئیں جو ابو جُہینہ کے نام سے معروف تھا، اس کے دو پیمانے تھے، وہ ایک پیمانہ سے بیچتا اور دوسرے سے خریدتا۔

سورت کا مجموعی خلاصہ:

مفسرین کی ایک بڑی تعداد نے اپنی تفاسیر میں لکھا ہے کہ "تطفیف"، "وزن" اور "کیل" جیسے الفاظ معنوی وزن کے لیے بھی ہیں اور اشخاص کی قدر و منزلت کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔

اور کہتے ہیں کہ پوری سورت میں "فجار" کی بحث میں جو موضوعات ہیں وہ ان کی برائی اور خطرناک انجام، اور "ابرار" کی بحث میں ان کی اچھائی بہترین اور خوبصورت ترین انجام کا ذکر ہے۔

اسلام کی نظر میں انسان کی عزت اور وقار پر حملہ سب سے بڑا حملہ ہے، اس لیے کہ انسان کے لیے سب سے معزز ترین سرمایہ انسان کی عزت اور شرف ہے۔

اس لحاظ سے "مطفف" وہ شخص ہے جو کسی شریف انسان کی توہین و تحقیر کرے، اور اسے

کمتر اور خود کو برتر سمجھے، فیصلہ کرتے ہوئے اس کی ذاتی اچھائی اور اس کی معاشرتی حیثیت اور مقام کو ٹھیس پہنچا کر حد سے تجاوز کرے یا پھر اس کی حیثیت و اہمیت اور قدر و قیمت کو کم ظاہر کرے، جب وہ خود کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو اپنی حیثیت اور سماجی مرتبے کی بنیاد پر اپنے لیے ان سے فیصلہ چاہتا ہے، اور حد سے زیادہ اپنی تعریف کی توقع رکھتا ہے، کہ اس کی حیثیت اور وقار کو پورا دکھائیں اور اس کی شخصیت میں کوئی عیب، نقص اور کمی و بیشی کی نشاندہی نہ کریں، اور اسے ہر قسم کی کمی سے پاک اور اونچا شمار کریں، یہی بدترین اور سب سے بُرا گناہ ہے جو اس سورت میں بیان ہوا ہے۔

سورة المطففين

بسم الله الرحمن الرحيم

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝۱ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝۲ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝۳
أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝۵ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۶ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ
الْفُجَارِ لَفِي سِجِّينٍ ۝۷ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ ۝۸ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝۹ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝۱۰ الَّذِينَ
يُكَذِّبُونَ بَيُّوتَ الدِّينِ ۝۱۱ وَمَا يُكْذِبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝۱۲ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ
الْأَوَّلِينَ ۝۱۳ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۱۴ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
لَّمْ حُجُّوا ۝۱۵ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝۱۶ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝۱۷ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ
الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ۝۱۸ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ ۝۱۹ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝۲۰ يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ۝۲۱ إِنَّ الْأَبْرَارَ
لَفِي نَعِيمٍ ۝۲۲ عَلَى الْأَرَآئِكِ يَنْظُرُونَ ۝۲۳ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝۲۴ يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ
مَّحْكُومٍ ۝۲۵ خِتْمُهُ مِسْكَ ۝۲۶ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝۲۷ وَمِرَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ۝۲۸ عَيْنًا
يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝۲۹ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝۳۰ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ
يَتَغَامَرُونَ ۝۳۱ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝۳۲ وَإِذَا رَآوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝۳۳
وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ۝۳۴ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝۳۵ عَلَى الْأَرَآئِكِ ۝۳۶
يَنْظُرُونَ ۝۳۷ هَلْ تُؤْتَىٰ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝۳۸

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝۱	خرابی ہے گھٹانے والوں کے لیے (۱)
الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝۲	جو لوگوں سے ناپ کر لیں اپنے لیے تو پورا لیں (۲)

اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں (۳)	وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝۳
کیا ان لوگوں کو یقین نہیں ہے کہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے (۴)	أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۝۴
اس بڑے دن کے واسطے (۵)	لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝۵
جس دن کھڑے ہوں گے لوگ راہ دیکھتے جہاں کے مالک کی (۶)	يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۶
ہر گز نہیں، بیشک اعمال نامہ گنہگاروں کا سچین میں ہے (۷)	كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَارِ لَفِي سِجِّينٍ ۝۷
اور تم کیا جانتے ہو سچین کیا چیز ہے ؟ (۸)	وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ ۝۸
ایک دفتر ہے لکھا ہوا (۹)	كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝۹
اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے (۱۰)	وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝۱۰
جو جزاء اور سزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں (۱۱)	الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝۱۱
اور اس کو جھٹلاتا وہی ہے جو حد سے گذرا ہوا گنہگار ہے (۱۲)	وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝۱۲
جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں (۱۳)	إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۱۳
ہرگز نہیں، بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے (۱۴)	كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۱۴
ہرگز نہیں وہ اپنے رب کے (دیدار) سے اس دن روک دئیے جائیں گے (۱۵)	كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّحَجُوبُونَ ۝۱۵
پھر بلاشبہ وہ جہنم میں داخل کر دئیے جائیں گے (۱۶)	ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝۱۶
پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے (۱۷)	ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝۱۷

ہر گز نہیں بیشک نیک لوگوں کے اعمال نامے (علیین) میں ہیں (۱۸)	كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْإِبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ۝۱۸
اور تمہیں کیا معلوم علیین کیا چیز ہے (۱۹)	وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ ۝۱۹
ایک دفتر ہے لکھا ہوا (۲۰)	كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝۲۰
جس کے پاس (فرشتے) حاضر رہتے ہیں (۲۱)	يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ۝۲۱
بیشک نیک لوگ یقیناً نعمتوں میں ہوں گے (۲۲)	إِنَّ الْإِبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝۲۲
تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے (۲۳)	عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ۝۲۳
تم ان کے چہروں سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے (۲۴)	تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝۲۴
ان کو خالص شراب سر بمہر (خُذَام کے ذریعے) پلائی جائے گی (۲۵)	يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ۝۲۵
جس کی مہر مشک کی ہوگی، تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہیے کہ اسی میں رعبت کریں (۲۶)	خِتْمُهُ مِسْكٌ ۝۲۶ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝۲۶
اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی (۲۷)	وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ۝۲۷
وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے (۲۸)	عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝۲۸
جو مجرم تھے، وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے (۲۹)	إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝۲۹
اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو آپس میں آنکھوں کے اشارے کرتے تھے (۳۰)	وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝۳۰
اور جب اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جاتے تھے تو دل لگی کرتے ہوئے جاتے تھے (۳۱)	وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝۳۱

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝۳۲	اور جب ان مؤمنین کو دیکھتے تو کہتے یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں (۳۲)
وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ۝۳۳	حالانکہ ان کو ان مسلمانوں پر نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا (۳۳)
فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝۳۴	پس آج ایمان والے ان کافروں پر ہنسیں گے (۳۴)
عَلَى الْأَرْآئِكِ ۝۳۵ يَنْظُرُونَ ۝۳۵	تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے (۳۵)
هَلْ تُؤْتِبُ الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝۳۶	کیا کافروں کو اس کا بدلہ دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟ (۳۶)

سورة المطففين کی تفسیر

آیات مبارکہ "1 تا 6" ناپ تول میں کمی کر کے بیچنے والوں کی سرزنش اور تنبیہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے :

یہ بات قابل غور ہے کہ: پہلی آیت کے متعلق ایک انصاری صحابی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ناپ تول کے لحاظ سے سب سے بُرے تھے، یہاں تک کہ ہم میں سے ہر ایک آدمی کے دو پیمانے ہوتے تھے، ایک فروخت کے واسطے اور دوسرا خریدنے کے لیے، لیکن جب یہ مبارک سورت نازل ہوئی، تو پھر ہم سب سے اچھا ناپ تول کرنے والے بن گئے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝۱	خرابی ہے گھٹانے والوں کے لیے (۱)

(وَيْلٌ) عذاب اور ہلاکت و بربادی ہو ان لوگوں کے واسطے جو اپنا پیمانہ رکھتے ہیں جس سے اپنے لیے تول کر پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن لوگوں کو دینے کے لیے اس سے کم والا پیمانہ اور ناپ استعمال کرتے ہیں۔

"مطففين" وہ لوگ ہیں جو ناپ، ماپ اور تول میں مکر اور دھوکے سے کام لیتے ہیں، وہ تاجر جو بازار پر غلبہ رکھتے تھے اور اپنے لیے خاص بٹہ، پیمانہ اور وزن رکھتے تھے اور ہر جگہ لے جاتے تھے۔

"تطفیف" طفیف سے لیا گیا ہے یعنی "تھوڑی چیز"، اور طِف سے یعنی "کسی چیز کا کنارہ" تو پھر "تطفیف" کا معنی ہے: پیمانہ اور ترازو کے ساتھ تھوڑی سی چیز کا کم کرنا، اور "مطفف" وہ شخص ہے جو خریدار کے حق میں سے کم کرنا چاہے وہ اجناس میں سے ہو جو تولی جاتی ہے یا ناپنے والی چیز ہو۔

اللّٰزِیْنَ اِذَا اُكْتَالُوْا عَلٰی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝۲	جو لوگوں سے ناپ کر لیں اپنے لیے تو پورا لیں (۲)

"یَسْتَوْفُوْنَ" بڑھا چڑھا کر اندازے سے زیادہ حاصل کرتے ہیں۔

وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ۝۳	اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں (۳)

یعنی: جس وقت دوسروں کو کوئی چیز بیچتے ہیں، تو اس کے وزن میں کمی کر دیتے ہیں، اس طرح دوسرے فریق کو نقصان پہنچا تے ہیں، لہذا آیت مبارکہ میں جس دھوکہ دہی اور خیانت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ درحقیقت پیمائش اور ناپ تول یا وزن میں دھوکہ دہی ہے۔

کیونکہ اس وقت لوگ ان دونوں طریقوں کا بہت زیادہ استعمال کرتے تھے، لیکن بعض علما کہتے ہیں کہ: یہ دھوکہ اور خیانت صرف کاروباری معاملات تک محدود نہیں تھی، بلکہ لوگوں کے تمام حقوق، یہاں تک کہ عبادات میں بھی شامل تھی۔

امام قرطبی کہتے ہیں کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ: آیت میں مذکور دھوکہ اور خیانت پیمائش، ترازو اور وضو، نماز حتیٰ کہ گفتگو میں بھی ہوتی ہے، سالم بن ابی جعد سے مروی ہے کہ نماز کا بھی معیار ہے، جو اس کے حقوق پورے کرے، وہ اس کے حق میں ہے، اور جس نے کمی کی تو تم جان لو اللہ تعالیٰ نے اُس کے بارے میں ارشاد فرمایا: "وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ" بعض علما نے کہا ہے کہ: ہر وہ چیز جس کو لیتے وقت وہ شخص اپنے حق سے زیادہ لے، اور حق دار کو اس کے حق سے کم دے تو وہ خیانت اور دھوکہ میں شمار ہوگا۔

قرآن کریم میں کمی کر کے بیچنے سے متعلق حکم:

(وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ) "خرابی ہو گھٹانے والوں کی" تباہی و بربادی ہو ان لوگوں کے لیے جو ناپ تول کرتے وقت لوگوں کے حق کو کم کر کے دیتے ہیں، قرآن کریم کی بہت ساری آیات میں ناپ تول میں کمی کرنے کی مذمت پر واضح اور بار بار متنبہ کیا گیا ہے، اور بہت سختی سے اس عمل کی مذمت کی گئی ہے، اس سے بڑھ کر قرآن کریم نے ناپ تول میں کمی کرنے کو "مَذِين" کے شہر کے ویرانی کا سبب اور اس میں بسنے والوں کی تباہی کی وجہ بتایا ہے۔

اس موضوع کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ قرآن کی (116) سورتوں میں سے چھ (6) سورتوں میں اس کم فروشی کی مذمت کی گئی ہے۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر سورہ "مطففین" کو "کم فروشوں" سے موسوم کر دیا گیا، اس سورت کو ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے نام سے موسوم کرنا بنی نوع انسان میں اس مسئلے کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

جب اس مبارک سورت کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے، "وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ" خرابی ہو گھٹانے والوں کے لیے (لوگوں کے حقوق میں) یا دوسرے لفظوں میں ہلاکت ہو ناپ تول میں کمی کر کے بیچنے والوں کے لیے، یہ مضمون ناپ تول میں کمی اور حق تلفی جیسے سنگین جرم کو ظاہر کرتا ہے، یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کم فروشی کرنا عقلی اور شرعی نقطہ نظر سے حرام اور غیر اخلاقی ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل کم فروشی کے نت نئے اور مختلف طریقے ایجاد ہو چکے ہیں، ان اشیاء کی کم فروشی جو وزن کی بنیاد پر فروخت کی جاتی ہیں، یہ طریقہ فروخت کی قدیم ترین اقسام میں سے ایک ہے۔

"تطفیف" کہ جس سے "مطففین" لیا گیا ہے، لغت میں "تھوڑے اور کم" کے معنی میں ہے، اور "مطفف" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو کسی چیز میں کمی کرے یعنی اس کی اصل مقدار سے کم کرے، اب وہ چیز ممکن ہے ان اجناس میں سے ہو جسے وہ کسی دوسرے کو بیچتا ہے، یا کوئی کام ہو جسے کسی اور کے لیے انجام دیتا ہے، اور کسی چیز کی قیمت بھی ہوسکتی

ہے جسے وہ ادا کرتا ہے، یا کسی کام کی اجرت دیتا ہے، حقیقت میں تطفیف اور کمی کرنا صرف لین دین کے معاملے میں نہیں، بلکہ ہر معاملے میں ممکن ہے۔

قرآن کریم نے لفظ "مطففین" کا مطلب فصیح انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ہر قسم کے کام میں کمی اور کم فروشی اس میں شامل ہے۔

ہمارے رب عظیم سورۃ اسراء میں فرماتے ہیں : (وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزَنُوا بِالْقِسْطِ أَسْوَاسٍ الْمُسْتَقِيمِ ۝ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝۳۵) ترجمہ: "اور جب (کوئی چیز) ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو اور (جب تول کر دو تو) ترازو سیدھا رکھ کر تولا کرو یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔"

اس سورۃ مبارکہ میں پیمائش اور صحیح وزن کرنے کے بیان سے قبل : زنا، قتلِ نفس، اور یتیم کے مال میں خیانت کا ذکر ہوا ہے، اور کم فروشی کا ذکر ان گناہوں کی قطار میں ہوا ہے۔

اسی طرح سورۃ رحمان میں آیا ہے : (وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝۸) ترجمہ: "اور اسی نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو قائم کیا"، " (أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝۸) ترجمہ: "کہ ترازو (سے تولنے) میں حد سے تجاوز نہ کرنا، (وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝۹) ترجمہ: "اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔"

اس طرح سورۃ انعام میں ہے : (وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ) **ترجمہ:** "اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کیا کرو۔"

اس سورۃ مبارکہ میں رب تعالیٰ نے جن چیزوں کا اپنے بندوں کو حکم دیا کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ان کا ذکر فرمایا ہے : شرک سے بچنا ہے، والدین کے ساتھ احسان کرنا ہے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا فقر اور افلاس کے ڈر سے، ظاہری اور باطنی گناہوں سے بچنا، خون ناحق اور یتیم کے مال میں خیانت اور دخل اندازی سے پرہیز کرنا، اور ناپ تول کی درستی اور کم فروشی سے اجتناب کرنا۔

ہمارے پروردگار سورۃ اعراف میں مدین شہر کے رہنے والے شعیبؑ کی قوم سے فرماتے ہیں: پیمائش اور وزن پورا اور مکمل کر کے دیا کرو، اور لوگوں کے مال میں نقصان نہ کرو، اور اصلاح شدہ زمین پر فساد نہ پھیلاؤ، اور یہ کام تم لوگوں کے لیے بہتر ہے اگر ایمان رکھتے ہو۔

اسی طرح سورۃ ہود میں مَدِّیْنَ کے واقعہ اور حضرت شعیبؑ کے ساتھ ان کے نامناسب سلوک اور قوم کے ہولناک انجام کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے شعیبؑ کی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے کی وجہ سے نیست و نابود کیا، اس کے بعد شعیبؑ نے ان کو بار بار نصیحت کی، "وَلْيَقُومُوا الْكِيَالَ وَالْإِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۸۵" (ہود: 85) ترجمہ: "اور اے میری قوم! ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں خرابی کرتے نہ پھرو۔"

زین الاسلام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک بن طلحہ بن محمد قشیری کہتے ہیں:

لفظ "مطفف" میں وزن اور پیمانہ کم کرنا، کپڑوں یا دیگر کسی چیز کا عیب ظاہر نہ کرنا یا چھپانا، اپنے لیے انصاف کا مطالبہ کرنا، اور دوسروں کے حق میں انصاف چھوڑ دینا، یہ سب شامل ہیں: لہذا وہ شخص جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے مگر اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند نہ کرے وہ عادل اور منصف نہیں ہے، اور ہر وہ شخص جو اپنے عیب کو نہیں دیکھتا اور دوسروں کے عیوب کی تلاش میں ہوتا ہے وہی "مطفف" ہے، اور وہ شخص جو اپنا حق لوگوں سے وصول کرتا ہے، اور لوگوں کو ان کا حق نہیں دیتا وہ بھی اس میں شامل ہے، لہذا قابل عزت آدمی وہ ہے جو لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (خَمْسٌ يَخْمِسُ، مَا نَقَضَ قَوْمُ الْعَهْدِ إِلَّا سُلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوُّهُمْ وَمَا حَكَمُوا بِغَيْرِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَّا فَشَا فِيهِمْ الْفَقْرُ وَلَا ظَهَرَتْ فِيهِمْ الْفَاحِشَةُ إِلَّا فَشَا فِيهِمُ الْمَوْتُ وَلَا طَقَفُوا الْكِيَالَ إِلَّا مُنِعُوا النَّبَاتَ وَأَخَذُوا بِالسِّنِينَ وَلَا مَنَعُوا الزَّكَاةَ إِلَّا حُبِسَ عَنْهُمْ الْمَطَرُ) (ذکر القرطبی وقال اخرجہ البزار بمعناہ مالک بن انس ایضاً من حدیث ابن عمر)۔

یعنی پانچ گناہوں کی سزا پانچ قسم کی ہے :

- 1 - جو لوگ عہد شکنی کریں، اللہ تعالیٰ ان پر دشمن کو مسلط کر دیتا ہے۔
- 2 - جو قوم رب کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قانون پر عمل پیرا ہوں ان میں غربت اور افلاس عام ہو جاتا ہے۔
- 3 - جس قوم میں زنا اور بے حیائی عام ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر طاعون اور دوسرے امراض مسلط کر دیتا ہے۔
- 4 - جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں، (اللہ تعالیٰ ان کو قحط میں مبتلا کر دیتا ہے)۔

جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ان سے بارش روک دیتا ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا : مال غنیمت میں چوری جس قوم میں پیدا ہوئی، اللہ نے ان کے دلوں میں دشمن کا خوف ڈال دیا، اور سود جس قوم میں پھیلا اللہ نے ان میں موت زیادہ کر دی، اور جس قوم نے ناپ تول میں کمی کی، اللہ نے ان سے رزق قطع کر دیا، اور جس قوم نے خلاف حق فیصلے کئے ان کے اندر خونریزی پھیل گئی اور جس قوم نے عہد توڑا، اللہ نے ان پر دشمن مسلط کر دیا، (رَوَاهُ مَالِكٌ مَوْقُوفًا - مظہری)

عبادت میں تطفیف :

مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز میں رکوع، سجدہ اور نماز کے دیگر ارکان ایسے ادا نہیں کر رہا جیسا ان کے ادا کرنے کا حق ہے، اور بہت تیزی سے نماز مکمل کی، فرمایا : "لَقَدْ تَفَقَّتَ" یعنی : تم حقوق اللہ میں تطفیف کے مرتکب ہوئے ہو۔

امام مالکؒ عمر فاروقؓ کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ : "لِكُلِّ شَيْءٍ وَفَاءٌ وَتَطْفِيفٌ" یعنی حق کا پورا ادا کرنا یا گھٹانا ہر چیز میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ نماز میں، وضو اور طہارت میں بھی، خدا اور انسانوں کے حقوق میں بھی اور عبادت میں کوتاہی کرنے والا بھی تطفیف کا مجرم ہے، نیز جو

بندوں کے مقررہ حقوق میں کوتاہی کرتا ہے وہ بھی "تطفیف" کے حکم میں ہوگا "تنویر الأذهان" کے مصنف: (وَأَقِيمُوا الزُّنْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْبَيْزَانَ ۝۹) (رحمن: 9) کے تحت لکھتے ہیں: ایک ملازم، ایک مزدور جو جان بوجھ کر اپنے کام میں غفلت برتتا ہے وہ اس آیت کریمہ کی وعید کی زد میں آئے گا اور مطففین میں شمار ہوگا۔

موت کے بعد کی زندگی پر یقین کا فقدان :

آلَا يَظُنُّ أُولَئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۝۴	کیا ان لوگوں کو یقین نہیں ہے کہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے (۴)

ہمارے رب عظیم فرماتے ہیں : کیا وہ لوگ جو عمل تطفیف کے مرتکب ہوتے ہیں کیا یہ ان لوگوں میں سے ہیں: جن کو کوئی فکر نہیں ہے کہ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے؟ اور اُس وقت پھر جس عمل کے مرتکب ہوئے ہیں ان سے پوچھا جائے گا اس کے متعلق، انہوں نے اس معاملے کے بارے میں غور و فکر اور تدبر نہیں کیا تاکہ اس معاملے میں یقین تک پہنچ کر وہ عمل جس کے نتائج کا خوف تھا چھوڑ دیتے، پس "آلَا يَظُنُّ" ایسا سوال ہے جو سرزنش کرنے، تنقید کرنے اور ان کی حالت پر تعجب کرنے کے لیے ہے، یہاں ظن سے یقین مراد لیا گیا ہے، تاکہ اس بات پر اشارہ ہو کہ اگر کسی کو قیامت برپا ہونے کا گمان بھی ہو وہ ایسے بُرے کاموں کی جسارت نہیں کرسکتا، اور جس کو یقین ہو تو وہ یقیناً مرتکب نہیں ہوگا۔

لَيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝۵	اس بڑے دن کے واسطے (۵)

عظیم دن وہ ہے جس دن قیامت ہوگی، اور اس بڑے دن میں بڑے بڑے واقعات رونما ہوں گے، جن میں سے قیامت کا دن اور حساب و کتاب اور جنتیوں کا جنت میں اور دوزخیوں کا دوزخ میں جانا ہے۔

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۶	جس دن کھڑے ہوں گے لوگ راہ دیکھتے جہاں کے مالک کی (۶)

یہ عظیم دن وہ ہے جس میں لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے، وہ لوگ جو روزِ جزا اور حشر و قیامت اور سوال و جواب کے دن پر ایمان نہیں رکھتے وہ سب ایک قسم کے بیمار ہیں، یہ بیماری لوگوں میں اس وقت

سرايت کرتی ہے جب وہ موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے، اس قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو یقین نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے رو برو کھڑے ہوں گے، اور محاسبہ الہی کا سامنا کریں گے۔

جنت والے کون ہیں اور دوزخ والے کون ہیں :

اس کے متعلق کے کون اہل جنت ہیں اور کون اہل جہنم کہلانے کے مستحق ہیں تو : " ہم قطعی اور یقینی طور پر کسی مسلمان کے جنت یا جہنم میں ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے، الا یہ کہ جن کے جنتی یا دوزخی ہونے کی گواہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے دی ہو۔"

یقیناً یہ قاعدہ مومنوں اور مسلمانوں پر لاگو ہوتا ہے، البتہ جو کفر کی حالت میں اس دنیا سے گیا تو ہم اس کے جہنمی ہونے کا حکم اور گواہی دے دیتے ہیں، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے کہ کفار اور منکرین اس دن جہنم میں ہوں گے، "وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ" (آل عمران: 131) "بجو اس آگ سے جو تیار ہوئی ہے کافروں کے واسطے"

"وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ" (وہو فی الآخرۃ من الخسیرین ۸۵) (آل عمران: 85) "اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہر گز قبول

نہیں کیا جائیگا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھا نے والوں میں سے ہوگا"

عشرہ مبشرہ سے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ : ابوبکرؓ فی الجنة وعمرؓ فی الجنة وعثمانؓ فی الجنة وعلیؓ فی الجنة وطلحہؓ فی الجنة والزبیرؓ فی الجنة وعبد الرحمنؓ بن عوفؓ فی الجنة وسعدؓ فی الجنة وسعیدؓ فی الجنة وأبو عبیدہؓ بن الجراحؓ فی الجنة. (امام أحمد، أبوداود، ترمذی 3680، و ابن ماجہ وغیرہ).

ترجمہ: ابوبکر جنتی ہے، عمر جنتی ہے، عثمان جنتی ہے، علی جنتی ہے، طلحہ جنتی ہے، زبیر جنتی ہے، عبدالرحمن جنتی ہے، سعید بن زید جنتی ہے، ابو عبیدہ بن جراح جنتی ہے (رضی اللہ عنہم أجمعین)۔

اسی طرح ان مسلمانوں کے متعلق جو نیک اور تقویٰ والے ہیں اور شرک بدعات و خرافات سے دور ہیں، تو ہم یقینی طور پر ان کے جنتی ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے، لیکن ہمیں حسن ظن اور امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ان کو بہشت میں داخل کرے گا، جیسا کہ فرماتا ہے: "وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۝ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا ۝ قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۝ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۝ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۝ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۲۵" (سورہ بقرہ: 25) ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لئے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

جب انہیں ان میں سے کسی قسم کا پہل کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دئے جائیں گے، اور وہاں ان کے لئے پاک بیویاں ہوں گی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔"

وہ مسلمان جو نافرمان اور گنہگار ہیں بشرطیکہ موحد ہوں، یقینی طور پر ہم ان کے جنتی یا جہنمی

ہونے کا حکم جاری نہیں کر سکتے، بلکہ کہیں گے: اگر اللہ نے چاہا تو ان کو بخش دے گا، اور جنت میں لے جائے گا اور اگر خدا نے چاہا تو ان کے گناہوں کے مقدار کے مطابق انہیں سزا دے گا پھر جہنم سے باہر نکال لے گا، اور بالآخر کوئی مؤمن موحد دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا،

جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں: (إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۝ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ۝۴۸) (سورہ نساء: 48) ترجمہ: "خدا نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے، اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا۔"

اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: (يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيْمَانٍ) (بخاري (7510)، مسلم (193) ترجمہ: "جہنم سے وہ آدمی نکل آئے گا جس کے دل میں زرہ برابر ایمان ہوگا"

یہ وہی صحیح عقیدہ ہے جو کتاب و سنت کے مجموعے سے مستنبط ہوتا ہے، اگر کوئی مسلمان آدمی فوت ہو جائے اور چند لوگ اس کی تعریف و خوبیاں بیان کریں اور حقیقت میں بھی وہ نیک اور صالح آدمی ہو، تو اس صورت میں بھی ہم یقینی اور قطع طور پر اس کے جنتی ہونے کا حکم جاری نہیں کر سکتے، لیکن امید اور حسن ظن رکھتے ہیں کہ انشاء اللہ خدا اسے اپنی جنت میں داخل کرے گا، البتہ بعض علماء نے کہا ہے کہ: بعض لوگ جن کے متعلق مؤمنوں نے خیر کی گواہی دی ہے، ان کے لیے جنت کی گواہی دی جاسکتی ہے۔

امام ابی العز الحنفی رحمہ اللہ "شرح عقیدہ طحاویہ" میں لکھتے ہیں کہ: سلف صالحین کے نزدیک جنتی ہونے کی گواہی پر تین اقوال ہیں:

اول: پیغمبروں کے علاوہ کسی کے لیے بھی جنت کی گواہی نہیں دی جاسکتی، یہ قول محمد بن حنفیہ اور اوزاعی سے نقل کیا گیا ہے۔

دوم: یہ ہے کہ ہر وہ مومن جس کے بارے میں نص وارد ہوئی ہو اس کے جنتی ہونے کی گواہی دی جاسکتی ہے، یہ قول اکثر علماء اور محدثین کا ہے۔

سوم: وہ افراد جن کے حق میں مومنوں اور مسلمانوں نے نیک عمل ہونے کی گواہی دی ہو ان کے لیے جنت کی گواہی دی جاسکتی ہے۔

جس طرح "صحیحین" میں انسؓ سے روایت ہے:

مَرُّوْا بِجَزَاةٍ فَأَثْنُوْا عَلَيْهَا خَيْرًا، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَجَبَتْ". ثُمَّ مَرُّوْا بِأُخْرَى فَأَثْنُوْا عَلَيْهَا شَرًّا، فَقَالَ: "وَجَبَتْ". فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: مَا وَجَبَتْ؟ قَالَ: هَذَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ خَيْرًا فَوَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ. وَهَذَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ شَرًّا فَوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ، أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ. (بخاري: 1367)

ترجمہ: "لوگ ایک جنازے پر سے گزرے تو لوگوں نے اس کی تعریف کی (کیا اچھا آدمی تھا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: واجب

ہوگئی، پھر ایک جنازے پر سے گزرے تو لوگوں نے اس کی برائی کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واجب ہوگئی حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا چیز واجب ہوگئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلے شخص کی تم لوگوں نے تعریف کی تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی، اور دوسرے کی تم لوگوں نے بُرائی بیان کی تو اس کے لیے دوزخ واجب ہوگئی، تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

اسی طرح عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَيُّمَا مُسْلِمٍ شَهِدَ لَهُ أَرْبَعَةٌ بِخَيْرٍ، أَدْخَلَهُ اللَّهُ الْجَنَّةَ". فَقُلْنَا وَثَلَاثَةٌ؟ قَالَ: "وَوَثَلَاثَةٌ". فَقُلْنَا: وَاثْنَانِ؟ قَالَ: "وَاثْنَانِ". ثُمَّ لَمْ نَسْأَلْهُ عَنِ الْوَاحِدِ. (بخاری: 1368)

ترجمہ: "جس مسلمان کے متعلق چار آدمی بھلائی کی گواہی دے دیں، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا"، ہم نے عرض کی: اور تین لوگ (جس کے حق میں گواہی دیں) تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور تین آدمی بھی" ہم نے عرض کی: اور دو لوگ گواہی دیں تو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور دو لوگ بھی" پھر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص کے بارے میں نہیں پوچھا۔

محترم قارئین:

آیات مبارکہ "7 تا 17" میں کافروں کے اعمال نامے اور بد کاروں کے حالات کے بارے میں بحث کی گئی ہے:

ہر گز نہیں، بیشک اعمال نامہ گنہگاروں کا سجین میں ہے (۷)	كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ، ۝

"کلا" ہر گز نہیں، معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا کم تولنے والے سوچتے ہیں، "کلا" اس انتظار اور توقع کا جواب ہے جو پوری نہیں ہوئی۔
"فُجَّار" کفار، منافقین، فاسقین، "سِجِّین" تنگ جگہ، ایک خاص مقام ہے جہنم میں۔

ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ: "سِجِّین" لفظ سجن سے ہے جس کا معنی "تنگی" (قید خانہ) ہے، کافروں کے جانے کی جگہ اسفل سافلین ہے، خدا تعالیٰ فرماتے ہیں

کہ ان کے اعمال نامے کو حتمی شکل دے کر سر بہ مہر کر دیا گیا ہے، کوئی بھی اس میں مداخلت اور تبدیلی نہیں کر سکتا، اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کم، (مختصر: 614/3)

"سَجِّين" ایک خاص کتاب یا بد کاروں اور گنہگاروں کے اعمال نامے کا مجموعی دفتر اور رجسٹر ہے، "سَجِّين" مبالغہ کا صیغہ ہے، "سَجْن" قید خانہ کے معنی میں ہے، لہذا "سَجِّين" بہت تنگ اور سخت قید خانہ (فرہنگ لغات ڈاکٹر قریب) اس نام سے اس کی تعبیر اس وجہ سے ہو سکتی ہے کہ اس دیوان کے مندرجات اس کے مالکان کو جہنم میں قید کرنے کا سبب بنیں گے، گویا کہ اس کا اصل "سَجْجُون" ہے اٹیوپی اور قدیم حبشی زبان میں مٹی اور کیچڑ کو کہتے ہیں، اس صورت میں اس کا معنی تنزل اور پستی کا بھی ہے (جزء عمّ شیخ محمد عبدہ)۔

"موت کے بعد انسان کا اعمال نامہ فرشتوں کے ذریعے آسمان پر لیجا کر اس پر مہر لگائی جاتی ہے" نیک لوگوں کا اعمال نامہ عَلَّیْن پر اور بُرے اور بدکار لوگوں کا اعمال نامہ نیچے کی طرف سَجِّين میں ڈالا جاتا ہے، جس کا اعمال نامہ سَجِّين میں درج کیا گیا ہو، اس کو معلوم ہونا چاہئیے کہ اس کے لیے سختیوں اور مصائب کا طویل قید خانہ زمین کے ساتویں طبقے میں نیچے واقع ہے۔

وَمَا أَذْرٰكَ مَا سَجِّينٌ ﴿٨﴾	اور تم کیا جانتے ہو سَجِّين کیا چیز ہے ؟ (۸)

یعنی تم اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ سَجِّين کیسا ہے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴿٩﴾	ایک دفتر ہے لکھا ہوا (۹)

یہاں کتاب سے مراد عَلَّیْن ہے، "عَلَّیْن" ایسی کتاب ہے جس میں جنتیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں، یا ایسی کتاب ہے جس میں نشان لگے ہوئے ہیں، اسی طرح عَلَّیْن جنت اور اس کے بلندیوں کا نام بھی ہے۔

"مَّرْقُومٌ"

1 - اس میں کمی بیشی نہیں ہے۔

- 2 - یہ واضح اور مخصوص ہے۔
 3 - کفار کے اعمال نامے والی کتاب اس میں خاص علامت ہے اور ان کے نام اس میں لکھے ہوئے ہیں۔
 4 - مہر شدہ ہے، مرنے کے بعد مہر جو تالے کی طرح ہے انسان کے اعمال نامے پر لگادی جائے گی۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٠﴾	اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے (۱۰)

وادی ویل میں قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے لیے خاص ہولناک عذاب ہے، جو اللہ تعالیٰ کو، اور اللہ کے دیدار کو، اور اللہ کی آیات اور حساب و کتاب کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔

"مُكَذِّبِينَ" وہ لوگ ہیں جن کو دین کی دعوت دی گئی لیکن انہوں نے قبول نہیں کی، یعنی عذاب اور ہلاکت ان کے لیے جن پر حجت مکمل ہوئی ہے، اور جس دین کی پہچان کرائی گئی ہے اور انہیں دعوت دی گئی، لیکن اسے انہوں نے قبول نہیں کیا اور دین کو جھٹلایا۔

الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بَيُّومٍ الدِّينِ ﴿١١﴾	جو جزاء اور سزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں (۱۱)

اور مرنے کے بعد جی اٹھنے سے انکار کرتے ہیں یعنی جنت اور دوزخ اور (اللہ کے حضور) خدائے جبار کے حضور کھڑے ہونے پر یقین نہیں رکھتے۔
 "بَيُّومٍ الدِّينِ" قیامت کا دن جو جزاء و سزا کا دن ہے۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾	اور اس کو جھٹلاتا وہی ہے جو حد سے گذرا ہوا گنہگار ہے (۱۲)

"مُعْتَدٍ" وہ متجاوز جو شرعی اور عقلی قانون کی حدود سے نکلنے والا ہے۔
 "أَثِيمٍ" بہت زیادہ گنہگار، یعنی: سوائے اس ظالم و بدکار کے جو حد سے زیادہ گناہ میں ڈوبا ہوا ہو اور گناہ کے ذرائع کو اختیار کرتا ہو، کوئی دوسرا قیامت کے دن کا انکار نہیں کرتا۔

ایسے افراد و اشخاص قیامت کے دن کو جھٹلاتے ہیں جن کی دو خصوصیت ہوں :

1 - معتد یعنی : حد سے تجاوز کرنے والا ہو، کیونکہ آخرت پر ایمان انسان کو حدود کے اندر رہنے پر آمادہ کرتا ہے حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتا۔

معتد: وہ آدمی جو حدود اور قیود کو توڑ دیتا ہے، اس بنا پر وہ خود بھی نقصان اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے، وہ لوگ جو حد کے اندر صحیح ماحول میں رہنا نہیں چاہتے وہ دوسروں کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

2 - دوسرے وہ لوگ جو ایسے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ ثواب و انعام تک پہنچنے کا شوق ہی نہیں رکھتے، اور ان کے یہ گناہ ان کو ثواب اور نیکی اور خیر کی طرف جانے سے روکے رکھتے ہیں۔

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝۱۳	جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں (۱۳)

"اَسَاطِیْرُ" جمع "اسطورة" یہ افسانے کے معنی میں ہے جس کا خوبصورت اور دلکش معنی ہو، لیکن اس کی کوئی حقیقت نہ ہو، صرف کہانی سنانے والوں کے ذہن کی اختراع ہو، "اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" یعنی : یہ کہ پہلوں نے افسانے گھڑے ہیں اور (نعوذ باللہ) پیغمبر انہیں دہراتے ہیں، آج کے انسانی معاشرے میں ایسے نام نہاد دانشور موجود ہیں جو قرآن کو پہلوں کے افسانے سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن آج کے معاشرے کے لیے فائدہ مند نہیں ہے، اور یہ قرآن آج کے ماڈرن معاشرے کے مسائل کو حل نہیں کرسکتا، چنانچہ پوری وضاحت کے ساتھ کہنا چاہئیے: جو لوگ قرآن کریم کو افسانے اور کہانیاں کہتے ہیں یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو گناہوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں،

واضح رہے کہ: وحی الہی جو آسمان سے آتی ہے اس کو افسانہ کہنا کفر پر باقی رہنے کا راستہ ہے۔

ہرگز نہیں، بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے (۱۴)	كَلَّا بَلْ ۝ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۱۴

"رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ" (ان کے دلوں پر زنگ پڑ گیا ہے جو حق قبول کرنے سے مانع ہے)

مفسرین لفظ "رَانَ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: رَانَ کا مطلب ہے کہ گناہ پر گناہ جمع ہوتا رہے یہاں تک کہ دل سیاہ ہو جائے اور راہ راست نہ دیکھے۔

ایسا نہیں ہے جیسے کہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ قرآن پہلوں کے افسانے ہیں، بلکہ یہ ان کے بُرے اعمال اور گناہوں کا اثر ہے کہ جس نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے، ایسا زنگ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا ہے کہ جس نے ان پر ہدایت کے راستے بند کر دیے ہیں، اور ان کو حق سمجھنے اور پہچاننے سے روک رکھا ہے۔

احمد، نسائی، ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ سے ایک حدیث روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَذْنَبَ ذَنْبًا نَكَتَتْ فِي قَلْبِهِ نَكْتَةٌ سَوْدَاءٌ، فَإِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صَقَلَ قَلْبُهُ وَإِنْ عَادَ زَادَتْ حَتَّى تَغْلِفَ قَلْبَهُ، فَذَلِكَ الرِّانُ الَّذِي ذَكَرَهُ اللَّهُ سُبْحَانَهُ فِي الْقُرْآنِ)

ترجمہ: بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے، ڈر جاتا ہے اور استغفار کر لیتا ہے تو دل سے گناہ کا نکتہ مٹ جاتا ہے، لیکن اگر گناہ میں اضافہ کرتا ہے تو نکتہ بھی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے وہ گناہ اس کے دل پر چھا جاتے ہیں، یہی ہے وہ "رَانَ" (زنگ) جس کا ذکر اللہ نے قرآن کریم میں کیا ہے، (ترمذی: 3334 و ابن ماجہ: 4244. حکم شیخ البانی: حسن)

ہرگز نہیں وہ اپنے رب کے (دیدار) سے اس دن روک دئیے جائیں گے (۱۵)	كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّهَجُوبُونَ ۝۱۵

یعنی: یہ لوگ جب قیامت کے دن حساب و کتاب کے لیے اللہ کے حضور میں لائے جائیں گے یہ لوگ پردے میں ہونگے، اور انہیں اللہ کے دیدار سے روکا جائے گا، ان کی نظر یں شرم سے جھک جائیں گی، وہ مومنوں کی طرح حقیقی خدا کو نہیں دیکھ سکیں، جیسا کہ وہ لوگ دنیا میں توحید اور یکتا پرستی سے رُکے ہوئے ہیں، اسی طرح رب تعالیٰ کے دیدار سے بھی روک دیے جائیں گے، اور وہ حق تعالیٰ کے کرم و بخشش سے بھی محروم کئے گئے ہیں۔

پھر بلاشبہ وہ جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے (۱۶)	ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝۱۶

ان کے اعمال کا انجام جہنم ہے، ہرگز اس سے نہیں نکلیں گے، اس لیے وہ خدا رحمان کے دیدار سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ آگ میں ہمیشہ رہنے والے بھی ہیں، اور یقیناً جہنم میں داخل کرنا ان کو ذلیل کرنے اور عزت سے محروم کرنے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے (۱۷)	ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝۱۷

یعنی: اس کے بعد جہنم کے اہلکار ان کو ڈانٹ کر، ذلیل کر کے اور سرزنش کے طور پر کہیں گے: یہ وہی عذاب ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے، اب اس کو چھکو اور اس میں ہمیشہ رہو،

قارئین کرام:

بابرکت آیات " 18 تا 28 " مؤمنوں کے اعمال نامہ اور ان کے انجام کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

ہر گز نہیں بیشک نیک لوگوں کے اعمال نامے (علیین) میں ہیں (۱۸)	كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ۝۱۸

"كِتَابُ الْأَبْرَارِ" وہ سب جو نیک لوگوں کے اعمال نامے میں لکھا ہوا ہے،
"الْأَبْرَارِ" برّ یا بارّ کی جمع ہے۔

- 1 - وہ لوگ جن کے نہ صرف ظاہر بلکہ ان کے باطن اعمال بھی پاک ہیں، ایمان دار ہیں، اور اللہ کے اور بندوں کے حقوق پورے کرتے ہیں۔
- 2 - وہ لوگ جو خیر کے کام کثرت سے انجام دیتے ہیں اور زیادہ اطاعت بھی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی سچی اطاعت کے ذریعے واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے بچنے میں رب تعالیٰ کے ساتھ نیک اور اچھا تعلق رکھنے والے ہیں، اس جیسے لوگوں کے اعمال نامے "علیین" میں ہیں۔

"لَفِي عِلِّيِّينَ" ایسے مقام پر جس کا نام علیین ہے، آسمان میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے، ایسے اعمال نامے والے اعلیٰ مرتبے کی جنت میں ہوں گے۔

مفسرین علیین کے متعلق فرماتے ہیں :

- 1 - علیین ایک جگہ ہے سدرۃالمنتہیٰ میں، "تسہیل" میں ہے کہ : لفظ علیین مبالغہ کا معنی دیتا ہے، اور علو سے مشتق ہے، اس لیے جنت میں مقام اور مرتبہ اور درجات کی بلندی کا سبب بنے گا، یا یہ معنی ہے کہ ارفع اور اعلیٰ جگہ ہے، روایت کیا گیا ہے کہ عرش کے نیچے ایک جگہ ہے، (التسہیل ۴/۱۸۵)۔
- 2 - "علیین" ساتویں آسمان میں ایک جگہ ہے۔
- 3 - "علیین" ایک جگہ ہے اللہ کے عرش کے نیچے۔

مرنے کے بعد انسان کے اعمال نامے کی کتاب اوپر لیجائی جاتی ہے اس پر مہر لگا کر یا بند کر کے علیین یا سجّین میں منتقل کیا جاتا ہے اعمال نامہ رکھنے کی جگہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہی جگہ یا مقام اس شخص کا ٹھکانہ ہے۔

روحوں کی آرام گاہ اور منزل :

روحیں اپنے ٹھکانے کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں، یقیناً مؤمنوں کی روحیں ایسی جگہ ہیں جہاں کافروں کی روحیں نہیں ہوتیں، قرآن فرماتا ہے : (كَلَّا إِنَّ

کِتَابُ الْآبَرَارِ لَفِي عَلِيَيْنِ) ایسا نہیں ہے جیسے وہ لوگ قیامت کے بارے میں سوچتے ہیں، بلکہ نیک لوگوں کے اعمال نامے علیین میں ہیں۔

اور فرماتا ہے: (كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سَجِّينِ) (المطففین: 7) ایسا نہیں ہے جیسے وہ

لوگ (قیامت کے بارے میں) سوچتے ہیں، یقیناً کفار کے اعمال نامے "سَجِّينِ" میں ہیں، ان دو آیتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کفار کا ٹھکانہ اور جگہ مؤمنین کے ٹھکانہ اور آرام گاہ کے علاوہ ہے، کہا گیا ہے کہ "سَجِّينِ" زمین میں سب سے نچلے ساتویں طبقے میں ہے، اور "علیین" سب سے اوپر ساتویں آسمان میں ہے، اور کہا گیا کہ کفار کی ارواح برہوت نام کے ایک کنوئیں میں ہیں اور مؤمنین کی ارواح "زمزم" کے کنوئیں میں ہیں، یعنی یہ ارواح وہیں پر اکٹھی ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے ملتی ہیں، صحیح قول یہ ہے کہ ایمان والوں کی ارواح جہاں چاہیں جا سکتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء کی ارواح کے متعلق فرمایا ہے کہ : وہ سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹے میں جنت کے باغوں میں آویزاں ہونگی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شہداء کی ارواح جنت میں ہونگی، رب تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شہداء کی ارواح زندہ ہیں :

(وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ) (آل عمران : 169) **ترجمہ:** "جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے اُن کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے۔"

یہ گمان مت کرو کہ جو اللہ کے راستے میں شہید ہوئے ہیں وہ مُردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، اور اپنے پروردگار کے پاس رزق دئیے جاتے ہیں، ان کی روحوں کی ایک خاص زندگی ہے، اور ان کی روحوں دوسروں کی روحوں کی طرح الگ تھلگ نہیں ہیں، بلکہ ان کی روحوں سبز پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں، جو ان قندیلوں کے گرد گھومتی ہیں جو جنت میں آویزاں ہیں، لیکن دوسرے مؤمنین کی روحوں کہتے ہیں کہ وہ مردہ ہیں اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ بھی پرندوں کے پیٹ میں ہیں۔

اور تمہیں کیا معلوم علیین کیا چیز ہے (۱۹)

وَمَا أَدْرَاكَ مَا عَلِيُّونَ ۝۱۹

اے محمد ! آپ کو کس نے بتایا کہ علیین کیا ہے؟ یہ سوالیہ انداز اس کے مقام اور مرتبے کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

ایک دفتر ہے لکھا ہوا (۲۰)

كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝۲۰

یعنی : علیین ابرار کی کتاب، جس میں جنتیوں کے نام لکھے گئے ہیں، یا ایسی کتاب جو خاص علامت والی ہے، اسی طرح علیین جنت کے نام یا اس سے اونچی جگہوں کے نام ہیں۔

"مَرْقُومٌ"

- 1 - اس کی علامات واضح اور مخصوص ہے۔
- 2 - اس میں کوئی نقصان اور کمی بیشی نہیں ہے۔
- 3 - مہر لگی ہوئی اور بند کر دیا گیا ہے اور اس شخص کا نام اس پر لکھا ہوا ہے۔
- 4 - اسے مالک کے علاوہ کسی نے نہیں دیکھا۔

اس کی تحریر یہ بتا رہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کتاب کے حامل کو جہنم کی آگ سے امن دے گا، اور جنت بھیج دے گا، تاکہ ان کا معاملہ صاف اور واضح ہو جائے۔

جس کے پاس (فرشتے) حاضر رہتے ہیں
(۲۱)

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ۝۲۱

یعنی : مقرب فرشتوں کی ایک بڑی جماعت ابرار و صالحین کے صحائف اعمال کے پاس حاضر ہوگی اور جو کچھ اس کتاب میں ہو گا اس کی گواہی دے گی، یعنی اس بات کی گواہی دے گی کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا میں اپنے قول و فعل سے اللہ کے احکام کی پیروی کی تھی، یہاں مقربین سے مراد فرشتے ہیں، اور اس کے دوسرے معنی جس سے مراد ہے عام انسان اور انبیاء جو کہ گواہ ہیں ان کی راہ کی سچائی پر۔

رب تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: (وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِئَتْ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۶۹) (الزمر: 69)

ترجمہ: "اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور (اعمال کی) کتاب (کھول کر) رکھ دی جائیگی اور پیغمبر اور (اُور) گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور بے انصافی نہیں کی جائیگی۔"

بیشک نیک لوگ یقیناً نعمتوں میں ہوں گے (۲۲)	إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝۲۲

یعنی؛ فرماں بردار لوگ آخرت کے گھر میں ایسی نعمتوں میں ہوں گے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے (۲۳)	عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ۝۲۳

"ارائک" تخت اور آسمانی رنگ کے پردے ہیں، اریکہ کا اطلاق صرف تخت پر نہیں ہوتا، مگر جب تخت ایک ایسے گنبد کے نیچے واقع ہو جسے پردوں سے مزین کیا گیا ہو تو اس کا اطلاق ہوگا۔

دیکھ رہے ہوں گے، اس کی طرف جسے اللہ رب العزت نے نعمتوں اور اعزاز و اکرام میں سے ان کے لیے تیار کیا ہے، یا تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ خدائے ذوالجلال کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

تم ان کے چہروں سے راحت کی تازگی معلوم کرلو گے (۲۴)	تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝۲۴

ان کو دیکھ کر سمجھ جاؤ گے کہ ناز و نعمتوں والے ہیں، اس نور، خوبصورتی، سفیدی، اور سرور و تازگی جو ان کے چہروں سے عیاں ہے، اس لیے رب تعالیٰ نے ان کے چہرے، شکل اور انداز میں ایسی رونق، صفائی اور تازگی رکھی ہے کہ کوئی تعریف و توصیف کرنے والا اس کا وصف بیاں ہی نہیں کر سکتا۔

"نَضْرَةُ النَّعِيمِ" (خوشی، رونق اور تازگی)

یُسْقَوْنَ مِنْ رَحِیقٍ مَخْتُومٍ ۝۲۵	ان کو خالص شراب سر بمہر (خُذَام کے ذریعے) پلائی جائے گی (۲۵)

"یُسْقَوْنَ" فرشتے اسے لیکر استقبال میں کھڑے ہو کر پیش کریں گے۔

"مِنْ رَحِیقٍ" ایسی شراب جس میں نہ کوئی ملاوٹ ہوگی اور نہ کوئی ایسی چیز ہوگی جو اس کو گندہ کر دے۔

"مَخْتُومٍ" وہ ہے جس کو مہر لگی ہو، کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا، اور صالحین خود ہی اس کی مہر توڑیں گے۔

خِتْمُهُ مِسْکٌ ۝۲۶ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝۲۶	جس کی مہر مشک کی ہوگی، تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہیے کہ اسی میں رعبت کریں (۲۶)

"تَنَافَسٌ" جھگڑا اور کشمکش کسی چیز کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے جسے ہر کوئی اپنے لیے چاہتا ہے، اسی لیے اسے اپنانے کے واسطے دوسروں سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتا ہے، اور اس معاملے میں بخل سے کام لیتا ہے اور اسے اپنے دائرہ اختیار میں لانا چاہتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ : ہر وہ مومن جو دوسرے مؤمن کو پانی کا ایک گھونٹ پلاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن رَحِیقِ مَخْتُوم سے پلائے گا، اور ہر وہ مؤمن جو دوسرے بھوکے مؤمن کو کھانا کھلائے گا، خدا جلّ جلالہ اسے جنت کے پھلوں سے کھلائے گا، اور ہر وہ مؤمن جو دوسرے ننگے مؤمن کو لباس پہنائے گا، خدا جلّ جلالہ اسے جنت کا سبز لباس پہنائے گا۔

وَمَزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ۝۲۷	اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی (۲۷)

تسنیم وہ شراب ہے جو جنتیوں پر اوپر سے برسے گی، جنت کی اعلیٰ شرابوں میں اس کا شمار ہے۔

عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝۲۸	وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے (۲۸)

رحیق، یا تسنیم وہ چشمہ ہے جس سے جنتی لوگ اپنی پیالوں میں ملاتے ہیں، جبکہ مقربین اس سے خالص پیتے ہیں، پھر رحیق کی چار صفتیں ہیں :

- 1 - ایسی شراب ہے جس پر مہر لگی ہوئی ہوگی۔
- 2 - اس کی مہر کستوری کی ہوگی۔
- 3 - یہ مقابلہ کی اور سبقت لیجانے کی جگہ ہے۔
- 4 - اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا : تسنیم اہل قرب کے لیے مخصوص ہے اہل قرب اس کو کسی چیز کی آمیزش کے بغیر پئیں گے اور باقی اہل جنت کے لیے اس میں آمیزش کی جائے گی۔

بابرکت آیات (29 تا 36) کافروں کے ہنسی مذاق مؤمنوں کے ساتھ اور مسلمانوں کے مقابلہ بالمثل قیامت کے دن کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

جو مجرم تھے، وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے (۲۹)	إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿۲۹﴾

مفسرین کرام نے اس آیت مبارکہ کے دو سبب نزول نقل کیے ہیں:

پہلی روایت کے مطابق: مجرمین سے مراد مشرکین کے بڑے، جیسے ابوجہل، ولید بن مغیرہ، اور عاص بن وائل ہیں، جوکہ عمار، صہیب، بلال اور دیگر فقراء مسلمین کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ: علی ابن ابی طالبؓ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ راستے سے گزر رہے تھے منافقین ان پر ہنس رہے تھے اور آنکھوں ابروؤں کے اشارے سے ان کا مذاق اڑاتے تھے، تب اپنے منافق دوستوں کے پاس جاکر کہتے: آج ہم نے ایک گنجلے آدمی کو دیکھا، اس بات پر وہ سب ہنس پڑے اس سے پہلے کہ علی رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچتے یہ آیت نازل ہوئی :

اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو اپس میں آنکھوں کے اشارے کرتے تھے (۳۰)	وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿۳۰﴾

"يَتَغَامَزُونَ" آنکھ اور ابرو کے اشارے سے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے، اور ان کا یہ کام ہنسنے سے زیادہ سخت تھا، یہاں لفظ اور فعل جمع استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ایسا کرتے تھے۔

وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿٣١﴾	اور جب اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جاتے تھے تو دل لگی کرتے ہوئے جاتے تھے (۳۱)

جب کفار اپنی مجالس و محافل سے خوشی خوشی لوٹتے تھے اپنی اس حالت پر اور اس پر کہ مسلمانوں کو ٹھٹھا کرتے اور مذاق اڑاتے تھے، یا یہ کہ وہ لوگ جب اپنے گھروں کو واپس جاتے تو ہر قسم کی ناز و نعمت جو وہ چاہتے تھے گھروں میں ان کو مل جاتی تھی، البتہ ان نعمتوں کا ان کو دینا "استدراج" تھا، کیونکہ وہ لوگ بدترین کام کرنے کے باوجود سکون محسوس کرتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ گویا خدا کی طرف سے ان کے پاس کوئی عہد آیا ہے کہ وہ لوگ خوش نصیب اور سعادت والے ہیں۔

انہوں نے اپنے بارے میں خود ہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہدایت والے ہیں، اور مؤمنین گمراہ ہیں، حالانکہ وہ ایک جھوٹ تھا جو خدا کی طرف منسوب کرتے تھے، اور یہ جرأت کر کے بغیر علم کے اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے۔

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَّالُّونَ ﴿٣٢﴾	اور جب ان مؤمنین کو دیکھتے تو کہتے یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں (۳۲)

"وَإِذَا رَأَوْهُمْ" جب مذاق اور تحقیر کرنے والے مسلمانوں کو دیکھتے "قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَّالُّونَ" تو کہتے: یہ لوگ، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گمراہ (دقیانوسی اور پرانے زمانے کے لوگ) ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ﴿٣٣﴾	حالانکہ ان کو ان مسلمانوں پر نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا (۳۳)

انہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر پوچھ گچھ کرنے والا مقرر نہیں کیا تھا، کہ ان کے اعمال و احوال کی نگرانی کریں، بلکہ وہ اپنے اعمال کی نگرانی کے مکلف تھے، کہ اپنے کاموں اور عمل کی اصلاح کریں، پس اپنے اعمال و

کردار کی طرف متوجہ ہونا دوسروں کی عیب جوئی میں مشغول رہنے سے ان کے لیے زیادہ بہتر تھا۔

ان کا یہ کام ضد اور ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے ہوا ہے کسی دلیل کی بنا پر نہیں، اس لیے آخرت میں ان کی سزا ان کے عمل کے جنس سے ہوگی۔

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٣﴾	پس آج ایمان والے ان کافروں پر ہنسیں گے (۳۴)

"مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ" یعنی جب مؤمنین اپنے تختوں پر بیٹھ کر کفار کے عذاب کا نظارہ کریں گے تو ان پر ہنسیں گے۔

عَلَى الْأَرْيَاءِ ۖ يَنْظُرُونَ ﴿٣٥﴾	تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے (۳۵)

قرطبی کہتے ہیں کہ: اہل جہنم سے کہا جائے گا کہ باہر نکلو تو ان کے لیے جہنم کے دروازے کھول دئے جائیں گے، جب وہ دیکھیں گے کہ دروازے کھول دیے گئے تو وہ نکلنے کے لیے ان دروازوں کی طرف بڑھیں گے جب کہ مؤمن پلنگوں پر بیٹھیں ہوں گے، جب وہ دروازے تک پہنچیں گے تو ان پر دروازے بند کر دیے جائیں گے، تو ان پر مؤمن ہنسیں گے، مؤمنین راحت اور سکون کے ساتھ سجے ہوئے پلنگوں پر ٹیک لگائے نعمتوں میں ہوں گے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تیار کیا ہے، اور اپنے رب کا دیدار کریں گے۔

هَلْ تُؤْتِبُ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾	کیا کافروں کو اس کا بدلہ دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟ (۳۶)

یعنی: کیا ان کو ان کاموں کی سزا دے دی گئی جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے؟ مثال کے طور پر وہ لوگ مسلمانوں پر ہنستے تھے اور انہیں گمراہ کہتے تھے، چنانچہ اب قیامت کے دن ان کی گمراہی اور سرکشی کی بناء پر ان کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر مؤمن ان پر ہنسیں گے۔

کاروبار میں نبی کا طریقہ:

سیرت نگاروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تجارت اور خرید و فروخت کے طریقے کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے:

1 - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود خرید و فروخت کیا کرتے تھے، جیسا کہ عمر اور جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، اور کبھی کبھار اصحاب کرام میں سے کسی کو وکیل مقرر فرماتے تھے۔

مثلاً عروہ بن جعدالبارقی کے بارے میں کہا گیا : (أَعْطَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِينَارًا يَشْتَرِي بِهِ أُضْحِيَّةً - أَوْ شَاةً - فَاشْتَرَى شَاتَيْنِ، فَبَاعَ إِحْدَاهُمَا بِدِينَارٍ، فَأَتَاهُ بِشَاةٍ وَدِينَارٍ، فَدَعَا لَهُ بِالْبَرَكَةِ فِي بَيْعِهِ، فَكَانَ لَوْ اشْتَرَى ثَرْبًا لَرَجَحَ فِيهِ) ترمذی (1258) و أبو داود (3384) و ابن ماجہ (2402). "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک دینار دیا تاکہ وہ ایک قربانی یا بکری خریدے، اس نے اس دینار سے دو بکریاں خریدیں، اور پھر ان میں سے ایک بکری ایک دینار میں فروخت کر دی، اور دوسری بکری اور ایک دینار آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیع میں برکت کی دعا فرمائی، پس اگر وہ مٹی بھی خریدے تو اس میں نفع کماتے"

2 - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تاجروں کو نیکی کرنے اور سچائی اختیار کرنے اور صدقہ دینے کا حکم دیتے تھے۔

حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : (فَإِنْ صَدَقًا وَبَيْنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا حُقَّتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا) (بخاری (1973) و مسلم (1532)) ترجمہ: اگر (خریدار اور بیچنے والا) دونوں نے سچائی اختیار کی اور ہر بات صاف صاف بیان اور واضح کر دی، تو ان کی خرید و فروخت میں برکت ہوتی ہے، لیکن اگر انہوں نے کوئی بات چھپائی یا جھوٹ بولا تو ان کی خرید و فروخت سے برکت مٹا دی جاتی ہے۔

اسماعیل بن عبید بن رفا عہ اپنے باپ اور دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید گاہ کے لیے نکلا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا : اے تاجروں کی جماعت : "يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ" انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ندا کا

جواب دیتے ہوئے اپنی گردنیں اور نگاہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اٹھائیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ التُّجَّارَ يَبْعَثُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا،

إِلَّا مَنِ اتَّقَى اللَّهَ وَبَرَّ وَصَدَّقَ" (ترمذی (1210) و ابن ماجہ (2146))

بلاشبہ قیامت والے دن تاجر لوگوں کا حشر گنہگار کی حیثیت سے ہوگا، مگر جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا، نیکیاں کرتا اور سچ بولتا رہا۔

قیس بن ابی غرزہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ إِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْخَلْفُ فَشُوبُهُ بِالصَّدَقَةِ" (ترمذی (1208) و أبو داود (3326)) "اے تاجروں کی جماعت! تمہاری خرید و فروخت میں قسم اور لغو باتیں آجاتی ہیں، لہذا تم اس میں صدقہ کو ملا دیا کرو۔"

3 - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید و فروخت میں سخاوت، خوش اخلاقی اور نرمی کا حکم دیا ہے۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا إِذَا بَاعَ، وَإِذَا اشْتَرَى، وَإِذَا اقْتَضَى" بخاری (1970) "اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے گا جو خرید و فروخت اور اپنا حق مانگنے میں نرمی اختیار کرتا ہو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ رائے کی مثالوں میں سے ایک حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں: "كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَكُنْتُ عَلَى بَكْرِ صَعْبٍ لِعُمَرَ، فَكَانَ يَغْلِبُنِي فَيَتَقَدَّمُ أَمَامَ الْقَوْمِ، فَيَزُجُّهُ عُمَرُ وَيُرُدُّهُ، ثُمَّ يَتَقَدَّمُ فَيَزُجُّهُ عُمَرُ وَيُرُدُّهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعُمَرَ: (بِعْنِيهِ) قَالَ: هُوَ لَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: (بِعْنِيهِ) فَبَاعَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هُوَ لَكَ يَا عَبْدَ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ تَصْنَعُ بِهِ مَا شِئْتَ" (بخاری: 2610) ترجمہ: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، میں عمر رضی اللہ عنہ کے ایک نئے اور سرکش اونٹ پر سوار تھا، اکثر وہ مجھ سے بے قابو ہو کر سب سے آگے نکل جاتا، لیکن عمر رضی اللہ عنہ اسے ڈانٹ کر پیچھے واپس

کردیتے، وہ پھر آگے بڑھ جاتا، آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر سے فرمایا کہ یہ اونٹ مجھے بیچ دے، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! یہ تو آپ ہی کا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں مجھے یہ اونٹ فروخت کر دے، چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اونٹ بیچ دیا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبداللہ بن عمر اب یہ اونٹ تیرا ہو گیا، جس طرح تو چاہے اسے استعمال کر۔

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ: "أَنَّكَ كَانَ يَسِيرُ عَلَى جَمَلٍ لَهُ قَدْ أَغْيَا، فَمَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَرَبَهُ، فَدَعَا لَهُ، فَسَارَ بِسِيرٍ لَيْسَ يَسِيرُ مِثْلَهُ، ثُمَّ قَالَ: بِعْنِيهِ بِوَقِيَّةٍ قُلْتُ: لَا ثُمَّ قَالَ: بِعْنِيهِ بِوَقِيَّةٍ فَبِعْتُهُ، فَاسْتَشْنَيْتُ حُمْلَانَهُ إِلَى أَهْلِي، فَلَبَّا قَدِمْنَا أَتَيْنَاهُ بِالْجَمَلِ، وَنَقَدَنِي ثَمَنَهُ، ثُمَّ انْصَرَفْتُ، فَأَرْسَلَ عَلَى إِثْرِي، قَالَ: مَا كُنْتُ لِأُخَذَ بِجَمَلِكَ، فَخُذْ بِجَمَلِكَ ذَلِكَ فَهُوَ مَالُكَ" (بخاری 1991) و مسلم (715) ترجمہ: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھا، میرا اونٹ تھک کر چلنے سے عاجز آگیا، اتنے میں رسول اللہ علیہ وسلم مجھ سے آملے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دُعا کی اور اسے تھپتھپایا، اب وہ ایسا چلا کہ اس طرح کبھی نہیں چلا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسے ایک اوقیہ (40 درہم) میں مجھے بیچ دو، میں نے کہا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے مجھے بیچ دو تو میں نے ایک اوقیہ میں اسے آپ کے ہاتھ بیچ دیا اور مدینے تک اس پر سوار ہو کر جانے کی شرط لگائی، جب ہم مدینے پہنچے تو میں اونٹ لے کر آپ کے پاس آیا اور اس کی قیمت وصول کر لی، پھر میں لوٹا تو آپ نے مجھے بلا بھیجا، اور فرمایا: کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے کم قیمت لگائی تاکہ میں تمہارا اونٹ لے سکوں، لو اپنا اونٹ بھی لو اور درہم بھی۔"

4 - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے حقوق ادا کرتے ہوئے اچھا معاملہ فرماتے تھے نیز اسکی ترغیب بھی دیتے تھے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: "كَانَ لِرَجُلٍ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِنٌَّ مِنَ الْإِبِلِ فَبَاءَهُ يَتَقَاضَاهُ فَقَالَ: (أَعْطُوهُ)، فَظَلَبُوا سِنَّهُ فَلَمْ يَجِدُوا لَهُ إِلَّا سِنًَّا

فَوَقَّهَا، فَقَالَ (أَعْطُوهُ)، فَقَالَ: أَوْفَيْتَنِي أَوْفَى اللَّهِ بِكَ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ خِيَارَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً" (بخاري (2182) و مسلم (1601))

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک شخص کا ایک خاص عمر کا

اونٹ قرض تھا، وہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضا کرنے آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے اونٹ دے دو، صحابہ کرام نے تلاش کیا لیکن ایسا اونٹ نہ مل سکا جو قرض خواہ کے اونٹ کے برابر ہو البتہ ایسا اونٹ مل سکا جو قرض خواہ کے اونٹ سے اچھی عمر کا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہی دے دو، اس پر اس شخص نے کہا کہ آپ نے مجھے میرا حق پوری طرح دیا، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اس کا بدلہ پورا پورا دے،

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں بہتر آدمی وہ ہے جو قرض ادا کرنے میں بھی سب سے بہتر ہو۔

5۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پشیمان شخص کی طرف سے سودے کی منسوخی کو قبول کرنے کی ترغیب دی ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللَّهُ عَثْرَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (أبو داود (3460) و ابن ماجہ (2199))

ترجمہ: جو کوئی اپنے مسلمان بھائی سے فروخت کا معاملہ فسخ کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ معاف کر دے گا۔

"أَقَالَهُ" یعنی درگزر کرنا، سخاوت کرنا، خریدا ہوا یا بیچا ہوا مال واپسی کی صورت میں قبول کرنا، یہ انسان کی شرافت کی دلیل ہے۔

مثال کے طور پر کسی نے کوئی سامان خریدا، مگر کسی وجہ سے اس خرید پر پشیمان ہو گیا یا اسے پسند نہ آیا یا اس نے محسوس کیا کہ دھوکہ کھایا ہے، یا اس کو اس سامان کی ضرورت نہ رہی، اور خریدا ہوا سامان واپس کر دینا چاہا اور فروخت کنندہ نے سامان واپس لے لیا، تو گویا اس نے ایک مسلمان پر

احسان کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ بھی اس پر احسان کرے گا کیونکہ اس نے اس خریدار پر احسان کیا، یہ اس صورت میں ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ طے پایا ہو اور خریدار کو سودا فسخ کرنے کا اختیار نہ ہو، ملاحظہ کریں :

"عون المعبود" شرح سنن ابو داود۔

6 - پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے مال کو حقیر اور بے وقعت نہیں سمجھتے تھے، جیسا کہ جابرؓ کی حدیث ہے کہ ان کے اونٹ کے فروخت سے متعلق جو واقعہ ان کے ساتھ ہوا، کپڑے خریدتے وقت وہ بیچنے والے کے ساتھ سودا طے ہونے تک بحث کرتے تھے (یعنی بھاؤ تاؤ کرتے تھے)۔

سوید بن قیس سے روایت ہے: "جَلَبْتُ أَنَا وَخَازِمَةُ الْعَبْدِيِّ بَرًّا مِنْ هَجَرَ فَأَتَيْنَاهُ مَكَّةَ، فَجَاءَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِي، فَسَأَوْنَاهُ بِسَرَاوِيلَ، فَبِعْنَاهَا" ترمذی (1305) و قال: حدیث حسن صحیح، وأبو داود (3336) والنسائی (4592) وابن ماجه (2220)۔

ترجمہ: میں اور مخرمہ عبدی ہجر کے علاقے سے کچھ کپڑے خرید کر لائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے ہم سے کچھ شلواریں کا بھاؤ طے کیا اور بحث کی اور ہم نے وہ ان کو فروخت کر دیں۔

7 - پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خرید و فروخت میں کسی چیز کو تولتے وقت ترازو کو ذرا سا جھکانے کا حکم دیتے تھے۔

سوید بن قیس سے روایت ہے کہ: (رَأَى) رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يَزِنُ بِالْأَجْرِ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: (زِنْ وَأَرْجُحْ). ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو اجرت لیکر تولتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وزن کرنے والے سے مخاطب ہو کر کہا: "تولو اور کچھ جھکتا ہوا تولو" یہ حدیث سابقہ حدیث کا تسلسل ہے۔

8 - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنگ دستوں کو مہلت دینے اور قرض میں کمی کرنے کا حکم دیتے تھے۔

ابوالسیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ عَنْهُ أَظْلَهُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ" (مسلم: 3006) ترجمہ: جو شخص کسی تنگدست کو مہلت دے یا اسے قرض معاف کر دے تو اللہ اسے اپنے (عرش کے) سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا۔

9 - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود، بیع غرر، وبيع العینہ اور محرّمات کے خرید و فروخت اور دھوکہ اور گھماؤ پھراؤ سے منع فرمایا۔

"غَرَرٌ" یعنی ایسا لین دین جو لا علمی یا خطرے کے ساتھ ہو۔

"بيع عینہ" اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو کوئی چیز ادھار قیمت میں فروخت کر دے، پھر قیمت لینے سے پہلے ہی خریدار سے اصل قیمت سے کم میں اسے خرید لے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا" جو ہمیں دھوکہ دے اور دغا و فریب کا ارادہ رکھتا ہے ہم میں سے نہیں ہے۔ (مسلم: 101)

اور ابن عمر سے روایت ہے: "إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعَيْنَةِ وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمْ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ" (ابوداؤد: 3445) ترجمہ: جب تم بیع عینہ کرنے لگو گے تو گائیوں بیلوں کے دم تھام لو گے، کھیتی باڑی میں مست و مگن رہنے لگو گے، اور جہاد کو چھوڑ دو گے، تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا، جس سے تم اس وقت تک نجات و چھٹکارا نہیں پاسکو گے جب تک اپنے دین کی طرف لوٹ نہ آؤ گے۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
جزء - (30)

سورۃ الانشقاق

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اسکی پچیس "25" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

"انشقاق" مصدر ہے، یہ پھاڑنے کا معنی دیتا ہے، اس میں آسمان کو پھاڑنے کے بارے میں بحث کی گئی ہے، اس سورت کا نام "انشقاق" "إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ" سے لیا گیا ہے، ایک ایسا واقعہ جو بذات خود دنیا کی تباہی اور قیامت کے دن بڑے پیمانے پر خوف و ہراس کی علامت ہے۔

سورۃ الانشقاق کی آیات، حروف اور الفاظ کی تعداد:

سورۃ "الانشقاق" سورۃ الانفطار کے بعد نازل ہوئی ہے، اور مکی سورتوں میں سے ہے، اس کا ایک (1) رکوع، پچیس (25) آیتیں، ایک سو آٹھ (108) الفاظ، چار سو اڑتالیس (448)

حروف، اور دو سو نو (209) نقطے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن کی سورتوں میں حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، (اس بحث کی تفصیل کے لیے تفسیر احمد سورہ الطور ملاحظہ کریں)۔

سورۃ الانشقاق کا ربط و مناسبت ماقبل سورتوں سے:

چونکہ سورہ انشقاق مکی سورتوں میں سے ایک ہے چنانچہ دیگر مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی قیامت کے دن دل دہلا دینے والے مناظر، اور اسلامی عقیدہ کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔

سورۃ الانشقاق کا ربط و مناسبت سورہ مطفین، انفطار اور تکویر سے یہ ہے کہ : اس میں بھی قیامت کے دن کے، خوش نصیبوں اور بد نصیبوں کی حالت پر بحث کی گئی ہے۔

یادداشت:

سورۃ انشقاق کی آیات (20 اور 21) میں سجدۂ تلاوت ہے، سجدۂ تلاوت کے تفصیلی احکام کے لیے اس تفسیر میں سورۃ النجم کا مطالعہ فرمائیں۔

سورۃ الانشقاق کا تعارف:

یہ سورت قرآن کریم کے آخری پارے کی اکثر سورتوں کی طرح قیامت کے دن کے موضوعات سے متعلق بحث کرتی ہے، سورہ کے شروع میں دنیا کے آخر میں ہولناک اور دل دہلا دینے والے واقعات اور قیامت کے آغاز کے بارے میں اشارے اور تنبیہات ہیں، اور اگلے مرحلے میں قیامت کا حال، نیکوں اور بدکاروں کے اعمال اور ان کے انجام کا بیان ہوا ہے، جبکہ تیسرے مرحلے میں ان اعمال اور عقائد کا ایک حصہ بیان ہوا ہے جو عذاب الہی کا سبب بنتے ہیں۔

چوتھے مرحلے میں بعض قسّموں کا ذکر کرنے کے بعد دنیا اور آخرت میں انسانی زندگی کے مراحل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور آخرت میں پانچویں مرحلے میں اچھے اور برے اعمال اور ان کی سزا و جزا کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

سورہ کے شروع میں آسمان کے چیر پھاڑنے کا واقعہ قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد زمین کا برابر ہونا اور جو کچھ اس کے سینے میں ہے اس کا باہر آنا، انسان کا بیدار ہونا، اور اس کا خدا کی طرف جانا اور اعمال نامے کی تقسیم کے طریقہ کار پر بحث کی گئی ہے۔

جیسا کہ ہم قرآن کریم میں پڑھتے ہیں: کہ قیامت آنے والی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو جو قبروں میں ہیں زندہ کرے گا (سورہ حج: 7)

قرآن کریم میں ہے کہ: "اور اس دن (اعمال کا) تلنا برحق ہے تو جن لوگوں کے (عملوں کے) وزن بھاری ہونگے تو وہ نجات پانے والے ہیں"

"اور جن لوگوں کے وزن ہلکے ہونگے تو یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے تئیں خسارے میں ڈالا اس لیے کہ ہماری آیتوں کے بارے میں بے انصافی کرتے تھے"

ہمارے پروردگار اس حساب و محاسبہ کے دن کے متعلق فرماتے ہیں: لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آپہنچا ہے اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔ (الانبیاء)

اسی طرح اعمال نامے کی تقسیم کے متعلق فرماتے ہیں: (وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۖ) (۱۰۰)

ترجمہ: "اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے" (سورۃ تکویر)

قرآنی فرمان کے مطابق قیامت کے دن جب نامہ اعمال موصول ہوں گے تو لوگ دو گروہوں میں بٹ جائیں گے: "پہلا وہ گروہ جس کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، دوسرا وہ گروہ جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

پہلا گروہ خوش اور آسان حساب و کتاب والا اور جنت سے ان کا تعلق ہے، جبکہ دوسرا گروہ جہنمی ہوگا، (اس موضوع پر آیات "7 تا 12" میں بحث کی گئی ہے)

پُل صراط وہ پُل ہے جسے جہنم کے اوپر بچھایا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کے تمام بندے اسے عبور کریں گے، تاکہ جو جنتی ہیں جنت میں داخل ہوں، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں: اور تم میں سے کوئی شخص نہیں مگر اسے اس پر گزرنا ہوگا، یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔

سورۃ الانشقاق کی فضیلت:

اس سورت کی فضیلت کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ "إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ" اور "إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ" کی تلاوت کے موقع پر سجدہ کرتے تھے۔

لغوی تحقیق

لغات اور اصطلاحات کی تشریح:

"اُنشَقَّتْ" چیر گیا، پھٹ گیا، پھاڑنا (ملاحظہ کریں: حاقہ آیت: 16 اور انفطار آیت: 1)

"أُذِنْتُ" اس نے سنا، حکم دیا، اطاعت کی۔

"حَقَّتْ" اس کو یہی لائق ہے، اس پر لازم ہے کہ مطیع و فرمانبردار ہو۔

"مُدَّتْ" کھینچا گیا اور پھیلا یا گیا، اس کا مقصد دو چیزیں ہیں:

1 - نشیبی اور بلندیوں کا ختم ہونا، اور زمین کا چٹیل، کشادہ اور برابر ہونا۔

2 - زمین کا کشادہ اور فراخ ہونا، تاکہ پہلی اور آخری مخلوقات کے لیے گنجائش پیدا کرے۔

"أَلْقَتْ" پھینک دیا، باہر پھینکا۔

"تَخَلَّتْ" (خَلَوَّ) خالی ہوا۔

"كَادَحٌ" سخت محنت کرنے والا۔

"كَدَحًا" کام میں جدوجہد کرنا مشقت اور تکلیف کے ساتھ اتنی محنت کہ جسم اور جان میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

"فَمَلَقِيْهِ" اپنے رب تک پہنچو گے، اور اپنی کوشش کا بدلہ پالے گا۔

ضمیر "ہ" رب یا کَدْح کی طرف راجع ہے۔

"فَسَوْفَ يُحَاسِبُ" حساب اور عملدرآمد کیا جائے گا۔

"إِلَىٰ أَهْلِهِ" اپنی بیوی بچے اور اقارب کے پاس۔

"وَرَأَىٰ ظَهْرَهُ" پیٹھ پیچھے، کافر اور گنہگار لوگ اپنے اعمال نامے پیٹھ پیچھے اور بائیں ہاتھ

سے وصول کریں گے، اس طرح کا عمل ان کے اس منحوس نامہ اعمال اور ناپسندیدہ مقدمے سے بیزاری کا اظہار ہے، یعنی ایک بد رونق اور تاریک مقدمہ (ملاحظہ فرمائیں: الحاقط آیت: 25)

"يَدْعُو" پکارتا اور روتا ہے۔

"تُبَوَّرًا" ہلاکت، تباہی۔

"يَصْلَى" داخل ہوتا ہے۔

"سَعِيرًا" دوزخ کی آگ، دوزخ کی بھڑکتی اور دھکتی ہوئی آگ، دوزخ۔

"أَهْلِهِ" اپنے اہل خانہ اور رشتہ دار۔

"كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا" اس سے مراد ہے خواہشات اور غفلت سے پیدا ہونے والا

سرور۔

"لَنْ يَجُورَ" واپس نہیں آئے گا، اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت پر یقین نہیں رکھتا

تھا، آخرت میں اٹھنے کے دن اور حساب و کتاب پر اور جنت و دوزخ پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

سورۃ الانشقاق

بسم الله الرحمن الرحيم

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا فَمُلْقِيَةً ۝ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينَةٍ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حِسَابًا يَّسِيرًا ۝ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَّنْ يَّجُوزَ ۝ بَلَىٰ ۝ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۝ فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۝ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكْذِبُونَ ۝ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ۝ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ۝	جب آسمان پھٹ جائے (۱)
وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝	اور وہ اپنے پروردگار کا حکم سن کر مان لے گا، اور اس پر لازم ہے یہی کرے (2)
وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝	اور جب زمین ہموار کر دی جائے گی (3)
وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝	اور نکال ڈالے گی جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے گی (4)
وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝	اور سنے گی حکم اپنے رب کا اور اس کو یہی لائق ہے (5)
يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا فَمُلْقِيَةً ۝	اے انسان! تو اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جاملے گا (6)

تو جس کا نامہ (اعمال) اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا (7)	فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝
تو اس سے جلد ہی آسان حساب لیا جائے گا (8)	فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝
اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش باش پلٹے گا (9)	وَيُنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝
اور جس کا نامہ (اعمال) اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا (10)	وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝
تو وہ عنقریب اپنی موت کو پکارے گا (کاش کہ میں ہلاک ہو جاؤں) (11)	فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝
اور بھڑکتی ہوئی آگ میں پہنچے گا (12)	وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝
بلاشبہ وہ اپنے گھر والوں میں خوش تھا (13)	إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝
اس کا خیال تھا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر نہیں جائے گا (14)	إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَخُورَ ۝
ہاں، اس کا پروردگار اس کو دیکھ رہا تھا (15)	بَلَىٰ ۚ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۝
پس میں قسم کھاتا ہوں شفق کی (16)	فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝
اور قسم ہے رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے (17)	وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝
اور چاند کی قسم جب کامل ہو جائے (18)	وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝
کہ تم ضرور ہی ایک حالت سے دوسری حالت کو چڑھتے جاؤ گے (19)	لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝
تو ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے (20)	فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝
اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے (21)	وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۝
بلکہ کافر تو جھٹلاتے ہیں (22)	بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكْذِبُونَ ۝

اور خدا ان باتوں کو جو یہ اپنے دل میں چھپاتے ہیں خوب جانتا ہے (23)	وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿٢٣﴾
سو خوشخبری سنا دے ان کو عذاب دردناک کی (24)	فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٤﴾
البتہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر غیر مَنُونِہٖ ﴿٢٥﴾	اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَنُوْنٍ ﴿٢٥﴾

محترم قارئین:

بابرکت آیات "1 تا 15" میں خوف، دہشت، روز قیامت اور دو جگہوں کی طرف لوگوں کے جانے کے بارے میں بحث کی گئی ہے، اور اس کی تصویر کشی، اور اس کی مثال دی گئی ہے، اسی طرح ان مصائب اور مشکلات پر بھی بحث ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوں گے، جس کا تصور ہی پریشان کن ہے۔

ترجمہ اور تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
اِذَا السَّمَاءُ اُنْشَقَّتْ ﴿١﴾	جب آسمان پھٹ جائے (۱)

آسمان کا پھٹ جانا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، یعنی اس کے دروازے کھل جائیں گے، اس کی حالت میں تبدیلی واقع ہو جائے گی، اور اس کی چھت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ میں فرماتے ہیں کہ: جب آسمان پھٹ جائے گا اور منتشر ہو جائے گا، کیونکہ اس کے بنانے کا مقصد پورا ہو چکا ہوگا، اور اب دنیا کی حالت بدلنی ہے۔

مفسر آلوسی کہتے ہیں کہ : قیامت کے دن کے خوف سے آسمان پھٹ جائے گا، (روح المعانی: 78/30)

وَاٰذَنْتُ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ ﴿٢﴾	اور وہ اپنے پروردگار کا حکم سن کر مان لے گا، اور اس پر لازم ہے یہی کرے (2)

وہی ہے جس نے آسمان کو بنایا، اس کا حکم نافذ العمل ہے، کوئی بھی اس کی مخالفت میں قدم نہیں اٹھا سکتا، مبارک آیت کے جملہ: "وَأَذْنُتُ لِرَبِّهَا" میں "اذن" کا لفظی معنی: کسی چیز کو کان لگا کر سننا، اور اس کی بات قبول کرنا ہے، "اس نے اپنے رب کا حکم سنا"۔

لیکن عربی زبان میں روز مرہ کی گفتگو کے لحاظ سے "اذن" کا معنی صرف یہ نہیں ہے کہ اس نے حکم سنا، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حکم سننے کے بعد فرمانبردار کی طرح اس کو بجا لایا، اور اس سے کسی بھی طرح انحراف نہیں کیا، آسمان اس بات کا پابند ہے کہ اپنے پروردگار کا فرمانبردار ہو، اور اس کے سامنے عاجزی کرے اور بات سنے، اور "حَقَّتْ" کا معنی مجہول صیغے کے طور پر یہ ہے کہ: "حق لہا الانقیاد" یعنی: حق اور واجب تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرے۔

وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝۳	اور جب زمین ہموار کردی جائے گی (3)

اور جب زمین پہاڑوں اور ٹیلوں کے ساتھ پھیل جائے گی، اور صاف و ہموار ہو جائے گی، اس طرح کہ نہ بستیاں، اور نہ کوئی عمارت، اور نہ پہاڑ اور نہ وادیاں نہ اونچ نیچ اس میں باقی رہے گی۔

حاکم نے عمدہ سند سے حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن زمین کو اس طرح کھینچ کر پھیلائی جائے گی جیسے چمڑے (یا ربڑ یا پلاسٹک) کو کھینچ کر پھیلا یا جاتا ہے۔"

مگر اس کے باوجود میدان حشر جو اس زمین پر ہوگا اس میں ابتداء دنیا سے قیامت تک تمام انسان جمع ہوں گے تو صورت یہ ہوگی کہ ایک آدمی کے حصے میں صرف اتنی زمین ہوگی جس پر اس کے پاؤں ہیں (رواہ الحاکم بسند جید، مظہری)۔

وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝۴	اور نکال ڈالے گی جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے گی (4)

قیامت سے پہلے ہر وہ چیز جسے زمین نے اپنے اندر محفوظ کیا ہے دفائن،

خزائن اور معادن میں سے سب کو اپنے بطن سے باہر اگل دے گی، اور ان تمام مخلوقات میں سے جو اس میں بے خالی ہوجائے گی اور اس کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی، زمین بھی آسمان کی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابع اور فرمانبردار ہوگی۔

مفسر شیخ قرطبی فرماتے ہیں: مُرْدُوں کو باہر نکال دے گی اور اس سے خالی ہوجائے گی، جیسے حاملہ اپنا حمل گرا دیتی ہے، وہ بھی اپنے بطن سے خزانہ اور معدنیات باہر پھینک دے گی، اس طرح یہ اس امر کے عظیم ہونے کی خبر ہے۔ (قرطبی: 248/19)

اور سنے گی حکم اپنے رب کا اور اس کو یہی لائق ہے (5)	وَإِذْ نَتَّلَرِّبَهَا وَحَقَّتْ هـ

یعنی: زمین اسی لائق ہے کہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر پھینکے اور رب کا حکم سن کر اطاعت و فرمانبرداری کرے، کیونکہ وہ رب اپنے ملک کا با اختیار مالک ہے، کوئی بھی اس کا حکم نہیں ٹال سکتا اور اس کی مرضی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

تفسیر "فی ظلال القرآن" کے مفسر اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: سب سے واضح منظر جو وہ اس صورت کی ابتدائی آیات انسان کے سامنے رکھتی ہیں وہ ہے، آسمان اور زمین کا اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، اس کے بعد انسان کو اس تسلیمی کی طرف بلانا "يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ" ان آیات کا آپس میں جو ربط ہے وہ بہت واضح اور روشن ہے: کہ (آسمان اور زمین) نے سر تسلیم خم کیا، اگرچہ علم، ارادہ، شعور نہیں رکھتے، پھر تو اے انسان! تیرے علم اور ارادے کے ساتھ، کیا یہ بات معقول اور مناسب ہے کہ تو اس تسلیمی میں ان کے ساتھ نہ ہو؟

اے انسان! تو اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جاملے گا (6)	يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا فَمُلْقِيَةٍ هـ

یہ خطاب عام ہے تمام انسانوں کو شامل ہے، یعنی: تو اپنے اعضاء اور جوارح کے ساتھ مسلسل کام کرتا ہے اچھے اور برے اعمال میں مصروف ہے، اور مرتے دم تک کام کرتا ہے یہاں تک کہ آخرت کے گھر میں منتقل ہوجائے

گا اور اپنے رب سے ملاقات کر لے گا، یہ ملاقات تو انسان کی موت ہے یا یہ کہ اپنے اعمال کے ساتھ قیامت کو ملاقات کرے گا، اور اپنی محنت اور مشقت کا نتیجہ ضرور دیکھ لے گا، اچھائی ہو یا بُرائی، اگر تمہارے اعمال نیک ہوں تو اچھا بدلہ پاؤ گے اور تمہارے عمل بُرے ہوں تو بُرا بدلہ پاؤ گے۔

"البحر" میں ہے کہ: "کادح" یعنی وہ شخص اپنے اچھے اور بُرے کام میں پوری زندگی کوشش کرتا رہتا ہے اور بالآخر اللہ کے حضور میں کھڑا ہو جائے گا، پھر اس وقت اسے اپنے کئے کی سزا یا بدلہ ملے گا۔ (البحر: 446/8)

حدیث شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا: اے محمد! جیسے چاہو زندگی گزارو (بالآخر) مرنا تو ہے، جس کو چاہو اپنا محبوب بناؤ (بالآخر) جدا تو ہونا ہے، اپنی چاہت کے مطابق عمل کرو (بالآخر) اپنے عمل سے ملاقات کرنی ہے۔

"إِنَّكَ كَادِحٌ" یقیناً تو سخت جدوجہد کرنے والا اور نیکی کمانے والا ہے۔

"إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا" اپنے پروردگار کی طرف سعی اور کوشش کرنے والا ہے۔

"فَمُلَاقِيهِ" تم عمل کرو اگرچہ یہ عمل اللہ کے ہاں کم ہوں، لیکن اس کا بدلہ دے گا، اور تم قیامت کے دن اس کی جزاء یا سزا دیکھو گے۔

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ، ○	تو جس کا نامہ (اعمال) اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا (7)

تو یہ خوشبختی اور سعادت کی علامت ہوگی، اور وہ مؤمنین ہیں کہ ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں جو کہ خیر سے بھرے ہوں گے اور ان میں بُرائی نہیں ہوگی دیے جائیں گے، کیونکہ سیدھا ہاتھ مبارک ہے، ایسا آدمی جو خوشبخت اور کامیاب ہے۔

جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال نامے کی کتاب بند کر کے اس پر مہر لگا دی جاتی ہے، اور اوپر لیجا کر اور باندھ کر اس شخص کے اعمال کے ساتھ علیین یا سچین میں منتقل کر دیا جاتا ہے، انسان کے نامہ اعمال میں تاریخ، سال، مہینہ، دن اور اعمال کی دیگر تفصیلات موجود ہوتی ہیں، اور جلد ہی وہ خود دیکھ لے گا۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝٨٤	تو اس سے جلد ہی آسان حساب لیا جائے گا (8)

یعنی: اس سے سخت حساب نہیں لیا جائے گا، اور اس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں کام کیوں کیا، اور تیرا عذر اور دفاع اس کام کی انجام دہی کے بارے میں کیا ہے، اس کے اعمال نامے میں اس کی بُرائیاں یقینی طور پر اس کی نیکیوں کے پہلو میں لکھی ہوں گی، البتہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ نیکیوں کا پلڑا اس کے بُرائیوں کے پلڑے سے بھاری ہے تو اس کے بُرائیوں سے درگزر کیا جائے گا اور اس کی بخشش ہوگی، جیسا کہ رب تعالیٰ نے (سورۃ احقاف: آیت نمبر: 16) میں اہل ایمان کے بارے میں فرمایا: (أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۝ وَعَدَ الصَّادِقُ الذِّمِّي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝١٦)

ترجمہ: "یہی لوگ ہیں جن کے نیک اعمال ہم قبول کریں گے اور ان کے گناہوں سے درگزر فرمائیں گے اور یہ جنتی لوگوں میں ہیں، یہ سچا وعدہ (ہے) جو ان سے کیا جاتا ہے"

اس طرح قرآن کریم میں (سورۃ رعد آیت: 18) میں سخت حساب کے لئے لفظ "سوء الحساب" یعنی: "بُرا حساب" استعمال کیا گیا ہے۔

"حِسَابًا يَسِيرًا" سے مراد آسان حساب ہے جو اس آیت مبارکہ میں ہے صرف ایک پیشی ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ: "جس سے باریک بینی سے حساب لیا گیا اس کو عذاب دیا گیا۔"

حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: "فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا" جلد ہی اس سے حساب لیا جائے گا، آسان حساب، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (ليس ذلك بالحساب، ولكن ذلك العرض، من نوقش الحساب يوم القيامة عذب)

یہ حساب نہیں ہوگا، یہ تو محض اعمال نامہ پیش کیا جائے گا، اور قیامت کے

دن جس کے حساب کی جانچ پڑتال کی گئی اسے تو ضرور عذاب دیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے نزدیک ہوگا اور اسے اپنی رحمت اور مغفرت میں شامل کرے گا، اور اس سے کہے گا، تم نے ایسا ایسا کیا، اس کے گناہوں کو گن کر بتائے گا، اور پھر کہے گا: اس پر میں نے دنیا میں پردہ ڈالا تھا اور آج اسے بخش دوں گا، حساب یسیر سے مراد یہی ہے۔

اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش باش پلٹے گا (9)	وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝۹

یعنی: مؤمن آسان حساب کے بعد ان لوگوں کی طرف واپس پلٹے گا جو اس کے خاندان میں سے اور بال بچوں میں سے ہوں گے جو اس کی طرح معاف کر دیئے گئے ہیں، اور بہشت میں ہیں، اور اللہ کے فضل و کرم سے جو اسے عطا ہوگا فرحان و شادان ہوگا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ: "أَهْلُهُ" سے وہ جنتی مراد ہیں جو اس سے پہلے فوت ہوئے ہیں اور وہ بھی ان سے جاملے گا۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ طور میں فرمایا :
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۝۲۱
أَمْرًا مِّمَّا كَسَبَ رَهِيْنًا ۝۲۱

ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو بھی اُن (کے درجے) تک پہنچا دیں گے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے، ہر شخص اپنے اعمال میں گروی ہے"

جو شخص ایمان کی حالت میں فوت ہوگا اس کے اہل کو اس سے ملائیں گے شرط یہ ہے کہ اس کے اہل و عیال بھی اہل ایمان میں سے ہوں، (یا الہا! ہمیں بھی ان ہی میں سے بنا دے، آمین۔)

اور جس کا نامہ (اعمال) اس کی پیٹھ کے
پیچھے سے دیا جائے گا (10)

وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝۱۰

یعنی: وہ جو اپنے بائیں ہاتھ سے اور پیٹھ پیچھے سے اپنا نامہ اعمال وصول کرے گا، یہ شقاوت اور بد بختی کی علامت ہے، اور کفار کے عذاب میں سے ایک یہی ہے کہ ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھ اور پیٹھ پیچھے سے دیے جائیں گے۔

تو وہ عنقریب اپنی موت کو پکارے گا (کاش
کہ میں ہلاک ہوجاؤں) (11)

فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝۱۱

یعنی: بعد اس کے کہ اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے اور وہ اسے پڑھے تو کہے گا: ہائے افسوس ہے مجھ پر! آہ میرا سر خاک آلود ہو! اور موت اور بربادی کی تمنا کرے گا، اور اللہ پاک سے چاہے گا کہ اسے ہلاک کر دے تاکہ اس افسوس ناک صورتحال سے نجات پائے، لیکن اس کو ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اور جو مہلت دی گئی تھی اور جو موقع ملا تھا وہ موقع ختم ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا مقصد لوگوں کو نیک اعمال کی انجام دہی کی طرف راغب کرنا اور بیدار کرنا ہے۔

"ثُبُورًا": ہلاکت اور فساد اور بربادی کے معنی میں ہے، اور "مَثْبُور" جو قرآن میں استعمال کیا گیا ہے، اس سے وہ شخص مراد ہے جس کی عقل ناقص ہو، کسی کی عقل میں خلل اور نقصان کا ہونا بڑے نقصانوں میں سے ایک ہے۔

اور بھڑکتی ہوئی آگ میں پہنچے گا (12)

وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝۱۲

یہاں تک کہ وہ اس کی سختیوں اور جلتی گرمی کا مزہ چکھ لے۔

تفسیر میسر میں لکھا ہے کہ: اپنے کفر و تکذیب اور بُرے اعمال کی وجہ سے بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا، جو اس کے چہرے کو جلادے گی، اور اس کے جسم کو جلائے گی مگر اس کے وجود کو باقی رکھے گی۔

بلاشبہ وہ اپنے گھر والوں میں خوش تھا (13)

إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝۱۳

وہ دنیا میں اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے سرمست، مغرور، متکبر، لالچی، خوش و خرم، غافل اور خوشحال تھا، انجام کے بارے میں نہیں

سوچتا تھا، آخرت کا اس کے دل میں خیال بھی نہیں آتا تھا، اور وہ گمان کرتا تھا کہ یہ دنیا اسی حالت و کیفیت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے باقی رہے گی، وہ لوگ دنیا میں مادی نعمتوں کے ساتھ خوش تھے، اور گناہ کا ارتکاب کرتے تھے اور مؤمنوں کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن یہ خوشی ان کی صرف جسمانی تھی روحانی نہیں تھی، کیونکہ کفار کی خوشیوں کے بعد غم اور افسوس ہوتا ہے، جبکہ مؤمنوں کی خوشیوں کے بعد پشیمانی نہیں ہوتی، بلکہ خوشی ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔

ابن زید نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کی صفت دنیا میں خوف رکھنے والے، غمگین، رونے والے، اور شفقت کرنے والے بیان کی ہے، جبکہ آخرت میں ان کی صفت نعمتوں اور سرور سے کی، جبکہ جہنمیوں کی دنیا میں صفت سرور، ہنسنے اور لطف اندوزی سے کی ہے اور آخرت میں ان کا انجام ہمیشہ کے غم سے کی ہے، (قرطبی: 271/19)

اس کا خیال تھا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر نہیں جائے گا (14)	إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يُّؤْمَرَ ۝۱۴

اور حساب کتاب اور پوچھ گچھ کے لیے مرنے کے بعد اسے زندہ نہیں کرے گا، اس لیے اللہ کی کتاب کو جھٹلایا، اور رسالت کو رد کر کے گمراہوں کی پیروی کی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو لہب کی طرح کہتا تھا: میں اپنے پیسوں سے جنت خریدوں گا اور ایسا تصور کرتا تھا کہ: یہ دنیا ختم ہونے والی نہیں ہے، اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوگا، اس لیے کبھی بھی کوئی نیک عمل انجام نہیں دیا، اور بُرے اعمال سے پرہیز نہیں کیا، اور قیامت اور سزا پر یقین نہیں رکھتا تھا، حالانکہ یہ عمل اور عقیدہ کفر اور سراسر نقصان والا ہے۔

ہاں، اس کا پروردگار اس کو دیکھ رہا تھا (15)	بَلَىٰ ۝۱۵ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۝۱۵

یعنی: ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتا ہے، بلکہ بہت جلد اپنے پروردگار کی طرف لوٹے گا، اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اور اس کا رب اس کے اعمال سے باخبر ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس کی جدوجہد اور کوشش کو خوب جانتا ہے، اس کی حالت سے واقف ہے اور اس کے چھپے اور کھلے معاملات کو دیکھتا ہے، اور دنیا میں اس کی حالت کے بارے میں کوئی چیز

اس سے پوشیدہ نہیں رہتی، اور اب اس کے تمام اعمال، قول و فعل اور اس کے کردار کا احتساب ہوگا اور سزا دی جائے گی۔

تفہیم القرآن کے مفسر کہتے ہیں کہ: یہ خدا کے انصاف اور حکمت کے خلاف تھا کہ جو کرتوت وہ کر رہا تھا ان کو وہ نظر انداز کر دیتا اور اسے اپنے سامنے بلا کر کوئی باز پرس اس سے نہ کرتا۔

"بَصِيرًا" بصیر: دلی ادراک کی طاقت، اس کے مقابل بصر ہے۔

بصر: ظاہری آنکھ، بصیرت: دل کی آنکھ، یعنی وہ قوت جو انسان کو اچھائی اور بُرائی، حق اور باطل کے تمیز کرنے میں مدد دیتی ہے۔

حیوانات فقط "عین" رکھتے ہیں، اور انسان عین کے علاوہ بصیرت بھی رکھتے ہیں، اس وجہ سے مکلف ہیں۔

محترم قارئین:

مبارک آیات (16 سے 25) تک میں قیامت کے واقع ہونے اور یقینی ہونے کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

اصطلاحات اور لغات کی تشریح :

"لا أقسم" حلف، قسم کھاتا ہوں (واقعہ/75) (حاقہ/38) (معارج/40)

"الشَّقْ" مغرب کے افق میں آسمان کے کنارے پر سرخی، جو کہ سورج غروب ہونے کے وقت نظر آتی ہے۔

اس سورت میں "شَقْ" سے مراد ہے رات کے شروع میں وہ روشنی جس میں ہلکی سی تاریکی کی آمیزش ہو، شَقْ کا ظہور دنیا میں بدلاؤ اور گہری تبدیلی کی کیفیت کے بارے میں بتاتا ہے، دن کے اختتام اور رات کے آغاز کا وقت ہے، ایک خاص خوبصورتی ہے اس میں، اور سب سے ہٹ کر مغرب کی نماز کا وقت ہے، خدا نے اس پر قسم کھائی ہے تاکہ ہر کسی کو آسمانی خوبصورتی کے اس مظہر کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کیا جائے۔

"وَسَقَّ" لپیٹنا، جمع کیا۔

"إِشْقَ" جمع کیا گیا، جمع ہو کر درست ہو جائے، گول اور مکمل ہو جائے، اس سے مراد ہے چودھویں رات کی چاند کی روشنی کا مکمل ہوجانا، اس حالت میں چاند کی ایک خاص چمک ہوتی ہے اور خوبصورت نظارہ ہوتا ہے۔

"لَتَرْكَبُنَّ" ایک حالت سے یقینی دوسری حالت کی طرف جاؤ گے: یعنی ایک صورتحال کے بعد دوسری صورتحال سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا۔

"يُكْذِبُونَ" فعل مضارع کا لانا استمرار کے لیے ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کفار اپنے انکار اور تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں۔

"يُوعُونَ" چھپاتے ہیں، وہ دلوں میں چھپاتے ہیں، اور دل میں لے لیتے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں: معارج: 18) (حاقہ: 12) اور سورہ فرقان۔

ترجمہ اور تفسیر:

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝۱۶	پس میں قسم کھاتا ہوں شفق کی (16)

(لا) قسم کی تاکید کے لیے آتا ہے، یعنی افق کی سرخی جو غروب آفتاب کے بعد نمودار ہوتی مؤ کداً قسم کھاتا ہوں۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں: شفق ایسی سفیدی جو سرخی مائل ہو، اس کو نرم اور نازک ہونے کی بنا پر شفق کہا جاتا ہے، تو پھر شفق، شفقت سے لیا گیا ہے۔

وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝۱۷	اور قسم ہے رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے (17)

یعنی: رات نے جو کچھ اپنے ساتھ جوڑا ہے، اور لاکر سمیٹ لیا ہے، کیونکہ رات دن میں بکھرنے والوں کو اکھٹا کرتی ہے، جو کاروبار کے حصول میں ہرطرف بکھرے ہوئے ہیں، اسی طرح جب رات ہوتی ہے تو سب کچھ اپنے مسکن اور ٹھکانے پر جمع ہوجاتے ہیں۔

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝۱۸	اور چاند کی قسم جب کامل ہو جائے (18)

اَسْأَقِ مَاہ: چاند کا بھر جانا اور مکمل ہوجانا، اس حالت کو "بدر" کہا جاتا ہے، اور یہ قمری مہینے کے درمیان ہوتا ہے، اللہ تین چیزوں کی تاکید کے لیے سخت اور شدید قسم کھاتا ہے۔

- 1 - شفق: یعنی مغرب کے بعد کی سرخی جو عشاء تک رہتی ہے۔
- 2 - رات اور ہر وہ چیز جو رات میں واقع ہوتی ہے، اور ہر وہ چیز جو رات کو مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے۔
- 3 - چاند، جب کہ مکمل بدر اور چودھویں کا ہوجائے۔

کہ تم ضرور ہی ایک حالت سے دوسری
حالت کو چڑھتے جاؤ گے (19)

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝۱۹

"طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" مختلف حالات اور درجات کو یکے بعد دیگرے طے کرے گا: وہ یہ کہ تو نطفہ ہوگا، پھر جما ہوا خون، پھر گوشت کا لوٹھڑا، پھر زندہ پھر موت، پھر دوبارہ زندگی، کبھی بھی ایک حالت پر باقی نہیں رہے گا۔

مفسر آلوسی فرماتے ہیں: ایسی آفات کا سامنا ہوگا جن میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ مشکل اور سخت ہے، یہ احوال: ڈر اور خوف، جو مشتمل ہیں موت اور اس کے بعد کے واقعات پر، جیسے قیامت کے دن کا خوف اور اس سے پیدا ہونے والی پریشانیاں۔ (روح المعانی، 3/82)

مفسر طبری کہتے ہیں: یعنی قیامت کے خوف اور ڈر کی وجہ سے وہ پریشان کن صورتحال دیکھتے ہیں۔ (تفسیر طبری، 40/80)

تفہیم القرآن میں ہے کہ: یعنی تمہیں ایک حالت پر نہیں رہنا ہے، بلکہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے برزخ، برزخ سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدان حشر، پھر حساب و کتاب پھر جزا و سزا کی بے شمار منزلوں سے لا زمائتمہیں گزرنا ہوگا، اس حقیقت کے اثبات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے:

ایک سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سرخی دوسری دن کے بعد رات کی تاریکی اور اس میں ان بہت سے انسانوں اور حیوانات کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلے رہتے ہیں، اور چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدر کامل بننا، گویا چند وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی اعلانیہ شہادت دے رہی ہے

کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے اندر کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے، بلکہ ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہر طرف پائی جاتی ہے، لہذا کفار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موت کی آخری ہچکی کے ساتھ معاملہ ختم ہو جائے گا۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾	تو ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے (20)

ان کو کیا ہوا ہے جو خدائے واحد اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ ان کے سامنے ثبوت رکھے گئے ہیں، دلائل قائم کیے گئے ہیں، حجتیں بیان کی گئی ہیں، اور استدلال کے طریقے واضح کئے گئے ہیں؟ جی ہاں! وحدانیت کے ثبوت موجود ہیں، الوہیت کی نشانیاں ظاہر، اور ربوبیت کے آثار واضح ہیں۔

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿٢١﴾	اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے (21)

سر تسلیم خم نہیں کرتے اور خدائے رحمان کے سامنے سجدہ نہیں کرتے، اس معجزے والے کلام کو سننے کے بعد انہیں اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے سے کس چیز نے روکا ہے؟ قرآن کی تلاوت کے دوران ان کے سجدہ اور سر تسلیم خم کرنے کی راہ میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں؟ یا یہاں پر سجدے سے مراد وہی مشہور و معروف سجدہ تلاوت ہے، جیسا کہ امام ابو حنفیہؒ اس آیت کریمہ سے سجدہ تلاوت کے وجوب پر استدلال کرتے تھے، کیونکہ آیت کریمہ میں ان لوگوں کی جو اس کو سنتے ہیں اور سجدہ نہیں کرتے سرزنش کی ہے، علماء کرام کی رائے بھی سجدہ تلاوت کے وجوب پر ہے۔ (تفسیر انور القرآن) تفسیر معارف القرآن میں اس بابرکت آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ سجدہ اور مسجود کے معنی لغت میں جھکنے کے ہیں اور یہ اطاعت شعاری اور فرمانبرداری سے کنایہ ہے، ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ سجدہ سے مراد سجدہ اصطلاحی نہیں، بلکہ اللہ کے سامنے اطاعت کے ساتھ جھکنا، جس کو خشوع و حضوع کہتے ہیں وہ مراد ہے، وجہ اس کی واضح ہے کہ اس آیت میں حکم سجدہ کسی خاص آیت کے متعلق نہیں، بلکہ پورے قرآن کے متعلق ہے، اگر اس سے سجدہ اصطلاحی مراد لیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ

پورے قرآن کی ہر آیت پر سجدہ لازم ہو جو باجماع امت مراد نہیں ہوسکتا، سلف و خلف میں کوئی اس کا قائل نہیں، اب رہا یہ مسئلہ کہ اس آیت کے پڑھنے اور سننے پر سجدہ واجب ہے یا نہیں، تو اگرچہ کسی قدر تاویل کے ساتھ اس آیت سے بھی وجوب سجدہ پر استدلال ہوسکتا ہے، جیسا کہ بعض فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ یہاں القرآن سے مراد پورا قرآن نہیں، بلکہ الف لام عہد کا ہے، اور مراد اس سے خاص یہی آیت ہے، لیکن یہ ایک قسم کی تاویل ہے، جو احتمال کے درجے میں صحیح کہی جاسکتی ہے، مگر اس کا مراد قرآن ہونا ظاہری عبارت سے بعید معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ اس کا فیصلہ روایات حدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابہ کرام کے تعامل سے ہوسکتا ہے، مگر روایات حدیث سجدہ تلاوت کے متعلق مختلف قسم کی آئی ہیں۔

بعض سے وجوب معلوم ہوتا ہے اور بعض سے رخصت، اسی لئے ائمہ مجتہدین کا اس معاملہ میں اختلاف ہے، امام اعظم ابو حنفیہ کے نزدیک اس آیت پر بھی سجدہ واجب ہے، امام اعظم کا استدلال اس کے وجوب پر مندرجہ ذیل احادیث سے ہے:

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو رافع نے فرمایا کہ: میں نے ایک روز عشاء کی نماز حضرت ابو ہریرہ کے پیچھے پڑھی، انہوں نے سورۃ "إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ" کی تلاوت نماز میں کی اور اس آیت پر سجدہ کیا، میں نے ابو ہریرہ سے پوچھا کہ یہ کیسا سجدہ ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں اس آیت پر سجدہ کیا ہے۔

شیخ قرطبی نے ابن عربی سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ آیت بھی آیات سجدہ میں سے ہے، اس کے پڑھنے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہے، مگر ابن عربی جن لوگوں میں مقیم تھے ان میں اس آیت پر سجدہ کرنے کا رواج نہیں تھا، شاید وہ کسی ایسے امام کے مقلد ہوں گے جن کے نزدیک سجدہ واجب نہیں، تو ابن عربی کہتے ہیں کہ: میں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جب کہیں امامت کروں تو سورۃ انشقاق نہیں پڑھتا، کیونکہ میرے نزدیک اس پر سجدہ واجب ہے، اگر سجدہ نہیں کرتا تو گنہگار ہوتا ہوں، اور اگر کرتا ہوں تو پوری جماعت میرے اس فعل کو بُرا سمجھے گی، بلاوجہ اختلاف کیوں

ڈالا جائے، (واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم) (تفسیر معارف القرآن: حضرت علامہ مفتی محمد شفیع عثمانی) (دیوبندی: مترجم: شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف حسین پوری)

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكْذِبُونَ ﴿٢٢﴾	بلکہ کافر تو جھٹلاتے ہیں (22)

حقیقت یہ ہے کہ کافروں نے کتاب الہی کا انکار کیا، اللہ کی کتاب جو کہ اثبات توحید، قیامت، اور جزا و سزا پر مشتمل ہے۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿٢٣﴾	اور خدا ان باتوں کو جو یہ اپنے دل میں چھپاتے ہیں خوب جانتا ہے (23)

اور یہ کفار جو کفر و تکذیب اپنے سینے میں جمع کئے ہوئے ہیں اور وہ چیزیں جو اپنے دل میں چھپاتے ہیں خوب جانتا ہے، خدا تعالیٰ ان مخفی چیزوں سے باخبر ہے اور جو کچھ ان کے سینوں اور نیتوں میں کفر اور تکذیب ہے اور چھپائے ہوئے ہیں علماً احاطہ کیا ہوا ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یُوعُونَ: یعنی عداوت اور دشمنی پیغمبر اور مومنوں کے ساتھ اپنے دلوں میں لئے ہوئے ہیں۔ (البحر: 448/8)

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٤﴾	سو خوشخبری سنا دے ان کو عذاب دردناک کی (24)

اے رسول اللہ! وہ لوگ جو سنتے ہیں اور عمل نہیں کرتے ان کو ایک بڑے عذاب کی خبر دو، قرآن کریم میں یہاں اور دوسری جگہوں پر بشارت کے یہ الفاظ استہزاء پر دلالت کرتے ہیں، ان کو خبر دو کہ درد دینے والا عذاب ان کے انتظار میں ہے، عذاب ان کے سامنے ہے، ان کا ٹھکانہ آگ اور دوزخ ہے۔

"التسہیل" میں ہے کہ: تنبیہ اور ڈرانے کی جگہ خوشخبری دینا کافروں کی سرزنش کے لیے ہے۔ (التسہیل: 188/4)

بشارت:

قرآن کریم اور کتب لغت میں لفظ "بشارت" خوشی اور غم والے خبر دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے، البتہ شواہد کے مطابق ان دونوں میں سے ایک معنی

متعین کیا جاتا ہے (قریشی،) سید علی اکبر قاموس قرآن، جلد 1، صفحہ 194) اگرچہ لفظ بشارت (بشارۃ) قرآن کریم میں نہیں آیا ہے، لیکن اس کے مشتقات کا ذکر ہوا ہے جیسے "بشری": (وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَى لَكُمْ) ترجمہ: "اور اس مدد کو تو خدا نے تمہارے لیے بشارت بنایا" ان آیات اور اسی طرح کی دوسری آیات میں خوشخبری کے لیے استعمال ہوا ہے۔

لیکن قرآن کریم لفظ "بشر" کے دونوں معنی بشارت کے ہیں، جیسے (وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلًّا رِزْقًا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا ۖ قَالُوا هَذَا الَّذِي رِزَقْنَا مِنْ قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۲۵) (سورہ بقرہ: 25)

ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لئے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب انہیں ان میں سے کسی قسم کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل پھل دئیے جائیں گے اور وہاں ان کے لئے پاک بیویاں ہونگی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے"

لفظ "بشر" اس آیت کریمہ میں خوشخبری اور خوشی کے لئے آیا ہے۔

(بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۳۸) (سورہ نساء: 138)

ترجمہ: "(اے پیغمبر) منافقوں (یعنی دو رخے لوگوں) کو بشارت سنا دو کہ ان کے لئے دکھ دینے والا عذاب (تیار) ہے۔"

اور (فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝۲۳)

ترجمہ: "تو ان کو دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنا دو" ان آیات میں لفظ "بشر" کا مطلب غم اور افسوسناک خبر ہے، اور اس لفظ کا استعمال ایک قسم کا استعارہ اور تحکم کے لیے ہے، یعنی: عذاب کے سوا ان کے لیے کچھ بھی

نہیں ہے، کیونکہ کفار اور بت پرستوں کے دلوں میں وعظ اور نصیحت کوئی اثر نہیں کرتی۔

خدا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا : ان کو درد ناک عذاب اور بُرے انجام کی خبر سنا دو، یہ طعنہ اور ملامت کی ایک شکل ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ٥٢	البتہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے (25)

مکمل اور نہ ختم ہونے والا انعام، غم کے بغیر خوشی، اور احسان جتائے بغیر تحفہ تیار ہے، عظیم تحفہ، پسندیدہ نعمت، مکمل فراوانی اور بہت بڑا انعام ان کو دیا جائے گا، اور اس کے علاوہ ان کا بہترین اکرام کیا جائے گا۔

ہمارے رب عظیم نے بعد اس کے کہ بدبختوں کے احوال اور کیفیت بیان کی، اس سورۃ مبارکہ کا ان نعمتوں کے ذکر کے ساتھ اختتام کیا ہے جو نعمتیں نیک لوگوں کو عطا کی ہیں، یہ درحقیقت ایک قسم کی اجمالی توضیح ہے جو کہ سورت کے شروع میں ہے، کیونکہ سورت کے شروع میں بیان ہوا تھا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ دیکھے گا۔

(يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا فَمُلْقِيَةٌ ٥١)

قیامت اور اس کی علامات:

ابو بکر الجزائری مرحوم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے شعبہ تفسیر اور حدیث کے مشہور اساتذہ میں سے ایک ہیں، اپنی کتاب "عقیدۃ المؤمن" میں قیامت کے دن کی اس طرح تعریف و توصیف کرتے ہیں : (ان المراد من يوم القيامة امران: فنا هذه العوالم كلها وانتهاء هذه الحياة بكاملها والثاني إقبال الحياة الآخرة وابتدائها، فدل لفظ اليوم الآخر على آخر يوم هذه الحياة وعلى اليوم الاول والاخر من الحياة الثانية اذ هو يوم واحد لا ثانيه له فيها البتة) قیامت کے دن سے ذیل کے دو امور مراد ہیں :

1۔ تمام کائنات فنا ہو جائے گی، اور اس دنیا کی زندگی کا بالکل خاتمہ ہوگا۔

2 - پھر ایک اور زندگی کی آمد ہوگی، اور اس کا باقاعدہ آغاز ہوگا، آخرت کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ دن دراصل اس زندگی کا آخری اور آنے والی زندگی کا پہلا اور آخری دن ہوگا، پہلا اور آخری اس لئے کہ ابتداء سے انتہاء تک یہ کامل ہوگا، اس کا کوئی دوسرا دن نہ ہوگا۔

پس لفظ آخرت سے مراد دنیا کی زندگی کا آخری دن اور دوسری زندگی کا پہلا اور آخری دن ہے، کیونکہ قیامت کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے: (هو الحادثة الكونية العظمى التي تطوى عندها السموات والارض وينتشر فيها النظام الكوني)

قیامت کا ایک عظیم کونی واقعہ ہے، جس میں زمین و آسمان لپیٹ دیے جائیں گے، اور موجودہ کائنات کا نظام اس دن منتشر ہو جائیگا۔

ابو بکر بن ابی الدنیا مقداد بن أسود سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن سورج لوگوں سے ایک میل یا دو میل (سلیم بن عامر حدیث راویوں میں سے کہتے ہیں کہ: مجھے نہیں معلوم میل سے مراد مسافت ہے یا وہی میل ہے جس سے آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں) نزدیک ہو جائے گا، اور لوگ اس کی گرمی میں اپنے اعمال کے مطابق پسینہ میں ڈبوئے ہوں گے، کسی کو پاؤں کے اوپر تک، کسی کو گھٹنوں تک، اور کسی کو کمر تک، اور کسی کو گلے تک، اور کچھ پیشانی تک پسینے میں ہوں گے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "اور ایک گروہ وہ ہے جن کو یہ پسینہ گھیر لے گا اور غرق کر لے گا" (مسلم اور ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے)

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات طرح کے آدمی ہوں گے جن کو اللہ اس دن اپنے سایہ میں جگہ دے گا، جس دن اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا؛ انصاف کرنے والا بادشاہ، وہ نوجوان جس نے اپنے رب کی عبادت میں جوانی بسر کی، تیسرا ایسا شخص جس کا دل ہر وقت مسجد میں لگا رہتا ہے، چوتھے دو ایسے شخص جو اللہ کے لیے باہم محبت رکھتے ہیں، اور ان کے ملنے اور جدا ہونے کی بنیاد یہی (اللہ کے لیے محبت) ہے، پانچواں وہ شخص جسے کسی باعزت اور حسین عورت نے (برے ارادے سے) بلایا، لیکن اس نے کہہ دیا کہ

میں اللہ سے ڈرتا ہوں، چھٹا وہ شخص جس نے صدقہ کیا، مگر اتنے پوشیدہ طریقے سے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا، ساتواں وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور (بے ساختہ) آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

یہ سب اس وقت ہوگا جب لوگ تنگ جگہ میں تکلیف میں ہوں گے، ایک تھکا دینے والی اذیت ناک جگہ، سوائے ان کے جن پر خدا رحم کرے اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس دن کو ہمارے لیے آسان بنا دے اور اس دن کی سختیوں سے ہمیں محفوظ فرمادے۔ (آمین)

اور جب لوگ اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو زمین کو مختلف انداز میں دیکھیں گے، اس کے پہاڑ ہموار ہو گئے ہوں گے، اس کے ٹیلے ختم، اس کی شکل بدل گئی ہوگی، دریا سوکھ گئے ہوں گے، درخت جڑ سے اکھڑ گئے ہوں گے، سمندر ابل پڑیں گے، نشیبی علاقے اور اونچائیاں ایک جیسی ہو گئی ہوں گی، شہر اور گاؤں تباہ ہو گئے ہوں گے، زلزلے آئے اور زمین نے اپنا مواد باہر پھینک دیا ہوگا، تو انسان پوچھے گا: زمین کو کیا ہوا ہے؟

اور آسمان بھی اسی طرح تبدیل ہوا ہوگا، اور ستارے بے نور ہو کر تتر بتر ہو گئے ہوں گے، اور آسمان پھٹ کر ٹکرے ٹکرے ہو گیا ہوگا، اور فرشتے سب جگہ کو گھیرے ہوئے اور چاند سورج اکھٹے ہو کر تاریک ہو گئے ہوں گے۔

ابو بکر ابن عیّاش ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: "جب لوگ اپنی قبروں سے باہر نکلیں گے، دیکھیں گے کہ نہ یہ زمین پہلے والی زمین ہے اور نہ یہ لوگ پہلے والے لوگ ہیں، جن کو یہ پہلے جانتے تھے"

رب تعالیٰ فرماتے ہیں: (يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمُوتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۴۸) (سورہ ابراہیم: 48)

ترجمہ: "جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دئیے جائیں گے) اور سب لوگ خدائے یگانہ و زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔"

(يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۝۴۹ وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝۵۰ فَوَيْلٌ لِلْمُصَدِّقِينَ ۝۵۱) (طور: 9 تا 11)

ترجمہ: "جس دن آسمان لرزے لگے کپکپا کر۔ اور پہاڑ اُڑنے لگے اور ہوکر۔ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے خرابی ہے۔"

(فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝۳۷ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝۳۸ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ ۝۳۹ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝۴۰) (سورۃ الرحمن: 37 تا 40)

ترجمہ: "پھر جب آسمان پھٹ کر تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائیگا ((تو) وہ کیسا ہولناک دن ہوگا۔) تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اس روز نہ تو کسی انسان سے اس کے گناہوں کے بارے میں پرسش کی جائیگی اور نہ کسی جن سے۔ تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟"

(فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۴۱ وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ۝۴۲ وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهِمْ ۝۴۳ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمْنِيَةٌ ۝۴۴ يَوْمَئِذٍ تَعْرَضُونَ لَا تَخْفَى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝۴۵) (الحاقہ: 15 تا 18)

ترجمہ: "تو اس روز ہو پڑنے والی (یعنی قیامت) ہو پڑے گی۔ اور آسمان پھٹ جائے گا وہ اس دن کمزور ہو گا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر (اُتر آئیں گے) اور تمہارے پروردگار کے عرش کو اُس روز اُٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔ اس روز تم پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہ رہے گی۔"

صحیحین میں سہل ابن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن لوگوں کو ایک سفید اور ہموار زمین میں جمع کیا جائے گا، جہاں کوئی اونچی جگہ نہیں ہوگی۔

امام احمد عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں: فرماتی ہیں کہ میں نے ہی سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا: (يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّهْوَتِ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۴۸) (سورہ ابراہیم: 48)

اے اللہ کے رسول! لوگ اس حالت میں کہاں ہوں گے؟ فرمایا! صراط پر۔ (امام مسلم اور ابن ماجہ نے بھی اسے روایت کیا ہے)

مسلم دوسری روایت میں ثوبان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم سے روایت کرتے ہیں: علماء یہود میں سے ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اندھیرے میں پل صراط کے نزدیک"

قیامت سے متعلق آیات قرآن کریم کی بیشتر سورتوں میں موجود ہیں امام احمد ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص چاہتا ہے کہ قیامت کو قریب سے دیکھے، تو وہ "سورۃ التکویر"، "انفطار"، "انشقاق" اور سورہ ہود پڑھے، (امام احمد نے عبد الرازق سے اور عبد اللہ بن یحیٰ اور صنعانی اور اس نے عبد اللہ بن یزید صنعانی سے اور اس نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے)

اسرافیل، جو سور پھونکنے پر مامور فرشتہ ہے، خدا کی اجازت سے دو بار نرسنگھا پھونکے گا، پہلی بار دنیا اور زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کو ختم کرنے اور قیامت کے آغاز کے لیے زمین و آسمان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے لیے اور دوسری بار قبروں سے انسان اور دیگر مخلوقات کے اٹھنے اور محشر کی طرف جانے اور اعمال نامے حاصل کرنے اور خدا سے روبرو ہونے کے لیے ہے۔

(وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۖ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَالسَّمُوتُ مَطْوِيَّتٌ بِيَمِينِهِ ۗ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝۶۰ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمُوتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ ۚ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ ۝۶۱ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِئَتْ بِالسَّابِقِينَ وَالشُّهَدَاءُ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۶۲ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝۶۳) (سورۃ الزمر: 67 تا 70)

ترجمہ: "اور انہوں نے خدا کی قدر شناسی جیسی کرنی چاہیے تھی نہیں کی۔ اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ اور وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک اور عالی شان ہے۔ اور جب صور پھونکا جاوے گا تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بیہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر جس کو خدا چاہے۔ پھر دوسری

دفعہ پھونکا جائے گا تو سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور (اعمال کی) کتاب (کھول کر) رکھ دی جائیگی اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور بے انصافی نہیں کی جائے گی۔ اور جس شخص نے جو عمل کیا ہوگا اس کو اس کا پورا پورا بدلہ مل جائیگا اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اس کو سب کی خبر ہے۔"

لیکن قیامت کے دن کی سختیاں اکثر کفار کے لیے خاص ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں خدا کی آیات کا انکار کیا، درحقیقت انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، کیونکہ وہ کفر کر کے انہوں نے خود کو رب تعالیٰ کے قہر اور غضب اور عذاب کا مستحق بنا لیا تھا، حالانکہ دنیا میں ان کو ڈرایا گیا تھا۔

رب تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ۝ وَكُلُّ اَتُوَّةٍ دٰخِرِيْنَ ۝ وَتَرٰى الْجِبَالَ تَحْسِبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۝ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِىْ اَتَقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۝ اِنَّهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۝) (النمل: 87 تا 88)

ترجمہ: "اور جس روز صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمانوں اور جو زمین میں ہیں سب گھبرا اٹھیں گے مگر وہ جسے خدا چاہے۔ اور سب اس کے پاس عاجز ہو کر چلے آئیں گے اور تم پہاڑوں کو دیکھو گے تو خیال کرو گے کہ (اپنی جگہ) پر کھڑے ہیں مگر وہ (اُس روز) اس طرح اڑے پھرینگے جیسے بادل۔ (یہ) خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ بیشک وہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔"

(فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ فَذٰلِكَ يَوْمَ يَؤْمَرُ عَسِيْرٌۢ ۝ عَلٰى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝) (سورہ مدثر: 8 تا 10)

ترجمہ: "جب صور پھونکا جائے گا۔ وہ دن مشکل کا دن ہوگا۔ (یعنی) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔"

امام احمد ابن عباس سے نقل کرتے ہیں: وہ آیت: "فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ" کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: تم اس وقت کیا کرو

گے جب نرسنگھا پھونکنے کا ذمہ دار اسے ہاتھ پکڑے، اپنی پیشانی کو آگے لاکر اس پر پھونکنے کے لیے خدا کے حکم کا انتظار کر رہا ہو؟

صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ہم کیا کہیں؟ فرمایا: (حسبنا اللہ ونعم الوکیل، علی اللہ توکلنا)

ترجمہ: "اللہ ہمارے کافی ہے، اور کیا خوب کارساز ہے، ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں"

پس پہلی بار صور پھونکنے پر موجودہ نظام تخلیق تباہ ہو جائے گا دھماکے کی شدت سے تمام موجودات مر جائیں گی، آسمان اور زمین اپنے فطری راستوں سے نکل جائیں گے اور ایک آن میں زلزلہ آئے گا، اور یہ تمام حوادث اور واقعات صرف آغاز ہوگا خدا کی طرف واپسی اور حساب و کتاب کرنے کے لیے قیامت کے دن۔

پھر چالیس سال کی مدت کے بعد صور دوبارہ پھونکا جائے گا، اور تمام مُردے اٹھائیں جائیں گے خواہ ان کی موت کا وقت کچھ بھی ہو، اور وہ حیران و پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھیں گے ان تبدیلیوں کی وجہ سے جو انہیں نظام تخلیق میں نظر آئیں گی، اور یہ وہ جگہ ہے جہاں مجرم اپنی تباہی اور بدبختی اور روسیاهی کو دیکھ لیں گے اور دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھاگیں گے، اور بالآخر ننگے بدن اور ننگے پاؤں محشر کی طرف روانہ کیے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کتنی خوبصورتی سے اس کو ایک جملے میں بیان فرماتے ہیں:

(مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۚ) (سورہ طہ: 55)

ترجمہ: "اسی (زمین) سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے۔"

قیامت کے دن ضروری سوالات

انسانوں سے ان معبودوں کے بارے میں پوچھا جائے گا جن کی وہ عبادت کرتے تھے، ان سے پوچھا جائے گا کہ پیغمبروں کی دعوت قبول کی تھی کہ نہیں، انسانوں سے ان کے کئے ہوئے اعمال اور دنیا میں جن نعمتوں سے فائدہ

اٹھایا تھا اور عہد و معاہدوں اور کان، آنکھ اور ان کے دلوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔

1 - کفر اور شرک:

یہ نہیں بھولنا چاہیے، قیامت کے دن انسانوں سے جو اہم ترین سوال پوچھا جائے گا وہ کفر و شرک کے بارے میں ہوگا، ان سے ان کے معبودوں کے متعلق پوچھا جائے گا، رب تعالیٰ فرماتا ہے: (وَقِيلَ لَهُمْ آيِنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ هَلْ يَنْصُرُونَكُمۡ اَوْ يَنْتَصِرُونَ ﴿٩٣﴾) (سورۃ الشعراء: 92 تا 93)

ترجمہ: "اور اُن سے کہا جائے گا کہ جن کو تم پوجتے تھے وہ کہا ہیں؟ یعنی جن کو خدا کے سوا (پوجتے تھے) کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں یا خود بدلہ لے سکتے ہیں۔"

(وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٩٢﴾) (سورۃ القصص: 62)

ترجمہ: "اور جس روز خدا ان کو پکارے گا اور کہے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کا تمہیں دعویٰ تھا۔"

(اے مشرکوں! اب تو سارے حجاب اور پردے ہٹ چکے، اور حساب و کتاب کا وقت اور پکڑ دھکڑ اور بے بسی کا وقت آپہنچا ہے، اور پکارو ان بتوں اور جنوں اور انسانوں میں سے ان کو جنہیں تم خدا جیسا بنا کر عبادت کرتے تھے، تاکہ تمہیں اللہ کی پکڑ اور عذاب سے آزاد کر دیں، انسانوں سے پوچھا جائے گا کہ وہ خدا کے سوا کس کی عبادت کرتے تھے، اور یہ کہ جانور اور مختلف عطیات باطل معبودوں کے لیے پیش کرتے تھے، پوچھے جائیں گے۔

(وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۚ تَاللّٰهِ لَتَسْتَخْلَنَ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿٥٦﴾) (سورۃ النحل: 56)

ترجمہ: "اور ہمارے دئیے ہوئے مال میں سے ایسی چیزوں کا حصہ مقرر کرتے ہیں جن کو جانتے ہی نہیں۔ (کافرو) خدا کی قسم کہ جو تم افترا کرتے ہو اس کی تم سے ضرور پرسش ہوگی۔"

(وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ٥١ فَعِمَيْتَ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءَ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ٥٢ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ٥٣ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ٥٤ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ٥٥ سُبْحَنَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ٥٦) (القصص: 65 تا 68)

ترجمہ: "اور جس روز خدا ان کو پکارے گا اور کہے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا۔ تو وہ اس روز خبروں سے اندھے ہو جائیں گے اور آپس میں کچھ بھی پوچھ نہ سکیں گے۔ لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو امید ہے کہ وہ نجات پانے والوں میں ہو۔ اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) برگزیدہ کر لیتا ہے۔ اُنکو اس کا اختیار نہیں ہے۔ یہ جو شرک کرتے ہیں خدا اس سے پاک و بالاتر ہے۔"

2 - انہوں نے دنیا میں کیا کیا ہے؟

انسان سے دنیا میں اس کے کئے ہوئے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا: (فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ٩٢ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٩٣) (سورة الحجر: 92 تا 93)

ترجمہ: "تمہارے پروردگار کی قسم ہم اُن سے ضرور پرسش کریں گے۔ اُن کاموں کی جو وہ کرتے رہے۔"

(فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ٥٦) (سورة الاعراف: 6)

ترجمہ: "تو جن لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم اُن سے بھی پرسش کریں گے (کیا آسمان سے لائے گئے پیغام تمہاری طرف پہنچائے گئے تھے کہ نہیں؟) اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے (کیا رب کا پیغام لوگوں تک پہنچایا کہ نہیں؟) اور جواب میں لوگوں سے اس کے حکم کے بارے میں کیا سنا اور کیا دیکھا؟"

قیامت کے دن کوئی بھی ایک قدم ادھر ادھر نہیں ہوسکتا، جب تک اس سے چار چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے:

- 1 - اپنی عمر کے بارے میں کہ اس نے کہاں گنوائی؟
- 2 - اپنے علم کے بارے میں کہ اس نے اس پر کیا عمل کیا؟
- 3 - اپنے جسم کے بارے میں کہ کہاں کھپا یا؟
- 4 - اپنے مال کے بارے میں کہاں سے کمایا اور کہاں لگایا؟

سنن ترمذی میں عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لا تزول قدم ابن آدم یوم القیامة من عند ربہ، حتی یسأل عن خمس: عن عمرہ فیم أفناہ؛ وعن شبابہ فیم أبلاہ؛ وعن مالہ من أين اکتسبہ، وفیم أنفقہ، وماذا عمل فیما علم)

"روز قیامت ابن آدم کے پاؤں اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے پاس سے نہیں کھسک سکیں گے، جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے:

- 1 - اس نے اپنی عمر کہاں فنا کی؟
- 2 - اپنی نوجوانی کہاں کھپائی؟
- 3 - مال کہاں سے اور کیسے کمایا؟
- 4 - اور مال و دولت کہاں خرچ کی؟
- 5 - اس نے اپنے علم کے مطابق کتنا عمل کیا؟

مذکورہ حدیث میں جو قابل غور بات ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو مال و دولت جمع کرنے میں احتیاط کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس لیے کہ انسان کا مال جتنا زیادہ ہوگا، اس کے مطابق اس کے بارے میں زیادہ پوچھ گچھ اور محاسبہ کا دورانیہ لمبا ہوگا۔

اور اس کا مال جتنا کم ہوگا، اس کے حساب کا وقت اتنا ہی کم ہوگا، اور اسے جلد از جلد جنت میں لے جایا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إن فقراء المهاجرين یسبقون الأغنیاء، یوم القیامة إلى الجنة بأربعین خریفاً)

"مہاجر فقراء جنت میں مالدار مہاجر وں سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے"
3 - وہ نعمتیں جن سے فائدہ حاصل کیا جاتا تھا :

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان نعمتوں کے متعلق جو انسان کو اس دنیا میں دی ہیں فرماتا ہے: (ثُمَّ لَنَسْأَلَنَّهُ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝٨) (التكاثر: 8)

ترجمہ: "پھر اُس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی"

مراد درج ذیل نعمتیں ہیں:

بھرا پیٹ، ٹھنڈا پانی، گھر اور رہائش، جسم اور روح کی ساخت میں توازن۔
 سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ: حتی کہ شہد کے ایک گھونٹ کا بھی سوال کیا جائے گا۔

مجاہد کہتے ہیں: دنیا کی تمام لذتیں پوچھ گچھ اور حساب کتاب میں شامل ہوں گے۔

حسن بصریؓ فرماتے ہیں: صبح و شام ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں: نعمت سے مراد ہے : جسم کی صحت، آنکھ اور کان، (تفسیر ابن کثیر: 364/7)

نعمتوں کی جو قسمیں شمار کی گئیں وہ نعمتوں کی تشریح میں تنوع کی وجہ سے ہیں، وگرنہ خدا کی نعمتیں بے شمار ہیں، ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا: (وَإِنْ تَعْدُوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا ۝٣٤) (سورہ ابراہیم: 34)

بعض نعمتیں ضروری ہیں اور بعض نعمتیں تکملہ میں سے ہیں، اسی طرح نعمتوں کے سلسلے میں لوگ بھی ایک جیسے نہیں ہیں، لوگ ایک زمانہ میں ایسی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں گے جو نہ اس سے پہلے موجود تھیں اور نہ بعد میں ہونگی۔

ایک نعمت ایک علاقے میں پائی جاتی ہے جو دوسرے علاقے میں نہیں پائی جاتی، انسان کو ان تمام نعمتوں کے متعلق مسئول قرار دیا گیا ہے۔

سنن ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إِنْ أَوَّلَ مَا يَسْأَلُ الْعَبْدَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ النِّعَمِ أَنْ يَقَالَ لَهُ: أَلَمْ نَصْحَكَ لِكِجْسَمِكَ؟ وَنُرْوِكَ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ) (مشكاة المصابيح: 656/2: 1596)

قیامت کے دن نعمتوں کے بارے میں انسان سے جو سب سے پہلا سوال پوچھا جائے گا وہ یہ ہے: کیا تجھے صحیح اور سالم جسم نہیں دیا تھا؟ اور ٹھنڈے پانی سے تجھے سیراب نہیں کیا تھا؟

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی عظیم اور قیمتی نعمتوں کو نہیں سمجھتے جو ان کو دی گئی ہیں، ایک گھونٹ پانی، اور ایک نوالہ کھانا، رہائش، بیوی اور بچے کی قدر نہیں جانتے، بلکہ صرف خوبصورت گھر، محلات، باغات اور نت نئی ماڈل کی گاڑیوں کو ہی نعمتیں سمجھتے ہیں۔

ایک شخص نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے سوال کیا اور کہا: کیا ہم مہاجر فقراء میں سے نہیں ہیں، عبد اللہ نے اس سے پوچھا: تمہاری بیوی ہے کہ تو اس کے پاس جائے؟ کہا: ہاں ہے، پھر پوچھا: رہنے کے لیے گھر ہے؟ کہا: ہاں ہے، عبد اللہ بن عمرو نے کہا: پھر تو تم مالداروں میں سے ہو، اس شخص نے کہا: اس کے علاوہ میرے کچھ نوکر بھی ہیں، عبد اللہ بن عمرو نے کہا: تو آپ کا شمار بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم: 2285/4) اس کا نمبر: (2979)

صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: الصَّحَّةُ وَالْفَرَاغُ) دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ اپنا نقصان کرتے ہیں: ایک تندرستی، دوسری فراغت۔

حدیث کا معنی یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس نعمت کا شکر ادا کرنے اور اس کی قدر و قیمت جاننے میں کوتاہی کرتی ہے، اور اس کے مطابق اور تقاضا پر عمل نہیں کرتی، اور جو شخص اس کے مقتضا پر جو اس پر واجب ہے عمل نہ کرے وہ خسارے میں ہوگا۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لا بأس بالغنی لمن اتقى الله عز وجل، والصحة لمن اتقى الله خير من الغنى، وطيب النفس من النعيم)

"مال اس شخص کے لیے نقصان دہ نہیں جو اللہ سے ڈرنے والا (متقی) ہو، جب کہ متقی کے لیے صحت مال سے بہتر ہے، اور خوش گوار طبیعت اللہ کی نعمتوں میں سے ہے"

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (يلقى (الرب) العبد فيقول: أى فلان، ألم أكرمك، وأسودك، وأزوجك، وأسخر لك الخيل والإبل، وأذكرك ترأس وتربع؟ فيقول: بلى، قال: فيقول: أفضنت أنك ملاقي؟ قال: فيقول: لا، فيقول: فإني أنساك كما نسيتني، ثم يلقى الثاني فيقول: أى فل، ألم أكرمك، وأسودك، وأزوجك، وأسخر لك الخيل والإبل، وأذكرك ترأس وتربع؟ فيقول: بلى، أى رب، فيقول: أفضنت أنك ملاقي؟ فيقول: لا، فيقول: فإني أنساك كما نسيتني، ثم يلقى الثالث، فيقول له مثل ذلك، فيقول: يا رب آمنت بك وبكتابك وبرسلك وصليت وصمت وتصدق، ويثنى بخير ما استطاع، فيقول: ههنا اذن.

قال: ثم يقال له: الآن نبعث عليك شاهداً عليك، ويتفكر في نفسه، من ذا يشهد على؟ فيختم الله على فيه، ويقال لفخذة ولحمه وعظامه: انطقي فتنتطق فخذة ولحمه وعظامه بعمله. وذلك ليعذر من نفسه. وذلك المنافق الذي يسخط الله عليه)

"جب بندہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا، تو حق تعالیٰ سوال کرے گا بندے سے: اے فلاں بندے! بھلا میں نے تجھ کو عزت نہیں دی، اور تجھے سردار نہیں بنایا، اور تجھ کو تیرا جوڑا نہیں دیا، اور گھوڑوں اور اونٹوں کو تیرا تابع نہیں کیا، اور تجھ کو چھوڑا کہ تو اپنی قوم کی ریاست کرتا، اور خوشحال رہتا؟ تو بندہ کہے گا: سچ ہے،" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو حق تعالیٰ فرمائے گا: بھلا تجھ کو معلوم تھا کہ تو مجھ سے ملے گا؟ سو بندہ کہے گا کہ نہیں، تو حق تعالیٰ فرمائے گا کہ اب ہم بھی تجھ کو بھولتے ہیں (یعنی تیری

خبر نہ لیں گے اور نہ تجھ کو عذاب سے بچائیں گے) جیسے تو نے ہم کو بہلایا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ دوسرے بندے سے حساب کرے گا تو کہے گا: اے فلاں! بہلا میں نے تجھ کو عزت نہیں دی اور تجھ کو سردار نہیں بنایا، اور تجھ کو تیرا جوڑا نہیں دیا، اور گھوڑوں اور اونٹوں کو تیرا تابع نہیں کیا، اور تجھ کو چھوڑا کہ تو اپنی قوم کی سرداری کرتا، اور خوشحال رہتا؟ تو بندہ کہے گا: سچ ہے اے میرے رب! پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بہلا تجھ کو معلوم تھا کہ تو مجھ سے ملے گا؟ تو بندہ کہے گا کہ نہیں، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: سو میں بھی اب تجھے بہلا دیتا ہوں، جیسے تو نے مجھ کو دنیا میں بہلایا تھا۔

پھر تیسرے بندے سے حساب کرے گا اس سے بھی اسی طرح کہے گا: اے رب! میں تجھ پر ایمان لایا اور تیری کتاب پر اور تیرے رسولوں پر اور میں نے نماز پڑھی، روزہ رکھا، صدقہ دیا اسی طرح اپنی تعریف کرے گا جہاں تک اس سے ہوسکے گا، حق تعالیٰ فرمائے گا: دیکھ یہیں تیرا جھوٹ کھل جاتا ہے، "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر حکم ہوگا اب ہم تیرے اوپر گواہ کھڑا کرتے ہیں، بندہ اپنے جی میں سوچے گا کہ کون مجھ پر گواہی دے گا، پھر اس کے منہ پر مہر لگ جائے گی اور حکم ہوگا اس کی ران سے کہ بول، تو اس کی ران کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے اعمال کی گواہی دیں گی، اور یہ گواہی اس واسطے ہوگی تاکہ اس کا عذر باقی نہ رہے اس کی ذات کی گواہی سے، اور یہ شخص منافق یعنی جھوٹا مسلمان ہوگا اور اس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرے گا۔"

نعمت کے بارے میں سوال، دراصل ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا سوال ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہیں، جب بھی انسان شکر ادا کرتا ہے، درحقیقت اس نے نعمت کا حق ادا کر دیا ہے، لیکن اگر وہ ناشکری کرے اور نعمت کی قدر نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس پر غضب کرے گا۔

صحیح مسلم میں سیدنا انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ لِيرْضَىٰ عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَأْكُلَ الْأَكْلَةَ، فَيُحْمَدُهُ عَلَيْهَا، أَوْ يَشْرِبَ الشَّرْبَةَ فَيُحْمَدُهُ عَلَيْهَا)

"بیشک اللہ تعالیٰ تو اپنے بندے سے اتنی بات پر راضی ہو جاتا ہے کہ وہ ایک لقمہ کھائے اور (اس پر) اس کی تعریف کر دے یا پانی کا ایک گھونٹ پیے اور اس پر اللہ کی حمد و ثنا بیان کر دے۔"

عہد اور میثاق:

خدا تعالیٰ لوگوں سے اس عہد کے متعلق جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے پوچھ گچھ کرے گا، آیت: (وَلَقَدْ كَانُوا عَاهِدُوا لَآلِهَتِهِمْ مِنْ قَبْلُ لَا يُؤْلُونَ إِلَّا ذَبَابًا ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۝۱۵) (الاحزاب: 15) ترجمہ: "حالانکہ پہلے خدا سے اقرار کرچکے تھے کہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور خدا سے (جو) اقرار (کیا جاتا ہے) اس کی ضرور پرسش ہوگی۔

ہر وہ عہد و معاہدہ جو جائز اور شرع کے مطابق ہو انسانوں کے درمیان طے ہوتا ہے، اس کو پورا کرنے یعنی اس پر وفا کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں بھی پوچھ گچھ ہوگی، فرماتے ہیں: (وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝۳۴) (الاسراء: 34) ترجمہ: "اور عہد و میثاق (جو خدا یا لوگوں کے ساتھ باندھا ہے) پورا کرو، کیونکہ تم لوگوں سے (قیامت کے دن) عہد و میثاق کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

کان، آنکھ اور دل:

اللہ تعالیٰ انسانوں سے ان تمام باتوں کے بارے میں پوچھے گا جو باتیں انہوں نے کی ہیں، یہیں پر انسانوں کو بعیداز علم اور ثبوت کے بغیر گفتگو کرنے سے منع کیا ہے: (وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝۳۶) (الاسراء: 36) ترجمہ: "اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باس پرس ہوگی۔"

قتادہ فرماتے ہیں کہ: ان چیزوں کے متعلق جو تم نے دیکھا ہے، سنا ہے یا نہیں سنا ہے، جانتے یا نہیں جانتے کچھ مت کہنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سب کے بارے میں تجھ سے پوچھے گا۔

ابن کثیر کہتے ہیں: اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے بغیر علم و سند اور ثبوت کے بات کرنے سے منع فرمایا ہے،

حتیٰ کہ گمان اور شک والی بات کو بھی جائز نہیں کہا ہے: (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبَ بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيْحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝۱۲) (سورۃ الحجرات: 12)

ترجمہ: "اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا ڈر رکھو بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

حدیث میں ہے کہ: (إياكم والظن فإن الظن أكذب الحديث) "بد گمانی سے بچتے رہو، کیونکہ بد گمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے"

سنن ابو داؤد میں ہے کہ: انسان کی سب سے بُری عادت یہ ہے کہ شک اور گمان سے بات کرے، اور دوسری حدیث میں ہے کہ: (إن أفرى الفرى أن يرى الرجل عينيه مالم تريا) "سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ اپنی آنکھ کو وہ دکھائے جو اس نے دیکھا نہ ہو"

ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ: (من تحلم حلماً كلف يوم القيامة أن يعقد بين شعيرتين وليس بفاعل) (تفسیر ابن کثیر: (308/4) "جو شخص ایسا خواب دیکھنے کا دعویٰ کرے، جو اس نے دیکھا نہ ہو، تو اسے جو کے دو دانوں کے درمیان گرہ لگا کر جوڑنے کا پابند کیا جائے گا اور ہرگز (ایسا) نہ کر پائے گا۔"

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة البروج

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے یہ بائیس (22) آیتوں پر مشتمل ہے۔

وجہ تسمیہ:

برجوں والے آسمان پر رب تعالیٰ کی قسم کھانے کی وجہ سے اس کام نام بروج رکھا گیا، اسی طرح بعض تفاسیر میں اس سورت کے نام: "البروج" اور "وَالسَّهَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ" بھی ہیں، اس سورت کا آغاز تشدد اور ظلم و جبر کرنے والے گروہ کے جرائم کے ذکر سے کیا گیا ہے، جو ایک گہری خندق اور کھڈا کھودتے، اور اس میں بڑی آگ جلاتے، اور مؤمنوں کو اس بڑی خوفناک آگ میں جلانے کی دھمکی دیتے تھے، اور جو ایمان لانے سے باز نہیں آتا اس کو آگ میں ڈال دیتے، عظیم رب بھی ان سے جہنم کی شدید آگ کا وعدہ کرتا ہے، جس کا موازنہ اس دنیا کی آگ سے نہیں کیا جاسکتا۔

سورة البروج کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد:

سورة البروج مکی سورتوں میں سے ہے، اس کا ایک (1) رکوع، پچیس (25) آیتیں، ایک سونو (109) الفاظ، چار سو چوبتر (474) حروف، اور دو سو چار (204) نقطے ہیں۔

(اس بات کا ذکر کرنا لازم ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد گننے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة البروج کا سورة الانشقاق سے ربط و مناسبت:

الف: دونوں سورتیں "السماء" پر قسم سے شروع ہوتی ہیں۔

ب: دونوں سورتیں مؤمنوں کو اچھائی کا وعدہ دیتی ہیں، کفار کو عذاب الہی سے ڈراتی ہیں، اور دونوں میں قرآن کریم کی شان و عظمت پر بحث کی گئی ہے۔

ج: پچھلی سورت کہتی ہے: خدا تمام مشرکوں کے دلوں سے واقف ہے کہ وہ پیغمبر اور مؤمنوں سے بغض اور دشمنی رکھتے ہیں، اور انہیں مسلسل ذہنی اور جسمانی اذیت دیتے ہیں، اور وہ چالوں، حیلہ اور جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں، چنانچہ سورة البروج بتاتی ہے کہ پچھلی نسلوں کی کافر قوموں کا بھی یہی حال تھا۔

سورة البروج کی فضیلت:

ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز میں سورہ "بروج" اور "والسّماء والطارق" کی تلاوت فرماتے تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سورہ کے نزول کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اور پیروکاروں کو کفار کی اذیت اور تکلیف پہنچانے کے خلاف تسلی دینا ہے، اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ پچھلی امتوں کے کافر بھی اہل مکہ کی طرح الہی دعوتوں کے خلاف لڑنے والے اور حق کو جھٹلانے میں یکساں تھے: یمن میں اصحاب اخدود کی طرح، فرعون، قوم ثمود وغیرہ۔

لیکن رب تعالیٰ نے ان سے انتقام لیا، کیونکہ وہ خدا عزوجل کے قبضہ قدرت میں تھے، تو اسی طرح وہ اسلام کے دشمنوں اور متحارب منکروں سے انتقام لے گا، اس لئے کہ وہ بھی اس اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

سورة البروج کے نزول کا وقت:

سورة بروج کا عمومی موضوع خود وضاحت کرتا ہے کہ یہ سورت مکہ معظمہ کے اس دور میں نازل ہوئی ہے، جس وقت مسلمانوں کے خلاف شدید ظلم و ستم جاری تھا، اور کفار مسلمانوں کو بدترین اذیتیں دے کر ایمان اور اسلام کی راہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔

سورة البروج کا سبب نزول:

اس سورت کا سبب نزول جو کہ اصحاب اخدود کے گرد گھومتی ہے مختصراً یہ تھا: کہ کفار یہود کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ جس کا نام زرعہ بن تبار أسعد حمیری تھا، اور ذونواس سے مشہور و معروف تھا، کو خبر ملی کہ اس کے رعایا دین یہودیت کو چھوڑ کر دین اسلام یا نصرانیت پر ایمان لائی ہے، پھر قبیلہ حُمیر سے ایک لشکر لیکر ان کے پاس گیا، اور انہیں گرفتار کر لیا، کہ یا تو یہودی بنے یا پھر آگ میں جلائے جائیں گے، ان کو اختیار دیا، لیکن مؤمنوں

نے آگ کو چُن لیا، پھر آگ کے گڑھے کھودے گئے اور ان میں آگ بھڑکا کر
مؤمنوں سے کہا: تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے اسے رہا
کر دینگے، اور جو اپنا دین نہ چھوڑے اسے اس آگ میں ڈال دینگے، وہ مؤمنین
صابر اور ثابت قدم رہے بالآخر انہیں آگ میں ڈالا گیا، جب کہ وہ ظالم بادشاہ اس
منظر کا نظارہ کر رہا تھا، منقول ہے کہ ان مؤمنین میں سے بارہ (12)، بیس (20)
یا ستر (70) ہزار افراد شہید کیے گئے، کہتے ہیں کہ ذونواس قبیلہ حمیر کا آخری
بادشاہ ابن کثیر کے قول کے مطابق مشرک تھا۔

سورۃ بروج سے متعلق معلومات:

یہ سورت مکی سورتوں میں سے ایک ہے جو اسلامی عقیدے پر بحث کرتی
ہے، اس سورت کا عمومی مواد دشمنوں کے مقابلے میں مؤمنوں کی حوصلہ
افزائی، اور انہیں ثابت قدم رہنے اور مزاحمت کرنے کی ترغیب دینا ہے۔

اس سورت کی بحث کا محور اخدود کے مؤمنوں کا قصہ ہے، جو بہادری، ایثار
اور قربانی کی واضح مثال ہے، "اصحاب اخدود" وہ لوگ ہیں جنہوں نے خندقیں
اور گڑھے کھودے اور ان میں بہت بڑی آگ جلائی، اور مؤمنوں کو آگ سے
اذیت دینے کی دھمکی دی، اور بہت سے مومنوں کو آگ میں جلایا لیکن وہ
ایمان سے پیچھے نہیں ہٹے، سورت کی شروع میں آسمان کی قسم کھائی گئی
ہے، جس میں حیرت انگیز ستارے اور ان کے بڑے بڑے مدار ہیں، جن میں
افلاک تیرتے ہیں۔

اور مشہود کے عظیم دن یعنی روز قیامت پر قسم کھائی گئی ہے، پیغمبروں اور
مخلوقات پر قسم کھائی گئی ہے کہ مجرمین نیست و نابود اور جڑ سے ختم
ہو جائیں گے، وہ مجرمین جو دین چھڑانے کے لیے مؤمنوں کو آگ میں ڈال دیتے
تھے۔

"وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝۲ وَشَهِيدٍ مَّشْهُودٍ ۝۳" اس کے بعد اس سورت
میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکتا
ہے، ان مجرموں سے جو خدا کے بندوں اور دوستوں کو تکلیفیں دیتے ہیں۔

"إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۲ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۝۱۳ وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝۱۵"
سورت کے اختتام میں ظالم فرعون کا واقعہ اور ان آزمائشوں اور آفات کا ذکر
ہے جو فرعون اور اس کی قوم پر سرکشی اور بغاوت و طغیان کی وجہ سے

آئی تھیں: "هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ" ۱۰۱، فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ۱۰۲، بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۱۰۳، وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۱۰۴، بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ۱۰۵، فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ۱۰۶" یہ ایک عمدہ اختتام ہے جو سورت کے موضوع سے مکمل مناسبت رکھتا ہے۔

اصحاب اخدود:

محدثین اور اہل سیر نے اصحاب اخدود کا واقعہ مختلف روایات کے ساتھ لکھا اور نقل کیا ہے، اس واقعے کا خلاصہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے جس میں اس سورہ کے نزول کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے۔

سیرت لکھنے والے لکھتے ہیں: ابن عباسؓ کی ایک روایت کے مطابق "یمن میں بادشاہ یوسف ذونواس" کے دور بادشاہت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت سے تقریباً "70" سال پہلے ایک کابن، اور دوسری روایت میں ہے کہ ایک ماہر جادوگر رہتا تھا۔

اہل سیر لکھتے ہیں کہ: یہ ماہر جادوگر شدید بیمار ہو گیا تو یہ "یوسف ذونواس" کے پاس گیا، اور اس سے عرض کی کہ میں ایک لاجلاج اور شدید قسم کی بیماری میں مبتلا ہوا ہوں، میری موت کا وقت قریب آچکا ہے، لہذا مہربانی فرما کر ایک ایسا نوجوان میرے حوالے کر دیں کہ میں اسے جادو سکھا دوں، بادشاہ نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ ایک ہوشیار اور ذہین نوجوان تلاش کر کے ساحر کی خدمت میں دیدو، درباریوں کو مطلوبہ نوجوان مل گیا اور اسے جادوگر کے حوالے کر دیا: مؤرخین نے اپنی روایت میں اس نوجوان کا تعارف "عبداللہ بن تامر" کے نام سے کیا ہے، جادوگر کے حکم کے مطابق یہ نوجوان ہر روز سحر اور جادو کی تربیت کے لیے شاہی محل جایا کرتا تھا، ایک دن راستے میں ایک راہب اور مسیحی عالم (اس زمانے میں مسیحی دین حق تھا) کے وعظ و نصیحت سے واسطہ پڑا، یہ نوجوان راہب کے وعظ و نصیحت سننے کے بعد اللہ کے دین کی حقیقت جان گیا، بالآخر مسلمان ہو گیا، اللہ نے اسے ایسا کامل اور مضبوط ایمان عطا فرمایا کہ اس نے ایمان کی خاطر لوگوں کی اذیتیں برداشت کیں، نوجوان (عبداللہ بن تامر) اس دن کے بعد وہ روزانہ اس عابد و عالم کے حلقہ وعظ و نصیحت میں اس کے معبد جایا کرتا تھا، اور اس روحانی عالم کے ساتھ طویل عرصے تک رہنے اور ان کے مفید وعظ و نصیحت سے فائدہ اٹھانے میں دلچسپی رکھتا تھا، رب تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ جادوگر کے پاس جانے میں اسے تاخیر ہوجاتی، کیونکہ وہ کافی دیر تک راہب

کے پاس رہتا، ساحر اسے سزا دیتا یہاں تک کہ اسے مارتا اور پیٹتا، نوجوان نے عیسائی راہب سے شکایت کی، اور اسے شاہی دربار کے جادوگر کے ہاتھوں مار پیٹ کے بارے میں بتایا، راہب نے اس نوجوان سے کہا: میرے بیٹے! جب جادوگر پوچھے کہ تم نے دیر کیوں کی تو کہو کہ کچھ لوگوں نے مجھے روکا تھا، اور جب گھر والے پوچھیں کہ کیوں دیر سے گھر آتے ہو تو کہو: جادوگر نے مجھے روکا تھا۔

نوجوان اسی آمد و رفت میں مصروف تھا کہ ایک دن دیکھا کہ ایک بہت بڑا اور خوفناک شیر لوگوں کا راستہ روکے ہوئے تھا، اور لوگوں کو تباہ کرنا چاہتا تھا، نوجوان نے کہا میں آج معلوم کرتا ہوں کہ راہب کا وعظ و نصیحت حق پر ہے یا جادوگر کا کام، پھر نوجوان نے ایک پتھر اٹھایا اور کہا: "یا اللہ" اگر آپ کے نزدیک راہب کا کام زیادہ مقبول ہے تو اس پتھر سے اس شیر کو ہلاک کر دے، اور اسے شیر کے سر پر مارا اور اسے قتل کر دیا، لوگوں کو اس درندہ شیر کے شر سے نجات دلادی، نوجوان نے اس واقعے کی اطلاع راہب کو دی، راہب نے اس نوجوان سے کہا: میرے بیٹے! تم بہت جلد پکڑے جاؤ گے، اور جب گرفتار ہو جاؤ تو میری خواہش ہے کہ میرے بارے میں ان کو کچھ نہ بتانا، اس نوجوان نے اس کے بعد سے بیماریوں کا علاج کرنا شروع کر دیا، اور کوڑھی، اور برص جیسے بیماریوں کا علاج کیا جس سے وہ شفایاب ہو گئے۔

(جزام ایک خطرناک بیماری ہے جو عام طور پر *mycobacterium leprae* نامی جراثیم کی وجہ سے ہوتی ہے، اس بیماری کی واضح علامات ہوتی ہیں جن کے سب سے زیادہ اثرات جسم کے اعصابی حصوں اور بیمار شخص کے جلد کے حصوں پر دیکھے جاتے ہیں)۔

ایک دن بادشاہ سے وابستہ ایک شخص جو کہ نابینا تھا اس نوجوان کے پاس گیا اور اس سے تقاضہ کیا کہ اس کی آنکھیں ٹھیک کر دے، نوجوان نے کہا: میں کسی کو شفاء نہیں دے سکتا، بلکہ وہ عظیم رب ہے جو شفاء دینے والا اور بخشنے والا ہے، اگر تو اللہ پر ایمان لاتا ہے تو میں اللہ سے دعا کروں گا کہ تیری بینائی واپس کر دے، اور میں اس معاملے میں اپنے رب سے دعا مانگوں گا، وہ نابینا آدمی یہ بات سن کر ایمان لایا، تو نوجوان نے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اسے شفا عطا کر، جب یہ شخص شفایاب ہو کر صحیح آنکھوں کے ساتھ بادشاہ یوسف دنوئاس کے دربار میں حاضر ہوا، اور اپنی آنکھوں کی شفایابی کا ماجرا

بادشاہ کے حضور بیان کیا، بادشاہ نے اس شخص سے پوچھا کہ تجھے کس نے شفا دی؟ اس شخص نے کہا: میرے رب نے۔

بادشاہ نے کہا: میں نے۔

شخص نے کہا: نہیں میرے اور تیرے رب نے۔

بادشاہ نے کہا کیا میرے علاوہ بھی تیرا کوئی خدا ہے؟

اس شخص نے کہا: جی ہاں میرا پروردگار اور تیرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، بادشاہ نے اپنے ماتحتوں کو اسے گرفتار کرنے اور سزا دینے کا حکم صادر کر دیا، کافی تشدد اور سزا کے بعد اس شخص نے نوجوان کے بارے میں بتادیا جس کی دعا سے شفایاب ہوا تھا، بادشاہ نے اس نوجوان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا اور اسے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا، نوجوان سے بادشاہ نے پوچھا کہ: تو بے جو جزام اور برص کی بیماریوں کو شفا دیتا ہے؟

نوجوان نے کہا: میں کسی کو شفا نہیں دیتا، بلکہ میرا رب شفاء دیتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: کیا میرے علاوہ تیرا کوئی اور رب ہے؟

نوجوان نے کہا: جی ہاں میرا اور تیرا رب۔

پھر بادشاہ نے اسے پولیس کے حوالے کیا پولیس نے اس پر تشدد کیا کہ پہلے معلّم کا پتہ بتا دے، نوجوان پر حد سے زیادہ تشدد کیا یہاں تک کہ اس نے راہب کے بارے میں بتادیا، شاہی دربار کے غنڈوں (اہلکاروں) نے راہب کو گرفتار کر کے اس پر ایسا غیر انسانی تشدد کیا کہ اس کا سر بھی آرے سے کاٹ دیا اور جسم کو دو ٹکڑے کر دیا، اور نوجوان سے کہا گیا کہ اپنے دین سے پلٹ جاؤ، نہیں تو ایسے ہی تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا، نوجوان نے تسلیم ہونے اور اپنا راستہ چھوڑنے سے انکار کر دیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ کچھ لوگ اسے پکڑ کر فلاں پہاڑی پر لے جائیں، اگر اپنے دین سے پھر جائے تو اسے آزاد کر دیں، اگر اپنا دین نہ چھوڑے تو اسے پہاڑی کے اوپر سے ایک گہری وادی میں پھینک دیں۔

اہل سیر مزید لکھتے ہیں کہ: مقررہ وقت آ پہنچا، درباری محافظ نوجوان کو پکڑ کر پہاڑی پر لے گئے، جب نوجوان پہاڑ کی چھوٹی پر پہنچا تو دست بہ دعا ہوا: اے پروردگار! مجھے ان کے شر سے نجات دے، کہتے ہیں کہ اس دعا کے ساتھ پہاڑ لرزنے لگا، اور تمام محافظین درّے کی گہرائی میں پھینک دیے گئے اور ہلاک ہو گئے، اور نوجوان صحیح سلامت بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور

بادشاہ سے کہا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے سارے محافظوں کو ہلاک کر دیا، بادشاہ نے دوسری بار اپنے محافظوں کو حکم دیا کہ اس کو پکڑ کر سمندر کی تیز موجوں کے درمیان غرق کر دو، بادشاہ کے محافظ نوجوان کو ایک کشتی میں بٹھا کر سمندر کی گہرائی کی طرف روانہ ہو گئے، محافظین نے جب نوجوان کو سمندر کے بیچ میں پھینکنا چاہا تو نوجوان نے پھر دعا کی: اللہ مجھے ان ظالموں کے شر سے نجات دے، اسی دوران کشتی سمیت تمام شر پسند ڈوب گئے، اور وہ نوجوان صحیح سلامت بادشاہ کے پاس آگیا، بادشاہ نے پوچھا محافظوں کا کیا بنا؟ تو اس نوجوان نے کہا کہ میرے رب نے اُن سب کو سمندر میں غرق کر کے ہلاک کر دیا، اور پھر نوجوان نے بادشاہ کی طرف پلٹ کر کہا: تم مجھے قتل نہیں کر سکو گے یہاں تک کہ جو کچھ میں کہوں گا اس پر عمل نہ کر لو۔

بادشاہ نے کہا کیا کروں، نوجوان نے کہا: لوگوں کو اکھٹا کرو، اور مجھے کھجور کے تنے سے باندھو، پھر میرے تیر کش میں سے ایک تیر نکالو اور کمان میں ڈالو اور کہدو: اس نوجوان کے پروردگار اور خدا کے نام پر، پھر کمان کو کھینچو اور تیر مجھے مارو تو میں مرجاؤں گا، یہ بات سننے کے بعد بادشاہ نے لوگوں کو جمع کیا اور نوجوان کو درخت سے باندھ دیا، اور اس کے تیر کش میں سے ایک تیر نکال کر کمان میں ڈالی اور کہا: اس نوجوان کے "اللہ کے نام پر" اور تیر چھوڑ دیا تیر کمان سے نکل کر اس کی پیشانی پر جا لگا، اس طرح اس مؤمن نوجوان کو شہادت کا درجہ نصیب ہوا، اور حاضرین کو ایمان، موقع پر موجود تمام لوگ یک صدا ہو کر پکارنے لگے "ہم اس نوجوان کے رب پر ایمان لے آئے" بادشاہ کے ساتھی اور اس کے محافظین یہ منظر دیکھ کر بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: دیکھا جس چیز کا تجھے ڈر تھا وہی ہوا، تمام لوگ اس جہاں کے خدا پر ایمان لے آئے۔

اس صورت حال پر بادشاہ کو غصہ آیا اور انہیں حکم دیا کہ گہری کھائیاں کھود کر ان میں آگ جلا دو، ہر وہ شخص جو اس نوجوان کا دین چھوڑ دے اسے آزاد کیا جائے اور جو بھی اس نوجوان کے دین کا معتقد و مؤید ہو اسے ان خندقوں اور آگ کے گڑھوں میں جلا دیں، اس دوران مؤمنین کی بڑی تعداد آگ میں جلا دی گئی (مؤرخین نے اس آگ کا شکار ہونے والوں کی تعداد 12 سے 20 کے لگ بھگ کا بتائی ہے)۔

سیرت نگار مزید لکھتے ہیں کہ: اس دن رب نے مؤمنین کو ایسی طاقت اور استقامت بخشی کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے ایمان کو چھوڑنے پر راضی نہ

ہوا اور آگ کے گڑھوں میں گرنا قبول کیا، لیکن اپنے دین اور عقیدے سے انکار نہیں کیا، کہتے ہیں کہ ایک خاتون کی گود میں بچہ تھا، جس کی وجہ سے اس عورت نے اس آگ میں جانے سے انکار کر دیا، تو گود والے بچے نے اس سے کہا: امی جان! صبر کرو کیونکہ تو حق پر ہے۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ: محمد بن اسحاق سے روایت ہے: حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ضرورت کے پیش نظر جس جگہ عبداللہ بن تامر دفن کیا گیا تھا کھدائی ہوئی، وہاں سے عبداللہ بن تامر کا جسد صحیح سلامت باہر نکلا، اسے غسل دیے بغیر ہی دفن کر دیا گیا تھا، اور اس کا ہاتھ اس زخم پر رکھا تھا جہاں تیر لگا تھا، وہاں موجود افراد میں سے ایک نے اس کا ہاتھ ہٹایا تو اس سے خون بہنے لگا، پھر ہاتھ کو دوبارہ اس جگہ پر رکھا تو خون بند ہو گیا، اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر "اللہ ربی" کا لفظ کندہ تھا۔

والی یمن نے اس واقعے سے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی، حضرت عمرؓ نے جواب میں کہا اس کو اسی حالت میں انگوٹھی سمیت دوبارہ دفن کیا جائے۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں اہل ایمان کو آگ کے گڑھے میں جلانے کے واقعات ایک نہیں تھے، بلکہ ایسے دو یا تین اور واقعات دوسرے علاقوں میں بھی رونما ہوئے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ یمن میں (جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ستر سال پہلے کا ہے) ہوا جس کو قرآن کریم کی اس سورت میں بیان کیا گیا ہے وہ ملک یمن میں خندق نجران ہے۔

اس واقعے کو بیان کرنے کا عمومی مقصد:

اس واقعے کا عمومی اور حتمی مقصد یوں بیان ہو سکتا ہے کہ:

- 1- ان مؤمنین کی پہچان جو دوسروں کے عذاب اور ایذا رسانی کے مقابلے میں صبر اختیار کرنے والے ہیں۔
- 2- کافروں کو ڈرانا اور دھمکانا، تاکہ وہ جان لیں کہ ان کے ظلم کے بعد انہیں کس طرح کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سورة البروج

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝۲ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۝۳ قَتِيلَ أَصْحَابِ الْأُخْدُودِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ۝۵ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝۶ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝۷ وَمَا نَقَبُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنَّ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝۸ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝۹ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝۱۰ إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝۱۱ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۝۱۲ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝۱۳ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۴ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۝۱۵ وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ۝۱۶ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝۱۷ فَعَالٌ لِمَ يُرِيدُ ۝۱۸ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۝۱۹ فِرْعَوْنُ وَثَمُودُ ۝۲۰ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۝۲۱ وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝۲۲ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ۝۲۳ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ۝۲۴

سورت کا لفظی ترجمہ

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝۱	برجوں والے آسمان کی قسم (1)
وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝۲	اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے (2)
وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۝۳	ہر شاہد اور مشہود پر (3)
قَتِيلَ أَصْحَابِ الْأُخْدُودِ ۝۴	کہ خندقوں کے (کھودنے) والے ہلاک کردئیے گئے (4)
النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ۝۵	آگ سے بھری ہوئی خندقیں بھرپور ایندھن والی (5)
إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝۶	جبکہ وہ اُن (کے کناروں) پر بیٹھے ہوئے تھے (6)

اور وہ لوگ جو کچھ مؤمنوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے (7)	وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝
ان کو مؤمنوں کی یہی بات بُری لگتی تھی کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے جو غالب اور قابل ستائش ہے (8)	وَمَا نَقْمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝
وہی جس کی آسمانوں اور زمین میں بادشاہت ہے، اور خدا ہر چیز سے واقف ہے (9)	الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝
بیشک جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر تشدد کیا، پھر انہوں نے توبہ نہیں کی ان کے لیے دوزخ کا عذاب اور جلنے کا عذاب ہے (10)	إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝
بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کے لیے باغات ہیں جن کے قصروں کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، یہ بے بڑی کامیابی (11)	إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۝ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝
بیشک تمہارے پروردگار کی پکڑ بڑی سخت ہے (12)	إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝
وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ (زندہ) کریگا (13)	إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۝
اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے (14)	وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ۝
عرش کا مالک بڑی شان والا (15)	ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝
جو چاہتا ہے کر دیتا ہے (16)	فَعَالٌ لِّبَاطِرٍ ۝

ہل اَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۝۱۷	بھلا تم کو لشکروں کا حال معلوم ہوا ہے (17)
فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ۝۱۸	(یعنی) فرعون اور ثمود کا (18)
بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۝۱۹	لیکن کافر (جان بوجھ کر) تکذیب میں (گرفتار) ہیں (19)
وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝۲۰	اور خدا (بھی) ان کو گردا گرد سے گھیرے ہوئے ہے (20)
بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝۲۱	(یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے (21)
فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝۲۲	لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) (22)

مختصر تفسیر

محترم قارئین:

آیات مبارکہ (1 تا 11) میں اصحاب اخدود اور جزاء و سزاء جیسے موضوعات سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

لغات اور اصطلاحات کی تشریح:

"ذَاتِ الْبُرُوجِ" برجوں والے، ستاروں اور کہکشاؤں کا برج، یا بارہ مشہور برج ہیں، جن میں سے ہر ایک زمین کی مخلوقات سے مشابہت رکھتا ہے، ان میں سے چھ خطِ استواء کے شمال میں واقع ہیں: حمل، ثور، جوزاء، سرطان، اُسد، سنبلہ، (بہار اور گرمی کا موسم) اور خطِ استواء کے جنوب میں دوسرے چھ: میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت (خزاں اور جاڑے کا موسم)۔

کہا جاتا ہے کہ: سورج تین مہینوں میں پہلے تین شمالی برجوں سے گزرتا ہے، جو کہ بہار کا موسم ہے، اور اگلے تین مہینوں میں دوسرے تین برجوں سے گزرتا ہے جو کہ موسم گرما ہے، اس کے علاوہ پہلے تین جنوبی برجوں سے

تین مہینوں میں گزرتا ہے جو کہ خزاں کا موسم ہے، اور دوسرے تین جنوبی
برجوں سے دوسرے تین مہینوں میں سفر کرتا ہے جو کہ سردیوں کا موسم ہے۔

لیکن چاند ان میں سے ہر ایک برج کو دو یا تین دن میں طے کر لیتا ہے اس
لیے چاند کی اٹھائیس منزلیں ہیں، جبکہ دو راتوں تک چھپا رہتا ہے۔

عربی زبان میں "بروج" کا دوسرا معنی: قصور: قصر کی جمع ہے۔

"الْيَوْمِ الْمَوْعُودِ" روزِ قیامت ۔

"شَاهِدٍ" گواہ، گواہی دینے والا ۔

"مَشْهُودٍ" گواہی کا سبب، جو گواہی دیدی گئی ہو، واقع شدہ، گواہی کا سبب بنا
ہو۔

"قُتِلَ" قتل ہو، نفرت ہو، نیست و نابود ہو۔

"أَصْحَابِ الْأُخْدُودِ" خندقوں کی آگ کے مالکان، انسانوں کو جلانے والے بھٹی کے
مالکان، اذیت دینے والے، گڑھے اور خندقوں والے۔

"أُخْدُودٍ" بڑا گڑھا اور خندق، ایک بڑی مستطیل کھائی، اس کی جمع "أُخَادِيدُ"
ہے۔

"ذَاتِ الْوُوقُودِ" آگ کے ایندھن کے مالکان۔

"الْوُوقُودِ" لکڑی، بھڑکانے والا ایندھن، جس سے آگ جلائی جاتی ہے (وَقُودُهَا
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ: بقرہ/23)، (أُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ: آل عمران:10)، (وَقُودُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ: تحریم:6)

"قُعُودٍ" قاعد کی جمع، بیٹھے ہوئے۔

"شُهُودٍ" شاہد کی جمع، گواہ، آتش زنی اور جرائم کا نظارہ کرنے والا۔

"وَمَا تَقْهَمُوا" انہوں نے بدلہ نہیں لیا، کوئی عیب نہیں دیکھا، کوئی بُرا کام نہیں دیکھا۔

"الْحَمِيدُ" تعریف کیا گیا، تعریف کے لائق

"فَتَنُوا" ہراساں کیا، ادیتیں دیں، مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔

"الْحَرِيقُ" جلانے والا

"الْفَوْزُ" کامیابی، نجات، فتح۔

سورة البروج کا ترجمہ و تفسیر:

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝۱	برجوں والے آسمان کی قسم (1)

یا اس آسمان کی قسم جو منازل والا ہے، (چاند، سورج، ستارے ان منازل میں مکمل نظم و ضبط کے ساتھ متحرک ہیں) اور اس میں سورج، چاند، ستاروں کے بھی منازل ہیں جو ایک ترتیب کے ساتھ چل رہے ہیں، سورج، چاند اور ستاروں اور نظام شمسی کی حرکت اللہ تعالیٰ کی قدرت، اور رحمت کے کمال اور علم و حکمت کی وسعت کی نشاندہی کرتی ہے۔

مفسرین میں سے کثیر تعداد جیسے: ابن عباس، مجاہد، قتادہ، حسن بصری، ضحاک اور سدی کے نزدیک البروج سے مراد آسمان کے عظیم الشان تارے اور سیارے ہیں (تفہیم القرآن)۔

قرآن کریم سیاروں کو آسمان میں رکے ہوئے ٹھہرے ہوئے نہیں سمجھتا، بلکہ ہر سیارے کو اپنی ذاتی حرکت کے مطابق متحرک سمجھتا ہے جیسا کہ سورہ یس آیت (40) میں ہے کہ "وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ" ۝۴۰ "ترجمہ: (اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں) یہاں فلک سے مراد آسمان نہیں، بلکہ ستاروں کے مدار ہیں، جن میں یہ ستارے حرکت کرتے ہیں (مظہری)

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝۲	اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے (2)

اس روز موعود پر جو کہ قیامت کا دن ہے، اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو وعدہ دیا ہے کہ اس دن سب کو ایک جگہ جمع کریگا، رب تعالیٰ کا یہ وعدہ ایسا نہیں ہے کہ تبدیل ہو یا اس کے برعکس عمل ہو، آپ چاہیں یا نہ چاہیں ضرور واقع ہوگا، ایک خاص وقت میں وقوع پذیر ہوگا۔

وَشَٰهِدٍ مَّشْهُودٍ ۝۳	ہر شاہد اور مشہود پر (3)

یہ ہر اس بندے کی حالت کو شامل ہوگا جو اس صفت سے متصف ہو، یعنی: دیکھنے والا اور جو کچھ دیکھا جاتا ہے، اور حاضر و موجود اور جو حاضر ہوا ہے، جس چیز کو ثابت کرنے کے لیے خدا نے قسم کھائی ہے وہ چیزیں ہیں جو اس قسم پر مشتمل ہیں، اور وہ خدا کی عظیم نشانیاں اور اس کا واضح حکم اور اس کی وسیع رحمت ہے۔

ایک قول کے مطابق: شاہد جمعہ کا دن ہے، ہر عمل کرنے والے کے عمل پر جو اس دن کیا ہے گواہی دیتا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ، فرشتے، پیغمبر اور انبیاء، جسمانی اعضاء (گواہی دینے والے)۔

اور "مشہود" عرفہ کا دن ہے، کہ لوگ اس میں مناسک حج کے گواہ ہیں، اور فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں یا "مشہود" سے مراد: وہ عجائبات ہیں جو قیامت کے دن لوگ دیکھیں گے (تفسیر انوار القرآن)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ: حضرات مفسرین کرام "الشاہد والمشہود" کے متعلق اختلاف رائے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے اس کے بارے میں سولہ (16) اقوال اپنی تفسیر میں بیان کیے ہیں۔

اس طرح ایک اور روایت میں ہے: شاہد یعنی: قیامت کا دن، مشہود: عرفہ کا دن، ایک اور قول ہے: شاہد یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مشہود یعنی روز قیامت۔

ایک اور قول ہے: "شاہد" یعنی: انسانی اعضاء، "مشہود" یعنی: بنی آدم، صاوی فرماتے ہیں: بہتر یہ ہے کہ اسے عام بیان کیا جائے، کیونکہ یہ نکرہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے تاکہ ہر شاہد اور مشہود کو شامل ہو (صفوة التفاسیر)۔

قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُحُدِ ۝۴	کہ خندقوں کے (کھودنے) والے ہلاک کر دیئے گئے (4)

کہا گیا ہے جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ" یعنی: (خندق والے برباد ہو جائیں) خندق والے کافر قوم تھی جس کے ساتھ مؤمنوں کی ایک جماعت رہ رہی تھی، کفار نے چاہا کہ مؤمن اپنے دین سے پھر جائیں اور ان کے دین میں شامل ہو جائیں لیکن مؤمنوں نے کفار کے دین میں شامل ہونے سے انکار کر دیا، تب کفار نے خندقیں کھودی زمین میں اور مسلمانوں کو سزا دینے اور جلانے کی غرض سے اس میں آگ جلائی۔

قرطبیؒ کہتے ہیں: "اخذود" سے مراد ایک بڑا گھڑا اور خندق، ایک بڑی مستظیل کھائی ہے جو زمین میں بنائی جاتی ہے، اس کی جمع "اخاذید" ہے۔
"قُتِلَ" کا معنی: نفرت بھیجنا اور اس پر لعنت بھیجنا ہے۔

ابن عباسؒ فرماتے ہیں: قرآن کریم میں جس جگہ لفظ "قُتِلَ" آیا ہو وہ لعنت کے معنی میں ہے۔ (تفسیر قرطبی)

النَّارِ ذَاتِ الْوُقُودِ ۝	آگ سے بھری ہوئی خندقیں بھرپور ایندھن والی (5)

"النَّارِ" نحویوں کی اصطلاح میں "اخذود" سے بدل ہے، یعنی: "قُتِلَ أَصْحَابُ النَّارِ ذَاتِ الْوُقُودِ" یعنی ہلاک ہو جائیں وہ لوگ جو آگ بھڑکانے والے ہیں، "ذَاتِ الْوُقُودِ" یعنی: ایندھن کے مالک، کیونکہ یہ ایندھن ہے جو شعلے کو بھڑکاتا اور متحرک کرتا ہے، وہ آگ جو مسلسل شعلہ ور ہوتی ہے، بجھتی نہیں اس سے لگاتار شعلے بلند ہوتے ہیں۔

ابوسعود کہتے ہیں: اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک بڑی اور بھڑکتی ہوئی آگ تھی، اور لکڑی کی کافی مقدار اس کا ایندھن فراہم کرتی تھی (ابوسعود: 202/5)

إِذْهُمْ عَلَيْهَا قُودٌ ۝	جبکہ وہ اُن (کے کناروں) پر بیٹھے ہوئے تھے (6)

یعنی: جب کافر خندق کے کنارے پر بے فکر بیٹھے مؤمنین کو زندہ جلتے ہوئے اور اذیتوں میں دیکھ رہے تھے، اور وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

یاد رکھیں: گناہ کا مرتکب ہونا ایک مسئلہ ہے، اور سنگدلی اور بے رحمی اور خوشی سے اس کا نظارہ کرنا ایک اور مسئلہ ہے، اہل ایمان پر ظلم و ستم دیکھنے والے ظالموں کو معلوم ہونا چاہئیے کہ: اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

اور وہ لوگ جو کچھ مؤمنوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے (7)	وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝

یعنی: جو ظلم و ستم وہ مسلمانوں پر روا رکھے ہوئے تھے جیسے اسلام سے ارتداد، انہیں آگ میں پھینکتا دیکھ رہے تھے، یعنی انہوں نے ان اذیتوں کا مشاہدہ کیا جو اہل ایمان پر ڈھارہے تھے اور اپنے ان اعمال سے وہ لذت محسوس کر رہے تھے، اور یہ کہ ظالم نفسیاتی طور پر ایسا سنگدل ہوتا ہے کہ وہ کسی کو عذاب اور اذیت میں دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی منطق دھمکی اور انتقام ہے۔

آیت مبارکہ کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے نزدیک ایمان لانا سب سے بڑا جرم ہے، اور وہ لوگ ایمان سے دست بردار ہونے کے علاوہ کسی اور چیز پر راضی نہیں ہوتے لیکن کافروں کو معلوم ہونا چاہئیے کہ مؤمنین کا مددگار رب تعالیٰ ہے جو کہ انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے۔

ان کو مؤمنوں کی یہی بات بُری لگتی تھی کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے جو غالب اور قابل ستائش ہے (8)	وَمَا نَقْمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

یعنی: مؤمنوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان کے علاوہ کوئی بُرائی نہیں دیکھی تھی، ان کے نزدیک مسلمانوں کا اور کوئی جرم و گناہ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ رب تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے تھے، اگر ایمان کا مسئلہ ختم ہوتا تو وہ نہ مسلمانوں کو اذیتیں دیتے اور نہ ان پر ظلم کرتے، اس آیت مبارکہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو آگ میں جلانے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے، جبکہ یہ ایسا گناہ نہیں ہے کہ سزا اور تعذیب کا موجب بنے۔

"نَقْمُوا" نعمت کے مادے سے ہے، یعنی کسی چیز کو ناپسندیدہ اور بُرا سمجھنا، چاہے زبان سے ہو یا انکار اور سزا دینے سے۔

"عَزِيزٌ" اسماء الحسنی، قادر، قوی، وہ سختی اور شدت سے بدلہ لیتا ہے، طاقت کا مالک ہے، کسی کا محتاج نہیں (یہ کفار کے لیے دھمکی ہے)۔

"حَمِيدٌ": محمود، اچھی صفات کا مالک، اور مؤمنوں کو ان کے صبر کا بدلہ دیتا ہے، (از اسماء الحسنی) (بشارت مؤمنوں کے لیے)

وہی جس کی آسمانوں اور زمین میں بادشاہت ہے، اور خدا ہر چیز سے واقف ہے (9)	الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

پروردگار ہر چیز پر گواہ اور ہر کام جانتا ہے، وہ ہر چیز سے باخبر ہے اور ہر چھوٹے بڑے کا احاطہ کیے ہوئے ہے، مؤمنوں کے ساتھ کفار نے جو سلوک کیا اس میں سے بھی کوئی کام اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے، یہ خندق اور گڑھے بنانے والوں کے لیے سخت وعید ہے، اور مؤمنوں کے لیے جو اپنے دین کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوئے اچھا اور نیک وعدہ ہے۔

ان مبارک آیات میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی وہ صفات اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق وہی ذات مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اس لیے جب لوگ ان صفات کی روشنی میں رب تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں تو یہ کفار اس کی وجہ سے پریشان اور مشتعل ہو کر ظلم و ستم کرنے لگتے ہیں۔

بیشک جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر تشدد کیا، پھر انہوں نے توبہ نہیں کی ان کے لیے دوزخ کا عذاب اور جلنے کا عذاب ہے (10)	إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝

یعنی: ان کے لیے ان کے کفر کے عذاب کے علاوہ مزید جلانے والا عذاب ہے مؤمنوں کو جلانے کی وجہ سے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں: رب تعالیٰ کی بے انتہاء رحمت و مہربانی کی طرف دیکھیں باوجود اس کے کہ ان کفار نے اس کے دوستوں کو قتل کیا، لیکن پھر بھی ان کو توبہ اور مغفرت طلبی کی طرف بلاتا ہے۔

"الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ" مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں، کیونکہ تشدد ہونے والوں میں عورتیں بھی تھیں، ایک مؤمن عورت اپنے بچے کی وجہ سے ایمان سے پھر جانے لگی تھی، لیکن چھوٹا بچہ بولنے لگا اور اپنی ماں سے کہا کہ تو حق پر ہے، چنانچہ وہ ماں اپنے ایمان پر قائم رہی اور اسے جلا دیا گیا۔

"ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا" پھر انہوں نے توبہ نہیں کی بلوجود اس کے کہ بدترین تشدد مؤمنوں پر کیا ان کو زندہ آگ میں جلایا، لیکن اگر وہ لوگ توبہ کرتے اور کفر سے پلٹ جاتے تو خدا تعالیٰ ان سب کو بخش دیتا، اور ان کی توبہ قبول فرماتا، سبحان اللہ! ان آیات کے مخاطب قریش ہیں ان کو توبہ کی ترغیب ہے۔

"عَذَابُ جَهَنَّمَ وَعَذَابُ الْحَرِيقِ" حرارت میں جہنم کا جلانے والا عذاب دگنا اور کئی گنا زیادہ ہے دنیا کی آگ سے، اور بڑے موٹے جسم زیادہ عذاب چھکنے کے لیے ہیں۔

یہ اللہ کا قانون ہے جنہوں نے مسلمان مرد اور عورتوں کو ایمان کی وجہ سے ایذائیں دیں اور انہیں ایمان سے پلٹنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی، پھر توبہ نہیں کی، دوزخ کا عذاب ان کے لیے ہے، اس لیے کہ انہوں نے بھی اس دنیا کو اہل ایمان کے لیے اذیت اور تشدد سے جہنم بنایا تھا۔

"وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ" عذاب حریق کیوں؟ اس لیے کہ اصحاب اخدود کی بحث تھی، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ مؤمن کو ایمان کی وجہ سے زندہ آگ میں پھینک دیتے تھے، چنانچہ ان کی سزا ان کے عمل کی جنس سے ہے، آگ کا عذاب ان کے لیے تیار ہے، دوزخ کا عذاب قیامت سے مربوط ہے، اور جلانے والے عذاب کا تعلق دنیا سے ہے۔

تفہیم القرآن کے مفسر لکھتے ہیں: عذاب سے الگ جلائے جانے کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ انہوں نے بھی مظلوم لوگوں کو آگ کے گڑھے میں پھینک کر زندہ جلایا تھا، غالباً یہ جہنم کی عام آگ سے مختلف اور اس سے زیادہ سخت کوئی اور آگ ہوگی جس میں جلائے جائیں گے۔

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کے لیے باغات ہیں جن کے قصروں کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، یہ بے بڑی کامیابی (11)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ
الْكَبِيرُ ۝۱۱

یہ وہی مطلوبہ کامیابی، خوشگوار چیزوں کا حصول، اور وہ تمام اچھی چیزیں حاصل کرنا ہے جو خدا کے فضل سے ہی کسی کے ہاتھ لگتی ہیں۔

یہ مبارک آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہر وہ شخص جس کو کفر پر مجبور کیا جاتا ہے، اس کے لیے یہی زیادہ مناسب ہے کہ ہر مصیبت اور خطرے کے خلاف ثابت قدم رہے اور زیادہ صبر کو اپنا وتیرہ بنائے اگرچہ اس کے لیے کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔

روایت ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابہ رسول کو گرفتار کیا، اور ان میں سے ایک سے کہا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ اس صحابی نے کہا: جی ہاں! تو مسیلمہ نے اسے رہا کیا، پھر دوسرے صحابی سے ایسا ہی پوچھا: لیکن دوسرے صحابی نے اس کے جواب میں کہا: نہیں میں تیرے متعلق ایسی گواہی نہیں دونگا، بلکہ تو جھوٹے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، تو مسیلمہ کذاب نے اس صحابی کو قتل کر دیا۔

جب یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: جس شخص کو مسیلمہ نے رہا کیا اس نے رخصت پر عمل کیا، لہذا اس پر کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن جو شہید کیا گیا، اس نے فضیلت پر عمل کیا، لہذا یہ فضیلت اس کو مبارک ہو (تفسیر انوار القرآن)۔

محترم قارئین:

آنے والی آیات مبارکہ (12 تا 22) میں اس کے بارے میں بحث کی گئی ہے کہ مکمل قدرت کاملہ اور اختیار اللہ کے پاس ہے۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۲ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۝۱۳ وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝۱۵
فَعَالٌ لِّمَآئِرٍ ۝۱۶ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۝۱۷ فِرْعَوْنٌ وَثَمُودُ ۝۱۸ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۝۱۹
وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝۲۰ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝۲۱ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝۲۲

الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح:

"بَطَشَ" غصہ کرنا، سختی اور شدت کے ساتھ پکڑنا، کچلنا، اچانک حملہ کرنا، سخت سزا۔

"يُبْدِي" شروع کرتا ہے۔

"يُعِيدُ" دہرائے گا۔

"الْوَدُودُ" محبت والا۔

"الْمَجِيدُ" شان و شوکت والا، عظمت و عزت والا۔

"الْجُنُودُ" جند کی جمع، سپاہی، فوج، اہلکار۔

"فِي تَكْذِيبٍ" جھوٹ میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان کا کام انکار ہے۔

"مِنْ وَرَاءِ" پیچھے سے، ہر طرف سے۔

تفسیر:

اللہ تعالیٰ مشرکین کے عقاب اور عذاب کو بیان کرنے کے بعد سب سے پہلے مؤمنین کے انعامات بیان کرتا ہے، کیونکہ قرآن کریم مثنائی ہے، کفر اور ایمان کے دونوں پہلوؤں اور عذاب اور ثواب دونوں کے متعلق بحث کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

بیشک تمہارے پروردگار کی پکڑ بڑی سخت ہے (12)	إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۲

یعنی: یقیناً اللہ کا عذاب ان لوگوں پر جو اس کی نافرمانی کرتے ہیں، دوہرا، دگنا اور برداشت سے باہر ہے، اس کی سزا اتنی سخت ہے کہ کوئی آدمی اور کوئی چیز اس کے آگے نہیں ٹھہر سکتی، جب کسی کو پکڑتا ہے تو اس کو تباہ و برباد کردیتا ہے، خصوصاً یہ ظالم اور جابر لوگ جن کا واقعہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔

"بَطْشٌ" شدّت اور سختی سے پکڑنا، چونکہ یہ لفظ خود شدّت کا معنی دیتا ہے، پھر شدید اس کی صفت ہو تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پکڑ سخت سے سخت تر ہے۔

وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ (زندہ) کریگا (13)	إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۝۱۳

لہذا جس میں شروع کرنے اور دہرانے کی صلاحیت ہو اس کا حملہ بھی شدید ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی قدرت و قوت یہ ہے کہ انسان کو پہلی بار پیدا فرما کر وجود میں لایا اور بالآخر دوسری بار بھی زندہ کر کے لوٹائے گا، وہ عدم سے پیدا کرتا ہے اور ہڈیاں بوسیدہ ہونے کے باوجود زندہ کرتا ہے، وہ مارتا ہے اور دوبارہ زندہ کرتا ہے، اس نے پیدا کیا اور برابر کیا، پیدا کیا اور رہنمائی فرمائی ہے۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ پیدا کرنا اور دوبارہ بھیجنا رب عظیم کا ہمیشہ کا کام ہے، واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پیدا کرنے اور دوبارہ لوٹانے میں یکساں ہے۔

اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے (14)	وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ۝۱۴

وہ ذات جو دشمنوں کی پکڑ پر قادر ہے، اپنے دوستوں کے گناہوں کو بخشنے والا بھی ہے، یعنی: رب تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کے گناہوں سے درگزر فرما کر انہیں چھپا دیتا ہے، ان کو ان گناہوں کی وجہ سے رسوا نہیں کرتا، گناہوں سے توبہ کرنے والے اور پشیمان ہونے والے کے لیے بہت زیادہ مہربان اور بخشنے والا ہے، کوتاہی کرنے والے کو معاف کرتا ہے، اسی طرح رجوع کرنے والے سے محبت رکھتا ہے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: جس طرح انسان اپنے بھائی سے محبت کرتا ہے، وہ اسی طرح محبت کرتا ہے اور ان کو خوشخبری دیتا ہے (قرطبی: 294/19)۔

مفسرین اس آیت مبارکہ کے اعجاز میں لکھتے ہیں:

خدا نے لفظ "ودود" کو لفظ "غفور" کے ساتھ اس لیے بیان فرمایا تاکہ اس بات کی دلیل ہو کہ گنہگار لوگ جب بھی اپنے رب کی طرف تائب ہو کر رجوع کریں تو ان کو بخشنے کے ساتھ ساتھ ان سے محبت بھی کرتا ہے، ایسا نہیں ہے جیسا کہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ: صرف ان کے گناہ بخشے جاتے ہیں، ان سے محبت نہیں کرتا یہ بات غلط ہے۔

بلکہ رب تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اُس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے، جس کا اونٹ اس کے کھانے سمیت کسی بیاباں میں گم ہوا ہو اور بندہ نا امید ہو کر موت کے انتظار میں کسی درخت کے سایہ میں لیٹا ہوا ہو لیکن اچانک آنکھ اٹھا کر دیکھے تو اس کا اونٹ اس کے سر پر کھڑا ہو، اس کا لگام ہاتھ میں پکڑ کر فرط جذبات اور خوشی کے عالم میں اپنا ہوش کھو بیٹھتا ہے اور غلطی سے کہتا ہے: "اے رب! تو میرا بندہ ہے میں تیرا رب ہوں"، رب تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔

دُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝۱۵	عرش کا مالک بڑی شان والا (15)

حق تعالیٰ عظیم عرش کا مالک عالی شان اور عظمت والا ہے۔

"الْمَجِيدُ" یعنی اللہ تعالیٰ مجید ہے، اس کا مقام تمام مخلوقات کے درجہ اور مقام سے بلند ہے اور کمال و جلال کی تمام صفات سے متصف ہے، اللہ کی ذات عظیم اور اس کی صفات خوبصورت ہیں، اچھی صفات کا مالک ہے اور عظمت و جلال اس کے لیے خاص ہیں، تخلیق کے ساتھ ساتھ تمام تدبیریں اور حکم اس کے لیے ہیں۔

فَعَالٌ لِّمَآ يُرِيدُ ۝۱۶	جو چاہتا ہے کر دیتا ہے (16)

یعنی: خدا تعالیٰ جو کچھ چاہتا ہے کر گزرتا ہے، جو کچھ ارادہ فرمائے حکم دے دیتا ہے، اس کا حکم کوئی ٹال نہیں سکتا، اور جو کچھ کرتا ہے اس سے نہیں پوچھا جائیگا، اس کا فیصلہ کوئی رد نہیں کر سکتا، جو کچھ عطا کر دے کوئی نہیں روک سکتا، اور جب منع فرمائے تو کوئی دے نہیں سکتا، اس کی قدرت نافذ العمل ہے اور اس کی حکمت واضح، اللہ تعالیٰ کسی چیز پر مجبور نہیں ہے، اور نہ کوئی اسے مجبور کر سکتا ہے، جب چاہے گناہوں کو بخش دیتا ہے، اور جب چاہے عذاب دیتا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں: کوئی چیز اس کی مرضی اور ارادے سے باہر نہیں ہے۔ (قرطبی: 290/19)

ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ مریض اور بستر مرگ پر تھے کہ، ان سے کہا گیا کہ کیا کسی طبیب نے آپ کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، پوچھا گیا: کیسا تھا اور کیا کہا؟ جواب میں کہا: مجھ سے کہا: "إِنِّي فَعَّالٌ لِّبَإٍرٍيْدٍ" میں جو چاہوں کرتا ہوں۔ (مختصر: 625/3)

ہلَّ أَتَيْتُكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ، ۱۰	بھلا تم کو لشکروں کا حال معلوم ہوا ہے (17)

یعنی: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو سرکش اور باغی اقوام کے قصوں سے باخبر کر دیں؟ وہ لوگ جو انبیاء کرام سے جنگ کرنے لگے تھے، زمین میں بہت زیادہ جرائم کیے تھے، اور اپنے حال پر بہت فخر کیا کرتے تھے، کیا تجھ تک ان کی خبر پہنچی ہے کہ رب کی طرف سے کیسی کیسی مصیبتیں ان پر آئیں؟ اور ان پر کیسا انتقام اور عذاب نازل ہوا؟

مفسر قرطبی فرماتے ہیں: اس موضوع کے بیان کرنے کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، اور یہ کہ قوم کی تکذیب اور جھٹلانے کے مقابلے میں صبر و تحمل اختیار کرنا چاہیئے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کرام نے صبر کیا تھا۔

فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ۱۸	(یعنی) فرعون اور ثمود کا (18)

کہ فرعون اور ثمود بہت زیادہ فوج اور طاقت والے تھے، تیری قوم سے زیادہ بھی تھے اور طاقتور بھی، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے بدلے میں ان سے سخت انتقام لیا۔

فرعون ذوالاوتاد سے مراد وہ فرعون ہے جو "وتد" رکھتا تھا، یعنی میخ والا تھا، یہ اس کے لشکر کی کثرت سے کنایہ ہے، کیونکہ فرعون کے پاس بہت زیادہ افرادی قوت تھی، اور ثمود بھی جسمانی لحاظ سے بہت زیادہ مشہور تھے، (وَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۱۹) (الفجر: 9) ترجمہ: "چٹانوں کو تراشتے اور اپنے لیے گھر بناتے تھے"، فرعون بڑے تکبر کے ساتھ غرور کی انتہاء کو پہنچ گیا، اسی طرح قوم ثمود جنہوں نے جھٹلانے میں حد سے زیادہ تجاوز کیا، لیکن خدا نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سب سے زیادہ لیس دستے اور فوجی قہر الہی کے سامنے بے حیثیت ہیں۔

فرعون: فرعون کا اصل لفظ: بڑے گھر کے معنی دیتا ہے، فرعون کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں تھا، فراعنہ اپنے آپ کو خدا اور بشر کے درمیان ثالث سمجھتے تھے، فراعنہ نے موجودہ مصر کے آس پاس کی سرزمین پر 6000 سال قبل مسیح میں حکومت کی۔

لفظ فرعون (74) مرتبہ قرآن عظیم میں خاص طور پر بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ذکر ہوا ہے، فراعنہ کا مقام اور محل مصر کی سرزمین تھی۔

فرعون: طاغی، مسرف، عالی، ذوالاوتاد جیسے الفاظ سے متصف کر دیا گیا، اور اس کے شیطانی سیاست کو "کید" فرعون سے یاد کیا گیا ہے، فرعون ابتداء میں ربوبیت کا داعی تھا، "فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ" (النازعات: 24) **ترجمہ:** "کہنے لگا کہ تمہارا سب سے بڑا مالک میں ہوں"

پھر اس نے صرف اس صفت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ آگے بڑھ کر ابوبیت کا دعویٰ بھی کر دیا: "وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَأْتِيهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي" (سورہ قصص: 38) **ترجمہ:** "اور فرعون نے کہا کہ اے اہل دربار میں تمہارا اپنے سوا کسی کو خدا نہیں جانتا"

فرعون بنی اسرائیل کا سخت دشمن تھا، ان کے نرینہ اولاد کو قتل کرتا تھا، اور ان کی لڑکیوں کو خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا۔ (سورہ اعراف: 141)

لیکن کافر (جان بوجھ کر) تکذیب میں (گرفتار) ہیں (19)	بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۝۱۹

کفار قریش نے جھٹلانے والوں کے انجام سے عبرت نہیں لی، بلکہ اپنی تکذیب جاری رکھی، پس کفار مکہ کا کفر اور سرکشی ان سرکشوں، باغیوں کے کفر و سرکشی سے زیادہ سخت ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں: ان کے نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان تک سابقہ قوموں کی خبریں نہیں پہنچی تھیں، اور وہ ان کی ہلاکت سے بے خبر تھے، بلکہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے انبیاء کرام کے لائے ہوئے پیغام کو جھٹلاتے تھے۔

اور خدا (بھی) ان کو گردا گرد سے
گھیرے ہوئے ہے (20)

وَاللّٰهُ مِنْ وَرَآئِهِمْ مُحِيطٌ ۝۲۰

یعنی: اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر غالب اور قادر ہے، جب چاہے ان کو اپنے قبضہ قدرت میں لے سکتا ہے، اس کے دائرہ اقتدار سے باہر نکل کر اسے بے بس نہیں کر سکتے اس لیے ہر وقت اور ہر موقع پر اس کے حکم کے تابع ہونگے، اس کے دائرہ اقتدار سے باہر نہیں جاسکیں گے، فرار کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے، (لفظ "وَرَّآئِهِمْ" یہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت اور ان لوگوں کی غفلت کی علامت ہے) اللہ تعالیٰ دیکھتا اور جانتا ہے کہ ان لوگوں نے کیا کیا اور کیا کر رہے ہیں، یہ آیت کافروں کے لیے سخت تنبیہ ہے کہ انہیں ضرور سزا ملے گی، اور یہ کہ سب کے سب براہ راست اس کی نگرانی میں ہیں، وہ پیچھے سے ان کا تعاقب کرتا ہے، جبکہ انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

(یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن
عظیم الشان ہے (21)

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝۲۱

یہ قرآن جسے کفار نے جھٹلایا "قرآن مجید" ہے بہت ہی باعزت، با وقار اور ایک بابرکت کتاب، اور عظیم و کریم رہنماء ہے، اس لیے کہ بخشنے والا مہربان رب کا کلام ہے، جیسا کہ وہ لوگ کہتے ہیں مگر غلط کہتے ہیں یہ شعر اور کہانت نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو معجزات اور معنی کی درستی کے میدان میں دوسری مقدس آسمانی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، جی ہاں وہ الہی کتاب قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔

رب تعالیٰ اس آیت کریمہ کے ساتھ مشرکین کے دعوے جو کہتے تھے: قرآن جادو، شعر و شاعری ہے پہلوں کی کہانیاں ہیں، ردّ کر کے فرماتے ہیں: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ قرآن نہایت ہی محترم اور لوح محفوظ ہے جو شیاطین کے دسترس سے محفوظ و مامون ہے، کبھی بھی شیاطین یا غیر شیاطین نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا ہے اور نہ اس کے قریب ہوئے ہیں۔

قرآن کریم کے لیے لفظ "مقدس" کا استعمال:

قرآن کریم کو لفظ "مقدس" سے توصیف کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کیونکہ تقدس اور تقدیس بہ معنی تطہیر کے ہیں، اور قدس لغت عرب میں طہارت کے معنی میں ہے۔

ازھریؒ نے کہا: "الْقُدُّوسُ" اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے، یعنی تمام عیوب اور نقائص سے پاک اور منزہ، اور تقدیس: یعنی "تطہیر" اور تقدس: یعنی "تطہر"۔ (مراجعہ فرمائیں: لسان العرب: 168/6-169)

ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں: تقدیس وہی تطہیر اور تعظیم ہے، بشمول اس قول کے: "سبوح قدوس" اس سے مراد یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ پاک اور منزہ ہے، اور "قدوس" کے معنی ہے: طہارت، پاکی اور تعظیم خدا کے لیے، اسی لیے زمین کے لیے کہا گیا: "ارض مقدسہ" یعنی پاک زمین۔ (تفسیر الطبری: 475/1)

البتہ بہتر و افضل یہی ہے کہ ہم قرآن کریم کی ہی صفات بیان کریں جو رب تعالیٰ نے اس کے لیے بیان کی ہیں، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں: (الزَّيْنَةُ ۝ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِينٍ ۝) (الحجر: 1) ترجمہ: "الزَّيْنَةُ (خدا کی) کتاب اور قرآن روشن کی آیتیں ہیں"

(وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْكِتَابِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝) (الحجر: 87) ترجمہ: "اور ہم نے تم کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) دُہرا کر پڑھی جاتی ہیں (یعنی سورہ الحمد) اور عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے"

(بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝) (بروج: 21) ترجمہ: "(یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے"

اس کے علاوہ قرآن کے لیے لفظ "مقدس قرآن" لقب کی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے، کیونکہ ہم اس عبارت کو کہتے ہوئے اپنے آپ کو نصاریٰ کے مشابہ بنالیتے ہیں کہ وہ اپنے تحریف شدہ کو "کتاب مقدس" یا "انجیل مقدس" کہتے ہیں، اگر کوئی پوچھے: کیا تمہاری کتاب مقدس نہیں ہے؟ ہم کہیں گے: جی ہاں ہماری کتاب کسی بھی دوسری کتاب سے زیادہ مقدس اور مطہر ہے، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے اس لفظ "کتاب مقدس" یا "قرآن مقدس" کا اطلاق نہیں کرتے کیونکہ یہ کہتے ہوئے ہم اپنے آپ کو نصاریٰ کے مشابہ بنائیں گے، اگرچہ قرآن کریم کو آپ "مقدس" اور "مطہر" سے توصیف کرسکتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا نام لیتے ہوئے ہم اس کا وہی نام لیں گے جس طرح خدا تعالیٰ نے نام لیا ہے، "قرآن کریم" یا "قرآن مجید"۔

قرآن عظیم کو ایک محفوظ تختی "لوح محفوظ" میں رکھا گیا ہے، اور وہاں سے اسے کسی بھی قسم کی تبدیلی، تغیر، اضافے اور شیطانوں کی طرف سے ہیرا پیری اور خناسوں کے چوری سے محفوظ رکھا گیا ہے، اور یہ وہ تختی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو لکھ کر محفوظ کیا ہے۔

یہ قرآن کریم کی عظمت و اہمیت اور بلند مقام پر دلالت کرتی ہے، قرآن کریم

غلطیوں سے پاک اور منزہ ہے، اور اس سے کافی بلند ہے کہ اس میں کوئی غلطی واقع ہو، کیونکہ یہ پروردگار عالم کی طرف سے آیا ہے، اس کے بہترین رہنما اصول اور معجزات ضرور عمل میں آئیں گے، اگر سارے دنیا والے بھی یکجا ہو کر اس کو ختم کرنا چاہیں، کبھی بھی نہیں کرسکیں گے رب تعالیٰ بھی تعریفوں اور عظمتوں والا ہے اور اس کی کتاب بھی۔

لوح محفوظ :

لوح محفوظ کے متعلق مفسرین کرام نے مختلف تفسیریں لکھی ہیں، لیکن یہ سمجھنا چاہئیے کہ اس کی کیفیت واضح نہیں ہے، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہوا یا ہوگا وہ سب اس میں لکھا ہوا ہے، حتیٰ کہ قرآن مجید بھی اس میں درج ہے، ایسا لوح محفوظ ہے جو شیطان کے دست رس سے محفوظ و مامون ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہے: "بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ" بلکہ یہ وہ قرآن ہے جس کے معنی اور مفہیم عظیم اور بہت سے ہیں، اس میں بہت زیادہ علم اور خیر کثیر ہے۔

"فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ" لوح محفوظ میں اس کی جگہ ہے، اور ہر تغیر و تبدیل اور کمی بیشی اور شیطانوں سے محفوظ ہے، ایک ایسی تختی ہے جس میں رب تعالیٰ نے ہر چیز کو محفوظ کر رکھا ہے، یہ قرآن کریم کی اہمیت و عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ (تفسیر سعدی)

امام بخاریؒ اپنی صحیح میں عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (كَانَ اللَّهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرُهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ وَكُتِبَ فِي الذِّكْرِ كُلِّ شَيْءٍ وَخَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ) (بخاری) ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا وجود تھا، اس کے علاوہ کسی بھی چیز کا وجود نہیں تھا، خدا کا عرش پانی کے اوپر ہے، اور تمام کائنات کی تقدیر لوح محفوظ میں لکھدی، زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔

آدم علیہ السلام سے پیغمبر اسلام تک انبیاء کا تسلسل :

قرآن کریم میں صرف 20 پیغمبروں کا ذکر ہے، اس فرمان الہی میں ان میں سے 18 کے نام مذکور ہیں: (وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأِهِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝۸۳ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۚ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۸۴ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِيلَاسَ ۚ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝۸۵ وَاسْمُعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝۸۶) (سورہ انعام: 83-86) **ترجمہ:** "اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو اُن کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک تمہارا پروردگار دانا اور باخبر ہے۔ اور ہم نے اس (ابراہیم) کو اسحاق اور یعقوب بخشے۔ (اور) سب کو ہدایت دی۔ اور پہلے نوح کو بھی ہدایت دی تھی اور ان کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا علیہ السلام اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی یہ سب نیکو کار تھے۔ اور اسمعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی۔ اور ان سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔"

اور ان کے علاوہ کا ذکر قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر آیا ہے جیسے: ہود، صالح، شعیب، آدم، ادریس، اور ذوالکفل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (وَإِلَىٰ عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا ۝۶۰) (سورہ اعراف: 60)

ترجمہ: "اور (اسی طرح) قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا"

(وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۝۶۱) (سورہ اعراف: 73) **ترجمہ:** "اور قوم ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو بھیجا"

(وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۝۶۲) (سورہ اعراف: 85) **ترجمہ:** "اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا"

(إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا) (سورہ آل عمران: 33)

(وَاسْمِعِلْ وَأَذْرِيسْ وَذَا الْكِفْلِ ۝ كُلُّ مِّنَ الصُّبُرِ ۝۸۵) (سورۃ انبیاء: 85) ترجمہ: "اور اسمعیل اور ادريس اور ذوالکفل (کو بھی یاد کرو) یہ سب صبر کرنے والے تھے"

اور فرماتے ہیں: (مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۝ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ) (سورۃ فتح: 29)

ترجمہ: "محمدؐ خدا کے پیغمبر ہے۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل"

وہ انبیاء کرام جن کے اسماء گرامی زمانہ کی ترتیب کے لحاظ سے ہم پر واضح نہیں وہ یہ ہیں: آدم، ادريس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلیمان، الیاس، الیسع، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، ذوالکفل، اور سب کے سردار محمد علیہم الصلاۃ والسلام، اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبروں کی تعداد اس سے زیادہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے نام اور واقعات کا ہم سے ذکر نہیں فرمایا۔

جیسا کہ فرماتا ہے: (وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۝) (سورۃ النساء: 164) ترجمہ: "اور بہت سے پیغمبر ہیں جن کے حالات ہم تم سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور بہت سے پیغمبر ہیں جن کے حالات تم سے بیان نہیں کئے"

اور فرماتے ہیں: (وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۝) (سورۃ عافر: 78) ترجمہ: "اور ہم نے تم سے پہلے (بہت سے) پیغمبر بھیجے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے حالات تم سے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات بیان نہیں کئے۔"

بعض علماء کہتے ہیں کہ انبیاء کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار (124000) تھی۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة وَالطَّارِقِ

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ، اس کی سترہ (17) آیتیں ہیں۔

وجہ تسمیہ:

"وَالسَّهَاءِ وَالطَّارِقِ" پر قسم کھانے کی وجہ سے اس سورت کا نام "طارق" رکھا گیا ہے، "طارق" کا معنی توڑنے والا اور کچلنے والا ہے، وہ چمکنے والا چاند یا ستارہ جو رات کی تاریکی کو چیر پھاڑ کر اپنی روشنی زمین پر پہنچائے اسے "طارق" کہتے ہیں۔

اس سورت کی پہلی آیت میں "طارق" کی قسم کھائی گئی ہے، جیسا کہ ہم نے کہا سورت کا نام اس کے مطابق رکھا گیا ہے، واضح رہے کہ عرب کے صحرائین اس سے پہلے بھی "طارق" نام کے ستارے سے واقف تھے، اور اسے پہچانتے تھے، بتایا گیا ہے کہ جنگ احد میں ہندہ بنت عتبہ ابو سفیان کی بیوی عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ قریش کے لشکر میں تھی، جو اپنے جنگجوؤں کی حوصلہ افزائی کے لیے مل کر گیت گاتی تھی، جس کا ایک شعر درج ذیل ہے:

نحن بنات الطارق * نمشی علی نمارق

ترجمہ: ہم چمکتے ستارے کی بیٹیاں ہیں، جو نرم قالینوں پر چلتی ہیں۔

سورہ طارق کے نزول کا وقت:

سورہ طارق کے مشتملات اور موضوعات بقیہ سورتوں کی طرح مکی دور کے ابتدائی ایام سے متعلق ہیں، لیکن یہ سورت تب نازل ہوئی تھی جب کفار مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور قرآن عظیم الشان پر کاری ضرب لگانے کے لیے تمام حربے استعمال کر رہے تھے۔

سورة الطارق کا سورة البروج سے تعلق اور مناسبت:

الف: دونوں سورتوں طارق اور بروج کی ابتداء اور آغاز سورۃ انشقاق اور انفطار

کی طرح آسمان پر قسم کھانے سے ہوتی ہے۔

ب: اسی طرح اس کی آیات کی ترکیب میں: زندہ ہونا، قیامت، قرآن کی صفات اور مشرکوں، جھوٹوں اور کافروں کا رد جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے، جس میں سے سورۃ بروج کی آیات (13،21،22) اور سورۃ طارق کی آیات (8-13) کا ذکر ہے۔

سورۃ الطارق کے الفاظ، حروف اور آیات کی تعداد:

سب سے پہلے جاننا چاہیے کہ سورۃ الطارق سورۃ البلد کے بعد نازل ہوئی ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ اس سورت کا "طارق" نام رکھنے کی وجہ اس کی پہلی آیت کی بنیاد پر ہے، سورہ "طارق" مکی سورتوں میں سے ہے، اس کا ایک (1) رکوع، سترہ (17) آیتیں، اکسٹھ (61) الفاظ، ایک سو چوراسی (184) حروف، اور اٹھانوے (98) نقطے ہیں۔

(یہ بات قابل ذکر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد گننے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے "سورۃ الطور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)۔

سورۃ الطارق کا سبب نزول:

ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے: ابو اشدرنگے ہوئے چمڑے پر کھڑے ہو کر کہتا تھا: اے قریش! جو مجھے اس چمڑے کے اوپر سے ہٹالے میں فلاں فلاں چیز دونگا، پھر کہتا محمد کا دعویٰ ہے کہ: جہنم کے نگہبان انیس (19) افراد ہیں، میں اکیلے تمہیں ان میں سے دس سے دس نجات دونگا، اور تم سب مجھے باقی نو کے شر سے نجات دلاؤ، اس کے متعلق: "فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ" نازل ہوئی۔

سورۃ الطارق سے متعلق معلومات:

اس کے بنیادی موضوعات دو محوروں قیامت اور قرآن عظیم اور اس کی قدرو اہمیت کے گرد گھومتے ہیں، لیکن سورت کے شروع میں فکر انگیز قسموں کے بعد بنی نوع انسان کے لیے خدا کی طرف سے مقرر کردہ نگران کے وجود کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس کے بعد معاد "یوم واپسی، یعنی قیامت" کے امکان کو

ثابت کرنے کے لیے پہلی زندگی اور منی سے انسان کی ابتدائی تخلیق کی طرف اشارہ ہے اور نتیجہ اخذ کیا گیا ہے، (خدا تعالیٰ جو اسے ایسے بے کار اور حقیر پانی سے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ اسے دوبارہ واپس لانے کی قدرت رکھتا ہے) اس کے بعد قیامت کے دن کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے، پھر بہت سی معنی خیز قسموں کے ساتھ قرآن کی اہمیت کی نشاندہی کی گئی ہے، اور آخر میں کافروں کو عذاب الہی کی دھمکی دے کر سورت کو ختم کیا گیا ہے، اس سورت میں ایک خاص خوبصورتی کے ساتھ کہا گیا ہے: کہ ہر انسان کا ایک خاص محافظ اور نگران ہوتا ہے، جو اس کے اعمال کو لکھ کر رکھتا، اور حساب و کتاب اور جزا اور سزا کے لیے اس کو محفوظ رکھتا ہے۔

اس وجہ سے انسان اکیلا نہیں ہے، جو کوئی بھی ہو اور جہاں بھی ہو وہ خدا تعالیٰ کے مامور فرشتوں کی نگرانی میں ہوگا، یہ وہ اصل مقصد ہے جس پر توجہ دینے سے انسان کی اصلاح ہوسکتی ہے اور یہ اس کی تعلیم میں انتہائی مؤثر ہے، انسان شروع میں مٹی تھا، پھر کئی مرحلوں سے گزر کر نطفہ بن گیا، اور یہ نطفہ پیچیدہ اور حیرت انگیز مراحل سے گزرنے کے بعد مکمل انسان کی صورت میں تبدیل ہو گیا، اس لیے اس کی واپسی نئی زندگی کی طرف کسی قسم کی مشکل کا باعث نہیں بنے گی، یہ ظہور یعنی روز قیامت زندہ ہونا اہل ایمان کے لیے فخر، عزت اور برکات کا باعث نعمتوں کی صورت میں، اور مجرموں کے لیے رسوائی اور ذلت کا باعث ہے، کتنا تکلیف دہ ہوگا کہ ایک انسان تمام عمر لوگوں کے درمیان عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارے، لیکن اس دن تمام مخلوقات کے سامنے رسوا اور شرمسار ہو جائے، اس دن نہ ایسی کوئی قوت ہوگی جو اس کی برائیوں پر پردہ ڈال سکے، اور نہ کوئی ایسا مددگار ہوگا جو اسے عذاب الہی سے رہائی بخشے۔

سورت کے آخر میں تمام مسلمانوں کے لیے اپنے کاموں میں ایک مشق اور مثال دی گئی ہے خاص طور پر اس وقت جب ایک طاقتور اور خطرناک دشمن مد مقابل ہو تو ہمت، حوصلہ، صبر اور محتاط طریقے سے سامنا کریں اور کسی بھی جلد بازی یا بغیر منصوبہ بندی کے کوئی کام نہ کریں اور ایسے اقدامات سے گریز کریں جو وقت اور حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہوں۔

سورت کے اہم ترین موضوعات:

1۔ طارق کی اہمیت و عظمت کا اظہار کرنا یا اس کی قسم کھانا۔

- 2 - انسان کے اعمال کی نگرانی۔
- 3 - انسان کی تخلیق اور تکمیل کے مراحل۔
- 4 - قیامت اور اس دن انسانوں کے پوشیدہ رازوں کا ظہور۔
- 5 - قرآن کی عظمت کی طرف اشارہ۔
- 6 - کافروں کو مہلت دینے کا حکم۔

سورۃ الطّٰرِقِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝۱ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳ إِنَّ كُلَّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴
 فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝۶ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝۷ إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ
 لَقَادِرٌ ۝۸ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝۹ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝۱۰ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱ وَالْأَرْضِ ذَاتِ
 الصُّدُعِ ۝۱۲ إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ ۝۱۳ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴ إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝۱۵ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝۱۶ فَمَهْلٍ
 الْكُفْرَيْنِ أَمْهَلُهُمْ رُويْدًا ۝۱۷

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝۱	قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے ستارے کی (1)
وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲	اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا ستارہ کیا ہے؟ (2)
النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳	وہ تارا ہے چمکنے والا (3)
إِنَّ كُلَّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴	کہ کوئی متنفس نہیں جس پر نگہبان مقرر نہیں (4)
فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵	تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کابے سے پیدا ہوا ہے (5)
خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝۶	وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے (6)
يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝۷	جو پیٹھ اور سینے کے بیچ میں سے نکلتا ہے (7)

بیشک خدا اس کے اعادے (یعنی دوبارہ پیدا کرنے) پر قادر ہے (8)	إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝۸
جس دن دلوں کے بھید جانچے جائیں گے (9)	يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝۹
تو انسان کی کچھ پیش نہ چل سکے گی اور نہ کوئی اسکا مددگار ہوگا (10)	فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝۱۰
آسمان کی قسم جو مینہ برساتا ہے (11)	وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱
اور زمین کی قسم جو پھٹ جاتی ہے (12)	وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝۱۲
کہ یہ کلام (حق کو باطل سے) جدا کرنے والا ہے (13)	إِنَّهُ لَقَوْلُ فَضْلٍ ۝۱۳
اور نہیں یہ بیہودہ اور ہنسی کی بات (14)	وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴
یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگ رہے ہیں (15)	إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝۱۵
اور ہم اپنی تدبیر کر رہے ہیں (16)	وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝۱۶
تو تم کافروں کو مہلت دو بس چند روز ہی کی مہلت دو (17)	فَمَهْلٍ الْكَافِرِينَ أَمْهَلُهُمْ رُوِيَ ۝۱۷

تفسیر کا خلاصہ

محترم قارئین:

آیات مبارکہ (1 تا 17) میں فرشتے انسان کے نگران، انسانی تخلیق، رب تعالیٰ کا بنایا ہوا شاہکار، قرآن حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا، کافروں کو تھوڑی سی مہلت ایک معین وقت تک جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار
ہونے والے ستارے کی (1)

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝۱

رب تعالیٰ اس سورت میں آسمان اور فرشتوں کی قسم کھا کر فرماتے ہیں: ہر ایک انسان کے لیے ایک محافظ مقرر کیا گیا ہے، جو کہ اس کے تمام افعال، اعمال، حرکات اور سکناات پر نظر رکھے ہوئے اور جانتا ہے، اس کا عقلی تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنے انجام کے بارے میں سوچے، کیونکہ وہ جو کام بھی دنیا میں کرتا ہے وہ رب تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے، یہ اعمال کا محفوظ ہونا قیامت میں حساب و کتاب کے لیے ہے، اس لیے آخرت کی فکر سے ہر گز غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

طارق: وہ ستارہ ہے جو رات کو دوسرے ستاروں کی طرح نمودار ہوتا ہے، اور دن کو چھپ جاتا ہے، حدیث مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: (أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ أَوْ رَحْمَنٍ) ترجمہ: "میں رات اور دن کے وقت آنے والوں کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، مگر ایسے آنے والے سے نہیں جو بھلائی لائے اے رحمٰن"

دوسری حدیث میں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا کہ مسافر آدھی رات کو اچانک اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اہل و عیال کے پاس داخل ہو۔

اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ رات کو
نمودار ہونے والا ستارہ کیا ہے؟ (2)

وَمَا أَكْذَرُكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲

طارق: لغت میں: کھٹکھٹانا، "طرق" کے مادے سے لیا گیا ہے، یعنی کھٹکھٹانے والا آلہ، اسی لیے ہتھوڑے کو بھی "مطرقة" کہا جاتا ہے، عرب رات کو گھر کے دروازے پر دستک دینے والے کو "طارق" کہتے ہیں۔

یہاں طارق سے وہی مراد ہے جو دوسری آیت کے بعد ذکر ہوا ہے، یعنی: "النَّجْمُ الثَّاقِبُ"، "ثاقب" ایک روشن ستارہ ہے جس کی روشنی انسانی آنکھ میں داخل ہو کر اس کے وجود کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔

مفسرین اپنی تفاسیر میں لکھتے ہیں: طارق (نجم ثاقب) سے مراد ہر وہ روشن ستارہ ہے جو آسمان میں چمکتا ہے، اس لیے عظیم رب نے ایک ستارے کی

نہیں بلکہ اس نے ان تمام ستاروں کی قسم کھائی ہے جن کی ایک خاص چمک اور روشنی ہے، کیونکہ ان ستاروں کی عظمت انسانوں پر زیادہ نمایاں ہے۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں: اس سے مراد "زحل" ستارہ ہے کیونکہ "زحل" نظام شمسی کا سب سے زیادہ دور، اونچا اور بلند ترین ستارہ ہے جسے آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، اس کے بعد اورانوس، نیپٹون اور پلوٹون دریافت ہوئے، اگرچہ یہ تین ستارے بغیر آلات کے آنکھوں سے نہیں دیکھے جاسکتے، اور آخر میں پلوٹون کو نظام شمسی سے نکالا جاچکا ہے، کیونکہ اس کی سیارے جیسی کافی حجم نہیں ہے، بلکہ یہ ایک گردش کرنے والی چٹان ہے جو نظام شمسی میں موجود ہے۔

طارق کو زحل ستارے سے تعبیر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ستارہ خاص خصوصیات کا حامل ہے کہ سائنسدانوں نے ابھی تک اس کے رازوں سے پردہ نہیں اٹھایا ہے، اور وہ یہ ہے کہ زحل کے گرد حلقے نظر آتے ہیں جو فاصلے پر سطح اور عریض ہیں، اور زحل کے گرد گھومتے ہیں، کیا حلقے برف کے ٹکڑے ہیں جو اس کے ارد گرد گھومتے ہیں، یا اس بکھرے ہوئے سیارے کا ٹکڑا ہے جو اس سے پہلے سورج کے گرد گھومتا تھا یا کچھ اور ہے، تیسرا احتمال یہ ہے کہ "طارق" سے مراد "ثریا" ستارہ ہے۔

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿٣﴾	وہ تارا ہے چمکنے والا (3)

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ ہمارا عظیم رب ان ستاروں کی قسم کھاتا ہے جو رات کو نمودار ہوتے ہیں اور ان کی روشنی اور چمک آسمان اور رات کی تاریکی کو چیر دیتی ہیں اور زمین سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

سب سے اصح قول مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ "النَّجْمُ الثَّاقِبُ" تمام ستاروں کو شامل ہے، اگرچہ بعض مفسرین اپنی تفاسیر میں لکھتے ہیں کہ "النَّجْمُ الثَّاقِبُ" سے مراد "زحل" ستارہ ہے، جس کی روشنی ساتوں آسمانوں سے گزر کر دیکھی جاتی ہے۔

اسی طرح بعض مفسرین کا یہ عقیدہ ہے کہ "النَّجْمُ الثَّاقِبُ" سے مراد چاند ہے جو دراصل ہمارے قریب ترین روشن ستاروں میں سے ایک ہے، یہ ایک چھوٹا ستارہ ہے چونکہ اس کا فاصلہ ہم سے بہت کم ہے اس لیے وہ ہمیں بڑا نظر آتا ہے۔

کہ کوئی متنفس نہیں جس پر نگہبان مقرر نہیں (4)	إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّهَا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴

رب تعالیٰ قسم کھاتے ہوئے فرماتے ہیں: ہر ایک کے لیے ایک نگہبان مقرر ہے جو اس کے اچھے اور برے کاموں کو لکھ کر محفوظ کرتا ہے، اور وہ اپنے ہر کام کے بدلے میں جو اس نے کیا ہے اور محفوظ ہوا ہے جزا اور سزا پائے گا، یہ آیت پچھلی دونوں قسموں کا جواب ہے۔

نگہبان اور محافظ وہ فرشتے ہیں جو انسانی عمل، گفتگو، کردار اور خیر و شر میں سے جو عمل کرتا ہے اسے لکھ کر محفوظ کر دیتے ہیں اور آفتوں اور مصیبتوں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے اعمال، روزی اور مقررہ وقت کو لکھ کر اس کی نگرانی کریں، دراصل نگرانی کرنے والی ذات اللہ رب العزت ہے، لیکن فرشتوں کی نگہبانی اس اللہ کی نگہبانی کے زیر اثر اور تابع ہے، کیونکہ فرشتوں کی انسان پر نگرانی رب کے حکم سے ہے۔

تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کابے سے پیدا ہوا ہے (5)	فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵

انسان کو اپنی تخلیق اور ابتدائی پیدائش کو دیکھنا چاہیے، یعنی: انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرے تاکہ وہ جان سکے کہ اللہ تمہاری پہلی تخلیق پر قادر ہے تو دوبارہ زندہ کرنا تو اس سے آسان ہے۔

وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے (6)	خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝۶

"اچھلتے پانی" جو کہ رحم میں بہادیا جاتا ہے، اس سے مراد مرد اور عورت کے نطفہ کا پانی ہے، اس لیے کہ انسان ان دونوں پانیوں سے مل کر بنا ہے، ان دونوں کا ایک ہی لفظ میں ذکر کیا ہے اس بنا پر کہ دونوں پانی باہم خلط کیے جاتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ: ابو اشدرنگے ہوئے چمڑے پر کھڑے ہو کر کہتا تھا: اے قریش! جو مجھے اس چمڑے کے اوپر سے ہٹالے میں فلاں فلاں چیز دونگا، پھر کہتا محمد کا دعویٰ ہے کہ: جہنم کے نگہبان انیس (19) افراد ہیں، میں اکیلے تمہیں ان میں سے دس سے نجات دونگا، اور تم سب مجھے

باقی نو کے شر سے نجات دلاؤ، اس کے متعلق: "فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ" نازل ہوئی۔

جو پیٹھ اور سینے کے بیچ میں سے نکلتا ہے (7)	يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ: اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مراد ممکن ہے صرف آدمی کی منی ہو جو اس کی کمر اور سینے سے نکلتی ہے، شاید یہی معنی بہتر ہو، کیونکہ پانی کو کودنے والا کہا گیا ہے، اور یہ مرد کی منی ہے جو کہ کودنے والی ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ "ترائب" کا لفظ مرد کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور مردوں میں "ترائب" والے دو پستان والی عورت کی طرح ہے، اگر اس سے مراد عورت ہوتی تو فرماتا: "من بين الصلب والثديين" یعنی کمر اور دو پستانوں کے درمیان سے۔

"الصُّلْبُ" پشت کی ہڈی، ریڑھ کی ہڈی۔

"التَّرَائِبُ" جمع "تَرْيَبَة"، سینے کی ہڈیاں۔

"يَخْرُجُ" فعل کا فاعل ضمیر مستتر (هو) ہے جو اس سورت کی پانچویں آیت میں "انسان" کی طرف لوٹتی ہے، ترقی یافتہ انسانی جنین کے دو قطب جنین کے آخری ہفتوں میں ماں کے سینے کی سٹرنم اور نچلی پسلیوں اور ماں کی کمر کی ریڑھ کی ہڈی کے درمیان واقع ہوتے ہیں اور وہاں سے یہ برتھ کینال کے راستے میں حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے۔

"رجعه" میں ضمیر "ه" "انسان" کی طرف راجع ہے، یہ آیات نطفہ کے جنم کے آغاز سے لے کر قیامت تک انسانی زندگی کے راستے کا جائزہ لیتی ہے۔

انسانی نطفے میں 200 تا 300 یا اس سے بھی زیادہ اسپرم ہوتے ہیں بعض نے ان کی تعداد 200 تا 500 بھی بتائی ہے، ان اسپرم کو جراثیم، کیڑے اور کرم بھی کھاجاتا ہے، ہر اسپرم کی لمبائی 10 تا 100 بال برابر ہوتی ہے، اور ہر بال ایک میٹر کا دس لاکھواں حصہ بنتا ہے، ان اسپرم میں سے ہر ایک کا سر، گردن اور ایک متحرک دم ہوتی ہے یہ 16 سے 23 مائکرون فی سیکنڈ

کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں، مجامعت کے وقت عورت کے رحم میں یہ اسپرم داخل ہوتے ہیں، مگر بچہ پیدا کرنے کے لیے ان 200 تا 5000 اسپرم میں سے صرف ایک ہی کافی ہوتا ہے، اور اگر ایک مردانہ اسپرم عورت کے نطفے کے ایک جرثومے میں داخل ہو جائے تو ان دونوں کے ملاپ سے بچہ تولد ہوتا ہے، بقیہ جراثیم کی ضرورت نہیں رہتی (توماس، رویان شناس لانگمس، رضای، حسن رضا، قرآن و فرہنگ زمانہ طبع تہران)۔

منی کی اصل جگہ کے بارے میں ماہرین کہتے ہیں کہ لغت کی کتابوں میں منی کی جگہ صلب اور ترائب بتایا گیا ہے، صلب ریڑھ کی دو ہڈیاں اور ترائب ان ہڈیوں کے مقابل سامنے یعنی پیڑھ کی دو ہڈیاں ہیں، یہ پچھلی اور اگلی ہڈیاں ریڑھ کے مہروں کے ذریعے مربوط ہیں، (جب مرد کا نطفہ عورت کے رحم میں جاتا ہے تو) پہلے وہ بیضہ میں اور بیضہ رحم میں قرار پاتا ہے، اگر جنین نہ رہے تو چھ ماہ تک پشت میں (عورت کے رحم کے ایک حصے میں) رہتا ہے، اور پھر وقت مکمل ہونے پر پیدا ہوتا ہے، اور اگر جنین مادہ ہے تو مختصر وقت کے لیے رحم کی اطراف کی نالیوں میں (پشت میں نہیں) رہتا ہے، (پھر رحم میں آتا ہے اور پھر اپنے مقررہ وقت پر پیدا ہوتا ہے)۔

انسانی نطفہ کی پیدائش و افزائش کے بارے میں ایک اور علمی نظریہ بھی ہے جو کہ لغت کے مطابق بھی ہے اور مشہور قول بھی ہے اور وہ رائے یا نظریہ اس طرح ہے کہ مرد کا نطفہ مرد کے صلب یعنی پشت اور اس کے ترائب یعنی ٹانگوں کی اوپری ہڈیوں کے درمیان سے خارج ہوتا ہے، پوسٹ مارٹم اور انسانی جسم کی جانچ سے ثابت ہوا ہے کہ مرد کی منی کے گزرنے اور قرار پکڑنے کی جگہ صلب اور ترائب (پشت اور اگلی ہڈیوں) کے درمیان ہے، یہیں پر منی کی تھیلیاں ہیں، یہیں پر وہ غدود ہیں جو منی میں رطوبت شامل کرتے ہیں (پروسٹیٹ گلینڈ) یعنی ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ صلب ایک عصبی نظام ہے، جو تناسل کے کام کا مرکز ہے اور ترائب اس تناسل کے اجراء کے لیے عصبی کام کرنے والے کا نام ہے، صلب منی کو اپنے اندر رکھتا ہے اور ترائب اس کو بوقت ضرورت خارج کرتا ہے، اور یہ دونوں یعنی صلب اور ترائب آدمی کے کولہے کی ہڈیاں صلب اور خصیتین کے اطراف کی دو ہڈیاں یعنی ترائب منی کا مرکز ہیں (دیاب و قرقوز، رضای، حسن رضا، بررسی شبہات، قرآن و فرہنگ زمانہ)۔

اس رائے کو مد نظر رکھیں اور کتب لغت اور مفسرین اور طب کے ماہرین کی رائے کو دیکھیں تو کھاجا سکتا ہے کہ صلب یعنی مرد کی پشت ایک عصبی

مرکزھے اور ترائب ران کے اوپر کی وہ ہڈیاں ہیں جن کے درمیان مرد کے تناسلی اعضاء ہیں، چنانچہ صلب اور ترائب ماہرین کی نظر میں یہی ہیں۔

بیشک خدا اس کے اعادے (یعنی دوبارہ پیدا کرنے) پر قادر ہے (8)	إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝

جس خدا نے انسان کو اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا ہے ایسا پانی جو ایسی مشکل جگہ سے نکلتا ہے، انسان کو آخرت میں دوبارہ زندہ کر کے جزا و سزاء کیلئے لوٹانے پر قادر ہے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ہمیں در اصل انسان کی کمزوری اور عاجزی یاد دلائی ہے اور اسے قیامت کا اقرار کرنے کی ہدایت دی ہے، کیونکہ وہ ذات جو اسے پہلی بار پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہے، دوبارہ اس کو بطریق اولیٰ پیدا کر سکتی ہے۔

جس دن دلوں کے بھید جانچے جائیں گے (9)	يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝

جس دن چھپی ہوئی اچھائیاں اور برائیاں چہرے سے عیاں ہوجائیں گی، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: (يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۝) ترجمہ: "جس دن بہت سے چہرے سفید ہونگے اور بہت سے سیاہ" دنیا میں بہت سے چہرے پوشیدہ رہ جاتے ہیں، لوگوں کے لیے طاہر نہیں ہوتے، لیکن قیامت کے دن نیک لوگوں کی نیکیاں اور بُرے لوگوں کی بُرائیاں اعلانیہ طور پر آشکار ہوجائیں گی۔

تو انسان کی کچھ پیش نہ چل سکے گی اور نہ کوئی اسکا مددگار ہوگا (10)	فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝

یعنی اپنے دفاع کی صلاحیت بھی نہیں رکھ سکے گا اور نہ ہی کوئی اس کا مدد کرنے والا ہوگا۔

"التسهیل" میں ہے کہ: چونکہ دنیا میں رکاوٹوں اور مسائل کو یا تو انسان خود ہی دور کر سکتا ہے یا کوئی اور ان پر قابو پانے میں اس کی مدد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ قیامت کے دن انسان ان میں سے کسی سمت سے مدد حاصل نہیں کر سکے گا، نہ اس کی اپنی طاقت ہوگی اور نہ کوئی اس کی مدد کر سکے گا (التسهیل: 4/192)۔

(فَمَالَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ) بہت ساری آیتوں کے رو سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ: قیامت کے دن نجات کا ذریعہ صرف اور صرف ایمان اور عمل صالح ہے اور بس، (ملاحظہ کریں: آیہ: 19: سورہ انفطار)۔

"ناصر" نَصَرَ اور نُصِرْتَ کے مادے سے ایک خاص قسم کی مدد کرنے کو کہتے ہیں، نصر اور عون میں فرق یہ ہے کہ "عون" ہر قسم کی مدد کرنے کو کہتے ہیں، جبکہ نصرت مدد کرنے کی ایک خاص قسم کو کہتے ہیں جو آفت اور مصیبت کے وقت ہوتی ہے، جس کا انسان محتاج ہو، مدد کا ایک حصہ اللہ کی طرف سے بندوں کے لیے ہے اور دوسرا حصہ جو قرآن کریم میں آیا ہے بندے کی طرف سے اللہ کی طرف ہے، "إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ" (محمد: 7) ترجمہ: "اگر تم اللہ (کے دین اور پیغمبر) کی مدد کرو گے، وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا"

اللہ کے لیے انسانی نصرت کا کیا مطلب؟ یعنی: بندگی کرنا اور اللہ کی نازل کردہ حدود اور احکام کو قائم کرنا، خدا کے ساتھ اپنے عہد کو برقرار رکھنا، ان تمام معنوں کا مجموعہ اللہ کے لیے انسان کی نصرت اور مدد میں شامل ہے، لیکن ان سب سے بڑھ کر بندے کی مدد کا بہترین طریقہ اللہ کی بندگی ہے۔

آسمان کی قسم جو مینہ برساتا ہے (11)

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱

مفسرین "رجع" کے معنی میں لکھتے ہیں: "رجع" وہ بارش ہے جو لگاتار برستی ہے، یعنی ایک بار برستی ہے اور ختم ہوتی ہے پھر واپس آتی ہے اور برستی ہے، بارش والے آسمان کی قسم کہ ہر سال اس سے بارش برستی ہے، اور وہ زمین کو چیرتی ہے اور پودے اور سبزہ اگاتی ہے، اور اسی کے ذریعے انسان اور جانور زندہ رہتے ہیں خدا تعالیٰ کے احکام ہمیشہ آسمان پر انجام پاتے ہیں، قیامت کے دن زمین پھٹ جائے گی اور اس سے مردے باہر آئیں گے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "رجع" کا مطلب ہے اگر بارش نہ ہو تو انسان نیست و نابود ہو جائیں گے، اور چوپائے تباہ ہو جائیں گے۔

اور زمین کی قسم جو پھٹ جاتی ہے (12)

وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصُّدُوعِ ۝۱۲

جسے پودوں، درختوں، آتش فشاں وغیرہ کو نکالنے کے لیے چیرا جاتا ہے، اور

یہ چیزیں اس سے نکلتی ہیں، "ذَاتِ الصَّدْعِ" جس میں شگاف ہو، زراعت کے لیے تیار، نباتات اُگنے کی وجہ سے شگاف پڑ جانا۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "ذَاتِ الصَّدْعِ" کا مطلب ہے سبزہ اُگنے اور پھل دینے کے موقع پر زمین کو پھاڑ دینا (تفسیر طبری: 90/30)

اللہ تعالیٰ نے آسمان کی قسم کھائی ہے جو ہم پر بارش برساتا ہے، زمین کی قسم کھائی ہے جو ہمیں پھل اور نباتات دیتی ہے، تخلیق کے معاملے میں آسمان کو باپ اور زمین کو ماں کی حیثیت حاصل ہے، دونوں کے درمیان عظیم اور ہمہ گیر نعمتیں ہیں جن پر انسانوں اور جانوروں کی بقاء کا انحصار ہے۔

کہ یہ کلام (حق کو باطل سے) جدا کرنے والا ہے (13)	إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ ۝۱۳

یہ مبارک آیت جواب قسم ہے: بلاشبہ یہ قرآن حق اور باطل، گمراہی اور ہدایت اور نیکی اور بدی میں فرق کرتا ہے۔

"فَصْلٌ" (1) یعنی حق اور سچا ہے، (2) اس کی معلومات صحیح اور غلط میں فرق واضح کرتی ہیں، (3) یہ متقی اور ظالم میں فاصلہ پیدا کرتا ہے۔

اور نہیں یہ بیہودہ اور ہنسی کی بات (14)	وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴

قرآن پاک مبالغہ آرائی یا مذاق نہیں ہے، بلکہ قرآن ایک سنجیدہ کلام ہے، ایسا کلام جو صحیح اور غلط گروہوں اور افکار کے درمیان فیصلہ کرتا ہے، اختلافات اور جھگڑے اسی کے ذریعے حل ہوجاتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے" حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اس فتنے کے شر سے بچنے کا راستہ کونسا ہے؟ فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب: اس فتنے کے شر سے بچنے کا راستہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے، (فیہ نبأ من قبلكم، وخبر ما بعدکم، وحکم ما

بینکم، هو الفصل ليس بالهزل، من ترکه من جبار قصبه الله ومن ابغى الهدى في غيره أضله الله وهو

حبل الله المتين، ونوره المبين، وهو الذکر الحکیم، وهو الصراط المستقیم، وهو الذی لا ترغبه الأهواء

ولا تلتبس به الألسنة ولا تشعب معه الآراء ولا يشعب منه العلماء ولا يمله الأتقياء ولا يخلق على كثرة الرد ولا تنقضي عجائبه، هو الذى لم تنته الجن لما سمعته أن قالوا: "قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ

نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝١ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۝٢ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝٣"

(سورة الجن: 1 تا 2) ترجمہ: اس میں تم سے پہلی امتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں (یعنی اعمال و اخلاق کے جو دُنیاوی و آخروی نتائج و ثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں، قرآن مجید میں ان سب سے آگاہی دے دی گئی ہے) اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں اُن کا حکم اور فیصلہ موجود ہے (حق و باطل اور صحیح اور غلط کے بارے میں) وہ قول فیصلہ ہے، وہ فضول بات اور یا وہ گوئی نہیں ہے، جو کوئی جابر و سرکش اس کو چھوڑے گا (یعنی غرور اور سرکشی کی راہ سے قرآن سے منہ موڑے گا) اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا، اور جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اُس کے حصے میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی، (یعنی وہ ہدایت حق سے محروم رہے گا) قرآن ہی حبل اللہ المتین ہے (یعنی اللہ سے تعلق کا مضبوط وسیلہ ہے)، اور اللہ کا چمکتا نور ہے، اور محکم نصیحت نامہ ہے، اور وہی صراط مستقیم ہے، وہی ہے جس کی اتباع سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں، اور زبانیں لڑکھڑاہیں سکتیں، اور آراء اس کی روشنی میں متفرق نہیں ہوں گی، اور علم والے اس کے علم سے کبھی سیر نہیں ہونگے، اور متقی لوگ اس سے کبھی بیزار نہیں ہوں گے، کثرتِ مزاوت سے کبھی پرانا نہیں ہوگا، اور اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے، قرآن کی شان یہ ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو بے اختیار بول اٹھے: (قُلْ

أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝١ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۝٢ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝٣) (سورة الجن: 1 تا 2) ترجمہ: "اے پیغمبر لوگوں سے) کہدو کہ میرے

پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (اس کتاب کو) سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک بہترین قرآن سنا۔ جو بھلائی کا راستہ بتاتا ہے سو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اور ہم اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے"

جو قرآن کے علم سے آراستہ ہوا وہ آگے بڑھ گیا اور جس نے قرآن کے ذریعے بات کی اس نے سچ کہا، اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی وہ راہِ راست پر آ گیا، قرآن عظیم ایک مشعل ہے جو بجھتی نہیں اور وہ ایسا چراغ ہے جس کی روشنی کبھی ختم نہیں ہوتی، قرآن وہ کتاب ہے جو صحیح اور غلط کو الگ کرتی ہے، اور ذہنوں سے شکوک و شبہات کو دور کرتی ہے، اور اس کو سننے

اور پڑھنے سے دل کو چمکایا جاتا ہے اور تقویت ملتی ہے، انسان کو سکون اور اطمینان ملتا ہے، قرآن کریم انسانیت کے لیے ہدایت اور روشنی کی کتاب ہے، اور انسان کی زندگی میں اس کی حیثیت اور کردار نہایت ہی اہم اور ضروری ہے۔

قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو صرف 1400 سال پہلے رہنے والے لوگوں کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے، بلکہ قرآن تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک کتاب ہے، بشر اور بشریت کی پوری تاریخ میں، یعنی جب تک انسان باقی ہے قرآن کریم ان کی رہنمائی کرتا رہے گا، انسان حقیقی ترقی اس وقت حاصل کرسکتا ہے جب وہ قرآنی ہدایات پر کان دھرے، انسان اصل اور ابدی سعادت اس وقت حاصل کرسکتا ہے جب وہ قرآن پاک اور اس کی تعلیمات کی طرف رجوع کرے۔

مسلمانو یاد رکھو!

زندگی کے تجربات نے ثابت کیا ہے کہ جو بھی قرآن کے راستے پر ہے اور قرآن سے دوستی رکھتا ہے، اسے چاہتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے اور احترام کرتا ہے، یقین رکھو کہ اسے قرآن پر بھروسہ اور اعتماد رکھنے کا صلہ ضرور ملے گا، قرآن کریم انسان کو زندگی میں اکیلا نہیں چھوڑے گا، قرآن ایسی کتاب ہے جو غم اور خوشی میں انسان کا ساتھ دیتی ہے، یہ بات یاد رکھو کہ قرآن آدھے راستے کا دوست اور ساتھی نہیں ہے، یہ ایسی کتاب ہے جو لوگوں کو خوشی اور سرشاری کے ساتھ عبادت کرنے کی دعوت دیتی ہے، اگر انسان کا دوست قرآن ہے تو یقیناً اس دوستی کا حامی اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ سے زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد کون ہے؟ اور کون ایسا ہے جو نصرت اور مدد کرنے میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ قوی اور قابل اعتماد ہو؟

یہ کتاب وعظ و نصیحت اور شیریں کلام سے بھرپور ہے اور انسانوں کو اعلیٰ مرتبے کا احترام دیتی ہے، اس کتاب کے قوانین و احکام پر عمل کرنا نہ صرف مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا سبب ہے، بلکہ روئے زمین کے تمام انسانوں کو اس کی طرف دعوت دینا ہے، قرآن کریم دنیا کے مسلمانوں کے لیے بحیثیت سہارا اور آرام گاہ اور مسلمانوں کی وحدت میں اتحاد کا مرکزی محور شمار ہوتا ہے، یہ کتاب مسلمانوں کی طاقت اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کی کمزوری رہی ہے اور رہے گی۔

یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگ رہے
ہیں (15)

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝۱۵

جو لوگ قرآن اور پیغمبر کو جھٹلاتے ہیں وہ سخت دھوکہ دہی کرتے ہیں، تاکہ اپنے اس دھوکے سے حق کو شکست دیں اور باطل کی مدد کریں۔

یہ آیت مبارکہ کفار اور خاص طور پر کفار قریش کے بارے میں ہے کہ وہ اپنی جدوجہد اور کوشش سے لوگوں کو قرآن، پیغمبر اور اس کی دعوت سے دور رکھنا چاہتے ہیں، ان کا یہ کام ایک منصوبہ بندی پر مبنی ہے، وہ پیغمبر کو روکنے اور کمزور کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، اور مکر و فریب سے کام لیتے ہیں۔

"يَكِيدُونَ" کید کے مادے سے ہے، اور یہ کسی کام کے انجام دینے کے بارے میں سوچنے کی قسم ہے، یہ ایک قابل مذمت چال ہوسکتی ہے، یعنی چالاکی اور دھوکہ دہی سے کرنا، کید بعض مرتبہ ممدوح بھی ہوسکتا ہے، یعنی قابل تعریف ہوسکتا ہے جیسے کوئی اچھی چال چلنا کسی اچھے مقصد کے لیے۔

اور ہم اپنی تدبیر کر رہے ہیں (16)

وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝۱۶

یعنی: میں بھی تدبیر کروں گا، تاکہ ان کا کوئی بھی مکر و تدبیر مؤثر نہ ہو، میں بھی حق کو ظاہر کرنے کے لیے اور اس باطل کو جو وہ لائے ہیں دور کرنے کے لیے تدبیر کروں گا اگرچہ کافروں کو یہ پسند نہ ہو، یہ واضح ہے کہ کون کامیاب ہوگا، کیونکہ انسان بہت کمزور، حقیر اور کمتر ہے خدائے غالب اور حکیم کو شکست نہیں دے سکتا۔

مفسر ابو سعود اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ان کے مکر و فریب کے مقابلے میں ایک مضبوط اور ٹھوس چال سے کام لوں گا جسے رد نہیں کیا جاسکے گا، کہ جب وہ ہر چیز سے غافل ہونگے میں انہیں گرفت میں لے لوں گا۔ (ابوسعود: 438/8)

اس آیت کریم میں اللہ تعالیٰ نے دعوت دینے والے مسلمانوں کو تسلی دی ہے اور انہیں ذہنی اطمینان بخشا ہے، فرماتا ہے: پریشان اور اداس مت ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، اور وہ لوگ میرے مد مقابل کھڑے نہیں ہوسکتے، ان سب کو ہلاک کردوں گا، لیکن یہ تب ہوگا جب تم اپنی دعوت اور ذمہ داری بھرپور ادا کرو گے، پھر اس وقت تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، جس "کید" کی یہاں اللہ

تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی ہے اس "ممدوح کید" کی قسم میں سے ہے (یعنی تدبیر کے معنی میں ہے)۔

آیت مبارکہ کے مفہوم سے واضح ہوجاتا ہے کہ: انسان کے ساتھ اللہ کا معاملہ اس کے اعمال کی مناسبت سے ہوگا، اگر سیدھے اور خیر کے راستے میں قدم اٹھائے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے ہدایت عطا فرمائے گا، (جَاهِدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ) (عنکبوت: 69) اگر مکر اور حیلہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے مکر میں گرفتار ہوگا، (يَكِيدُونَ كَيْدًا وَّاَكِيدُ كَيْدًا) اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔

تو تم کافروں کو مہلت دو بس چند روز ہی کی مہلت دو (17)

فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷

تاکہ ان سے متعلق اتمام حجت ہوجائے اور بعد میں ان کا بُرا ہوگا، اور وہ دنیا و آخرت میں شرمندہ ہونگے، زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ ان کے اعمال کا نتیجہ ان کے سامنے ظاہر ہوگا، اور ضرور جان لیں گے ان کی چال اور دھوکے کی میری تدبیر کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے، اس لیے دشمن کے ساتھ معاملہ میں نہ خود عجلت اور جلدی کریں اور نہ اللہ سے جلدی اور عجلت چاہیں۔

"مہل" جو کہ "مہل" کے مادے سے ہے، اس کا مطلب ہے سکون و اطمینان سے کسی کام کو انجام دینا، "مہلت" یعنی ایسا موقع پیدا کرنا کہ کام حوصلہ مندی سے پورا کر سکے، اسی طرح "امہال": یعنی چھوڑنا اور تاخیر کرنا، "تھوڑے سے وقت میں" ان کو مہلت دو قریب کی مہلت، اور تھوڑی مہلت، اور عنقریب تم دیکھو گے کہ ان پر ذلت آمیز عذاب نازل ہوگا، اور جب عذاب کا وقت آئے گا تو آپ ان کی زندگی کا تلخ خاتمہ دیکھیں گے۔

جنین میں مرد اور عورت کے انڈوں کا کردار

آیہ مبارکہ "يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ" (طارق: 7) میں خلقت کا موضوع اور اس میں سے "جنین" کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، جنین لغت میں ڈھانپنے کے معنی میں ہے یعنی کسی بھی چیز کو چھونے سے بچانا بچے کے لیے "جنین" کہا گیا ہے کہ وہ ماں کے رحم میں پوشیدہ اور مخفی ہے۔

صحیحین میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ وَكَّلَ بِالرَّحِمِ مَلَكًا يَقُولُ: يَارَبِّ نُطْفَةٍ، يَارَبِّ عَلَقَةٍ، يَارَبِّ مُضْغَةٍ، فَإِذَا أَرَادَ

أَنْ يَقْضَىٰ خَلْقَهُ قَال: أَذْكَرٌ أَمْ أُنْثَىٰ، شَقِيَ أُمُّ سَعِيدٍ، فَمَا الرِّزْقُ وَالْأَجَلُ، فَيَكْتُبُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ. (بخاری 6595) و مسلم (2624)"

ترجمہ: "رحم مادر میں اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ اے رب! اب یہ نطفہ ہے، اے رب! اب یہ علقہ ہو گیا ہے، اے رب! اب یہ مضغہ ہو گیا ہے، پھر جب اللہ چاہتا ہے کہ اس کی خلقت پوری کرے تو کہتا ہے کہ مذکر یا مؤنث، بد بخت ہے یا نیک بخت، روزی کتنی مقرر ہے اور عمر کتنی، پس ماں کے پیٹ ہی میں یہ تمام باتیں فرشتہ لکھ دیتا ہے۔"

اس کا ہر مرحلہ چالیس دن ہے، یعنی چالیس دن نطفہ، چالیس دن علقہ، اور تیسرے مرحلے میں چالیس دن مضغہ (یا تخلیق) کہتے ہیں، اور آخری مرحلے میں جب "مضغہ" ہو جاتا ہے تو فرشتے کو مقرر کیا جاتا ہے لکھنے کے لیے اور بچے کے جنس کو بھی کہا جاتا ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إِنَّ أَحَدَكُمْ يَجْمَعُ خَلْقَهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، ثُمَّ يَكُونُ عَاقِلَةً مِّثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللَّهُ مَلَكًا فَيُؤَمِّرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ) (بخاری: 3208) ترجمہ: "تم میں سے ہر ایک شخص کا مادہ تخلیق چالیس دن تک اس کی ماں کے پیٹ میں اکھٹا کیا جاتا ہے، پھر وہ اتنی مدت (چالیس دن) کے لیے علقہ رہتا ہے، پھر اتنی ہی مدت کے لیے مضغہ کی شکل میں رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتا ہے، جو اس میں روح پھونکتا ہے اور چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے۔"

انتہائی مرحلہ مضغہ ہے جس سے تخلیق ہوتی ہے رب تعالیٰ کا یہ فرمان اس کی دلیل ہے: (فَاتَّخَذْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَاقِلَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ) (سورہ حج: 5)

ترجمہ: "تو ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر۔ پھر اُس سے خون کا لوتھڑا بنا کر۔ پھر اُس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تاکہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں۔"

"مُخَلَّقَةٍ" یعنی: گوشت کا ٹکڑا جس کا واضح چہرہ، جسم اور کامل تخلیق کے ساتھ آنکھ، منہ اور پاؤں وغیرہ۔

پھر آخری مرحلہ مضغہ (جو اسی دن کے بعد سے شروع ہو کر ایک سو بیس دن تک طول پکڑتا ہے) میں دھیرے دھیرے جنین کی شکل ظاہر ہونے لگتی ہے، اور اس کی جنس بھی فرشتے کو بتادی جاتی ہے، آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اس نوزائیدہ بچے کی جنس کو نہیں جانتا، جیسا کہ فرماتا ہے: (إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۝ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۝ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۝ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۝ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۝ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝۳۴) (سورہ لقمان : 34) ترجمہ: "خدا ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی (حاملہ کے) پیٹ کی چیزوں کو جانتا ہے (کہ نر ہے یا مادہ) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کام کرے گا۔ اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں اُسے موت آئے گی۔ بیشک خدا ہی جاننے والا (اور) خبردار ہے۔"

اس آیت مبارکہ اور گذشتہ حدیث کے مابین تطبیق دیں گے تو ہمیں یہ نتیجہ ملے گا کہ آیت کا معنی یہ ہے: نوزائیدہ کی تخلیق سے پہلے (تیسرے مرحلے کی تکمیل سے پہلے) صرف اور صرف خدا اس کی جنس کو جانتا ہے، لیکن اس کی تخلیق کے بعد اس کے فرشتے کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا مقررہ وقت لکھے اور جنین کے جنسیت سے اسے باخبر کیا جاتا ہے، اب جنین کا علم غیبیات کا حصہ نہیں رہا، بلکہ اب عالم گواہی کا جز ہے، کیونکہ مامور بہ فرشتہ بھی اس نوزائیدہ کی جنسیت سے مطلع ہوا ہے، حالانکہ وہ حالت غیبی سے خارج ہوا ہے، اس لحاظ سے جدید آلات کے ذریعے انسان مضغہ کے مرحلے (چار ماہ) مکمل ہونے کے بعد حمل کی شکل سے جنین کی جنس جان سکتا ہے، لہذا طبی آلات کے ذریعے اس امر کو جاننا اس آیت سے متضاد نہیں ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا پیدا کرنا چاہتا ہے، لیکن جب بھی جنین کے مذکر اور مؤنث ہونے یا بد بخت یا خوش بخت ہونے کا حکم کرے، اس کے مؤکل فرشتے بھی اس سے واقف ہو جاتے ہیں، اور پھر اس کے بعد جس کو بھی چاہے اپنی مخلوقات میں سے وہ بھی واقف ہو جاتا ہے۔"

ایک اور نکتہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں عام طور پر فرمایا ہے: "وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ" یعنی: "جو کچھ ماؤں کے رحموں میں ہے جانتا ہے"

اس آیت میں جنین کی جنس کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ فرمایا: جنین کے احوال سے آگاہ ہے، اور یقیناً جنین کی جنس جاننا جنین کے احوال میں سے ہے، لیکن دیگر معاملات جیسے: بچہ ماں کے پیٹ میں کتنا وقت گزارے گا، اور اس کی

زندگی کی مقدار، اس کے اعمال، اور اس کے رزق و روزی کی مقدار، اس کی نیک بختی اور بدبختی بھی ان حالات و معاملات میں سے ہے جو اس آیت کے عموم میں داخل ہے، کہ جس سے صرف اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة الاعلى

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی انیس (19) آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ: اس سورت نے مکہ میں بعد از سورہ تکویر شرف نزول پایا، رب تعالیٰ کے فرمان «سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى» کی وجہ سے «اعلى» اس کا نام ہوا، اسے سَبَّح بھی کہا گیا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ: بعض مشہور مفسرین جیسے: "ناصرالدین عبد اللہ بیضاوی" مؤلف تفسیر "انوار التنزیل و اسرار التاویل"، المعروف بہ تفسیر بیضاوی" مفسر محمود تفسیر افندی آلوسی مؤلف تفسیر "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم" اور مشہور اسلامی اسکالر محمد سید طنطاوی امام مسجد الازھر شریف سابقہ رئیس جامعة الأزھر مصر آیت: 14 اور 15 کی تفسیر سے متعلق کہتے ہیں کہ: "تَزَلَّى" صدقہ فطر ادا کیا، اور «وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ» عید الفطر میں رب تعالیٰ کی بڑھائی بیان کی، تکبیرات کہیں، «فَصَلَّى» عید کی نماز ادا کی۔

روح المعانی کے شیخ آلوسی نے اس دلیل کی بنیاد پر "سورة الاعلى" کے "مدنی" ہونے کا اشارہ کیا ہے۔

سورة الاعلى کے الفاظ، حروف اور کلمات کی تعداد

سورة الاعلى مکی سورتوں میں سے ہے، اس کا ایک (1) رکوع، انیس (19) آیتیں، بہتر (72) الفاظ، دوسو ننانوے (299) حروف اور ایک سو تینتیس (133) نقطے ہیں۔

(یہ بات ذکر کرنا لازم ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کیلئے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)۔

سورة الاعلى کا سورة الطارق سے ربط و مناسبت:

سورة الطارق انسان کی پیدائش اور آسمان وزمین کی تخلیق پر بحث کرتی ہے، "خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ" (طارق: 6) اور (طارق: 11، 12) سورة الاعلى

میں بھی دونوں صورتوں کا تذکرہ قدرے وسیع ہے، (آیات مبارکہ : (2، 4، اور 5 اعلیٰ میں)۔

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ : جو سورتیں رب تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے کے حکم کے ساتھ شروع ہوتی ہیں انہیں "مستبحات" کہتے ہیں ، اور سورة الاعلى "مستبحات" میں سے سب سے آخری سورہ ہے۔

سورة الاعلى کی فضیلت :

حدیث شریف میں نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید اور جمعہ کی نمازوں میں سورہ "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" اور "هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْعَاشِيَةِ" پڑھتے تھے ، اگر کبھی عید اور جمعہ ایک ہی دن میں آئے تو تب بھی یہی پڑھتے تھے ۔

اسی طرح دوسری حدیث مبارکہ میں آیا ہے : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نماز میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" ، "قُلْ يَٰ أَيُّهَا الْكَافِرُونَ" اور "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" پڑھتے تھے ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورة الاعلى سے محبت کرتے تھے ۔

سورة الاعلى کا سبب نزول:

سورة الاعلى کے سبب نزول کے بارے میں ہم حضرت عقبہ بن عامر جہنی کی ایک حدیث مروی ہے، کہ جب سورہ "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اجعلوها فی سجودکم" یعنی اسے اپنی سجدوں میں رکھو "سبحان ربی الاعلى" ۔

"سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" کا معنی ہے کہ اپنے رب کی نام کی تعظیم و تکریم بجا لائیں، جب بھی اللہ کا نام اپنی زبان پر لاؤ تو خشوع و خضوع اور عاجزی اور ادب کا خاص خیال رکھو ۔

سورة الاعلى کا موضوع اور مندرجات:

اگر ہم اس سورت کے عمومی مواد کو غور سے دیکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ بنیادی طور پر یہ سورت دواہم حصوں پر مشتمل ہے :

اول: اس میں روئے سخن خاص طور پر جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، تسبیح کے ضمن میں در اصل اللہ کی تسبیح کے ساتھ ساتھ رسالت

کی ذمہ داری پوری کرنے کی طرف اشارہ بھی ہے۔

دوم: اس حصے میں فرمانبردار مؤمنین اور بدبخت گروہوں کی سعادت اور شقاوت کے عوامل کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، سورت کے آخر میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ تمام مذکورہ حقائق صرف قرآن عظیم میں ہیں، بلکہ دیگر سابقہ کتب اور صحائف میں جیسے صحف ابراہیم او رصحف موسیٰ میں بھی مؤکد بیان کیے گئے ہیں۔

اسی طرح اس سورہ مبارکہ کے تمام متن سے اور خاص طور پر آیت "6" سے "سَنُقَرِّئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ" ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ سورت مکی دور کے بالکل ابتدائی زمانہ میں اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی دریافت کرنے کے عادی نہیں بنے تھے، اور آپ کو خدشہ تھا کہ کہیں وہ کچھ وحی بھول نہ جائیں۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ کریں گے: پہلی پانچ آیات میں خدا کی پہچان اور توحید کے اصولوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے، اور بعد کی آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو درج ذیل اطمینان اور تسلی عظیم رب کی طرف سے دی گئی ہے کہ: خدا کے فضل و کرم سے آپ قرآن کریم کو نہیں بھولیں گے۔

اور اطمینان بھی دلایا گیا ہے کہ: اس ذمہ داری اور دعوتی کام کو رب تعالیٰ نے مشکل نہیں بنایا ہے، بلکہ اس میں منحصر کر دیا ہے کہ ایسے شخص کو وعظ و نصیحت کریں اور اس کی ہدایت اور رہنمائی کا اہتمام کریں جو دعوت سے فائدہ اٹھائے اور اس میں نصیحت حاصل کرنے کی صلاحیت پائی جاسکتی ہو، جو شخص بے خوف نہیں ہوتا، وہ اپنے اعمال کے اچھے اور برے نتائج سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، وہ اپنے آپ سے ڈرتا ہے، اور وہ اپنے اور معاشرے کے برے خیالات اور نظریات کے نتائج سے ڈرتا ہے، اور معاشرے پر حاوی ظلم اور فساد سے ڈرتا ہے، اس دعوت الہی کا اصل مخاطب یہی ہے، ایسا شخص اپنے دل سے اس نجات دینے والے پیغام کو ضرور سنے گا، البتہ بد بخت اور نامراد عناصر اس دعوت سے دوری اختیار کریں گے۔

خوش شخص اپنی فکری اور اخلاقی آبیاری کرے، اور اپنے رب کو یاد کرتے ہوئے نماز قائم کرے تو فلاح اور کامیابی حاصل کرے گا، لوگ دنیا کی جلد حاصل ہونے والی زندگی کا انتخاب کرتے ہیں، اور معمولی مقاصد پر اڑے رہتے ہیں، حالانکہ دنیا حقیر اور فنا ہونے والی ہے جبکہ آخرت بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان د لایا گیا ہے کہ: آپ کی رسالت کی بنیاد اولوالعزم پیغمبروں جیسے: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سی رکھی گئی ہے، اور تاریخ کے بڑے بڑے متکبر لوگ ان انبیاء کے ہاتھوں سرنگوں ہوچکے ہیں، آپ کا اور ان کا پیغام ایک ہی ہے، اور آپ کے کام کی انتہا بھی ایک ہی ہے۔

آخر میں: سورہ مبارکہ: "الاعلیٰ" کے الفاظ اس مواد کے ساتھ ختم کیے گئے ہیں کہ نجات صرف ان کے لیے ہے، جو اپنے خیالات، اعمال اور اخلاق کو پاکیزہ بنائیں اور اپنے پروردگار کا ذکر کریں اور نماز پڑھیں۔

لیکن افسوس سے کھنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی تمام تر سوچ اور فکر اس دنیا کی خوشحالی اور راحت، فائدے اور لذتوں کے حصول کے لیے ہے اور بس، حالانکہ ان کو اصل فکر آخرت کا ہونا چاہیے، کیونکہ آخرت باقی رہنے والی جبکہ دنیا فنا ہونے والی ہے، اور آخرت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ ہیں، یہ حقائق صرف قرآن کریم میں نہیں آئے، بلکہ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی، بیان کیے گئے ہیں۔

عالم اسلام کے مشہور مفسر شیخ قرطبی (ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: عموماً صحابہ کرام بشمول حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس، ابن عمر، ابن زبیر، ابو موسیٰ و عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین، جب اس سورت کی قراءت کا آغاز کرتے تو (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى) کے بعد کہتے: "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى" یعنی نماز کے علاوہ جب تلاوت کریں تو ایسا کھنا مستحب ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم سورة الاعلیٰ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسُوِّيْ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝ وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ ۝ فَجَعَلَهُ
غُثَاءً أَوْ حَوِيًّا ۝ سَنُقَرِّبُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۝ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰ ۝ وَنُيْسِرُكَ
لِلْيُسْرَىٰ ۝ فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۝ سَيَذَكِّرُ مَنْ يَّحْشَىٰ ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَىٰ ۝ الَّذِي يَصْلَى
النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۝ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَخْشَىٰ ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝ بَلْ
تُوْثِرُونَ الْحَيَوَةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ
وَمُوسَىٰ ۝

سورت کا مختصر ترجمہ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۝	اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح بیان کرو
الَّذِي خَلَقَ فَسُوِّيْ ۝	جس نے پیدا کیا اور پھر اس کا تناسب قائم کیا
وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝	اور جس نے ہر چیز کو ایک خاص انداز دیا پھر راستہ بنایا
وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ ۝	اور وہ جس نے چارہ اگایا
فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَوْ حَوِيًّا ۝	پھر کر دیا اس کو خشک سیاہی مائل
سَنُقَرِّبُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝	ہم تمہیں پڑھا دیں گے پھر تم بھولو گے نہیں
إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۝ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰ ۝	مگر جو اللہ چاہے، یقیناً وہ کھلی بات کو جانتا ہے اور اس بات کو بھی جو چھپی ہوتی ہے

وَنُيِّسِرْكَ لِلْيُسْرَىٰ ۝٨	ہم آپ کو سادہ اور آسان شریعت کے لیے تیار کریں گے
فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۝٩	لہذا تم نصیحت کیے جاؤ، اگر نصیحت کا فائدہ ہو
سَيِّدٌ كَرَّ مِنْ يَحْشَىٰ ۝١٠	جوشخص (ہمارے رب عظیم سے) ڈرتا ہے وہ تو نصیحت قبول کرے گا
وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَىٰ ۝١١	اور برا بدبخت اس سے دور رہے گا
الَّذِي يَصِلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۝١٢	وہ شخص جو بڑی آگ میں داخل ہوگا
ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝١٣	پھر وہاں نہ وہ مرے گا اور نہ جیے گا
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝١٤	بہ تحقیق فلاح پاگیا وہ جس نے (کفر اور گناہوں سے) پاکیزگی اختیار کی
وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝١٥	اور اپنے رب کا نام ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا
بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝١٦	بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو
وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝١٧	حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے
إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝١٨	بیشک یہ بات یقیناً پہلے صحیفوں میں ہے

ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے
صحیفے

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوسٰىؑ ۱۹۰

مختصر تفسیر

اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح بیان
کرو

سَبِّحْ اِسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ۱۹۱

یعنی : ہر وہ چیز جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے، "سُبْحَانَ رَبِّيَّ الْأَعْلَى" کہتے ہوئے ان تمام چیزوں سے اس کی پاکی بیان کرو، حدیث شریف میں ہے کہ: جب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی تلاوت فرماتے تو کہتے: "سُبْحَانَ رَبِّيَّ الْأَعْلَى" (امام احمد نے اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے)

"اعلیٰ" سے مراد یہ ہے کہ : اللہ تعالیٰ ہر اس چیز سے برتر، اونچا، عظیم اور بڑا ہے جو توصیف کرنے والے اس کے وصف میں بیان کرتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں: اس آیت کی تلاوت کرنے والے کے لیے مستحب ہے کہ جب اس آیت کو پڑھے تو "سُبْحَانَ رَبِّيَّ الْأَعْلَى" کہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی کثیر تعداد کرتی تھی۔

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ : جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اجعلوها فی سجودکم" کہ تم اسے اپنے سجدوں میں رکھ لو، یہیں سے سجدے میں "سُبْحَانَ رَبِّيَّ الْأَعْلَى" پڑھا جانے لگا۔

اسی طرح ایک حدیث میں عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے میں "سبحان ربی الاعلیٰ" پڑھنے کا حکم اس آیت کی بنیاد پر دیا، اور رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّيَّ الْعَظِيمِ" پڑھنے کا حکم سورۃ واقعہ کی آخری آیت : "فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ" کی بنیاد پر دیا (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ابن المنذر۔

اس مبارک آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ عظمت والارب اپنی تسبیح بیان کرنے کا حکم دے رہا ہے، جس میں اس کی شان و شوکت اور عظمت بیان کرنا اور

اس کا ذکر کرنا اور عبادت کرنا شامل ہے، یہ ایسی تسبیح ہو جو ہمارے پروردگار کی عظمت شان کے لائق ہو، اس طرح کہ اس کے اسماء حسنی ذکر کیے جائیں، اس کے خوبصورت نام اچھے اور عظیم معانی کے ساتھ جو اس کے ہیں ہر نام میں اس کی برتری موجود ہے، اور ہمارے عظیم رب کے کام بھی ذکر ہو۔

"سَبَّحَ" اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقصان سے پاک اور منزہ ہے، اللہ تعالیٰ دیگر مخلوقات کی مشابہت سے پاک ہے۔

"رَبِّكَ" "آغاز اور ابتدا سے رب یعنی" تربیت اور پرورش کرنے والا۔

"الْأَعْلَى" اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، برتر، سب سے اوپر، اللہ تعالیٰ سب سے اوپر ہے۔

"عُلُوُّ ذَاتٍ" ذات کی بلندی، ذات کے اعتبار سے آسمان میں اور اوپر ہے، اس کا عرش اور علم ہر جگہ کو گھیرے ہوئے ہیں۔

"عُلُوُّ الْقَهْرِ" وہ ظالموں کے خلاف قاهر اور طاقتور ہے۔

"عُلُوُّ قَدَرٍ" اس کا وقار اور مرتبہ بلند ہے۔

اللّٰزِیْ خَلَقَ فَسُوِّیْ ۝۲	جس نے پیدا کیا اور پھر اس کا تناسب قائم کیا

اللہ کے عظیم کاموں میں سے ایک یہ ہے: کہ اس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا، اور ان کی شکل اچھی بنائی، ان کا قد برابر بنایا، ان کے اعضاء موزوں بنائے، اور ان کی تخلیق کو مضبوط اور خوبصورت بنایا تاکہ وہ اپنے اپنے کام کو سنبھال سکیں، جیسا کہ سورہ سجدہ میں فرمایا: **الَّذِیْ أَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ** ۝ ترجمہ: "جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا، (یعنی) اس کو پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا"

"البحر" میں اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ اس نے ہر چیز کو ترتیب سے پیدا کیا، تاکہ ان میں عدم مطابقت نہ ہو، بلکہ وہ استحکام اور طاقت میں متناسب ہیں، اور اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ انہیں حکیم اور علیم خدائے پیدا کیا ہے (البحر: 458/8)۔

"خَلَقَ" پیدا کیا ۔

"فَسَوَّيْ" نقص اور عیب کے بغیر بہترین صورت اور ساخت میں ۔

اور جس نے ہر چیز کو ایک خاص انداز دیا پھر راستہ بنایا	وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝۳۰

عظمت والے رب نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کیا ہے، اور تمام مخلوقات کی اس اندازے تک رہنمائی کی، یہ ہدایت عام ہے، یعنی اس نے ہر مخلوق کی اس چیز کی طرف رہنمائی کردی ہے جو اس کے لیے بہتر اور مفید ہو دنیاوی نعمتیں اس مذکورہ ہدایت کے زمرہ میں شامل ہیں، مفسرین فرماتے ہیں کہ افادہ عام کے مدنظر یہاں مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے یعنی مخلوق اور حیوانات جیسا کہ وہ ہونے چاہیے پیدا کیا اور ان کی ان کے کاموں اور ذمہ داریوں کی طرف رہنمائی فرمائی اور ان کو ان کے کام سکھا دیے، (روح المعانی : 104/30) اور (التسهيل: 193/4 کی طرف رجوع کیا جائے)

ہدایت کی متعدد قسمیں ہیں:

- 1 - ہدایت تکوینی یا طبعی: یہ جسم کے تمام اندرونی اور بیرونی اعضاء، پودوں اور جانوروں کے جسموں کا احاطہ کرتی ہے۔
- 2 - ہدایت غریزی: یہ حیوانات کے لیے مخصوص ہے، جن میں حسب مراتب کچھ ارادہ، فہم اور شعور واضح اور موجود ہے۔
- 3 - ہدایت فطری : اس قسم کی ہدایت غریزی ہدایت سے زیادہ کامل تر صورت ہے جو زندگی کے راستوں میں عقل و تدبر کا پہلا درجہ ہے، جو انسانی ذہن میں کھلتا ہے ۔
- 4 - آزاد اور خود مختار فکری رہنمائی: جو نظری مسائل تک پہنچنے کے لیے فطری ، محسوس اور بدیہی ترتیب دریافت کرتی ہے۔
- 5 - ہدایت وحی و نبوت (تشریعی) : یہ ہدایت ، گذشتہ ہدایتوں کی تکمیل کرنے والی ہے اور عقل کو راہ راست پہ رکھنے کے لیے اعلیٰ مرتبے کی ہدایت ہے (قرآن اور تفسیر فرقان سے انتخاب)۔

اور وہ جس نے چارہ اگایا	وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ ۝۳۱

اور جس نے آسمان سے پانی برسایا، جس کے ذریعے مختلف نباتات اور بہت سی سرسبز گھاس اُگائی، کہ لوگ اور ان کے مویشی اور تمام حیوانات اس سے کھاتے ہیں ۔

"الْبَرْغِي" چراگاہ وہ جگہ جہاں جانور چرتے ہیں، تازہ اور خشک گھاس سے ، اگرچہ آیت مبارکہ میں لفظ "مرعی" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق چوپائیوں کے چارے پر ہوتا ہے، لیکن اس عبارت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف چارہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام قسم کی نباتات ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔

فَجَعَلَهُ عُثَاءً أَحْوَىٰ ۝	پھر کر دیا اس کو خشک سیاہی مائل

پھر اس کے بعد اس مدت کو پورا کر دیا جو مدت تروتازہ رہنے کے لیے ہمارے رب عظیم نے مقرر کی تھی، وہ مدت ختم کر دی "فَجَعَلَهُ عُثَاءً أَحْوَىٰ" پھر اس کو خشک اور سیاہی مائل کر دیا، یعنی اس کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنادیا۔ یہ تنبیہ انسان کے لیے بھی ہے کہ ہمیشہ جوان اور شاداب نہیں رہے گا۔ مذکور بالا پانچ آیات میں سے: پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے نام کی تنزیہ اور تقدیس شامل ہے، اور بعد والی چار آیات اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اوصاف سے متعلق ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم اور اس کی مبارک ذات کی عظمت ہو، اور شریک، ہمسر، اور اولاد سے اس کی پاکی کا اظہار ہو وغیرہ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور وحدانیت کے دلائل ذکر کرنے کے بعد اپنے نبی پر اپنے فضل و کرم کا ذکر کیا اور فرمایا۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝۶	ہم تمہیں پڑھا دیں گے پھر تم بھولو گے نہیں

جو کتاب آپ پر وحی کی صورت میں نازل کی، اس کی حفاظت کریں گے اور اس کو آپ کے دل میں جگہ دیں گے اور آپ نہ بھولیں گے، ہدایت کے معاملے میں کوئی کمی بیشی نہیں دیکھو گے، کیونکہ ہم یہ ہدایت آپ کو حالات و واقعات کے مطابق سناتے ہیں، جیسا کہ جملہ: "فَلَا تَنْسَىٰ" سے بھلا نہ سکو گے، یعنی بھول جانے اور فراموش ہونے کا خوف نہ کیا کرو، کیونکہ ہم آپ کو یہ ہدایت اس طرح دیں گے کہ آپ اسے بھول نہ پائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے فرستادہ رسول کے لیے وعدہ ہے جو کچھ سیکھ گئے ہیں وہ بھولیں گے نہیں۔

اس آیت مبارکہ میں ہمارے رب کی طرف سے وعدہ اور خوشخبری ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس بنیاد پر کہ رب جو علم اسے عطا کرے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو فراموش نہیں کریں گے، اس کے علاوہ اس مبارک آیت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بھی شامل ہے، اس لیے کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، پڑھائی اور لکھائی سے واقف نہیں تھے، اس کے باوجود جبرئیل علیہ السلام جو کچھ ان پر تلاوت کرتے آپ بھولتے نہیں تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم کتاب کو سیکھا اور دھرائے بغیر حفظ کر لیا اور اسے فراموش نہیں کیا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہے، وعدہ کیا گیا ہے کہ جو کچھ ان پر پڑھا جائے گا وہ اسے فراموش نہیں کریں گے، (مختصر : 630/3)۔

آیت کا شان نزول: جب جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل فرماتے تو جبرئیل آخری آیت کی تلاوت سے فارغ نہیں ہوتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلی آیت کی تلاوت شروع کرتے، تاکہ آپ وہ بھول نہ جائیں، پھر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تلاوت اپنے نبی پر الہام کردی، اور ان کو اسے بھول جانے سے حفاظت میں رکھا۔

مگر جو اللہ چاہے، یقیناً وہ کھلی بات کو جانتا ہے اور اس بات کو بھی جو چھپی ہوتی ہے

إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۖ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى ۖ

(مگر جس چیز کی حکمت الہی متقاضی ہو اس کو فراموش کرو گے)

ہمارا رب ہر ظاہر اور پوشیدہ چیز کو جانتا ہے، اور اپنے بندوں کی مصلحت کو بھی جانتا ہے، اس بنا پر جو کچھ چاہتا ہے شریعت کے عنوان پر اسے مقرر کر دیتا ہے، اور اس کا حکم صادر فرماتا ہے، مفسرین اس عبارت یعنی: "يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ بندے کی قرات اور گفتگو میں سے جو کچھ وہ بندہ ظاہر کرتا یا چھپاتا ہے باخبر ہے، بندوں کے برعکس کہ وہ پوشیدہ اور مخفی کاموں سے بے خبر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی ابتدا میں لفظ: "الْجَهْرَ" (ظاہر اور آشکارا) کا ذکر فرمایا اور پھر لفظ "يَخْفَى" (پوشیدہ) اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے بندوں کو سمجھا دیا کہ: جس طرح وہ جہری اور ظاہری چیز کو جانتا ہے، اسی طرح سری اور پوشیدہ کو بھی جانتا ہے، تاکہ ان کو یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ظاہر اور باطن کا علم رکھتا ہے۔

ہم آپ کو سادہ اور آسان شریعت کے
لیے تیار کریں گے

وَنُيِّسِّرْكَ لِلْيُسْرَىٰ ۝۸

یعنی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نیک عمل انجام دینا آسان کر دیں گے، اور وحی کو آسان بنادیں گے اس طرح کہ آپ اس کو آسانی کے ساتھ یاد کریں گے، اور اس پر عمل کریں گے، سہل اور آسان راستہ یعنی: کسی بھی نقصان سے دور جو کہ اسلامی شریعت ہے، کہ سہل اور آسانی پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۝" ترجمہ: اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرماتے ہیں کہ نہ صرف تمہارا دین اور شریعت تمام ادیان سے آسان ہے، بلکہ ہر چیز تمہارے لیے آسان بنادیں گے، دوسرے لفظوں میں ہم تبلیغ اور رہنمائی کو آسان کر دیں گے اور آپ کو بھی تیار کریں گے کہ اس کام کو بخوبی انجام دیں اور تبلیغ کریں، تو جب یہ معاملہ ہے، تو آپ کا کام واضح ہے، اور یہ بھی ایک اچھی خبر ہے کہ عظیم رب اپنے پیغمبر کے تمام کاموں کو آسان بنائے گا، اور اس کی شریعت کو بھی آسان اور سادہ بنائے گا۔

لہذا تم نصیحت کیے جاؤ، اگر
نصیحت کا فائدہ ہو

فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۝۹

اس آیت میں اللہ تعالیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ: شریعت الہی اور اس کی آیات کے مطابق نصیحت کریں، اگر نصیحت قابل قبول واقع ہو، آپ وعظ و نصیحت کیجیے اگر کوئی سنتا ہے، اور نصیحت کرنے سے نصیحت کے تمام مقاصد پورے ہوتے ہوں، یا بعض آپ نصیحت ہر حال میں جاری رکھیں۔

اس آیت کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اگر نصیحت کرنا فائدہ مند نہ ہو، یعنی کہ اس نصیحت کرنے سے شر اور بُرائی میں اضافہ ہو، یا خیر اور اچھائی میں کمی ہو تو اس صورت میں نصیحت نہیں کرنی چاہیے، نصیحت کرنا لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے، ایک وہ لوگ جو فائدہ حاصل کرتے ہیں اور دوسرا وہ لوگ جو فائدہ حاصل نہیں کرتے، جو لوگ نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو رب عظیم سے ڈرتے ہیں، اس کی سزا سے ڈرتے ہیں اور ان کاموں سے دوری اختیار کریں جو ہمارے رب با عظمت کو

ناپسند ہیں، اور اچھے اعمال انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

عالم اسلام کے مشہور مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں: یہاں سے علم اور دانستگی کی اشاعت کا طریقہ اور آداب لیاجاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نا اہل اور ناشائستہ لوگوں کے سامنے اس کو بیان نہ کیا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے کے مطابق کہ: "ایسی بات لوگوں سے نہ کہی جائے کہ ان کی عقل اس کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، کیونکہ یہ کام بعض لوگوں کے لیے فتنے کا سبب بنے گا" اور فرمایا: "لوگوں سے اس انداز سے بات کرو کہ وہ سمجھ سکیں، کیا تم پسند کرو گے کہ لوگ خدا اور پیغمبر کو جھٹلائیں" (مختصر: 630/3)۔

سَيِّدٌ كَرَّ مِنْ يَحْشَى ۱۰	جوشخص (ہمارے رب عظیم سے) ڈرتا ہے وہ تو نصیحت قبول کرے گا

یعنی: جوشخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے غضب وقہر سے ڈرتا ہو خوف رکھتا ہو نصیحت پکڑے گا۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۱۱	اور برا بدبخت اس سے دور رہے گا

اور جو لوگ اس وعظ ونصیحت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے، وہ بدبخت ترین لوگ ہیں جو سب سے بڑی آگ میں ہونگے اور اس میں جلیں گے۔ "الْأَشْقَى" وہ کافر ومنکر جو اللہ کی شریعت اور قرآن سے نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

الَّذِي يَصِلَى النَّارَ الْكُبْرَى ۱۲	وہ شخص جو بڑی آگ میں داخل ہوگا

یعنی: اس خوفناک اور انتہائی دردناک آگ میں جو جہنم کی آگ ہے، وہ آگ جو دنیا کی آگ سے ستر (70) گنا زیادہ جلاتی ہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ: "نَارُكُمْ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِينَ جُزْءًا مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ"، قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّكَ كَأَنْتَ لَكَافِيَةٌ قَالَ: «فُضِّلَتْ عَلَيْهِمْ بِتِسْعَةِ وَسِتِّينَ جُزْءًا كُلُّهُنَّ مِثْلُ حَرِّهَا» (بخاری: 3265 و مسلم: 2843) ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری آگ جہنم کی آگ کے مقابلے میں (اپنی گرمی اور ہلاکت خیزی میں) سترواں

حصہ ہے، کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ ہماری دنیا کی آگ کافی نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا: دنیا کی آگ کے مقابلے میں جہنم کی آگ انہتر گناہ بڑھ کر ہے۔"

مفسر حسن فرماتا ہے: "نار کبریٰ" یعنی آخرت کی آگ، "نار صغریٰ" دنیا کی آگ۔

ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝۱۳	پھر وہاں نہ وہ مرے گا اور نہ جیے گا

وہ لوگ وہاں دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے کہ کسی بھی قسم کا سکون اور راحت نہیں دیکھیں گے، یہاں تک کہ وہ لوگ موت کی خواہش کریں گے مگر ان کو موت بھی نہیں آئے گی۔

واقعی! انسان کے لیے زندگی کا وہ دن سب سے مشکل ہوتا ہے جب انسان کو زندگی کی صورت میں کوئی امید نہ ہو، اور نہ ہی اسے موت آئے جو اسے مکمل طور پر فنا کر دے۔

جیسا کہ ہمارا رب فرماتا ہے: "لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا ۝۱۴" ترجمہ: "نہ مریں گے اور نہ ان کے عذاب میں کمی آئے گی۔"

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝۱۴	بہ تحقیق فلاح پاگیا وہ جس نے (کفر اور گناہوں سے) پاکیزگی اختیار کی

جس نے خود کو کفر اور گناہوں سے پاک رکھا، اور خود کو شرک کرنے، ظلم اور غلط رویوں سے پاک رکھا یقیناً وہ کامیاب ہے۔

"أَفْلَحَ" فلاح پائی، دوزخ کی آگ سے نجات پائی، اور جنت میں داخل ہوا۔

"مَنْ تَزَكَّىٰ" وہ شخص جس نے کفر اور شرک سے خلاصی کے بعد اپنے آپ کو ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعے پاک کیا، اور زکوٰۃ ادا کر کے بخل سے دوری اختیار کی۔

"تزکیہ" دراصل اس کا معنی نمو بڑھنے اور ترقی کرنے کا ہے، اسی طرح تزکیہ بہ معنی تطہیر اور پاکی کے بھی ہے۔

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ: تزکیہ یہ ہے کہ ایمان کفر یہ عقیدے کے فساد سے اور نفس اخلاق کے فساد سے اور اعضاء فاسد رویے سے پاک ہوں، اور زکات

جو روح کی پاکی کے لیے ہے لالچ اور بخل سے پاک ہو، اس مال سے بھی جو محروموں کے حقوق ہیں۔

قرآن کریم گیارہ قسموں کے بعد فرماتا ہے: اس سب چیزوں کی قسم جس نے اپنے نفس کو پاک کیا کامیاب رہا، اور جس نے اپنے نفس کو آلودہ کیا (اللہ تعالیٰ کے لطف و مہربانی سے) محروم ہوا، قرآن کریم نے پیامبروں کا مقصد تزکیہ اور لوگوں کی تربیت قرار دیا ہے۔

"تَزَكَّى" زکوٰۃ سے مشتق ہے پاک کرنے کی معنی میں ہے، مال کی زکوٰۃ اس لیے زکات کھاگیا کہ باقی مال کو انسان کے لیے پاک کر دیتا ہے، یہاں لفظ "تَزَكَّى" عام ہے، یہ تزکیہ ایمان اور اخلاق دونوں کو شامل ہے، اور اسی طرح مال کی زکات کو بھی، تزکیہ تک پہنچنے کے لیے مفسرین نے دو مراحل تجویز کیے ہیں:

- 1- نفس کو برائیوں سے پاک کرنا، یعنی دل کو برے اخلاق سے پاک کرنا، اور گناہوں سے بچنا، اس عمل کو تصفیہ اور تخلیہ بھی کہتے ہیں۔
- 2- نفس کی دیکھ بھال اور تکمیل کرنا حصول علوم و معارف، فضائل، اچھے اخلاق، اور نیک انجام کے ساتھ، اس عمل کو تخلیہ بھی کہتے ہیں، یعنی: دیکھ بھال اور مکمل، مزین کرنا، لیکن تخلیہ اور تخلیہ سے پہلے انسان کو اپنے کمزور نکات کو پہچاننا چاہیے۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝۱۵	اور اپنے رب کا نام ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا

اپنے رب کے ذکر میں مشغول ہو جائے اور اس کا دل اس کے ذکر سے مانوس ہو، ایسا شخص ایسا عمل انجام دے گا، جو رب کو خوش کرے گا، خاص طور پر نماز ادا کرے گا، کہ نماز ایمان کا ترازو ہے، بعض مفسرین ایسے ہیں جو "تَزَكَّى" ، فَصَلَّى کی تفسیر میں کہتے ہیں: " زکوٰۃ فطر دیتے ہیں، اور عید کی نماز پڑھتے ہیں" حالانکہ یہ مفہوم بھی شامل ہے، لیکن آیت کا معنی صرف یہی نہیں ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝۱۶	بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو

یعنی اس دنیا کی ناپسند اور ختم ہونے والی نعمت کو اختیار کرتے ہو، اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو، تمہاری ساری فکر، عقل اور دھان دنیا اور اس کی

فلاح و بھود اور راحت و فائدے اور لذتوں کی طرف ہے، اور سمجھتے ہو کہ تمام حقیقی فائدے یہی ہیں، جو یہاں حاصل ہوتے ہیں؟ اگر یہاں کسی چیز سے محروم ہو جاؤ تو سمجھتے ہو کہ یہی حقیقی نقصان ہے جس سے دوچار ہوئے ہو، افسوس کے ساتھ کھنا پڑتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ہر جلد حاصل ہونے والی چیز کی تلاش میں کوشش کرتے ہیں، جبکہ آنے والے وقتوں میں جس چیز کے ملنے کا وعدہ ہے اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

والاخرۃ خیر و ابقیٰ ۱۰	حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے

اس آیت میں اللہ فرماتا ہے: کہ آخرت دنیا کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیونکہ آخرت ہمیشہ رہنے والی اور بقا کا گھر ہے، جبکہ دنیا فنا اور نابود ہونے والی ہے، تو عاقل مؤمن بہتر کو چھوڑ کر بدتر کو اختیار نہیں کرتا، اور ہمیشہ والے سکون اور راحت کو عارضی خوشیوں اور لذتوں کی وجہ سے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اس لیے دنیا کی محبت اور اسے آخرت پر ترجیح دینا ہر غلطی کی جڑ ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا: تمہیں معلوم ہے کیوں ہم نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی؟ انہوں نے کہا: نہیں، فرمایا، کیونکہ دنیا ہمیں کھانا، پینا، عورتیں، لذتیں اور تفریح نقداً سستے میں دے دیتی ہے، اور آخرت ہماری نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ ہے، تو پھر ہم نے عاجل کو پسند کر کے آجل کو چھوڑ دیا، (تفسیر خازن: 234/4)۔

اِنَّ هَذَا اَلْفِی الصُّحُفِ الْاُولٰی ۱۸	بیشک یہ بات یقیناً پہلے صحیفوں میں ہے

وہ تمام مضامین، اچھی باتیں، اور اچھی خبریں جو اس سورہ مبارکہ میں بیان کی گئی ہیں اس آسمانی کتاب تک منحصر نہیں ہے، بلکہ سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی بیان کی گئی تھیں، جن میں ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفے ہیں، جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سب سے بڑے اوالوالعزم پیغمبروں میں سے تھے، پس یہ وہ فرامین ہیں جو ہر شریعت میں آئے ہیں، اس لیے کہ یہ احکام دونوں جہانوں کے منافع سے متعلق ہیں اور یہ اوامر ہر وقت اور ہر جگہ انسانوں کو اصلاح و منفعت فراہم کرتے ہیں۔

صُّحُفِ اِبْرٰہِیْمَ وَ مُوسٰی ۱۹	ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفے

دس صحیفے ہیں ابراہیم علیہ السلام کے اور تورات موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔

"صُف" پہلے والے صفحہ کا بدل ہے، یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آسمانی ادیان کے بنیادی مضامین اور عمومی اصول سب ایک ہیں، اور ایک ہی مأخذ سے مأخوذ ہیں البتہ صرف تعلیمات اور احکامات میں فرق ہوا ہے، جس کی وجہ وقت کا مختلف ہونا ہے اور دوسرا یہ کہ انسانی ترقی بھی اس کی متقاضی ہے، (تفسیر نور مصطفیٰ خرمدل)۔

ملاحظہ :

یہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے جہاں موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس سے پہلے "سورہ نجم کی آیات : 36-37" میں اس طرف اشارہ ہوا ہے۔

صفحہ ابراہیمی کے موضوعات اور مضامین

آجری نے حضرت ابوذر غفاری سے روایت کیا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے کیسے اور کیاتھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: اس میں عبرت کی مثالیں بیان کی گئی تھیں، ایک مثال میں ایک ظالم بادشاہ کو مخاطب کیا گیا ہے کہ: اے لوگوں پر غلبہ پانے والے، مغرور اور متکبر، میں نے تجھے بادشاہت اس لیے نہیں دی کہ تو دنیا میں دولت پر دولت جمع کرے، بادشاہت اس لیے دی کہ تو کسی مظلوم کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے کہ اس کی فریاد مجھ تک پہنچے، کیونکہ یہ میرا قانون ہے کہ میں کسی مظلوم کی پکار کو بے نوا نہیں چھوڑوں گا، چاہے وہ کافر کی زبان سے ہی کیوں نہ نکلے۔

دوسری مثال میں عوام الناس کو مخاطب کیا گیا ہے کہ عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے اوقات تین حصوں میں تقسیم کرے گا: (1) ایک وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے دربار میں دعاؤں کے لیے، (2) دوسرا، اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت، قدرت اور صنعت میں غور و فکر کرنا۔

(3) تیسرا، ضروریات زندگی کا حصول اور فطری ضرورتوں کو پورا کرنا۔ فرمایا: عقلمند آدمی کے لیے ضروری ہے کہ اپنے زمانے کے حالات سے باخبر رہے، اور بامقصد کاموں میں مصروف رہے، اپنی زبان کو اپنے قبضے میں رکھے، جو شخص اپنے قول اور فعل کو شمار میں رکھے گا، اس کی زبان کم اور صرف ضروری کاموں میں ہی استعمال ہوگی۔

حضرت موسیٰ کے صحیفوں کے موضوعات

حضرت ابوذر فرماتے ہیں: پھر میں نے پوچھا موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان میں صرف عبرت تھی جس میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں: میں تعجب کرتا ہوں ایسے بندے پر جس کو مرنے پر یقین ہو، لیکن پھر بھی اس کا دل خوشیوں سے وابستہ ہو، اور تعجب کرتا ہوں اس پر جس کو تقدیر پر ایمان ہو، لیکن پھر بھی بے بس اور مایوس ہو، اور تعجب کرتا ہوں اس پر جس کو آخرت کے حساب و کتاب کا یقین ہو، لیکن پھر بھی عمل سے ہاتھ کھینچ لیے۔

حضرت ابوذر فرماتے ہیں، پھر میں نے پوچھا: کیا جو وحی آپ پر نازل ہوتی ہے اس میں ان صحیفوں میں سے کچھ آیا ہے؟ تو فرمایا: اے ابوذر! ان آیات کی تلاوت کرو: "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ" (قرطبی)۔

آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم

یہ کھنا ضروری ہے کہ جو شخص تمام دیگر آسمانی کتابوں (تورات، انجیل، زبور، صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ) پر ایمان نہ لائے، اس کا ایمان قابل قبول نہیں ہے، اور وہ مسلمان نہیں کہلائے گا۔

آسمانی کتابوں پر ایمان واجب ہونے کی دلیل

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان کے وجوب کا حکم اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِنْ قَبْلُ ۝ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلِكِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ ۱۳۶" (سورہ نساء: 136) ترجمہ: "مومنو! خدا پر اور اس کے رسول پر اور جو کتاب اس نے اپنے پیغمبر (آخر الزماں) پر نازل کی ہے اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل کی تھیں سب پر ایمان لاؤ، اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں اور روز قیامت سے انکار کرے وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑا"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو حکم کرتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر نازل شدہ کتاب جو کہ پہلے تمام کتابوں کو شامل ہے جیسے: تورات، انجیل اور زبور پر ایمان لائیں۔

پھر آیت کے آخر میں بیان کرتا ہے کہ کوئی بھی ایمان کے ارکان میں سے کسی ایک پر کفر کرے تو وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہے اور سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے۔

پھر تمام کتابوں پر ایمان کے بیان میں اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کو حکم کرتا ہے، کہ اہل کتاب کو مخاطب کر کے اس طرح کہو کہ: "قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝۱۳۶" (سورہ بقرہ: 136)

ترجمہ: "(مسلمانو) کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں اُن پر اور جو اور پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملیں اُن پر (سب پر ایمان لائے) ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی میں بھی کچھ فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی (خدا کے واحد) کے فرمانبردار ہیں"

یہ آیت مؤمنوں کے ایمان کو جو کچھ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نازل کیا ہے شامل ہے اور جو کچھ انبیاء سے متعلق آیت میں ذکر ہوا ہے اور جو کچھ باقی انبیاء پر نازل ہوا ہے سب کو شامل ہے، اور وہ ان پیغمبروں پر ایمان میں کسی قسم کا بھی فرق نہیں کرتے، اور تمام انبیاء پر اور ان پر جو کتابیں ترتیب وار نازل ہوئی ہیں رب کی طرف سے سب پر ایمان لاتے ہیں۔

اس لیے قرآن کریم کی صریح آیات کے مطابق، جو شخص ان آسمانی کتابوں پر جو قرآن کریم سے پہلے نازل ہوئی ہیں ایمان نہیں لاتا وہ کافر ہے، کیونکہ دوسری آسمانی کتابوں پر ایمان نہ لانے کا مطلب ہے خدا کی آیتوں کا جھٹلانا جو دوسرے پیغمبروں سے متعلق ہیں، جبکہ اللہ کے تمام پیغمبر حق پر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے رہنمائی کے لیے بھیجے گئے ہیں، ان میں سے بعض انبیاء آسمانی کتاب کے حامل تھے۔

ضروری اور جاننے کے قابل نکات

سب سے پہلے: ایک مسلمان کو جاننا چاہیے کہ قرآن کریم کے علاوہ تمام آسمانی کتابوں میں تحریف، تغیر اور تبدیلی ہوئی ہے، کیونکہ خدا عزوجل قرآن کریم میں اس تحریف، تغیر اور تبدیلی کے بارے میں جو اہل کتاب نے نازل شدہ کتابوں میں کی تھیں خبر دی ہے، یہودیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے: "أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (سورہ بقرہ : 75) ترجمہ: "(مؤمنو) کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے (دین کے) قائل ہو جائیں گے (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے بعد اس کو جان بوجھ کر بدل دیتے"

اور فرماتا ہے: "مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ" (سورہ نساء : 46) ترجمہ: "اور یہ جو یہودی ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ کلمات کو ان کے مقامات سے بدل دیتے ہیں"

نصاری کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نُنْزِلُ الْكِتَابَ مِثْقَالَهُمْ فَذَرْبُوا حَظًّا ذَرْبًا بِهِ" (سورہ بقرہ : 17) ترجمہ: "اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ فراموش کر دیا تو ہم نے ان میں باہم قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینہ ڈال دیا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے خدا عنقریب اُن کو اس سے آگاہ کرے گا (14) اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر (آخر الزمان) آگئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب میں چھپاتے تھے وہ اس میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کھول کر بتا دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے قصور معاف کر دیتے ہیں"

آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ نے ان پر نازل ہونے والے کتابوں میں تحریف کی، اور یہ تحریف کبھی اضافہ کر کے اور کبھی کمی کر کے کی گئی ہے، اور ان کتابوں میں اضافہ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "قَوْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُوبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ" (سورہ بقرہ : 79) ترجمہ: "تو اُن لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے (آئی) ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی سے قیمت حاصل کریں، اُن پر افسوس ہے اس لیے کہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر اُن پر افسوس ہے کہ ایسے کام کرتے ہیں"

ترجمہ: "تو اُن لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے (آئی) ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی سے قیمت حاصل کریں، اُن پر افسوس ہے اس لیے کہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر اُن پر افسوس ہے کہ ایسے کام کرتے ہیں"

اور ان کتابوں میں کمی کی دلیل رب تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ۖ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝١٥" (سورہ مائدہ : 15) ترجمہ: "اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر (آخر الزمان) آگئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب میں چھپاتے تھے وہ اس میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کھول کر بتا دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے قصور معاف کر دیتے ہیں، بیشک تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے"

اور فرماتا ہے: "قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا ۝٩١" (سورہ انعام : 91) ترجمہ: "کہو کہ جو کتاب موسیٰ لے کر آئے تھے اُسے کس نے نازل کیا تھا، جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق (پر نقل) کر رکھا ہے ان کو تو ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو"

لیکن قرآن کریم ان تحریفات اور تبدیلیوں سے جو پہلے کتابوں میں ہوئی تھیں محفوظ اور سالم ہے، رب تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا ہے، اور وہی اس کی حفاظت کرے گا، جیسا کہ وہ خود اس کی خبر دیتا ہے: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝٩٢" (سورۃ الحجر: 9) ترجمہ: "بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"

ثانیاً: اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن سے پہلے کتابوں پر ایمان کیسے لایا جائے، اور وہ اس طرح ہے:

1۔ اس بات کی پختہ تصدیق کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اور اللہ کا کلام ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے لائق ہے اور جسے چاہا اس سے بات کی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۝ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝٢" (آل عمران: 2-4) ترجمہ: "خدا (جو معبود برحق ہے) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں زندہ ہمیشہ رہنے والا۔ اس نے (اے محمدؐ) تم پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق

کرتی ہے اور اُسی نے تورات اور انجیل نازل کی۔ (یعنی) لوگوں کی ہدایت کے لیے پہلے (تورات اور انجیل اتاری) اور (پھر قرآن جو حق اور باطل کو) الگ الگ کر دینے والا (ہے) نازل کیا۔ جو لوگ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں ان کو سخت عذاب ہوگا اور خدا زبردست (اور) بدلہ لینے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ مطلع فرماتے ہیں کہ یہ کتابیں: توریت، انجیل، اور قرآن اس کی پاس سے آئی ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے ان انبیاء سے کلام فرمایا ہے اور اس کا آغاز اس اللہ کی ذات پاک سے ہی ہوا ہے اور اس کے غیر سے نہیں، اسی وجہ سے آیت کے آخر میں وعید دیتا ہے کہ جس شخص نے خدا تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا وہ عذاب شدید میں مبتلا ہوگا۔

2- یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی

ہیں، اور ان میں باہم کوئی تناقض اور تعارض نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: "وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ

الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ" (سورہ مائدہ: 48) ترجمہ: "اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے۔ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر مشتمل یا نگران ہے"

انجیل کے متعلق فرماتا ہے: "وَأَتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ ۝ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ" (سورہ مائدہ: 46) ترجمہ: "اور اُن کو انجیل عنایت کی

جس میں ہدایت اور نور ہے اور تورات کی جو اس سے پہلے ہے تصدیق کرتی ہے"

ان کتابوں پر ایمان واجب ہے، اللہ تعالیٰ کی کتابیں تمام قسم کے تناقضات اور تعارضات سے پاک ہیں، مخلوق کی کتابوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں، کیونکہ لوگوں کی کتابوں میں نقص، خلل اور تعارض موجود ہے جبکہ اللہ کی کتب ان عیوب سے پاک ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی صفت بیان کرتا ہے:

"وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝۸۲" (سورہ نساء: 82) ترجمہ: "اگر یہ خدا کے سوا کسی اور (کا کلام) ہوتا تو اس میں (بہت سا) اختلاف پاتے"

3- یہ پختہ عقیدہ رکھنا کہ وہ تمام کتابیں اور صحیفے جو اللہ تعالیٰ نے

رسولوں پر نازل فرمائے قرآن کریم کے ذریعے سے منسوخ کر دیے گئے

ہیں، جن اور انس اور پچھلی کتابوں کے پیروکاروں یا دوسروں میں سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم کے آنے کے بعد خدا کی عبادت کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرے، یا اس قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب پر فیصلہ کرے، اس مسئلے پر قرآن و سنت میں بہت دلائل ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا" (سورہ فرقان: 1) ترجمہ: "وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا، تاکہ اہل جہاں کو ہدایت کرے۔"

اور فرماتا ہے: "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ" (سورہ نور: ۱۵) "يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ" (سورہ مائدہ: 15-16) ترجمہ: "اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر (آخر الزمان) آگئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب (الہی) میں چھپاتے تھے وہ اس میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کھول کر بتا دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ بیشک تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔ جس سے خدا اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے راستے دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور ان کو سیدھے رستے پر چلاتا ہے"

خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلہ کریں: "فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ" (سورہ مائدہ: 48) ترجمہ: "تو جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور حق جو تمہارے پاس آچکا ہے اس کو چھوڑ کر اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا"

اور اسی طرح فرماتا ہے: "وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ" (سورہ مائدہ: 49) ترجمہ: "اور (ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ) جو (حکم) خدا نے نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق ان میں فیصلہ کرنا اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو خدا نے تم پر نازل فرمایا ہے یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں۔"

اور حدیث میں سے جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ عمر بن خطاب اہل کتاب کی ایک کتاب لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور اسے پڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم غصے ہو گئے اور فرمایا: "أُمْتَهُوْا كُوْنَ فِيْهَا يَا ابْنَ الْخَطَابِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءُ نَقِيَّةً لَا تَسْأَلُوهُمْ عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوْكُمْ بِحَقِّ فَتُكْذِبُوْا بِهِ اَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوْا بِهِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَوْ اَنَّ مُوسَى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ حَيًّا مَا وَسِعَتْهُ اِلَّا اَنْ يَّتَّبِعَنِيْ" (مسند الإمام أحمد: 3 / 387، وكشف الأستار: 134، وشعب الإيمان للبيهقي: (177). وغيرهم وهو حديث

حسن بمجموع طرقه) "ترجمہ: "اے خطاب کے بیٹے! کیا اس میں تعجب کرتے ہو؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تو اس دین کو روشن اور ہر نقص سے پاک لایا ہوں، تم ان سے کچھ پوچھو گے، اگر وہ تمہیں حق کی خبر دیں تو تم اس کی تکذیب کرو گے، یا وہ تمہیں باطل کی خبر دیں جس کے تم تصدیق کر دو گے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو میرے پیروی کے سوا ان کے لیے کچھ اور راستہ نہ ہوتا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کی مختصر سے بحث ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے، اور جو قرآن میں خاص طور پر مذکور ہے۔

سوم: سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ: توریت، بائبل اور دوسری کتابوں کی آیات سے واسطہ پڑنے کی دوران ہر مسلمان کو تین صورتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

1 - وہ آیت جو دیکھتا اور سنتا ہے قرآن کی مخالف ہے، (اس حالت میں اس کو جھٹلانا واجب ہے، کیونکہ وہ تحریف شدہ ہے، ہم مسلمان ان تحریف کی ہوئی آیات پر ایمان لانے پر مکلف نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ تحریف شدہ آیات رب کی جانب سے نازل نہیں کی گئی ہیں، بلکہ انسانوں کے ذریعے اس میں تغیر اور تبدیلی کی گئی ہے، اس بنا پر ان کی تکذیب واجب ہے)۔

2 - وہ آیت جو قرآن کی آیات کے مطابق ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہے، (اس حالت میں چاہیے کہ اس پر ایمان لائے اور رب کی جانب سے اس کی نزول کی تصدیق کریں)۔

3 - وہ نہیں جانتا کہ تورات، انجیل وغیرہ کی وہ آیت جو دیکھتا یا سنتا ہے قرآن کی تصدیق کرتی ہے یا اس کی مخالف ہے، (اس صورت میں وہ نہ اس کی تصدیق کرے نہ جھٹلائے)۔

آسمانی کتابوں کے احترام کا حکم

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان بہت سے پہلوؤں پر مشتمل ہے جو کہ نصوص کی واجب ہونے، ان پر عقیدہ رکھنے اور ان کے اظہار کرنے پر دلالت کرتے ہیں، تا کہ اسلام کے ارکان میں سے سب سے بڑا رکن ثابت ہوسکے اور وہ یہ ہیں:

1 - اس بات کی پختہ تصدیق کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کو جس طرح اس کی شان کے لائق وزیبا ہے، اور جس طرح چاہا ہے ان انبیاء سے کلام کیا ہے۔

2 - اس بات پر ایمان لانا کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت، اور جو کچھ خیر، ہدایت، نور اور روشنی ہے اس کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

3 - اس بات پر ایمان لانا کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں، اور ان میں کوئی تناقض اور تعارض نہیں ہے۔

4 - یہ پختہ عقیدہ رکھنا کہ وہ تمام کتابیں اور صحیفے جو خدا نے رسولوں پر نازل کیے ہیں قرآن کریم کے ذریعے سے سب منسوخ ہوچکے ہیں، جن اور انس اور پچھلی کتابوں کے پیرو کاروں یا دوسروں میں سے کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم کے آنے کے بعد خدا کی عبادت اس کے علاوہ کسی اور طریقے پر کرے، یا اس کے بغیر کسی اور چیز پر فیصلہ کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وَالَّذِي نَفْسِي

بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ مُوسَى صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي" مسند أحمد (387)، وشعب الإيمان بیہقی (177)۔ "ترجمہ:" اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتا تو میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔"

لہذا صرف وہی چیز جو قرآن کریم میں مذکور ہے اس پر عمل کرنا واجب ہے، لیکن جو کچھ سابقہ آسمانی کتابوں میں ہے اگر وہ ہماری شریعت کی خلاف ورزی ہے تو خود بخود متروک ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ باطل تھا، ممکن ہے وہ اپنے زمانے میں حق تھا، لیکن ہم اس کے مکلف نہیں، کیونکہ ہماری شریعت کے آنے کے ساتھ ہی وہ منسوخ ہوا ہے، اگر ہماری شریعت کے موافق ہو تو لازماً ایسا حق اور سچ ہے کہ شریعت اسلام اس کے حق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

5 - اس بات کا یقین رکھنا کہ سابقہ کتابوں میں تحریف کی گئی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اہل کتاب نے ان پر نازل ہونے

والی کتابوں میں تحریف، تبدیلی اور تغیر کی ہے، اللہ تعالیٰ یہود کے بارے میں فرماتا ہے: "أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا بِالْكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (سورہ بقرہ : 75) ترجمہ: "(مؤمنو) کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے (دین کے) قائل ہو جائیں گے (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے بعد اس کو جان بوجھ کر بدل دیتے"

"مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ" (سورہ نساء : 46) ترجمہ: "اور یہ جو یہودی ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ کلمات کو ان کے مقامات سے بدل دیتے ہیں"

اور اللہ تعالیٰ نصاریٰ کو مخاطب کرتا ہے: يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ" (سورہ مائدہ: 15) ترجمہ: "اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر (آخر الزمان) آگئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب میں چھپاتے تھے وہ اس میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کھول کر بتا دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے قصور معاف کر دیتے ہیں"

اور فرمایا: "فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ" ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيُشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا" فَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ" (سورہ بقرہ: 79)

ترجمہ: "تو اُن لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے (آئی) ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی سے قیمت حاصل کریں، اُن پر افسوس ہے اس لیے کہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر اُن پر افسوس ہے کہ ایسے کام کرتے ہیں"

یہ آیات دلالت کرتی ہیں کہ اہل کتاب نے اپنے اوپر نازل ہونے والی کتابوں میں تحریف کی تھی، اور یہ تحریف کبھی اضافہ کر کے اور کبھی گھٹا کر کی گئی ہے، لیکن قرآن کریم اس قسم کی تحریف اور تغیر سے محفوظ رہا ہے، خدا تعالیٰ اس کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفُظُونَ" (سورۃ الحجر: 9) ترجمہ: "بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔"

ابو عمر اور دارائی ابو حسن منتاب سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "ایک دن میں قاضی ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق کے پاس تھا، ان سے کہا گیا:

کیوں اہل توریت کو تحریف کی اجازت دی گئی (یعنی موقع ملا یا ان کے لیے ممکن ہوا) لیکن اہل قرآن کو اس کی اجازت نہیں دی گئی؟ قاضی نے کہا: خدا عزوجل اہل توریت سے متعلق فرماتا ہے: "مِمَّا اسْتَحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ" (سورہ مائدہ : 44) ترجمہ: "کیونکہ وہ کتاب خدا کے نگہبان مقرر کیے گئے تھے" تو اس کی حفاظت ان کے سپرد کردی گئی؛ لہذا تبدیلی کا موقع کیوں دیا گیا یا ان کے لیے ممکن ہوا، اور قرآن کریم میں فرماتا ہے: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (سورۃ الحجر: 9) ترجمہ: "بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں" تو اس میں تبدیلی کا موقع یا امکان نہیں ہے۔

اس نے کہا: میں ابو عبد اللہ محاملی کی طرف گیا اور یہ واقعہ ان سے بیان کیا، تو انہوں نے کہا: میں نے اس سے زیادہ خوبصورت بات نہیں سنی۔ قرآن کریم میں پچھلی کتابوں کا خلاصہ اور سابقہ انبیاء کی شریعت کے اصول شامل ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ" (سورہ مائدہ : 48) ترجمہ: "اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے۔ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر نگہبان ہے"

سوال: ممکن ہے کوئی کہے: قرآن وسنت کے نصوص کے مطابق ہر مسلمان پر واجب ہے کہ تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرے، اور ایمان لائے، لیکن دوسرے نصوص ان کتب کی تحریف ہونے پر دلالت کرتے ہیں، اس صورت میں، ایک مسلمان کیسے ان تحریف شدہ کتابوں پر ایمان لائے؟

جواب: ہمیں مکمل یقین اور اطمینان ہے کہ رب تعالیٰ نے گزشتہ کتابوں میں جو کچھ اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمایا تھا وہ ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے محفوظ تھا، اور یہ حق ہے کسی قسم کا شک و شبہ اس میں نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس وقت جو کچھ ان کتابوں میں درج ہے اور اہل کتاب کے پاس ہے اس کو ہم قبول کریں، کیونکہ یہ کتب محرّف ہیں، جس کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں پر نازل کی تھیں اس پر باقی نہیں ہیں۔

جس توریت پر ایمان لانا واجب ہے وہ وہی کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر خدا تعالیٰ نے نازل فرمائی تھی، نہ وہ کہ جو تحریف شدہ کتاب اہل کتاب کے پاس ہے، جس انجیل پر ایمان لانا واجب ہے یہ وہ انجیل ہے جو خدا نے

عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی، اور جس زبور پر ایمان لانا واجب ہے تو وہ وہی کتاب ہے جسے خدا نے داؤد علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی نہ وہ تحریف شدہ زبور جس کو یہود نے تحریف کی ہے۔

تاہم ضروری نہیں ہے کہ اس تحریف اور تبدیلی میں ان کی پوری کتاب شامل ہو، ان کی کتابوں میں بہت سے ایسے مسائل ہوسکتے ہیں جو صحیح ہوں، چنانچہ یہ کتب بعض اسماء الہی پر مشتمل ہیں، اس لیے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام تورات، انجیل اور زبور تحریف شدہ ہیں اور انسان کی لکھی ہوئی ہیں۔

تحریف شدہ کتابوں کے بارے میں اعتقاد

1 - جس چیز کو ہم یقینی طور پر جان لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس میں تحریف اور تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس کی تصدیق کریں گے، مثلاً جس چیز کی تصدیق قرآن و سنت کرے ہم یقیناً اس کی تصدیق کریں گے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے اس کو بیان فرمایا ہے، مثال کے طور پر: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "أَمْ لَمْ يُنَبِّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۖ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۖ أَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۖ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۖ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۖ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءُ الْأَوْفَىٰ ۖ" "سورہ نجم: 36 - (41) ترجمہ: "کیا جو باتیں موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں اُن کی اس کو خبر نہیں پہنچی۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی جنہوں نے (حق طاعت و رسالت) پورا کیا۔ یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائیگا۔ اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔ پھر اُس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔"

اور فرماتا ہے: "بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۖ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۖ إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۖ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۖ" (سورہ اعلیٰ: 16-19)

یا فرماتا ہے: "كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَةُ ۚ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَةِ فَاتْلُوهَا ۖ إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ" (سورہ آل عمران: 93) ترجمہ: "بنی اسرائیل کے لیے (تورات کے نازل ہونے سے) پہلے کھانے کی سب چیزیں حلال تھیں بجز ان کے جو یعقوب نے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھیں کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تورات لاؤ اور اُسے پڑھو (یعنی دلیل پیش کرو)"

تو مثال کے طور پر: ہم ایمان رکھتے ہیں کہ تمام انواع کے طعام اور کھانے توریت میں حلال تھے، اور جو کچھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا وہ ان کے گناہوں کی وجہ سے تھا، اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ اللہ کا حکم توریت میں موجود تھا: "وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ" (سورہ مائدہ 43) ترجمہ: "اور یہ تم سے (اپنے مقدمات) کیونکر فیصلہ کرائیں گے۔ جب کہ خود ان کے پاس تورات (موجود) ہے جس میں خدا حکم لکھا ہوا ہے"

2- ہم جس چیز کو جان لیں کہ تحریف شدہ ہے اس سے انکار کرتے ہیں، وہ چیزیں جن کا قرآن و سنت نے انکار کیا ہو ہم بھی یقینی طور پر انہیں ناقابل قبول سمجھ کر تکذیب کریں گے۔

3- جن چیزوں کی قرآن و سنت نے تصدیق یا تکذیب نہیں کی ہو، ہم بھی خاموشی اختیار کریں گے، یعنی نہ تصدیق کریں گے نہ ہی تکذیب، کیونکہ اس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہے، جب تک کہ حقیقی دلائل اس کی تصدیق یا تردید کی نشاندہی نہ کریں تو ہم بھی تصدیق یا تردید میں اُن دلائل کے تابع ہونگے، مثال کے طور پر قرآن کی آیات کے خلاف ہو، اگر احکام کی آیات ہو تو ہوسکتا ہے کہ اس کے نسخ کی دلیل قرآن کی آیات کے ذریعے سے ہو، یا شاید محرف ہو، اگر آیات احکام سے متعلق نہیں ہے تو یقینی طور پر اس کی تحریف ہونے پر دلیل ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں، اور ان کے درمیان کوئی تناقض اور تعارض نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: "وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ" (سورہ مائدہ: 48) ترجمہ: اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے۔ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر مشتمل ہے۔"

انجیل کے متعلق فرماتے ہیں: "وَأَتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ ۝ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ" (سورہ مائدہ: 46) ترجمہ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: "كَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَءُونَ التَّوْرَةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ، وَيَفْسِّرُونَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ، وَلَا تُكْذِبُوهُمْ وَقُولُوا: (آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا). (بخاری: 4485)"

ترجمہ: "اہل کتاب تورات عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے اس کی تفسیر عربی میں کرتے تھے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو بلکہ یہ کہا کرو (اَمَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا) یعنی ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔"

ان وضاحتوں سے ہم پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ توریت اور انجیل کی توہین جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ کے کلام پر مشتمل ہوں، جیسا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء و صفات موجود ہے۔

ہیثمی اپنی کتاب "تحفة المحتاج" (178/1) میں کہتا ہے: یہ سچ ہے کہ: توریت اور انجیل ایسی چیزیں ہیں جن کی عدم تبدیلی کا گمان ہے، کیونکہ ہم نے جو کچھ اپنی شریعت سے سیکھا ہے وہ ان سے مطابقت رکھتا ہے۔

خطیب شربینی نے بھی کہا: ہر غیر محترم چیز کے ساتھ استنجا جائز ہے، قاضی عیاض نے توریت اور انجیل کے اوراق کے ساتھ استنجا کرنے کو جائز کھا ہے، لیکن ان کا یہ کلام ان اوراق پر محمول ہوتا ہے (یا وہ اوراق مراد ہیں) جن کی تبدیلی یا تحریف کی صراحت ہوتی ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کے نام یا اس کے مشابہ کوئی چیز نہ ہو (مغنی المحتاج: 162/1-163)۔

خرشی مالکی نے کتاب "مختصر خلیل" (63/8) میں کھا ہے: اللہ تعالیٰ کے اسماء اور انبیاء کے نام ان کے نام کے حرمت کی وجہ سے مصحف کی طرح قابل احترام ہیں۔

حطاب مالکی نے کتاب "مواہب الجلیل" (287 / 1) میں کھا: اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی کا احترام واجب ہے، اگرچہ ایسی چیزوں پر لکھی گئی ہو جن کی اہانت واجب ہو، جیسے: تورات اور انجیل جو تحریف ہوئے ہوں، ان کو جلانا اور نابود کرنا جائز ہے، لیکن ان کی توہین ان اسماء مبارکہ کی موجودگی کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

فقہی کتاب دائرة المعارف میں ہے کہ: جمہور فقہانے توریت اور انجیل کے چھونے یا ہاتھ لگانے کو بغیر طہارت کے جائز قرار دیا ہے، سوائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے انہوں نے کہا: حائضہ عورت اور جنبی آدمی کو توریت اور انجیل کی تلاوت کرنا مکروہ ہے، کیونکہ وہ سارے کا سارا کلام اللہ ہے، سوائے ان چیزوں کے جو تحریف شدہ ہیں، اور جو چیزیں تحریف شدہ ہیں وہ غیر معین ہیں (الموسوعة الفقهية)، (رد المحتار علی الدر المختار: 190/1) اور (الفتاویٰ الہندیہ: 39/1)۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ : فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حروف کی حرمت کی وجہ سے قابل احترام اشیاء سے استنجا کرنا جائز نہیں ہے مثلاً جن کتابوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے ، جیسے: حدیث ، فقہ ۔

لیکن غیر محترم کتابوں کے بارے میں نقطہ نظر کا اختلاف رکھتے ہیں ، جیسے: سحر اور جادو کی کتابیں، فلسفہ اور تورات ، انجیل جن کا تحریف ہونا واضح ہو۔

مالکیہ کہتے ہیں: حروف کی حرمت کی وجہ سے ان کتب کے ساتھ استنجا جائز نہیں ہے ۔

ابراہیم اللقائی کہتے ہیں: اگر یہ حروف عربی میں لکھے گئے ہوں تو حرمت والے ہیں، نہیں تو ان کی کوئی حرمت نہیں ہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی میں سے کوئی اسم لکھا گیا ہو۔

ولی علی اجمہوری کہتے ہیں: چاہے عربی میں لکھے گئے ہوں، یا غیر عربی میں دونوں صورتوں میں قابل احترام ہیں۔

شافعیہ کہتے ہیں: غیر محترم اشیاء جیسے: فلسفہ کی کتابیں، اور اسی طرح تورات اور وہ انجیل جس کی تحریف کا معلوم ہوا ہو، اور اللہ کے اسم سے خالی ہو تو اس سے استنجا جائز ہے ۔

ابن عابدین علماء حنفیہ سے نقل کرتے ہیں " ہمارے نزدیک اس طرح روایت ہوا ہے کہ حروف (قرآن) حرمت والے ہیں، یہاں تک کہ مقطعات کیوں نہ ہوں، اور بعض قراء نے نقل کیا ہے کہ قرآن کے حروف ہجا بود علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے ۔

اس بات کا فائدہ یہ ہے کہ ان حروف کا کوئی حرف کسی بھی چیز پر لکھا ہوا ہو تو وہ حرمت والا ہے، (البوسوعة الفقهية : 181/34)۔

(اس موضوع کی تفصیل حاشیہ ابن عابدین (1/ 227) حاشیہ الدسوقی (1/ 113) مواہب الجلیل (1/ 287) نہایۃ المحتاج (1/ 132) کشاف القناع (1/ 69) اور المغنی (1/ 158) میں ملاحظہ کریں)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو یہود کو لعن کرتا ہے اور ان کے دین پر بھی لعنت بھیجتا ہے ، اور تورات کو گالیاں دیتا ہے کیا ایک مسلمان کے لیے جائز ہے کہ ان کی کتاب کو گالی دے؟

جواب دیا: "کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ تورات کو لعن کرے، بلکہ جس شخص نے تورات پر علی الاطلاق لعنت کی اس سے توبہ کا مطالبہ

کیا جائے گا، اگر اس نے توبہ نہیں کی تو قتل کیا جائے گا، اور اگر اس کتاب میں کسی ایسی چیز پر لعنت بھیجی جس کے بارے میں واضح ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے تو اس حالت میں اسے قتل کیا جائے گا، حتیٰ کہ علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

اور اگر یہود کے اُس دین کو لعنت کرے جس پر وہ آج قائم ہیں، اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے، کیونکہ یہود اور ان کا دین ملعون ہے، اسی طرح اگر وہ تورات جو ان کے پاس ہے کو گالی دے، اور یہ واضح کر دے کہ اس کا مقصد اس کا تحریف شدہ حصہ ہے، مثلاً کہہ دے کہ: یہ تورات محرّف اور نسخ شدہ ہے اس کے مواد پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، اور جس نے بھی ان کی محرّف اور منسوخ شدہ شریعت پر عمل کیا وہ کافر ہے، یہ بات اور اس طرح کی بات کرنا حق ہے، اور اس کے کہنے والے پر کوئی مسئلہ نہیں ہے (مجموع الفتاویٰ: 200/35)

خلاصہ یہ ہے کہ:

انجیل کی توہین، اہانت اور بے حرمتی کرنا اور وہ توراۃ جو اہل کتاب کے پاس ہے جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ کتب حق اور باطل دونوں پر مشتمل ہیں، نیز اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات بھی ان میں شامل ہیں، لہذا ان چیزوں کی حرمت کے تحفظ کے لیے ان کی اہانت جائز نہیں ہے، مثال کی طور پر انجیل یا تورات کو زمین پر دے مارے، البتہ ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ ان تحریف کیے ہوئے کتب کا بند و بست کرے، اور ان کو پڑھے، مگر وہ حضرات جو اہل علم ہیں ان کی اکاذیب کے استخراج کا ارادہ رکھتے ہوں، تو اگر ان کتابوں میں سے کوئی بھی ہمارے ہاتھ لگے تو ان کی حفاظت اور نگرانی کرنا جائز نہیں ہے، جس طرح ان کی توہین کرنا مثلاً کچرے کی بالٹی میں ڈالنا جائز نہیں ہے، لیکن اس کو جلا کر اس سے خلاصی حاصل کی جاسکتی ہے، کیونکہ اسماء الہی پر مشتمل ہے، اور ممکن ہے ایسے مسائل و احکام بھی ہوں جو تحریف سے محفوظ رہے ہوں۔

اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ان کو جلایا جائے اس کی بے حرمتی اور بے ادبی کے لیے نہیں، بلکہ اہانت سے بچانے کے لیے ہے، اس لیے کہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ صحابہ کرام نے مصحف کے اوراق کو اہانت سے بچانے کے لیے ان کو جلایا تا کہ ان کو بے حرمتی سے بچایا جائے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة الغاشية

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی 26 آیات ہیں

وجه تسمیہ:

یہ سورت رب تعالیٰ کے فرمان "هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ" سے شروع ہونے کی وجہ سے "غَاشِيَةٍ" کہلائی، "غَاشِيَةٍ" قیامت کے ناموں میں سے ایک ہے، "غَاشِيَةٍ" قیامت اور پوشیدہ کے معنی میں ہے، اس سورت کے تین نام ذکر کیے گئے ہیں:

1 - "الْغَاشِيَةِ"

2 - "هَلْ أَتَاكَ"

3 - "هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعے کی نماز میں "سورة الاعلى" اور "سورة الغاشية" پڑھا کرتے تھے، "كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْعِيدَيْنِ، وَفِي الْجُمُعَةِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ، قَالَ: وَإِذَا اجْتَمَعَ الْعِيدُ وَالْجُمُعَةُ، فِي يَوْمٍ وَاحِدٍ، يَقْرَأُ بِهِمَا أَيْضًا فِي الصَّلَاتَيْنِ" (مسلم: 878)

چونکہ ان دو سورتوں کے معانی بہت اہم ہیں اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں بار بار آئیں اور محفوظ ہوجائیں، سورہ غاشیہ کے تمام مضامین اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سورت بھی ان سورتوں میں سے ہے جو بعثت کے ابتدائی ایام میں مکہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نزول کے وقت ہی عام تبلیغ شروع کردی تھی اور اہل مکہ نے اسے عموماً سنا، مگر اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

سورة غاشية کے بحث کا محور:

سورة غاشية کا محور آخرت اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں نقطہ

نظر کی اصلاح ہے، جو ایک بدیہی مسئلہ ہے، عقل اور روایت سے ثابت ہے، اسی طرح لوگوں کی زندگیوں میں آخرت پر ایمان کے اثرات اور اس اہم واقعہ کے بارے میں ان کا موقف جو صرف ایک بار رونما ہوتا ہے، سورت کے نام کے ساتھ اس سورت کا محور جو غاشیہ ہے اور "غشا" کے مادے سے ہے، ایسے پردے کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو مکمل ڈھانپتا ہے، اس طرح کہ اس میں سے کچھ نظر نہ آئے، اس لیے کہ "غاشیۃ" قیامت کے ناموں میں سے ہے، یہ قیامت کے ہمہ گیر ہونے کو بتاتی ہے۔

سورة الغاشية کا سورة الاعلى سے ربط و مناسبت:

ہم کہہ سکتے ہیں کہ سورہ غاشیہ سورہ اعلى کی مختصر تفسیر ہے، البتہ یہ سورت مؤمن و کافر کے احوال، جنت اور دوزخ کے بارے میں تھوڑا سا زیادہ بتاتی ہے، سورہ اعلى میں فرماتا ہے: "وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝۱۱ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَى ۝۱۲ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۝۱۳" (اعلى: 11 تا 13) سورة الغاشية اس کی تفسیر یوں بیان کرتی ہے: "عَامِلَةٌ تَأْصِبُهُ ۝۳ تَصْلَى نَارًا حَامِيَةً ۝۴ تُسْقَى مِنْ عَيْنٍ أُبْيَیَّةٍ ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيحٍ ۝۶ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ۝۷" (سورة الغاشية مؤمنوں کی صفات کے بارے میں بتاتی ہے: "وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ تَائِمَةٌ ۝۸ لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝۹ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۱۰ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۝۱۱ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۲ فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ۝۱۳ وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ۝۱۴ وَمَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝۱۵ وَزَرَّابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ۝۱۶" (8 تا 16) سورة اعلى میں فرماتا ہے: "وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى ۝۱۷" (اعلى: 17)

سورة الغاشية کے الفاظ، آیات اور حروف کی تعداد:

اس سورت کا نام "الْغَاشِيَّةُ" ڈھانپنے والی ہے، یہ نام سورت کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے، یہ سورت مکہ مکرمہ کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی ہے، "سورة الغاشية" مکی ہے سورة الذاریات کے بعد نازل ہوئی ہے، اس کا ایک (1) رکوع، چھبیس (26) آیتیں، بیانوے (92) الفاظ، تین سو چوراسی (384) حروف، اور دو سو سولہ (216) نقطے ہیں۔

(واضح رہے کہ قرآن کی سورتوں میں حروف کی تعداد گنتے میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے تفسیر احمد سورة الطور ملاحظہ کریں)

سورة الغاشية کا خلاصہ:

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا "الْغَاشِيَةِ" ڈھانپنے کے معنی میں ہے، اور "غَاشِيَةٍ" نام کا چناؤ قیامت کے لیے اس لیے ہے کہ اس کے خوفناک واقعات اچانک سب کو اپنے گھیرے میں لے لیں گے، سورہ غاشیہ کے مجموعی اور بنیادی مشتملات کا خلاصہ درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1- اس سورت کی پہلی آیت میں قیامت کے آنے سے متعلق بحث کی گئی ہے، کیونکہ اس دن کی سب سے واضح اور اہم خصوصیت اس کی ہمہ گیریت ہے، قیامت کا ابتدائی مرحلہ ہم سب جانتے ہیں کہ موت ہے، اور یہ عام بھی ہے، شاید انسان بہت سے دینوی مسائل، حوادث اور واقعات میں شرکت سے انکار کرسکتا ہے، لیکن قیامت سے پہلے موت کے اہم واقعہ میں دوسروں کے ساتھ شرکت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، سب کے سب موت میں شریک ہیں اور ان کو مرنا ہی ہے، البتہ موت کے وقت میں تقدیم اور تاخیر موجود ہے، کوئی جلدی موت کو گلے لگاتا ہے اور کوئی دیر سے، جبکہ موت بذات خود "غَاشِيَةٍ" کی ایک قسم ہے البتہ چھوٹے پیمانے پر، آیات "2 تا 7" ان میں لوگوں کے ایک گروہ کا حال بیان کیا گیا ہے جو قیامت کے دن ذلیل اور رسوا ہوں گے، کیونکہ وہ دنیا میں گناہوں کا ارتکاب کرکے اس ذلت و رسوائی کے مستحق قرار پائے۔

2- آیات "8 تا 16" دوسرے گروہ کی حالت بیان کرتی ہیں جو اپنی دنیاوی کوششوں پر خوش اور فخر کرتے ہیں۔

3- آیات "17 تا 20" آفاق کی نشانیوں پر دلالت کرتی ہیں جو ہدایت الہی کی عظمت کو ثابت کرتی ہیں۔

4- آیات "21 اور 22" میں لوگوں کی رہنمائی کے سلسلے میں داعی اور مبلغ کے فرائض بتائے گئے ہیں کہ ایک دعوت دینے والے کی ذمہ داری کیا ہے۔

5- آیات "23 تا 26" تک ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جو ہدایت سے منہ موڑ چکے ہیں۔

سورت کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ آپ اس

مخالفت سے نہ تھکنا جو یہ جاہل عناصر آپ کے خلاف کر رہے ہیں، بلکہ اپنا کام تسلسل سے جاری رکھیں۔

اے محمد! تو نصیحت کرنے والا اور ڈرانے والا ہے، انہیں نصیحت کرو اور بھولے ہوئے حقائق کی ان کو یاد دہانی کرواؤ اور ان کو یاد دلاؤ، اور ان کو یہ باور کرا دو کہ انجام کار اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ کر جانا ہے، اور پروردگار تم سے حساب لے گا۔

سورة الغاشية

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ۝ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ تَأْسِبُ ۝ تَصْلِي نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقَى
 مِنْ عَيْنٍ أُنِيَّةٍ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيحٍ ۝ لَا يُسِينُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ۝ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ
 تَائِمَةٌ ۝ لِسْعِيهَا رَاضِيَةٌ ۝ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَا غِيَةَ ۝ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝ فِيهَا سُرُرٌ
 مَرْفُوعَةٌ ۝ وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ۝ وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝ وَزَرَّازِي مُبْشُورَةٌ ۝ أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ
 كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ
 سُطِحَتْ ۝ فَذَكِّرْ ۝ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۝ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ۝	کیا تیرے پاس ڈھانپ لینے والے کی خبر پہنچی؟ (1)
وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝	اس روز بہت سے چہرے (والے) ذلیل ہوں گئے (2)
عَامِلَةٌ تَأْسِبُ ۝	سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے (3)
تَصْلِي نَارًا حَامِيَةً ۝	دھکتی آگ میں داخل ہوں گے (4)
تُسْقَى مِنْ عَيْنٍ أُنِيَّةٍ ۝	وہ ایک کھولتے ہوئے چشمے سے پلائے جائیں گے (5)
لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيحٍ ۝	اور خاردار جھاڑ کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں (ہوگا) (6)
لَا يُسِينُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ۝	جو نہ فریبی لائے گا نہ بھوک میں کچھ کام آئے گا (7)
وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ تَائِمَةٌ ۝	بہت چہرے اس دن خوش و خرم ہوں گے (8)

لَسْعِيهَا رَاضِيَةً ۝٩	اپنے نیک اعمال پر شاداں ہوں گے (9)
فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝١٠	عالیشان جنت میں ہوں گے (10)
لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۝١١	جس میں وہ کوئی لغو بات نہیں سنیں گے (11)
فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝١٢	اس جنت میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے (12)
فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝١٣	اس میں اونچے اونچے تخت ہیں (13)
وَأَكْوَابُ مَوْضُوعَةٌ ۝١٤	اور آب خورے (قرینے سے) رکھے ہوئے (14)
وَمَنَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝١٥	اور وہاں گاؤں تکیے ہیں برابر لگے ہوئے (15)
وَزَرَائِبُ مَبْنُوتَةٌ ۝١٦	اور وسیع و عریض قالین بچھے ہوئے (16)
أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝١٧	کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے، وہ کیسے بنائے گئے ہیں! (17)
وَالِى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝١٨	اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیسے بلند کیا گیا ہے (18)
وَالِى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝١٩	اور پہاڑوں کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح (زمین پر مضبوط) کھڑے کیے گئے ہیں (19)
وَالِى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝٢٠	اور (نہیں دیکھتے) زمین کو کہ کس طرح بچھائی گئی (20)
فَذَكِّرْ ۝٢١	اے پیغمبر! تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو (21)
لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُضَيِّطٍ ۝٢٢	تم ان پر داروغہ نہیں ہو (22)
إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ۝٢٣	ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا (23)
فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝٢٤	تو خدا اس کو بڑا عذاب دے گا (24)
إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝٢٥	بیشک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے (25)

پس ہماری ذمہ داری ہے ان سے حساب لینا
(26)

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝۲۶

مختصر تفسیر:

بابرکت آیات "1 تا 7" میں قیامت اور جہنم میں لوگوں کی حالت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
هَلْ أَتٰكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ۝۱	کیا تیرے پاس ڈھانپ لینے والے کی خبر پہنچی؟ (1)

اے محمد! کیا آپ کے پاس قیامت کی خبر آچکی ہے جو اپنی ہولناکیوں کے ساتھ مخلوق پر چھا جائے گی؟

یہاں استفہام تشویق کا مطلب یہ ہے کہ اس خبر کو کان لگا کر سنیں، اور اس کو ہولناک اور ڈراونا بتا کر اس دن کو بڑا ظاہر کرنا مقصود ہے، یعنی ایک ایسی مصیبت جو تمام جہاں پر غالب آجائے گی، قیامت وہ دن ہے جو سب پہ آئے گا، کوئی مشتسلی نہیں ہے، اس دن کو "غَاشِیَّة" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سختی اور ہولناکی تمام لوگوں کو لپیٹ میں لے لیگی۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ان آیات میں آخرت کے تمام مراحل، موجودہ نظام کے انہدام سے لے کر تمام انسانوں کے زندہ ہونے تک، اور تمام انسانوں کے لیے عدالت الہی سے حکم کے اجراء وغیرہ تمام مراحل کو، اور ایک ساتھ ہی ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ الحج میں "غَاشِیَّة" کی تعریف اور تعبیر اس طرح کی گئی ہے: جب آئے گا اس کے ساتھ زلزلہ تو ایک شدید قسم کا جھٹکا ہو گا جو سب کو غافل، حیران اور پریشان کر دے گا، (یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ) (الحج : 2) ترجمہ: "(اے مخاطب) جس دن تو اس کو دیکھے گا (اُس دن یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی" (وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا) (الحج : 2) ترجمہ: "اور تمام حمل والیاں اپنا حمل گرا دیں گی"

(وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَى) (الحج : 2) ترجمہ: "اور دیکھو گے لوگوں کو بے خود، نشے میں اور حیران ادھر ادھر بھاگ رہے ہوں گے، کچھ معلوم نہیں کہ کس کام میں مشغول ہیں" (وَمَا هُمْ بِسُكَرَى وَلَكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ۝۲) (الحج : 2) ترجمہ: "حالانکہ وہ بے خود اور نشے میں نہیں ہیں، بلکہ غاشیہ نے ایسے حالات پیدا کیے ہیں، اور کوئی بھی اس حالت سے بھاگ نہیں سکتا۔"

مفسرین فرماتے ہیں کہ: قیامت کے دن خوف، ڈر اور سختیاں لوگوں کو گھیر لینگے، اس کے حوادث اور یہ سختیاں عام ہوں گی، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس حالت کو "غاشیۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"غاشیۃ" غشاء کے مادے سے ہے، ایسے پردے کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو مکمل ڈھانپ لے، قرآن کریم میں لفظ غطاء بھی آیا ہے جو کہ غاشیہ ہی کا معنی دیتا ہے، لیکن معمولی فرق کے ساتھ "غشاء" نازک پردے کو کہتے ہیں اور غطاء موٹے اور ضخیم پردے کو، غشاء: گھیرنے والا، لپیٹنے والا اور ڈھانپنے والا۔

وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲	اس روز بہت سے چہرے (والے) ذلیل ہوں گے (2)

قیامت کے دن بہت سے چہرے اپنے بد اعمالیوں اور غلط کاموں کی وجہ سے خوار، ناامید، اور سیاہ ہوں گے، کیونکہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو پشیمانی ان کو گھیر لیگی، اور نقصان اٹھانے کا احساس کر لیں گے۔

حضرت امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: جب حضرت فاروق اعظمؓ ملک شام تشریف لے گئے، تو ایک عمر رسیدہ نصرانی راہب ان کے پاس آیا، اور اپنے مذہب کے مطابق عبادت، ریاضت اور محنت میں مشغول ہو گیا، اس محنت کے اثر سے اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا، اس کا جسم کمزور تھا اور اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، جب فاروق اعظمؓ نے اسے دیکھا تو رونے لگے، لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا؟ تو آپ نے فرمایا: مجھے اس بوڑھے پر ترس آتا ہے کہ جس مقصد کے لیے محنت اور مشقت کی ہے وہ اللہ کی رضا ہے جسے یہ حاصل نہیں کر سکا، تب حضرت فاروقؓ نے یہ آیت تلاوت کی: "وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ" (قرطبی) "خَاشِعَةٌ" ذلیل اور بُری حالت ہوگی،

پریشان، خوار، "وُجُوْہ" (چہرہ) بیان کیا ہے مگر اس سے مراد (اصحاب وجوہ) چہرے والے ہیں۔

یہ آیت پہلی والی آیت "الْغَاشِیَةِ" کی تفصیل ہے کہ گنہگاروں کے چہروں کے بارے میں بتایا ہے جو ان کے دل اور اندرونی احساس کو ظاہر کریں گے، اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح جھکے ہوئے، شرمندہ اور پریشان حال ہوں گے، "غَاشِیَةِ" کے گھیرنے کی وجہ سے ان کی فکرمندی ان کے چہروں سے عیاں ہوگی، اور وہ چہرے ذلیل و رسوا ہوں گے۔

سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے (3)

عَامِلَةٌ ثَّابِتَةٌ ۝۳

(دنیا میں) وہ مسلسل عمل کرتا رہا (اور) تھک گیا (چونکہ وہ صحیح راستے پر نہیں تھا، اس نے کوئی نتیجہ نہیں دیکھا) مفسرین فرماتے ہیں: یہ آیت کافروں سے متعلق ہے، وہ زنجیریں اور طوق کھینچتے ہوئے تھک جائیں گے جیسے اونٹ کیچڑ میں دھنستا ہے، اسی طرح وہ آگ میں دھنس جائیں گے، وہ اونچی اور نیچی جگہوں اور دروں میں اوپر نیچے جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ غافر میں فرماتا ہے: (إِذِ الْأَغْلُلُ فِيَّ أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسُلُ ۝۱۰ يُسْحَبُونَ ۝۱۱) فِي الْحَبِيمِ ۝۱۲ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ ۝۱۳) ترجمہ: "جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (اور) گھسیٹے جائیں گے۔ (یعنی) کھولتے ہوئے پانی میں۔ پھر آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔"

یہ ان کے اس تکبر کا بدلہ ہے جو دنیا میں کرتے تھے، اور دنیاوی لذتوں اور بے مقصد خواہشات میں غرق ہونے کی سزاء ہے۔

دہکتی آگ میں داخل ہوں گے (4)

تَصْلٰی نَارًا حَامِيَةً ۝۴

وہ آگ کہ جو جسم کی کھال کو جھلساتی ہے، وجود کے اعضاء کو پگھلاتی ہے، نہ انہیں کوئی رعایت ملے گی اور نہ اس کے عذاب سے نجات پائیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: جہنم کی آگ تیز ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر بھڑکے گی، (خازن: 237/4)

"تَضَلَّى" آگ میں داخل ہوں گے اور اس میں جلیں گے (انشقاق: 12، اعلیٰ: 12)

"حَامِيَّةٌ" حد سے زیادہ گرم اور جلانے والی (قاسمی)

"حَامِيَّةٌ" :

- 1 - کبھی بھی نہیں بجھے گی بلکہ ہمیشہ جلتی رہے گی۔
- 2 - دنیا کی آگ کی طرح نہیں کہ کبھی گرم، کم اور زیادہ ہو یا مکمل طور پہ بجھ جائے۔
- 3 - آگ تمام جہتوں اور اطراف سے گھیرے ہوگی۔
- 4 - قیامت کے دن آگ سے ایک گردن اٹھے گی اور بولے گی اور کافروں کو پکارے گی۔

تُسْقَى مِنْ عَيْنٍ اِنِّيَّةٍ ۝	وہ ایک کھولتے ہوئے چشمے سے پلائے جائیں گے (5)

ایسے گرم اور کھولتے ہوئے چشمے کے پانی سے پئیں گے کہ جس کی حرارت جوش مارنے کی وجہ سے آخری حد کو پہنچی ہوئی ہوگی، یعنی اہل جہنم جب بھی مدد یا پانی مانگیں گے تو انہیں "اِنِّيَّةٌ" چشمے سے گرم اور کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا، جس کی گرمی کی وجہ سے ان کی آنتیں کٹ جائیں گی اور اس کے جلنے کی شدت سے ان کے چہروں کا گوشت گرجائے گا، ایک ایسا چشمہ جس کا پانی زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت کو پہنچ چکا ہوگا، (وَسُقُوا مَاءً حَمِيماً فَقَطَّعَ اَمْعَاءُ هُمْ ۝۱۵) ترجمہ: "اور جن کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو ان کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا"

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝	اور خاردار جھاڑ کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں (ہوگا) (6)

یعنی جہنمیوں کے لیے ضریع کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا، ضریع ایک کانٹے دار پودا ہے جس کا ذائقہ تلخ ہوگا وہ ان کو دیا جائے گا، کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی تھی چنانچہ اب وہ تمام نعمتوں سے محروم رہیں گے، دنیا میں جانوروں جیسی زندگی گزارتے تھے، چنانچہ ان کا کھانا خاردار اور کڑوی جھاڑیاں اور پودے ہو نا چاہیے، اس کے بعد کہا گیا

کہ یہ کڑوے اور کانٹے دار گھاس پھوس میں سے ہے جو نہ کسی کو موٹا کرے گا اور نہ بھوک مٹائے گا۔

اس مبارک آیت میں فرمایا ہے: ان کا کھانا ضریع ہے: "لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ صَرِيحٍ" جبکہ سورہ حاقہ آیت (36) میں فرماتا ہے: "وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسِيلٍ" یہ دونوں متضاد نہیں ہیں، کیونکہ عذاب کی مختلف صورتیں اور اقسام ہیں، اور گنہگار بھی مختلف ہیں، بعض کا کھانا زقوم ہے اور ایک گروہ کا کھانا ضریع اور بعض کی خوراک غسلین ہے، اس ترتیب سے عذاب کی مختلف انواع اور صورتیں ہیں۔

ضریع کیا ہے؟

اس بارے میں مفسرین کرام نے مختلف تفسیریں بیان کی ہیں، مفسرین میں سے بعض نے کہا: ضریع خاردار جھاڑی کی ایک قسم ہے جو زمین میں چھپکی ہوئی ہے، ایک زہریلی گھاس ہے کہ کوئی جانور اس کے قریب نہیں جاتا، اور یہ کانٹے دار گھاس جب تازہ ہو تو قریش والے اسے "شبرق" اور جب سوکھ جاتی ہے تو "ضریع" کہتے ہیں۔

خلیل علماء لغت میں سے ہیں بیان کرتے ہیں کہ: "ضریع" ایک سرسبز اور بدبودار گھاس ہے جو سمندر سے باہر آتی ہے۔

ابن عباسؓ "ضریع" کی تعریف میں لکھتے ہیں: یہ آگ کا درخت ہے اگر دنیا میں ہو تو جو کچھ اس میں ہے سب جلا دے گی۔

قتادہ کہتے ہیں کہ: کھانے کی سب سے بدترین، ناپاک اور بُری چیز ہے (مختصر: 632/3)

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "ضریع" ایک چیز ہے دوزخ میں، کانٹے کی طرح، گھیکھوار سے زیادہ کڑوا اور مردار چیز سے زیادہ بدبودار، آگ سے زیادہ جلانے والا، خدا نے اس کا "ضریع" نام رکھا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے: کہ "ضریع" ایک گھٹیا قسم کا کھانا ہے جو جہنم والے اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور میں تضرع اور عاجزی اختیار کریں گے، یہ کھانا نہ ان کو فربہ کرے گا نہ ان کی بھوک مٹائے میں

کوئی اثر رکھے گا، جیسا کہ فرماتا ہے:

جو نہ فرہی لائے گا نہ بھوک میں کچھ کام آئے گا (7)	لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ، ○

(ایسا کھانا نہیں ہے کہ جو جسم کو تقویت پہنچائے یا بھوک مٹائے، یہ غذا کانٹے دار، خشک، اور زہر آلود ہے جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک کا احساس ختم کرے گا، بلکہ اس برعکس درد میں اضافہ اور بیماری کو بڑھائے گا) علماء نے کہا ہے: کہ یہ ایک قسم کی غذا ہے جو حلق میں اٹک جاتی ہے اور بذات خود ایک قسم کا عذاب ہے۔

جنہوں نے اس دنیا میں ہر طرح کے لذیذ، مرغن اور عمدہ کھانے ظلم و جبر اور دوسروں کے حقوق کی مایالی کے ذریعے حاصل کیے اور محروموں کو حلق میں اٹکنے والے اور ناگوار کھانوں کے علاوہ کسی چیز کا استعمال نہ کرنے دیا، ان کے لیے وہاں ایسا ہی تکلیف دہ کھانا ہونا چاہیے۔

"يُسْمِنُ" سَمَنُ کے مادے سے ہے، موٹے ہونے کا معنی دیتا ہے، اس کی ضد هُزَال ہے، یعنی لاغر ہونا، گھی کو سَمَن کہتے ہیں، شاید اس لیے کہ یہ بھی انسان کے موٹے ہونے کا ایک سبب ہے۔

محترم قارئین!

واضح رہے کہ سابقہ آیات میں قیامت اور خوش نصیبوں، بدبختوں کے گروہ اور ان کے مقام اور ان کی جزاء اور سزاء پر بحث کی گئی ہے۔

بابرکت آیات 8 تا 28 میں ہمارا عظیم رب اپنی قدرت اور وحدانیت کے دلائل بیان کرتا ہے، اور وہ تنبیہ کرتا ہے کہ وہ بلند آسمان، وسیع زمین، اونٹوں کی حیرت انگیز تخلیق، پہاڑوں اور چیزوں کو دیکھیں اور اچھی طرح سوچیں اور خدا کی شان و عظمت کو یاد کریں۔

اسی طرح ان آیات میں نیک اور مخلص مؤمنوں کی حالت اور اہل جنت کی بے مثال نعمتوں کی توصیف و تعریف بیان کرتا ہے۔

وَجُودُهُ يُؤْمِنُ تَائِعَةً ○	بہت چہرے اس دن خوش و خرم ہوں گے (8)

اس آیت مبارکہ میں جنتیوں کی توصیف و تعریف اور ان کے چہروں کے

بارے میں بحث کی گئی ہے، بہت سے چہرے اس دن شاداب، تر و تازہ اور خوش و خرم ہوں گے، جیسا کہ فرماتا ہے: (تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝۲۴) (مطففین) اس کے برعکس دوزخیوں کے چہرے اس دن ذلیل و خوار ہوں گے۔

"نَّاعِمَةٌ" کی بنیاد "نعمۃ" ہے یہاں مراد وہ چہرے ہیں جو نعمتوں سے بھرے ہوئے اور خوش نما روشن ہوں گے، حقیقت یہ ہے کہ: واقعی خوشی چہرے سے عیاں ہوتی ہے، یہ چہرے خوش نصیبوں اور اچھے لوگوں کے ہوں گے، وہ لوگ جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور دنیا میں بھی وہ مقام رکھتے ہیں، لیکن درحقیقت اس دنیا میں وہ اپنی آخرت کے لئے کوشش کرتے ہیں، دوسرے الفاظ میں وہ دنیا کو ایک پُل سمجھتے ہیں جسے عبور کر کے آخرت میں پہنچ جاتے ہیں، اور پُل کو بھی ایسا مضبوط بنائیں کہ جلدی نہ گرے، تاکہ ہم خود بھی اسے عبور کر لیں اور دوسرے بھی عبور کر سکیں۔

لِّسَعِيهَا رَاضِيَةً ۝۹	اپنے نیک اعمال پر شاداں ہوں گے (9)

ان چہروں کی صفت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی کوششوں سے (دنیا میں کیے ہوئے نیک اعمال سے) مطمئن اور خوش ہیں، یعنی: دنیا میں انہوں نے جو عمل کیے ہیں اس سے راضی ہیں، کیونکہ انہیں اس کا اطمینان بخش اجر ملا ہے۔

جہنمی لوگ جنہیں تھکاوٹ اور تکالیف کے سوا ان کی کوشش کا اور کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور "عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳" تھے، ان کے برعکس جنتی لوگ اپنی کوششوں کے نتائج کو بہترین انداز میں دیکھیں گے، اور مکمل خوش اور راضی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی روشنی میں جن کوششوں کو بڑھا چڑھا کر کبھی دس گنا، کبھی سات سو برابر، اور کبھی اس سے بھی زیادہ ملے گا، اور کبھی اس کا بے حساب اجر پائیں گے: (إِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰) (الزمر) انہوں نے اپنی زندگی خلوص نیت کے ساتھ صرف اللہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق گزاری اور اپنی زندگی کے اوقات اور لمحات کا بہترین استعمال کیا، انہوں نے بہترین

وقت پر بہترین کام کیے اور بہترین حالت پائی جو بلندجنتوں میں ہے، پھر اس معاملے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ بہت ہی اعلیٰ جنت میں ہیں۔

عَالِیَّۃٌ جَنَّتْ مِیْن ہوں گے (10)	فِی جَنَّةٍ عَالِیَّۃٍ ۝۱۰

"عَالِیَّۃٌ" کا لفظ ممکن ہے "علو مکانی" کی طرف اشارہ ہو، یعنی وہ اعلیٰ طبقات میں ہوں گے، یا "علو مقام" ہے، مفسرین کے نزدیک دونوں احتمال ہیں، لیکن دوسری تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے، اگرچہ دونوں معانی کے درمیان تطبیق بھی کی جاسکتی ہے، کیونکہ جنت کے درجات ہیں جیسا کہ دوزخ کے درجات و طبقات ہیں۔

"عَالِیَّۃٌ":

- 1 - جنتی اور مکانی: جنت بلند مقام پر اور ساتوں آسمانوں کے اوپر واقع ہے۔
- 2 - معنوی: اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ باوقار اور مرتبے والے ہیں۔
- 3 - درجات: جنت درجے درجے اور منزلیں رکھتی ہے۔

جو جنت عالی شان اور بلند درجے والی ہے وہاں ہر کوئی نہیں پہنچتا، مگر جو اچھے اعمال والا اور ایمان والا ہو وہی پہنچے گا، اس کے بعد اس جنت کی ایک اور تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے جس کا ایک روحانی اور معنوی پہلو بھی ہے، فرمایا:

جس میں وہ کوئی لغو بات نہیں سنیں گے (11)	لَّا تَسْمَعُ فِیْہَا لَا غِیْۃً ۝۱۱

ایسے کوئی الفاظ نہیں جو نفاق، دشمنی، جنگ و نزاع، بغض و حسد، جھوٹ، غیبت، تہمت، حتیٰ کہ لغو اور کوئی بے فائدہ بات بھی نہیں۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: نہ کوئی اذیت دینے والی کوئی بُری بات کانوں سے ٹکرائی گی، نہ کوئی باطل اور بیہودہ بات (تفسیر طبری: 104/30)

کتنا پر سکون ہوگا وہ ماحول جو ان باتوں سے پاک ہوگا، اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو دنیا کی زندگی میں گھٹن کا ایک بڑا حصہ ایسے الفاظ کا سننا بھی ہے جو روح کے سکون اور معاشرتی نظام کو درہم برہم کرتے ہیں، اور فتنوں کی آگ بھڑکاتے ہیں، نہیں بھولنا چاہئیے کہ جو لوگ دنیا میں لغو سے دوری اختیار کرتے ہیں، آخرت کے گھر میں لغو سے پاک ماحول میں

رہیں گے، جنت میں نہ صرف لغو نہیں بلکہ ایسا لفظ بھی نہیں ہے جو کسی نہ کسی طریقے سے لغو کا سبب بنے۔

اس بنا پر دنیا میں اگر ہماری مجلسوں اور محفلوں کا اس طرح انتظام ہو کہ اس میں کوئی لغو اور بیہودہ بات نہ کی جائے تو وہ مجلس جنت والی مجلس جیسی ہوگی، اور انشاء اللہ اُس دنیا میں بھی کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں ہوگی، اس روحانی نعمت اور روحانی سکون کے ذکر کے بعد اللہ جنت کی چند مادی نعمتوں کا بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۲	اس جنت میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے (12)

جنت میں صاف اور ٹھنڈے پانی کے ساتھ ایک خوشگوار اور صاف بہتا ہوا چشمہ ہے جو تیزی سے باہر نکلتا ہے، اور یہ اہل ایمان کے لیے باعث اعزاز ہے، اس کے جاری ہونے اور نکلنے کی جگہ جنت الفردوس ہے، اور کستوری کے پہاڑوں سے بہتا ہوا آتا ہے۔

"عَيْنٌ" یہ اسم جنس ہے، یعنی اس میں جاری اور بہتے ہوئے چشمے ہیں، جہاں چاہیں گے انہیں لے جائیں گے۔

زمحشری کہتے ہیں کہ: "عَيْنٌ" کی تتوین تکثیر کے لیے ہے، یعنی اس میں بہت سارے چشمے ہیں (الوسی: 115/30) جنت میں مختلف نہریں مختلف ذائقوں کے ساتھ بہتی ہیں (پانی، دودھ، شہد، شراب، سُلْسَبِيل)

اس جاری پانی کی آواز انہیں سکون دے گی، اور پانی کو دیکھنے سے ان کی فرحت دوگنی ہو جایا کرے گی۔

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝۱۳	اس میں اونچے اونچے تخت ہیں (13)

قدر و منزلت کے اعتبار سے بھی اور مقام اور موقع کے لحاظ سے بھی، "سُرُرٌ" سریر کی جمع ہے، جس کا اصل "سُرُور" ہے، ایسے تخت کا معنی دیتا ہے جو محبت اور خوشی والی مجالس میں ہوتا ہے، جنتی اس پر بیٹھے ہوئے ہوں گے، اور حوریں ان کے سامنے فرمانبرداری کا مظاہرہ کریں گی، (مختصر: 633/3)

یہ تخت اس لیے اونچے اور بلند ہیں تاکہ جنتی اپنے اردگرد کے تمام مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ان تختوں کی توصیف جو "مَرْفُوعَةٌ" سے کی گئی ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ان تختوں کا شمار مہنگے ترین تختوں میں ہو، جیسا کہ ان تختوں کی توصیف اور تعریف میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تخت سونے کے ٹکڑوں سے بنائے گئے ہیں، اور زبرجد کے پتھر، موتی اور یاقوت کے پتھر سے مزین کیے گئے ہیں۔

"سُرُر" سریر کی جمع وہ تخت ہے جس پر بیٹھتے ہیں یا سوتے ہیں۔

"مَرْفُوعَةٌ" رفع کے مادے سے ہے، کسی چیز کو مادی لحاظ سے یا معنوی اعتبار سے اونچا کرنا، رافعہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے جس کا ذکر سورہ واقعہ میں ہوا ہے، چونکہ جنت کے اس دلنشین اور پاک صاف مشروب پینے کے لیے برتن اور گلاس کی ضرورت بھی ہوگی، اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

اور آب خورے (قرینے سے) رکھے ہوئے (14)	وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۝۱۴

ان چشموں کے کنارے خوبصورت جام رکھے ہوں گے، جب بھی پینے کا ارادہ کریں گے وہ جام خود بھر کے ان کے سامنے پیش ہو جائیں گے، لذت والے تازہ بہ تازہ مشروبات پی کر سیراب ہوں گے، ایسی لذت جس کی تعریف دنیا والوں کے لیے ناممکن ہے۔

"اَكْوَابٌ" (کوب) کی جمع بہ معنی پیالہ اور جام کے ہے جس کے دستے ہوں، اس نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں جنتیوں کے شراب طہور کے ظروف کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں، اس مقام پر اور بعض دوسری آیت میں لفظ "اکواب" ذکر ہوا ہے۔

سونے اور چاندی کے پیالے آسمانی مشروب سے بھرے جائیں گے: (لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُزْفُونَ ۝۱۹) (الواقعہ: 19) جس کے پینے سے نہ ان کے سر میں درد ہوگا اور نہ مدبوش ہوں گے، ان کے لیے رکھے گئے ہیں تاکہ وہ جب بھی

مشروب پینا چاہیں تو اپنے ہاتھوں سے لے کر پی لیں، یا کہ غلام ان پیالوں سے انہیں پلائیں، یہ جنتیوں کے پینے کی ایک قسم ہے، اب جنت کی نعمتوں کی مزید تفصیلات بیان ہو رہی ہیں، فرمایا:

وَمَنَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝۱۵	اور وہاں گاؤ تکیے ہیں برابر لگے ہوئے (15)

"مَنَارِقُ" (نمرقہ) کی جمع ہے، اس سے مراد ریشم اور نرم و نازک سا بنا ہوا ایک چھوٹا سا تکیہ ہے جو کمر کے پیچھے رکھتے ہیں، قطار میں لگے ہوئے اور ترتیب دیے گئے ہوں گے، جن پر اہل جنت ٹیک لگائیں گے، جو عام طور پر مکمل آرام کے وقت استعمال ہوتے ہیں، اور وہ تھکاوٹ جو اللہ اور اس کے دین کی خاطر دنیا میں برداشت کی تھی دور کریں گے۔

"مَصْفُوفَةٌ" کا لفظ ان کی تعداد اور ترتیب کو ظاہر کرتا ہے، اس تعبیر سے پتا چلتا ہے کہ وہ پر خلوص اجتماعی مجلسیں منعقد کریں گے، اور یہ اجتماعات ہر قسم کے لغو اور بیہودگی سے پاک ہوں گے، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور بے شمار نعمتوں اور دنیا کے درد اور الم آخرت کے عذاب سے نجات کے بارے میں باتیں ہوں گی، اور اس میں ایسا لطف اور لذت ہوگی کہ اس کے برابر کوئی چیز نہیں ہے، پھر عالیشان جنتی قالینوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَزَرَائِي مَبْثُوثَةٌ ۝۱۶	اور وسیع و عریض قالین بچھے ہوئے (16)

"زَرَائِي" (زربیۃ) کی جمع ہے، یہ پر تعیش اور قیمتی نرم آرام دہ قالین کو کہتے ہیں جو ریشم کے ہوں گے اور اس کے ساتھ قیمتی اور مہنگے ہوتے ہیں، اس میں نرم، پتلی اور نازک مخمل ہوتی ہے اور یہ جنتیوں کی مجالس میں زیادہ تعداد میں پائے جائیں گے۔

"مَبْثُوثَةٌ" ہر جگہ پھیلے ہوئے، یعنی قالین جو زمین پر بچھے ہوئے ہوں گے اور ان قالینوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کو سکون ملے گا، یہ جنتیوں کے ایک منظر کا مختصر خلاصہ تھا جو رغبت کرنے والوں کی یاد دہانی اور پرہیز گاروں کے لیے نصیحت تھی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ: جنت ایسی جگہ ہے جو ہر لحاظ سے بے مثال، ہر قسم

کی تکلیف اور جنگ و جدال سے پاک، مختلف رنگ و انواع کے پھل، دلکش آوازیں، بہتے ہوئے چشمے، پاک صاف مشروب، بہترین خدمت کرنے والے ملازم، بے مثال بیویاں، جڑے ہوئے اور پر آسائش قالین، اور دلچسپ پیالے اور آب خورے چشموں کے کنارے رکھے ہوئے، درحقیقت ایسی ایسی نعمتیں ہیں جو اس دنیا کے محدود الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتیں اور تخیلی علم میں بھی سمجھائی نہیں جاسکتی، یہ سب ان مؤمنوں کے لیے ہیں جنہوں نے اپنے اعمال صالحہ سے اس مرکز الہی میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کی ہوگی۔

اس کے بعد والی آیات میں تمام نعمتوں کی اصل کلید کو حاصل کرنے کے لیے جو "اللہ تعالیٰ کی معرفت" ہے کے بارے میں بات کی گئی ہے، اور خدا کی قدرت کے مظاہر کی چار مثالیں خدا کی تخلیق سے ذکر کر کے انسان کو ان کے مشاہدہ کی دعوت دی گئی ہے جو جنت میں داخل ہونے کا راستہ دکھاتی ہیں، اس ضمن میں، خدا کی لامحدود طاقت کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کے مسئلے کو حل کرنے کی کلید ہے۔

اَفَلَا يَنْظُرُونَ اِلَى الْاِلٰہِ کَیْفَ خُلِقَ ۝۱۷	کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے، وہ کیسے بنائے گئے ہیں! (17)

یعنی: لوگ غور و فکر اور عبرت کی نگاہ سے اونٹ کی طرف کیوں نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی شکل اور جسمانی ہیئت اس قدر شاندار طریقے سے بنائی، جس سے خالق کی قدرت اور صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

"التہسیل" میں ہے کہ: اس آیت میں انسان کو اونٹ میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ وہ ایک مضبوط اور طاقتور جانور ہے، اور انسان ضعیف اور بے بس پھر بھی انسان اس پر سوار ہو کر اسے چلا کر لیجاسکتا ہے، یہ جانور بھوک اور پیاس کے معاملے میں بہت برداشت رکھتا ہے، اس کے بے شمار اور متعدد فائدے ہیں، انسان اس پر بوجھ لاد کر اس پر سوار ہوتا ہے، اور اس کے دودھ اور گوشت سے فائدہ اٹھاتا ہے، اونٹ عرب کے بہترین جانوروں میں سے ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس کا ذکر کیا ہے، اور تمام حیوانات سے زیادہ فائدہ مند بھی ہے، اس وجہ سے اس کو "صحرا کی کشتی" کہا جاتا ہے، تو پھر اس کی تخلیق کی طرف دیکھیں کہ وہ بہت طاقتور بہت مفید ہے، (التہسیل: 196/4)

قابل غور بات یہ ہے کہ: یہ آیت ان لوگوں کے لیے ایک سرزنش ہے جو قیامت کو نہیں مانتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی تصدیق نہیں کرتے، اور اس مبارک آیت کا مطلب بھی لوگوں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حیرت انگیز تخلیقات کے بارے میں غور و خوض کریں۔

آیت "17" کا سبب نزول:

ابن جریر اور ابن ابی حاتم قتادہ سے روایت کرتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کی تعریف کی تو گمراہ لوگ متعجب ہوئے، پس یہ آیت نازل ہوئی: (أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ، ۱۰) ترجمہ: "کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے کہ وہ کیسے بنائے گئے!"

اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیسے بلند کیا گیا ہے (18)	وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝۱۸ ○

یعنی کیا وہ عبرت کی نظر سے نہیں دیکھتے اللہ تعالیٰ کی خالص اور مضبوط تخلیق کی طرف کہ (ان کے لیے محفوظ چھت) اٹھائی گئی ہے (جو گرتی نہیں؟)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آسمان کی تخلیق پر سوچنے اور توجہ کرنے کی ترغیب دی ہے جو بغیر کسی ستون اور خلل کے اور کسی بے ترتیبی کے اٹھایا گیا ہے۔

اور پہاڑوں کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح (زمین پر مضبوط) کھڑے کیے گئے ہیں (19)	وَالِی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْۙ ۝۱۹

(اور زمین کی حفاظت کرتے اور اسے ہلنے سے روکتے ہیں)

یہ پہاڑ جو شان و شوکت کے ساتھ کھڑے ہیں، اور کیلوں کی طرح زمین کو جمائے رکھتے ہیں، وہ ہوا، طوفان اور آندھی کو روکتے ہیں اور سمندروں کو طغیانی سے بچاتے ہیں، شہادت کی انگلی کی طرح ہر پہاڑ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ ان تین مذکورہ بالا آیات میں ایک روح پرور سبق بیان کیا گیا ہے کہ بہترین تعلیمی اداروں میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

ایک چرواہا اور ایک کسان اگر وسیع و عریض چراگاہ میں اپنے مویشی چرا رہا ہوتا ہے تو اس کے پیروں کے نیچے زمین اور سر کے اوپر آسمان اور چاروں طرف پہاڑ اور اس کے برابر میں اونٹ ہیں، اگر ان مخلوقات میں سے کسی ایک کی تخلیق پر گہری نگاہ ڈالے تو بہت سارے راز اس پر کھل جائیں گے، مثال کے طور پر اونٹ گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑتا ہے اور گدھے سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے، اور حیوانات میں سے بعض سواری کے لیے، اور بعض گوشت کے لیے اور بعض دودھ کے لیے استعمال ہوتے ہیں، جبکہ اونٹ سے یہ تینوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

اس کی دیکھ بال کرنے پر کسی بھی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں ہوتا، کیونکہ جب صحرا میں چھوڑے جائیں تو حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، ان کی غذا ہاتھی اور دوسرے حیوانات کے جیسی نہیں ہے کہ اس کا حاصل کرنا مشکل ہو۔

سعودی عرب کے صحراؤں میں پانی بہت کم ہوتا تھا، ہمیشہ اور ہر جگہ نہیں ملتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اونٹ کے پیٹ میں پانی ذخیرہ کرنے والا ٹینک بنایا ہے، کہ ایک مرتبہ پانی پینے سے سات یا آٹھ دن کا پانی ذخیرہ کر لیتا ہے، پھر حسب ضرورت اسے استعمال کرتا ہے، اس بلند قامت حیوان میں سوار ہونے کے لیے سیڑھی کی ضرورت تھی، لیکن رب تعالیٰ نے اس کے پاؤں کے تین جوڑ بنا دیے کہ ہر پاؤں میں دو گھٹتے ہیں، اسے سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے تاکہ اس پر سوار ہونا اور اترنا آسان ہو، اور یہ اتنا محنتی ہے کہ تمام جانوروں سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے۔

عرب کے بیابانوں میں موسم گرما میں سفر کرنا بہت مشکل تھا، خدا نے اونٹ کی ایسی تخلیق کی ہے کہ ساری رات چلتا رہتا ہے، یہ سب سے مضبوط، سب سے کم خرچ، سب سے زیادہ مفید، پرسکون، اور سب سے کامیاب جانور ہے، اور اتنا فرمانبردار ہے کہ ایک چھوٹا بچہ بھی اس کا لگام پکڑ کر جہاں چاہے اسے لے جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس میں دوسری خصوصیات بھی ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت بالغہ کا درس دیتی ہیں۔

آسمانوں، پہاڑوں اور زمینوں کی تخلیق اتفاقی نہیں ہے بلکہ بڑی حکمت کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں، اور اپنی صحیح جگہ پر رکھے گئے ہیں، ہر نعمت میں ایک نمایاں سمت ہے، (اونٹ میں تخلیق کی، آسمان میں بلندی کی، زمین میں وسعت کی اور پہاڑوں میں زمین کا توازن برقرار رکھنے کی)

آسمان، کرے، کروں کے مدار، ان کی ترتیب اور حساب، جن میں ہر روز عجائبات کا ایک نیا گوشہ دریافت ہوتا ہے، مطالعہ، دریافت اور غور و فکر کے مستقل میدان ہیں، زمین کے قلب میں پہاڑ اور ان کی جڑیں کیلوں اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح زمین کے اندر گندھک چونا اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے لاوا کے نتیجے میں زمین میں پیدا ہونے والی جنبش عدم استحکام اور بے چینی سے زمین کی حفاظت کرتے ہیں، برف کو اپنے اندر ذخیرہ کر کے ترتیب کے ساتھ چشموں کی صورت بہاتے رہتے ہیں، وہ طوفان کو روکتے ہیں، اور ہوا کو صاف کرتے ہیں، یہ ہر قسم کی کانوں اور صنعتی مواد اور قیمتی معدنیات جیسے یہ مسافروں کے لیے نشانیاں اور پودوں کو اگانے اور ان کی پرورش کی جگہ ہے۔

مختلف قیمتی اور آرائشی پتھروں جیسے عقیق یا تعمیراتی پتھر جیسے سنگ مرمر کے ذریعے بنی نوع انسان کے لیے ایک لازوال سرمایہ ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں کھیتی باڑی، صنعت زراعت کے ساتھ ساتھ خلائی امور جیسے مسائل کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

وَالِی الْأَرْضِ کَیْفَ سَطَحَتْ ۝۲۰	اور (نہیں دیکھتے) زمین کو کہ کس طرح بچھائی گئی (20)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے نشانیوں کی یاد دہانی کراتا ہے، اور انسان سے کہتا ہے کہ کس طرح زمین بچھائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے متعدد آیتوں میں: (آل عمران: 19 ؛ بقرہ: 164 ؛ روم: 22 ؛ جاثیہ: 3 ؛ عنکبوت: 44 ؛ یونس: 3 ؛ عنکبوت: 61 ؛ غافر: 57 ؛ ذاریات: 47-48 ؛ انبیاء: 32 ؛ رعد: 2) آسمان اور زمین کو اپنی قدرت کے نشانیوں میں شمار کیا ہے، آسمانی کرّوں اور کہکشاؤں کی عظمت، وسعت اور ان کا لاتعداد ہونا خدا تعالیٰ کی لامحدود قدرت کی سب سے واضح نشانی ہے۔

فَذَرِّکَ ۝۱۰۰ اِمَّا اَنْتَ مُذَرِّکَ ۝۲۱	اے پیغمبر! تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو (21)

"مُذَرِّکَ" آپ انہیں توحید کی نعمت اور اس کے دلائل یاد دلائیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ اپنی ذمہ داریاں نبھائیں، قرآن کی آیات اور مخلوقات کی تخلیق کی دلیلوں سے لوگوں کو نصیحت کرتے رہیں، لوگوں کو نعمتوں

کی اقسام اور عذاب کے ایام بھی یاد دلاتے رہیں، کیونکہ آپؐ کی ذمہ داری صرف نصیحت کرنا ہے۔

تم ان پر داروغہ نہیں ہو (22)

لَسْتُ عَلَيْهِمْ مُصَيِّرٌ ۝۲۲

کہ ان کو زبردستی ایمان لانے پر مجبور کر دو، آپؐ کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے، آپؐ کا فریضہ یہ نہیں ہے کہ انہیں جبر اور اکراہ کے ساتھ ایمان والوں میں شامل کر دو اس لیے کہ ہدایت قبول کرنا اجباری نہیں بلکہ اختیاری ہے، اگر اجباری ہوتا تو ایمان کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ ایمان کا مطلب امن تک پہنچنا ہے، اور یہ زبردستی اور ناپسندیدگی سے حاصل نہیں ہوتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ: لوگوں کو نصیحتیں اور وعظ قبول کرنے پر مجبور کرنا پیغمبر کے فرائض اور ذمہ داریوں میں سے نہیں ہے،

"لَسْتُ عَلَيْهِمْ مُصَيِّرٌ"، (صَطَرَ) و (سَطَرَ) کا ایک ہی معنی ہے (مفردات) و (سیطر) کا معنی عہدے والا اور مسلط شدہ کا ہے (مقایس اللغہ)

دوسرا مسئلہ اس آیت کو سمجھنے میں یہ ہے کہ دین قبول کرنے میں زبردستی نہیں ہے "لَسْتُ عَلَيْهِمْ مُصَيِّرٌ"

تیسرا نکتہ آیت کی تفہیم میں یہ ہے کہ: لوگوں کی رہنمائی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید دلچسپی تھی مگر (لَسْتُ عَلَيْهِمْ مُصَيِّرٌ) کو مدنظر رکھتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی لوگوں پر تسلط اور غلبہ نہیں چاہتے تھے، آیت مبارکہ کی تاکید غلبہ کی نفی کرتی ہے اور اس کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم کوشش اور مسلسل جستجو کو ظاہر کرتی ہے۔

چوتھا نکتہ اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ: لوگوں پر دین کے وعظ و نصیحت کا اثر نہ کرنا، یہ علم الہی کی تعلیم، اور ابلاغ کے فریضہ کو ساقط نہیں کرتا: (فَذَكِّرْ ۝۱۰۰ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝۲۱ لَسْتُ عَلَيْهِمْ مُصَيِّرٌ ۝۲۲) آیت کریمہ میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ بعض لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور تذکیر سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس صورت میں بھی لوگوں پر خدا تعالیٰ کے دین کی تعلیمات کو مسلط نہ کیا جائے، گذشتہ

آیت میں پیغمبرؐ کو "نصیحت کرنے والا" قرار دے کر، اس معاملے میں بھی آپ کو صرف نصیحت کا کام سونپا گیا ہے۔

ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا (23)	إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ۝۲۳

سوائے اس کے جو ہدایت سے منہ پھیرے اور رسالت کا انکار کرے، راستہ پانے سے گریز کرے، اور دلائل سے انکار کرے، اور حق کو جھٹلائے، ایسا شخص حقیقی معنوں میں عذاب اور سزا کا مستحق ہے۔

تو خدا اس کو بڑا عذاب دے گا (24)	فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝۲۴

چنانچہ اس کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں داخل کرے گا، یعنی جس نے خدا کی اطاعت سے منہ موڑا اور آیات کا انکار کر دیا وہ بڑے عذاب اور آخرت کی شدید سزا سے کبھی بھی خلاصی نہیں پائے گا، وہ ہمارے سامنے دوبارہ ضرور بالضرور آئے گا اور ہم اس سے ایک ایک ذرہ کا حساب لیں گے۔

"العذاب الاکبر"

- جسمانی عذاب
- نفسانی اور روحانی عذاب

حق تعالیٰ قیامت کے دن اسے شدید عذاب میں مبتلا کرے گا، انہیں طوقوں اور لوہے کی زنجیروں سے دوزخ کی آگ میں جو بہت گہری ہے عذاب دیا جائے گا، وہ ان سے امن چھین کر ان پر بڑا عذاب لائے گا، عذاب اکبر کیوں؟ کیونکہ ان کا موقف تکبر اور غرور پر مبنی تھا، اس لیے ان کی سزا بھی ان کے عمل کے مطابق ہونی چاہئیے، تکبر انسان کو حق سے دور کر دیتا ہے اور ایسا بنادیتا ہے کہ انسان پھر حق بات کو قبول نہیں کرتا۔

بیشک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے (25)	إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝۲۵

حقیقت یہ ہے کہ سب کا پلٹنا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور سب اسی کی طرف لوٹیں گے۔

پس ہماری ذمہ داری ہے ان سے حساب لینا (26)	ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝۲۶

ان سے ان کے اعمال کا حساب لینا اور انہیں ان اعمال کی سزا دینے کی ذمہ

داری ہم پر ہے، یعنی سب کو دہان میں رکھیں گے اور ہر ایک کو اس کے اچھے یا بُرے عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔

کیا جنت کی مروج زبان عربی ہے؟

اوپر ہم نے نعمتوں، کھانوں اور اہل جنت کی زندگی کے بارے میں اور جہنمیوں کے کھانے کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کی ہیں، اب ہم اہل جنت کی زبان پر بھی مختصراً لکھیں گے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاوی جلد چار عقیدے والے حصے میں لکھتے ہیں کہ: یہ معلوم نہیں ہے کہ قیامت کے دن لوگ کس زبان میں بات کریں گے، اور کونسی زبان میں اللہ تعالیٰ کا خطاب سنیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا ہے، یہ درست نہیں ہے کہ وہاں کے لوگوں کی زبان عربی ہے، مجھے نہیں معلوم کی صحابہ کرام کے درمیان کوئی اختلاف ہے، بلکہ انہوں نے اس مسئلے پر بحث ہی نہیں کی ہے، کیونکہ اس بارے میں بات کرنا فضولیات کا حصہ ہے، لیکن متاخرین کے درمیان کچھ قیل و قال ہوئے ہیں:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ: جنت والے عربی زبان میں بات کریں گے، بعض دوسرے کہتے ہیں: جنتی لوگ سُریانی زبان میں بات کریں گے کیونکہ آدم علیہ السلام کی زبان ہے، لیکن بعض اور لوگوں کا عقیدہ ہے کہ: جنتی صرف اور صرف عربی زبان میں بات کریں گے۔

البتہ ان تمام اقوال کی کوئی دلیل نہیں ہے، نہ عقل سے اور نہ نصوص سے کوئی ثبوت ہے، بلکہ یہ تمام دعوے ہیں جن کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ اسے بہتر جانتا ہے (مجموع الفتاوی شیخ الاسلام أحمد بن تیمیہ، جلد 4 بخش (العقیدۃ))

ہم نے کئی بار کہا ہے کہ اسلام میں عبادات اور اس سے متعلق مسائل کا تعلق نصوص سے ہے نہ کہ عقل سے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ شریعت میں عبادت کے مسائل کا عقلی پہلو نہ ہو، اس کے برعکس علم ہر روز پوشیدہ رازوں اور اسلامی مسائل اور احکام کی معنویت اور گہرائی کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ قرآن کریم کا معجزہ روز بہ روز ثابت ہوتا جا رہا ہے، اس سلسلے میں ہم جنت اور جہنم میں استعمال ہونے والے کھانے، لباس اور آلات کے بارے میں بات کرتے ہیں تو:

اسلام اور عقل کے اس ربط اور تعلق کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنت اور جہنم میں جو کھانا پینا لباس اور دیگر اشیاء اور نعمتیں ہوں گی جن سے وہ لوگ استفادہ کریں گے تو جہاں تک میں دین اسلام کو سمجھا ہوں ان مسائل کو دنیاوی مسائل (اشیاء اور نعمتوں کو دنیاوی نعمتیں) بنا کر پیش کیا گیا ہے تاکہ انسان انہیں عالم اسباب یعنی دنیا کے لحاظ سے بہتر طور پر سمجھ سکے ورنہ تو وقت اور اندازے کا کم زیادہ ہونا، بصارت، بصیرت، آنکھ اور دیگر اعضاء سے عالم برزخ اور آخرت کے مشکل اور عمیق معاملات، جنتیوں اور جہنمیوں کی زبان ان کا کھانا وغیرہ انسانی فہم کے مطابق بیان کیا ہے ورنہ اللہ جانتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ مفہیم یا یہ سب اشیاء اس مشکل میں عملی اعتبار سے اس طرح کا وجود ہی نہ رکھتی ہوں یا عین وقت پر دیگر ذرائع اور وسائل سے حاصل کیے جائیں۔

غذاء، لباس اور دیگر زیب و زینت کے بیان میں جو تشریحات اور مطالب بیان کیے گئے ہیں یہ نصوص شرعی بھی انسان کو سمجھانے کے لیے ہیں اور ان کو یہ بتانے کے لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یقینی طور پر اس بات پر قادر ہے کہ جنتیوں، جہنمیوں کو اسی شکل اور ذائقے کے کھانے دے یا ان سے زیادہ اچھی شکل اور بہتر و افضل دے، اور مختلف انداز اور اشکال میں دے کہ جن سے اللہ بخوبی واقف ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان مسائل اور معاملات کو اس صورت میں سمجھنا حتمی نہیں ہے کہ ہم اس وقت کے معاملات اور روابط و تعلقات جو اس وقت ہوں گے اور اس وقت حالات کا جو نقشہ ہوگا اسے انسان موجودہ فہم کے مطابق سمجھ سکے یہ ضروری نہیں ہے۔

اس وقت ان اصطلاحات اور اس طرح کے مفہیم کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہوگی (واللہ اعلم بالصواب)

کیا دن کی بے برکتی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے؟

بہت سارے لوگ دن اور رات کی بے برکتی کو قیامت کی علامات میں سے سمجھتے ہیں، اکثر و بیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور پھر خاص طور پر صحیح بخاری کے حدیث نمبر: 1036 جو حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے: (لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَقْبُضَ الْعِلْمُ،

وَتَكْثُرُ الزَّلَازِلُ، وَيَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، وَتَظْهَرَ الْفِتَنُ، وَيَكْثُرُ الْهَرَجُ وَهُوَ الْقَتْلُ الْقَتْلُ، وَحَتَّى يَكْثُرَ فِيكُمْ الْمَالُ الْفَيْضُ) ترجمہ: "قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ یہ علامات ظاہر نہ

ہوں: علم کا اٹھایا جانا، کثرت سے زلزلہ آنا، زمانہ کا باہم قریب ہونا، فتنوں کا ظاہر ہونا اور فساد کی کثرت اور فساد سے مراد قتل ہے، اور تم لوگوں میں مال و دولت کا بے حد زیادہ ہونا"

امام احمدؒ حدیث: 10260 میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، فَتَكُونَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ، وَيَكُونَ الشَّهْرُ كَالْجُمُعَةِ، وَتَكُونَ الْجُمُعَةُ كَالْيَوْمِ، وَيَكُونَ الْيَوْمُ كَالسَّاعَةِ، وَتَكُونَ السَّاعَةُ كَالْحِزَابِ السَّعْفَةِ) ترجمہ: "قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمانہ قریب ہو جائے گا، سال ایک مہینے کے برابر ہو جائے گا، جب کہ ایک مہینہ ایک ہفتے کے برابر اور ایک دن ایک گھنٹے کے برابر ہو جائے گا"

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اس کی سند صحیح مسلم کی شرط پر ہے، البانیؒ نے الجامع الصحیح (7432) میں اسے صحیح قرار دیا ہے، اور ساعت (گھڑی) کھجور کے ٹہنیوں میں آگ لگنے کی مانند ہو، یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قیامت کی علامات میں سے زمانہ کا باہم قریب ہونا ہے، زمانے کی نزدیکی کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے، اور اس بارے میں بہت سارے اقوال ہیں، ان میں سے سب سے بہترین قول یہ ہے کہ: زمانے کے نزدیک ہونے کو حسّی اور معنوی نزدیک ہونے پر محمول کرتے ہیں۔

معنوی نزدیکی:

معنوی نزدیکی یا روحانی نزدیکی کا مطلب یہ ہے کہ زمانے کی برکت ختم ہو جائے گی اور یہ آنے والے زمانے میں واقع ہوگا، اس قول کو قاضی عیاض، نووی اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

نووی کہتے ہیں: دن کے چھوٹے ہونے کا مطلب اس کا بے برکت ہونا ہے، مثال کے طور پر پورا دن گزر جاتا ہے لیکن ہم اس سے ایک گھنٹے کے برابر فائدہ لیتے ہیں۔

حافظ کہتا ہے کہ: حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد تمام چیزوں سے برکت کا ختم ہونا ہے، حتیٰ کہ زمانے سے بھی جو کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

معنوی نزدیکی سے دور دراز مقامات کے درمیان رابطے کی آسانی اور ان

فاصلوں کے درمیان سفر کی تیزی بھی مراد لی جاسکتی ہے، جسے وقت کی قربت سے تعبیر کیا جاتا ہے، گزشتہ زمانے میں جو فاصلے کئی مہینوں میں طے کیے جاتے تھے، مبالغہ نہیں ہوگا کہ اگر ہم یہ کہیں کہ آج کے زمانے میں وہ چند گھنٹوں میں طے ہو جاتے ہیں۔

شیخ ابن باز فتح الباری (522/2) کی تعلیق میں کہتے ہیں کہ: حدیث میں جو نزدیکی ذکر ہوئی ہے اس نزدیکی سے مراد ہے شہروں، ملکوں کے درمیان، ہوائی جہازوں اور نقل و حمل کے دیگر وسائل کی اختراع کی وجہ سے فاصلوں کی کمی۔

حسی نزدیکی:

اس سے مراد یہ ہے کہ وقت کا مختصر ہونا محسوس ہوگا، دن اور رات کے اوقات تیزی سے گزر رہے ہوں گے اور ان اوقات اور گھڑیوں کے درمیان فاصلہ نہیں ہوگا، اس کا واقع ہونا غیر ممکن نہیں ہے، اس کی تائید کے لیے دجال کے زمانے کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں، کہ اس میں ایک دن سال، مہینے اور ہفتے کے برابر طویل ہو گا، خلاصہ جس طرح دن لمبے ہوتے ہیں اسی طرح چھوٹے بھی ہوں گے کہ جس کی بنا پر دنیا کے نظم و ضبط میں خلل واقع ہوگا اور دنیا انتہاء کے قریب ہوگی۔

حافظ "الفتح" میں ابن جریر سے نقل کرتے ہیں: حدیث (لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَكُونَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ) میں زمانے کے نزدیک ہونے سے مراد زمانے کا چھوٹا اور مختصر ہونا ہے، اس حساب سے چھوٹا ہونا حسی ہونا چاہئیے اور معنوی معنی بھی لیے جاسکتے ہیں، لیکن حسی میں فاصلہ مقصود نہیں ہوتا، شاید یہ ان امور میں سے ہو جو قیامت کے قریب ہوں گے، لیکن معنوی لحاظ سے وہ فاصلہ اور مدت مراد ہے جسے علماء جانتے ہیں، اگر دنیا والے بھی سمجھدار اور عقل مند ہوں تو جان لیں گے کہ وہ پہلے کی طرح جو بڑے بڑے کام کرتے تھے اب وہ نہیں کر سکیں گے، اس کی وجہ سے وہ شک اور تردد میں مبتلا ہوں گے لیکن اس کی علت کو نہیں سمجھیں گے، اس کی وجہ شاید ایمان کی کمزوری ہے جو کھلم کھلا خلاف شرع کام کرنا اور حد سے زیادہ سخت اور بدتر وہ کھانا ہے جس کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ وہ حرام ہے، اور بہت سارے لوگوں کو حلال و حرام سے کوئی سروکار نہیں ہے، بس اس کی تلاش اور حاصل کرنے میں تمام تر کوشش کریں گے، اور اپنی عقل

سے کام نہیں لیں گے۔

بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وقت، روزی اور زمینی پیداوار میں برکت پختہ ایمان اور خدا کے احکام کی اطاعت کرنے اور اس کے نواہی سے بچنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ) (اعراف: ۹۶) ترجمہ: "اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے"

سیوطی الحاوی للفتاویٰ (44/1) میں مذکورہ حدیث کے معنی کے بارے میں کہتے ہیں: "کہا گیا ہے کہ اس چھوٹے ہونے سے مراد حسی طور پر ہونا ہے، رات اور دن اوقات قیامت قائم ہونے کے قریب چھوٹے ہو جائیں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنوی طور پر ہوتا ہے کہ اس سے مراد زمانے کا تیزی سے گزر جانا اور تمام چیزوں سے برکت کا ختم ہو جانا مراد ہے یہاں تک کہ زمانے سے بھی، دیگر اقوال بھی اس بارے میں موجود ہیں واللہ اعلم۔

یہ تین اقوال: برکت کا اٹھ جانا، رابطے کی سہولت، نزدیک ہونا حسی صورت میں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، اور یہ حدیث ان تینوں پر دلالت نہ کرے ایسے کسی مانع پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے، بہت سارے اقوال زمانے کے بارے میں کہے گئے ہیں لیکن ان دلائل میں وہ قوت نہیں ہے جو مذکورہ اقوال میں ہے:

مثلاً خطابی نے کہا ہے کہ اس کا مطلب زندگی کا لطف اٹھانا ہے، حافظ اسی کا قول ذکر کر کے کہتا ہے: کہ خطابی کی بات کا مطلب یہ ہے کہ یہ مہدی کے ظہور کا وقت ہوگا، جب زمین پر سچائی کا ظہور ہوگا، (انصاف کامیاب ہوگا) انصاف کا بول بالا ہوگا، اور لوگ زندگی سے لطف اندوز ہوں گے، اور اس کی مدت مختصر ہوگی، اور لوگوں کی خوشی کے دن تھوڑے عرصے میں گذر جائیں گے، اگر اس کی مدت زیادہ عرصہ رہے تو وہ ناگوار اور ناپسند ہو جائے گی، نتیجتاً اس کی مدت کم ہوگی۔

پھر حافظ کہتا ہے کہ: میں کہتا ہوں کہ اس میں جو بات خطابی نے بیان کی ہے وہ تاویل میں گئی ہے، کیونکہ زمانہ اور وقت میں کمی نہیں ہوتی، ورنہ

حدیث کی ضمانت دینے والا اس کو ہمارے زمانے میں وجود میں لاتا، نتیجتاً اس حدیث سے ہم وقت میں کمی کے بجائے دنوں کے جلدی گزرنے کو سمجھتے ہیں، کیونکہ ہمارے زمانے کا پچھلے زمانے سے کوئی فرق نہیں ہے، اور اس حدیث سے مراد زندگی سے لطف اندوز ہونا نہیں ہے، سچ یہ ہے کہ اس سے مراد برکت کا ختم ہوجانا ہے۔

ابن بطال کہتے ہیں: اس سے مراد انسانوں کے عمر کا نزدیک ہونا ہے عبادت کی کمی کی وجہ سے، یہاں تک کہ گناہوں اور فسق و فجور کے غالب آجائے، اور مفسد انسانوں کے غالب ہونے پر، کوئی نہیں ملے گا کہ نیکیوں کا حکم کرے یا برائیوں سے روکے، مگر یہ تاویل حدیث کے ظاہری معنی کے خلاف ہے، اس جملے کی تردید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے فرماتے ہیں: (لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، فَتَكُونَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ.. الخ) اس کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد زمانے کا نزدیک ہونا ہے نہ کہ انسانوں کی عمر کی مدت۔

اس موضوع کی تفصیل کے لیے مراجعہ فرمائیں: فتح الباری کی طرف (21/13) شرح حدیث رقم (7061) اتحاف الجماعة للتجویری (497/1) "السنن الواردة فی الفتن وغوائلها والساعة وأشرطها" لأبی عمرو عثمان الدانی، تحقیق د/ رضاء اللہ المبارکفوری. "أشراط الساعة" للوابل (صفحة 120)۔

جنت میں پرندوں کی موجودگی

روایات کے مطابق جنت میں ایسے پرندے اور جاندار موجود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کے بارے میں جو جنتیوں کی غذاء میں شامل ہوں گی فرماتا ہے: (وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۝۲۱) (سورة الواقعة: 21) ترجمہ: "اور پرندوں کا گوشت جس قسم کا ان کا جی چاہے"

سنن ترمذی میں حضرت انسؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ: کوثر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کوثر کیا ہے؟ فرمایا: (ذَاكَ نَهْرٌ اعطانيه الله، اشد بياضاً من اللبن واحلى من العسل فيه طير اعناقها كاعناق الجزر، قال عمر: ان هذه لناعمة، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اكلتها انعم منها) ترجمہ: "جنت میں ایک

نہر ہے جو خدا تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے: دودھ سے زیادہ سفید ہے، اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے، اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹ کی گردن کی طرح لمبی ہیں۔"

عمرؓ نے کہا: پھر تو یہ شترمرغ ہونا چاہئیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا کھانا شترمرغ سے زیادہ بہتر ہے۔ (مشکاة المصابیح (91/2) ابو نعیم "حلیہ" میں اور حاکم "مستدرک" میں ابن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں: (جاء رجل بناقة مخطومة، فقال: يا رسول الله، هذه الناقة في سبيل الله، فقال: لك بها سبع مائة ناقة مخطومة من الجنة) ترجمہ: ایک آدمی نکیل شدہ اونٹنی لے کر آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! یہ اونٹنی اللہ کے راستے میں صدقہ کے لیے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لیے اس کے بدلے میں جنت کی سات سو اونٹنیاں ہوں گی، سب کی سب مہار والی ہوں گی۔

صحیح مسلم میں ابو سعود انصاری سے اس طرح مروی ہے: (لك بها يوم القيامة سبع مائة ناقة كلها مخطومة) ترجمہ: "قیامت کے دن اس اونٹنی کے بدلے سات سو نکیل شدہ اونٹنیاں تجھے دی جائیں گی"

خمر یا جنت کی شراب

ان مشروبات میں سے جو خدا اپنے فضل سے جنت والوں کو عطا کرتا ہے ایک "خمر" ہے، جنت کی "خمر" ان تمام عیوب اور نقصانات سے پاک ہے جو دنیا کی شراب میں ہے، دنیا کی شراب عقل کو زائل کردیتی ہے، سر اور پیٹ میں تکلیف پیدا کرتی ہے، اور مہلک امراض کا سبب بنتی ہے، بعض اوقات اس کے رنگ اور بناوٹ میں نقائص ہوتے ہیں، لیکن جنت کی خمر اور شراب ان تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے، جنت کی شراب: چمکدار، شفاف اور خوبصورت ہوگی (يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۖ ۝٤٥ بَيِّضَاءَ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ۝٤٦ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ۝٤٧) (الصافات: 45 تا 47) ترجمہ: "شراب لطیف کے جام کا اُن میں دَور چل رہا ہوگا۔ جو رنگ کی سفید اور پینے والوں کے لیے (سراسر) لذت ہوگی۔ نہ اُس سے دردِ سر ہو اور نہ وہ اس سے مہ ہوش ہوں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے جنت کی شراب کی خوبی اور اس کا حُسن بیان کیا ہے اور پھر فرمایا کہ: شراب پینے والا بغیر اس کے کہ اس کی عقل میں کوئی خلل پیدا ہو اس سے لطف اندوز ہوگا: (وَأَنهَرُمْ مِّنْ خَمْرٍ لَّدُنَّ لِلشَّرِبِ بَيْنَ ۝۱۰) (محمد: 15) ترجمہ: "اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے (سراسر) لذت ہے"

اور جنت کے شرابوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ پینے والے اس کے پینے سے بیمار نہیں ہوں گے: (لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ۝۴۷) (الصافات: 47) ترجمہ: "نہ اُس سے دردِ سر ہو اور نہ وہ اس سے مہ ہوش ہوں گے"

(يُطَوَّفُ عَلَيْهِمْ وَلَدَانٌ مُّخْلَدُونَ ۝۱۰۱ يَا كُؤَابِ وَأَبَارِيقَ ۝۱۰۲ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۝۱۰۱۸) (الواقعة: 17-18) ترجمہ: "نوجوان خدمت گزار جو ہمیشہ (ایک ہی حالت میں) رہیں گے اُن کے آس پاس پھرینگے۔ یعنی آبِ خورے اور آفتابے اور صاف شراب کے گلاس لے لے کر۔"

ابن کثیر مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انہیں سر درد نہیں ہوگا اور ان کی عقلوں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔

ضحاک ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں: (فی الخمر اربع خصال: السكر، الصداغ، القيء و البول، فذكر الله خمر الجنة، ونزهها عن هذه الخصال) ترجمہ: "نشہ، سردرد، قئی اور الٹی، اور پیشاب کا آنا یہ دنیا کی شراب میں ہیں، لیکن خدا نے جنت کے مشروبات کو ان عیوب سے پاک قرار دیا ہے"، (تفسیر ابن کثیر: 514/6)

خدا تعالیٰ دوسری آیت میں جنت کی شراب کی صفت میں فرماتے ہیں: (يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُومٍ ۝۲۵ خِتْمُهُ مِسْكٌ ۝۱۰۲ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝۲۶) (المطففين: 25-26) ترجمہ: "اُن کو خالص سر بمہر شراب پلائی جائے گی جس کی مہر مشک کی ہوگی تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہئیے کہ اسی میں رغبت کریں۔"

خدا نے اس شراب کی دو صفتیں بیان کی ہیں: سب سے پہلی یہ کہ مختوم ہے، یعنی مہر لگی ہوئی ہر قسم کی ملاوٹ سے محفوظ، اور دوسری یہ ہے کہ جو لوگ اس کو پئیں گے تو اس میں کستوری خوشبو محسوس کریں گے۔

جنت میں شہوت اور جماع

قابل ذکر بات یہ ہے کہ روایات میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں انسانوں کے لیے ہر لذت موجود ہے، جس میں سے کھانا پینا، شہوت اور جنسی لذت، لہذا جنت میں شہوت اور جماع ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دوسرے کیا کہتے ہیں، وہ وحی سے نابلد یا لاتعلق یا منکر ہیں، اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا کہ جنت میں جماع (ہمبستری) اور لذت ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو اپنی امت کے لیے بیان فرمایا۔ جیسا کہ فرماتا ہے: (إِنَّ الرَّجُلَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ يُعْطَى قُوَّةَ مِائَةِ رَجُلٍ فِي الْأَكْلِ وَالشُّرْبِ وَالشَّهْوَةِ وَالْجَمَاعِ. فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْيَهُودِ: فَإِنَّ الَّذِي يَأْكُلُ وَيَشْرَبُ تَكُونُ لَهُ الْحَاجَةُ؟ قَالَ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: حَاجَةٌ أَحَدِهِمْ عَرَقُ يَفِيزُ مِنْ جِلْدِهِ فَإِذَا بَظُنُّهُ قَدْ ضَمَرَ) (رواہ أحمد برقم 18509، والدار می برقم 2704) ترجمہ: "بے شک اہل جنت میں سے ہر ایک آدمی کو کھانے پینے، شہوت اور جماع کے لیے (دنیا کے) سو آدمیوں کی طاقت دی جائے گی تو ایک یہودی نے کہا کہ جب ایک آدمی کھائے گا پئیے گا تو اسے قضائے حاجت بھی ہوگی؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کی حاجت خوشبودار پسینے کی صورت میں ہوگی، جو ان جلد سے مشک کی طرح نکلے گا اور اس کا پیٹ ہلکا ہو جائے گا"

پس جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جنت میں شہوت اور جماع کے ہونے کی تصدیق کرتا ہے، دوسروں کی بغیر ثبوت کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں، ہم صرف اپنے نبی کی پیروی کریں گے اور انہی کی باتوں کی تصدیق کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ خود قرآن کی آیات میں حور العین کے وجود کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ جنتی مردوں کی بیویاں ہوں گی: (كَذَلِكَ ۝ وَزَوْجُهُمْ يُحْوَرُّ عَيْنٌ ۝) (دخان: 54) ترجمہ: "(وہاں) اس طرح (کا حال ہوگا) اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی گورے رنگ کی عورتوں سے ان کے جوڑے بنائیں گے۔"

یعنی ہم ان کو حور عین کے ساتھ جوڑے بنائیں گے جن کو ان کے لیے حلال بنایا ہے، ان کی عزت اور اکرام کریں گے، اس طرح کہ ان سے کوئی بھی

جنتی تعداد میں حور عین چاہیں گے انہیں دستیاب ہوں گی، اور "وَزَوْجُهُمْ" (ہم بیویاں بنائیں گے) کی تفسیر جنتیوں کا حور عین کے ساتھ جماع کی دلیل ہے۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ: جنت میں جماع کی وجہ سے کوئی اولاد نہ ہوگی، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (وَقَدَرُوْی عَنْ اَبِی زَرِیْنِ الْعُقَیْلِی عَنْ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ لَا یُکُوْنُ لَہُمْ فِیْہَا وَلَدٌ) یعنی: ابی زرین العقیلی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل جنت کے لیے وہاں کوئی اولاد نہیں ہوگی۔ (یہ حدیث امام بخاری کی تائید میں مسند احمد میں آیا ہے (15773)

کیا عورتوں کے لیے بھی حوریں ہیں؟

حور کا لفظ "سفیدی" سے لیا گیا ہے بمعنی "سفید عورتیں" اور لفظ "عین" یعنی: "کشادہ آنکھیں" اور یہ اصطلاح صرف عورتوں کے لیے استعمال ہوئی ہے، جیسا کہ دنیا میں مرد عورتوں کے ہاتھ مانگنے کے لیے جاتے ہیں تو مرد طالب ہیں اور عورتیں مطلوب، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جنتی حوروں کا ذکر فرمایا تاکہ ان کا شوق بڑھ جائے، لیکن جنسی مسئلہ ایک ایسی چیز ہے کہ بشر کی خواہش (چاہے مرد ہو یا عورت) کا اس کی طرف میلان ہے، اس لیے لازماً عورتوں کے لیے بھی جنت میں مرد موجود ہیں جیسا کہ شرعی نصوص میں واضح طور پر حور اور غلمان کے بارے میں بتایا گیا ہے، ان غلمان کو بعض نافہم لوگ اور مرد (مردوں کو بالادست جاننے والے) حضرات صرف مرد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جنت میں عورتوں کی مراعات، اور حقوق کی طرف مناسب توجہ نہیں دیتے، اس بنا پر اگر عورت جنت میں دنیا سے اس حالت میں جا کے داخل ہو کہ غیر شادی شدہ ہو، یا شادی شدہ ہو اور اس کے شوہر دوزخی ہو، اور وہ مرد جن کی دنیا میں بیوی نہ ہو یا ان کے بیویاں دوزخی ہوں تو ان مردوں اور عورتوں کی آپس میں شادی کرویائی جائے گی۔

جنت میں کسی بھی قسم کی کوئی ممانعت نہیں ہے، جس چیز کی دل خواہش کرے اسے پالے گا چاہے مرد ہو یا عورت، جیسا کہ حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ جنت میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کو نہ کسی نے دیکھا اور نہ سنا ہے، اور نہ ان کا کسی بشر کے دل میں خیال گزرا، چنانچہ بندوں پر لازم ہے کہ خود کو اعمال صالحہ سے آراستہ کر کے وہاں پہنچیں، اور پھر ایسی چیزوں

کا مشاہدہ کریں گے جو انسان کے ذہن اور دماغ میں نہیں آسکتیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک حدیث مروی ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ، وَاقْرُؤُوا إِنَّ شَتْمَكُمْ: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ) (سورہ السجدہ: 17) (متفق علیہ)

ترجمہ: "اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں خیال گزرا، ان نعمتوں کے علاوہ جن پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مطلع کر دیا ہے"

پھر فرمایا چاہو تو یہ آیت پڑھو: "کسی کو معلوم نہیں کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے" (سورہ سجدہ: 17)

خدا تعالیٰ قرآن عظیم میں فرماتا ہے: (وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ) (سورہ فصلت: 31) ترجمہ: "اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گاتم کو (ملے گی) اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لیے (موجود ہوگی)" اور فرمایا: (وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ) (سورہ زخرف: 71) ترجمہ: "اور وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھوں کو اچھا لگے (موجود ہوگا) اور (اے اہل جنت) تم اس میں ہمیشہ رہو گے"

جنتی غلمان:

جنت میں اہل جنت کے لیے "خوبصورت لڑکوں" کا جو وعدہ کیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل جنت ان کے ساتھ قوم لوط کا عمل کریں گے، کیونکہ جنت ان خباثت اور برائیوں سے پاک ہے، اور یہ برا فعل جنت میں نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سورہ طور میں اہل جنت کے متعلق فرماتے ہیں: (وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ

رَهِیْنٌ ۝۲۱ وَآمَدَدْنَهُمْ بِغَاكِهِةٍ وَنَحْمِ مِمَّا يَشْتَهُونَ ۝۲۲ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَعَفُوفِيهَا وَلَا تَأْثِيْمٌ ۝۲۳ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ۝۲۴ (سورہ طور: 21-24) ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی۔ ہم ان کی اولاد کو بھی اُن (کے درجے) تک پہنچا دینگے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال میں پہنسا ہوا ہے۔ اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہے گا ہم ان کو عطا کریں گے۔ وہاں وہ ایک دوسرے سے جام شراب لیا کرینگے۔ جس (کے پینے) سے نہ ہڈیاں سرائی ہوگی نہ کوئی گناہ کی بات۔ اور نوجوان خد متگار (جو ایسے ہونگے) جیسے چھپائے ہوئے موتی، ان کے آس پاس پھریں گے۔"

قرآن میں ان نوجوانوں کو غلمان کہا گیا ہے، لیکن معلوم ہو جانا چاہئیے کہ ان نوجوانوں کا فرض جنت والوں کی خدمت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ "خوب رو" نوجوان پیالے، پھلوں اور نعمتوں کے ساتھ جنت والوں کے اردگرد گھومیں گے، وہ صرف خدمت کرنے اور آنے جانے میں مصروف ہوں گے، اور وہ نوجوان اپنے حسن و جمال، چمک دمک اور صفائی میں موتیوں کی مانند ہوں گے، یعنی یہ سیپ کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور سیپ کے اندر محفوظ ہے، اور کسی ہاتھ نے اسے چھوا نہیں ہے، گورے، خوبصورت آنکھیں، اور خوش باش۔

قتادہؒ سے ایک حدیث مروی ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! خدمت کرنے والا (خود جنت میں) موتی کی مانند ہے، پس وہ بندہ کیسا ہوگا جس کے یہ خادم خدمت کریں گے؟ فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ان دونوں کے درمیان فضیلت ایک دوسرے پر چودھویں رات کے چاند کی فضیلت کے مانند دوسرے ستاروں پر ہے۔" (انوار القرآن)

اس لیے جنت میں خوبصورت نوجوانوں کا ہونا اہل جنت کے لیے جنسی طور پر لطف اندوز ہونے کی دلیل نہیں ہے، اور کوئی بھی اس قبیح اور غیر فطری فعل کی توجیہ نہیں کر سکتا سوائے ہم جنس پرستوں کے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان نوجوانوں کے وجود کا دنیاوی شرعی احکام سے کوئی تعلق نہیں ہے، تاکہ وہ آدمی چاہے ان کا حوالہ دے کر ان کے ساتھ بد فعلی اور ہم جنس پرستی کے جائز ہونے کی توجیہ پیش کرے۔

دنیاوی عورتوں کا حوروں میں تبدیل ہونا

عورتیں بعد از مرگ جب جنت میں داخل ہوں گی تو حور میں تبدیل نہیں ہوں گی، بلکہ جنت کی حوریں دنیا کی عورتوں سے مختلف ہیں، جیسا کہ قرآن کریم جنت کی حوروں کے بارے میں فرماتا ہے: (فِيهِنَّ قُصِرَتُ الظُّرُفُ) ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ (سورہ رحمٰن: 56) ترجمہ: "اُن میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں جن کو اہل جنت سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ کسی جن نے۔"

یہ معنی ان لوگوں کے قول کی نفی کرتا ہے جو کہتے ہیں: حوریں وہی دنیاوی بیویاں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ بڑھاپے کے بعد دوبارہ جوان بنادے گا، جی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مؤمن عورتوں کو جوانی کی عمر دے کر جنت میں داخل کرے گا، لیکن وہ ان حوروں کے علاوہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا۔

قرآن کریم جنتی عورتوں کے حسن و جمال کے بارے میں فرماتا ہے: (وَحُورٌ عَيْنٌ ۝ ۲۲ ۝ كَامُثَالِ اللُّوْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝ ۲۳) (سورۃ الواقعہ: 22-23) ترجمہ: "اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں، جیسے (حفاظت سے) رکھے ہوئے (آب دار) موتی۔" مکنون کے معنی: پوشیدہ اور محفوظ ہے، یعنی سورج کی روشنی نے ان کا رنگ تبدیل نہیں کیا ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے جنتی حوروں کو یاقوت اور مرجان سے تشبیہ دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَسُوقًا، يَأْتُوْنَهَا كُلُّ جُمُعَةٍ، فَتَهْبُ رِيْحُ الشَّمَالِ فَتَحْثُوْ فِي وُجُوْهِهِمْ وَثِيَابِهِمْ، فَيَزْدَادُوْنَ حُسْنًا وَجَمَالًا، فَيَرْجِعُوْنَ اِلٰی اَهْلِيْهِمْ وَقَدْ اَزْدَادُوْا حُسْنًا وَجَمَالًا، فَيَقُوْلُ لَهُمْ اَهْلُوْهُمْ: وَاللّٰهَ لَقَدْ اَزْدَدْتُمْ بَعْدَنَا حُسْنًا وَجَمَالًا، فَيَقُوْلُوْنَ: وَاَنْتُمْ، وَاللّٰهَ لَقَدْ اَزْدَدْتُمْ بَعْدَنَا حُسْنًا وَجَمَالًا) (مسلم: 2833) یعنی: "جنت میں ایک بازار ہے جس میں ہر جمعہ کے دن لوگ آئیں گے، شمال کی ہوا چلے گی تو ان کے چہروں اور لباس سے ہوتے گزر جائے گی اور اس سے ان کا حسن و جمال مزید بڑھ جائے گا، اور وہ جب اپنے اہل خانہ کے پاس واپس آئیں گے تو اس حال میں لوٹیں گے کہ ان کے حسن و جمال میں اضافہ ہوچکا ہوگا، ان کے اہل خانہ ان سے کہیں گے، اللہ کی قسم! ہمارے پاس سے

جانے کے بعد آپ کے حسن و جمال میں اضافہ ہو گیا ہے، تو وہ کہیں گے: اللہ کی قسم! تمہارا بھی حسن و جمال ہمارے جانے کے بعد بڑھ گیا ہے"

اور جنت میں عورتیں اپنے دنیا کے شوہروں کے ساتھ ایسی ہوں گی، جیسا کہ فرماتا ہے: (أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ، ○) (سورہ زخرف: 70) ترجمہ: " (ان سے کہا جائے گا) کہ تم اور تمہاری بیویاں عزت (و احترام) کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاؤ"

اگر کسی عورت کا شوہر جہنمی ہو تو اس صورت میں وہ عورت کسی جنتی مرد کے عقد نکاح میں آجائے گی، اسی طرح اگر کوئی عورت دنیا میں شادی سے پہلے فوت ہو گئی تو جنت میں کسی ایسے مرد سے شادی ہو جائے گی جو دنیا سے شادی کے بغیر چلا گیا۔

اس مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ: دنیا میں عورت درج ذیل حالات میں سے کسی ایک حالت میں ہوتی ہے:

1 - شادی سے پہلے (کنواری حالت میں) فوت ہو جائے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا سے کوئی شوہر معین کرے گا، ایسا شوہر جو اس عورت کا پسندیدہ ہو، کیونکہ جنت کی نعمتوں میں سے ایک میاں بیوی کی قربت ہے، اور یہ نعمت صرف ایک کے لیے نہیں، بلکہ دوسرے کے لیے بھی ہے۔

2 - طلاق کے بعد اور دوسرے شوہر سے نکاح کیے بغیر فوت ہو جاتی ہے تو اس صورت میں بھی مذکورہ بالا حکم ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ دنیا سے ہی اس کے لیے اس کی خواہش کے مطابق شوہر عطا کرے گا۔

3 - عورت کا شوہر ہے، لیکن دوزخی ہونے کی بنا پر اس کے ساتھ جنت نہیں جائے گا، اس صورت میں وہ مرد جنہوں نے اس دنیا میں شادی نہیں کی یا ان کی بیویاں جہنمی ہیں، ان عورتوں کے ساتھ نکاح کریں گے۔

4 - شادی کے بعد میاں بیوی مرجائیں تو اس صورت میں وہی دنیا والا شوہر جنت میں بھی اس کا شوہر ہوگا۔

5 - اس کا شوہر مر جاتا ہے اور وہ مرتے دم تک بغیر شوہر کے بیوہ رہتی ہے تو اس صورت میں بھی اس کا شوہر وہی دنیا والا شوہر ہوگا۔

6 - اس کا شوہر مرجاتا ہے اور اس کے ساتھ دوسرا مرد شادی کر لیتا ہے، تو اس صورت میں اگر گذرتے زمانے کے ساتھ اس نے دنیا میں یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کیں تو جنت میں اس کا شوہر اس کا آخری والا شوہر ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (البرأة لآخر أزواجها) (صحیح - سلسلہ احادیث صحیحۃ البانی)

حذیفہ ابن یمان نے اپنی بیوی سے کہا: اگر تم چاہتی ہو کہ جنت میں بھی تیرا شوہر رہوں تو میری موت کی بعد کسی اور سے شادی مت کرنا، کیونکہ جنت میں عورت اپنے آخری شوہر کے حصے میں آئے گی، اگرچہ یکے بعد دیگرے کئی شوہر کر لے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے بیویوں سے اس کے بعد شادی کرنے کو حرام قرار دیا، کیونکہ وہ سب جنت میں پیغمبر کی بیویاں ہوں گی، یہ تھا ایک عورت کا مقام دنیا میں، اور ان میں سے ہر ایک حالت کے مقابل جنت میں، پس کوئی بھی جنت میں جوڑے کے بغیر نہیں رہے گا۔

جنت میں حوروں کا حجاب

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ ہم انسان بہت سے غیبی امور کو سمجھ نہیں سکتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے وہ خبریں اپنے نبی کو نہیں بھیجیں چنانچہ جو ہم پر واجب ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان پر ایمان لائیں اور زیادہ تجسس سے گریز کریں۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ اُس جہاں میں معاملات کی نوعیت، اور کیفیت اور امور کی تفصیلات اللہ تعالیٰ کے وسیع اور بے انتہا امکانات کے ساتھ اس طرح ہوگی کہ ہم اس کا یقینی تصور نہیں کر سکتے، اور بہت سے تصورات اور اہداف بہتر اور خوب تر دوسرے طریقے سے فراہم کیے جاسکتے ہیں، یا کچھ مفہیم اور تصورات اور پھلوں پر اس وقت غور کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، یا وہ ہمارے تصور کی شکل میں موجود نہ ہو، اس کے ساتھ ہم نے اس موضوع میں بعض شرعی نصوص روایات کچھ واقعات کے ساتھ میں آپ کو شریک کیا۔

دوم: جنت میں کوئی برائی اور بُری نظر نہیں ہوگی، اور جو لوگ اس میں داخل ہوں گے ان کے دلوں میں بھی کوئی ایسی بیماری نہیں ہوگی کہ جس کی بنا پر وہ عورتوں کے پیچھے گھومتے رہیں بلکہ جنت عزت کی جگہ ہے وہاں کوئی برائی نہیں ہے اور نہ کوئی حرام شہوت ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جنتی حور جس شخص سے شادی کے لیے تیار کی گئی

ہوگی اس کا کسی دوسرے آدمی سے نہ رابطہ ہوگا اور نہ ہی اس شخص کے علاوہ کوئی اور اس حور سے استفادہ کر سکے گا۔

عبدالرحمن سعدی سورہ صافات کی آیت "48" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "وعندہم قاصرات الطرف" (صافات: 48) اہل جنت اپنی پہلوؤں میں خوبصورت حوریں رکھتے ہیں جو ہر قسم کے عیب اور برائی سے پاک ہیں، بڑی آنکھوں والی نیچی نظر والی، "قاصرات الطرف" یعنی: وہ حوریں صرف اپنے شوہروں کی طرف دیکھیں گی، دوسروں کی طرف نہیں، کیونکہ وہ پاکدامن ہیں، دوسروں کی طرف نظر میں نہیں اٹھائیں گی، اس وجہ سے کہ ان کے شوہر خوبصورت اور کامل ہوں گے، وہ جنت میں اپنے شوہروں کے علاوہ کسی کو نہیں چاہیں گی، صرف ان کی طرف میلان رکھیں گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا شوہر بھی اسی کی طرف نظریں جمائے رہے گا، یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جنتی عورت خوبصورت اور کامل ہے، اس کے حسن کی وجہ سے اس کا شوہر صرف اسی کو دیکھے گا، اور نگاہ کا صرف اس کی طرف منحصر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی محبت ایک دوسرے تک ہی محدود ہوگی، دونوں معنی درست ہونے کا امکان ہے۔

یہ سب دلائل جنتی مرد اور عورت کے حسن پر دلالت کرتے ہیں، اور یہ بتاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں گے، کوئی بھی اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور سے محبت کرنا نہیں چاہے گا، یہ ان سب کی سخت پاکدامنی کی طرف اشارہ ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حسد نہیں کریں گے اور وہاں رنجیش نہیں ہوں گی، کیونکہ حسد اور کینہ کی کوئی وجہ نہیں ہوگی، سورہ رحمن کی آیت "56" کی تفسیر میں لکھا ہے: "قاصرات الطرف" یعنی ان محلوں میں ایسی حوریں ہیں جو آنکھیں جمائی ہوئی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نظریں صرف اپنے شوہروں پر ہوں گی، کیونکہ ان کے شوہر بہت خوبصورت اور اچھے ہوں گے، اور وہ ان سے پوری طرح محبت کریں گے، ان کے شوہر بھی صرف انہی کی طرف دیکھیں گے، کیونکہ وہ بھی بہت زیادہ خوبصورت ہوں گی، اور شوہر سے بہت پیار کریں گی، ان کا میل ملاپ اور باہم ملاقاتیں بہت خوشگوار ہوں گی۔

"لَمْ يَظْمِرْهُمْ اِنَّهُمْ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ" یعنی: ان سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے

کسی کی رسائی ان تک نہیں تھی، اور چونکہ وہ اچھے شوہر بننے کا حق ادا کریں گے، اور ان حوروں میں نرمی، ناز اور دلبری ہوگی، اس لیے اپنے شوہروں کی پسندیدہ ہوں گی، اس لیے فرمایا: "كَانَ لَهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۝۸" گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں، یہ ان کی صفائی اور دلکشی اور حسن کی وجہ سے ہے، اللہ تعالیٰ سورہ رحمن کی آیت "72" میں فرماتا ہے، "حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۝۲" "وہ حوریں (ہیں جو) خیموں میں مستور (ہیں) اس بنا پر کہ جنت کی حوروں کو شوہروں کے علاوہ کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا، اس صورت میں ان کے لیے اپنے شوہروں سے کوئی حجاب نہیں ہے، عام طور پر اس کے بارے میں کوئی نص صریح نہیں ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا حال کیسا ہے، لیکن جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اپنے شوہروں سے حجاب کی ضرورت نہیں ہے، ایسی کوئی عبارت موجود نہیں کہ جس میں بتایا گیا ہو کہ: مرد دوسری جنتی عورتوں کی طرف دیکھیں گے یا نہیں!

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة الفجر

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی "30" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اللہ تعالیٰ کے فرمان "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" سے شروع ہونے کی وجہ سے اس سورت کا نام "وَالْفَجْرِ" (صبح) رکھا گیا، اور یہ صبح کی سفیدی پر ایک بڑی قسم ہے کہ اندھیرے کے دل کو چیرتی ہے، سورة الفجر نے سورہ "واللیل" کے بعد شرف نزول پایا۔

سورة الفجر کا خلاصہ:

سورہ فجر کا بنیادی محور اہل ایمان کے لیے کشادگی کا بیان ہے، جو بغاوت اور سرکشی سے لڑنے کی راہ میں ہوتی ہے، اور اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ تاریکی اور سرکشی کا دور محدود ہے، ہر حال میں اسے فنا ہونا ہے، بالکل اسی طرح کہ جیسے رات گزر جاتی ہے اور اپنی جگہ روشن دن کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔

سورة الفجر کی آیات، حروف اور تعداد:

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا اس سورت کا نام "وَالْفَجْرِ" صبح کے معنی میں ہے، سورت کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے، یہ سورہ مکی ہے اور اس کا ایک (1) رکوع، تیس (30) آیتیں، ایک سو سینتیس (137) الفاظ، پانچ سو پچاسی (585) حروف، اور دو سو چھپن (256) نقطے ہیں۔

(یہ بات قابل ذکر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد گننے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے سورہ طور تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

یہ سورت مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور میں ایسے حالات میں نازل ہوئی تھی جب دشمن مسلمانوں کے خلاف طاقت کے استعمال سے کام لیتے تھے، مسلمان خطرے اور دباؤ میں تھے۔

سورة الفجر کا سورۃ الغاشیہ سے ربط و تعلق:

الف: سورة الفجر کے شروع میں قسمیں اور سورة الغاشیہ کے آخر میں آیات کے صحیح ہونے کی دلیلیں ہیں۔

ب: سورہ غاشیہ میں لوگوں کو دو گروہوں بدبخت اور نیک بخت میں تقسیم کیا، یہ سورت بھی نافرمان اقوام: جیسے عاد، ثمود، فرعون اور ان جیسے بدنصیبوں کے زمرے میں جو لوگ آتے ہیں، اور وہ لوگ جو یقین اور ایمان والے کہ شکر گزار اور وفادار ہیں کے بارے میں بات کرتی ہے۔

ج: الفجر کا "أَلَمْ تَرَ كَيْفَ" کا جملہ الغاشیہ کے "أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِلَهِ" کے مشابہ ہے (فرقان)

سورہ فجر کی فضیلت:

امام نسائی رحمہ اللہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا: معاذؓ لوگوں کے پیش امام تھے، اس دوران ایک آدمی آیا اور ان کی اقتدا کی، لیکن معاذ نے نماز لمبی کردی، تو اس آدمی نے اپنی نماز توڑ کر مسجد کے ایک کونے میں جا کر نماز پڑھی اور باہر چلا گیا، جب یہ خبر معاذ تک پہنچی تو کہا: فلاں آدمی جس نے اس طرح کیا وہ منافق ہے، چنانچہ اس واقعے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے پوچھا کہ معاذ کے پیچھے نماز کیوں چھوڑ دی؟ اس نے کہا: میں ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے آیا تھا، لیکن انہوں نے مجھ پر نماز لمبی کردی، اس لیے لاچار میں پلٹ گیا اور مسجد کے ایک گوشے میں نماز پڑھ کہ گیا تاکہ اپنے اونٹ کو گھاس ڈالوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ سے کہا: "اے معاذ! کیا تم فتنہ برپا کرنے والے ہو؟ کیوں: (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ وَالشَّهْيسَ وَضْحَهَا ۝ وَالْفَجْرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى ۝) جیسی سورتیں لوگوں پر نہیں پڑھتے؟"

سورہ فجر کا سبب نزول:

سورہ فجر کی آیت "27" کے سبب نزول کے بارے میں ابن ابی حاتم بریدہ سے روایت کرتے ہیں کہ آیت: (يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ) حضرت حمزہؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے، اور جویر کے توسط سے ضحاک سے وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنو رومہ کو کون خریدے گا؟ کہ اپنے اس عمل سے میٹھا اور خوشگوار پانی بھی پیے، اور خدا تعالیٰ کی عطا اور بخشش کا مستحق بھی بنے؟ حضرت عثمانؓ نے اس کنویں

کو خریدا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا آپ اس کنویں کو عوام کے پینے کی جگہ بنا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، اس وقت آیت (یا اَیُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ) حضرت عثمانؓ کے متعلق نازل ہوئی۔

یا اَیُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (27) اَرْجِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (28) اے نفس مطمئنہ! (اطمینان پانے والی روح) یعنی: اے امن والی روح! تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کی وحدانیت پر یقین رکھنے میں اس یقین کو پہنچ گئی ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ کی آمیزش باقی نہیں ہے اور اس میں کوئی دھوکہ یا منافقت نہیں پائی جاسکتی، اے وہ روح جو اللہ کے فیصلے سے مطمئن ہے، تو راضی ہے اور جانتی ہے کہ ہر چیز اس کی تقدیر کے مطابق ہے، اور جو چیز انسان کو پہنچنی چاہیے وہ پہنچے گی اور اس سے دور نہیں، اور جو کچھ اس تک نہیں پہنچنی وہ اس سے بالکل دور ہے، اے خوش و خرم روح! "اپنے رب کی طرف راضی ہو کر لوٹ جا" اس انعام سے جو اس نے تمہیں دیا ہے، "اور وہ بھی تجھ سے راضی ہے" اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے راضی ہے اور تو قیامت کے دن پرسکون اور پر امن میدان محشر میں آئے گی، کیونکہ تجھے موت کے وقت اور قیامت کے وقت جنت کی بشارت دی جائے گی۔

بعض مفسرین نے اس کے اسباب نزول میں دو روایتوں کا ذکر کیا ہے: پہلی روایت یہ ہے کہ: یہ آیت حضرت حمزہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب احد میں شہید ہوئے۔

دوسری روایت وہی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جب رومہ کنواں خرید کر لوگوں کے پینے کے لیے وقف کیا یہ آیت اُس بارے میں نازل ہوئی۔

سورہ فجر کا موضوع اور محور

- 1- خدا تعالیٰ کی خاص قسم صبح سویرے پر اور ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں پر، ہر چیز کے جفت و طاق اور رات کے آخری حصے پر کہ کفار اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھاگ نہیں سکتے (1 الی 5)
- 2- کچھ ظالم قوموں کی قسمت اور انجام کا مختصر بیان جو خدا کے پیغمبروں کا انکار کرتی رہیں (6 الی 14)
- 3- دنیا کی زندگی انسان کے لیے عام آزمائش کی جگہ ہے کہ آخر کہاں ختم ہوگی؟ (15 الی 20)
- 4- قیامت کی بار بار تفصیل (21 الی 23)

5- قیامت میں لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوں گے: خوش نصیب اور بد نصیب
(24 الی 26)

6- اہل سعادت یعنی خوش نصیب کو جنت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کے
بارے میں آگاہ کرنا (27 الی 30) (بہ نقل تفسیر فرقان)

سورة الفجر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ۝ هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرِ ۝ أَلَمْ تَرَ
كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا
الصَّخْرَ بِآلِوَادٍ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَارِ ۝ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَاكْثُرُوا فِيهَا الْفُسَادَ ۝ فَصَبَّ
عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ إِنَّ رَبَّكَ لِبَالِغٌ صَادٍ ۝ فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ
وَنَعَّمَهُ ۝ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۝ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ
لَّا تَكْرُمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَخْضُونَ عَلَى طَعَامِ الْيَسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لَّهًا ۝ وَتُحِبُّونَ
الْبَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْبَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ
يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۝ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۝ يَقُولُ يَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۝ فَيَوْمَئِذٍ
لَّا يُعَذِّبُ عَذَابُهُ أَحَدًا ۝ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدًا ۝ يَأْتِيهَا النَّفْسُ الْبُطْبُئِيَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَى
رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبْدِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

سورت کا لفظی ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالْفَجْرِ ۝	قسم ہے فجر کی (1)
وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝	اور دس راتوں کی (2)
وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝	اور جفت اور طاق کی (ہر چیز کی قسم کہاتا ہے) (3)
وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ۝	اور رات کی جب (وہ دن کی روشنی کی طرف) چلتی ہے (4)
هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرِ ۝	کیا اس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟ (5)

اے پیغمبر) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا (6)	أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝١
ارم کے لوگ ستونوں جیسے لمبے قد والے (7)	إِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٢
وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا (8)	الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٣
(کیا تم نہیں جانتے ہو تمہارے رب نے) قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی (قری) میں پتھر تراشتے (اور گھر بناتے) تھے (9)	وَتَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝٤
اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (کس طرح کیا) (10)	وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَارِ ۝٥
وہ لوگ جنہوں نے شہروں میں سرکشی اختیار کر لی تھی (11)	الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝٦
اور ان میں بہت فساد مچایا تھا (12)	فَاكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝٧
چنانچہ تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا (13)	فَصَبَّ عَلَيْهِمُ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝٨
بے شک تیرا رب یقیناً گھات میں ہے (14)	إِنَّ رَبَّكَ لِبَاسٍ رِصَادٍ ۝٩
پس لیکن انسان جب اس کا رب اسے آزمائے، پھر اسے عزت بخشے اور اسے نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی (15)	فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ ۝١٠ وَنَعَّمَهُ ۝١١ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝١٢
اور لیکن جب وہ اسے آزمائے، اور اس پر اس کا رزق تنگ کر دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے (16)	وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۝١٣ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝١٤
ہر گز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے (17)	كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝١٥
اور نہ تم آپس میں مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو (18)	وَلَا تَحْضُونَ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۝١٦
اور میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو (19)	وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّهًا ۝١٧

اور مال سے محبت کرتے ہو، بہت زیادہ محبت کرنا (20)	وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝۲۰
ہر گز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کردی جائے گی (21)	كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝۲۱
اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے (22)	وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝۲۲
اس دن جہنم کو لایا جائے گا، اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں (23)	وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۝۲۳ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۝۲۴
کہے گا اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے آگے بھیجا ہوتا (24)	يَقُولُ يَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۝۲۵
پس اس دن اس کے عذاب جیسا عذاب کوئی نہیں کرے گا (25)	فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝۲۶
اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھے گا (26)	وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝۲۷
اے نفس مطمئن! (27)	يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝۲۸
اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا، اس حال میں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی (28)	ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۹
پس میرے (خاص) بندوں میں شامل ہوجا (29)	فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝۳۰
اور میری جنت میں داخل ہوجا (30)	وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝۳۱

مختصر تفسیر

محترم قارئین:

آیات مبارکہ (1 تا 16) میں کفر اختیار کرنے والوں کی جزا و سزا یقینی بتائی گئی ہے، اور ان میں سے بعض کو اسی دنیا میں جزا و سزا دی جائے گی اس کے بارے میں بھی بحث کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالْفَجْرِ ۝	قسم ہے فجر کی (1)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے صبح کی قسم کھائی ہے، کیونکہ یہ وقت اندھیرے کو چیرنے اور دن طلوع ہونے کا ہے، یعنی: میں صبح سویرے کی قسم کھاتا ہوں، جب وہ اندھیروں کو دور کرتا ہے، اور کائنات کو اپنی روشنی سے منور کرتا ہے۔

صبح کی قسم! جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دن طلوع ہوتا ہے، اور ہم نیند سے بیدار ہوتے ہیں جو کہ چھوٹی موت ہے، اور اللہ تعالیٰ مزید اعمال ذخیرہ کرنے کے لیے ہمیں ایک اور دن دیتا ہے۔

مجاہد فرماتے ہیں: اس قسم سے اللہ تعالیٰ کی مراد عید الاضحیٰ کے صبح سویرے کی روشنی ہے۔

والفجر کی تفسیر میں مفسرین کے نظریات و آراء

- 1۔ مکمل فجر کا وقت۔
- 2۔ فجر صبح کی نماز کا وقت: کیونکہ صبح کی نماز کے وقت فرشتوں کے دو گروہ موجود ہوتے ہیں:

رات کے فرشتے اوپر اور دن کے فرشتے نیچے آتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے میرے بندے کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟ وہ جواب دیتے ہیں: انہیں اس حال میں چھوڑ آئے ہیں کہ وہ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے: (يَتَعَاقِبُونَ فِيكُمْ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ، وَيَجْتَمِعُونَ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الْعَصْرِ، ثُمَّ يَرْجِعُ الَّذِينَ بَاتُوا فِيكُمْ، فَيَسْأَلُهُمْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ: كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِي، فَيَقُولُونَ: تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ، وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ) (بخاری: 555 و 3223 و 7429 و 7486) (مسلم: 632) ترجمہ: فرشتے آگے پیچھے زمین پر آتے جاتے ہیں، کچھ فرشتے رات کے ہیں اور کچھ دن کے اور یہ سب فجر اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے جو تمہارے یہاں رات میں رہے، اللہ کے حضور جاتے ہیں تو اللہ ان سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے وہ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ جب ہم نے انہیں چھوڑا تو وہ (فجر کی)

نماز پڑھ رہے تھے، اسی طرح جب ہم ان کے ہاں گئے تھے، تب وہ (عصر) کی نماز پڑھ رہے تھے، صبح اور عصر کی نماز کے وقت فرشتوں کے دونوں گروہ انسانوں کے پاس حاضر ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کے لیے جگہ خالی کرتے ہیں، انسانوں کے دن اور رات کے اعمال آسمان پر لے جاتے ہیں۔

"فجر" حج کی صبح، عید قربان، (ذی الحج کی راتوں میں سے آخری رات) قرآن کریم میں فجر کی جو دوسری تعبیر آئی ہے وہ فلق ہے: "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" "میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی" فلق یعنی پہاڑنا، یہ اندھیرے کے پردے کو پہاڑتا ہے اور اس اندھیرے کے دل سے روشن صبح نکالتا ہے۔

وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝۲	اور دس راتوں کی (2)

ذی الحج مہینے کی پہلی دس مبارک راتوں کی قسم، کیونکہ یہ ایک محترم وقت ہے، کہ اس میں بہت اچھے اعمال کثرت سے کیے جاتے ہیں، عبادات اور مناسک ادا کرنے کا وقت مقرر کیا گیا ہے، (یہ جمہور کی رائے ہے، اور ابن عباسؓ سے بھی روایت ہے) بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں: اس سے مراد رمضان کے آخری دس دن ہیں، کیونکہ اس میں شب قدر ہے، ابن عباسؓ سے بھی یہ قول مروی ہے، لیکن پہلا قول راجح ہے

حدیث مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی کی تائید میں فرماتے ہیں: (مَا مِنْ أَيَّامٍ الْعَمَلُ الصَّالِحُ فِيهِنَّ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْأَيَّامِ الْعَشْرِ) ترجمہ: "نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذی الحج کے پہلے عشرے کی طرح کسی اور دن میں محبوب نہیں" (ترمذی: 757) و (ابوداؤد: 2438) و (ابن ماجہ: 1727) حکم البانی: صحیح۔

دس راتوں کے بارے میں مفسرین کے نظریات:

1- ذی الحج کا پہلا عشرہ: یہ اللہ کے دنوں (ایام اللہ) سے مشہور ہیں، نیک اعمال کا ان دنوں میں بہت زیادہ اجر و ثواب ہے، تمام نیک اعمال ان دنوں میں جمع ہو جاتے ہیں، وہ سارے نیک عمل جو شب قدر میں ہیں وہ ذی الحج کے پہلے عشرے میں بھی ہیں، علاوہ اس کے کہ ذی الحج میں مناسک حج بھی ادا کیے جاتے ہیں، جس میں تمام مسلمان یک صدا ہو کر لبیک کہتے ہیں، اور شیطان ناراض ہو جاتا ہے، ذی الحج کے پہلے عشرے کی عبادت اور روزہ کی فضیلت اللہ کے راستے میں جہاد سے بھی زیادہ

ہے، مگر سوائے اس شخص کے جو جہاد میں شہید ہو اور اپنے تمام مال و دولت کو اللہ کے راستے اور جہاد میں کھو دیا ہو، صرف اس صورت میں شہید کی فضیلت زیادہ ہے: "مَا مِنْ أَيَّامٍ الْعَمَلُ الصَّالِحُ فِيهِنَّ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ هَذِهِ الْأَيَّامِ الْعَشْرِ"، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، إِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فَلَمْ يَرْجَعْ مِنْ ذَلِكَ بِشَيْءٍ" (ترمذی: 757) و (ابوداؤد: 2438) و (ابن ماجہ: 1727) حکم البانی: صحیح.

2- "وَلَيَالٍ عَشْرٍ" سے رمضان کا آخری عشرہ مراد ہے، شب قدر کی وجہ سے۔

رمضان کے آخری عشرے کے بارے میں علماء کی دو رائے

1- بعض کا خیال ہے کہ دس راتوں سے مراد رمضان کی آخری راتیں نہیں ہیں، کیونکہ سورۃ الفجر مکی ہے، جبکہ رمضان کے روزے کی فرضیت ہجرت کے دوسرے سال میں ہوئی ہے۔

2- بعض دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ اگرچہ کوئی دلیل موجود نہیں ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے علم غیب سے ہر اس چیز کی قسم کھا سکتا ہے جو ابھی تک نازل نہیں ہوئی ہو۔

آخر میں علماء نے اس آیت سے متعلق درج ذیل دو رائے پیش کی ہیں:

1- رمضان کی راتیں جبکہ ذی الحج کے دن بہتر ہیں۔

2- عشرہ ذی الحج بہتر ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے دن ہیں جو بہت زیادہ مقام اور فضیلت رکھتے ہیں، اس میں شب قدر کے تمام اعمال کے علاوہ حج بھی ہوتا ہے۔

اور جفت اور طاق کی (ہر چیز کی قسم کھاتا ہے) (3)	وَالشَّفْعُ وَالْوَتْرُ ۝۳

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی قسم کھائی ہے، کیونکہ ہر چیز یا تو جفت ہوگی یا طاق، خالق اور مخلوق بھی اس میں شامل ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے، تمام مخلوقات جو نر اور مادہ سے پیدا ہوئے ہیں جوڑے ہیں، (یہ رائے مجاہد اور ابن عباسؓ سے روایت کی گئی ہے)، اور ابن عباسؓ سے یہ بھی

روایت ہے کہ "شفع" یعنی: عید قربان کے دن، اور "وتر" عرفہ کے دن، اس لیے نواں "9" دن ہے، اس بارے میں بہت سارے اقوال منقول ہیں، مزید تفصیل معلوم کرنے کے لیے تفاسیر کی طرف رجوع فرمائیں، (تفسیر صفوة التفاسیر) "الشفع" زوج، جوڑا "الوتر" طاق، "شفع ووتر" اس میں پوری کائنات شامل ہے، بعض کا خیال ہے کہ "شفع" اللہ کی مخلوق اور "وتر" اللہ کی ذات ہے۔ (قاسمی۔ خرمدل)

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۝	اور رات کی جب (وہ دن کی روشنی کی طرف) چلتی ہے (4)

رات کا صبح کی روشنی کی طرف جانا یہ ایک نشانی ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی قدرت کو ظاہر کرتی ہے۔

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝	کیا اس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟ (5)

یعنی: عقل والوں کے لیے قائل کرنے والی قسم موجود ہے؟ یہ تقریری استفہام ہے، اس سے مذکورہ امور کی وسعت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے، گویا کہ فرماتا ہے: کہ یہ عقل اور سمجھ رکھنے والوں کے نزدیک حقیقت میں ایک بڑی اور عظیم قسم ہے، لہذا جو بھی عقل و شعور رکھتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مذکورہ بالا اشیاء میں خدا کی وحدانیت اور اس کے وجود کے بے شمار دلائل ہیں، پس یہ سب اشیاء قسم کھانے کے لائق اور مناسب ہیں کیونکہ یہ خدائے عظیم الشان پر دلالت کرتی ہیں، (بنقل از تفسیر صفوة التفاسیر)

مفسر قرطبی فرماتے ہیں: بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے اسماء و صفات کی قسمیں کھاتا ہے جس سے اس کا علم ظاہر ہوتا ہے، اور کبھی افعال کی قسم کھاتا ہے کیونکہ وہ اس کی طاقت اور قدرت پر دلالت کرتے ہیں۔

جیسا کہ فرمایا ہے: "وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ" ۝ اور اپنے مخلوقات کی قسم کھاتا ہے، کیونکہ وہ اس کی قدرت اور طاقت کو بیان کرتی ہیں: "وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝، وَالسَّمَاءَ وَالطَّارِقَ ۝" اور "وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝" (تفسیر قرطبی: 41 / 19)

جواب قسم محذوف ہے اور تقدیر اس کی اس طرح ہے: ان اشیاء کے رب کی قسم میں کفار کو عذاب دوں گا، (الوسی: 122/30)

اے پیغمبر) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا (6)	أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝

(اور کیا مصیبت ان پر آئی) جب ان کو سخت اور تیز ہوا کے ساتھ عذاب سے دو چار کیا، اور ہلاک کر کے نابود کیا، حالانکہ وہ کفار مکہ سے زیادہ طاقتور تھے، اس لیے ان کفار کی ہلاکت زیادہ آسان ہے۔

"أَلَمْ تَرَ" کیا نہیں دیکھا؟ دیکھنے سے مراد آنکھ کا دیکھنا نہیں ہے، بلکہ دل کی آنکھ سے عقلی طور پر دیکھنا اور سمجھنا ہے۔

"رَبُّكَ" تیرا پروردگار، یہ پیغمبر کے لیے بشارت ہے کہ تجھے تنہا نہیں چھوڑوں گا، اور مقصود پوری امت ہے۔

"بِعَادٍ اِرَمَ" عاد قوم ہود کے باپ کا نام ہے، اس کا قبیلہ اس کے نام پر تھا، سلطنت عمان میں یمن کے علاقے میں رہتے تھے، چونکہ یہ مکہ کے قریب تھے اس لیے اہل مکہ ان کے حالات اور تاریخ سے باخبر تھے، جن کا پیغمبر ہود علیہ السلام تھا، وہ لوگ کافی مضبوط اور طاقتور تھے، اِرَمَ شاید ان کے دادا کا نام ہو۔

اِرَمَ کے لوگ ستونوں جیسے لمبے قد والے (7)	اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝

اور ان کے محل اور خیمے ستون والے تھے، "اِرَمَ" قوم عاد کا دوسرا نام ہے، جو عاد سے بدل اور مجرور ہے، "ذَاتِ الْعِمَادِ" ستون جیسے دراز اور لمبے قد والے، طاقتور اور اونچے اونچے ستونوں سے بھرے محلات اور خیمے تھے، اس سے مراد قوم عاد کی مادی اور جسمانی طاقت ہے۔ (تفسیر نور مصطفیٰ خرم دل)

وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا (8)	الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝

اس قبیلے کے افراد کی طرح مضبوط، لمبے قد و قامت، طاقتور کسی اور کو نہیں بنایا گیا۔

عاد (عادیوں کے پر دادا کا نام تھا) تفاسیر میں جو کہا گیا ہے اس کے مطابق قوم عاد سام بن نوح کی نسل سے ہے، جو مضبوط جسامت کے مالک اور طاقتور تھے، عادیوں کی سرزمین زرخیز، سرسبز اور شاداب تھی اور انہوں نے اپنی خداداد قوتوں سے اسے آباد کرنا شروع کیا، اور پہاڑوں اور اونچی جگہوں پر نہایت مضبوط اور خوبصورت محلات اور قصر تعمیر کیے جو قرآن کے مطابق ان کی طرح کہیں اور نہیں بنائے گئے، (شیخ قرطبی نے لکھا ہے کہ مثلہا ضمیر قبیلہ کی طرف لوٹتی ہے یعنی اس قبیلہ جیسی قوت، مضبوطی، بڑے جسم اور لمبے قد دیگر شہروں میں کوئی پیدا نہیں کیے گئے، انہوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ ایک گروہ اس ضمیر کو عادیوں کے شہر کی طرف راجع سمجھتا ہے، یعنی اس جیسا شہر کہیں نہیں بنایا گیا:

قوله تعالى: "الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ" الضمير في "مثلها" يرجع إلى القبيلة. أي لم يخلق مثل القبيلة في البلاد: قوة وشدة، وعظم أجساد، وطول قامة؛ عن الحسن وغيره. وفي حرف عبدالله «التي

لم يخلق مثلهم في البلاد». وقيل: يرجع للمدينة. والأول أظهر، وعليه الأكثر، حسب ما ذكرناه. زياده طاقت اور ترقی قوم عاد کے تکبر اور سرکشی کا سبب بنی، چنانچہ ان کی سرکشی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اپنے نبی کی دعوت حق سے انکار کر دیا اور کہا: کون ہم سے زیادہ طاقتور ہے (سورہ فصلت: 15) کہ ہمیں عذاب دے سکے؟ قرآن مجید سورہ ہود آیت: 60 میں صراحت سے موجود ہے کہ عاد وہی قوم ہود ہے، قبیلہ یا قوم عاد کا نام 24 مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے، اور سورہ نجم آیت "50" میں "عادن الاولی" کہا گیا ہے کہ بعض محققین اس سے استدلال کرتے ہیں کہ عاد کے دو قوم تھے: "عادن الاولی" جس کی ایک ہزار سے زائد شاخیں ہیں، ان کی ہلاکت کے بعد "عاد ثانی" ظاہر ہوئے جو کہ بت پرست تھے، جن کے بتوں کے نام کتب اصنام میں ذکر ہوئے ہیں۔ (تفسیر قرطبی سورہ نجم آیت 50 کی تفسیر میں ہے کہ: قوله تعالى: (وأنه أهلك

عادا الأولى) سماها الأولى لأنهم كانوا من قبل ثمود. وقيل: إن ثمود من قبل عاد. وقال ابن زيد: قيل لها عاد الأولى لأنها أول أمة أهلك بعد نوح عليه السلام. وقال ابن إسحاق: هما عادان فالأولى أهلك بالريح الصرصر، ثم كانت الأخرى فأهلك بالصيحة. وقيل: عاد الأولى هو عاد بن إرم بن عوص بن سام بن نوح، وعاد الثانية من ولد عاد الأولى، والمعنى متقارب. وقيل: إن عاد الآخرة الجبارون وهم قوم هود)

قوم عاد بت پرست تھے، خدا تعالیٰ نے ان کی طرف ہود علیہ السلام کو بھیجا، حضرت ہودؑ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں سے ایک تھے جن کا اسم گرامی سات بار قرآن میں ذکر ہوا ہے، اور قرآن کریم کی ایک سورت بھی ان کے نام سے ہے۔

ہود حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ہیں، سات پشتوں کے بعد ان سے جا ملتے ہیں، ان کو ہود اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہیں قوم کو گمراہی سے نجات دلانے، اور رب کی طرف سے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے چنا گیا تھا، لیکن قوم عاد نے ہود علیہ السلام کو بے وقوف اور احمق تصور کیا (سورہ اعراف: 66، سورہ ہود: 54)، خدا کی عبادت سے منہ پھیر لیے اور اپنے باپ دادا کے دین سے چمٹ گئے، تکبر کرنے لگے اور ہود علیہ السلام کو ستانے لگے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا عذاب طوفان اور ہوا کی صورت میں ان پر نازل ہوا، ہود علیہ السلام اور اس کے تھوڑے سے پیروکاروں کے علاوہ سب کے سب نابود ہو گئے، قوم عاد کے واقعات: سورہ اعراف، ہود، مؤمنون، شعراء اور فصلت میں تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں، قرآن کی رو سے جو کچھ سامنے آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کے محل سکونت احقاف (ایک ریگستان عمان اور حضر موت کے درمیان) میں تھا، (سورہ احقاف آیت: 21)

سورہ حاقہ آیت 6 تا 8 میں ہے: لیکن قوم عاد ایک تیز، سرکش اور ٹھنڈی ہوا سے ہلاک ہو گئی (6) خدا نے اس کو سات رات اور آٹھ دن مسلسل ان پر چلائے رکھا تو لوگوں کو اس میں اس طرح (زمین پر) گرے ہوئے دیکھتا جیسے وہ کھجوروں کے گرے ہوئے تھے ہوں (7) تو کیا ان کا کوئی بھی باقی رہنے والا تو نے دیکھا ہے؟ (8) (مزید تفصیل کے لیے تفسیر قرطبی، تفسیر جلالین، ابن کثیر و تفسیر بغوی کا مطالعہ کریں)

(کیا تم نہیں جانتے ہو تمہارے رب نے) قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراشتے (اور گھر بناتے) تھے (9)	وَتَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِیِّ ۝

وہی قوم جو شام اور مدینے کے درمیان وادی قریٰ میں بڑے بڑے چٹانوں کو تراشتی اور کاٹتی تھی، اور پہاڑوں کے اندر اپنے لیے عالیشان محلات اور گھر بنا کر رہتی تھی۔

وادی قریٰ کی سرزمین (مکہ اور مدینہ کے درمیان) شہر حجر میں (اب بھی ان کے کچھ آثار اور علامات بڑے بڑے پتھروں کے درمیان دیکھے جاسکتے ہیں) زندگی بسر کرتے تھے، اور مختلف قبائل سے تشکیل پاتے تھے، قوم عاد

کی طرح بت پرستی، ظلم اور سرکشی میں ڈوبے ہوئے تھے، عمارتیں اور محلات بناتے تھے، اور ان کی زندگی میں سوائے انحراف اور گمراہی کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔

حضرت صالح

حضرت صالح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں سے ایک ہیں قرآن کریم میں گیارہ مرتبہ ان کے نام کا تذکرہ ہوا ہے، حضرت صالح ثمود قبیلے سے اور سام بن نوح کے پوتے تھے، بعض مؤرخین حضرت صالح کے سلسلہ نسب سے متعلق لکھتے ہیں: "صالح بن عبید بن جابر بن ثمود" اور بعض دوسروں نے ان کو: "صالح بن جابر بن ارم بن سام بن نوح" لکھا ہے، حضرت صالح ان پیغمبروں میں سے تھے جن کو عربی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا، اور روایات کے مطابق "280" سال عمر پائی۔

روایات کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام کا مدفن اور مقام حجر الاسود اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے درمیان کعبہ کے پہلو میں ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجے گئے تھے، دن اور رات محنت کر کے اس قوم کو خدا اور نیکیوں کی طرف دعوت دی، لیکن اس قوم نے ان کی اطاعت نہیں کی، بالآخر وہ قوم خدا کے سخت عذاب میں گرفتار ہو گئی۔

حضرت صالح علیہ السلام تیسرے پیغمبر تھے جو حضرت نوح اور ہود علیہما السلام کے بعد بتوں اور بت پرستی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، برسوں تک ان سے لڑتے رہے۔

بعض روایات کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام نے سولہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا شروع کیا، ایک سو بیس (120) سال تک ان کو دعوت دیتے رہے، لیکن سوائے چند آدمی کے اور کوئی ان پر ایمان نہیں لایا۔

مغضوب زمین:

اس سے مراد وہ زمین ہے جس میں عذاب الہی کا نزول ہوا ہو، وہ سرزمین جو مغضوب ہیں، ان میں: لوط علیہ السلام کی سرزمین، بابل اور ثمود (مدینہ اور شام کے درمیان جس میں قوم صالح رہتی تھی) اور مسجد ضرار (جو مسجد قبا کے پہلو میں ہے جسے منافقین نے بنایا تھا) شامل ہیں، اگرچہ مغضوب

سرزمین میں جمہور علماء کے نزدیک نماز پڑھنا درست ہے، لیکن چند دوسرے علماء اس میں نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

محدثین فرماتے ہیں: کہ ایک دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ثمود کے علاقے سے گزرے تو فرمایا: (لَا تَدْخُلُوا عَلَى هَؤُلَاءِ الْمُعَذِّبِينَ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ، فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا بَاكِينَ فَلَا تَدْخُلُوا عَلَيْهِمْ، لَا يَصِيبُكُمْ مَا أَصَابَهُمْ) بخاری (433) ترجمہ: "ان عذاب والوں کے آثار سے اگر تمہارا گزر ہو تو روتے ہوئے گزرو، اگر تم اس موقع پر نہ رو سکو تو ان سے گزرو ہی نہیں، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی ان کا سا عذاب آجائے"

اور مسلم کے لفظ میں ہے کہ: (لَا تَدْخُلُوا مَسَاكِينَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ، إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ حَذَرًا، أَنْ يَصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَهُمْ) مسلم (2980) ترجمہ: "جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے ان کی رہائش گاہوں میں داخل نہ ہونا، مگر اس طرح کہ تم رو رہے ہو، ڈر رہے ہو کہ تمہیں بھی عذاب نہ آجائے جس نے انہیں آ لیا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زور سے سواری کو ہانکا رفتار تیز کی یہاں تک کہ اس جگہ کو پیچھے چھوڑ دیا"

اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: (أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا تَزَلَّ الْحَجْرَ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ أَمَرَهُمْ أَنْ لَا يَشْرَبُوا مِنْ بَيْرِهَا وَلَا يَسْتَقُوا مِنْهَا، فَقَالُوا: قَدْ عَجْنَا مِنْهَا وَاسْتَقَيْنَا، فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَطْرَحُوا ذَلِكَ الْعَجِينَ وَيَهْرِيقُوا ذَلِكَ الْهَاءَ) بخاری (3378) و مسلم (2981) ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجر (ثمود کی بستی) میں غزوہ تبوک کے لیے جاتے ہوئے پڑاؤ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم فرمایا کہ یہاں کہ کنوئیں کا پانی نہ پینا اور نہ اپنے برتنوں میں ساتھ لینا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کی کہ ہم نے تو اس سے اپنا آٹا بھی گوند لیا ہے اور پانی اپنے برتنوں میں بھی رکھ لیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ گوندا ہوا آٹا پھینک دیا جائے (یا اونٹوں کو دے دیں) اور اس پانی کو بہا دیں۔"

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بابل میں نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے (اس موضوع کی تفصیل: الموسوعة الفقهية: 190/30 میں ملاحظہ کرسکتے ہیں)

اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (کس طرح کیا) (10)

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝۱۰

(اور) اے محمد! (کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے رب نے) فرعون کے ساتھ کیا کیا؟

ایک باغی اور جابر فرعون جس کے پاس بڑی فوج اور لشکر تھی جس کے ذریعے اس نے اپنی سلطنت کو مضبوط کیا۔

مفسر ابو سعود فرماتے ہیں: اس لحاظ سے اسے "اوتاد" کہا گیا کہ اس کی بہت زیادہ فوج اور کثیر تعداد میں خیمے تھے، اپنے فوجی چھاؤنیوں کے لیے میخیں استعمال کرتا تھا، یا اس لیے کہ لوگوں کو میخوں سے تشدد کرتا اور اذیتیں پہنچاتا، (ابو سعود: 362/5)

ابن عباسؓ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: فرعون کے بہت سارے سپاہی اور لشکر تھے جن کے پاس کافی سارے خیمے ہوتے تھے، ان خیموں کو میخوں کے ذریعے مضبوط کرتے۔

"اوتاد": میخیں، یہ اشارہ ہے فرعون کی فوج، لشکر اور بہت سارے خادموں کی طرف جو فوجی اور میدانی خیموں کو جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کیلوں سے مضبوطی سے باندھا کرتے تھے۔

دوسرا یہ کہ: میخیں زمین میں گاڑتے، اور جو لوگ فرعون کے غضب کا نشانہ بنتے انہیں اذیتیں دیتے اور کیلوں سے انہیں میخ لگاتے یہاں تک کہ وہ فوت ہو جاتے۔

لفظ "ذِي الْأَوْتَادِ" کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کی آراء کا اظہار درج ذیل شرح سے کیا جاسکتا ہے:

(1) پہاڑ والے (اہرام) فرعونوں نے اہرام بنائے تاکہ ان کے اندر ان کی قبریں رکھی جاسکیں، اور انہوں نے ان بڑی عمارتوں کی تعمیر کے لیے لوگوں کو جبری مشقت پر مجبور کیا۔

(2) ایک فرعون جو لوگوں کو اذیت دینے کے لیے کوڑے کا استعمال کرتا تھا۔

(3) وہ فرعون جس کے پاس اپنی حکومت اور بادشاہت کی حفاظت کے لیے

بہت سی فوجیں اور لشکر تھے، اور لمبے ستون جو ان لوگوں نے جشن کے دوران کھڑے کیے تھے۔

ملاحظہ:

سب سے خوبصورت تفسیر اور تعبیر اس آیت مبارکہ "وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ" کے متعلق یہ ہے کہ: مصری فرعونوں کی عمارتوں کی شکلیں الٹی کیلوں کی طرح تھیں کہ بنیاد سے چوڑی اور اوپر سے پتلی جس کی نمونے قاہرہ میں تھیں ابرام کی صورت میں موجود ہیں، (واللہ اعلم) (تفسیر مرغی اور تفسیر فرقان سے منقول)

محترم قارئین:

مؤرخین اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے: جب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکار فرعون اور فرعونوں کے ظلم و ستم سے تنگ آگئے تو مصر میں ان کا رہنا دشوار ہو گیا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے عزم اور فیصلہ کر لیا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ فلسطین (بیت المقدس) کی طرف ہجرت کریں، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اپنے پیروکاروں کو رات کے وقت مصر سے باہر نکالے۔

موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکار رات کو مصر سے فلسطین کی طرف نکل پڑے، سفر کے دوران دریا نیل تک پہنچے، اس مشکل کی گھڑی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و مہربانی سے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی، کہ اپنی عصا سے دریا کو مارو، "فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ۚ" (شعراء: 63) اور فرمایا: "فَاضْرِبْ لَهُم مَّحْجَاً فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۖ لَا تَخَفْ دَرَكَاوُلَا تَخْشَىٰ ۚ" (طہ: 77) بنی اسرائیل کے لیے دریا میں خشک راستہ بنادے کہ (فرعونوں) کے پیچھا کرنے سے ڈرو گے نہ دریا نیل میں ڈوبنے اور غرق ہونے سے (سورہ طہ: 77)

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی لاٹھی دریا پر دے ماری، دریا کا پانی شق ہو گیا اور دریا کے نیچے کی زمین ظاہر ہو گئی، موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل اسی راستے سے چلتے ہوئے دریا کی دوسری طرف

سلامتی کے ساتھ نکل گئے۔

فرعون اور اس کے سپاہی جب پہنچ گئے، تو اسی راستے سے جو دریا کے بیچ میں خشک نکل آیا تھا بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے لگے، فرعون پر غرور اور تکبر اتنا غالب آیا تھا کہ اپنے سپاہیوں کی جانب منہ کر کے کہا: دیکھ لو کیسے میرے حکم سے دریا دو لخت ہو گیا اور راستہ دیا تاکہ اپنے بھگوڑے غلاموں (بنی اسرائیل) کا تعاقب کروں۔

جب فرعون کی فوج کا آخری آدمی دریائے نیل کے کھلے راستے میں داخل ہوا تو اچانک اللہ تعالیٰ کے حکم سے پانی دونوں طرف سے باہم مل گیا اور تمام فرعونیوں کو غرق کر کے ہلاک کر دیا، طوفان کے عین لمحے میں جب فرعون نے خود کو موت کے شدید خطرے میں دیکھا، تو اس نے شکست مان لی اور اسے احساس ہوا کہ اس کی ساری زندگی سرکشی میں گزری اور اس نے غلطی کی، روتی آنکھوں کے ساتھ جہاں خدا کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: (أَمْنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝۹۰) (سورہ یونس: 90) ترجمہ: "میں ایمان لایا کہ جس (خدا) پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔"

لیکن اس وقت اور موقع ہاتھ سے گیا تھا، توبہ کرنے کا کوئی لمحہ نہیں بچا تھا، دریائے نیل کی موجوں نے فرعون کو غرق کر دیا پھر اس کے بے جان جسم کو دریا سے باہر پھینک دیا، تاکہ آنے والے نسلوں کے لیے عبرت کا نشان بنے، (اس بحث کی تفصیل آیات متبرکہ: 95 تا 92 سورہ یونس میں ملاحظہ کریں)

وہ لوگ جنہوں نے شہروں میں سرکشی اختیار کر لی تھی (11)	الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝۱۱

یہ عاد، ثمود اور فرعون کی تفصیل ہے، یعنی: ان میں سے ہر قبیلے نے اپنی اپنی سرزمین میں بغاوت شروع کر دی اور حکم الہی سے پھر گئے اور سرکشی کی: باغی اور سرکش کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

"الَّذِينَ" مذکورہ تینوں اقوام، یعنی: عاد، ثمود، فرعون اور اس کی قوم۔

"طَغَوْ" زمین میں فساد اور سرکشی کی۔

یہ قوم عاد، ثمود، فرعون اور ان کے پیروکاروں کی صفت ہے جنہوں نے

شہروں، آبادیوں میں سرکشی اور بغاوت کی، اور اللہ کے بندوں کو دین اور دنیا میں اذیت پہنچائی اور ظلم کیے۔

فَاكْثُرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝۱۲	اور ان میں بہت فساد مچایا تھا (12)

قتل، ظلم، اور سرکشی کی، اور اللہ کی زمین پر بہت سارے گناہ اور معاصی کے مرتکب ہوئے۔

"الْفَسَادَ" اس سے مراد بھرپور فساد اور تباہی، (روحانی فساد) یعنی: جیسے کفر اور شرک، (حسی اور عملی فساد) جیسے ظلم، فسق اور فجور ہے۔

انہوں نے فساد اور بدعنوانی میں حد سے تجاوز کیا، کفر اور گناہ کے مرتکب ہوئے، شدید کفر کی بناء پر ظالم ہوئے اور پیغمبروں کے ساتھ جنگ اور مخالفت میں اور اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنے کی بہت کوششیں کیں۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمُ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝۱۳	چنانچہ تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا (13)

یہ تشریح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب کے مقابلے میں مثال کے طور پر قتل کے لیے کوڑے مارنے کے مترادف ہے۔

"سَوْط" کیا ہے:

"سَوْط" کوڑے مارنے کے معنی میں ہے، اصل معنی ہے ایک چیز کو دوسری چیز میں مخلوط کرنا، اس کے علاوہ وہ کوڑا جو چمڑے کے مختلف حصوں سے یا اس جیسی چیز سے بُنا گیا ہو پر اس کا اطلاق ہوا ہے، اور بعض اسے عذاب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، وہ عذاب جو انسان کے گوشت اور خون میں پیوست ہو جاتا ہے، اور اسے سخت تکلیف پہنچاتا ہے۔

"صَبَّ" کا معنی دراصل پانی بہانا ہے، یہاں اس عذاب کی شدت اور تسلسل کی طرف اشارہ ہے، اس مختصر تشریح سے مراد وہ سخت اور مختلف سزائیں ہیں جو ان اقوام کو دی گئیں۔

مفسرین لکھتے ہیں: قوم عاد کو تیز اور جلانے والی ہوا کے ذریعے ہلاک کیا (سورہ حاقہ: 6)، قوم ثمود کو ایک بڑی آسمانی چیخ کے ساتھ نیست و نابود کیا

(سورہ حاقہ: 5)، اور قوم فرعون کے لوگ دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہو کر ڈوب گئے (زخرف: 55)

اس بحث کی آخری آیت میں ان تمام لوگوں کے لیے جو سرکشی کے راستے پر چلتے ہیں تنبیہ کے طور پر کہتا ہے:

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝۱۴
بے شک تیرا رب یقیناً گھات میں ہے (14)

بے شک تمہارا رب ہر سرکش، جبار اور ظالم کی تاک میں ہے، اسے تھوڑی سی مہلت دیتا ہے، پھر سختی سے پکڑتا ہے اور اس کا عذاب ختم ہونے والا نہیں ہے۔

"مِرْصَادٍ" یہ "رصد" کے مادے سے ہے، کسی چیز کی نگرانی کے لیے تیار ہونا، فارسی میں اس کے مترادف معنی (کمین گاہ) یعنی گھات ہے۔

یہ لفظ عام طور پر ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں لوگوں کو کسی گزر گاہ کو عبور کرنا ہوتا ہے اور کوئی دوسرا شخص چور ڈاکو قاتل وغیرہ اس گزرنے کی جگہ تاک میں انہیں مارنے کے لیے بیٹھا ہوتا ہے، مجموعی طور پر اس کا معنی یہ ہے کہ آپ یہ نہ سوچیں کہ عذاب الہی کے چنگل سے کوئی بھاگ سکتا ہے، ہر کوئی اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور وہ جب چاہتا ہے انہیں سزا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ خدا کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ کسی گزرگاہ میں بیٹھتا ہے یہ تعبیر اشارہ ہے خدا کی قدرت احاطہ یعنی تمام ظالموں، باغیوں اور مجرموں کو گھیرنے کی طرف۔

محترم قارئین:

آیات مبارکہ 15 تا 30 میں آخرت کی طرف توجہ نہ کرنے پر انسان کی مذمت، حد سے زیادہ حرص، دنیا کی محبت اور دنیا کی پرستش کرنا، دنیاوی مال سے بے نیازی اور قیامت کے دن کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ
وَنَعَّمَهُ ۝ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝۱۵
پس لیکن انسان جب اس کا رب اسے آزمائے، پھر اسے عزت بخشے اور اسے نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی (15)

پس انسان! جب اس کا رب اسے آزماتا ہے (نعمتیں دے کر) پھر اسے عزت بخشے اور نعمت دے (اس کو مال دے کر اور رزق میں وسعت دے کر

اسے نعمتیں عطا کرتا ہے تو کہتا ہے: مجھے میرے رب نے عزت بخشی، اس لیے اس خیال کے ساتھ کہ دنیا کے فائدے اس کے لیے اللہ کی طرف سے عزت افزائی ہے، اس پر خوش اور مغرور ہوجاتا ہے، بجائے اس کے کہ ان نعمتوں کا شکر گزار بنے، یا اس کو یہ فکر لاحق ہو کہ یہ اس کے لیے رب کی طرف سے ایک امتحان ہے۔

مفسر تفسیر بیضاوی فرماتے ہیں: گویا کہ اللہ فرماتا ہے: "اے انسان! جان لو کہ میں تمہاری گہات میں ہوں، چاہتا ہوں کہ تم اپنی آخرت کے لیے کوشش کرو، لیکن انسان کو دنیا کی فکر، سوچ اور لذتوں کے علاوہ کسی اور چیز کی پرواہ نہیں"

"لیکن جب اسے آزمائے (مصیبت اور تکلیف کے ساتھ) اور اس کا رزق، روزی اس پر تنگ کرے" (اور اس میں اس کے لیے کوئی کشادگی اور فروانی نہ رہے تو) کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ہے (یعنی مجھے خواری اور حقارت میں دھکیل دیا ہے)۔

یہ ان منکروں کی صفت ہے جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، اس لیے ایسے لوگوں کی نظر میں دنیا اور اس کے وسیع فوائد کے علاوہ کوئی عزت و تکریم نہیں اور دنیا کے فوائد کو کھونے اور اس کی سجاوٹ تک عدم رسائی کے علاوہ ان کی نظر میں کوئی ذلت اور رسوائی نہیں ہے لیکن مؤمن کی کرامت اور عزت یہ ہے کہ خدا اس کی بخشش فرما کر اس کو اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق عطا کر کے آخرت کے عمل کے لیے توفیق بخش دے، پس مؤمن نہ دنیا کے کام میں وسعت کو عزت سمجھتا ہے اور نہ اس کی اہانت، بلکہ کام کی وسعت اور دولت کو اپنے لیے آزمائش سمجھتا ہے کہ کیا اس کے مقابلے میں شکر ادا کرتا ہے کہ نہیں؟ اور فقر کو بھی اپنے لیے آزمائش سمجھتا ہے کہ کیا اس پر صبر کرتا ہے کہ نہیں؟

اور لیکن جب وہ اسے آزمائے، اور اس پر اس کا رزق تنگ کر دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے (16)

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ ۝
فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝۱۶

اور جب وہ اسے آزماتا ہے، تو اس پر اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے (تو وہ نا امید ہوجاتا ہے اور) کہتا ہے: "رَبِّي أَهَانَنِ" مجھے میرے رب نے خوار اور ذلیل کر دیا، یعنی: مجھے رسوائی اور حقارت میں دھکیل دیا ہے، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں پر جو اسے عطا کی گئی ہیں جیسے: اس کے اعضاء کی صحت

و سلامتی اور جسمانی درستی پر وہ شکر ادا نہیں کرتا، اور جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے رزق میں کمی کر دیتا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کو محدود کر دیتا ہے، اور محنت کے باوجود اسے محدود خوراک مہیا کرتا ہے، اس طرح کہ اس کے روز مرہ کے کھانے سے زیادہ نہ ہو، تو وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا اور اسے عزت نہیں دی، فکر اور تنگدستی سے اس کو عذاب دے رہا ہے رب اس پر توجہ ہی نہیں دیتا، حالانکہ انسان کا یہ طرز تصور اور سوچ درست نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے آزماتا ہے، اللہ تعالیٰ سے محبت کا پیمانہ مال و دولت نہیں ہے بلکہ دین ہے۔

مفسر قرطبی لکھتے ہیں: یہ کافر کی صفت ہے جو قیامت پر ایمان نہیں لاتے اللہ کے نزدیک عزت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اپنی اطاعت اور توفیق سے نوازے اور اسے آخرت کے حصہ کی طرف لے جائے، اگر اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں وسعت عطا فرمائے تو وہ بندہ اللہ کی حمد کرتا ہے اور شکر بجا لاتا ہے، (قرطبی: 51/19)

ہر گز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے (17)

كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝۱۷

"کَلَّا" نہیں، اس کی حقیقت نہیں ہے، ایسا نہیں جیسا کہ یہ کافر سوچتے اور کہتے ہیں: یہ مت بھولنا کہ عزت اور وقار دولت نہیں ہے، اور ذلت و رسوائی غربت اور بد حالی میں نہیں ہے، بلکہ عزت اور ذلت کا دارومدار اطاعت اور نافرمانی پر ہے، لیکن تم نہیں جانتے، پھر فرمایا: "بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ" بلکہ اس سے بدتر عمل کے مرتکب ہوتے ہو، یعنی: اللہ تعالیٰ نے تم پر کرم کیا، اور بہت زیادہ مال و دولت عطا کی، لیکن تم یتیم پر مہربانی اور نرمی نہیں کرتے ہو۔

"لَا تُكْرِمُونَ" (عزت نہیں کرتے، اکرام نہیں کرتے، اپنے خیالات کے بنیاد پر:

1- اپنے مال و دولت سے یتیم کو کچھ نہیں دیتے -

2- حتیٰ کہ تم یتیم کے مال سے کھاتے ہو، اور اس کا حق ادا نہیں کرتے، اور ساتھ ہی اس کی تذلیل و تحقیر بھی کرتے ہو۔

یتیم: وہ بچہ جس کا باپ اس کی بلوغت سے پہلے فوت ہو گیا ہو۔

حدیث میں ہے کہ: (خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یحسن إلیہ وشر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یساء إلیہ ثم قال بأصبعیہ: أنا وکافل الیتیم فی الجنة هکذا) ترجمہ: "مسلمانوں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو، مسلمان گھرانوں میں سب سے بُرا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں سے اشارہ فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے"

اور نہ تم آپس میں مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو (18)	وَلَا تَحْضُوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنَ ۝۱۸

یعنی: خود کو اور دوسروں کو اس کی تشویق اور ترغیب نہیں دیتے اور ابھارتے نہیں ہو، آپ لوگوں کے درمیان اور معاشرے میں مسکین کو کھانا کھلانے کے بارے میں گفتگو نہیں ہوتی، نہ کوئی شخص ماتحتوں اور محتاجوں کو کھلانے کی فکر میں ہے، کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے بارے میں سوچے اور ایک دوسرے کو اس کے متعلق کوئی حل تلاش کرنے کی ترغیب دے۔

اور میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو (19)	وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ أَكْلًا لِّبَآءٍ ۝۱۹

عورتوں اور یتیموں میں سے ضعیفوں کو حق نہیں دیتے، یعنی: وراثت کو سختی سے کھاتے ہو اس کے حلال یا حرام ہونے کی پرواہ نہیں کرتے، یتیموں، بیواؤں اور عورتوں کے حقوق کو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور خوف کھائے بغیر اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے ہو۔

"التسہیل" میں ہے کہ: اپنی وراثت اور دوسرے کا مال اٹھا لیتے ہو، کیونکہ عرب عورت اور یتیم کو وراثت میں سے حصہ نہیں دیتے تھے، بلکہ وراثت مردوں کے لیے خاص تھی (مختصر: 638/3)

"التُّرَاثُ" میراث: وہ مال جو کسی کے مرنے کے بعد اس کے گھر والوں اور ورثاء کو ملتا ہے۔

اور مال سے محبت کرتے ہو، بہت زیادہ محبت کرنا (20)	وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝۲۰

(دنیا کے مال و متاع کے ساتھ سخت محبت ہے) (دنیا کے مال و متاع پر دل

ہار بیٹھے ہو) اس کو حاصل کرنے کے لیے عمریں ضائع کرتے ہو، خطرات مول لیتے ہو، اور دور دراز سفروں کے لیے آمادہ ہوتے ہو، جی ہاں! آج کل کے بہت سے انسان درہم اور دینار کے بندے ہیں، مال سے پیار کرنا فطری ہے، البتہ مذہب نے انسانوں کے لیے جائیداد سے محبت کرنے کی مقدار مقرر کی ہے، اس لیے ہمیں مال سے محبت کرنے کا حق اس حد تک ہے کہ وہ ہمارا خادم ہو نہ کہ ہمارے حق میں خائن، ہمارے لیے سواری ہو نہ کہ ہم پرسوار ہو، اگر یہ دولت انسان کو اپنی عبودیت یا غلامی میں لاتا ہے تو یہ بہت خطرناک ہے۔

مختصر یہ کہ تم لوگ اس دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے لیے کوشش کرنے سے زیادہ آخرت کے لیے کوشش کرنا پسند ہے، اور وہ اس بات پر خوش نہیں ہے کہ دنیا کی دوستی اور اس کی لذتیں انسان پر غالب آجائیں اور انتہاء کو پہنچ جائیں۔

ہر گز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ
کردی جائے گی (21)

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝۲۱

ہر گز ایسا نہیں ہے (جیسا کہ تم گمان کرتے ہو) "إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ" جب زمین کو سختی سے کوٹا جائے گا بڑے زلزلہ اور شدید حرکت کے ساتھ، یہاں تک کہ زمین پر کوئی اونچی جگہ نہیں رہے گی، (زمین ہموار، صاف اور نشیب و فراز کے بغیر چٹیل میدان میں تبدیل جائے گی)

جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: (وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝۲۰ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝۲۱) (انشقاق: 2 تا 3) ترجمہ: "اور اس پر لازم بھی یہی ہے اور جب زمین ہموار کردی جائے گی۔ اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی اور (بالکل) خالی ہو جائے گی۔"

"كَلَّا" روکنے اور منع کرنے کے معنی میں ہے، یعنی اے غافلوا! بس کرو اور اس عمل سے باز رہو، قیامت کے دن اپنے سامنے بے چینی اور خوف اور ڈر پاؤ گے، وہ بھی اس وقت جب زمین حرکت کرنے اور ہلنے لگے گی۔

"دُكَّتِ" ٹوٹ جانا، کوٹنا اور کسی اونچی سطح کو ہموار کر کے برابر کرنا، یعنی: زمین یکے بعد دیگرے ایسی ہلائی جائے گی کہ اس پر بنی ہر عمارت ڈھے

جائے گی، یہاں تک کہ پہاڑ اور ٹیلے ہموار صحرا میں تبدیل ہو جائیں گے،
"دکان" بھی "دک" کے مادے سے ہے، کیونکہ وہ ہموار جگہ ہے۔

اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے (22)	وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝۲۲

"التسہیل" میں آیا ہے کہ: منذر بن سعید فرماتے ہیں: اُس موقع پر خالق خلائق کے سامنے ظاہر ہوں گے، اس آیت اور اس جیسی آیتوں پر ایمان لانا واجب ہے، بغیر اس کے کہ ہم اس کی کوئی کیفیت یا مثال بیان کریں۔

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات قبر سے اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گی، حق اور انصاف کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے درمیان آئیں گے، حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے بعد اللہ تعالیٰ حق اور باطل کے درمیان فیصلے کے لیے آئیں گے، اور فرشتے منظم صفوں میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے، (صفوة التفاسیر)

اس دن جہنم کو لایا جائے گا، اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں (23)	وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ بُجْهَتُمْ ۝ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۝۲۳

اس دن دوزخ کو سامنے حاضر کریں گے (تاکہ مجرمین دیکھیں)۔

جیسا کہ فرماتا ہے: (وَبُرَزَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَرَى ۝۳۶) (النازعات: 36) حدیث شریف میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ: جہنم کو قیامت کے دن حاضر کیا جائے گا اس حال میں کہ اس کے ستر ہزار زنجیر ہوں گے، اور ہر زنجیر کو ستر ہزار فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔

"يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ" اُس بے چینی والے دن اور انتہائی خوفناک حالات میں انسان اپنے عمل کو یاد کرے گا، وہ اپنی لاپرواہی اور نافرمانی اور ذیادتیوں پر نادم ہوگا اور دنیا میں واپس آنے کی آرزو اور توبہ کرنا چاہے گا، کیا اس وقت ہوش میں آنا اور پشیمان ہونا اس کو فائدہ پہنچائے گا؟ -

"وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى" اس دن متنبہ ہونا اسے کیا فائدہ پہنچائے گا، کیونکہ اس کا وقت گزر چکا ہے، نصیحت کرنے اور متنبہ ہونے سے اس کو اس وقت فائدہ ہوتا جب

وہ موت کے آنے سے پہلے حق کو یاد رکھتا، اس لیے اس کو آخرت میں توبہ کوئی فائدہ نہیں دے گا، یہ ماضی کی تلافی کا وقت نہیں ہے، وہ وقت گزر چکا ہے، عمل کا وقت ختم ہو چکا ہے اور حساب کا وقت ہے، اور پھر وہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ کہے گا:

یَقُولُ يَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۝۲۳	کہے گا اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے آگے بھیجا ہوتا (24)

"قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي" کاش میں اس فانی دنیا میں اس ابدی زندگی کے لیے بھلائی اور خیر کا کوئی عمل انجام دے دیتا، کیونکہ ابدی زندگی وہاں ہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ: اگر کوئی شخص پیدائش سے موت تک ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف و مشغول رہے تو وہ بلاشبہ قیامت کے دن اپنے اس عمل کو بھی حقیر اور کم تر سمجھے گا، اور وہ چاہے گا کہ اپنے اجر و ثواب میں اضافہ کے لیے اس دنیا میں واپس لوٹ آئے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَہٗ أَحَدٌ ۝۲۴	پس اس دن اس کے عذاب جیسا عذاب کوئی نہیں کرے گا (25)

جس دن ایسے حالات پیش آئیں گے اللہ تعالیٰ کافر کو ایسی سزا دے گا کہ اس جیسا عذاب کوئی نہیں دے گا، یعنی: قیامت کے دن خدا کا عذاب نافرمانوں پر ایسا سخت اور ہولناک ہوگا کہ اس کے سوا کوئی ایسی سزا پر قادر نہیں، کیونکہ حساب اور سزا کا مکمل اختیار اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے پاس ہے، اور اس کے اقتدار اور تسلط سے کوئی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔

وَلَا يُؤْتِي وَثَاقَہٗ أَحَدٌ ۝۲۵	اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھے گا (26)

اور اس دن کوئی بھی اسے خدا جیسا نہیں باندھ سکے گا اور نہ زنجیروں میں جکڑ سکے گا، جی ہاں مجرم کی سزا ایسی ہی ہے، البتہ پاکیزہ اور مطمئنہ روح کا استقبال کیاجائے گا اور اس کی ایک الگ حیثیت ہوگی۔

يَأْتِيہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ۝۲۶	اے نفس مطمئن! (27)

کہ تو نے اللہ کے ذکر اور عبادت کی روشنی میں سکون پایا، اے وہ انسان جو اللہ کے فیصلے اور تقدیر پر یقین رکھتا تھا، خوشی اور ناخوشی میں، نعمتوں کے ہونے اور نہ ہونے کے وقت، مالداری اور مفلسی کے وقت تو اطمینان

رکھتا تھا، تمہیں کو کوئی شک اور تردید بھی نہیں ہوتا تھا، منحرف نہیں ہوتا، اپنے اوپر اطمینان تھا کہ راستے سے ادھر ادھر نہیں بھٹکا، تم محفوظ ہو اور قیامت کے دن کی ہولناکی اور ڈر و خوف سے نہیں ڈرو گے۔

یہاں کلام کا خوبصورت اختتام ہے ہمیں یہ سمجھایا گیا ہے کہ: ہم کوشش کریں اس نفس مطمئنہ کو موت سے پہلے بطور ذخیرہ آخرت حاصل کریں، اور ہم یقیناً اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں، ہم اگر چاہیں تو اسی ذہنی سکون اور اطمینان اور مرضیت یعنی پسندیدگی کو پہنچ سکتے ہیں۔

اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا، اس حال میں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی (28)	اَرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۸

یہ مطمئن روحوں کو خطاب ہے، وہ روحیں جو ایمان کے ساتھ آخری سکون تک پہنچ چکی ہیں، دنیا میں اپنے کردار و عمل سے اور آخرت میں نعمتوں سے راضی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی مستحق ہیں، اپنے رب کی طرف اور اس کے جلال و کرامت کی طرف لوٹ جاؤ، اس فریاد سننے والے رب اور حاکم کی طرف جس کی تم دنیا میں بندگی کرتے تھے۔

جب مؤمن آدمی کے جسم سے روح نکلتی ہے، تو پانی کا ایک قطرہ گرنے جتنا آسان ہوتا ہے، تو فرشتے اسے آرام دہ موت اور سکون والی جگہ کی بشارت دیتے ہیں۔

1- تمہاری روح تمہاری جسم سے سکون اور راحت کے ساتھ نکل جاتی ہے۔

2- تیرا ٹھکانا جنت میں ہوگا۔

3- تو اللہ سے راضی ہے، اور اللہ تجھ سے راضی ہے۔

مفسرین فرماتے ہیں: اس خطاب اور پکار کا ادراک موت کے وقت ہوتا ہے، جب مؤمنین کی موت کا وقت قریب آتا ہے کہا جائے گا:

پس میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا (29)	فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَدِيْ ۝۲۹

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور کامیاب گروہ میں شامل ہو جا، جو کہ ابدی اور لافانی نعمتوں کے ساتھ ہمیشہ رہنے والی جنت میں ہیں۔

اور میری جنت میں داخل ہوجا (30)

وَادْخُلْ جَنَّتِي ۝۳۰

یعنی نیک اور صالح لوگوں کے ٹھکانے میں داخل ہوجا، (کہ میں نے ان کے لیے تیار کیا ہے)۔

نفس مطمئنہ:

نفس مطمئنہ: وہ مطمئن روح ہے جس کے پاس ہو وہ خدا کی طرف سے تحفظ محسوس کرتا ہے، اور اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتا ہے، وہ اللہ کے پاس لوٹتی ہے اور اس سے ملنے اور اس کے قریب ہونے کی اشتیاق میں رہتی ہے، ایسی روح ہے، جو اللہ کی بارگاہ میں مطیع اور فرمانبردار عاجزی انکساری والی ہے، دنیا کی فانی زندگی میں متقی اور پرہیزگار ہوتی ہے، فرشتے موت کے وقت ان مطمئن روحوں والوں سے کہتے ہیں: (يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْهَاطِئَةُ، ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِي فِي عِبَادِي، وَادْخُلِي جَنَّتِي) ترجمہ: "اے سکون پانے والے انسان! (کہ ذکر الہی اور عبادت الہی کی روشنی میں تم نے سکون پایا ہے، اور اب تم یہاں اطاعت و عبادت کے بڑے ذخیرے کے ساتھ آرام کرو گے۔" اپنے رب کی طرف پلٹ جاؤ، اس حال میں کہ تو (دنیا میں اپنے اعمال سے اور آخرت میں نعمت سے خوش ہو اور (خدا بھی) تجھ سے راضی ہے، میرے خاص بندوں میں شامل ہوجا (نیک اور بہترین لوگوں کے درمیان رہو) اور میری جنت میں داخل ہوجا، (اور خوش رہو)۔

اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ: (اے روح! اللہ عز و جل کے نزدیک، رحمت و ثواب الہی کی طرف پلٹ جا، تو اللہ اس سے راضی ہوجائے گا، اور اس روح کو موت کے قریب ہونے کے وقت خوشخبری سنا دی جائے گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے ہے اور بہت جلد جنت میں داخل ہوگی، فرشتوں کی یہ بشارت مؤمن انسان کو موت کے قریب ہونے اور قبر سے اٹھنے کے وقت دی جاتی ہے) (تفسیر ابن: ج 1 ص: 511)

ابن عباسؓ نفس مطمئنہ کے معنی کے بارے میں فرماتے ہیں

(مطمئنہ یعنی: تصدیق شدہ) حضرت قتادہ (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: (مؤمن وہی ہے کہ اس کی روح اس چیز پر مطمئن ہو جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے، خدا کے ناموں کی معرفت اور پہچان کے ضمن میں اس روح کا مالک اس بات سے پوری طرح واقف ہوتا ہے کہ موت کے بعد اور برزخ کے واقعات اور ان کے بعد قیامت کی ہولناکی اور خوف کیا ہوتا ہے، گویا وہ ان کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اور خدا تعالیٰ کے فیصلے اور تقدیر کو تسلیم کرتا ہے اور اس سے مطمئن ہے اس سے راضی ہے، اور کسی بھی قسم کا شکوہ اور فریاد نہیں کرتا، اپنے ایمان میں کسی شک، تردید اور اضطراب سے دو چار نہیں ہوتا،

کسی چیز کے ہاتھ سے جانے پر نا امید نہیں ہوتا، اور جو کچھ اسے میسر ہوتا ہے اس پر شاد اور مسرور نہیں ہوتا، کیونکہ آنے والی مصیبت اس تک پہنچنے سے پہلے ہی مقدر میں لکھی ہوتی ہے۔

نفس مطمئنہ ایک بیدار نفس ہے، یہ بیداری سبب بن جاتی ہے کہ انسان اپنے اعمال کے عیوب اور کوتاہیوں کا مشاہدہ کرے، اور اپنے جرائم اور گناہوں سے دست بردار ہو جائے، اور یہ نفس اس کو بہت سارے حقوق اور واجبات پر ترغیب دیتی ہے، اور اس میں عاجزی لاتی ہے، انسان میں تواضع کی صفت اجاگر کرتی ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے نعمتوں کے مشاہدہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اپنے گناہوں اور عیوب کے ظاہر ہونے پر شرمندہ کر دیتی ہے، انسان اللہ کے سامنے تواضع اختیار کر کے جھک جاتا ہے، اسی طرح زمانے کی قدر و قیمت اور اہمیت کو سمجھ لیتا ہے کہ وہ اس کی خوش نصیبی کا سرمایہ ہے، پس ہر وہ چیز جو اسے اپنے پروردگار کے قریب نہیں کرتی اس سے بیزار ہو کر اسے دور کر دیتا ہے۔

اس لیے اس روح کو نابود کرنے اور ختم کرنے میں نقصان اور پچھتاوا ہے اور اس کو ترقی دینے اور بڑھانے میں فائدہ اور خوش نصیبی ہے، اور یہ اس بیداری کا اثر اور نتیجہ ہے، یہ نفس مطمئنہ کی پہلی منزل ہے جہاں سے انسان روز جزا کی طرف پیشرفت کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

نفس مطمئنہ کی بعض خصوصیات

نفس مطمئنہ کی خصوصیات میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ نفس غفلت سے جگانے والی، خدا کے ہاں گناہوں اور کوتاہیوں سے پاک کرنے والی ہے کہ ہمیں خدا تبارک و تعالیٰ کے ذکر، کثرت توبہ اور مغفرت طلب کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے پر مطمئن کرتی ہے، اور یہ ہمیں خدا سے ملنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا مشتاق بناتی ہے، جبکہ فرشتے اسے خدا کی خوشنودی کی بشارت دیتے ہیں، علماء اور صلحائے امت اور دانشوروں نے نفس مطمئنہ کی خصوصیات مندرجہ ذیل بیان کی ہیں:

اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی قضا و قدر پر اطمینان

ہمارا عظیم رب نیک اور صالح انسانوں کی صفت اس طرح بیان کرتا ہے: "الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ" (پربیزگار) وہی ہیں (موت کے وقت) جب فرشتے (روح قبض کرنے والے) ان کی جانیں نکالنے لگتے ہیں اور یہ (کفر و شرک سے) پاک اور (رب کے ساتھ اپنی کامیاب ملاقات سے) خوش ہوتے ہیں، (تو فرشتے ان سے) کہیں گے: سلامتی ہو تم پر! (اللہ کی حفاظت میں ہو آج کے بعد کبھی مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا نہیں

ہو گئے) (اور کہتے ہیں) جو عمل تم کیا کرتے تھے اس کے بدلے میں جنت میں داخل ہو جاؤ (سورہ نحل: 32)

حدیث شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: (لَذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللَّهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ رَسُولًا) ترجمہ: "اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر (دل سے) راضی ہو گیا۔"

اور جو شخص اذان سننے پر کہے: (رَضِيتُ بِاللَّهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُولًا غُفِرَتْ لَهُ ذُنُوبُهُ) (رواہ مسلم) ترجمہ: "میں اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہوا تو اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔"

خدا کے فیصلے پر اطمینان کامل مقبولیت کی علامت ہے اور صالحین کی صفات میں سے ایک صفت بھی، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: (رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ) (سورۃ البینہ: 8) ترجمہ: "خدا ان سے خوش اور وہ اس سے خوش۔ یہ (صلہ) اس کے لیے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا ہے۔"

اور جو شخص اپنے قلب کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے بھر دے اس کی روح کو تکلیف، غم اور پریشانی سے آزاد کر دیا جاتا ہے، اور وہ اپنی روح کو اپنی خواہشات اور شیطان کے وسوسوں کو غالب آنے نہیں دیتا، مسلمان کو یقینی طور پر (اللہ کی) رضا، خوشنودی، آرام اور سکون حاصل ہوتا ہے، اس ضمن میں حدیث میں ایک دعا ہے: (اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطَهَّرَةً وَتُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ، وَ تَرْضَى بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ) ترجمہ: "اے پروردگار! میں تجھ سے ایسے نفس کا سوال کرتا ہوں جو تجھ پر بھروسہ اور تجھ سے ملنے پر یقین رکھتا ہو تیرے فیصلے سے مطمئن اور تیری دی گئی نعمت اور عطا پر قناعت رکھتا ہو"

عاجزی اور خوف خدا

ایک متقی مسلمان ہمیشہ گناہوں اور محرمات کے ارتکاب سے ڈر اور خوف کے عالم میں زندگی گزارتا ہے، یہ اس کے ایمان کے مضبوط ہونے کی دلیل

ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ) (آل عمران: 170) ترجمہ: "پس (چونکہ تم خدا پر یقین رکھتے ہو اس لیے بے خوف اور بہادر بنو) ان سے مت ڈرنا مجھ ہی سے ڈرتے رہنا"

اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کی صفت کچھ یوں بیان کرتا ہے: (إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ) (سورہ مؤمنون: 57) ترجمہ: "جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں"

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا

اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو امید کی صفت اور عادت کا حامل قرار دیتا ہے اور کہتا ہے: (أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ) (سورہ بقرہ: 218) ترجمہ: "وہی خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا (اور) رحمت کرنے والا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے: (اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخِطِكَ وَأَعُوذُ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ) ترجمہ: "اے اللہ! بے شک میں تیری ناراضگی سے تیری رضامندی کی پناہ میں آتا ہوں اور تیری پکڑ سے تیری معافی کی پناہ میں اور تیرے عذاب سے تیرے ہی پناہ میں آتا ہوں، میں پوری طرح تیری تعریف کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، تو ایسا ہی ہے جیسے تو نے خود اپنی ثنا بیان کی ہے"

نفس بشری کا خدا کی رحمت سے امید رکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ حقیقت میں نفس انسانی اپنے رب کی ہمیشہ محتاج ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ انسانی نفس خدا کی رحمت، کرم، فضل اور توفیق سے بے نیاز رہے، خدا کی رحمت کی امید پر گناہ اور نافرمانی جائز نہیں ہے، البتہ خدا کی امید پر سستی اور کاہلی ہوسکتی ہے، جبکہ صحیح اور پسندیدہ امید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید نیک اعمال کے ساتھ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا) (سورہ کہف: 110) ترجمہ: "تو جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ عمل نیک کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (لَیْسَ الْإِيْمَانُ بِالتَّمَنَّى وَلَکِنْ مَا وَقَرَ بِالْقَلْبِ وَصَدَّقَهُ الْعَمَلُ) (متفق علیہ) ترجمہ: "ایمان خواہش یا من پسند تمناؤں کا نام نہیں، بلکہ ایمان تو ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جو دل میں مضبوطی سے بیٹھ جائے اور بندے کے اعمال اس کی تصدیق کرتے رہیں"

پس اللہ کی رحمت کی امید صحیح عمل کرنے کے سوا اور کسی طرح درست نہیں ہے، توبہ، استغفار کی کثرت اور سیدھے راستے اور حقیقت کی طرف لوٹنا، نفس مطمئنہ والا انسان اپنی غلطیوں اور صغیرہ گناہوں کو بڑا سمجھ کر خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، اس سے بخشش طلب کر کے اس کی پناہ میں آجاتا ہے اور اپنے کیے پر نادم ہو کر معافی مانگتا ہے اور نافرمانیوں کے ارتکاب کی طرف کبھی واپس نہ آنے کا فیصلہ کرتا ہے، اور اطاعت و عبادت میں اضافہ کر کے خدا کی بارگاہ میں اپنا سر جھکا تا ہے، توبہ کرتا ہے اور اس کی پیروی کرتا ہے، خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو استغفار اور توبہ کا حکم دیتا ہے: (وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُغْفِرْ لَكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى) (سورہ ہود: 3) ترجمہ: "اور یہ کہ اپنے پروردگار سے بخشش مانگو اور اس کے آگے توبہ کرو وہ تم کو ایک وقت مقرر تک متاع نیک سے بہرہ مند کرے گا"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ توبہ سچی، حقیقی اور خالص اس اللہ کے لیے ہونی چاہئیے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاعْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ) (سورہ تحریم: 8) ترجمہ: "مؤمنو! خدا کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔ امید ہے کہ وہ تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تم کو بہشت کے باغوں میں جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں داخل کرے گا۔ اس دن خدا پیغمبر کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا نہیں کرے گا (بلکہ) ان کا نور ایمان ان کے آگے اور داہنی طرف (روشنی کرتا ہوا) چل رہا ہوگا۔ اور وہ خدا سے التجا کرینگے کہ اے پروردگار ہمارا نور ہمارے لیے پورا کر اور ہمیں معاف فرما۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور فرماتا ہے: (إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ) (سورہ بقرہ: 222) ترجمہ: "کچھ شک نہیں کہ خدا توبہ

کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

توبہ بھی خدا کے رسول کی وصیتوں میں سے ہے فرماتے ہیں: (يَا أَيُّهَا النَّاسُ تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَيْكُمْ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً) (رواہ مسلم و بخاری) ترجمہ: "اے لوگو! اللہ کی طرف توبہ کرلو، اللہ کی قسم میں دن میں ستر بار اللہ کی طرف توبہ کرتا ہوں"

اور نیز فرماتے ہیں: (لَلَّهِ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ فِي أَرْضٍ ذَوِيَّةٍ مُهْلِكَةٍ مَعَهُ رَاحِلَتُهُ عَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَنَامَ فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ ذَهَبَتْ فَطَلَبَهَا حَتَّى أَدْرَكَهُ الْعَطَشُ ثُمَّ قَالَ أَرْجِعْ إِلَى مَكَانِي الَّذِي كُنْتُ فِيهِ فَأَنَامُ حَتَّى أَمُوتَ فَوْضَعَ رَأْسَهُ عَلَى سَاعِدِهِ لِيَمُوتَ فَاسْتَيْقَظَ وَعِنْدَهُ رَاحِلَتُهُ وَعَلَيْهَا زَادُهُ وَطَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَالَلَّهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هَذَا يَرَا حِلَّتِهِ) (رواہ البخاری و مسلم) ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کی توبہ پر اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو مہلک ویرانے میں ہو، اس کے ساتھ اس کی سواری ہو جس پر اس کے کھانے، پینے کی چیزیں ہوں اور پھر وہ سوجائے، بیدار ہو کر دیکھے تو اس کی سواری غائب ہو، پھر اسے تلاش کرتے کرتے پیاس لگ جائے۔ آخر کار (دل میں) کہے کہ اس جگہ جاکر سوجاتا ہوں حتیٰ کہ میری موت واقع ہو جائے۔ پھر وہ مرنے کے لیے کلائی پر سر رکھ کر لیٹ جائے جب بیدار ہوتا ہے تو اچانک دیکھتا ہے کہ اس کی سواری اس کے سامنے موجود ہے جس پر اس کا زادِ راہ، طعام و مشروب لدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس آدمی سے بڑھ کر خوش ہوتا ہے جو (گم ہونے کے بعد) اپنی سواری کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

انسانی روح کی اقسام

خدا تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ نفس تین قسم کی ہے:

- 1- نفس امّارہ بالسوء
- 2- نفس لوّامہ
- 3- نفس مطمئنہ

(إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي) (سورہ یوسف: 53) ترجمہ: "کیونکہ نفس (سرکش فطرتاً خواہشات کی طرف راغب کرتا ہے، اور برائیوں کو مزین کردیتا ہے اور لوگوں کو) برائیوں کی طرف بلاتا ہے مگر وہ آدمی جس پر

میرا رب رحم فرمائے (اور اسے اپنے حمایت کے پہلو میں محفوظ و مامون رکھے)"

(وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ) (سورة القیامہ: 2) ترجمہ: "قسم ہے ملامت کرنے والے نفس کی"

کہ مرنے کے بعد اٹھائے جائیں گے، اور قیامت حق ہے، (ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مُّرْضِيَةً، فَأَدْخُلْ فِي عِبَادِي، وَادْخُلْ جَنَّتِي) (الفجر: 28 - 30) ترجمہ: "اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی ہے پس میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا"

البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر انسان کے بیک وقت تین نفس ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں صفات اور حالات ممکن ہے شرائط کے اعتبار سے کسی کے ساتھ وابستہ ہو جائیں، مثال کے طور پر جب بھی نفس کی خواہشات انسان پر غالب آجائیں اور نفس گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو نفس امارہ بن جاتا ہے، اگر گناہ کے بعد توبہ کر لے اور پشیمان ہو جائے تو نفس لوامہ بن جاتا ہے کیونکہ انسان کو گناہ کے انجام پر ملامت کرتا ہے، اور گناہوں کے ارتکاب اور نیک اعمال کے بارے میں شک کرتا ہے۔

لیکن نفس مطمئنہ اس صورت میں ہے کہ خیر کی محبت، نیکیوں کی طرف میلان، شر اور برائیوں سے دوری کا بدیہی ملکہ اور اچھے اخلاق میں بدل گیا ہو۔

شرح عقیدہ طحاویہ کے شارح نفوس کی انواع و اقسام بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: در حقیقت یہ نفوس ایک انسان کے لیے پیش آتے ہیں، یعنی انسانی نفس کے تین حالات ہیں، پہلے تو انسان کو گناہ انجام دینے کا حکم دیتا ہے نفس امارہ بن جاتا ہے پھر اگر ایمان آجائے تو نفس لوامہ بن جاتا ہے، اور گناہ کرنے کے بعد انسان کو سزا دیتا ہے اور سرزنش کرتا ہے، اگر ایمان مضبوط ہو جائے تو نفس مطمئنہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ (شرح طحاویہ: 445)

کیا نفس مرتا ہے؟

ابن تیمیہ فرماتے ہیں: بغیر کسی تردید کے ارواح مخلوق ہیں، ان پر بھی عدم اور فنا آتے ہیں، لیکن ان کی موت جسم سے جدا ہونے کی صورت میں ہے، دوسری صورت پھونکنے سے ارواح جسموں میں واپس آجائیں گی۔ (مجموع فتاویٰ: 4/279)

شرح طحاویہ کے شارح اس مسئلے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: روح مرتی ہے یا نہیں اس بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے، ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح مرتی ہیں، کیونکہ وہ نفوس ہیں، اور ہر نفس کو ضرور مرنا ہے اگر فرشتے موت سے نجات نہ پاتے، تو روح کو بھی ہر گز نجات نہیں ملے گی، دوسرا گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ارواح نہیں مریں گی، کیونکہ روحوں ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہیں، جبکہ جسم اور بدن موت اور نابود ہونے کے لیے ہیں، اس اصول کی بنا پر کہتے ہیں: وہ احادیث جو ارواح کو انعام دینے یا عذاب دینے پر دلالت کرتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ روحوں ختم نہیں ہوتیں، اس بارے میں صحیح نظریہ یہ ہے کہ: روحوں اور نفوس کا مرنا، یعنی جسم سے ان کا الگ ہوجانا، اگر ارواح اور نفوس کے مرنے سے مراد صرف یہی ہے جسم سے جدا ہونا ہو تو یہ موت کا ذائقہ چھکیں گی، اور "کل

نفس ذائقۃ الموت" ان کے بارے میں محقق ہے، لیکن اگر ارواح کے مرنے سے ان کا فنا یا معدوم ہونا مراد ہو کلی طور پر تو یہ درست نہیں ہے، کیونکہ روح کو جنت یا جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے، نعمت یا عذاب سے متاثر ہوگی جیسا کہ رب تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: (لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ) ۝ وَوَقَّعَهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝۵۶ (سورہ الدخان: 56) ترجمہ: "(اور) پہلی دفعہ کے مرنے کے سوا (کہ مرچکے تھے) موت کا مزہ نہیں چھکیں گے۔ اور خدا ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا"

اس موت سے مراد وہی روح کی مفارقت اور الگ ہونا جسم یا بدن سے ہے، (شرح طحاویہ: 446)

نفس اور شیطان میں کیا فرق ہے؟

ہم کیسے جان لیں کہ ہمیں گناہوں پر نفس آمادہ کرتا ہے یا شیطان؟

انسانی نفس تین قسموں پر مشتمل ہے:

- 1- نفس امارہ بالسوء؛ کہ اسے بُرائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے اور بھلائی سے دور کرتا ہے، گناہ اور معصیت میں مبتلا کرتا ہے۔
- 2- نفس لوامہ؛ جب بھی کوئی انسان کوئی غلط کام کرنا چاہتا ہے، یا گناہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، تو ملامت کرنے والی روح یا نفس اس کو ملامت کرتی ہے تاکہ وہ پلٹ جائے اور توبہ کرے اور درست سمت کی طرف قدم اٹھا لے۔

3- نفس مطمئنہ؛ کہ نفس لوامہ سے اوپر ہے، اور یہ انسان کو سکون کی حالت میں لے آتا ہے اس طرح کہ وہ ایمان اور عبادت کی مٹھاس کو سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے، جب بھی گناہ کی سوچ یا اس کو انجام دینے کا ارادہ ہونے لگتا تو نفس لوامہ اس کو سرزنش اور تنبیہ کرے گا تاکہ وہ کام نہ کرے، پس وہ رو کر اور پشیمان ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا، اور حق تعالیٰ سے بخشش طلب کرے گا۔

خلاصہ اس شخص کی کوئی نیکی نہیں جو ہمیشہ تا آخر وقت نفس امارہ کے تابع ہو، جب اس کے پاس پلٹنے اور پشیمان ہونے کا موقع ہی نہیں رہے اور یہ واضح نقصان ہے۔

انسانی طبیعت کسی پابندی کو قبول نہیں کرتی، اس کا نفس چاہتا ہے کہ تمام پابندیوں سے آزاد رہے، (وَمَا أَبْرِي نَفْسِي ۝ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَرَحِمٌ رَّبِّي ۝ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝) (سورہ یوسف: 53) ترجمہ: "اور میں اپنی تئیں پاک صاف نہیں کہتا کیونکہ نفس امارہ (انسان) کو برائی ہی سکھاتا رہتا ہے۔ مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے بیشک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ نفس اپنے مالک کو جو کچھ اس کا دل چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور اسے گناہ اور معصیت کی طرف لے جاتا ہے اور بندگی کے راستے سے ہٹاتا ہے، اس کے لیے گناہ اور معصیت کے تمام اسباب حیرت انگیز اور دلچسپ ہیں، اور اس کے دل میں فسق و فجور کی قوتیں بڑھ رہی ہیں، اللہ تعالیٰ کے کلام میں غور و فکر کریں: "لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ" مبالغہ کے ساتھ کہا گیا ہے۔

خدا نے نہیں فرمایا: "آمرۃ بالسوء" یہ نفس کی برائیوں پر کثرت حکم کی وجہ سے ہے، نفس امارہ بہت زیادہ برائیوں کی ترغیب دیتا ہے اور اکثر دیتا ہے، بُرے کاموں کو انجام دینے کے لیے، اس نفس کی نہ تھکنے والی خصلت کی وجہ سے ہے، جب تک کہ اس کا مالک اس ٹوٹی ہوئی لگام کو مضبوطی سے پکڑے نہ رکھے، لیکن جو نفس برائیوں اور گناہوں کا حکم دیتا ہے وہ شیطان سے الگ ہے شیطان انسان کا ساتھی ہے جو اسے گناہ کی دعوت دیتا ہے، لیکن برائی کا حکم دینا انسانی نفس کا شیوہ ہے، کیونکہ نفس خواہشات کی طرف مائل ہوتا ہے اور خواہشات کا اس پر طبعی اثر ہوتا ہے، اور اس کے رجحان کو اس سے روکنا مشکل ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ کیا کہتے

ہیں اس دوست کے بارے میں جو آپ کے ساتھ ہے، وہ دوست کہ اگر آپ اس کی تعظیم کرتے ہیں، اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی پردہ پوشی کرتے ہیں تو آپ کو بدترین انجام کی طرف لے جائے گا اور اگر تم اسے تابع کرو گے اور اسے پیاسا اور بھوکا رکھو گے تو وہ تمہیں بہترین انجام کی طرف لے جائے گا؟

صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا دوست زمین کا سب سے بُرا دوست ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس خدا کی قسم جس کے اختیار میں میری جان ہے، یہ دوست تمہاری جان ہے جو تمہارے اطراف میں ہے، (انوار الفرقان)

تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انسان کا برائیوں کی طرف میلان شیطان کی طرف سے ہے یا نفس امارہ کی وجہ سے، اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور دوسروں کی خواہشات کے آگے نہ جھکے۔

لیکن رمضان کے مہینے میں شیاطین جو زنجیروں میں جھکڑے ہوتے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو چیز اس مہینے میں لوگوں سے گناہ کروانے کا باعث بنتی ہے وہ وہی نفس امارہ ہے، حقیقت میں نفس امارہ بالسوء ہر انسان کے اندر ایک خواہش اور رجحان ہے جو بُری چیزوں کو پسند کرتی ہے، اور شیطان اس نفس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے، اور انسانوں میں ان صلاحیتوں کو ابھارتا اور پرورش دیتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو آسانی سے اپنے جال میں پھنسا سکے۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة البلد

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی، اس کی 20 آیتیں ہیں

وجه تسمیہ:

اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع میں بلد حرام (مکہ مکرمہ) کی قسم کھائی ہے، اس وجہ سے اس سورت کو "سورة البلد" کے نام سے موسوم کیا گیا، یہ سورت سورہ "ق" کے بعد نازل ہوئی ہے۔

سورة البلد کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

اس سورہ کا نام سورة البلد ہے جو کہ سورت کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے، یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس کا ایک (1) رکوع، بیس (20) آیتیں، بیاسی (82) الفاظ، تین سو سینتالیس (347) حروف اور ایک سو اڑسٹھ (168) نقطے ہیں۔

(یادر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة البلد کا سورة الفجر سے ربط و مناسبت

الف: سورة فجر میں دوستوں اور ورثاء کی جائیدادوں کو غصب کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے، کیونکہ یہ لوگ غریبوں اور مسکینوں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور کسی کو مدد پہنچانے کی ترغیب اور تشویق نہیں کرتے، سورہ بلد میں غلاموں کو آزاد کرنے، قحط اور خشک سالی میں کھانا کھلانے اور یتیموں کی مدد کرنے جیسی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔

ب: سورة فجر کے آخر میں نفس مطمئنہ کا ذکر ہوا، سورة بلد میں بھی اطمینان اور بھروسہ کرنے کی ترغیب اور مایوسی، کفر اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

سورة "البلد" سے اخذ کردہ نکات

قابل ذکر بات یہ ہے کہ:

اس سورت میں ایک بہت ہی معنی خیز موضوع کو چند مختصر جملوں میں سمویا گیا ہے، جس سے قرآن کے اختصار کا کمال ثابت ہوتا ہے، کہ ایک مکمل عالمی نظریہ جسے کسی بڑی کتاب میں سمیٹنا مشکل ہے کو مختصر سطروں میں مؤثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے، اس کا موضوع دنیا میں انسان کے صحیح مقام اور انسان کے لیے دنیا کے صحیح مقام کو سمجھنا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے سعادت اور بدبختی کے دونوں راستے کھلے رکھے ہیں، اس نے اسے دونوں راستوں کو دیکھنے اور ان پر چلنے کے ذرائع بھی فراہم کر دیے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر منحصر ہے کہ وہ سعادت کی راہ پر گامزن ہو کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا بد بختی اور شقاوت کا راستہ اختیار کر کے بُرے انجام میں مبتلا ہوتا ہے۔

اس سورہ مبارکہ میں بیان ہوتا ہے کہ: انسان رنج، مشقت اور سختیوں میں پیدا ہوا ہے، اسے ساری زندگی مشقتیں برداشت کرنی چاہیے، پس کیا ہی بہتر ہے کہ دنیا کی سختیوں کے بوجھ تلے دب جائے تاکہ آخرت تک آسانی سے پہنچ سکے، ورنہ اس کی آخرت بھی اس کی دنیا کی طرح سختیوں سے بھری ہوگی۔

یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل خدا کی طرف سے امتحان ہے، اس آزمائش سے صبر و تحمل کے ساتھ نکلنا چاہیے، مسائل کے ظاہر کو نہ دیکھیں، اپنی زندگی کے واقعات کے معنوی نتائج اور آخری زندگی کے اثرات پر بھی توجہ دیں، زندگی ہمیشہ مصائب اور پریشانیوں سے بھری ہوئی ہے، اور بنیادی طور پر زندگی میں مسائل اللہ کی طرف سے امتحان کی ایک قسم ہے، خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: (وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ

وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ٥٠ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ٥١) (سورہ بقرہ: 155) ترجمہ: "اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میوؤں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو"

(الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ٥٠ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ٥١) (سورۃ الملک: 2) ترجمہ: "اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے"

اہل سیر لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے دوسروں کی بہ نسبت سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کیا، قرآن کریم میں اللہ فرماتا ہے: "إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" اگر ہم آیت کریمہ میں گہری نظر سے توجہ کریں ہم اسے واضح طور پر سمجھ

جائیں گے: کہ آیت شریفہ میں سختیوں کو برداشت کرنے اور آسانی کے حصول کے درمیان ایک تعلق اور باہم ربط ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص مشکل کے بعد اتفاقاً آسانی حاصل کرے، لہذا "عسر اور یسر" کے درمیان تعلق کے لیے ایسے لفظ کا استعمال کیا جائے جس میں یہ معنی موجود ہو، اور وہ لفظ (مع) ہے۔

لفظ (مع) کے استعمال کے لیے مفسرین کے جانب سے متعدد تفسیریں کی گئی ہیں:

(۱): لفظ "مع" کے ساتھ ایک آیت ذکر کرنے کا یہ ہے کہ ہم انسانوں کو یہ جسے بھولنا نہیں چاہیے کہ آسانی اور تکلیف ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، مشکل لمحات کو برداشت کرنے سے آسانی آہستہ آہستہ حاصل کی جاتی ہے۔

(۲): لفظ "مع" کے استعمال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آسانی مشکل کے قریب ہے، اس طرح بیان کرنے سے سکون ملتا ہے اور حوصلے کو تقویت ملتی ہے۔

بہ ہر حال اس بنا پر کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ملی ہوئی اور ہر صعوبت کے ساتھ سہولت ہے، یہ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں اور ساتھ رہیں گے، (بعد) کا لفظ استعمال کرنے سے یہ لطیف معنی نہیں بنتا (چنانچہ لفظ مع کا جو لوگ ترجمہ بعد کا کرتے ہیں وہ اس لفظ کے استعمال کی لطافت سے لاعلم ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرماتے ہیں: پس (جان لیں) کہ یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

جس نبی کو مکہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ مدینے میں اس کے لیے آسانیاں ہوں گی یا جن مشکلات اور سختیوں کے ساتھ وہ دنیا میں ہیں، جنت میں ان کے لیے آسانی ہوگی، البتہ آیات کے مفہوم کی وسعت تمام مسائل کو شامل ہے، یعنی یہ دونوں آیات اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ یہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں اور نہ آپ کے زمانے کے ساتھ، بلکہ اسے ایک کلی قاعدے کے طور پر اور پچھلے موضوعات کی وضاحت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور وہ تمام دیانتدار، مخلص اور محنتی لوگوں سے وعدہ کرتا ہے کہ مشکلات کے ساتھ ساتھ ہمیشہ آسانیاں بھی ہوتی ہیں۔

سورة البلد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۝ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۝ وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدٍ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۝
أَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ۝ أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا
وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكٌ رَقَبَةً ۝ أَوْ
إِطْعَمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتَّبِعُنَا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ
الْمَشْأَمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّوصَدَّةٌ ۝

سورت کا مختصر ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۝	میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں! (1)
وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۝	اور تو رہنے والا ہے اس شہر میں (2)
وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدٍ ۝	اور قسم ہے باپ (یعنی آدم) اور اس کے اولاد کی (3)
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۝	یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (4)
أَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہوگا؟ (5)
يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ۝	کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال برباد کیا (6)
أَحْسَبُ أَنْ لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۝	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ (7)
أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝	کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں (8)
وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝	اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دئیے) (9)

اور ہم نے اسے دو واضح راستے (خیر اور شر) دکھا دیے (10)	وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰
پھر (بھی) وہ مشکل گھاٹی میں نہ (قدم رکھا) گھسا (11)	فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝۱۱
اور تمہیں کیا پتہ کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ (12)	وَمَا أَكْزَبَكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝۱۲
کسی گردن کو (غلامی سے) آزاد کرنا ہے (13)	فَكُ رَقَبَةٌ ۝۱۳
یا کسی بھوک والے دن کھانا کھلانا (14)	أَوْ اطْعَمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝۱۴
کسی قرابت والے یتیم کو (15)	يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۵
یا مٹی میں ملے ہوئے کسی مسکین کو (۱۶)	أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝۱۶
پھر ہوئے وہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی (۱۷)	ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝۱۷
یہی لوگ صاحب سعادت ہیں (۱۸)	أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝۱۸
اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا وہ بدبخت ہیں (۱۹)	وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَلِيتَنَاهُمُ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝۱۹
ان پر (ہر طرف سے) آگ بند کی جائے گی (۲۰)	عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ ۝۲۰

مختصر تفسیر

مبارک آیات (1 تا 7) میں انسان کے مصائب و مشکلات کے ساتھ جڑے رہنے کی بات کی گئی ہے اور ساتھ ہی، طاقت اور دولت کے ذریعے اس کے بہکانے جائے جانے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

جاننا چاہیے کہ: سورہ مبارکہ کی ابتداء قسم سے ہوتی ہے، اور اس کے بعد انسان کے نظام توالد اور تناسل کی طرف اشارہ کر کے اس دنیا کی زندگی کو محنت اور مشقت سے متعارف کراتی ہے، پھر وہ غافل اور متکبر لوگوں کو قابل سرزنش ٹھہراتی ہے، اللہ تعالیٰ کی قیمتی نعمتوں کی نشاندہی کرتی ہے جو انسان

کو عطا کی گئی ہیں، اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مستحقین کا خیال رکھا جائے اور یتیموں کی مدد کی جائے۔

بلاشبہ نعمتوں کے معاملے میں لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، شکر گزار گروہ کا انجام خوشگوار اور مبارک ہوگا جبکہ ناشکرے گروہ کا انجام عبرتناک اور سخت ہوگا۔

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۝	میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں! (1)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر یعنی: حرمت والے شہر مکہ مکرمہ کی، وہ شہر جو حرم الہی ہے، اور نزول وحی کا مقام، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور مناسک حج کی جگہ ہے، وہ جو بیت العتیق (جسے قبلہ بنا کر شرق اور غرب کا) معزز ترین اور بابرکت مقام بنادیا گیا ہے، اسے رحمتوں اور برکتوں کے نزول کی جگہ قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ سورت کے شروع میں مکہ شہر کی قسم کھاتا ہے، یہ اس سرزمین کے شرف اور احترام کی خاطر، کہ اللہ تعالیٰ کا گھر اس میں واقع ہے اور اللہ کا سب سے محبوب ترین مقام ہے، اس مکان کی فضیلت اور برتری سب پر واضح ہے، اس مقام اور خانہ کعبہ میں دعا رد نہیں کی جاتی بلکہ قبول ہو جاتی ہے، اس صورت میں کہ دعا کرنے والا اپنی دعا کی قبولیت پر یقین رکھتا ہو۔

اس آیت میں حروف "لا" زائد ہے، بعض محاورات میں عرب کے نزدیک حرف زائد "لا" لانا معمول ہے۔

صحیح ترین قول یہ ہے کہ حرف "لا" مخاطب کے خیال باطل کو رد کرنے کے لیے ہے، قسم کے شروع میں لایا جاتا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ جیسا کہ تم سوچتے آئے ہو ایسا نہیں ہے، بلکہ ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ: اس کی حقیقت وہ ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں، جیسا کہ ہم نے کہا: "البلد" سے مراد مکہ شہر ہے، اسی طرح سورہ "التین" میں بھی شہر کی قسم کھائی گئی ہے، اس صفت کے ساتھ اسے امین کہا گیا: (وهذا البلد الامین) شہر مکہ کی قسم کھانا دوسرے شہروں کی بہ نسبت اس کے شرف اور فضیلت کا اظہار اور اعلان کرنا ہے۔

التسهیل میں ہے کہ: اکثر مفسرین کا اتفاق رائے ہے کہ "بلد" سے مراد شہر مکہ ہے، اس کی قسم کھائی ہے تاکہ اس کی عزت پر دلالت کرے۔ (التسهیل: 199/4)

حضرت عبد اللہ بن عدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت شہر مکہ سے خطاب کر کے فرمایا: اللہ کی قسم! تو اللہ کے نزدیک تمام زمین سے زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے، اگر مجھ پر یہاں سے نکلنے کا دباؤ نہ ہوتا، تو میں تیری زمین سے باہر نہ جاتا (رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

ملاحظہ :

قرآن عظیم میں جملہ "لَا أُقْسِمُ" تین بار مستعمل ہوا ہے، مفسرین نے اس کے دو مفہوم اور معنی بیان کیے ہیں، کچھ مفسرین حرف "لا" کو زائد سمجھتے ہیں اور اس کا معنی (قسم کھاتا ہوں) کرتے ہیں اور کچھ نے اسے (قسم نہیں کھاتا ہوں) ترجمہ کیا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ مسئلہ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَأَنْتَ حَلٌّ لِّهَذَا الْبَلَدِ ۝۲	اور تو رہنے والا ہے اس شہر میں (2)

لفظ "حَلٌّ" میں دو معنی کا احتمال ہے: ایک یہ کہ حلول سے مشتق ہو، کہ متبادل، رہائش اختیار کرنا، اور اترنے جیسے معنی میں آتا ہے، تو اس کے مطابق "حَلٌّ" کا معنی اترنے کا ہے اور سکونت اختیار کرنے کا معنی بھی آتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شہر مکہ خود محترم اور مقدس ہے، خصوصاً جب آپ اس میں رہائش رکھتے ہوں، پس مکین کی فضیلت سے مکان کی فضیلت میں اضافہ ہوتا ہے، اس بناء پر شہر کی عظمت اور تقدس آپ کی سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے دوگنا اور دوبالا ہو جاتا ہے، اور دوسرا امکان یہ ہے کہ لفظ "حَلٌّ" مصدر "حلت" سے مشتق ہو، جو کہ حلال ہونے کے معنی میں ہے، اس لحاظ سے لفظ "حَلٌّ" کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ کفار مکہ نے آپ کے قتل کو حلال قرار دیا ہے اور وہ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہیں، حالانکہ وہ خود مکہ شہر میں کسی بھی قسم کے شکار کو جائز نہیں سمجھتے، لیکن ان کا ظلم اور سرکشی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ جس مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل جائز نہیں ہے جو کہ ان کا بھی عقیدہ اور ماننا ہے، اُس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون گرانے کا حلال قرار دیا ہے۔

"حَلٌّ" کا دوسرا معنی یہ ہوسکتا ہے کہ: آپ کی خصوصیت یہ ہے کہ حرم میں کفار مکہ سے لڑنا آپ کے لیے حلال ہوگا، جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ایک دن کے لیے حرمت کے احکام اٹھالیے گئے، اور کفار کا قتل حلال قرار پاگیا۔

خلاصہ تفسیر میں یہی تیسرے معنی کو مدنظر رکھا گیا ہے، لیکن تفسیر "مظہری" میں تینوں احتمالات کا ذکر کیا گیا ہے، اور تینوں معنی کی گنجائش ہے۔

وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ ۝	اور قسم ہے باپ (یعنی آدم) اور اس کے اولاد کی (3)

آدم سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہے تمام بنی آدم کے باپ ہیں اور "مَا وَلَدَ" سے مراد اس کی اولاد ہے، جو ابتدائی پیدائش سے قیامت تک ہیں، اس صورت میں حضرت آدم اور تمام بنی نوع انسان کی قسم کھائی گئی۔

مجاہد نے کہا: "وَالِدٍ" یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور "مَا وَلَدَ" اس کی نیک اولاد ہیں۔

ابن کثیر نے کہا: مجاہد اور اس کے دوستوں کی رائے اچھی اور پختہ ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اُم القریٰ کی قسم کھائی، جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سکونت کی جگہ ہے، پھر اس کے باشندے آدم اور ان کے بیٹے کی قسم کھائی۔ (مختصر: 630/3)

خازن نے کہا: خدا نے مکہ کی عزت اور شرف کی قسم کھائی ہے، اور آدم، اور دیگر پیغمبروں اور ان کی نیک اولاد کی قسم کھائی ہے، کیونکہ کافر۔ اگرچہ وہ آدم کی نسل سے ہے۔ کی کوئی عزت نہیں ہے (خازن: 248/4)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۝	یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (4)

کَبَدٍ: کبد یا کباد کا معنی درد اور سختی کے ہے، جب کہا جاتا ہے کہ: "كَبَدَ رَجُلٌ" یعنی اس آدمی کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، یعنی: ان متذکرہ چیزوں کی قسم: کہ انسان مسلسل دنیا کی تکلیف اور مشقتوں میں ہے اور اس کی سختیوں کو برداشت کرتا ہے، انسان کی تخلیق کے آغاز سے، یعنی اس کے جسم میں روح پھونکنے سے لے کر جب تک وہ اس سے لی نہیں جاتی، وہ ہر طرح کی سختیوں کو مسلسل برداشت کرتا ہے۔

ابن عباسؓ نے فرمایا: "فِي كَبَدٍ" یعنی: مشقت اور سختی، حمل، ولادت، بچپن اور دودھ چھڑانے سے لے کر زندگی کے دیگر مراحل زندگی اور موت تک مشکل میں ہے، (خازن: 248/4)

کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی مخلوق نہیں بنائی کہ انسان جتنی تکلیف اور مشقت اٹھائے، باوجود اس کے کہ انسان سب سے کمزور مخلوق ہے، (خازن: 248/4)

ابو سعود فرماتے ہیں: یہ مبارک آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی طرف سے پیش آنے والی مشکلات پر تسلی دیتی ہے، اور ان مشکلات کو برداشت کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انسانی طبیعت کی خبر دیتا ہے، وہ انسان جو خدا کی قدرت کا انکار اور حشر و نشر کو جھٹلاتا ہے۔

ایَحْسَبُ أَنْ لَنْ يُقَدِّرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہوگا؟ (5)

کیا انسان گمان کرتا ہے کہ کوئی بھی اس سے انتقام نہیں لے سکتا کہ اس پر غالب ہو؟ وہ اس مال پر جو اپنی نفسانی خواہشات پر خرچ کرتا ہے فخر کرتا ہے، یہ جہالت، غرور اور خود غرضی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس پر غالب آئے گا، اور اس سے انتقام لے گا۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت: "ابی الاشد بن کلدہ" کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جو اپنی جسمانی طاقت پر بہت فخر کرتا تھا، کہتے ہیں کہ: وہ ایک کھال کو بچھا کر اس پر پاؤں رکھتا اور کہتا کہ: جو بھی اسے میرے پاؤں کے نیچے سے گھسیٹ لے یا مجھے اس پر سے ہٹا لے تو میں اسے اتنی رقم دوں گا، دس بندے کھال کو کھینچتے تھے چمڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا لیکن اس کا پاؤں اس سے نہیں ہلتا تھا۔

آیت کا معنی اس طرح ہے: کیا یہ سرکش، نافرمان اور مؤمنوں کو ذلیل کرنے والے سمجھتے ہیں کہ ان سے انتقام لینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے؟

يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَا لَا بَدَأَ ۝	کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال برباد کیا (6)

یہ کافر کہتا ہے: میں نے ڈھیر سا مال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں خرچ کیا ہے، یعنی: میں نے بہت سا مال خرچ کیا ہے جو اتنا زیادہ ہے

مگر پھر بھی اس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی اور دشمنی میں، اسلام کی مخالفت اور نافرمانی میں، یا شہرت کے لیے اور فخر کی خاطر۔

مقاتل اس آیت کے شان نزول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: یہ آیت عامر بن نوفل کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کہ ایک گناہ کا مرتکب ہوا، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ کفارہ ادا کرے۔

کہا: جب سے میں محمد کے دین میں داخل ہوا ہوں، میرا تمام مال کفاروں اور خیراتوں میں چلا گیا، اس کی یہ بات ایک قسم کی بغاوت تھی، یا اپنے مال کے جانے پر افسوس کا اظہار تھا، جو ہر حال میں مال خرچ کرنے پر اس کے پچھتاوے کا عکاس ہے، مفسر آلوسی فرماتے ہیں: یعنی وہ شیخی مار کر اور گھمنڈ سے مؤمنوں کو کہتا: میں نے بہت سارا مال خرچ کیا، اس کا مقصد وہ مال ہے جو اس نے دکھلاوے کے طور پر اور شہرت حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا تھا، اس نے انفاق کو ابلاک سے تعبیر کیا ہے، فائدہ حاصل کرنے کے لیے خرچ نہیں کیا، اس نے ایسا سوچا گویا کہ اس نے بہت سا مال ضائع کر دیا ہے۔

کچھ لوگوں نے کہا ہے: وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی شدید دشمنی ظاہر کرنے کے لیے اس طرح کہتا ہے (آلوسی: 136/30)

اللہ تعالیٰ نے خواہشات اور گناہوں کے راستے میں خرچ کرنے کو ہلاکت کہا ہے، کیونکہ خرچ کرنے والے اس خرچ سے سوائے ندامت، نقصان، پچھتاوے اور کوتاہی کے کوئی فائدہ نہیں ملتا۔

لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنا مال و جائیداد خرچ کیا ہو تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجارت والا معاملہ کیا ہے اور جتنا اس نے خرچ کیا ہے اس سے کئی گنا بڑا فائدہ حاصل کرے گا۔

"أَهْلَكْتُ" مال کا تباہ و برباد اور ہلاک کرنا، مراد خرچ کرنا ہے۔

"لُبًّا" زیادہ اور بکثرت، "أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبًّا" ایسے کافر اور کافروں کا مقصد مال کی فروانی پر فخر کرنا اور لوگوں کو بلا سوچے سمجھے دینا اور بہت زیادہ مال خرچ کرنا ہے۔

کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ (7)

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهُ اَحَدٌ ۝

کیا یہ متکبر اور مغرور شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی کو اس معاملے کی حقیقت اور اس کے خرچ کی مقدار کا علم نہیں ہوگا؟ اور خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ ہے؟

اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ میں اس شخص کو جو خواہشات کے راستے میں اپنا مال خرچ کرتا ہے، اور پھر اپنے اس کام پر فخر کرتا ہے تو اللہ اسے سرزنش کر رہا ہے کہ کیا اس کا خیال ہے کہ خدا اسے نہیں دیکھتا اور اس کے مقاصد سے باخبر نہیں ہے؟ اس کے اعمال کا حساب و کتاب نہیں کرے گا، ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور اس کے اعمال کو محفوظ کر کے اسے اس کا بدلہ دے گا، کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جس اللہ تعالیٰ نے انسان کو سننے اور دیکھنے کے ذرائع عطا کیے ہوں اور خود ان سے محروم ہو؟

مفسرین لکھتے ہیں کہ: اس آیت سے مراد ایک شخص "ابوالاشدین" کے نام سے ہے کہ اپنے مال اور جائیداد کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے دشمنی میں بڑے فخر سے خرچ کرتا تھا۔

ملاحظہ:

مفسرین کی بڑی تعداد کی رائے ہے کہ اس کا ہدف اور مقصد کوئی معین اور معلوم شخص نہیں ہے، لیکن بعض علماء کا یہ ماننا ہے کہ یہ شخص "ابوالاشدین" اُسَید بن کَلْبَةَ الْجُمَحی ہے اس بارے میں ایک روایت بلاسند کے ابن عباس سے تفسیر قرطبی "الجامع لا حکام القرآن 20 / 64" میں ذکر ہوئی ہے، جس کو اس آیت مبارکہ سے مربوط مانتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

محترم قارئین:

آیات مبارکہ (۸ تا ۲۰) میں آخرت کے لیے نجات کے راستے کے انتخاب اور اختیار کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں (8)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهِ عَيْنَيْنِ ۝۸

کہ اس کے ذریعے دیکھتا ہے؟ جی ہاں! انسان کی بینائی ایک بڑی نعمت ہے،

کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے زندگی کے اسباب اور ضروریات کو دیکھتا ہے تاکہ اس کا وجود ان ضروریات اور اسباب کے ذریعے سے قائم رہے۔

"عَيْنَيْنِ" عین کے مادے سے ہے، اس کا مطلب بصارت کا ذریعہ ہے، یعنی: آنکھ؛ البتہ اسے مختلف معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں میری نظروں میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اُس کی حفاظت کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے فرماتے ہیں: "وَلِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي" (طہ: 39) یعنی اے موسیٰ! تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے (نگرانی میں) کی جائے۔

وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝۹	اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دئیے) (9)

یعنی: وہ زبان جس سے وہ بولتا ہے، اور اس سے اپنی حالت کی ترجمانی کرتا ہے، اس طرح ہم نے اسے ہونٹ بھی دیے ہیں جو بولنے اور خاموش رہنے اور کھانے میں اس کی مدد کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ان دونوں نے اس کے جمال کو اور خوبصورت بنایا ہے، اور ان میں مضبوط کاریگری کا استعمال ہوا ہے۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰	اور ہم نے اسے دو واضح راستے (خیر اور شر) دکھا دیے (10)

اور ہم نے اسے اچھے اور برے دو راستوں کی طرف واضح رہنمائی کردی ہے اور اس کے لیے گمراہی سے ہدایت کو الگ کر کے واضح کر دیا تاکہ سعادت کا راستہ اپنا لے اور بد بختی والے راستے سے دور رہے۔

ابن مسعودؓ نے فرمایا: "النَّجْدَيْنِ" یعنی خیر اور شر، جیسا کہ کہا گیا: (إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا) (مختصر: 3/۶۴۱)

لہذا ان بے شمار نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا تقاضا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے، اور گناہوں کے لیے نعمتوں کو استعمال نہ کرے لیکن انسان نے ایسا نہیں کیا۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝۱۱	پھر (بھی) وہ مشکل گھاٹی میں نہ (قدم رکھا) گھسا (11)

"الْعَقَبَةُ" دو پہاڑوں کے درمیان کی گھاٹی کو کہتے ہیں، یعنی نجات پانے کے

لیے نیک اعمال اور فرض، نفل اور صدقہ کر کے اس کھٹن راستے سے کیوں نہیں گزرتا؟ تاکہ کامیابی حاصل کرتا اور نجات اس کے ہاتھ لگ جاتی۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی میں مال خرچ کرنے کے بجائے اس مشکل راستے کو عبور کرنے کے لیے کیوں خرچ نہیں کیا؟!

البحر میں ہے کہ: "الْعَقَبَةُ" یہ ایک استعارہ ہے، اس سے مراد وہ عمل ہے جس کو انجام دینا نفس پر بوجھ بنتا ہو، کیونکہ مال خرچ کرنا نفس کے لیے مشکل اور سخت ہے، عَقَبَہ یعنی: ایک دشوار گزار پہاڑی راستے سے تشبیہ دی گئی ہے، کہ ایسے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرنا درحقیقت سختیوں اور مشقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے، "اقتحبھا" معنی ہے جلدی اور تیزی سے داخل ہونا،
(البحر: 476/8)

یہ وہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے نفس، خواہشات اور شیطان کے خلاف جہاد کرنے اور رحمن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بیان کی ہے، نفس سے جہاد کرنا گھاٹی عبور کرنا جیسا ہی ہے، اور آخرت کا راستہ کافی لمبا اور سخت ہے، پس انسان کو چاہئیے کہ اس سخت اور مشکل راستے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری کے ساتھ طے کرے، اگر دنیا کے مال کو دنیاوی لذتوں میں استعمال کرنے کے بجائے عقبہ کے راستے اور آخرت کی راہیں آسان کرنے کے لیے استعمال ہو تو زیادہ بہتر ہوگا، جنت کا راستہ سخت ہے، اس راستے کو آسان کرنے کے لیے مال خرچ کیا جائے تو بہتر ہے۔

حدیث میں ہے کہ: "حُقِّبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُقِّبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ" (مسلم: 2822) "جنت ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیزوں سے گھری ہوئی ہے اور جہنم خواہشات سے گھرا ہوا ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کا راستہ سختیوں اور مشکلات سے ہو کر گزرتا ہے، اور جہنم کا راستہ خواہشات، شہوتوں اور دلی میلان کی پیروی ہے، اس لیے اس راستے پر قدم اٹھانا اور رکاوٹوں اور تنگ اور خطرناک موڑوں اور دشوار گزار اور ناقابل گزر راستوں گھاٹیوں سے گزرنا لوگوں کو چوٹیوں تک پہنچا دے گا، اگر چہ کافی خطرات بھی ہیں، لیکن اس کا خوشگوار نتیجہ نکلے گا، تو لوگ کیوں مشکلات اور سختیوں کو قبول نہیں کرتے؟

ملاحظہ:

دینی امور کو سخت راستہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ خواہشات نفس کے خلاف ہے اسی لیے اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

اور تمہیں کیا پتہ کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ (12)

وَمَا آذْرَبَكَ مَا الْعَقْبَةُ ۝۱۲

کہ جنت تک پہنچنے کے لیے اس کا طے کرنا لازمی ہے، یعنی: تو کیا جانے کہ اس سخت رکاوٹ کا ہونا اور دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟

یہ آیہ مبارکہ اس گھاٹی کی شان کو بڑا دکھانے کے لیے ہے، یعنی تو اس گھاٹی کی دشواری اور سختی اور پھر اس کو پار کرنے اور اس سے گزر جانے کا بدلہ نہیں جانتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ وہاں سے گزرنے کی توفیق عنایت نہ فرمائے تو گزرنا بہت مشکل ہے، لیکن جسے اللہ تعالیٰ توفیق دے اس کے لیے آسان ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ بعد والی آیات میں گھاٹی کی تفسیر بیان فرماتا ہے اور اس گھاٹی کو عبور کرنے کے طریقے بیان کرتا ہے۔

کسی گردن کو (غلامی سے) آزاد کرنا ہے
(13)

فَكَرَّبَةٍ ۝۱۳

اللہ تعالیٰ کے راستے میں قید سے غلام کا آزاد کرانا اور رہا کرنا ہے، تاکہ اسے آزادی ملے اور اپنے حقوق حاصل ہوں اور اس کی انسانیت کمال کو پہنچے، اسلام آزادی اور حریت دلاتا ہے۔

"رَقَبَةٍ" گردن کے معنی میں ہے عربی زبان میں، لیکن بعض مرتبہ انسان سے کنایہ ہوتا ہے، انسان کا آزاد کرنا، کسی انسان کو آزاد کریں۔

یا کسی بھوک والے دن کھانا کھلانا (14)

أَوْ اطْعَمْتُ يَوْمَ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝۱۴

یعنی: کھانا کھلانے کا اقدام کریں، بھوکوں کو کھانا کھلانا، کونسے دن؟ اس دن جب قحط پڑے، کھانا کھلانا ہمیشہ سے اسلام میں مقبول اور پسندیدہ امر رہا ہے، اور دین اسلام میں ہمیشہ اس کی تشویق اور ترغیب دی گئی ہے، البتہ قحط والے دن اس کھلانے کی قدر و قیمت اور ثواب یقیناً زیادہ اور خاص ہے، کیونکہ "ذِي مَسْغَبَةٍ" جس دن وہ بھوکے ہوں، یعنی: قحط کے ایام ہو۔

مفسر صاوی فرماتے ہیں: کھانا کھلانے کو بھوک کے دن سے مقید کیا ہے، چونکہ ایسے دن میں کھانا کھلانا نفس پر سخت اور بھاری ہے، (تفسیر صاوی: 342/4)

جیسا کہ ہم نے کہا: کھانا کھلانا بطور عام مطلوب ہے، یہ کہ انسان کھانا کھلانے والا ہو، چاہے مستحق افراد کے لیے ہو، یا غیر مستحق افراد کے لیے ایک پسندیدہ کام ہے، لیکن یہ کہ کس وقت اس کی اہمیت زیادہ ہے اور اجر و ثواب جو مطلوب ہے اسے حاصل کرے اور خاص شرائط کیا ہیں؟ تو: اس سے مراد وہ ہے جس شخص ہے جو غربت کی انتہاء کو پہنچ چکا ہو، اور اس کے لیے کوئی راستہ نہیں بچا ہو، وہ فقیر جو آہستہ آہستہ ایمان کی کمزوری اور کفر کی طرف جارہا ہے، ایسے افراد اور اشخاص کی: اگر مدد کی جائے تو یہ قیمتی ہوگا، آیت کا سادہ سا معنی یہ ہے کہ جو بھوکا ہے اسے کھانا کھلائیں۔

یَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۵	کسی قرابت والے یتیم کو (15)

یعنی: وہ بچہ جس کے ماں باپ نہ ہوں، اور نہ کوئی ایسا ہو کہ اس کا خیال رکھے اس کی دیکھ بال کرے، وہ شکستہ دل اور احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔

یتیموں کے ساتھ نیکی کرنا ثواب ہے اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی، اور جہاں یہ دو اکٹھے ہوں تو وہاں ثواب دوگنا ہے۔

اسی طرح: یتیم ہر زمانے میں معاشرے کا محروم ترین طبقہ ہے، چنانچہ یتیم ہونا بلوغت سے پہلے ہے، بلوغت کے بعد اگر باپ نہ بھی ہو تو وہ یتیم شمار نہیں ہونگے، تو اب کیوں اس آیت اور دیگر بابرکت آیات میں یتیم اور مسکین کی بحث زیادہ آئی ہے؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان دو قسم کے افراد کا سب سے زیادہ نام لیتا ہے؟ اس کی علت اور وجہ یہ ہے کہ: معاشرے کا محروم ترین طبقہ یتیم ہیں، وہ بھی وہ یتیم جو کسی شخص کی قوم، رشتہ داروں اور اقارب میں سے ہو۔

حدیث میں ہے کہ: (الصدقة على المسكين صدقة، وعلى ذي الرحم اثنان: صدقة وصلة) ترجمہ: "صدقہ مسکین پر صرف صدقہ ہے، رشتہ دار اور قریبی آدمی پر دو چیزیں ہیں: صدقہ اور صلہ رحمی"

أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۶	یا مٹی میں ملے ہوئے کسی مسکین کو (۱۶)

متربہ، تراب سے لیا گیا ہے، اور تراب کا معنی مٹی ہے، اس مسکین کو کہا جاتا ہے جس کے بود و باش کے لیے کوئی مکان نہ ہو، مٹی میں پڑا ہوا ہو، یہ کنایہ ہے شدید فقر اور غربت سے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: وہ ایسا غریب ہے جس کے پاس کپڑا یا کوئی اور چیز نہیں ہے کہ اسے مٹی سے بچائے، پس خاکنشین اور خاکسار رہتا ہے۔

پھر ہوئے وہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی (۱۴)	ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝۱۴

ان آیات میں جس اہم چیز کی طرف ہمیں توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمارے رب نے انسان کو سعادت کی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے اجتماعی مسائل جیسے یتیموں کی دیکھ بال، بھوکوں کو کھانا کھلانا، انسانوں کو آزاد کرنا وغیرہ کے ضمن میں ایک معنوی مفہوم بھی رکھا ہے اور وہ یہ کہ اللہ پر ایمان لانا اور تمام خدمت خلق کے امور انجام دینا ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، خدا پرستی اور خدمت خلق ساتھ ساتھ ہیں۔

یعنی دین اسلام میں مادی اور معاشرتی مسائل روحانی اور خدا پرستی سے الگ نہیں ہوتا، لہذا بعض آیات میں فرماتا ہے: "ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات" کہ "آمنوا" سے مراد ذہنی اور روحانی پہلو ہے، جبکہ "عملوا الصالحات" اجتماعی مناسب کاموں کی طرف اشارہ ہے، اگر کوئی شخص کمال کی راہ پر قدم رکھنا چاہتا ہے، وہ در حقیقت کمال کے دشوار گزار میدانوں میں داخل ہونا اور انہیں طے کرنا چاہتا ہے، اور ساتھ ہی ایمان کے میدان میں بھی آگے جانا چاہتا ہے، اور معاشرتی اخلاقیات کے میدان میں بھی، اسے اچھے معاشرتی اخلاقیات اور خاص طور پر ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا ہوگا: اور وہ بھی تو مشکل حالات میں خاص کرجو کسی معاشرے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

چار چیزیں جن کے تحت آپ اس گھاٹی کو عبور کرسکتے ہیں

1 - غلام آزاد کرنا جو روایت میں موجود ہے: جس نے کسی مؤمن غلام کو آزاد کیا جہنم کی آگ سے اس کا فدیہ ہوگا، حدیث شریف میں ہے کہ: (أَتَمَّارَجُلٍ

أَعْتَقَ أَمْرًا مُسْلِمًا، اسْتَنْقَذَ اللَّهُ بِكُلِّ عَصْوٍ مِنْهُ عَصْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ) (بخاری 2517)

و6715 و مسلم 1509) ترجمہ: "جس نے کسی مؤمن گردن کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے (اس آزاد کرنے والے کا) عضو آگ سے آزاد کرے گا"

2- بھوک اور غربت و افلاس کے دور میں کھانا، خاص طور پر کسی ایسے یتیم کو جو رشتہ دار ہو یا قریب کا رہنے والا ہو، یا کسی غریب کے لیے جو مٹی میں رُل رہا ہو اور انتہائی فقیر ہو۔

3- سچا ایمان خدا پر، خدا کے رسول پر، خدا کی آیات پر اور خدا کی ملاقات پر، تاکہ اس کا دل اس سے زندہ رہے۔

4- مظلوم مؤمنوں کو صبر کرنے اور حق پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتا ہے، اور مالداروں اور امیروں کو سمجھاتا ہے کہ غریبوں اور مسکینوں پر رحم و مہربانی کیا کریں۔

ان چار چیزوں کے ذریعے انسان اس عاقبت کی گھاٹی کے پار جاسکتا ہے اور خود کو عذاب سے نجات دلا سکتا ہے، یعنی انسان کو اپنا مال خرچ کرنا چاہیے اور صالح مؤمن رہنا چاہیے۔

اُولَئِكَ اَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝۱۸	یہی لوگ صاحب سعادت ہیں (۱۸)

یعنی مذکورہ صفات والے وہ صالح لوگ ہیں جو نجات پانے والوں کی صف میں شامل ہوں گے، جو اپنا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں وصول کریں گے، اور جب وہ نعمت والے باغوں میں داخل ہوں گے تو خوش ہوں گے، بعض مفسرین نے "مَیْمَنَة" کو مصدر میمی سے بہ معنی زیادہ اور استمرار کے خیر اور برکت میں لیا ہے، اور بعض نے اسم مکاں کہا ہے، جس کا معنی خیر اور برکت کا مقام ہے۔ (التفسیر الکبیر: جلد ۲۷، صفحہ: ۱۴۳)

اصحاب یمین اور مینہ کا قرآن عظیم کی اصطلاح کے مطابق ان لوگوں پر اطلاق ہوتا ہے جنہوں نے دنیا میں ایمان اور نیک اعمال کے ساتھ زندگی گزاری ہو، جیسا کہ ہم نے کہا: قیامت کے دن اپنا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں حاصل کریں گے، قرآن کریم نے لوگوں کو قیامت کے دن تین گروہوں (سابقون، اصحاب یمین، اصحاب شمال) میں سے ایک قرار دیا ہے: "وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلَاثَةً فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ... وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ... وَالسَّابِقُونَ" اور بعض دوسرے مواقع پر اصحاب یمین کو اصحاب شمال کے مقابل اور اصحاب مینہ کو اصحاب مشئمہ کے مقابل قرار دیا ہے۔

کتاب اللہ اور احادیث نبوی کے نصوص کی بنیاد پر انسانوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے:

1 - ایسے لوگ ہیں جن کا ایمان اور توحید درست ہے، اور ان کے نیک اعمال بہت ہیں، یہ لوگ جنتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے گا، (وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ) (سورہ بقرہ: ۲۵) ترجمہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔"

2 - ایسے لوگ ہیں جن کا ایمان اور توحید صحیح ہے: لیکن بہت زیادہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، جو کہ فسق کے حد کو پہنچ چکے ہیں، یہ افراد جہنم کے مستحق ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ دو طرح کا معاملہ کر سکتا ہے: اپنے فضل اور مہربانی سے ان کے گناہوں سے درگزر کر کے ان کو جہنم سے نجات دے گا، یا پھر ان کو جہنم میں بھیج کر گناہوں کی سزا دے کر ایک دن ان کو دوبارہ باہر نکالے گا: (لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنْ تُبَدِّلُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخَفُوْا يُحَاسِبْكُمْ بِهٖ اللّٰهُ ۚ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) (سورہ بقرہ: ۲۸۴) ترجمہ: "جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ تو اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا تم سے اس کا حساب لے گا پھر وہ جسے چاہے مغفرت دے اور جسے چاہے عذاب دے۔"

3 - وہ جن کا ایمان اور توحید صحیح نہ ہو، اس قسم کے لوگ جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، کبھی بھی اس سے نہیں نکلیں گے، اسی طرح عالم برزخ کے بارے میں، کتاب اللہ اور احادیث کے نصوص سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ .

ا: قبر یا عالم برزخ میں۔

ب: یا جنت کے باغیچوں میں سے کسی ایک باغیچہ میں ہوں گے۔

ت: یا جہنم کے گڑھوں میں سے کسی ایک گڑھے میں ہوں گے۔

جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهُ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ اِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَمِنْ اَهْلِ النَّارِ فَيَقَالُ هَذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى يَبْعَثَكَ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) بخاری (1379)، وصحیح مسلم (2866)

ترجمہ: "جب تم میں سے کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو ہر صبح و شام اس کا اصل ٹھکانا اس کے سامنے لایا جاتا ہے، اگر وہ جنت والوں میں سے ہے تو اہل جنت سے اور اگر وہ دوزخ والوں میں سے ہے تو دوزخ میں سے (اس کا ٹھکانا اسے دکھایا جاتا ہے اور اس سے) کہا جاتا ہے یہ تمہارا ٹھکانا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تجھے زندہ کر کے اس (ٹھکانے) تک لے جائے۔"

ضروری نہیں کہ جو لوگ عالم برزخ میں خوش ہوں وہ قیامت کے دن ناخوشی میں رہیں، بلکہ مذکورہ بالا حدیث اس کے خلاف ثابت کرتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوگا کہ کوئی عالم برزخ میں تکلیف اور عذاب میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے جنت میں بھیج دے گا، برزخ کے سختی اور عذاب کو اس کے گناہوں کے پاکی کا سبب بنادے کہ صحرائے محشر میں اس کے گناہ کم ہوجائیں، اور یہ شائستہ اور لائق بندوں میں سے ہو۔

اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا وہ بدبخت ہیں (۱۹)	وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمُشْهَةِ ۝۱۹

"أَصْحَابُ الْمُشْهَةِ" قرآن کریم میں اصحاب الشمال کی دوسری تعبیر ہے، قرآن کریم نے اصحاب شمال کو دوسرے القاب کے ساتھ بھی ذکر کیا ہے: "مکذبین"، "ضالین"، "کافر"، "اعمی"، "مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ" و "مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ" اس جماعت اور گروہ کو اصحاب شمال کے نام سے منسوب کرنے کی وجہ مندرجہ ذیل طریقے سے بیان کی جاسکتی ہے:

- 1- ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے، اور یہ ان کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہے، کیونکہ عرب دائیں ہاتھ خط لینے کو قبولیت اور احترام کی علامت سمجھتے ہیں، اور بائیں ہاتھ سے رد اور توہین کی علامت سمجھتے ہیں۔
- 2- انہوں نے اپنی زندگی باطل پرستی، خواہش پرستی اور نافرمانی میں گزاری اور خدا کی آیات سے کفر کرتے ہوئے حق اور سعادت کے راستے کے خلاف چلے، ان کا انجام جہنم اور دیگر بہت سے عذاب ہوں گے۔
- 3- کائنات کے دو رُخ ہیں، دائیں اور بائیں، دائیں جانب ملکوتِ اعلیٰ ہیں۔ اور بائیں جانب ملکوتِ اسفل اور بدبختوں کی ارواح کی جگہ اور عذاب کے فرشتوں اور برائیوں کے لکھنے والے فرشتوں کی جگہ ہے اور بدکرداروں کے لیے جہنم ہے۔

جہنم میں اصحاب شمال کے جانے، ان کے دردناک عذاب اور آخرت میں ان کے حال اور کیفیت کے بارے میں بتانے والی آیات سے اصحاب شمال کے جہنم میں جانے کے اسباب اور ان کے عذاب کے بارے میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے:

دل کا اندھا ہونا

قرآن کریم نے اصحاب شمال کو اصحاب یمین کے مقابل بیان کیا ہے اور اصحاب یمین کے مقابل گروہ کو دنیا میں نابینا اور اندھا کہا ہے، چنانچہ اس سے اس طرح نتیجہ لیا جاسکتا ہے کہ اصحاب شمال دل کے اندھے ہیں،

ان کے دل کا اندھا ہونا قیامت میں ان کے نابینا ہونے کا سبب بنے گا۔

زیادہ نعمتوں کا مالک ہونا

اصحاب شمال دنیا میں نعمتوں میں سر تاپا ڈوبے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عبرت حاصل کرنے سے غافل ہیں، وہ لوگ جسمانی راحت اور سکون پانے کے لیے اپنے فرائض چھوڑ دیتے ہیں، اللہ نے خواہشات کی قوت انسان کی ترقی اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اس کے جسم میں رکھی ہے، البتہ حد سے زیادہ کھانا پینا اور دیگر خواہشات کی تکمیل اور حصول ان کو فرائض سے غفلت برتنے اور ترک کرنے کی بنیاد فراہم کرتے ہیں، اس لیے انہوں نے خواہشات کی قوت جو کہ ترقی اور کمال کا ذریعہ ہوسکتی تھی، اپنے زوالہ استعمال کی:

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ ۖ	ان پر (ہر طرف سے) آگ بند کی جائے گی (۲۰)

جنہوں نے کفر کیا اور ان احکام کو پس پشت ڈال دیا، خدا کو تسلیم نہیں کیا اور اس پر ایمان نہیں لائے، اور نیک عمل نہیں کیے اور اللہ کے بندوں پر رحم نہیں کیا، یہی لوگ شقی اور بدبخت ہیں، ان پر ایسی آگ مسلط کی جائے گی کہ جس کے دروازے اونچے ہوں گے کہ اس سے باہر نہیں نکل سکیں گے، اور یہ لوگ سختی و مصیبت میں رہیں گے۔

صبر کی اہمیت اور مقام

صبر واضح ترین انسانی اخلاقیات میں سے ایک ہے، علماء کہتے ہیں کہ صبر اسلامی اخلاقیات کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے، باقی تمام طرز سلوک

اسی کے گرد گھومتا ہے اور صبر ہی اس کا منبع ہے، اور اگر ہم انسانی خوبیوں میں سے ہر خوبی پر پوری توجہ دیں تو ہم پوری وضاحت کے ساتھ پائیں گے کہ: اس کی بنیاد اور مرکز صبر ہے۔

انسان کو اپنی زندگی کی راہ میں تین قسم کے صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور صبر کی تینوں قسمیں قرآن عظیم میں بیان ہوئی ہیں، جیسے:

1 - اللہ کی اطاعت میں صبر

یعنی تمام نفسانی اور شیطانی خواہشوں کے خلاف مزاحمت اور دین پر استقامت کرنا اور انتھک کوششوں کے ساتھ خدا کی عبادت اور دوسرے انسانی فرائض اور مقاصد انجام دیتے رہنا۔

2 - اللہ تعالیٰ کی معصیت کے مقابلے میں صبر کرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ روح کو گناہ کی دلدل میں گرنے اور اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں اور احکام کی نافرمانی سے بچانا۔

3 - زندگی کے دردناک واقعات کے مقابلے میں صبر کرنا

یعنی اس حقیقت کا ادراک کرنا کہ زندگی کا ایک رخ اداسی اور دوسرا رخ خوشی کا ہے، مصیبت کے وقت انسان کو نا امید نہیں ہونا چاہیے، بلکہ خود کو خدا کے حوالے کرنا چاہیے، جو کچھ اس نے چاہا ہے اس پر راضی ہو، یہ صبر کی تیسری صورت ہے جس کا ذکر قرآن میں بکثرت آیا ہے، جو صبر اس طرح کا نہ ہو تو اس کا کوئی ثواب ہے نہ کوئی قدر، خدا نے قرآن میں صرف ان لوگوں کی توصیف کی ہے جو اس کی رضا کی خاطر صبر کرتے ہیں اور مستقبل کے کامیابی کو ان کے لیے بتایا ہے: یہ بات ذہن میں رہے کہ تینوں قسم کے صبر کا محرک رب کی رضا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ خود رب تعالیٰ نے فرمایا ہے: (وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ)، (وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ) (رعد: 22)

صبر کا لغوی معنی:

روکنا اور حفاظت کے معنی میں ہے، صبر جمیل وہی صبر ہے جس میں آہ و

فغان اور واویلا نہ ہو: (فَصَبِّرْ جَمِيلٌ) (سورہ یوسف: ۱۸) (اس لیے خوبصورت صبر کو اپنائیں) یہ بات قابل ذکر ہے کہ "صبور" پروردگار کے ناموں میں سے ایک ہے۔

اصطلاح میں:

علماء صبر کی اصطلاحی تعریف میں فرماتے ہیں: صبر خدا کی کتاب قرآن عظیم اور رسول خدا کی سنت کے احکام پر استقامت اور ثابت قدمی ہے۔

قرآن کریم جنت میں داخل ہونے کی چابی کو صبر کہا گیا ہے، علماء فرماتے ہیں: ایمان کا معیار، انسان کی زینت صبر ہے، اور عظمت تک اس کے پہنچنے کا راستہ صبر ہی ہے، انسان صبر سے سکون پاتا ہے، اور صبر کی سرزمین میں مکمل آسانی حاصل کر لیتا ہے، قرآن کریم میں لفظ صبر ستر مرتبہ سے زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔

صبر کے مقام اور مرتبہ کے بارے میں یہی کافی ہے کہ ہمارے عظیم رب نے سورہ زمر کی آیت "۱۰" میں فرمایا: (إِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ) (○) ترجمہ: "جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے حساب ثواب ملے گا"

ایک مخلص مسلمان آزمائشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرتے وقت جو سب سے بہتر کام کر سکتا ہے وہ ہے صبر، اور اللہ کے فیصلوں کے سامنے خدا کے اجر و ثواب کا انتظار۔

اگر انسان کا صبر شہوت کے خلاف ہو تو اسے "عفت" کہتے ہیں، اگر انسان کا صبر ناخوشی کو برداشت کرنے کے لیے ہو تو وہ "قناعت اور خدا کے سامنے سر تسلیم خم" کرنا ہے۔

اگر صبر نعمتوں اور شکر کے لیے ہو تو اسے ضبط نفس اور حکمت کہا جائے گا اور اگر صبر مقدس جہاد میں ہو تو اسے "شجاعت" کہا جائے گا، اگر انسان کا صبر دوسروں کی حماقت اور بدتمیزی کے خلاف ہو تو اسے "برداشت اور حلم" کہا جائے گا، اور اگر دوسروں کے راز چھپانے کے لیے ہو تو اس کا مالک "امین اور سچا" کہلائے گا، اور اگر کسی شخص کا صبر زندگی میں زیادتیوں کے خلاف ہو تو اسے "زہد" کہتے ہیں، یہی منطق ہے کہ صبر نہ کرنے والا اپنی زندگی کمزور اور بے اختیار ہو جائے گا اور کسی دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

حساب و کتاب سے پہلے جنت میں جانا

روایت ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ اپنے اعمال کے حساب و کتاب کے لیے جمع ہوں گے، ایک منادی پکارے گا: صبر کرنے والے کہاں ہیں؟ تاکہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں۔

لوگوں کا ایک گروہ کھڑا ہوگا، فرشتے اس کو دیکھ کر کہیں گے: کہاں جارہے ہو اے آدم کے بیٹو؟

کہیں گے: جنت، فرشتے کہیں گے: حساب سے پہلے؟

کہیں گے: جی ہاں، فرشتے ان سے پوچھیں گے: تم کون ہو؟ کہیں گے: ہم صابریں ہیں۔

فرشتے پوچھیں گے: آپ لوگوں کا صبر کیا تھا؟

کہیں گے: خدا کی اطاعت پر ہم نے صبر کیا، خدا کی معصیت اور گناہ کے مقابلے میں صبر کرتے رہے جب تک اللہ نے ہمیں موت دی۔

فرشتے کہیں گے: آپ لوگ ایسے ہی ہو جیسے کہتے ہو، جنت میں داخل ہو جائیں کیا ہی اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔

خدا جل جلالہ اس بارے میں فرماتے ہیں: "إِنَّمَا يَوْفِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (سورہ زمر: ۱۰)

لوگوں کے ساتھ صبر اور حوصلہ

ابو سعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں، کہ اللہ کے نبیوں میں سے ایک نبی کا قصہ سنا رہے تھے کہ اس نبی کو لوگوں نے مارا پیٹا اور اس کے جسم کو خون سے آلود کر دیا، اور جب وہ اپنے چہرے سے خون پونچھ رہے تھے کہا: (اللهم اغفر لقومي، فإنهم لا يعلمون) (متفق علیہ) ترجمہ: "اے میرے رب: میری قوم کی غلطیوں کو معاف فرما کیونکہ وہ نادان ہیں۔"

ایک دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ تھے، کہ زید بن سعنہ نام کا ایک یہودی شخص آپ کے پاس آیا اور اپنے قرض کا مطالبہ کیا، اس نے آپ کی قمیص اور عبایا پکڑی اور غصے بھرے چہرے کے ساتھ آپ

کی طرف دیکھا اور بولا: اے محمد کیا تم میرا حق نہیں دیتے ہو؟ آپ سے سخت اور جارحانہ انداز سے بات کی، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہودی کی اس حرکت سے بہت زیادہ غصہ ہو گئے، شدید غصے کی وجہ سے ان کی آنکھیں گھومنے والے جھولے کی طرح گھوم رہی تھیں اور کہا: اے اللہ کے دشمن! کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح بات کرتے اور جارحانہ انداز اختیار کرتے ہو، اس خدا کی قسم جس نے ان کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر اس کی ملامت کا خوف مجھے نہ روکتا تو میں ابھی تمہارا سر تن سے جدا کر دیتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سکون اور اطمینان سے عمر کی طرف دیکھا اور فرمایا: میں اور یہ معزز آدمی اس رویے کے علاوہ کے محتاج ہیں، تمہیں مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض اچھی طرح چکا دوں، اور اسے اپنا حق اچھی طرح سے مانگنا چاہیے، اے عمر! جاؤ اس کا قرض ادا کرو اور اسے بیس (۲۰) اضافی کپ کھجوریں دیدو۔

زید یہودی کہتا ہے: جب عمر نے ۲۰ کپ کھجوریں بڑھا کر دیں، تو میں نے کہا: یہ زیادہ کیا ہے؟

حضرت عمرؓ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ تیری دشمنی اور بغض کے مقابلے میں بیس (۲۰) کپ بڑھا کر دوں۔

زید نے کہا: اے عمر مجھے جانتے ہو؟ عمر نے کہا: نہیں تم کون ہو؟ اس نے کہا: زید بن سُنَّہ، عمر نے کہا: زید پڑھا لکھا یہودی عالم؟ کہا: جی ہاں، عمرؓ نے کہا: کس چیز نے تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدتمیزی پر آمادہ کیا اور بُرا بھلا کہا؟

زید نے کہا: پیغمبری کے تمام علامات میں محمد میں دیکھتا تھا، دو چیزوں کے علاوہ:

- 1- کہ کیا ان کا غصہ اس کے بردباری پر غلبہ پاتا ہے؟
- 2- اور کیا اس کے سامنے شدید جہالت اسے مزید بردبار ہونے پر آمادہ کرتی ہے، میں نے چاہا کہ اس کا امتحان لوں، اب تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں: (رضیت باللہ رباً وبالاسلام دنیاً ومحمد نبیاً) ترجمہ: "میں اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہوں"

اور تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے کل مال و دولت کا آدھا حصہ امت محمد کے مسلمانوں کے لیے بخش دیا۔

عمرؓ نے کہا: لیکن مال کی یہ مقدار ان کے لیے کافی نہیں ہوگی، اس مال کو ان میں سے بعض کے لیے بخش دیا۔

پھر زید یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آگیا اور کہا: (أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمداً عبده ورسوله) ترجمہ: "گواہی دیتا ہوں میں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہے"

اس طرح اس پر ایمان لایا اور تسلیم کیا، (حاکم نے المستدرک میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے)

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة الشمس

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اس کی ۱۰ آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

یہ بات قابل ذکر سمجھتا ہوں کہ: قرآن کریم میں بعض موضوعات ایک قسم کے ساتھ آئے ہیں۔

مثال کے طور پر: "وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ" اور بعض حالات میں دو قسمیں پے در پے آتی ہیں جیسے: "وَالضُّحَىٰ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ"۔

اور بعض مواقع پر تین قسمیں یکے بعد دیگرے آئی ہیں: "وَالْعَدِيتِ ضُبْحًا فَالْمُورِيَّتِ قَدْ حَا فَالْمُغِيرَتِ ضُبْحًا"۔

اور بعض حالات میں چار قسم مسلسل آتی ہیں، جیسے: "وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ"۔

اور بعض مرتبہ پانچ قسمیں لگاتار آئی ہیں، جیسے: "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ"۔

لیکن قرآن کریم میں سب سے زیادہ قسمیں یکے بعد دیگرے اسی سورہ مبارک شمس میں آئی ہیں کہ جن کی تعداد گیارہ مسلسل قسموں تک پہنچتی ہے کہ ان میں سے: سورج اور چاند، دن اور رات، آسمان اور زمین، نفس کی پاکی کی قدر اور اہمیت کی تاکید کی گئی ہے۔

سورہ شمس کو اس نام سے مسمیٰ کرنے کی وجہ:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کریم کی سورتوں کے نام وحی کے ذریعے متعین ہو گئے تھے۔

بعض مواقع پر محدثین اور مفسرین نے سورتوں میں موجود مناسبتوں کی وجہ سے اس سورہ کو دوسرے نام بھی دئیے ہیں، اس بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی سورتوں کے ناموں میں مختلف اعتبارات کو مدنظر رکھا گیا ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

الف: سورہ کا نام رکھنا سورت کے پہلے لفظ یا الفاظ اور ان کے معانی کی بنیاد پر، جیسے سورہ برائت "توبہ" یا سورہ قل هو اللہ "توحید"۔

ب: سورہ کا نام رکھنا اس نام کی بنیاد پر جو اس سورہ میں آیا ہے۔

ج: ایک خاص موضوع کی بنیاد پر نام رکھنا جو اس سورت میں آیا ہے اور باقی سورتوں میں نہیں ہے، بلکہ اس سورت میں زیادہ وسیع اور مکمل انداز میں پیش کیا گیا ہے، (الاتقان، جلال الدین، جلد: ۱، صفحہ ۱۱۸ کے بعد نشر دارالکتب العلمیہ)

سورة الشمس کا نام بھی مندرجہ بالا احتمالات میں سے ایک کی وجہ سے ہے، یعنی کہ یہ سورہ لفظ قسم "الشمس" کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔

سورة الشمس کا سورہ البلد سے ربط و مناسبت

سورہ "شمس" نے سورہ قدر کے بعد مکہ میں شرف نزول پایا۔

مفسرین سورہ شمس کے سورہ بلد کے ساتھ ربط و تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

الف: سورہ بلد کا اختتام اہل سعادت (اصحاب میمنہ) اور اہل شقاوت (اصحاب مشئمہ) کے تعارف کے ساتھ ہوا، اور یہ سورت بھی دو گروہوں کو واضح طور پر بیان کرتی ہے (ملاحظہ فرمائیں: آیہ مبارک: ۹، ۱۰)

ب: سورہ بلد کے آخر میں کفر اختیار کرنے والوں کی واپسی اور انجام کی وضاحت کی گئی اور سورہ شمس کے آخر میں بھی بعض کفر اختیار کرنے والوں کی دنیاوی سزاء مذکور ہوئی ہے۔

سورہ شمس کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس سورت کا نام "الشمس" سورج ہے جو کہ پہلی آیت سے لیا گیا ہے، اس سورت کا ایک (۱) رکوع، پندرہ (۱۵) آیتیں، پچاس (۵۰) الفاظ، دو سو سینتالیس (۲۴۷) حروف اور ستانوے (۹۷) نقطے ہیں۔

(واضح رہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورہ شمس کا موضوع اور فضیلت

یہ سورت دراصل "تزکیہ نفس" یعنی دلوں کو ناپاکیوں اور نجاستوں سے پاک کرنے والی ہے، اگر انسان بدبخت بن جاتا ہے تو اس کو چاہئیے کہ اس شقاوت اور بد بختی کی وجوہات کو اپنے اندر تلاش کرے، اگر وہ حقیقی سعادت اور خوش نصیبی تک پہنچنا چاہتا ہے تو اس کو چاہئیے کہ اس سعادت کے لوازم اپنے اندر پیدا کرے۔

سورت کا خلاصہ اس مفہوم کے گرد گھومتا ہے تاہم، سورت کے شروع میں گیارہ اہم موضوعات مذکور ہیں جو عالم تخلیق سے ہیں، اور خدا کی پاک ذات نے اس معنی کو ثابت کرنے کے لیے کہ فلاح اور نجات روح کی تطہیر پر منحصر ہے ان اشیاء کی قسم کھائی ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا قرآن کریم میں کئی چیزوں کی قسمیں ایک ساتھ کھائی گئی ہیں۔

سورہ شمس نفس کو پاک نہ کرنے کے نتائج کی دو حصوں میں وضاحت کرتی ہے:

پہلے حصے میں (آیات: ۱ تا ۱۰) نفس کو تزکیہ نہ کرنے کے انفرادی نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس بیان میں مظاہر پر قسم کھا کر جیسے: سورج اور چاند، رات اور دن، آسمان اور زمین جو باہمی خصوصیات کے حامل ہیں، اور انسانی روح جس کی دو مختلف حالتیں فجور اور تقویٰ ہیں اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہیں کہ انسان کی نجات نفس کی پاکیزگی پر منحصر ہے، اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ نہ کرے تو ابدی فلاح و کامیابی سے محروم رہے گا۔

دوسرے حصے میں (آیات: ۱۱ تا ۱۵) انسانی نفس کے تزکیہ نہ ہونے کے اجتماعی نتائج کے ساتھ خاص ہیں اس بیان میں قوم ثمود کے مہذب اور ترقی یافتہ لوگوں کی سماجی فساد کے پھیلاؤ کی وجہ سے تباہی کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتے کی تصدیق کی گئی ہے کہ ان کی منحوس حالت اور خراب قسمت اس حقیقت کی وجہ سے تھی کہ قوم ثمود نے (پیغمبر کے بجائے) ایک فاسد اور گمراہ شخص کی پیروی کی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کیا تھا۔

سورة الشمس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا ۝۳ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝۴ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا ۝۵ وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝۷ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝۸ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ رَزَقَهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۝۱۱ إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۝۱۳ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۝۱۴ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ يَذُنُّهُمْ فَمَا رَاقَاهَا ۝۱۵ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۝۱۶

سورت کا مختصر ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ۝۱	افتاب اور اس کی روشنی کی قسم (۱)
وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۝۲	اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے (۲)
وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا ۝۳	اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو ظاہر کر دے! (۳)
وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝۴	اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لے (۴)
وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا ۝۵	اور آسمان اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا (۵)
وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا ۝۶	اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا (۶)
وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝۷	اور قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے ٹھیک بنایا (۷)
فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝۸	پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کردی (۸)

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝	یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنا نفس پاک کر لیا (۹)
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝۱۰	یقیناً وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے دبا دیا (۱۰)
كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۝۱۱	قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب (پیغمبر) کو جھٹلایا (۱۱)
إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا ۝۱۲	جب اس کا سب سے بڑا بدبخت اٹھا (۱۲)
فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۝۱۳	تو ان سے اللہ کے رسول نے کہا اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری (کا خیال رکھو) (۱۳)
فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوها ۝۱۴ قَدْ مَدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذُنُوبِهِمْ فَسَوَّاهَا ۝۱۵	مگر انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا اور سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا
وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۝۱۶	اور وہ اس (سزا) کے انجام سے نہیں ڈرتا (۱۵)

سورت کی تفسیر:

اس مبارک سورت میں سزائوں کے مضامین، تزکیہ شدہ نفس اور ناپاک نفس کا بدلہ اور سرکشوں اور بُرے اعمال والے لوگوں کے نتائج کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝۱	آفتاب اور اس کی روشنی کی قسم (۱)

جب یہ دنیا کو روشن کرتا ہے اور تاریکی کو منتشر اور ختم کرتا ہے۔

"ضُحٰی" سورج جب طلوع ہونے کے بعد اوپر آجائے جب اس کی چمک اور روشنی تکمیل کو پہنچے، یا یہ معنی ہے کہ: سورج ہمیشہ روشن اور چمکتا رہتا ہے، کہ یہ معنی قرآن عظیم کے معجزات میں سے ایک معجزہ کا حاصل ہے۔

وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۝۲	اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے (۲)

اور چاند کی قسم جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے چلے (اور سورج کے نائب کے طور پر وہ چاند زمین کو اپنی روشنی پروں میں سمودیتا ہے)

"تَلَّهَا" اس کے پیچھے نکلا، اس کے پیچھے چل پڑا، یعنی دن کے وقت سورج اور رات کو چاند چمکتا ہے، یہ آیت سورج کی ایک اور چمک اور مظہر ظاہر کرتی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ چاند اپنی روشنی اور چمک کے علاوہ، جو اسے سورج سے حاصل ہوتی ہے، سورج کے گرد بھی گھومتا ہے۔

اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو ظاہر کر دے! (۳)	وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰهَا ۝۳

اور دن کی قسم جب وہ سورج کو ظاہر کرتا ہے (اور اس کی عظمت کو اپنے چہرے پر ظاہر کرتا ہے) ہاں! البتہ وہ نظروں سے محبوب ہے، اور پردے کے پیچھے ہے، ایک دن اسے ظاہر کر دے گا۔

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: یعنی یہ زمین کی وسعت کو روشن کرتا ہے اور کائنات کو اپنی روشنی سے منور کرتا ہے، (مختصر ۳/۶۴۴)

"النَّهَارِ" دن، "تَجَلَّىٰهَا" اسے روشن کر دیا، نمایاں کر دیا، "ہا" کی ضمیر سورج کی طرف لوٹتی ہے، یہ درست ہے کہ درحقیقت سورج دن کو ظاہر کرتا ہے، لیکن آیت کا صریح معنی یہ ہے کہ دن سورج کو ظاہر کرتا ہے، ایک مخفی اشارے سے سورج کی روشنی میں زمین کا دخل اور کردار ہے، کیونکہ حقیقت میں یہ سورج کے ساتھ زمین کہ روز سورج زمین پر طلوع ہوتا ہے اور روشن ہوتا ہے، بہ ہر صورت، سورج کی روشنی اور زمین پر موجود مخلوقات پر اس کے حیرت انگیز اثرات کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

"تَجَلَّىٰهَا" جلو کے مادے سے کسی غیر واضح اور مبہم چیز کو روشن اور ظاہر کرنے کا معنی دیتا ہے، یعنی خفیہ چیز کو دریافت کرنا، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک "جلیل" ہے جو اسی مادے سے ہے، یعنی وہ جس کا کام واضح اور روشن کرنا ہے۔

اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لے (۴)	وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰهَا ۝۴

اور اسے اندھیرے کے پردے کے پیچھے چھپا دے۔

"يَغْشَاهَا" سورج کو ڈھانپ لیتا ہے، "ہا" کی ضمیر سورج کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ ایک بار پھر زمین کے ایک حصے کے سورج کے ساتھ تقابل و تخالف کی وجہ سے رات سورج کے چہرے پر پردے کی طرح گرتی ہے اور سورج کو زمین کے افق میں ڈھانپ لیتی ہے۔

مفسر صاوی فرماتے ہیں: فواصل کی رعایت کرتے ہوئے فعل مضارع "يَغْشَاهَا" لایا، "غشیہا" نہیں کہا (تفسیر صاوی ۴/۳۲۱)

اور آسمان اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا (۵)	وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا ۝

احتمال ہے کہ "مَا" موصولہ ہو، اور اس طرح معنی کیا جائے: قسم ہے آسمان اور اس کے بانی کی جو کہ خدا تعالیٰ ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ "مَا" مصدریہ ہو، پھر اس طرح معنی کیا جائے گا: قسم ہے آسمان اور اس کی بناوٹ کی جو نہایت خوبصورتی اور استحکام کے ساتھ بنایا گیا ہے۔

"مَا" اس جملے میں موصولہ ہے اور اس سے مراد پروردگار کی ذات پاک ہے۔

عرب کی لغت میں موصول مشترک عاقل کے لیے "مَنْ" اور غیر عاقل کے لیے "مَا" استعمال ہوتا ہے، لیکن بعض مواقع پر ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں، (ملاحظہ فرمائیں: سورہ نساء: ۳ و ۲۲ اور سورہ بلد ۳)

یہاں لفظ "مَا" کا استعمال وصفیت کے لیے ہے، یعنی وہ عظیم الشان اور مضبوط طاقت جس کا ذکر ہو چکا اس سے معلوم ہوا کہ، لفظ "مَا" یا "مَنْ" کا استعمال خدا کے لیے یکساں ہے، کیونکہ ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک کا استعمال بشر کے ذہن اور سمجھ کے اس تصور کے مطابق ہے جو وہ خدا کے بارے میں رکھتا ہے، جبکہ خدا تو نادر العقول ہے انسانی عقل و ادراک میں اس کا تصور نہیں آسکتا۔ (ملاحظہ کریں جزء عمہ شیخ محمد عبدہ)۔

اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا (۶)	وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا ۝

قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے زمین کو بچھایا اور پھیلا دیا، اس کے گول ہونے اور تیز گردش کے باوجود، اس نے اسے انسانوں کی زندگی اور پودوں کی ہریالی اور نشوونما کے لیے پھیلا دیا اور بڑھایا ہے۔

"طَّا" چلایا، پھینکا، گرایا، پھیلا دیا یہ لفظ سورہ نازعات آیت (۳۰) میں "دَحَا" کے ہم معنی ہے، دال کو طاء سے بدلنا جائز ہے (ملاحظہ کریں لسان العرب، روح البیان، کبیر)۔

زمین کی کڑوی یعنی گیند کی طرح گول ہونے اور وضعی اور انتقالی حرکت کی طرف اشارہ ہے:

اور قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے ٹھیک بنایا (۷)	وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّيْنَاهَا ۝

اور قسم انسان کی روح کی اور اس کی جس نے اسے بنایا اور اسے منظم کیا، (اس کی روحانی صلاحیتوں اور جسمانی قوتوں کو منظم کیا)۔

"نَفْس" خود انسان، اس سے مراد انسان کی انسانیت ہے جو روح حیوانی اور جسم کے علاوہ ہے اور جو حیرتوں اور رازوں سے بھری ہوئی ہے، لفظ نَفْس کا نکرہ لانا، یہ اشارہ ہوسکتا ہے ناقابل تصور عظمت اور اہمیت کی طرف جو انسانی علم سے ماورا ہے، تخلیق کی دنیا کا یہ عجوبہ اور شاہکار جسے سائنسدانوں نے بجا طور پر "نامعلوم موجود" کہا ہے، (یعنی جسم اور حیوانی روح کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانیت کھاجاتا ہے، یہاں نفس سے وہی مراد ہے۔

"سَوَّيْنَاهَا" اسے بنایا اور برابر کیا، اس طرح اس نے انسانی جسم کے ہر عضو کو ایک کام کے لیے اور اس کی ہر قوت کو ایک مقصد کے لیے بنایا اور جسم کی علامت اور بناوٹ اور اس کے تناسب کا لحاظ رکھا، (مراجعہ فرمائیں سورہ: قیامہ آیہ ۳۸، سورہ کہف آیہ ۳۷، سورہ انفطار ۷)۔

پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کردی (۸)	فَالْهَمَّهَا فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝۸

اسے گناہ سے بچنے اور تقوی اختیار کرنے کی سمجھ دی ہے، (اور اس کو وحی کے ذریعے کھائی اور راستہ، اچھائی اور بُرائی دکھادی ہے) ابن عباسؓ

فرماتے ہیں: بھلائی اور بُرائی، فرمانبرداری اور گناہ اس کے لیے واضح کر کے بیان کر دیا ہے، اور اسے سکھادیا ہے کہ کیا چیز مناسب ہے اور کیا چیز پرہیز کے لائق ہے۔

"اَلْهَمَّ" الہام کیا ہے، دکھایا ہے، سمجھایا ہے، "فُجُورَ" گناہ اور معصیت کی طرف رحجان، حق اور حقیقت سے کنارہ کشی، (معجم الفاظ القرآن الکریم)

اس سے مراد بُرائی اور گناہ کا راستہ ہے، فُجُورِ ثلاثی مجرد کا مصدر ہے جیسے جُلوس و قُعود۔

"تَقْوَى" پرہیز، اس سے مراد خیر اور حق کا راستہ ہے، (مراجعہ فرمائیں: سورہ بلد: ۱۰)

مفسرین کہتے ہیں: خدا نے سات چیزوں کی قسم کھائی ہے، یعنی: "سورج، چاند، رات، دن، آسمان، زمین اور انسانی جان کی" اپنی عظیم قدرت کو ظاہر کرنے، اور ربوبیت اور الوہیت میں اپنی وحدانیت بتانے کے لیے قسم کھائی ہے، ان چیزوں کے فائدے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، تاکہ یہ ثابت کرے کہ کسی بنانے والے نے اسے بنایا ہے اور کسی مدبّر نے اس کی حرکات و سکنات کو ترتیب دیا ہے۔

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں: چونکہ سورج محسوسات میں سے سب سے بڑا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی چار صفات ذکر کی ہیں جو اس کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں، اس کے بعد اللہ نے اپنی پاک ذات کا تذکرہ فرمایا اور اسے تین صفات کے ساتھ بیان کیا تاکہ عقل و دانش اس کی شان و عظمت کو ٹھیک طرح سے سمجھ سکے، اور اس طرح عقل کو حواس کی دنیا کی تہ سے لے کر اپنی عظمت کی وسعتوں کی بلندیوں تک لیجائے، (صفوة التفاسیر)

یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنا نفس پاک کر لیا (۹)

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهُ ۝

(ان سب چیزوں کی قسم) وہ شخص نجات اور کامیابی حاصل کرے گا جو اپنے نفس کو (نیک اعمال اطاعت اور عبادت کر کے اور گناہوں اور ممنوعات کو چھوڑ کر) پاک کرے (اور اسے انسانی شناخت دے کر ترقی دے اور بڑھائے)۔

"قَدْ أَفْلَحَ" یقیناً کامیاب ہے، کامیاب ہوا، گیارہ قسموں کا جواب ہے، (ملاحظہ

فرمائیں: المصحف المیسر، صفوة التفاسیر، روح المعانی

"زُكِّي" پاک رکھا، اس سے مراد ہے کہ روح کو، اوامر کے انجام دہی اور نوابی کے ترک کے ذریعے پاک کیا جائے اور اسے سنوارا جائے (مراجعہ کریں: سورہ: بقرہ: 129 و 151، سورہ توبہ: 103، سورہ نازعات: 18)

اس کا مقصد تقویٰ اور اطاعت کا جذبہ پیدا کرنا اور انسانی شخصیت کو ظاہر کرنا اور نیکی اور نیک اعمال کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے، یہ تزکیہ کے مصدر سے تطہیر اور تَنَمِیہ (نشوونما) کے معنی میں ہے (اس کی تفصیل آپ تفسیر: روح المعانی میں قرآن کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔

واضح رہے کہ ایک پاک اور باشعور انسان معاشرے میں تبدیلی کا ذریعہ بن سکتا ہے، اور معاشرے کو ترقی، شجاعت، ہمت، تشخص، علم اور وحدت دیتا ہے، جیسا کہ ایک ناپاک اور غیر مہذب انسان اپنی خواہشات کے حصول کے لیے قوموں کو فساد، تباہی اور تنزل کی طرف لے جاتا ہے۔

قرآن عظیم میں انسانوں کی نجات کے لیے دو اعمال تجویز کیے گئے ہیں: ایک ایمان اور دوسرا تزکیہ۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهٖ ۝۱۰	یقیناً وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے دبا دیا (۱۰)

اور جو اپنے نفس کو چھپاتا ہے حالانکہ وہ چھپانے کی چیز نہیں، چھپانے کی مستحق نہیں، بلکہ ظاہر کرنے کا مستحق ہے، اور اسے ذلیل کرتا ہے، اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ اسے برائیوں سے آلودہ کر کے اور عیوب کے قریب کر کے اور گناہوں کے ارتکاب سے اور ان صفات کو ترک کرنے سے ہوتا ہے جو روح کو کامل بناتی ہیں، اور اس کی نشوونما کرتی ہیں، اور ان صفات کے ساتھ ملنا جو روح کو آلودہ کرتی ہیں (جو شخص ایسا کرے وہ ناکام اور نقصان اٹھانے والا ہے)۔

"قَدْ خَابَ" خاب: خَبِیَّة سے ہے، مکمل نا امید اور ناکام ہو گیا، وہ یقینی طور پر مطلوبہ مقصد تک نہ پہنچ سکا، محروم اور بے کار ہو گیا (مراجعہ فرمائیں: سورہ: آل عمران: ۱۲، ابراہیم: ۱، سورہ طہ: ۶۱ و ۱۱)

"دَسَّى" چھپایا، آلودہ کر دیا، از مصدر تَدَسَّى: بہ معنی نقص اور اخفاء کے ہے،

یہ صلاحیت کو ناکارہ اور بند کرنا ہے، در اصل "دَسَسَ" "دَسَّ" مٹی کے نیچے کسی چیز کو چھپانا ہے، اور مضاعف کا دوسرا حرف "ی" سے بدل گیا ہے، "تَقَضَّضَ" اور "تَظَنَّ" جیسے کہ یہ تقَضَّی اور تَضَّی بھی پڑھے گئے ہیں۔

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ضروری صلاحیتیں، اور بیدار ضمیر، اچھی اور بُری چیزوں کی سمجھ، سعادت کے راستے پر چلنے کے لیے عطا کی ہیں، چنانچہ ان کو ضائع کرنے یا بے ثمر چھوڑنے کا حساب انسان سے ہوگا۔

گَذَّيْتُ مُمُودًا بِطُغْيَانٍ ۝۱۱	قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب (پیغمبر) کو جھٹلایا (۱۱)

قوم ثمود نے اپنی سرکشی، نافرمانی، تکبر اور حق قبول کرنے سے انکار اور اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے اسے جھٹلایا۔

"طُغْيَانًا" طغیان، سرکشی، اس کا مطلب ہے مقررہ حدود الہی سے تجاوز کرنا، اور اس کے حکموں کی نافرمانی کرنا جو نفس کا سب سے بڑا گناہ ہے۔

"بِطُغْيَانٍ" اپنی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے، یا ان کی سرکشی اور نافرمانی۔

"مُمُودًا" پتھر والے جنہوں نے اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کو جھٹلایا، ثمود صالح علیہ السلام کا مشہور و معروف قبیلہ ہے، چونکہ ان کے گھر اور عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی تھیں اس لیے انہیں "اصحاب حجر" کا خطاب ملا، پچھلی آیات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مثال کے طور پر قوم ثمود کا ذکر فرمایا۔

إِذَا نَبَعَتْ أَشْقَىٰ ۝۱۲	جب اس کا سب سے بڑا بدبخت اٹھا (۱۲)

جب ان میں سے سب سے بدنصیب اٹھا اور گیا (تاکہ اونٹنی کی کونچیں کاٹ دے، اس طرح گناہ اور خطاء کا مرتکب ہو کر مجرم بن گیا) یہ بات قابل ذکر ہے کہ: گناہ پر تشویق اور ترغیب دینا اور اکسانا بھی گناہ سمجھا جائے گا۔

ابن کثیر نے کہا: اس بدبخت انسان سے مراد: "قُذَار بن سالف" ہے۔

"اُنْبَعَثَ" اُنْبَعَثَ فعل بَعَث سے ہے، یعنی: کھڑا ہوا اور روانہ ہو گیا، جب اس قوم نے "قُدار" کو بھیجا تو "قُدار" نے ان کی تائید اور حمایت سے اونٹنی کو قتل کر ڈالا۔

حقیقت یہ ہے: مقدسات کو توڑنا بدبختی کی علامت ہے، جو چیز جتنی زیادہ مقدس ہوگی اسے توڑنے کے لیے اتنی ہی زیادہ بدبختی درکار ہو گی، جیسا کہ آیت مبارکہ میں لفظ "اشقی" اسم تفضیل ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ یا سب سے زیادہ بد بخت۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تزکیہ کی فکر میں نہیں ہے، اس بارے میں نہیں سوچتا، وہ ابتداء میں چُھپ چُھپ کر نفس کی پیروی کرتا ہے جیسا کہ آیت مبارکہ میں ہے: "وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا" پھر اس کے بعد علانیہ طور پر: "إِذَا نُبِغَتْ أَشْقَاهَا" کا ذکر کیا گیا، یہ واضح ہے کہ بُرا عمل انجام دینے میں جو زیادہ بدبخت ہے وہ بہت متحرک ہوگا۔

"أَشْقَاهَا" قبیلے کا سب سے بد بخت "قُدار بن سالف" اُٹھ کھڑا ہوا، تاکہ کونچیں کاٹ دے، اور دوسروں نے اسے نہیں روکا، تو اس لیے "قُدار" بدبختی اور بغاوت میں ہر عام و خاص کے لیے مثال بن گیا، لوگ آپس میں کہتے تھے: "فلاں قدار سے بھی زیادہ بدبخت ہے۔"

جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث میں ہے:

1 - يَا أَبَاتْرَابِ! أَلَا أُحَدِّثُكُمْ بِأَشَقَى النَّاسِ رَجُلَيْنِ؛ قُلْنَا: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: أَحْيِيرُ ثُمُودَ الَّذِي عَقَرَ النَّاقَةَ، وَالَّذِي يَضْرِبُكَ عَلَى هَذِهِ (يَعْنِي قَرْنَ عَلِيٍّ)، حَتَّى تَبْتَثَلَ هَذِهِ مِنْهُ الدَّمُ، يَعْنِي لِحْيَتَهُ (المستدرک حاکم: 4679) و (مسند احمد: 18321) و (السنن الکبریٰ نسائی: 8485) و (السلسلة الصحيحة: 1743) ترجمہ: "اے ابو تراب! (یعنی مٹی والے): کیا میں تمہارے لیے دو بدبخت ترین مردوں کی نشاندہی نہ کروں؟ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احییر ثمودی، جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور وہ آدمی جو (اے علی!) تیرے سر پر مارے گا، حتیٰ کہ تیری (داڑھی) خون سے بھیگ جائے گی"

2 - أَشَقَى الْأَوَّلِينَ عَاقِرُ النَّاقَةِ، وَ أَشَقَى الْآخِرِينَ الَّذِي يَطْعُنُكَ يَا عَلِي وَأَشَارَ إِلَى حَيْثُ يَطْعَنُ

(المعجم الكبير طبرانی: 7311) و (مسند ابویعلی موصلی: 485) و (مسند بزار: 1424) و (السلسلة الصحيحة: 1088) ترجمہ: "پہلے لوگوں میں سے بدبخت ترین شخص وہ تھا جس نے ناقہ صالح کو قتل کیا، اور بعد کے لوگوں میں سے بدبخت ترین آدمی تیرا قاتل ہے اور اس طرف اشارہ کیا جہاں وہ مارے گا۔"

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ	تو ان سے اللہ کے رسول نے کہا اللہ کی
وَسُقِيَهَا ۝۱۳	اونٹنی اور اس کے پینے کی باری (کا خیال رکھو) (۱۳)

پیغمبر خدا صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو تنبیہ کرتے ہوئے ان سے کہا: اس اونٹنی کو قتل کرنے اور کونچیں کاٹنے سے گریز کرو جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک عظیم معجزہ اور نشانی قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو جس کے دودھ سے تم پیتے اس دودھ کا بدلہ اس کے قتل کی صورت میں نہ دو اس سے چھیڑ چھاڑ مت کرو۔

صالح علیہ السلام نے ان میں پوری وضاحت کے ساتھ اعلان کیا: اس اللہ کی اونٹنی کے ساتھ کام نہیں رکھو، اس کی باری پر اسے چشمے سے پانی سے پینے مت روکو۔

"نَاقَةُ اللَّهِ": اللہ کی اونٹنی، (مراجعہ فرمائیں: سورہ اعراف: ۷۳ اور ۷۷، سورہ ہود: ۶۴، سورہ اسراء: ۵۹، سورہ قمر: ۲۷) ایک تنبیہ ہے، اور ناقہ کا لفظ مفعول بہ ہے "إِحْذَرُوا" فعل محذوف کا۔

"سُقِيَا" اس کے پانی پینے کی باری (مراجعہ فرمائیں: سورہ شعراء: آیت : ۱۵۵)

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوْهَا ۝۱۴ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمُ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَسَوَّاهُمْ ۝۱۵	مگر انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا اور سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا

انہوں نے اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کو جھٹلایا، اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور قتل کیا، تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا

اور عذاب نے ان سب کو ڈھانپ لیا ان کے سر کے اوپر سے ان پر موت منڈلانے لگی، زلزلے نے انہیں نیچے سے گھیر لیا تو وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

واضح رہے کہ: جو شخص دوسرے کے گناہ پر راضی ہوتا ہے اسے شریک جرم تصور کیا جائے گا۔

ہم نے دیکھا کہ: ایک بندے نے اونٹنی کو مارا لیکن قرآن کریم فرماتا ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اسے قتل کیا۔

"دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ" ان پر غضب کیا، سب پر عذاب مسلط کیا، ان کو کچل کر روند ڈالا، انہیں ہلاک اور نیست و نابود کیا۔

مفسر خازن فرماتے ہیں: "الدمدمة" یعنی انہیں نابود کیا اور جڑ سے اکھاڑا، یعنی ان پر ایسا عذاب مسلط کر دیا کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔

"سَوَّيْهَا" ان کو مٹی میں ملا دیا، یعنی قبیلے کے تمام افراد کو ایک جیسا عذاب دیا، چھوٹے بڑے، مالدار اور غریب میں سے کوئی بھی نجات نہیں پاسکا۔

اس کا معنی یہ ہے کہ: زمین ان پر ہموار کر دی اور ان کو مٹی میں ملا کر یکساں کر دیا، عذاب اور ہلاکت میں یکساں طور پر ان کو مبتلا کر کے ان کو ختم کر دیا۔

"فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ... فَسَوَّاهَا" ان کے گناہ کے سبب ان سب پر عذاب نازل کر دیا اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔

حضرت صالح کی اونٹنی کا واقعہ

حضرت صالح علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں گیارہ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے، حضرت صالح علیہ السلام حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے بعد تیسرے پیغمبر ہیں جو پوری قوت اور طاقت کے ساتھ بت پرستی اور طاغوت کے خلاف اپنے زمانے میں اٹھ کھڑے ہوئے، اور کئی سال تک ان کے خلاف مسلسل جنگ کی۔

حضرت صالح علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم کی دس سورتوں اور مجموعی طور پر سڑسٹھ "۶۷" آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت صالح قبیلہ ثمود میں سے ہیں اور یہ قبیلہ حضرت نوح کے بیٹے "سام" کی اولاد میں سے ہے، حضرت صالح علیہ السلام خدا کی طرف سے قوم ثمود کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے، ثمود کی قوم حجاز اور شام کے درمیان ایک پہاڑی علاقے میں آباد تھی۔

ثمود بہت زیادہ مالدار، باغوں اور وسیع و عریض زرخیز زمینوں کے مالک تھے، دنیاوی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی علاقے ان کے پاس تھے، وہ دنیا کی زندگی سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ خوشحال زندگی گزارنے والے تھے جبکہ مذہبی طور پر بت پرست تھے۔

ان کی ہدایت کے لیے، خدا نے صالح نامی ایک پیغمبر ان کے خاندان اور قبیلے سے پیدا کیا۔

خدا کی عبادت کی دعوت

حضرت صالح نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اس اکیلے خدا کی عبادت کرو کہ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا، تاکہ ان سے اور ان کے انجام سے عبرت حاصل کرو، اس لیے کہ جس عذاب کے ذریعے انہیں ہلاک کیا کہیں تم بھی اس میں گرفتار نہ ہو جاؤ، جی ہاں! قوم ثمود نے بھی پچھلی اقوام کی طرح پیغمبر کی بات سننے کے بجائے ان پر جھوٹی تہمتیں لگائیں اور بُری باتیں کیں۔

وہ کہتے تھے: کیا ہم اپنے جیسے انسان کی تابع داری کریں؟ ہم میں سے صرف اس پر کیوں وحی اُترتی ہے؟

قوم ثمود کے بت پرستوں نے جب حضرت صالح علیہ السلام کی ثابت قدمی دیکھی تو ان سے ایک معجزہ کا مطالبہ کیا، اس معجزے کے طلب کرنے سے وہ چاہ رہے تھے کہ حضرت صالح عاجز آجائے تاکہ ہمیشہ کے لیے اس سے اور اس کی باتوں سے جان چھڑائیں۔

خدا نے حضرت صالح پر وحی بھیج کر فرمایا کہ ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیج دیں گے، ایسی اونٹنی جو پہاڑی کے دل سے نکلے گی بغیر نر اور مادہ کے ملاپ کے پیدا ہو جائے گی، ایک دن لوگ اس علاقے کے چشمے سے پانی پئیں گے اور دوسرے دن اونٹنی۔

حضرت صالح نے اپنی قوم کو معجزہ دکھایا اور لوگوں کو اس کے متعلق ضروری احکام صادر فرمائے۔

حضرت صالح نے اپنی قوم سے فرمایا : اس اونٹنی کے آگے رکاوٹ نہ بنیں، چھوڑ دیں اس کو چرتی رہے، اگر کسی نے اسے تکلیف پہنچائی تو دردناک عذاب سے دوچار ہو جائیگا، ایک دن آپ لوگ اس علاقے کے کنویں سے پانی بھریں اور مویشیوں کو بھی پلائیں، اور ایک دن اس اونٹنی کو پینے دیا کریں ۔

اس طرح کچھ عرصہ گزر گیا یہاں تک کہ یہ مسئلہ ان کافروں اور مشرکوں پر بھاری ہو گیا اور انہوں نے اسے پانی سے اپنی محرومی کا سبب بھی سمجھا اور اپنی ذلت کا سبب بھی، پھر قوم ثمود کے بڑے اور مالدار لوگوں نے باہمی مشاورت شروع کی، اس اونٹنی کو مارنے کا فیصلہ کر لیا، اس کے لیے انہوں نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو سب سے زیادہ شریر اور بدکار تھا، اس کام کو انجام دینے کے لیے قدارہ ابن سالف یا قدار ابن سالف جو ایک بے رحم آدمی تھا منتخب کیا اور اسے ضروری احکامات دیے۔

ایک دن اونٹنی کے پانی پینے کی باری تھی وہ آدمی اونٹنی پر حملہ آور ہوا اور اسے قتل کر دیا، حضرت صالح علیہ السلام کو جب اس بات کی اطلاع ملی، تو انہوں نے قوم سے کہا: میں نے تم لوگوں سے نہیں کہا تھا کہ اس اونٹنی کو تکلیف اور اذیت نہ پہنچاؤ ؟

اب بہت مختصر مدت میں اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے، قوم ثمود پر جو عذاب خدا نے بھیجا وہ حیرت انگیز اور خوفناک تھا، عذاب تب نازل ہوا جب سب نیند میں تھے، کہ اچانک شدید زلزلہ نے اس علاقے کو ہلا دیا وہ نیند سے اُٹھ گئے لیکن ان کو گھروں سے نکلنے کی فرصت نہیں ملی، کیونکہ ایک شدید کڑک اور خوفناک آواز گونجنے لگی، ایک طرف زلزلہ اور دوسری طرف آسمانی بجلی نے انہیں فیصلہ کرنے کا موقع نہیں دیا، اگلے دن اگر کوئی اس علاقے میں آتا تو وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں کبھی لوگ رہتے تھے اور کوئی گھر بھی تھا، کیونکہ نہ لوگوں کے کوئی آثار تھے اور نہ گھروں کے، لیکن حضرت صالح علیہ السلام اور اللہ کے معجزہ پر ایمان لانے والوں کو نجات ملی اور زندہ محفوظ رہے۔

اور وہ اس (سزا) کے انجام سے نہیں ڈرتا
(۱۵)

وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۝۱۵

یعنی پروردگار نے اس عذاب کو نازل کیا، اپنے کام کے خاتمے اور اس کے نتائج سے ڈرے بغیر کیونکہ وہ اپنے فیصلوں میں عادل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ: عظیم پروردگار ہر چیز پر غالب ہے، اور وہ ظالموں اور حد سے تجاوز کرنے والوں کو تباہ کرنے کی پرواہ نہیں کرتا۔

ابن کثیر اس قول راجح اور اولیٰ سمجھتے ہیں، لیکن دوسرا قول ہے جس میں "ہا" کی ضمیر کونچیں کاٹنے والے کے عمل کی طرف راجع ہے یعنی: اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا اپنے عمل کے نتائج سے نہیں ڈرا۔

زمحشری پہلے معنی کی تائید میں فرماتے ہیں: خدا تعالیٰ اپنے کام کے نتائج سے نہیں ڈرتا، جیسا کہ اگر بادشاہ لوگ اپنے منصوبوں کے انجام سے ڈرنے لگیں یا کسی کو سزا دینے سے ڈرنا شروع کریں تو کبھی کسی کو سزا نہیں دے سکیں گے۔

"لَا يَخَافُ" نہیں ڈرتا۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کسی کو عذاب دینے کے نتائج سے نہیں ڈرتا کہ کوئی کچھ کہے گا یا کچھ کرے گا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ عذاب دینے کے انجام سے پشیمان نہیں ہوتا، اور اپنے کام کے نتائج "ان کے ہلاکت اور بربادی" سے وہ خوف زدہ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ سب کا پروردگار، سب کا مالک، قاہر اور قادر ہے، اور وہ اپنے بندوں سے بہت اوپر اور افضل ہے، غالب اور حکمت والا بھی ہے، حکیم ذات اپنے علم اور حکمت کی بنیاد پر سزا دیتا ہے، چنانچہ اس کے پشیمانی کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، کیونکہ ان کو پہلے تنبیہ کی گئی تھی لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔

قرآن میں قسم

قرآن عظیم جو کہ انسانی رہنمائی کی کتاب ہے، انسانوں کی تعلیم کے لیے کئی طریقوں کو مدنظر رکھتا ہے، حلف (قسم) کا استعمال بھی ان تربیتی طریقوں میں سے ایک ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قسم کھانا لوگوں میں ایک عام چیز ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے مذہب اور رسم و رواج کے مطابق قسم کھاتا ہے تاکہ کسی بات پر یقین دلایا جائے یا تاکید پیدا کی جائے یا سامعین کی توجہ زیر بحث نکتے کی طرف مبذول کروائی جائے۔

"قَسْمٌ" لغت میں حصہ، حصہ کرنا، اور "قِسْمٌ" فائدہ اٹھانے کے معنی میں ہے، (ابن منظور، محمد بن مکر، لسان العرب، بیروت، دار صادر، 1414ق، ج12، ص478)

اور "قَسَم" اصل میں "قَسامہ" سے ہے، (وہ قسم جو مقتول کے ورثاء کو کھلائی جائے) حسن و جمال کے معنی میں بھی ہے، یہ لفظ فقہی اور قرآنی اصطلاحات میں "حلف" کے لیے بطور اسم استعمال ہوا ہے۔

اس کا نام قسم رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ "قسم" کھانے والا چاہے کسی بھی حیثیت میں ہو اس چیز کی خوبصورتی سے فائدہ اٹھاتا ہے جس کی وہ قسم کھاتا ہے، (راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، بیروت، دارلعلم الدار الشامیة، 1412ق، چاپ اول، صفحہ 670)

"یمین" کو قسم کے معنی میں اس لیے لیا گیا ہے کہ عرب کے لوگ عہد اور معاہدہ کرتے وقت اور قسم کھاتے وقت آپس میں سیدھے ہاتھ کو مضبوط پکڑ کر دباتے تھے، اس لیے مجازاً اسے "یمین" کہا گیا یمین کا لفظی معنی ہے دایاں (قرشی، سید علی اکبر؛ قاموس قرآن، تہران، دارالکتب الاسلامیہ، 1384ش، چاپ چہار دہم، جلد 7، صفحہ 273)

قرآنی قسموں کی اقسام:

قرآن میں اقسام کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں ان کی درجہ بندی علماء نے درج ذیل انداز میں کی ہے:

خدا نے قرآن میں اپنی ذات کے علاوہ کئی مخلوقات پر بھی قسم کھائی ہے کہ قرآن میں ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں تو درج ذیل چیزوں کی قسم نظر آتی ہے۔

(۱) اپنی ذات کی قسم کھانا

ہمارے عظیم رب نے دس (۱۰) بار لفظ "اللہ" کی قسم کھائی ہے جیسے "تَاللّٰهِ لَئَسْأَلَنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ" (سورہ نحل آیت: ۵۶) اور چھ مرتبہ لفظ "رب" کی قسم کھائی ہے۔

(۲) فرشتوں کی قسم

"وَاللّٰزِعَاتِ غَرْقًا ۝ وَاللّٰزِعَاتِ غَرْقًا ۝... فَاَلْمَدِينَةِ اَمْرًا ۝" (سورہ نازعات آیات: ۵-۱) پیغمبر کی عمر کی قسم! "لَعَنُوكَ اِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ" (سورہ حجر آیہ ۷۲)

(۳) قرآن مجید کی قسم

"يَسَّۤٓٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝٢" (سورہ یس ۱ و ۲)

(۴) قیامت کی قسم

"والیوم الموعود" (سورہ بروج آیہ ۲)

(۵) تخلیق کے مظاہر کی قسم

جیسا کہ: سورج، ستارے، زمین، چاند، ہوا، بادل، سمندر، کشتی، انجیر اور زیتون کی قسم کھانا، مراجعہ کیا جائے: (سورہ طارق آیت ۴، سورہ شمس آیت ۱، سورہ تکویر آیت ۱۵، سورہ شمس آیت ۶، سورہ انشقاق آیہ ۱۸، سورہ ذاریات آیہ ۱ و ۲، سورہ طور آیہ ۶، سورہ ذاریات آیہ ۳، سورہ تین آیہ ۱)

(۶) مختلف وقتوں کی قسم

صبح صادق، چاشت، عصر، غروب آفتاب، دن اور رات، مراجعہ کیا جائے: (سورہ فجر آیہ ۱، سورہ شمس آیہ ۱، سورہ عصر آیہ ۱، سورہ انشقاق آیہ ۱۷، سورہ شمس آیہ ۴، سورہ تکویر آیہ ۱۷)

(۷) مقدس اماکن کی قسم

جیسے مکہ، کوہ طور، بیت المعمور، مراجعہ فرمائیں سورہ: (بلد آیت: ۱ و ۳)

(۸) دیگر اشاء کی قسم مثلاً

انسانی ضمیر کی قسم، قلم اور تحریر، لڑنے والے انسان کی، جفت اور طاق کی، رجوع فرمائیں: (سورہ شمس آیہ ۱۷، سورہ قیامت آیہ ۲، سورہ قلم آیہ ۱، سورہ عادیات آیہ ۱ تا ۵، سورہ فجر آیہ ۳)

قسم کی وجوہات:

البتہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کی قسمیں یا تو ایسی چیز کے بارے میں ہیں جن پر انسان کا اعتقاد ضروری ہے جیسے: خدا کی وحدانیت، قیامت کے وقوع پذیر ہونے، انبیاء کے مبعوث ہونے، پیغمبر اسلام کی نبوت اور خدا کے وعدے کی سچائی پر قسم کھانا، یا انسان کی حالتوں اور مزاجوں پر تاکید کرنا ہے، جیسے انسان کو بہترین شکل میں تخلیق کرنے کی تاکید، انسان کو مصائب اور

مشکلات میں پیدا کرنا، انسان کے لیے محافظوں اور نگرانوں کا وجود، انسان کے زیاں کار ہونے کا ذکر کیا۔

خدا کی قسم اور انسان کی قسم میں فرق

مفسرین اس بارے میں لکھتے ہیں: خدا کی قسموں اور لوگوں کے درمیان روایتی قسموں کے درمیان فرق نے ذیل کے نکات نمایاں کیے ہیں:

۱۔ لوگ عام طور پر ان چیزوں کی قسم کھاتے ہیں جنہیں وہ مقدس یا بہت عزیز سمجھتے ہیں، ان سب کے بارے میں وہ جھوٹ بولنے پر پکڑ میں آنے یا نقصان اٹھانے سے ڈرتے ہیں۔

۲۔ لوگوں کی قسم کا اصل مقصد کچھ ثابت کرنا ہوتا ہے، جب بات کرنے والے کو یہ اندیشہ ہو کہ سننے والے اس کی باتوں پر یقین نہیں کریں گے تو وہ قسم کھا کر انہیں یقین دلانے اور ان کا شک دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، قرآن کی قسموں میں ایسا کچھ نہیں ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کسی سے یا کسی چیز سے نہیں ڈرتا، نہ اسے کسی کو یقین دلانے کے لیے قسم کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے کہ خدا کے کلام کے متعلق مؤمن کو یقین دلانے کے لیے قسم کی ضرورت نہیں ہے، جبکہ منکر اور کافر کے لیے قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

خدا کی قسمیں کیوں:

خدا کی قسموں کا ایک فلسفہ اس چیز کی اہمیت کو بیان کرنا ہے جس کی قسم کھائی ہے، خدا کی قسموں کا دوسرا فلسفہ ان مخلوقات کی اہمیت اور قدر کا اظہار ہے جس کی اس نے قسم کھائی ہے۔

قرآن کی مجموعی قسموں میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک کے بارے میں ذکر کیا ہے، جو کہ سورہ شمس کی ابتدائی آیات ہیں اور چار مواقع میں پانچ قسم کی قسمیں موجود ہیں، اور دوسرے مواقع پر چار قسم کی قسمیں پائی جاتی ہیں، تین قسمیں چھ مواقع پر اور دو قسم کی قسمیں پانچ مقامات پر ذکر ہوئی ہیں۔

اور متفرد یعنی ایک قسم سولہ مرتبہ آئی ہے یہ تعداد سب سے زیادہ ہے۔

سورہ شمس کی قسموں کی گیارہ قسمیں اور تزکیہ نفس

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں گیارہ قسمیں یاد کی ہیں، ان میں سے چار قسمیں دو بار آئی ہیں، اور تین مواقع پر منفرد آئی ہیں پہلے چار مورد درج ذیل ہیں۔

۱- وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ۝: قسم ہے سورج اور اس کے چمک کی: اس آیت میں سورج اور اس کی روشنی دونوں کی قسم کھائی گئی ہے۔

۲- وَالسَّيِّءِ وَمَا بَنَاهَا ۝: قسم ہے آسمان کی اور اس کی جس نے اس بلند و بالا عمارت کو بنایا ہے۔

۳- وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا ۝: قسم ہے زمین کی اور خدا کی جس نے اسے پھیلایا ہے۔

۴- وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝: انسان کی اور اس کے پیدا کرنے والے کی قسم۔

مندرجہ بالا چار مقامات میں کل آٹھ قسمیں موجود ہیں۔

لیکن تین مواقع جو کہ منفرد ہیں:

۱- وَالْقَبْرِ إِذَا تَلَّهَا ۝: چاند کی قسم جب سورج کے بعد نکلے۔

۲- وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّلَهَا ۝: قسم ہے دن کی جب اس کی کرنیں زمین کو منور کر دیں۔

۳- وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝: قسم ہے رات کی جب اس کی تاریکی ساری زمین کو ڈھانپ لے۔

عالم کو روشن کرنے والا سورج

سورج اور اس کی روشنی کی عظمت و اہمیت کے بارے میں، جس کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی تھی، وہ معلومات جن کی قرآن کے نزول کے وقت کسی کو خبر نہیں تھی:

الف: سورج کی چمکیلی عظمت۔

ب: سورج کا وزن۔

ج: سورج کا درجہ حرارت۔

د: سورج کے شعلے۔

ه: سورج کی کشش۔

سورج کی روشنی کے اثرات اور راز

۱- سب کچھ سورج کی روشنی پر منحصر ہے۔

۲- سورج کی روشنی سے غذائی اجناس کا پرورش پانا اور ان کا پختہ ہونا پکنا۔

۳- بارشیں اور سورج کی روشنی۔

۴- سورج کی روشنی اور ہوا کے درمیان تعلق۔

۵- سورج خوبصورتی کا منبع اور ذریعہ۔

۶- سورج کی روشنی توانائی کا مرکز۔

چاند کی قسم

الف: چاند کا حجم۔

ب: چاند کا وزن۔

ج: چاند پر زندگی۔

د: چاند کی حرکت۔

ه: چاند تک ہمارا فاصلہ۔

و: دن رات اور چاند۔

چاند کی برکتوں کا ایک گوشہ

۱- چاند، قدرتی تقویم (کیلندر)

۲- اصل مقصد یہاں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روح کی اصلاح اور تہذیب کے سبق کے ضمن میں (سورہ شمس کی گیارہ قسمیں کھا کر) توحید اور خدا کی معرفت کا سبق بھی دیتا ہے اور یہ ہمیں وجود کے آفاقی فضل کے ماخذ اور اسباب کی وجہ کا احساس دلاتا ہے، تاکہ ہم اس کو زیادہ سے زیادہ پہچان کر کمال کے اعلیٰ درجات تک پہنچ سکیں۔

انسان کی روح کی قسم

"وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّيْنَاهَا فَأَلْهَمْنَاهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا" اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں انسان کی روح اور اس کی ذات کی قسم کھائی ہے جس نے اسے پیدا کیا اور معتدل بنایا، اور آگے اس نکتے کا ذکر کرتے ہیں کہ انسان کی روح کی پیدائش پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے اس کی اچھائی اور بُرائی کی بھی تعلیم دی یعنی سعادت کے

اسباب کو بھی اس کے دست رس میں رکھا اور بدبختی، شقاوت کے عوامل کی بھی اسے پہچان کروائی۔

بالفاظ دیگر: انسان کو راستہ اور کھائی دونوں دکھادیے۔

"قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا" گیارہ قسمیں اس نکتے کی بڑی اہمیت کو بیان کرتی ہیں کہ: جس نے اپنی نفس کا تزکیہ اور آبیاری کی وہ کامیاب ہو گیا، اور جس نے اپنی روح کو گناہ سے آلودہ کیا وہ نا امید اور محروم ہو گیا۔

سعادت کیا ہے؟

(۱) سعادت کا تصور۔

(۲) اس کی اصطلاحی معنی۔

(۳) سعادت کے بارے میں ہماری سمجھ

انسانی معاشرے یعنی ہم انسانوں کی زندگیوں میں سعادت ایک اہم اور مرکزی موضوع ہے، انسانی زندگی کا ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسے کیسے پتہ چلے گا کہ خوشی کیا ہے؟ سعید اور خوشبخت کون ہے؟ حقیقی سعادت اور خوشی کیا ہے؟ اور انسان حقیقی سعادت کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ ان سوالات کے درست اور منطقی جواب تلاش کرنا ہمارے بہت سے مسائل کا یقینی حل ہو سکتا ہے، اس کے مفردات یعنی ہر ایک جواب کو معلوم ہونا یا کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، ہر قوم کی ثقافت کے لحاظ سے، سعادت کی صورت الگ ہوتی ہے، حتیٰ کہ ہر انسان کی ثقافت میں مختلف مفہوم اور تعریفیں رکھی گئی ہیں، ہر انسانی گروہ اور فرقے نے سعادت کی تعریف اپنی خصوصیات اور ذوق کے مطابق کی ہے اور اس کے مفہوم کے بارے میں اپنی الگ سمجھ ہے۔

لفظ "سعادت" یا "خوشبختی" کا لغت میں علماء نے ترجمہ "سعادت اور خوشی" کا کیا ہے، علماء سعادت کی تعریف میں کہتے ہیں: سعادت مختلف مادی اور روحانی قوتوں کا صحیح، بھرپور اور جائز استعمال ہے وہ قوتیں جو خدا نے انسان کے قبضے اور صوابدید میں رکھی ہیں۔

اس مفہوم کو قرآن عظیم نے اپنی خاص خوبصورتی کے ساتھ اس طرح متعارف کرایا ہے: "وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۚ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۚ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۚ" آیات مبارکہ کے مفہوم سے واضح ہے کہ: انسان کی کامیابی کا دارو

مدار نفس کے تزکیہ پر ہے اور "فلاح" وہی سعادت اور نفس انسانی کی تکمیل ہے کہ انسان کے لیے مشکلات کا سبب ہے، "فوز" وہ مطلوب ذاتی ہے جسے "سعادت" کہا گیا ہے۔

اگر ہم انسانی تخلیق کی حکمت اور فلسفہ کا جائزہ لیں تو ہمیں واضح طور پر سمجھ آجائے گا کہ دنیا کی تخلیق کا مقصد انسان کو کمال فضیلت اور سب سے اعلیٰ ترین کمال انسانی تک پہنچانا ہے، اس منطق کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان فطرتاً کمال کی جستجو کرنے والی مخلوق اور سعادت کا طالب پیدا کیا گیا ہے، اس لیے تمام انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی گمشدہ سعادت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان سعادت کی بلندی تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اور ذرائع تجویز اور مہیا کرتا ہے۔

کچھ لوگ ظاہری لذت تک رسائی کو خوشی اور سعادت کا مقصود سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے لوگ باطنی لذتوں کو خوشی اور سعادت کا مطلوب سمجھتے ہیں۔

ابن سینا نے سعادت کا معنی کیا ہے یک جہت اور ہم آہنگ انداز میں انسانی صلاحیتوں کا نشوونما جو انسان کو کمال کی طرف لے جاتا ہے، (رسالہ سیمای خوشبختی، نوشتہ حمید رسائی، صفحہ ۱۷)

اسی طرح علماء کہتے ہیں کہ دو خصوصیات (سعادت اور شقاوت) میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص معنی ہے۔

مثال کے طور پر: "روح" کی اپنی خاص سعادت اور شقاوت ہے، اور "جسم" کی اپنی خاص سعادت اور شقاوت ہے، اس منطق کے مطابق قرآن عظیم نے انسان کو جسم اور روح کے مرکب کے طور پر متعارف کرایا ہے، ابدی روح اور بدلتا جسم۔

اس بناء پر جن چیزوں کا تعلق صرف انسان کی "روح" کی سعادت سے ہے، جیسے: علم، تقویٰ اور اس کی امثال، انسانی سعادت سمجھی جاتی ہیں، اسی طرح جن چیزوں میں روح اور جسم دونوں کی سعادت شامل ہے، وہ بھی انسان کی سعادت میں شمار ہوتی ہیں جیسے: مال اور اولاد کی نعمت، بشرطیکہ اس سے بندہ خدا کی یاد کو فراموش نہ کرے اور دنیاوی زندگی کی طرف زیادہ مائل نہ ہو، نیز انسانی سعادت وہ چیز ہے جو جسم سختی اور پریشانی کا باعث

بنتی ہے، لیکن روح کے لیے سعادت سمجھی جاتی ہے، جیسے: خدا کی راہ میں جسمانی مشقتیں برداشت کرنا، اور مال خرچ کرنا۔

تاہم وہ چیزیں جو روح میں شقاوت اور تکلیف کا باعث بنتی ہیں، اگرچہ وہ جسمانی سعادت کا باعث ہی کیوں نہ ہوں ان میں کسی قسم کی سعادت نہیں ہے، جیسے وہ دنیاوی جسمانی آسائشیں جو ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کی جائیں اگرچہ وہ جسمانی لحاظ سے سعادت نظر آتی ہیں مگر چونکہ وہ خدا کی یاد بھول جانے کا باعث بنتی ہیں، لہذا خدا نے اس قسم کی لذت اور نام نہاد ناجائز جسمانی سعادت کو انسان کے لیے عذاب قرار دیا ہے۔

اسلام کا مقدس دین لوگوں کو متنبہ کرتا ہے کہ زندگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو دنیاوی آسائشوں تک محدود رکھا جائے، بلکہ دائمی اور ابدی زندگی بھی دکھوں اور آسائشوں کے ساتھ چل رہی ہے جو انسانوں کے اعمال کے مطابق ہوگی، اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ عارضی اور فانی زندگی کی سعادت کا انتخاب کرتا ہے یا ابدی زندگی کی سعادت کا۔

اس سلسلے میں دین اسلام اعتدال کا خیال رکھتا ہے، اور مادی اور روحانی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بہت اعلیٰ انسانی حدود و قیود متعین کرتا ہے، جن کی پیروی کرنے سے جو اس دین کی فطرت ہے کہ یہ دنیا اور آخرت کا دین ہے رہنمائی کرتا اور ہدایت بخشتا ہے، ان اصولوں پر عمل کرنے سے دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح اور کامیابی نصیب ہوگی۔

یہ بات یقینی ہے کہ سعادت اور خوشی ان انسانوں اور انسانی معاشروں سے تعلق رکھتی ہے جن میں ذہنی سکون زیادہ ہوتا ہے، وہ اشخاص جو سعادت اور خوشی کو دنیوی مال رکھنے میں سمجھتے ہیں تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ: مال، جائیداد اور اقتدار کسی بھی طرح خوشی کا ذریعہ نہیں ہیں، کیونکہ مال و دولت خوشحالی لاتی ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ آرام اور راحت بخش بھی ہو۔

ایک انگریز دانشور کہتا ہے: عقلمند لوگوں کے لیے دولت پریشانی اور بدبختی کا ایک سبب ہے، اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے مال کا مالک بننے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ اس کا غلام، ہمیں اپنے نفس کا امیر بننا چاہیے، نہ کہ نفس کے اسیر۔

جو لوگ دولت اور طاقت میں گرفتار ہو کر ہمیشہ اپنے آپ کو اس کا اسیر بنا چکے ہیں وہ مسلسل یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ حوادث کی کشمکش

میں وہ اپنی دولت اور جائیداد سے ہاتھ دو بیٹھیں، وہ ہر وقت اسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں، معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے لوگوں کو کوئی خوشی نہیں ملے گی، غور کرنا چاہیے اور جان لینا چاہیے کہ کفن میں جیب نہیں ہوتی (بلکہ یہ بھی نہیں پتہ کہ کفن بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں)

انسان حقیقی سعادت تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟

۱۔ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا:

سب سے پہلی چیز جس کے ذریعے انسان حقیقی سعادت تک پہنچ سکتا ہے وہ پروردگار کی رضا حاصل کرنا ہے، قرآن عظیم سورہ عصر میں ان لوگوں کو نقصان سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے جو مؤمن اور نیک اعمال والے ہیں، قرآن کریم پوری وضاحت سے بیان کرتا ہے: نیک اور مؤمن انسان لازمی طور پر فلاح اور کامیابی حاصل کریں گے۔

(إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالحَقِّ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ) اخلاقیات کے علمبردار کہتے ہیں کہ خوش نصیب وہ ہے جس کی زندگی خوشگوار ہو، اس لیے کہ خدا کی مرضی کے بغیر خوشگور زندگی نہیں مل سکتی۔

۲۔ تقویٰ اور پرہیز گاری:

حقیقی سعادت اور خوشی حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ قرآن عظیم میں سورہ شمس کی آیت نمبر ۹ میں گیارہ قسموں کے بعد بیان کیا گیا ہے: سعادت اور نجات ان لوگوں کے لیے ہے جو ہر قسم کی ناپاکی سے پاک ہوجاتے ہیں، اور بد نصیب وہ شخص ہے جو ناپاکی میں ملوث ہوجاتا ہے، آسمانی کتابوں اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے بھیجنے کی ایک وجہ کا خلاصہ اس مفہوم میں ہے، انبیاء آئے ہیں تاکہ ہم انسانوں کو زندگی گزارنے اور ابدی سعادت مند زندگی تک پہنچنے کا راستہ دکھائیں، خدا کے پیغمبر انسانوں کو نیکی اور سعادت کا راستہ سکھائیں، انبیاء کی رسالت کا ایک مقصد لوگوں کو سعادت مند زندگی میں داخل ہونے کے راستے، خوشبختی، نیکی اور نیک عمل، سچائی اور راست بازی، اخلاقی طاقت، خیر خواہی اور مہربانی سکھانا ہے۔

۳۔ پروردگار کی یاد:

سب سے اہم چیز جو انسانی روح کو سکون اور خوشی پہنچانے کا سبب بنتی ہے وہ خدا کی یاد ہے، قرآن کریم نے سورہ رعد آیت: ۲۸ میں ذکر الہی کو

روح کی خوشی اور سکون کے لیے سب سے اہم عنصر قرار دیا ہے: (الابدکر
 اللہ تطمئن القلوب) ترجمہ: "اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون ملتا ہے"

جبکہ اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے کو تنگدستی اور مصائب کا سبب قرار دیا
 ہے اور فرمایا: (وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ آغْمًى) (○۱۲۳)
 (سورہ طہ آیت: ۱۲۴) ترجمہ: "اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے
 لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی"

یاد رکھنا چاہیے کہ خوشبختی کا راز صرف خدا پر ایمان کی روشنی میں
 مضمر ہے اور بس، وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ خوشی صرف مال و دولت
 جمع کرنے تک محدود ہے ان کا یہ خیال غلط ہے۔

تجربے سے ثابت ہے کہ بے تحاشا مال و دولت کسی شخص کے لیے کبھی
 خوشی نہیں لایا، اکثر و بیشتر مواقع پر یہی مال و دولت انسانوں کے لیے بہت
 سی آفات اور بدبختی کا باعث بنتی ہے۔

۴۔ عمل صالح:

قرآن کریم نے اعمال صالحہ جیسے کہ اللہ کی راہ میں جہاد، نیکی کا حکم،
 برائی سے روکنا، اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا اور توبہ کو انسانوں کے
 لیے خوشگوار زندگی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

۵۔ علماء کرام اور نیک لوگوں سے میل جول اور ملاقاتیں:

شرعی اور دینی رہنمائی یہ ہے کہ: سب سے زیادہ خوش نصیب وہ لوگ ہیں
 جن کی صحبت اور ہمنشینی علماء کرام اور نیک لوگوں کے ساتھ ہو۔

۶۔ صالح اور نیک اولاد کا ہونا:

نیک عورت اور شائستہ گھر؛ یہ ان عوامل میں سے ہے جو انسان کو حقیقی
 خوشی تک پہنچاتے ہیں۔

حدیث شریف میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت
 ہے فرماتے ہیں: (من سعادة البرء المسلم الزوجة الصالحة والمسكن الواسع والمركب الهنيء
 والولد الصالح) ترجمہ: "ایک مسلمان شخص کی نعمتوں میں سے ایک نیک بیوی،
 ایک کشادہ گھر، بہترین سواری اور قابل اولاد ہیں۔"

محترم قارئین

خوشگوار اور بہتر زندگی کے حصول کے لیے میرا مخلصانہ، دوستانہ اور برادرانہ مشورہ یہ ہے کہ: خود سے گناہ نہ کرنے کا عہد کریں، مجھے یقین ہے کہ ہم گناہ اور نافرمانی جتنی کم کریں گے، اتنی ہی سعادت اور آسائش والی زندگی گزاریں گے: یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے باطن کو ظاہر سے زیادہ بہتر بنائیں، اچھے اخلاق اور مزاج کو زندگی میں نہیں بھولنا چاہیے، جو چیز زندگی میں مفید نہیں سمجھی جاتی اور اصل خوشی اس سے حاصل نہیں ہوتی ان چیزوں کو چھوڑ دینا چاہیے، ہمیں اپنی زندگی میں اس نتیجے پر پہنچنا چاہیے کہ جو کچھ انسان کے لیے اس دنیا میں بچتا ہے وہ آخرت میں کام آئے گا، انسان کو دنیا کے مال و متاع کا دھوکہ کھاکر ہمیشہ پیسے کی فکر میں نہیں ہونا چاہیے، اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان جتنا ہوسکے وہ محنت اور مشقت کرتا رہے تاکہ کسی کا محتاج نہ بنے، اور دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، لیکن اس سلسلے میں اعتدال اور خدا کے احکامات کا لحاظ کر کے دونوں جہانوں میں صلاح اور کامیابی کا مستحق بنے گا، اے اللہ! ہمیں دونوں جہانوں کی خوشیاں نصیب فرما۔ (آمین)

اے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اگر تو نے ہم پر رحم نہ کیا اور درگزر نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے، (ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرین)

غیر اللہ کی قسم کھانا

غیر اللہ کی قسم کھانا یا اللہ کے اسماء صفات کے علاوہ کی قسم کھانا مطلق طور پر حرام ہے، اور اس کا شمار شرک اصغر میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نے غیر اللہ کو تعظیم کے ساتھ بڑا سمجھتے ہوئے اس کی قسم کھائی تو وہ شرک اکبر کا مرتکب ہوگا، اس کی وجہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے فرماتے ہیں: (من حلف بشيء دُونَ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ) ترجمہ: "جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی یقیناً اس نے شرک کیا" (ترمذی: ۱۵۳۵) ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

لہذا ہم مسلمانوں کو اول تو قسم نہیں کھانی چاہیے اور اگر کھانی ہو تو پھر صرف اللہ یا اس کے ناموں اور صفات میں سے کسی ایک کی ہونی چاہیے۔

خدا تعالیٰ اپنی مخلوق کی قسم کھا سکتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝ وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا ۝ وَالنَّهَارُ إِذَا جَلَّهَا ۝ وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَاهَا ۝ وَالسَّمَاءُ وَمَا بَنَاهَا ۝ وَالْأَرْضُ وَمَا طَحَاهَا ۝ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝) (الشمس: ۱-۷) ترجمہ: "آفتاب کی روشنی کی قسم، اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے، اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو ظاہر کر دے!، اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لے، اور آسمان اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا، اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا، اور قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے ٹھیک بنایا"

ان آیات میں اور بہت سی دوسری آیات میں خدا تعالیٰ سورج، چاند، رات، دن وغیرہ کی قسم کھاتا ہے، جاننا چاہیے کہ فجر، شمس، لیل، جفت اور وتر وغیرہ مخلوقات کی قسم کھانا صرف اور صرف خدا تعالیٰ کے لیے خاص ہے، ہم انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مخلوق میں سے کسی بھی چیز کی قسم کھائیں، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام میں سے کسی نے بھی شمس یا فجر، لیل یو وتر وغیرہ کی قسم نہیں کھائی ہیں، اگر جائز ہوتی تو وہ ان چیزوں کی قسم کھاتے۔

البتہ رب تعالیٰ جس چیز کی چاہتا ہے قسم کھاتا ہے، خدا تعالیٰ کی ان قسموں سے مقصود اپنی نعمتوں کی یاد دہانی ہے وہ نعمتیں جیسے: سورج، دن، رات اور پہاڑ وغیرہ کہ ان سب کو اللہ نے انسانوں کے لیے پیدا فرمایا ہے، اور خدا کا ان نعمتوں پر قسم کھانے کا مقصد ہمیں اس کی یاد دہانی کرانا ہے اس بناء پر فقط ان کے خالق (یعنی خدا) اُن مخلوقات کی قسم کھا سکتا ہے نہ کہ ہم انسان جو کہ خود مخلوق ہیں، ہمیں ان کی قسم نہیں کھانی چاہیے، کیونکہ یہ خدا کے لیے خاص ہے، اللہ تعالیٰ کا ان پر قسم کھانے کا مقصد اپنے مخلوقات کو یاد دہانی کرانا ہے۔

اگر غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہوتا تو یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس سے منع کرنے کے بجائے ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے خدا کے سوا کسی اور کی قسم کھانے کو جائز قرار دیتے، جبکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (أَلَا إِنَّ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ، فَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللَّهِ أَوْ لِيَصُحَّتْ) (بخاری: 2679) (مسلم: 1646) ترجمہ: "خبردار یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آباو اجداد کی قسم کھانے سے روکتا ہے، پس جو کوئی قسم کھانا چاہے تو اس کو چاہیے کہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔"

دوسری روایت میں عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلَا يَحْلِفُ إِلَّا بِاللَّهِ) ترجمہ: "جو قسم کھانا چاہے وہ اللہ کے علاوہ کسی کی قسم نہ کھائے"

راوی فرماتے ہیں کہ: قریش اپنے آباواجداد کے نام کی قسم کھاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ) ترجمہ: "اپنے باپوں کے نام کی قسم نہ کھاؤ"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت اس موضوع کی تائید کرتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مَنْ حَلَفَ مِنْكُمْ فَقَالَ فِي حَلْفِهِ: بِاللَّاتِ وَالْعُزَّىٰ فَلْيَقُلْ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَمَنْ قَالَ لِأَخِيهِ تَعَالَ أَقَامِرَكَ فَلْيَتَصَدَّقْ) (رواہ مسلم وغیرہ) ترجمہ: "تم میں سے جس نے حلف اٹھایا اور اپنے حلف میں کہا: لات کی قسم! تو وہ لا الہ الا اللہ کہے اور جس نے اپنے ساتھی سے کہا: آؤ، جو کھیلیں تو وہ صدقہ کرے" (بخاری: ۳۸۶۰) (مسلم: ۱۶۳۸)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو جس نے لات اور عزی کی قسم کھائی ہے حکم دیا ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کہے، (یعنی: تجدید ایمان کرے) کیونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا توحید کے کمال کے خلاف ہے، اس کام میں اس قسم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے غیر اللہ کی تعظیم ہوئی ہے۔

جی ہاں! یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات ہیں کہ غیر اللہ کی قسم کھانے سے صراحتاً منع فرماتے ہیں، اگر چاند اور ستاروں کی قسم کھانا جائز ہوتا تو کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکتے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی آیات اور اس کے معانی کا انسانوں میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے تو پھر کیوں ان آیات کی روشنی میں جس میں خدا نے ان مخلوقات کی قسم کھائی ہے غیر اللہ کی قسم کھانے کے جواز کا حکم نہیں دیتے؟ العیاذ باللہ! کیا رسول اللہ نے رسالت کے معاملے میں کوتاہی کی تھی؟ یا ان کے معانی نہیں جانتے تھے؟ کیوں ان کے اصحاب کرام غیر اللہ کی قسم نہیں کھاتے تھے؟، جیسا کہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: (لَأَنْ أَحْلِفَ بِاللَّهِ كَاذِبًا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُحْلِفَ بِغَيْرِهِ صَادِقًا) (مصنف ابن ابی

شبیہ: ۱۲۲۸۱) ترجمہ: "یہ کہ خدا کی جھوٹی قسم کھانا مجھے زیادہ پسند ہے خدا کے سوا کسی اور کی سچی قسم کھانے سے"

مختصر یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں چاند، سورج، زمین، آسمان اور دیگر مخلوقات کی قسم کھائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جہاں والوں کا پروردگار اور خالق ہے اپنی مخلوق کی قسم کھاسکتا ہے، لیکن مخلوق کے لیے جائز نہیں ہے کہ دوسرے مخلوق کی قسم کھائے، صرف اللہ پر اس کے اسماء و صفات اور کلام پر قسم کھائے مثلاً کہے: "واللہ" یا "اللہ کے کلام پر" اسی طرح کی قسمیں۔

عصر کی قسم کھانے کی حکمت

(وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالحَقِّ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ)

اللہ تعالیٰ کی قسم سے کون سی عصر مراد ہے؟ کیوں عصر کی قسم کھائی ہے، عصر سے مراد زمانہ اور وقت ہے، اور اللہ تعالیٰ اس بناء پر وقت اور زمانہ کی قسم کھاتا ہے کہ وقت رات اور دن کے گزرنے کا ذریعہ ہے، اور اندھیرے اور روشنی کا پے در پے آنا اور واقعات اور معاملات رونما ہونا اور زندگی کے قیام اور فوائد اور زندوں کے مفادات وقت پر منحصر ہیں جو کہ انہیں اپنی گود میں پالتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام چیزیں ایک صانع کے وجود اور اس کی وحدانیت پر واضح دلیل ہیں۔

اس لحاظ سے خدا کا زمانے کی قسم کھانا زمانے کے شرف اور اہمیت کی دلیل ہے، اس لیے حدیث شریف میں ہے کہ: (لا تسبوا الدهر، فإن الله هو الدهر) ترجمہ: "زمانے کو گالی مت دو کیونکہ زمانے کو (پیدا کرنے والا) خود اللہ تعالیٰ ہے" (صحیح مسلم: ۲۲۴۷)

مقاتل کے قول کے مطابق: عصر سے مراد: نماز عصر ہے، اس لیے اکثر علماء نے "صلاة وسطی" کی تفسیر کی عصر نماز سے کی ہے اس تفسیر کی بنیاد پر، یہ قسم اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دنیا کی جتنی عمر باقی ہے گزشتہ عمر کی بنسبت وہ اتنی ہے کہ جتنا وقت نماز عصر اور مغرب میں ہے اسی مقدار کی عمر باقی ہے، پس انسان کو چاہیے کہ بغیر نقصان والے تجارت میں مشغول ہو جائے، کیونکہ (وقت) آخر تک قریب ہو چکا ہے، اور گزرے زمانے کی تلافی ممکن نہیں ہے۔

البتہ ابن کثیر نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے (تفسیر انوار القرآن)

ایک ضروری ملاحظہ

اللہ تعالیٰ زمانے کی قسم کھاتا ہے اس کے لیے خاص ہے، اور ہم انسانوں کو اس کے نام اللہ یا اس کے صفات کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم نہیں کھانا چاہیے، اس معاملے میں علماء کے فتاویٰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30) سورة اللیل

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی ۲۱ آیتیں ہیں

وجه تسمیہ:

اس سورت کا نام اس لیے اللیل رکھا گیا ہے کہ خدا نے رات کی قسم کھائی ہے جس کا اندھیرا دنیا کو ڈھانپنے والا ہے سورت اس سے شروع ہوئی ہے۔

سورة اللیل نے سورة الاعلیٰ کے بعد شرف نزول پایا۔

سورة اللیل کا سورة الشمس سے ربط و مناسبت

سورة الیل کا عمومی موضوع کچھ حد تک سورة الشمس کے موضوع سے مشابہ ہے، دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر معلوم ہوتی ہیں، اور مواد وہی ہے جو سورہ شمس میں مختلف انداز میں سمجھایا گیا ہے جبکہ اس سورت میں دوسرے انداز میں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کے قریب قریب نازل ہوئی ہیں۔

سورہ شمس میں تزکیہ شدہ روح کی کامیابی اور اس کی پاکیزگی کی بات کی گئی ہے اور گناہوں میں ڈوبی ہوئی روح کے نقصان کے بارے میں بحث کی گئی ہے، (ملاحظہ فرمائیں: آیات مبارکہ: ۹ اور ۱۰) اور سورہ لیل ان اوصاف کے بارے میں بتاتی ہے جن سے کامیابی ملتی ہے، اور ان چیزوں کے بارے میں بتاتی ہے جن سے انسان کو نقصان اور مایوسی ہوتی ہے، (آیت: ۵) گویا یہ آیات اوپر والی دو آیتوں کی وضاحت اور بیان ہے۔

سورت کی ابتداء لیل سے ہوئی ہے جو بخیل کے بخل سے مناسبت رکھتی ہے، کیونکہ بخل بخیل کی بدبختی اور مایوسی کا سبب ہے۔

سورة اللیل کے الفاظ، آیات اور حروف کی تعداد

سورہ الیل کا ایک (۱) رکوع، اکیس (۲۱) آیتیں، اور اکھتر (۷۱) الفاظ، تین

سو چودہ (۳۱۲) حروف اور ایک سو سینتیس (۱۳۴) نقطے ہیں۔

(واضح رہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة اللیل کی آیات کا مکی اور مدنی ہونا

یہ دیکھتے ہوئے کہ بعض روایات اس سورت کے مکی ہونے اور بعض دیگر روایات اس کے مدنی ہونے کی نشاندہی کرتی ہیں مگر اس سورت کی آیات کا سیاق و سباق اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ آیا یہ مکی ہے یا مدنی؛ اس لیے اس کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں حکم لگانا ممکن نہیں ہے، سورت کی ابتداء میں تین قسموں کے ذکر کرنے کے بعد لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے: تقویٰ کے ساتھ خرچ کرنے والے، اور بخیل جو قیامت کے دن کے اجر کو جھٹلاتے ہیں، پہلے گروہ کے لیے انجام کی خوشی، سہولت اور سکون ہے، جبکہ دوسرے گروہ کے کام کا انجام مشکلات اور مصائب ہیں۔

اس سورت کے ایک اور حصے میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ بندوں کی ہدایت خدا کے پاس ہے، سب کو جہنم کی آگ سے ڈرا یا گیا ہے، اور آخری حصے میں اس آگ میں جلنے والوں اور اس سے نجات پانے والے گروہوں کا ان کی اوصاف کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔

سورة الیل کا سبب نزول

مفسرین کی کثیر تعداد نے اس سورت کے شان نزول میں ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ:

ایک مسلمان کے کھجوروں کے درخت میں سے ایک درخت کی ٹہنی ایک غریب آدمی کے گھر کے اوپر تھی، کھجور کا مالک جب بھی کھجوریں توڑنے کے لیے درخت پر چڑھتا تو چند کھجوریں فقیر کے گھر میں گرجاتیں، اس کے بچے اٹھا لیتے، تو کھجور کا مالک درخت سے اتر کر ان بچوں سے کھجور لے لیتا، اس غریب آدمی نے جاکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاکر اس مسئلے کو حل کر دیتے ہیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے مالک کے پاس تشریف لائے

اور اس سے کہا: تیرے اس کھجور کے درخت کی شاخیں جو فلاں آدمی کے گھر کے اوپر گئی ہوئی ہیں مجھے دو گے، اس کے بدلے جنت میں ایک درخت تمہیں ملے گا؟

اس نے کہا: میرے پاس بہت سارے کھجور کے درخت ہیں، ان میں سے کسی کا پھل اس جیسا نہیں ہے، میں ایسا سودا کرنے کو تیار نہیں ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک نے یہ بات سُن لی، عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر میں جاکر یہ درخت اس سے خرید کر حوالے کر دوں تو کیا وہی چیز آپ مجھے عطا کر دیں گے جو اسے دے رہے تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں۔

اُس آدمی نے جاکر درخت کے مالک سے اس بارے میں بات کی، کھجور کے مالک نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ محمد مجھے اس کے بدلے جنت کا درخت دینے کو تیار تھا مگر میں نے نہیں دیا۔

خریدار نے کہا: کیا تم اسے بیچنا چاہتے ہو؟

کہا: میں نہیں بیچتا، مگر ایسی قیمت پر کہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص مجھے وہ قیمت دے گا۔

اس نے کہا: کتنی رقم؟

کہا: چالیس کھجور کے درخت۔

خریدار نے متعجب ہو کر کہا: واہ، تم کھجور کے اس درخت کی بھاری اور مہنگی قیمت مانگ رہے ہو جو ٹیڑھا بھی ہے، اس کے بدلے چالیس کھجور کے درخت! پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد بولا! بہت اچھا، چالیس کھجور کے درخت تجھے دوں گا۔

بیچنے والے لالچی نے کہا: اگر تم سچ کہتے ہو تو چند آدمی گواہ کے طور پر بلاؤ، اتفاق سے کچھ لوگ وہاں سے گزر رہے تھے انہیں آواز دی، اور اس معاملے کا گواہ بنادیا۔

پھر وہ بندہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور کہا: کھجور کا

درخت میری ملکیت میں ہے، اور آپ کی خدمت مبارک میں پیش کرتا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غریب آدمی گھر تشریف لے گئے اور اس کے گھرانے کے سربراہ سے فرمایا: یہ کھجور کا درخت آپ کا اور آپ کا بچوں کا ہے۔

اس موقع پر سورہ "لیل" نازل ہوئی، جس میں بخیلوں اور سعادت کرنے والوں کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا گیا۔

سورۃ اللیل کی آیات مبارکہ کا موضوع

یہ سورت زندگی کے طریقوں میں لوگوں کے درمیان فرق کی طرف اشارہ کرتی ہے اور آخرت میں ان طریقوں میں سے ہر ایک کے اثرات کی وضاحت کرتی ہے، مثلاً بیان کرتی ہے: جو اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ کے وعدوں کو تسلیم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اسے ہمیشہ کی زندگی اور ابدی خوشی عطا فرمائے گا، اور جو شخص بخل کرتا ہے اور اپنی اندرونی مخفی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خدا کے اچھے وعدوں کو رد کرتا ہے، تو خدا تعالیٰ اس کا انجام بُرا بنا دیتا ہے اور آخرت میں اس کا مال اس کے کوئی کام نہیں آئے گا۔

سورہ "لیل" کا تاریخی موضوع

اس سورت میں کسی اہم تاریخی مسئلہ کا ذکر نہیں ہے اور صرف ایک بخیل کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس نے اپنی دولت کے باوجود غریبوں کی مدد سے خود کو روکا تھا، مذکورہ شخص کھجور چنتے وقت زمین پر گھرا ہوا کھجور کا ایک دانہ بھی غریبوں کو دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اگر غلطی سے اس کے ہاتھ سے کوئی کھجور کا دانہ گرجاتا اور غریب کا بچہ اسے منہ میں ڈال دیتا تو وہ کھجور کے درخت سے اُتر کر بچے کے حلق سے نکال لیتا۔

اس سورت میں اس بخیل اور کنجوس شخص اور دوسرے لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ عنقریب سختی دیکھیں گے اور اس دن ان کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

سورۃ اللیل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاللَّیْلِ إِذَا یَغْشَىٰ ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝ إِنَّ سَعِیْكُمْ لَشَتَّىٰ ۝ فَأَمَّا مَنْ
 أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُیَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ
 بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُیَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝ وَإِنَّ لَنَا
 لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝ فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ۝ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝
 وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ
 رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۝

سورت کا مختصر ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَاللَّیْلِ إِذَا یَغْشَىٰ ۝	قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے (۱)
وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝	اور دن کی جب وہ روشن ہو! (۲)
وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝	اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا (۳)
إِنَّ سَعِیْكُمْ لَشَتَّىٰ ۝	بے شک تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے (۴)
فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝	تو جس نے خرچ کیا اور پرہیزگاری کی (۵)
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝	اور بھلائی کو سچ مانا (۶)
فَسَنُیَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝	تو یقیناً ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے (۷)
وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝	وہ شخص جس نے بخل سے کام لیا اور بے نیازی اختیار کی (۸)

وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝٩	اور اس نے سب سے اچھی بات جھٹلائی (۹)
فَسَنِيْسِرُهُ لِّلْعُسْرَىٰ ۝١٠	تو یقیناً ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے (۱۰)
وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝١١	اور جب وہ ہلاک ہو تو اس کا مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا (۱۱)
إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝١٢	یہ سچ ہے کہ راستہ بتلا دینا ہمارے ذمے ہے (۱۲)
وَأَن لَّنَا لِّلْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ۝١٣	اور بلاشبہ ہمارے ہی اختیار میں دنیا اور آخرت ہے (۱۳)
فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ۝١٤	سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کیا (۱۴)
لَّا يَصْلَحُهَا إِلَّا الْآسَفَىٰ ۝١٥	جس میں اس بڑے بدبخت کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا (۱۵)
الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝١٦	جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا (۱۶)
وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقَىٰ ۝١٧	اور اُس سے دور رہے گا نہایت پرہیزگار (۱۷)
وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۝١٨	اور نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا بدلہ دے (۱۸)
الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَلَّىٰ ۝١٩	جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے (۱۹)
إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۝٢٠	صرف اپنے رب کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے (۲۰)
وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۝٢١	اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا (۲۱)

سورت کی تفسیر

آیات مبارکہ (۱ تا ۱۱) میں لوگوں کی جستجو اور مختلف کوشش جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے (۱)

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۝۱

قسم ہے رات کی جب وہ دن کو ڈھانپ لیتی ہے، جب دنیا کو اپنے اندھیرے میں لپیٹ لیتی ہے، وہ رات جو زمین کی سطح اور تمام اشیاء کو اپنی تاریکی میں گھیر لیتی ہے، وہ رات جو تمام جانوروں اور انسانوں کو آرام اور سکون پہنچاتی ہے۔

"یَغْشَىٰ" گھیرتا اور ڈھانپ لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ رات کی قسم کھاتا ہے کہ لباس کی طرح سب چیزوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور اندھیرا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کی قسم کھا سکتا ہے، کیونکہ وہ اس کی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیشہ بڑی اور اہم چیزوں کی قسم کھاتا ہے، اور رات بھی اہم چیز ہے کہ یہ اپنی تاریکی کے ذریعے راحت اور سکون کا باعث بنتی ہے، بعض علماء کی رائے کے مطابق، اس سورت کا آغاز رات سے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں بخیل انسانوں کے بارے میں بات ہوئی ہے کہ ان کے اعمال رات کی طرح سیاہ اور تاریک ہیں۔

رات اور دن کی قسم کھانے میں جو باریک نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہ اشارہ کائنات کے ثنوی نظام کی طرف مثلاً مؤنث اور مذکر، اچھائی اور برائی، سختی اور آسانی، تصدیق اور تکذیب وغیرہ جن سے اس سورت کا موضوع تشکیل پاتا ہے۔

اور دن کی جب وہ روشن ہو! (۲)

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝۲

قسم ہے دن کی جب وہ ظاہر ہو جاتا ہے، دن جس کی روشنی رات کے اندھیرے کو بھگاتی ہے، اور تمام انسانوں اور جانوروں کو پھر سے کام اور جدوجہد میں لگاتا ہے۔

"تَجَلَّىٰ" روشن اور ظاہر ہوا، واضح ہوا۔

مفسرین فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے رات کی قسم کھائی ہے جو تمام مخلوق کے آرام کا وقت ہے، انسان اور حیوان رات کو اپنے اپنے ٹھکانوں میں پناہ لیتے ہیں، محنت مشقت اور حرکت سے رہائی پاتے ہیں، اور دن کی قسم کھائی ہے

جس کے دوران لوگ اپنے معاش کی تلاش اور جستجو میں لگ جاتے ہیں، اس قسم کی حکمت کے لاتعداد فائدے ہیں جو دونوں کے ایک دوسرے کے بعد آنے اور تعاقب سے حاصل ہوتے ہیں۔

کیونکہ اگر ساری زندگی رات ہوتی تو زندگی ناممکن ہو جاتی اور اگر ہمیشہ دن ہوتا تو انسان کو سکون نہ ملے، اور انسانی مفادات میں خلل پڑتا۔

اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا (۳)	وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝۳

ہمارے پروردگار مذکورہ آیات میں فرماتے ہیں: رات کی قسم جب وہ دن کو ڈھانپ لیتی ہے، اور دن کی قسم جب وہ نکلتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے، اور چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کرتا ہے، اور اس عظیم اور حیرت انگیز ذات کی قسم جو دو جنسوں، نر اور مادہ کو ایک نوع واحد سے پیدا کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے "ما" کو ما مصدریہ کہا ہے کہ اس صورت میں اس کا معنی ہوگا: "نر اور مادہ کی تخلیق کی قسم": "الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ" سے مراد تمام مخلوق میں نر اور مادہ کی جنس ہے، انسانوں اور حیوانات، حشرات اور تمام اقسام کے پودے اور تمام اشیاء میں، یاد رہے کہ: جانوروں اور انسانوں میں نظام زوجیت یعنی جوڑے جوڑے بنانے کا نظام اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حکمت کی نشانی ہے۔

بے شک تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے (۴)	إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝۴

اس لیے تمہاری جزاء اور سزاء بھی مختلف نوعیتوں کی ہو گی۔

ابن کثیر فرماتے ہیں: چونکہ قسم متضاد چیزوں پر تھی اس لیے مقسم علیہ یعنی جواب قسم بھی متضاد اور مختلف ہو گا۔

اس لیے فرمایا: "یقیناً تمہاری کوشش مختلف ہے" یعنی: تمہارے عمل بھی مختلف اور متضاد ہیں، ان میں سے بعض کا عمل خیر ہے، اور بعض کا عمل شر، اور بعض ان میں جنت کے لیے اور بعض دوزخ کے لیے، کوئی اپنے نفس کی نجات کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتا ہے کوئی اس کی بربادی اور ہلاکت کے لیے۔

"لَشَيْءٍ" جمع ہے شتیت کی، معنی ہے بکھرے ہوئے، مطلب یہ کہ تمام لوگوں کی کاوشیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ایک گروہ نیک، پرہیزگار تو ایک بد کردار اور برا، بعض مؤمن اور صادق تو بعض کافر، فاسق، بعض جسمانی آسائشوں کے لیے کوشاں تو بعض انسانی خدمت اور اللہ کی رضا کے حصول اور اس کے احکام کے نفاذ میں مصروف، اور یہ آیت دو الگ الگ راستوں اور مختلف سمتوں کو بیان کرتی ہے اور قسم کا جواب بھی ہے۔

بعض مفسرین آیت "إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: انسان کو قدرتی طور پر کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے کوششیں اور جدوجہد کی عادت پڑی ہے، لیکن اس کوشش میں بعض لوگوں کو دائمی آسائش ملتی ہے، اور بعض دوسرے اس کی کوشش سے ہمیشہ والا عذاب خریدتے ہیں۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: جو بھی صبح اٹھتا ہے، وہ کسی نہ کسی معاملے میں مشغول ہو جاتا ہے، اس معاملے میں کوئی بندہ کامیاب ہو کر اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے رہائی دلاتا ہے، بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کی جدوجہد اور کوشش ان کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔

عقلمندی یہ ہے کہ لوگ پہلے اپنے کام پر غور کریں، اور وہ عمل جو وقتی طور پر سکون اور آرام کا باعث ہو، مگر آخرت میں عذاب کا سبب بنے، انسان کو ان سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى ۝	تو جس نے خرچ کیا اور پرہیزگاری کی (۵)

یعنی جس نے (اللہ کے راستے میں اپنا مال) دیا اور معاف کر دیا، تقویٰ اور پرہیزگاری کو وتیرہ بنایا، (اور اپنے رب سے ڈرتا رہا)۔

شاید تقویٰ کے ساتھ دینے سے مراد یہ ہے کہ یہ خالص نیت اور کسی منت سماجت کے بغیر دیا گیا ہے، یہ حلال مال سے اور خدا کی راہ میں ہو، یہ تمام معنی لفظ تقویٰ میں شامل ہیں۔

ابن کثیرؒ نے فرمایا: وہ مال دے جس کے دینے کا اُسے حکم دیا گیا ہو اور اپنے کاموں میں خدا سے ڈرے، (مختصر: ۳/۶۴۶)

"أَعْطَى" خرچ کیا اور دیا، خرچ کیا اور تقسیم کیا۔

"وَاتَّقَى" اللہ سے ڈرا، تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کی۔

آیت مبارکہ کا شان نزول

حاکم نے عامر بن عبداللہ بن زبیر سے اس نے اپنے والد سے روایت کیا ہے: ابوقحافہ (ابوبکرؓ کے والد) نے ابوبکرؓ سے کہا: پیارے بیٹے! ہم دیکھتے ہیں کہ تم صرف اُن غلاموں اور لونڈیوں کو جو کمزور، بیچارے اور محتاج ہیں آزاد کرتے ہو، اگر تم مضبوط اور طاقتور مردوں کو آزاد کرو گے تو وہ تمہارے حمایتی بنیں گے اور تمہاری مدد کریں گے، ابوبکر صدیقؓ نے کہا: ابو جان! میرا یہ کام صرف اللہ کی رضا کے لیے ہے، پس "فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى" نازل ہوتی۔

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے: (قَالَ أَبُو مُحَاذَةَ لِأَبِي بَكْرٍ: أَرَأَيْكَ تُعْتِقُ رِقَابًا ضِعَافًا فَلَوْ أَنَّكَ إِذْ فَعَلْتَ مَا فَعَلْتَ أَعْتَقْتَ رَجُلًا جَلْدًا يَمْنَعُونَكَ وَيَقُومُونَ دُونَكَ. فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: يَا أَبَتِ إِنِّي إِنَّمَا أُرِيدُ مَا أُرِيدُ لِمَا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَاتُ فِيهِ: فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى ۝ فَسَنِيْسِرُهُ لِيُسِرُّهُ ۝ إِلَى قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضَى ۝) (اللیل: ۲۱-۵) (حاکم: ۳۹۴۲) حکم سند: حسن۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى ۝	اور بھلائی کو سچ مانا (۶)

اور اسے اچھے ثواب (اللہ کی طرف سے اس جہاں میں اور آخرت میں اجر) پر ایمان اور یقین ہونا چاہیے، "الحُسْنَى" اللہ کی طرف سے اچھا بدلہ جو اس دنیا میں مؤمنوں کے حصے میں آتا ہے، اور خدا تعالیٰ سب سے بہترین بدلہ جو اُس جہاں میں مسلمانوں کو نصیب ہوگا، ایسا خیر اور بھلائی جسے اللہ تعالیٰ خودخیر کہتا ہے، یعنی: وہ آدمی جو مال خرچ کرتا اور بخشتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے، اچھی چیز اور اچھائی پر ایمان رکھتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ: اچھے اور بُرے، نیکی اور بدی کو برابر نہیں سمجھتا،

اور فطرتاً وہ نیکیوں اور بُرے کاموں کی جزا و سزا پر یقین رکھتا ہے۔
 "الْحُسْنٰی" یہ صفت مشبہ یا صفت تفضیلی ہوسکتی ہے۔

فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝	تو یقیناً ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے (۷)

جلد ہی ہم اس کے لیے ایک آسان راستہ بنائیں گے، رکاوٹوں اور مشکلات کو اس کے لیے آسان بنادیں گے، اور اچھے کام کی توفیق دیں گے، اسے خوشحالی اور راحت کے لیے تیار کریں گے۔
 "نُيَسِّرُهُ" اسے تیار کریں گے۔

"الْيُسْرَىٰ" خوشحالی اور راحت، سادہ اور آسان، آیت: "فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ" دو معنی کو متضمن ہے:

اول: اسے آخرت کی خوشحال اور آرام دہ زندگی کے لیے تیار کریں گے،
 (رجوع کریں: سورہ نحل آیت: ۹۷)

دوم: اسے آسان اور معمولی کاموں کے انجام دہی کے لیے تیار کریں گے جو پہلے اس کے لیے مشکل اور سخت تھے۔

یعنی اللہ کے راستے پر قدم رکھنے کی روشنی میں ہم اس کے لیے مسائل کو آسان بناتے ہیں اور اسے ان میں کامیاب کرتے ہیں، (مراجعہ کیا جائے آیت: "۱۶" سورہ مائدہ اور "۶۹" سورہ عنکبوت)

دراصل قیامت اور اللہ کی طرف سے ملنے والے اجر پر ایمان انسان کی نظر میں تمام مسائل کو سہل اور آسان بنادیتا ہے، پھر وہ نہ صرف اپنا مال؛ بلکہ اپنی جان بھی خلوص کے ساتھ لگاتا ہے، اور اس اللہ کے دین میں قربانی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

یہ آیت اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا ان بندوں کی جو خلوص نیت سے اطاعت، بندگی، تقویٰ اور انفاق کی راہ پر چلتے ہیں کامیاب فرماتا اور توفیق بخشتا ہے، اور اس راہ میں ان کی حرکت اور چلنے کو آسان بنادیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نیک عمل-جیسے: "انفاق" انسان کے لیے ابتداء میں بہت مشکل ہے، لیکن بار بار اور تسلسل کے ساتھ کرنے سے آدمی کے لیے ایسا آسان ہو جاتا ہے کہ پھر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے اور پھر اسے چھوڑنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ: قیامت پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے پناہ اجر و ثواب پر عقیدہ رکھنا انواع و اقسام کی مشکلات کو انسان کے لیے ایسا آسان بنا دیتا ہے کہ نہ صرف اپنا مال بلکہ اپنی جان بھی اخلاص کی ہتھیلی پر رکھ کر عشق شہادت کے میدان میں کود پڑتا ہے، اور اپنے اس ایثار و قربانی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

بعض مفسرین اس آیت کی تفسیر "فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ" میں لکھتے ہیں: "کہ اس کی بہت راہیں برائی اور مشکلات کی طرف ہموار کریں گے" یعنی: ہم اسے ایک مشکل خصلت اور مشکل کردار تیار کرتے ہیں، اس کا راستہ اس کے لیے ہموار کرتے ہیں، اس طرح کہ اس کے لیے خیر اور نیکی کے اسباب مشکل ہو جاتے ہیں، ان پر عمل کرنے سے کمزور اور سست ہو کر قاصر رہتا ہے، اور یہ کام خود اسے دوزخ کی طرف لے جائے گا جو بہت بُری جگہ اور بدترین ٹھکانہ ہے۔

بخاری اور مسلم میں حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے میں تھے تو آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے مگر یقیناً لکھا گیا ہے کہ اس کا ٹھکانہ جنت میں ہے، یا دوزخ میں۔

صحابہ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول! "اب جب سب کچھ لکھا گیا ہے" کیا ہم اس پر بھروسہ کر کے اکتفا نہ کریں (اور عمل سے ہاتھ کھینچ لیں؟) آپؐ نے فرمایا: عمل کرو کیونکہ ہر بندہ اس چیز کے لیے تیار ہوا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے، پس ہر وہ آدمی جو اہل سعادت میں سے ہے اسے اہل سعادت کے عمل انجام دینے کے لیے تیار کیا جائے گا اور جو آدمی اہل شقاوت اور بدبختوں میں سے ہے اسے بدبختوں والے عمل کے لیے تیار کیا جائے گا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: "فَسَنُيَسِّرُهُ

لِلْيُسْرَىٰ" ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: یہ آیت امیہ ابن خلف کے بارے میں نازل

ہوئی ہے -

وہ شخص جس نے بخل سے کام لیا اور بے نیازی اختیار کی (۸)	وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝۸

اور وہ شخص جو (اپنے مال میں) بخل کرتا ہے اور مال و دولت کا خواہاں ، تنگ نظر اور بخیل ہے، (اور اللہ کی راہ میں اپنا مال سخاوت کے ساتھ خرچ نہ کرے) اور خود کو (اللہ تعالیٰ اور اس کی توفیق دنیوی اور اخروی اجر و ثواب سے) بے پرواہ سمجھے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یعنی وہ مال خرچ کرنے سے باز رہے اور خود کو خدا کا محتاج نہ سمجھے۔

"اسْتَغْنَىٰ" خو کو بے نیاز یعنی غیر محتاج جانا، یعنی اللہ تعالیٰ سے بے نیاز، اور اس کی مدد و نصرت سے اور اللہ کی ذات کے دنیوی اور اخروی اجر و ثواب سے بے پرواہ سمجھا۔

بخل کرنے والوں کو جاننا چاہیے کہ مال و دولت کا ہونا انسان کے لیے باعث نجات نہیں ہے۔

بخل کا نتیجہ آخر کار زوال ہے، انسانی صفات کی تکمیل میں تنزل، لوگوں کی نظروں میں گرنا اور جہنم میں جانا اور دنیوی درجات سے محروم ہونا ہے۔

اور اس نے سب سے اچھی بات جھٹلائی (۹)	وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝۹

وہ روز جزا کے اچھے اجر کا انکار کرتا ہے، اور اچھے اجر کا اس دنیا میں یقین نہیں رکھتا۔

مفسرین لکھتے ہیں: یعنی انفاق، صدقہ اور خیرات کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے بدلے اور انعامات کا انکار کرے، ان عقائد کا انکار کرے جن کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے:

بخل - واستغنی - وكذب بالحسنى

۱۔ حق کو جھٹلانا

۲۔ مال کے بدلے اور متبادل کا انکار

۳۔ "لا الہ الا اللہ" کی تکذیب

حسنیٰ یعنی ہر اچھی چیز کا انکار کرے یعنی آخرت کا، کلمہ توحید کا اور آخرت میں جو چیز بھی سب سے بہترین اور قیمتی ہے اس سے انکار کرتا ہے، اور سب سے کہتا رہتا ہے کہ یہ سب افواہیں ہیں، جنت اور جہنم کا کوئی وجود نہیں ہے، جنت اور جہنم کا تعلق اسی دنیا سے ہے (یعنی دنیاوی اچھی زندگی جنت اور بری زندگی جہنم ہے)۔

فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝۱۰	تو یقیناً ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے (۱۰)

نیک اعمال کو اس کی نظر میں مشکل اور سخت بنادیں گے، اور اسے تیار کریں گے سختی اور مشقت کے لیے (جہنم کی مشکل اور ڈکھی زندگی کے لیے)

"الْعُسْرَىٰ" سختی اور مشقت، شدت اور محنت، نیک عمل کی توفیق نہ ملنے کی وجہ سے ذلت، دوزخ کا عذاب۔

مفسرین لکھتے ہیں: خیر کے راستے کو "یُسْرَىٰ" سے موسوم کیا ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ جنت میں داخل ہونا اور نعمتوں والا مقام ہے، اور شر کا راستہ "عُسْرَىٰ" سے موسوم کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ عُسْر اور سختی ہے، یعنی دوزخ میں داخل ہونا۔

حدیث مبارکہ امام بخاری اور مسلم کی روایت علی بن ابی طالبؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے میں تھے تو آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے مگر یقیناً لکھا گیا ہے کہ اس کا ٹھکانہ جنت میں ہے، یا دوزخ میں ہے۔

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝۱۱	اور جب وہ ہلاک ہو تو اس کا مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا (۱۱)

اور (موت کے وقت) دوزخ میں جاتے وقت اس کا مال اس کی حالت کو فائدہ نہیں دے گا۔

"إِذَا تَرَدُّی" ہلاک ہوا، آگ میں گر پڑا۔

اس آیت میں پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو دولت اور جائیداد اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی، اس شخص کے برعکس جو پچھلی آیات میں مذکور ہے، یہاں ایک ایسے شخص کے بارے میں بیان ہے جو خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے، اور مال کو ذخیرہ کرنے اور دولت کمانے میں لگا رہتا ہے، اور اس نیک وعدے کا انکار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کرنے والے شخص کو دیا ہے یہ انکار دراصل قیامت اور معاد کا انکار ہے، فرماتے ہیں: جو شخص ایسا ہے تو ہم اسے نیک عمل انجام دینے کی توفیق نہیں دیں گے، تاکہ وہ یہ عمل نہ کر سکے اور عذاب کے لیے تیار ہو جائے، اور جب ایسا شخص قبر میں یا جہنم اور تباہی کے گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کس درد کی دوا ہوگا اور اس کو کیا فائدہ پہنچائے گا؟ یہ معنی اس وقت ہوگا جب "ما" استفہامیہ ہو، اگر "ما" نافیہ ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ایسے آدمی کو کہ جب ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے تو اس کا مال اس کو فائدہ نہیں دے گا۔

یہ سچ ہے کہ راستہ بتلا دینا ہمارے ذمے ہے (۱۲)	إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝۱۲

یقیناً ہدایت اور گمراہی کی راہ واضح کرنا اس کی نشاندہی کرنا اور بتانا ہمارے ذمے ہے، کہ ہدایت اور گمراہی کے راستے ہم لوگوں کے لیے روشن اور واضح کریں گے، سیدھے اور غلط راستے کی وضاحت کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۝ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۝) (سورہ کہف: ۲۹) ترجمہ: اور کہہ دو کہ (لوگو) یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے تو پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

"عَلَيْنَا" ہمارے ذمے ہے، "الْهُدَى" رہنمائی کرنا، راہ دکھانا، راستہ دکھانا۔

اور بلاشبہ ہمارے ہی اختیار میں دنیا اور آخرت ہے (۱۳)	وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝۱۳

دنیا اور آخرت ہمارا ہے "لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ" وہ جہاں اور یہ جہاں، آخرت کا دنیا پر مقدم ہونا اس کی زیادہ اہمیت اور اصل مقصد ہونے کی وجہ سے ہے، یعنی

ہر کام کی ابتداء اور انتہاء ہمارے ہاتھ میں ہے، اگر چاہتے ہو کہ تمہاری آخرت اچھی ہو تو اس کا راستہ ہدایت کو لازم پکڑنے اور تابعداری کرنے میں ہے، اگر چاہتے ہو کہ تمہاری دنیا اچھی ہو، تو اس اچھی دنیا تک پہنچنے کا راستہ بھی ہدایت ہے، اور اگر دنیا اور آخرت دونوں کو اچھا بنانا چاہتے ہو تو پھر بھی اس کا راستہ اسی ہدایت کی تابعداری اور اسے لازم پکڑنا ہے۔

سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کیا
(۱۴)

فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلْقَوْنَ ۝۱۴

میں تمہیں اس خوفناک آگ سے خبردار کرتا ہوں جو جلتی ہے اور بھڑکتی ہے۔

"فَأَنْذَرْتُكُمْ" تمہیں اس سے ڈرایا، میں نے خبردار کیا۔

"نَارًا تَلْقَوْنَ" ایسی آگ جو بھڑکتی ہے۔

"فَأَنْذَرْتُكُمْ" یہ "انذار" کے مادے سے اور "نذر" اس کی بنیاد ہے، ڈرانے کے معنی میں ہے، لوگ جو نذر مانتے ہیں کہ فلاں کام ہوا تو اللہ کی راہ میں فلاں چیز دونگا وغیرہ کو اس نذر سے مراد یہ ہے کہ انسان شریعت کے مقرر کیے بغیر اپنے اوپر خود ہی کسی کام کے کرنے کو واجب کرتا ہے اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کسی ایک یا کچھ چیزوں کو چھوڑ دے۔

جب کوئی شخص کہتا ہے کہ: "نذرت اللہ امرا" میں نے اللہ کے لیے نذرمانی ہے، تو یہ نذر بغیر اس کے کہ اللہ کی طرف واجب کی گئی ہو، اس پر خود بخود واجب ہو جائے گی، دل میں ڈر اور اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خواہش پوری نہ ہو جائے، "انذار" کی بنیاد یہی ہے، یعنی ڈرانا، اور "نذر" ڈرنا اور ڈرانا، یعنی: وہ خبر جس میں ڈرانا اور خوف ہو۔

"انذار" کے مقابلے میں "تبشیر" ہے، یعنی وہ خبریں جن میں سُور اور خوشی ہو، مُنذر سے مراد وہ آدمی جو کسی شخص کو اس کے آگے کے برے انجام سے ڈراتا ہے خبردار کرتا ہے، اور مُبَشِّر وہ آدمی جو کسی شخص کو اس کے آگے کے اچھے انجام پر خوشخبری دیتا ہے۔

درحقیقت دین اور قرآن میں انبیاء کا "انذار" ان کی "تبشیر" کے ماتحت ہے، یعنی انبیاء کرام کا مُبَشِّر ہونا ان کے مُنذر ہونے پر مقدم ہے، کیونکہ اللہ کی

رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے، یہ ممکن نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کسی کو اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے دربار سے مایوس کر دیں، اس لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ شروع ہی سے انذار سے کام کا آغاز کریں، سوائے اس مواقع کے کہ جس میں تبشیر کے ساتھ کوئی مثبت کام نہ ہو، ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اپنی دعوت و تبلیغ کے کام میں "تبشیر" کو بنیاد بنانا چاہیے، اور "انذار" بھی ضرورت کے تحت ہی کرنا چاہیے۔ (بنقل از: ترجمہ معانی قرآن)

جس میں اس بڑے بدبخت کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا (۱۵)	لَا يَصْلُهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۝۱۵

اس میں کوئی داخل نہیں ہوگا اور نہ ہی ہمیشہ رہے گا سوائے اس بدبختی کو اختیار کرنے والے کافر کے جو ہدایت سے منہ موڑتا ہے، وہ ہلاکت کا انتخاب کرتا ہے، ایمان میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

حدیث مبارکہ میں آتا ہے امام احمدؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لَا يَدْخُلُ النَّارَ إِلَّا الشَّقِيُّ، قِيلَ: وَمَنِ الشَّقِيُّ؟ قَالَ: الَّذِي لَا يَعْمَلُ بِطَاعَةِ وَلَا يَتْرُكُ لِلَّهِ مَعْصِيَةً) ترجمہ: "بدبخت کے سوا کوئی جہنم میں نہیں جائے گا، کسی نے پوچھا: بدبخت کون؟ آپؐ نے فرمایا: وہ جو اطاعت نہ کرے اور اللہ کی معصیت کا کوئی کام نہ چھوڑے"

واضح رہے کہ "اتقی" اور "اشقی" میں بھی ہر ایک میں لوگوں کی دو قسمیں ہیں:

لہذا، "اتقی" میں ایک نیک، اچھے اور باعمل مؤمن شامل ہیں جو ہر قسم کی برائیوں سے دوری اختیار کرچکے ہوں، اس میں وہ مؤمن بھی شامل ہے جو کبھی کبھار گناہ کر بیٹھتا ہے اور پھر اس پر پچھتا تا ہے ان دونوں کا بدلہ جنت ہے۔

"اشقی" میں وہ کافر شامل ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء اور کتابوں سے انکار کرتا ہے، اور وہ مسلمان بھی شامل ہیں جن کے دل میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان ہے، لیکن بعض گناہوں پر وہ مصرّو اور اڑے ہوئے ہیں ان سے توبہ بھی نہیں کرتے، یہ خود اس کے یقین اور تصدیق کی کمی کی دلیل

ہے، یہ حدیث مبارکہ اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب زنا کرنے والا زنا کرتا ہے تو زنا کے وقت اس کا ایمان نہیں رہتا، اور جب چوری کرنے والا چوری کرتا ہے تو چوری کے وقت اس کا ایمان نہیں رہتا۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ اشقی کا پہلا گروہ جہنم میں ہمیشہ رہنے والا ہے، جبکہ دوسرا گروہ اللہ کی مرضی سے کچھ مدت تک جہنم میں رہے گا، لیکن آخر کار جنت میں لے جایا جائے گا (تفسیر انوار القرآن)

الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۝۱۶	جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا (۱۶)

وہی شخص جس نے قرآن کریم کو جھٹلایا ہے، اور اللہ کے احکام سے منہ موڑا ہے، رسالت کا انکار کرتا ہے، شریعت کے احکام ترک کرتا ہے، اور نوابی کا ارتکاب کرتا ہے، اسی طرح وہ احادیث کا رد کرتا ہے، اور دین پر عمل نہیں کرتا۔

"تَوَلَّى" پیٹھ کر لیا، منہ موڑا، (اس کی تفصیل سورہ بقرہ آیت "۲۰۵" اور سورہ آل عمران آیت: ۸۲ اور سورہ نجم آیت: ۲۹ میں ملاحظہ کیا جائے)

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝۱۷	اور اُس سے دور رہے گا نہایت پرہیزگار (۱۷)

اور بہت جلد متقی لوگوں کو اس خوفناک آگ سے بچالیا جائے گا، یعنی جو شخص "اتقی" ہے یعنی حق کی مکمل اطاعت کرنے والا ہے اور اپنا مال اللہ کی راہ میں اس لیے خرچ کرتا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک ہو ایسے آدمی کو دوزخ کی آگ سے دور رکھا جائے گا، اگرچہ یہ آیت کریمہ عام اور سب کو شامل ہے جو کوئی بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے، لیکن اس کے شان نزول سے یہ معلوم ہوتا ہے "اتقی" کے لفظ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ مراد ہے۔

ابن ابی حاتم عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ سات مسلمان ایسے تھے جن کو مشرکین نے اپنا غلام بنایا ہوا تھا، جب وہ مسلمان ہوئے تو مختلف بہانوں اور طریقوں سے ان کو اذیتیں دی گئیں، حضرت ابو بکر نے اپنا مال خرچ کر کے ان کو کفار کی غلامی سے آزاد کروادیا، تو اس پر یہ آیت اُتری، (مظہری)۔

اس کے مطابق آیت کا آخری جملہ اس طرح ہے: (وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى) یعنی جن غلاموں کو حضرت ابوبکرؓ نے کثیر رقم خرچ کر کے آزاد کروایا پہلے سے اُن غلاموں کا ان پر کوئی احسان نہیں تھا، کہ اس کے بدلے میں ایسا قدم اٹھایا ہو، بلکہ: (إِلَّا ابْتِغَاءً وَجْهَ رَبِّهِ الْأَعْلَى) ابوبکرؓ کا مقصد اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

مستدرک حاکم میں حضرت زبیر سے منقول ہے کہ: حضرت ابوبکر صدیق کی یہ عادت تھی کہ جب بھی کسی مسلمان کو کافر کے ہاں غلام دیکھتے تو اسے خرید کر آزاد کر دیتے، اور یہ افراد عموماً مستضعفین میں سے ہوتے تھے، حضرت ابو بکر کے والد ابو قحافہ نے ان سے کہا: جب تم غلاموں کو آزاد کرتے ہو تو ایسے غلاموں کو آزاد کرو جو مضبوط اور بہادر ہوں، تاکہ کل تیرے دشمنوں کے مقابلے میں تیرے کام آئیں، اور تیری حفاظت کر سکیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا: میرا ان کو آزاد کرنے کا مقصد ان سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے، بلکہ صرف اور صرف رب تعالیٰ کی رضا مندی چاہتا ہوں، (مظہری)

"الَّتَقَى" سب سے زیادہ پرہیز گار، پرہیز گار ترین۔

الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝۱۸	جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے (۱۸)

جو شخص اپنا مال و جائیداد (بغیر کسی شہرت، دکھلاوے، احسان جتانے اور تکلیف دیے بغیر اللہ کے راستے میں خرچ کرے) دیدے تاکہ اپنے آپ کو (اس کام کے ذریعے بخل کی خصلت سے) پاک کرے۔

"يَتَزَكَّى" خود پاک کرتا اور رکھتا ہے، یہ فاعل سے حال یا بدل ہے۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى ۝۱۹	اور نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا بدلہ دے (۱۹)

کسی کا بھی نعمت میں سے اس پر کوئی حق نہیں (تاکہ اس کی نعمت کے احسان پر اسے جوابدہ ہو اور اس کی طرف سے اسے) اس کا بدلہ دیا جائے۔

"تُجْزَىٰ" کسی نعمت یا احسان کا حق اُتارا جائے، شکریہ ادا کیا جائے۔

صرف اپنے رب کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے (۲۰)	إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۝۲۰

"ابْتِغَاءً" چاہنا، طلب کرنا، "وَجْه" ذات (مراجعہ فرمائیں سورہ: انعام/ 52، سورہ کہف/ 28، و سورہ قصص/ 88)

اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا (۲۱)	وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۝۲۱

یقیناً ایسا شخص اپنے اس کام سے جو اس نے کیا ہے (راضی ہوگا اور (ان انعامات سے جو پروردگار اسے دے گا) خوشحال ہو جائے گا۔

"لَسَوْفَ يَرْضَىٰ" مطمئن ہو جائے گا، راضی ہوگا، یعنی جس نے اپنا مال خرچ کیا اور رب کی رضا مندی کو مدنظر رکھا، کوئی ذاتی فائدہ اس کے ذہن اور نظر میں نہ تھا، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں حیرت انگیز اور ابدی نعمتوں تک پہنچائے گا۔

انفاق

علماء انفاق کی تعریف میں فرماتے ہیں: اسلامی معاشرے میں لوگوں کے فرائض میں سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ضرورت مندوں، غریبوں اور مسکینوں کی امداد کیا کریں، ہر شخص کی اپنی استطاعت اور صلاحیتوں کے مطابق فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں میں آنے والے خلا کو پورا کرے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھے، جس طرح رب فقیر اور ضرورت مند کو فقیری اور غریبی کے ذریعے آزماتا ہے اسی طرح دولت مند آدمی کو دولت سے بھی آزماتا ہے۔

ضرورت مندوں، مسکینوں اور فقیروں کی مدد اگر خلوص نیت اور رضائے الہی کے لیے کی جائے تو اس کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے بعض اثرات دوسرے جہاں آخرت میں بدلہ اور انعام کی صورت میں اس پر ظاہر ہوں گے، بہت سی آیات اور احادیث کی کثیر تعداد میں ان میں سے بعض اثرات کی طرف اشارہ ہوا ہے ان میں سے حادثات اور ناگہانی اموات

کی روک تھام اور آفات و پریشانیوں کا خاتمہ بھی ہے۔

انفاق قرآن میں

قرآن پاک میں انفاق کے بارے میں بہت سے احکام ہیں اور انفاق کی راہ میں خلوص سے کام کرنے کی تاکید کی گئی ہے قرآن کریم میں ایک آیت ہے کہ صدقہ کا آخری مقصد جو کہ مفادات اور خواہشات سے دل نہ لگانا اور وابستہ نہ ہونا۔

(لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ) (92 آل عمران)، (تم پوری نیکی ہر گز حاصل نہیں کر سکو گے، جب تک کہ اس میں سے کچھ خرچ نہ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو) سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۴ میں رات اور دن میں چھپ کر اور کھلے طور پر خرچ کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اور بعض نے اسے آیہ انفاق کہا ہے: (الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۴۲) ترجمہ: "جو لوگ اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہر (راہ خدا میں) خرچ کرتے رہتے ہیں ان کا صلہ پروردگار کے پاس ہے اور ان کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ غم"

بعض مفسر کے مطابق: خرچ کرنے والے کو صدقات دینے میں دن ہو یا رات کو، چھپ کر علانیہ طور پر ہر حال میں اخلاقی اور معاشرتی پہلوؤں کا خیال رکھنا چاہیے، چونکہ ضرورت مندوں کو صدقہ دینے سے ظاہر کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے اسے چھپائیں تاکہ ان کی عزت نفس محفوظ رہے اور اس میں اخلاص بھی زیادہ ہو، البتہ اگر دوسری مصلحتیں ہوں جیسے شعائر کی تعظیم اور دوسروں کو ترغیب دینے کے لیے اعلانیہ کی ضرورت پڑتی ہے، اور انفاق میں کوئی ذاتی پہلو نہیں ہے کہ کسی کے احترام کا موجب بنے (جیسے جہاد اور دوسرے فلاحی کاموں میں خرچ کرنا اور اسی طرح کے اور کاموں میں) تو یہ اخلاص کے منافی نہیں ہے کہ کھلے طور پر خرچ کرے۔

انفاق میں اخلاص اور دکھلاوا

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص کے مختلف درجات ہیں، اللہ تعالیٰ

کا فضل اور بخشش ہر شخص پر اس کے اخلاص کے مطابق ہوتا ہے، آخرت میں اعمال کے پیمانے کا وزن اور ہلکا پن اخلاص کے درجے پر منحصر ہے، سورہ بقرہ میں ان لوگوں کی حالت جو اپنے مال کو اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک اچھے باغ سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایک اچھی زمین پر واقع ہو اور اس میں کافی زیادہ بارش برسے تو اپنا پھل دوگنا دے، یا اس پر کم بارش برسے، اس لیے جس طرح اچھی زمین سے ہمیشہ اچھی فصل حاصل ہوتی ہے اسی طرح عمل صالح کا نتیجہ بھی ہمیشہ اچھا ہوتا ہے، اور اللہ کی مہربانی اس میں شامل ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے عمل سے باخبر ہے، اور اس عمل میں جو اخلاص کی مقدار ہے اس سے بھی باخبر ہے، (واللہ ماتعملون بصیر)

(قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ) (بقرہ 263) ترجمہ: "اچھی بات (ضرورت مندوں کے ساتھ) اور معاف کردینا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد کسی طرح کی تکلیف پہنچانی ہو اور اللہ بہت بے پروا، بے حد بُردبار ہے"

یہ آیت دراصل پچھلی آیت کی تکمیل ہے، صدقہ دیتے وقت احسان جتانے اور تکلیف دینے کو چھوڑنے اور ترک کرنے پر ترغیب ہے، فرماتے ہیں: اچھی اور پسندیدہ گفتگو (حاجت مند کے سامنے) معاف اور درگزر کرنا (ان کے تکلیفوں اور اذیتوں سے) اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد ظلم اور اذیتیں دی جائیں، یہ بھی جان لیں جو کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہو درحقیقت اپنی نجات اور بچاؤ کا ذخیرہ کر رہے ہو، اور خدا تعالیٰ (اس سے) بے نیاز ہے یعنی اسے کی ضرورت نہیں ہے اور (تمہاری ناشکری اور برائیوں کے مقابلے میں) بُردبار ہے۔

بخل

بخل لغت میں: سخاوت، عطاء اور بخشش کرنے کے مقابلے میں بولا جاتا ہے، اگر کوئی مالدار شخص اپنی دولت اور مال کسی جائز اور بہتر جگہ پر خرچ کرے تو یہ سخاوت کہلائے گی، لیکن اگر مال و دولت کسی مناسب جگہ پر خرچ کرنے سے گریز کرے تو یہ بخل کہلائے گا، (مفردات قرآن کریم، راعب اصفہانی، صفحہ ۱۰۹ "بخل")۔

لفظ بخل "۱۲" مرتبہ اور "۷" آیات میں (آل عمران: ۱۸۰، نساء، آیہ ۳۷؛ توبہ، آیہ ۷۶؛ محمد، آیات ۳۷ و ۳۸؛ حدید، آیہ ۲۴؛ لیل، آیہ ۸) میں مصدری صیغوں،

فعل ماضی اور فعل مضارع کی صورت میں استعمال ہوا ہے، سورہ لیل کی آیت "۵ تا ۸" میں یہ لفظ "اعطاء" کے مقابل استعمال ہوا ہے جس کا معنی: دینے اور عطاء کرنے کا ہے، اس بناء پر جو بندہ دینے والا اور عطاء کرنے والا نہیں ہے وہ بخیل ہے۔

اس لیے، فرہنگ اصطلاحات و مفہیم قرآنی میں بخل کا ایک وسیع مفہوم بیان ہوا ہے اور اس کا اطلاق نیک اعمال کے ترک کرنے، جہاد، صدقہ، خیر خواہی اور اس جیسے کام نہ کرنے پر ہوتا ہے، بہ ہر حال، قرآنی لغت میں بخل اس کے لغوی معنی سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے، لہذا بعض نے بخل کو کرامت اور بزرگی کے خلاف سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس کے معنی ممانعت اور روکنے کے ہیں، کیونکہ بخیل شخص دوسروں کو کچھ دینے سے باز رہتا ہے اور دوسروں کو خود سے فائدہ اٹھانے سے روکتا ہے۔

بخل کے مضر اثرات

بخل کے ہر ایک درجے کے الگ الگ اثرات ہوتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ مال خرچ کرنے سے مطلق روکنا یہ ناشکری اور کفران نعمت کی علامت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بہت ساری نعمتیں دی ہیں تاکہ ان سے فائدہ اٹھائیں، خود اور دوسروں کو آخرت کے لیے جو ہمیشہ رہنے والی ہے تیار رکھے، اگر انسان اپنی عقل سے استفادہ نہ کرے، بیوقوفی اور جہالت میں رہے اور حقیقی عقلمندی اختیار نہ کرے تو وہ ناشکری کرنے والا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے تاکہ خدا کو اور خود کو پہچان لے، اور اپنی زندگی کے فلسفے اور حکمت کو جان لے اور خدا کے راستے میں صحیح طریقے سے چلے، جو شخص نعمتوں کو اکھٹا کر کے اس کے انبار لگادیتا ہے اور اس سے اچھے طریقے سے فائدہ نہیں اٹھاتا درحقیقت وہ نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے، بعض اوقات یہ بخل اپنے بارے میں ہوتا ہے، اور نہ صرف یہ کہ وہ نعمت کسی دوسرے کو نہیں دیتا، بلکہ دوسروں کو بھی بخل کا حکم اور ترغیب دیتا ہے (نساء آیہ ۳۷؛ المیزان، ج ۴، صفحہ ۳۵۵)

جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو درست طریقے سے استعمال نہیں کرتے درحقیقت وہ لوگ قیامت، محشر اور اجر و ثواب کے منکر ہیں۔

لہذا اللہ تعالیٰ بخل کو ان لوگوں کی غلط بصیرت اور رویہ کی علامت قرار دیتا ہے جو قیامت اور اس کے اجر کا انکار کرتے ہیں، (لیل آیات: ۸ اور ۹)

اجنبی کے باغ کے پھل کا استعمال

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ درخت جو کھلے راستے میں بغیر چار دیواری کے ہیں اور پھل والے ہیں، اگر ان کے پھل میں سے کھایا جائے یا فائدہ اٹھایا جائے تو شریعت کی رو سے کوئی ممانعت نہیں ہے، کیونکہ یہ درخت عام مسلمانوں کی ملکیت ہیں، ان کو بغیر کسی حفاظتی حصار یا دیوار کے چھوڑ دینا ان کا پھل کھانے کی اجازت اور اباحت کی دلیل ہے۔

حتیٰ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو کسی باغ سے گزر رہا ہو اجازت دی ہے کہ اس کے پھل میں سے کھائے، لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ پھل کو جمع کر کے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے، البتہ یہ نبوی اجازت اس باغ کے متعلق ہے جو کسی شخص کی ملکیت ہو، چنانچہ ان درختوں کے پھل اور میوے میں سے کھانا جو عام مسلمین کے ملکیت میں ہیں بطریق اولیٰ جائز ہے۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا: (مَنْ دَخَلَ حَائِطًا فَلْيَأْكُلْ وَلَا يَتَّخِذْ حُبْنَةً) ترمذی (1287) ابن ماجہ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: (إِذَا مَرَّ أَحَدُكُمْ بِحَائِطٍ فَلْيَأْكُلْ وَلَا يَتَّخِذْ حُبْنَةً) ابن ماجہ (2301) (وصحہ البانی فی صحیح الترمذی) یعنی: "جو کوئی بھی کسی کے باغ میں داخل ہو اس کے پھل سے کھائے لیکن اپنی جھولی نہ بھرے"

دوسرے الفاظ میں اس طرح روایت کی گئی ہے: "جب بھی تم میں سے کوئی کسی کے باغ سے گزرے اس کے پھل سے کھا سکتا ہے لیکن اپنے جھولی اس سے پُر نہ کرے"

دوسری حدیث ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إِذَا أَتَيْتَ عَلَى رَاعٍ فَتَادِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَإِنْ أَجَابَكَ إِلَّا فَاشْرَبْ فِي غَيْرِ أَنْ تُفْسِدَ، وَإِذَا أَتَيْتَ عَلَى حَائِطٍ بُسْتَانٍ فَتَادٍ صَاحِبِ الْبُسْتَانِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَإِنْ أَجَابَكَ إِلَّا فَكُلْ فِي أَنْ لَا تُفْسِدَ) ابن ماجہ (2300) (وصحہ البانی فی صحیح ابن ماجہ) ترجمہ: "یعنی: جب تم کسی چرواہے کے پاس آؤ تو تین بار اسے آواز دو، اگر وہ جواب دے تو بہتر ورنہ اپنی ضرورت کے مطابق بغیر خراب کیے دودھ دوہ کر پی لو، اور جب تم کسی باغ میں آؤ تو باغ والے کو تین بار آواز دو اگر وہ جواب دے تو بہتر ورنہ اپنی ضرورت کے مطابق پھل توڑ کر کھا لو، البتہ خراب مت کرو"

یہ احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ دوسروں کے باغ کے پھل میں سے کھانے کی اجازت ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ ابتداء میں تین بار باغ والے کو بلائے، (مثلاً کہے کہ: اے باغ والے) اگر جواب دے تو اس سے اجازت لے، اگر جواب نہ دے تو بقدر ضرورت اس کے پھل سے کھاسکتا ہے، بغیر اس کے کہ حد سے تجاوز کرے یا اس میں سے کچھ توڑ کر اپنے ساتھ لے جائے۔

امام بن قدامہ اپنی کتاب "المغنی: ۹/۳۳۲" میں لکھتے ہیں کہ: اگر (باغ) کی دیوار نہ ہو (یعنی اس کے اطراف کو کسی رکاوٹ یا دوسرے موانع سے بند نہ کیا گیا ہو) اور بندہ بھوکا ہو تو اس صورت میں اس کے پھل میں سے کھائے، اگر اس کو بھوک نہ ہو تو اس میں سے کچھ نہ کھائے۔

کہا کہ: اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے چند لوگوں نے ایسا کیا ہے، اگر باغ کو دیوار کے ذریعے محفوظ کیا گیا ہو تو اس سے مت کھاؤ کیونکہ یہ دیوار حریم جیسی ہے (اس باغ کے لیے) (اور مالک کی طرف سے عدم اجازت کی دلیل ہے) ابوزید تیمی سے روایت ہے کہا کہ: میں نے انس بن مالک، عبد الرحمن بن سمرہ اور ابو بردہ کے ساتھ (رسول اللہ کے اصحاب) سفر کیا، اور وہ ایک باغ سے گزر رہے تھے اور اس سے کھا رہے تھے، اور یہ ابن عباس، ابوبردہ اور حضرت عمرؓ کا قول بھی ہے، عمرؓ نے کہا: کھاؤ لیکن اس سے کچھ بھی ساتھ لیکر نہ جاؤ، پھر امام احمد سے روایت کیا گیا ہے انہوں نے کہا: درخت کے نیچے گرے ہوئے پھل سے کھاؤ، اگر درخت کے نیچے پھل نہ گرا ہو تو دوسروں کے پھل سے نہ کھاؤ، اور لکڑی، پتھر درخت اور پھل پر نہ پھینکو اس لیے کہ اس طرح پھل خراب ہو جائیں گے (اور یہ حد سے تجاوز ہے)، پس اگر باغ کی حفاظت دیوار لگا کر کی گئی ہو تو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، ابن عباسؓ کے اس قول کے مطابق: اگر اس کے ارد گرد کوئی دیوار ہو تو یہ اس باغ کے حریم کے طور پر تصور کیا جائے گا، تو پھر اس سے مت کھاؤ، اگر دیوار نہ ہو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، (کہ اس کے پھل میں سے کھائے) اس کے ارد گرد دیوار اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مالک اپنے باغ کے پھل کھانے کی اجازت نہیں دیتا۔

لیکن شیخ عثیمینؒ کہتے ہیں کہ: باغ کے ارد گرد کے دیوار کو اس کے پھلوں کو کھانے کے جواز یا عدم جواز سے مشروط کرنا محض ایک رائے ہے، کیونکہ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: (من دخل حائطاً) یعنی: جو کوئی بھی کسی حائط میں داخل ہو، اور حائط اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو

اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہو، اس بنیاد پر جو نخلستان جس کی اطراف میں دیوار ہو یا وہ باغ جو بغیر دیوار کے ہو کوئی فرق نہیں ہے، اور جو کچھ حدیث سے ثابت ہوتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ اس سے کھائے مگر اپنے ساتھ نہ لے جائے، درخت پر کوئی چیز نہ پھینکے بلکہ اپنے ہاتھوں سے پھل اتارے، یا اگر زمین پر گرا ہوا ہو تو اس سے کھالے، اسی طرح یہ شرط بھی رکھی گئی ہے کہ باغ کے مالک کو تین بار بلائے، اگر جواب دے تو وہ اجازت لے کر کھائے، اگر جواب نہ دیا تو اس سے کھالیوے، یہ وہ چیز ہے جس پر حدیث دلالت کرتی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے، لیکن جمہور کی رائے ہے کہ یہ کام جائز نہیں ہے، اس ضمن میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا تعلق اسلام کے ابتدائی ایام یا ہجرت کے اوائل سے ہے، اس زمانے میں لوگ غریب اور ضرورت مند تھے، جبکہ ضرورت نہ ہونے کی صورت میں جائز نہیں ہے، لیکن صحیح رائے یہ ہے کہ یہ (حکم) عام ہے (چاہے محتاج بندہ ہو یا نہ ہو) (الشرح الممتع: ۶/۳۳۹)

خلاصہ:

وہ درخت جو سڑک کنارے، عام راستوں میں اور خاص طور پر وہ درخت جن کا کوئی مالک نہ ہو ان کا پھل سے کھانا جائز ہے، اسی طرح اس باغ و بستان سے کھانا جن کے مالک ہوں مگر شروط کی رعایت کرتے ہوئے کھانا جائز ہے۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30) سورة الضحیٰ

سورة الضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اس کی گیارہ آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کو «ضُحیٰ» کہا گیا ہے کیونکہ اس کا ابتدائی لفظ «وَالضُّحیٰ» ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے «ضُحیٰ» کی قسم کھائی ہے جو کہ دن کا آغاز ہے، روشنی کے اس اہم وقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے قسم کھائی ہے، اور اس لیے بھی کہ یہ سورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازل ہوئی تھی جو کہ خالص نور تھے۔

امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: سورہ ضحیٰ کے آخر میں اور اس کے بعد والی تمام سورتوں کے اختتام پر "اللہ اکبر" کہنا یا "اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر" پڑھنا سنت ہے، مفسرین اس تکبیر کے کہنے کے موقع پر ذکر کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے میں کچھ مدت تک تاخیر ہوئی، پھر فرشتہ نے آکر آپ کو سورة الضحیٰ پوری پڑھ کر سنادی تو آپ نے خوشی اور مسرت سے "اللہ اکبر" کہی، لیکن ابن کثیر کہتے ہیں: یہ روایت ایسی اسناد نہیں رکھتی جس کی بناء پر صحیح یا ضعیف ہونے کا فیصلہ کیا جاسکے۔

سورة الضحیٰ اور سورة الیل کے درمیان ربط و مناسبت

چونکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ لیل کا اس طرح اختتام فرمایا کہ سب سے متقی آدمی کو اس قدر اجر و ثواب دیا جائے گا کہ وہ راضی ہو جائے گا تو سورة الضحیٰ کا آغاز فرمایا اپنے نبی کو خوش کرنے کے لیے ان انعامات کے ذریعے جو قیامت کے دن عزت اور مقام و مرتبہ ان کو عطا کریں گے۔

سورة الضحیٰ کے الفاظ، حروف اور آیات کی تعداد

سورة الضحیٰ مکہ مکرمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے نازل ہوئی۔

سورة الضحیٰ مکی سورتوں میں سے ہے جس کا ایک (۱) رکوع، گیارہ (۱۱) آیتیں، چالیس (۴۰) الفاظ، ایک سو چیاستھ (۱۶۶) حروف اور اڑستھ (۶۸) نقطے ہیں۔

(واضح رہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

یہ سورہ مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے منقطع ہوا، ایک طرف وحی کا عارضی تعطل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اضطراب اور پریشانی کا باعث بنا اور آپؐ نہیں جانتے تھے کہ آپؐ پر وحی میں کیوں خلل پڑا ہے، اور یہ سوچتے اور پریشان ہوکے کہ کہیں ان سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی وجہ سے اس کا مہربان رب ان سے ناراض ہوا یا اس کے علاوہ کوئی وجہ تھی؟

دوسری طرف دشمنوں میں وسیع پروپیگنڈہ جاری تھا اور انہوں نے اپنے پروپیگنڈے میں کہا: وہ خدا جس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے تعلق کا دعویٰ کیا تھا، اس خدانے اسے تنہا چھوڑ دیا، اس سے رابطہ منقطع کر دیا، یہ خدا جس سے نبیؐ نے تعلق ہونے کا دعویٰ کیا تھا وہ خدا نہیں تھا بلکہ ایک جن تھا جس نے نبیؐ کو وسوسے کر کے (نعوذ باللہ) فتنہ میں ڈالا، اور وہ اسے وحی الہی سمجھتا تھا تو اس جن نے اس سے رشتہ توڑ دیا ہے، اس اضطراب اور پریشانی اور دشمن کے شدید پروپیگنڈے کے درمیان یہ سورت نازل ہوئی جس کے دوران ہمارے رب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ آپ کو دشمن سمجھا ہے، بلکہ وحی کی عارضی رکاوٹ میں لامحدود حکمت مضمحل ہے، جس طرح دن کی شدید گرمی کے بعد رات کا آنا مضمحل ہے۔

سورة الضحیٰ کا سبب نزول

سورة الضحیٰ کے سبب نزول کے بارے میں عالم اسلام کے مشہور دانشور مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں؛ بخاری و مسلم میں حضرت جندب بن عبد اللہ کی روایت سے آیا ہے اور ترمذی نے حضرت جندب سے یہ روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انگلی زخمی ہو گئی اس سے خون جاری ہوا، آپؐ نے

فرمایا: (ان انت الاصبیح دمیت وفي سبیل اللہ مالقیث) یعنی: تو ایک انگلی ہی تو ہے جو خون آلود ہوگئی اور جو کچھ تکلیف تجھے پہنچی وہ اللہ کی راہ میں ہے (اس لیے کیا غم ہے) حضرت جندب نے یہ واقعہ ذکر کرکے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد (کچھ روز) جبرئیل امین کوئی وحی لے کر نہیں آئے تو مشرکین مکہ نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے چھوڑ دیا اور ناراض ہوگیا، اس پر یہ سورت ضحیٰ نازل ہوئی۔

حضرت جندب کی روایت جو بخاری میں ہے اس میں ایک دو رات تہجد کے لیے نہ اٹھنے کا ذکر ہے، وحی میں تاخیر کا ذکر نہیں، جبکہ ترمذی میں تہجد میں ایک دو رات نہ اٹھنے کا ذکر نہیں صرف وحی میں تاخیر کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، ہوسکتا ہے کہ دونوں باتیں پیش آئی ہوں، راوی نے کبھی ایک کو بیان کیا کبھی دوسری کو، اور یہ عورت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا ام جمیل ابولہب کی بیوی تھی، جیسا کہ دوسری روایت میں ہے اور تاخیر وحی کے واقعات متعدد مرتبہ پیش آئے ہیں، ایک شروع نزول قرآن میں پیش آیا جس کو زمانہ فطرۃ الوحی کہا جاتا ہے، یہ سب سے زیادہ طویل تھا۔

ایک واقعہ تاخیر وحی کا اس وقت پیش آیا جب مشرکین یا یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال فرمایا اور آپ نے بعد میں جواب دینے کا وعدہ فرمالیا، مگر انشاء اللہ نہ کہنے کے سبب کچھ روز تک سلسلہ وحی بند رہا اس پر مشرکین نے یہ طعنہ دینا شروع کیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا ان سے ناراض ہوگیا اور ان کو چھوڑ دیا، اسی طرح کا یہ واقعہ ہے جو سورہ ضحیٰ کے نزول کا سبب ہوا، یہ ضروری نہیں کہ یہ سب واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے ہوں، بلکہ آگے پیچھے بھی ہوسکتے ہیں۔

طبرانی، ابن ابی شیبہ اپنی مسند میں واحدی او ردیگر نے ایک سند سے (روایت کیا ہے) کہ اس میں ایک شخص ہے جس کی شناخت نہیں ہوسکی ہے، وہ حفص بن سعید قریشی سے روایت کرتا ہے، حفص اپنی ماں سے اور وہ پھر اپنی ماں خولہ سے روایت کرتی ہے جو کہ رسولؐ کی گھر میں ملازمہ تھی یہ کہتی ہے کہ کتے کا ایک بچہ رسولؐ کے گھر میں داخل ہوا اور آپؐ کے تخت کے نیچے چلاگیا اور وہاں مرگیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار دن انتظار کیا وحی نہ آئی، فرمایا: اے خولہ یہ کیا ہوگیا کہ خدا کے رسولؐ کے گھر میں جبرائیل امین نہیں آ رہا؟ میں

نے اپنے آپ سے کہا: بہتر ہے کہ گھر کی اچھی چھان بین کر کے اس کی صفائی کروں، جب میں چارپائی کے نیچے جھاڑو دے رہی تھی تو ایک کتے کے بچے کی لاش نکالی جو وہیں مر گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قمیص میں کانپتے ہوئے تشریف لائے، اور جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی تو اس وقت آپ کا جسم مبارک کانپ جاتا، پھر خدائے بزرگ و برتر نے "وَالضُّحٰی... تا... فترضیٰ" نازل فرمائی۔

حافظ ابن حجر نے کہا: جبرئیل کے تاخیر سے آنے کا مسئلہ کتیا کے مردہ بچے سے مشہور ہے، لیکن اس واقعہ کا سبب نزول ہونا غریب بلکہ شاذ اور مردود ہے۔

ابن حجر نے عبداللہ بن شداد سے روایت کیا ہے: کہ خدیجہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میرے خیال میں تیرا رب تجھ سے بیزار ہو گیا ہے، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

اسی طرح عروہ سے روایت کیا ہے: جبرئیل امین کافی دیر تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں آئے، تو رسول گرامی انتہائی بے چین ہو گئے۔ اُم المؤمنین خدیجہؓ نے کہا: میرے خیال میں تیرا رب تجھ سے بیزار ہو گیا ہے، کہ یہ ساری بے صبری آپ کی دیکھی جاسکتی ہے، تو پھر یہ آیت نازل ہو گئی۔ یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں اور ان کے راوی ثقہ اور سچے ہیں۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں: بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ام جمیل اور خدیجہ دونوں نے یہ جملہ کہا ہے، خدیجہ نے ہمدردی کی بنیاد پر اور ام جمیل نے طنز کے طور پر۔

سورة الضحیٰ کا خلاصہ:

بعض روایات کے مطابق جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی تاخیر اور وقتی انتظار کی وجہ سے پریشان اور بے چین تھے، دشمنوں کی زبانیں بھی دراز ہوئیں، تو یہ سورت نازل ہوئی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر رحمت کی بارش برسی۔

اس سورت کا آغاز دو قسموں کے ساتھ ہوتا ہے، پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دیتی ہے کہ پروردگار نے تجھے ہرگز نہیں چھوڑا ہے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گزشتہ زندگی کو ان کی نظروں میں لا کر بتادیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمیشہ ہر قسم کی رحمتوں میں شامل کیا، اور زندگی کے مشکل ترین لمحات میں ان کا ساتھ دیا۔

اس لیے آخری آیتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ (خدائے بزرگ و برتر کی نعمتوں کے شکرانے کے طور پر) یتیموں اور حاجت مندوں کے ساتھ اچھائی اور نرمی کا برتاؤ کریں اور اللہ کی نعمتوں کا اظہار کریں۔

سورة الضحیٰ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالضُّحَىٰ ۝۱ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝۳ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝۴ وَلَسَوْفَ
يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝۵ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝۷ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝۸
فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

سورت کا مختصر ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالضُّحَىٰ ۝۱	چاشت کے وقت کی قسم (جب سورج طلوع ہوتا ہے اور ہر طرف پھیل جاتا ہے) (۱)
وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝۲	اور رات کی جب طاری ہو جائے (۲)
مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝۳	نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا (اور نہ دشمن بنایا) (۳)
وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝۴	اور آخرت (یعنی بعد کی حالت) تمہارے لیے پہلی حالت سے کہیں بہتر ہے (۴)
وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝۵	اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا (۵)
أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝۶	کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا، پس جگہ دی (۶)
وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝۷	اور اس نے تجھے راہ حق کی تلاش میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا (۷)
وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝۸	اور تنگدست پایا تو غنی کر دیا (۸)
فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹	پس تم یتیم پر ستم نہ کرنا (۹)
وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰	اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک (۱۰)

اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کرتے رہنا (۱۱)	وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

مختصر تفسیر:

چاشت کے وقت کی قسم (جب سورج طلوع ہوتا ہے اور ہر طرف پھیل جاتا ہے) (۱)	وَالضُّحَىٰ ۝۱

(ضحیٰ کی قسم) ضحیٰ دن کے آغاز میں سورج کے طلوع ہونے کے وقت کا نام ہے، یعنی: دن کے اُجالے کی قسم۔

قسم کی دلیل: اہم خبر کا بیان کرنا، یہ عرب کا اسلوب بیان ہے جو توجہ مبذول کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

روشنی اور نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو کہ شرک کے اندھیرے میں ہدایت کا نور ہے۔

یادر ہے کہ: دن کی روشنی اور رات کی تاریکی اور سکون بھی اللہ تعالیٰ کی دو عظیم نعمتیں ہیں جن کی قسم رب عظیم نے کھائی ہے۔

اور رات کی جب طاری ہو جائے (۲)	وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝۲

(قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے) اصمعی کہتے ہیں: "سجو شب، یعنی دن کا ڈھانپنا ہے، جیسا کہ ایک شخص خود کو کپڑے میں لپیٹتا ہے"

اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ سورت میں رات کو دن پر مقدم کیا تھا جبکہ اس سورت میں مؤخر ذکر کیا ہے، یہ دن اور رات میں سے ہر ایک کی فضیلت پر توجہ دلانے کے لیے ہے، کیونکہ رات کو سبقت میں فضیلت حاصل ہے، اور دن کو روشنی میں، دلیل یہ ہے کہ صرف وقت چاشت اور رات کی قسم کھائی ہے، یہ وقت اور زمانہ کی اہمیت پر توجہ دینا ہے کہ دن اور رات کا آنا جانا اس پر دلالت کرتا ہے، اس نے خاص طور پر چاشت کے وقت کو یاد دلانے کی وجہ یہ بتائی کہ یہ وقت رات کی تنہائی کے بعد لوگوں کے اکھٹے ہونے اور ایک دوسرے سے ملنے کا ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: سجی: یعنی وہ اپنے اندھیرے کے ساتھ واپس آئی، (خازن: ۲۵۸/۴)

مفسرین کی آیت کی تفسیر میں آراء اور نظریات:

- 1 - رات کی قسم جب وہ آرام پکڑ لے۔
- 2 - قسم ہے رات کی جب اس کی تاریکی سب جگہوں کو ڈھانپ لے۔
- 3 - قسم ہے رات کی کیونکہ تمام جگہوں کو سیاہ اور تاریک کر دیتی ہے۔
- 4 - رات کی قسم کیونکہ یہ لمبی ہے اور عبادت اور نماز کا موقع ہے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝۳	نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا (اور نہ دشمن بنایا) (۳)

یہ جواب قسم ہے کہ: "تیرے رب نے تجھے نہیں چھوڑا" اس آدمی کی طرح جو دوسرے کو الوداع کہتا ہے، پس اس نے تجھ سے وحی منقطع نہیں کی ہے "اور وہ ناراض نہیں ہوا ہے" تجھ پر بغض رکھ کر تجھ سے نفرت نہیں کی ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں: "وَالضُّحَىٰ" نور کے معنی میں ہے، یہ نزول وحی سے استعارہ ہے، اور "والیل" کا معنی رات ہے، وحی کا منقطع ہونا مراد ہے، معنی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیغمبر پر غصہ نہیں فرمایا ہے، اس طرح مشرکین کی بات کو رد کیا جو کہتے تھے: کہ خدا نے محمد کو چھوڑ دیا ہے، جواب قسم وہی ہے۔

"مَا وَدَّعَكَ" تجھے نہیں چھوڑا ہے، تجھے چھوڑنے ترک کرنے کو نہیں کہا ہے، "وَدَّعَ" یعنی خدا حافظ کہا، "وَدَّعَكَ" یعنی: تجھے خدا حافظ اور الوداع نہیں کہا۔

"مَا قَلَىٰ" یعنی غصہ نہیں کیا، اور دشمن نہیں بنایا۔

وَلَا خِزَّةٌ خِيَّتْ لَكَ مِنَ الْاُولٰٓئِ ۝۴	اور آخرت (یعنی بعد کی حالت) تمہارے لیے پہلی حالت سے کہیں بہتر ہے (۴)

اس مبارک آیت میں درج اہم نکات پر غور کیا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے یہ کہ: کہا گیا کہ آخرت تیرے لیے دنیا سے بہتر ہے۔

دوسرا یہ کہ: گذرے ہوئے وقت سے بہتر اور روشن مستقبل آپ کا منتظر ہے۔

سوم یہ کہ: وحی کا نزول اس وقفے کے بعد پہلے سے بہتر اور آسان حالت میں ہوگا، پہلے آپ کے لیے وحی کا حصول مشکل اور دشوار تھا، لیکن مستقبل میں آپ کو اس سے بہتر اور آسان طریقے سے موصول ہوگی۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے: بعض مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کا حاصل کرنا اتنا دشوار ہوتا تھا کہ سخت سردی کے موسم میں بھی آپ کے پورے جسم سے پسینہ جاری ہوتا تھا۔

حدیث مبارکہ عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت سے مروی ہے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر سوئے ہوئے تھے، جس کے کھر درے پن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو پر نشان چھوڑا تھا، جب نیند سے بیدار ہوئے تو ان کے پہلو پر میں نے ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ ہمیں اجازت دیں گے کہ اس چھٹائی پر آپ کے لیے کچھ بچھالیں؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مالی و للدنیا، إنما مثلی و مثل الدنيا کراکب ظل تحت شجرة ثم راح وترکھا) ترجمہ: "مجھے دنیا سے کیا سروکار، میری اور اس دنیا کی مثال اس مسافر کی سی ہے جو کسی درخت کے نیچے سایہ حاصل کرنے کے لیے ٹھہرا، پھر چل پڑا اور اس درخت کو چھوڑ دیا"۔

طبرانی نے "معجم اوسط" میں ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن شہروں اور ملکوں کو میری امت میرے بعد فتح کرے گی وہ مجھے دکھائے گئے ہیں میں ان کے مشاہدہ سے خوش ہوا ہوں، پھر خدائے بزرگ و برتر نے "وَلَا خَيْرَ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُولٰٓئِہٖ" نازل فرمائی، (اس روایت کی سند حسن ہے)۔

حاکم اور بیہقی نے "دلائل النبوة" میں طبرانی اور دوسروں نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے: جو ملک، علاقے اور شہر یکے بعد دیگرے مسلمانوں سے مغلوب ہو کر فتح ہونے تھے وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واضح طور پر دکھائے گئے، جنہیں دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہو گئے۔

اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے
گا، پس تو راضی ہو جائے گا (۵)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰهُ ۝

«البتہ بہت جلد تیرا رب تجھے عطا کرے گا» دین کے کام میں وسعت، اجر

عظیم ، جنت میں اعلیٰ علیین، حوض کوثر اور آخر میں اپنی امت کے لیے شفاعت کی نعمت، "پھر تم راضی ہو جاؤ گے" ان اجر اور نعمتوں سے۔

"فَتَرْضَىٰ" رضایت کے مادہ سے ہے، رضا اس حالت کو کہا جاتا ہے کہ انسان کو اندرونی یعنی دلی طور پر کسی قسم کا اعتراض نہ ہو۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یعنی آپؐ کو شفاعت عطا کریں گے تاکہ آپؐ راضی ہو جائیں، اس لیے ایک روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یاد کر کے فرمایا: میری امت، میری امت، اور رونے لگے، تب اللہ تعالیٰ نے جبرائیل سے کہا: جاؤ محمدؐ کے پاس اور ان سے پوچھو کہ آپؐ کیوں روتے ہیں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، جبرائیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان سے پوچھا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاملہ کا ذکر فرمایا، پھر اللہ تعالیٰ نے جبرائیل سے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ان سے کہدو: جہاں تک ان کی امت کا تعلق ہے تو آپؐ کو ہم راضی کریں گے، ناراض نہیں کریں گے۔ (اخراج از مسلم)

اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ ہر پیغمبر کی دعا اور درخواست قبول ہوئی ہے، تمام پیغمبروں نے اپنی دعائیں دنیا میں قبول کراوالی ہیں، جبکہ میں نے اپنی درخواست روز قیامت کے لیے اپنی امت کی شفاعت کے لیے رکھی ہے (بخاری، مسلم)

مفسر خازن اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: بہتر یہ ہے کہ اس سے آیت کے ظاہر کو مراد لیا جائے تاکہ دنیا اور آخرت کے خیر کو بھی شامل ہو، کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دشمنوں پر کامیابی اور غلبہ، پیروکاروں کی کثرت اور بہت زیادہ فتوحات آپؐ کو عطا کی ہیں، آپؐ کے دین کو غالب اور کامیاب بنایا، اور آپؐ کی امت کو بہترین امت قرار دیا، اور آخرت میں شفاعت عام اور مقام محمود وغیرہ آپؐ کو عطا کی ہیں، (تفسیر خازن: ۲۶۰/۴) (تألیف علی بن محمد بغدادی (م، ۷۲۵ ھ) مشہور بہ خازن)

اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إِذْ لَا أَرْضِي وَوَاحِدٌ مِنْ أُمَّتِي فِي النَّارِ) پس جب کہ ایسا ہے تو میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک میری امت میں سے ایک شخص بھی آگ میں ہو۔

آیت مبارکہ کا شان نزول:

اس آیت مبارکہ کا شان نزول پچھلی آیت کے شان نزول کی طرح ہے، ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں: وہ ممالک اور علاقے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ہاتھوں فتح ہوں گے وہ ایک ایک شہر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیے گئے آپ اس سے خوش ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی: (وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى)۔

جب یہ عظیم نعمت آپ کو دی، اور ساتھ ہی بچپن کی نعمتوں کی آپ کو یاد دہانی کرادی تاکہ اپنے خدا کا شکر ادا کریں، پس فرمایا:

آلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَى ۝۶	کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا، پس جگہ دی (۶)

یعنی: تیرے رب نے تجھے یتیم بغیر باپ کے پایا پھر آپ کو ٹھکانہ دیا تاکہ اس میں بسیں اور آباد ہو جائیں، وہ ٹھکانہ تیرے دادا عبدالمطلب اور تیرے چچا ابو طالب کا گھر تھا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شکم مادر میں تھے یا ولادت کے بعد اپنے والد کو کھویا تھا، پھر ان کی والدہ آمنہ بنت وہب فوت ہوئی جب آپ کی عمر مبارک چھ سال تھی، اور آپ آٹھ سال کی عمر تک اپنے دادا عبدالمطلب کے سرپرستی میں رہے، اس کے وفات کے بعد آپ کے چچا ابو طالب نے آپ کی سرپرستی کی ذمہ داری اٹھائی، آپ کی بعثت کے چند سال بعد ابو طالب بھی چل بسے جو کہ مسلسل آپ کے حامی اور مددگار رہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اپنے سخت دلی کی شکایت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: اگر نرم دل بننا چاہتے ہو تو یتیم کے سر پر دست شفقت پھیر دو (کفالت کرو)، اور مسکین کو کھانا کھاؤ۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ: "میں اور یتیم کا سرپرست (جنت میں) ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے" اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی والی انگلی سے اشارہ کیا۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى ۝۷	اور اس نے تجھے راہ حق کی تلاش میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا (۷)

یعنی: اے پیغمبر! حق تعالیٰ نے تجھے ایمان کی پہچان سے لاعلم پایا، اس طرح کہ تجھے معلوم نہیں تھا کہ ایمان کیا ہے اور نبوت میں سے جو کچھ آپ کے لیے ارادہ فرمایا تھا اس سے بے خبر پایا، اور تو نہیں جانتا تھا کہ قرآن کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے شرائع اور احکام سے بھی بے خبر تھے، پھر تجھے ان سب کی پہچان کرادی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس محل پر "ضلال" کو "ہدیٰ" کے مقابل والے معنی میں محمول نہیں کرسکتے، یہاں اس کا معنی شریعت کے احکام کا نہ جاننا اور نبوت کے امور سے بے خبری کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ بیان ہوا۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یعنی: بچپن میں مکہ کے وادیوں میں گم ہو گئے تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ جب اپنے چچا کے ساتھ شام جارہے تھے راستے میں گم ہو گئے تھے۔

«ضَالًّا» ضال یہاں حیران کے معنی میں ہے، ایک حد تک درست معنی ہے، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ عرب جہالت میں مبتلا ہیں آپ کی قوم گمراہی کا شکار ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی اللہ کی طرف کیسے رہنمائی کریں، اس وجہ سے حیران و پریشان تھے۔

«فَهْدًى» یعنی: اللہ نے تجھے ہدایت عطا کردی، اس ہدایت کو تیرے اختیار میں رکھا، تاکہ تو تاریخ بدل ڈالے، تجھے یتیم پایا پھر تیری محتاجیت ختم کردی، خدیجہ کو آپ کاہمسفر اور شریک حیات بنادیا، (ایک ایسی عورت جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کا پیغام بھیج دیا، یہ انتہائی اہم اقدام تھا) ایسی ہدایت جس نے تیری پوری شخصیت بدل ڈالی، سورہ نجم میں قرآن کریم کی تعبیر کے مطابق ایسی ہدایت کہ اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کی طرح آپ کی شخصیت کو تمام پہلوؤں کا تزکیہ کر کے اور سے منتخب کر کے اس کی تائید کردی، وہ پیغمبر اسلام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل، زبان، اخلاق الغرض ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی تائید کردی ہے۔

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنِي ۝۸	اور تنگدست پایا تو غنی کردیا (۸)

اے پیغمبر! اللہ تعالیٰ نے تجھے غریب، ضرورت مند اور مال و اسباب سے محروم پایا تو آپ کو بے نیاز بنادیا، اس رزق اور روزی کے ذریعے جو ملکوں کے فتوحات کے ذریعے اور کفار کی آدیوں سے دیا، یا تو معنی یہ

ہے کہ: تجھے قبل از رسالت سب سے پہلے خدیجہ بنت خویلد کے مال سے تجارت میں مالدار بنادیا، پھر ابوبکر صدیقؓ کے مال کے ساتھ، پھر انصار کے مال کے ساتھ، پھر رسالت کے بعد حصول مال غنیمت سے اور پھر ہجرت کے بعد بھی اور آپ کو تھوڑے سے مال سے راضی کر کے قناعت دیکرامیر بھی بنادیا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: (لیس الغنی عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس) ترجمہ: "تو نگری یہ نہیں ہے کہ سامان زیادہ ہو، بلکہ امیری یہ ہے کہ دل غنی ہو"

«فَأَغْنَى»: غنی کے مادہ سے ہے، مراد یہ ہے کہ انسان میں رضامندی جیسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں، کسی چیز یا کسی شخص کی طرف انسان میں محتاجگی کا احساس پیدا نہیں کرتا، بلکہ بے نیاز اور بے پروا بنادیتا ہے، اس پر تین نعمتیں گنواں کر ان کو تین چیزوں کی وصیت کر کے فرماتے ہیں:

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝	پس تم یتیم پر ستم نہ کرنا (۹)

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم: ان تمام نعمتوں کے ساتھ کسی یتیم کے مال اور اس کے حقوق پر اس کی کمزوری اور بے کسی کی وجہ سے قبضہ نہ کرو، بلکہ اُسے اس کا حق دو اور اپنی یتیمی کو یاد کرو۔

بچپن میں اپنے والد یا والدین کو کھونے والے یتیموں کا وجود کسی بھی معاشرے میں ناگزیر ہے، تمام الہی، ابراہیمی ادیان میں ان بچوں پر توجہ دی گئی ہے اور اس میں ان کے ساتھ عہد کرنے، ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

ہمارے عظیم رب نے ادیان الہی کے پیروکاروں خاص طور پر بنی اسرائیل کی رہنمائی اس نیکی کی طرف کی ہے: "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِآلِ الدِّينِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ" (سورہ بقرہ آیت: ۸۳) ترجمہ: "اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ عبادت نہ کرو (کسی کی) بجز اللہ کے اور حسن سلوک سے پیش آنا (اپنے) ماں باپ سے اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے بھی)"

یہ آیت کریمہ متعدد قسم کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کو اہل ایمان کے ضروری فرائض اور نیک اعمال میں سے قرار دیتی ہے یتیموں کی دیکھ بھال بھی ہے، کیونکہ اس عہد کی شقیں عام ہیں، بنی اسرائیل کے لیے مختص نہیں

ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے حقیقی اصول ہیں جو کہ تمام شرائع مقدسہ میں تھے اور یہ تبدیل نہیں ہوتے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ" (بقرہ: ۱۷۷) ترجمہ: "نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لایا اور مال دیا اس کی محبت کے باوجود قربت والوں اور یتیموں اور مسکینوں کو"

اسی طرح سورہ انعام آیت: ۱۵۲ میں فرماتے ہیں: "وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" ترجمہ: "اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو"

قرآن کریم یتیموں کے بارے میں لوگوں اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری کو واضح تشریحات کے ساتھ بیان کرتا ہے، یہ مقدس اور آسمانی کتاب یتیموں کی عزت کرنے اور ان کے ذاتی اور معاشرتی، مادی اور روحانی انفرادی و اجتماعی امور کی دیکھ بھال کی تاکید کرتی ہے، ان کے دیکھ بھال میں کوتاہی پر سرزنش بھی کرتی ہے، اور اسے دنیا و آخرت کے عذاب کا سبب قرار دیتی ہے۔

قرآن مجید کی مختلف آیات میں یتیم افراد کے مادی اور روحانی امور میں بھلائی اور دیکھ بھال کو والدین اور رشتہ داروں کے بعد رکھا ہے، اور اس نیکی کو اخلاقیات کی تعمیر اور بخل، غرور اور اخلاقی فساد کے خلاف جدوجہد اور جنگ کی قرار دیا ہے۔

یتیم:

عرب کی اصطلاح میں یتیم اس نابالغ کو کہتے ہیں جس کا والد فوت ہو گیا ہو، بالغ ہونے کے بعد یہ نام اس سے ہٹا دیا جاتا ہے، (لسان العرب، ابن منظور، دار صادر، بیروت، سوم، 1414 ق، ج 12، ص 645)

شریعت مقدسہ کے نقطہ نظر سے ایک یتیم بچہ اپنے باپ کی محبت کے سایہ سے محروم ہو کر بہت زیادہ تنہائی اور کمی محسوس کرتا ہے، جس کی تلافی

محبت اور دوستی سے کی جاسکتی ہے، مہربان اور رحم دل مائیں کسی حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہیں، لیکن اسلام نے ہر ایک کو مکلف کیا ہے کہ اس اہم معاملے میں ماں اور سرپرست کی موجودگی کے صورت میں بھی اس کی مدد کریں، اگر ماں یا سرپرست نہیں ہے تو اسے اپنی حفاظت میں رکھیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں کے ساتھ جو ہمدردی اور مہربانی کا برتاؤ کیا وہ ناقابل بیان ہے، اور ان کے حق میں اچھی رہنمائی کی ہے، اور بہت سی ہدایات ان کے حقوق کی تگ و دو اور توجہ کے میدان میں جاری کی ہیں۔

وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰	اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک (۱۰)

جب بھی کوئی فقیر مسکین اور ضرورت مند تجھ سے مدد کے طور پر کوئی چیز مانگے تو اسے مت جھڑک اور اپنے پاس سے مت بھگاؤ، کیونکہ تم خود بھی فقیر کی حالت میں تھے، پس یا تو اسے خوراک دو یا پھر نرمی سے جواب دو۔

مفسرین حضرات نے اس آیت کریمہ کے دو معنی اور تفسیریں بیان کی ہیں: اگر لفظ سائل مانگنے والے کو حاجتمند شخص اور مدد کے طلبگار کے معنی میں لے لیں تو اس عبارت کا معنی وہی ہے کہ اگر اُس کی مدد کرنے کی استطاعت رکھتے ہو تو مدد کرلو، اگر استطاعت نہیں رکھتے تو اس سے نرمی اور مہربانی کے ساتھ معذرت کرلو، لیکن کسی بھی صورت میں اسے خود سے دور مت بھگاؤ اور مت ڈانٹو، اس معنی کے اعتبار سے یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ: "تجھے تنگدست پایا تو بے نیاز بنادیا"، اور اگر سائل کو سوال کرنے والا، یعنی: وہ جو دین کے مسائل سے متعلق پوچھتا ہے کے معنی میں لیں تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ایسا شخص جس قدر بھی ناسمجھ اور تہذیب و تربیت سے دور ہو اور ظاہری طور پر اپنی فکری اور ذہنی سوچ کے مطابق جس طرح بھی نادانی کا مظاہرہ کر کے سوال کرے، ہر صورت میں شفقت کے ساتھ اسے جواب دو، اور بدمزاج علم و دانش کے مدعی انسانوں کی طرح اسے تنگ نہ کرو، اور نہ مسترد کرو، اس مفہوم کے لحاظ سے یہ ارشاد بلند مرتبہ خدا کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ: "اس نے تجھے راستے سے ناواقف پایا پھر راستہ دکھایا"۔

حضرت ابوالدرداء ، حسن بصری، سفیان ثوری اور بعض دیگر علماء اور مفسرین نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ ترتیب کلام کے لحاظ سے یہ ارشاد: "وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهْدًى" کے جواب میں آتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کرتے رہنا (۱۱)

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

اپنے پروردگار کی ان نعمتوں کو بیان کرو جو تم پر مکمل کردی ہیں، خود پر اس کی رحمت کے آثار دکھاؤ، اس کریم اور مَنَّان کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے ان نعمتوں کو یاد کرو، انہیں جھٹلاتے ہوئے اور انکار کرتے ہوئے ان سے چشم پوشی مت کرو۔

مفسر آلوسی فرماتے ہیں: یعنی: تم یتیم تھے راستے سے بے خبر اور بے کس تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں پناہ دی اور بے نیاز کر کے ہدایت عطا کردی، پس تو ان تین نعمتوں کو مت بھلاؤ، اور یتیم کے ساتھ نرمی اختیار کرو اور مانگنے والے پر رحم کرو، کیونکہ تم نے خود یتیمی اور بی کسی کا ذائقہ چکھا ہے، سیدھے رستے کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرو، جیسا کہ خدانے تمہیں ہدایت عطا فرمائی ہے۔ (تفسیر روح المعانی: 164/30)۔

یاد رہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنے والد سے میراث میں مال و دولت نہیں بچی تھی، انہوں نے نہ صرف اپنے والد کی سرپرستی سے محروم ہونے کا درد سہاتا، بلکہ چھ (6) سال کی عمر میں وہ اپنی ماں کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے تھے، بلکہ آپؐ نے اپنی جوانی بھی غربت، فقر اور تنگدستی میں گزاری، لیکن زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ قریش کی امیرترین عورت سے ملاقات ہوئی، اس نے آپؐ کو پہلی فرصت میں اپنا شریک تجارت بنالیا، اور پھر شادی کی پیشکش کی، اور اس طرح آپؐ پر غربت سے نکلنے کے راستے کھل گئے۔

"وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" میں یہ بتانا ضروری ہے کہ: "حَدِّثْ" تحدیث سے مشتق ہے، جو کہ بات کرنے کے معنی میں آتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ کیا کریں، کیونکہ یہ بھی شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی کسی پر احسان کرے تو اسے محسن کا شکریہ ادا کرنے کا حکم ہے۔

حدیث میں ہے کہ: "جو شخص لوگوں کے احسان اور بھلائی کے مقابلے میں

شکریہ نہ کہے یا لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرے ایسا شخص اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا" (من لایشکر الناس لایشکر اللہ) .

دوسری حدیث میں ہے کہ : "جس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کیا جائے ، اس کو اس اچھائی کا بدلہ دینے چاہیے ، اگر بدلہ چکانے کے قابل کوئی چیز نہ ملے تو دینے والے کی اچھائی کا اعتراف ہی کر دے ، جب اعتراف کر دیا تو شکر کا حق ادا کر دیا" (تفسیر مظہری) .

مسئلہ :

ہر نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہے ، مال کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس سے کچھ مقدار اللہ کے راستے میں نیت کے اخلاص سے خرچ کرے ، اور علم کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ اسے دوسروں کو سکھائے پڑھائے ، (رواہ البغوی عن جابر بن عبد اللہ مظہری) .

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا

آیت "وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" میں ہمارا عظیم رب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہیں: اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کرو ، نعمتوں کو یاد کرنے کا مطلب دوسروں پر برتری حاصل کرنا اور فخر کرنا نہیں ہونا چاہیے ، بلکہ اس کا مطلب ان نعمتوں کو یاد کرنا ہے جنہوں نے انسان کو شکر گزار بنایا اور مقام عبودیت میں تکمیل بخشی ہے ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے اگر ایک نعمت چھن جائے تو ہم ان دوسری نعمتوں کا شکر بھی ادا نہیں کر پائیں گے جو ہمارے پاس باقی رہیں ۔

جو شخص اللہ کی نعمتوں کو یاد کرتا ہے وہ مصیبتوں ، سختیوں اور آفات میں مایوسی ، ناامیدی ، اضطراب اور بے چینی کا شکار نہیں ہوتا ، اس کی روح پرسکون اور دل با اعتماد ہوگا۔

لسانی اور عملی

لسانی ، وہی زبانی شکر ادا کرنا ہے ۔

عملی: کہ انفاق یعنی ضرورت مندوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں مالی تعاون ، اور ایسی بخشش جو احسان جتائے بغیر تمام نعمتوں کو شامل ہو جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہیں جیسے: مال خرچ کرنا صدقہ جاریہ میں ، ایسے

نیک کاموں میں لگانا جو باقیات الصالحات میں شامل ہوں، جیسے : مسجد بنانا، مدرسہ بنانا، اچھی اور مفید کتابوں کی نشرو اشاعت وغیرہ، پروردگار عالم کو ہمارے شکر کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر اس نے شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے، تو یہ اس لیے ہے کہ ہم تربیت کے اعلیٰ مکتب میں شکر گزاری کے بہترین درجات حاصل کر لیں۔

اللہ تعالیٰ نے نجات، کامیابی اور نعمتوں کے فراوانی کو شکر گزاری میں اور عذاب کو نعمتوں کے ناشکری میں رکھا ہے، بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے (موسیٰ علیہ السلام کے مواعظ کے سلسلے میں) اور ایک مستقل جملے میں مسلمانوں کو (دونوں باتیں قرآن کی تفاسیر میں آئی ہیں، البتہ ان کو جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے) فرماتا ہے: "لَیْسَ شَکْرُکُمْ لَّا زَیْدٌ لَّکُمْ وَلَیْسَ کُفْرُکُمْ اِنَّ عَذَابَیْ لَشَدِیْدٌ" ترجمہ: اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب سخت ہے۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ پروردگار عالم کو ہماری شکر گزاری کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہمیں شکر کرنے کا حکم دیا ہے تو یہ اس لیے کہ ہم تربیت کے اعلیٰ مکتب میں شکر گزاری کے درجات حاصل کر لیں۔

شکر کیا ہے ؟

لغت میں شکر کا مطلب : ذہن میں نعمتوں کا تصور کرنا اور قول و فعل سے اس کا اظہار کرنا ہے، دل، زبان اور عمل سے شکر ادا کرنا، اسلامی روایات میں یہی معنی آیا ہے۔

اسلام اور شکر

اللہ کی تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرنا انسان کی اہم خصوصیات میں سے ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی نعمتیں بہت زیادہ ہیں جنہیں شمار کرنا ممکن نہیں، لیکن انسان اگر یہی جان لے کہ وہ خدا کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہے تو اس کے وجود میں اس روش کی نشو و نما کا باعث بنے گا، شکر گزاری کے درجات ہیں، شکر گزاری دل، روح اور دماغ کے گہرائیوں سے اور جو کچھ اسے عطاء کیا گیا ہے، اس کا اظہار زبان سے کرنا اور منعم کی تعریف کرنا، جبکہ جوارح اور اعضاء سے شکر ادا کرنا یہ ہے کہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو ان معاملات اور امور میں جن میں اللہ کی رضا ہو بہترین طریقے سے استعمال کرے۔

قرآن کریم میں "70" سے زیادہ آیات میں ، خدا اور انسانوں کی طرف سے کیے جانے والے شکر گزاری کی قدردانی کا ذکر ہوا ہے، اور اس نیک کام کو مختلف عنوانات کے تحت انجام دینے کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسی طرح بہت سی روایات میں بھی اس کا حکم دیا گیا ہے، قرآن میں ہے -

اللہ اور والدین کا شکر

"وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصْلُهُ فِي شَأْمٍ ۖ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝١٣" ترجمہ: "اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی ہے، اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری کی حالت میں اسے اٹھائے، اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔"

شکر کے مراحل

خدا تعالیٰ کی وسیع اور لامحدود نعمتوں کا شکر تین مراحل میں ادا کیا جاتا ہے:

(دل کا شکر، زبان کا شکر اور عملی شکر)۔

دل کا شکر

اس کا مطلب یہ ہے کہ شکر گزار دل ہمیشہ اللہ کی نعمتوں اور بخششوں کو یاد کرتا ہے، اللہ کی تعظیم کرتا ہے اور اس کے آگے جھکتا ہے، اور اس کی عظمت کے سامنے خود کو چھوٹا سمجھ کر محتاجی کا اظہار کرتا ہے، خدا کے عظیم کاموں، مختلف مخلوقات اور اس کے بندوں کو خیر پہنچانے کے بارے میں غور و فکر کر کے اپنی حیرت کا اظہار کرتا ہے، اور اس طرح اس کی عاجزی بڑھتی ہے -

زبان کا شکر ادا کرنا

زبانی تشکر کا یہ معنی ہے کہ: شکر گزار شخص نعمت دینے والے کی حمد و ثناء کرتا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی تعریف کرتا ہے، اسی طرح نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے دائرے میں بھی وہ دوسروں کو اس کی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔

عملی طور پر شکر کرنا

شکر کا تیسرا مرحلہ عملی شکر ہے، عملی تشکر یہ ہے کہ نعمت دینے والے کے سامنے عمل سے شکر کا اظہار کرے، یعنی نعمت حاصل کرنے والا کوشش کرے کہ خدا کی نعمتوں کو اللہ کی نافرمانی میں استعمال نہ کرے، بلکہ ان نعمتوں کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کا ذریعہ بنائے۔

شکر ادا کرنے کی ترغیب

اسلام کا مقدس دین شکر ادا کرنے کا حکم اور اس کی ترغیب دیتا ہے اور شکر گزار افراد کی تعریف کرتا ہے، قرآن کریم فرماتا ہے: اے لوگو جو ایمان لائے! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو، اور مزید فرمایا ہے: "اور جو آخرت کا بدلہ چاہے اسے اس میں سے دیں گے اور ہم شکر کرنے والوں کو جلد جزا دیں گے۔"

کفران نعمت

کفران نعمت کا مطلب نعمتوں کو چھپانا اور نظر انداز کرنا ہے، اگرچہ خدا تعالیٰ ہماری شکرگزاری اور عبادت کا محتاج نہیں ہے، لیکن حکمت اور مصلحت کے اعتبار سے بندوں پر عبادت کو فرض قرار دیا ہے، قرآن کریم میں شکر گزاروں کو خوش خبری سنانے کے بعد فرماتا ہے: جو شخص شکر گزار بنتا ہے اس کا شکر گزار بننا اس کے فائدے میں ہے، اور جو ناشکری کرے تو خدا بے نیاز اور تعریف نوالا ہے، حالانکہ خدا تعالیٰ نعمت حاصل کرنے والوں کے شکر کا محتاج نہیں ہے، اور اس بات سے بہت اوپر اور عظیم تر ہے کہ ناشکروں کو محروم کرے، لیکن کفران نعمت اور ناشکری خود کچھ مصیبتوں کا سبب بن جاتی ہے جیسے:

1 - پستی

ایک ناشکرا شخص اپنی کمتری اور نا اہلی کا ثبوت دیتا ہے، کیونکہ انسانی عقل اور ضمیر کا تقاضا ہے کہ نعمت پانے والے شخص کو شکر گزار ہونا چاہیے، عقل اور ضمیر کو پیروں تلے روندنا ان لوگوں کا وتیرہ ہے جو کمتری اور بے وقعتی میں حیوانیت کے درجے پر پہنچ چکے ہیں، بلکہ اس سے بھی پست ہو گئے ہیں۔

2 - نعمت کا زوال

کفران نعمت، نعمتوں کے زوال اور عدم استحکام کا سبب بنتا ہے، اور نیکیوں اور برکتوں کا خاتمہ کرتا ہے، اس کے برعکس شکر گزاری ان نعمتوں کی بقا کا سبب ہے۔

3 - احسان اور نیکی میں کمی

ناشکری کا ایک اور اثر معاشرے سے نیکی اور احسان کا ختم ہونا ہے، کیونکہ ناشکری سخاوت کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور انہیں دینے سے روکتی ہے، خدا کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اگر بندوں نے ناشکری کی تو اپنے فضل اور احسان میں کمی کرتا ہے۔

4 - فوری سزا

ناشکری کا ایک اور منفی اثر، نعمت کی ناشکری کرنے والے کی اذیت اور عذاب میں جلدی کرنا۔

5 - دوزخ جانا

سب سے آخری اثر جو ناشکرے بندے پر اپنے کیے سے ہوتا ہے، وہ جلانے والے دوزخ میں جانا ہے، کیونکہ وہ خدا کی نعمتوں کو چھپا کر اور بندوں کی مہربانیوں کو نظر انداز کر کے خدا کے راستے ہٹ جاتا ہے، اور وہ ظلم کے راستے پر قدم رکھتا ہے جس کا انجام جہنم کے سوا کچھ نہیں ہوگا، یہی وہ انجام ہے جو قرآن نے انہیں دکھایا ہے: "الَّذِينَ يَبْذُلُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۚ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۚ" (سورہ ابراہیم: 28) ترجمہ: "کیا تم نے غور نہیں کیا ان لوگوں کے حال پر جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا، اور اپنی قوم کو لا اتارا تباہی کے گھر میں، یعنی جہنم، جس میں وہ داخل ہوں گے وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔"

وحی کیا ہے؟

وحی کی تعریف: ابن ابی حاتم نے عقیل کے ذریعے زہری سے روایت کیا ہے کہ ان سے وحی کے بارے میں پوچھا گیا: جو اب میں کہا: وحی وہی ہے جسے خدا اپنے رسولوں پر بھیجتا ہے، اور پیغمبر کے دل میں محفوظ رکھتا ہے، پھر وہ رسول اس سے بولتے، اور اسے لکھتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور پیغمبر کی وحی کا ایک اور حصہ کہ اس سے وہ نہیں

بولتا، وہ اسے کسی کے لیے نہیں لکھتا اور اس کے لکھنے پر مأمور بھی نہیں ہے، لیکن وہ اسے ایک حدیث کی صورت میں لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیان کرے اور ان کو تبلیغ کرے، (ترجمہ الاتقان فی علوم القرآن جلال الدین عبدالرحمن سیوطی)۔

وحی کیا ہے اور کن لوگوں پر ہوتی ہے اس بارے میں علماء فرماتے ہیں : لفظ وحی کے عربی میں متعدد معانی ہیں، جنہیں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے:

1 - غریزی الہام جانور کے لیے، جیسے شہد کی مکھی کے لیے الہام: «وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ﴿٦٨﴾» (سورہ نحل: 68)

ترجمہ: «اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی (الہام غریزی) کی کہ کچھ پہاڑوں میں سے گھر بنا اور کچھ درختوں میں سے اور کچھ اس میں سے جو لوگ چھپر بناتے ہیں»۔

اس وحی سے مراد الہام غریزی ہے، یعنی: تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی، شہد کی مکھیاں اپنی فطرت کے مطابق گھر تیار کرتی ہیں، اور اس فطرت کو خدا نے ان کے وجود میں ڈالا ہے اور وہی غریزی الہام ہے۔

2 - فطری الہام انسان کے لیے -

3 - فوری اشارہ خفیہ لفظ کے ساتھ، جیسے زکریا علیہ السلام کا اشارہ: «فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَن سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ﴿١١﴾» (سورہ مریم: 11)

ترجمہ: (تو وہ عبادت خانے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے، پس انہیں اشارے سے کہا کہ (اس تحفے کے شکرانے کے طور پر) صبح وشام (خدا کو یاد کرتے رہو) یعنی: یہ مطلب اشارے سے ان کو سمجھایا، زبان سے کچھ نہ کیا یہاں وحی بمعنی اشارہ ہے۔

4 - شیطان کا وسوسہ انسانی نفس پر:

«وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَيُؤْخَذُونَ إِلَىٰ أُولَئِهِمْ لِيُجَادِلُوهُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾»

(سورہ انعام: 121) ترجمہ: "اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں، اگر تم نے ان کا کھنا مان لیا تو

بلاشبہ تم یقیناً مشرک ہو۔"

پس لغت عرب میں وحی کے مذکورہ بالا تمام معانی ہیں، لیکن یہاں ہم جو چاہتے ہیں، وہ اس کا اصطلاحی معنی ہے، وحی کے اصطلاحی معنی سے مراد، انبیاء کے ساتھ خدا کا رابطہ بالواسطہ یا بلا واسطہ ہوتا ہے، وحی اپنے اصطلاحی معنی کے ساتھ صرف فرشتوں اور خدا کے پیغمبروں کے لیے مخصوص ہے، فرشتوں پر وحی کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبَّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَالِقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَأَصْرَبُوا أَفْوَاقَ الْأَعْنَاقِ وَاصْرَبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ" (سورہ انفال: 12) ترجمہ: "اور (یاد رکھو) جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں، عنقریب میں ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا، رعب ڈال دوں گا، پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پر پر ضرب لگاؤ"

اللہ کا انبیاء پر نزول وحی کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا" (سورہ نساء: 163)۔

ترجمہ: "(اے محمد) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی، اور ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کو بھی وحی بھیجی تھی اور داؤد کو ہم نے زبور عنایت کی تھی۔"

اس لیے صرف فرشتوں، انبیاء اور پیغمبروں پر وحی ہوتی ہے، قرآن اور حدیث میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ وحی -اپنی اصطلاحی تعریف کے ساتھ- فرشتے اور انبیاء کے علاوہ کسی اور پر ہوتی ہو، انبیاء پر وحی کے طریقے بھی مختلف ہیں۔

وحی کی زبان

ابن ابی حاتم نے سفیان ثوری سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں: کوئی بھی

وحی بغیر عربی کے نازل نہیں ہوئی ہے، بلکہ ہر پیغمبر نے اسے اپنی قوم کے لیے ترجمہ کیا ہے۔

نزول وحی کے وقت پیغمبر اسلام کی حالت

نزول وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ابن سعد کی ایک حدیث میں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے یوں بیان ہوئی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی آتی تھی تو اپنا سر ڈھانپ لیا کرتے تھے، آپ کا رنگ بدل جاتا تھا، آپ کو اپنے دانتوں میں ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پسینہ آتا تھا کہ آپ کے چہرے سے موتیوں کی طرح نیچے ٹپکنے لگتا تھا۔

وحی کے مختلف طریقے

قرآن کریم سورہ شوری آیت : "51" میں انبیاء علیہم السلام پر وحی کے تین طریقے بیان ہوئے ہیں: "وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بَأْذَنِهِ مَا يَشَاءُ" ○ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ مُّهِينٍ ○ ترجمہ: اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے) سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے، بیشک وہ عالی رتبہ (اور) حکمت والا ہے۔

یہاں وحی سے مراد اس کا اصطلاحی معنی نہیں ہے، بلکہ اس کے لغوی معانی میں سے ایک معنی مقصود ہے، کہ آیت میں لفظ وحی کو خواب دیکھنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس آیت کریمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور رسولوں کے ساتھ تین طریقوں سے بات کرتا ہے:

- 1- اچھے خوابوں کے ذریعے۔
- 2- پردے کے پیچھے سے بولنے کے ذریعے۔
- 3- فرشتوں کے ذریعے یعنی وحی لانے والے فرشتوں کے ذریعے وحی بھیج کر۔

اگر یہ کھاجائے کہ: "ہر پیغمبر کے لیے وحی کا طریقہ مختلف ہے" تو یہ بات سو فیصد درست نہیں، کیونکہ جیسا کہ اوپر کی آیت میں بتایا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء سے صرف ان تین طریقوں سے رابطہ قائم کرتا ہے، یہ بھی ممکن ہے ایک نبی ان تینوں طریقوں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ میں

هو (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) ممکن ہے دوسرا پیغمبر صرف دو طریقوں (اچھے خواب اور فرشتے کے ذریعے) سے رابطہ میں ہو، پس ممکن ہے ایک پیغمبر دوسرے کے ساتھ وحی کے طریقوں میں مشترک ہو۔

مثلاً ابراہیم علیہ السلام پر دو طریقے سے (اچھے خواب اور بذریعہ فرشتہ) وحی ہونی تھی، جیسا کہ اچھے خواب کے بارے میں مندرجہ ذیل آیت اس کی تائید کرتی ہے:

1 - ابراہیم علیہ السلام پر وحی خواب کے ذریعے : "رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ۝۱۰۰

فَبَشِّرْهُ بِبُحْلٍ خَلِيمٍ ۝۱۰۱ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنَؤُنِي إِيَّيْ فِي الْمَمَامِ إِيَّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۝۱۰۲ قَالَ يَاقَبْتُ أَفْعَلُ مَا تُؤْمَرُ ۝۱۰۳ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝۱۰۴ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۰۵ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۰۶ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۰۷ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۰۸ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۰۹ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۱۰ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۱۱ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۱۲

الرَّءْيَا ۝۱۰۱ إِنْ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۱۰۲ إِنْ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝۱۰۳ وَفَدَيْنَهُ بِذَنُجٍ عَظِيمٍ ۝۱۰۴ وَفَدَيْنَهُ بِذَنُجٍ عَظِيمٍ ۝۱۰۵ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝۱۰۶ سَلَّمَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝۱۰۷ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۱۰۸ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝۱۰۹ وَبَشِّرْهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝۱۱۰ (سورہ صافات: 100 تا 112) ترجمہ: اے پروردگار مجھے (اولاد) عطا فرما (جو) سعادت مندوں میں سے (ہو) تو ہم نے انکو ایک نرم دل لڑکے کی خوشخبری دی، جب وہ انکے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا تو ابراہیم نے کھاکہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کھا کہ ابا جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجئے، خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیں گے، جب دونوں نے حکم مان لیا اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹادیا، تو ہم نے ان کو پکارا کہ اے ابراہیم تم نے خواب کو سچا کر دکھایا، ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلادیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی، اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا، اور پیچھے آنے والوں میں ابراہیم کا (ذکر خیر باقی) چھوڑ دیا، کہ ابراہیم پر سلام ہو، نیکو کاروں کو ہم ایسا ہی بدلادیا کرتے ہیں، وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھے، اور ہم نے ان کو اسحاق کی بشارت بھی دی (کہ وہ) بنی (اور) نیکو کاروں میں سے (ہونگے)۔

2- اسی طرح ابراہیم علیہ السلام پر فرشتے کے ذریعے بھی وحی نازل ہوئی : "وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ ۚ" (سورہ ہود: 69)۔

ترجمہ: " اور ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے تو سلام کہا، انہوں نے (جواب میں) سلام کہا! ابھی کچھ وقفہ نہیں ہوا تھا کہ (ابراہیم) ایک بھنا ہوا بچہڑا لے آئے۔ "

لیکن خدا کا پردے کے پیچھے سے نبی کے ساتھ بات کرنا صرف موسیٰ علیہ السلام اور پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: "وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِبِيعَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ۖ قَالَ رَبِّ أَرِنِي ۖ أَنْظُرْ إِلَيْكَ ۚ" (سورہ اعراف: 143)۔

ترجمہ: "اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا اور لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ "

اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ معراج کی رات خدا تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پردے کے پیچھے سے بات کی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اچھے خواب اور ارسال فرشتے کے ذریعے بھی وحی نازل ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تین طریقوں کے ساتھ اپنے انبیاء سے رابطے میں ہوتا تھا، اس دوران (پردے کے پیچھے سے) کلام کرنے کی کچھ قسمیں صرف اللہ کے دو نبی کے لیے تھیں، جبکہ اکثر پیغمبر اس دوسری دو قسم (رؤیا صالحہ اور ارسال فرشتہ) میں مشترک تھے، ایسا نہیں تھا کہ ہر پیغمبر کے لیے ایک مخصوص طریقے سے وحی کی گئی ہو۔

شہد کی مکہ کی وحی کی حکمت

شہد کی مکہ کی وحی کی حکمت کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ۖ" (سورہ نحل: 68)۔

وحی سے مراد اس مقام پر اس کا شرعی معنی نہیں ہے، بلکہ اس کے لغوی معانی میں سے ایک معنی مقصود ہے جو کہ الہام ہے، کیونکہ وحی کے

متعدد معانی ہیں ان میں سے: الہام غریزی یا فطری الہام، اشارہ کرنا، اور شیطان کا وسوسہ بھی وحی کی ایک قسم ہے جو کہ شیطان کی طرف انسان پر اس کا القاء ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: "وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لِيُؤْخُونَ إِلَىٰ أُولِيهِمْ لِيُجَادِلُوهُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ" (سورہ انعام: 121) ترجمہ: اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں، اور اگر تم لوگ ان کے کہے پر چلے تو بے شک تم بھی مشرک ہوئے۔

مذکورہ بالا سورہ نحل کی آیت: "68" میں وحی بہ معنی "الہام" کے ہے، اور وہ غریزی الہام میں سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ شہد کی مکھی پر الہام کیا جس کے ذریعے اس مکھی نے ایسے حیرت انگیز اعمال پیش کیے کہ ان سے بشر کے عقلا بھی عاجز ہیں، وہ ان کی فطرت اور جبلت میں رکھا، کیونکہ شہد کی مکھی کی زندگی میں ایسا قطعی اور حیران کن معاشرتی اور تعاون پر مبنی نظام ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو حیرت اور تعجب میں ڈال دیا ہے، شہد کی مکھیاں اس قدرتی الہام کی روشنی میں کام کرتی ہیں جو خالق نے ان میں ودیعت کر رکھا ہے؛ الہام بھی وحی کی ایک قسم ہے کہ شہد کی مکھیاں اس کے مطابق کام کرتی ہیں، شہد کی مکھیاں اپنی فطرت کے مطابق اپنا گھر تیار کرتی ہیں اور یہ فطرت اللہ تعالیٰ نے ان میں ڈالی ہے جو کہ ایک فطری الہام ہے، جیسا کہ انسان بھی اپنے بعض کام فطری طور پر انجام دیتے ہیں۔

اور بعض کاموں کو انجام دینے کے لیے انبیاء کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ سیدھی سمت پر راہ پائیں، خدائے بزرگ و برتر نے اپنے برگزیدہ لوگوں کو وحی کے ذریعے بتایا کہ وہ ان ہدایات کو لوگوں میں پھیلا دیں، خدا کے آخری پیامبر اور اس کی کتاب قرآن کریم کے آنے کے بعد وہ رسالت مکمل ہوئی، اور وحی کے نزول کی ضرورت نہیں رہی چنانچہ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

غیر اللہ کی قسم

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا یا اللہ کے اسماء و صفات کے علاوہ کی قسم کھانا حرام ہے، اور اسے شرک اصغر میں شمار کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر کسی نے تعظیم کی غرض سے اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائی تو وہ شرک اکبر کا مرتکب ہوگا۔

اس بارے میں ایک حدیث بنی ﷺ سے مروی ہے فرمایا: "مَنْ حَلَفَ بِشَيْءٍ فَقَدْ أَشْرَكَ" (ترمذی : 1535) ترجمہ: جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے یقیناً شرک کیا" کہتے ہیں کہ: یہ حدیث حسن ہے۔

لہذا ہم مسلمانوں کو یا تو قسم نہیں کھانی چاہیے ، یا اگر قسم کھانا ضروری ہو تو یہ صرف اللہ کی یا اس کے اسماء و صفات میں سے کسی ایک کی ہو، مثلاً اللہ کے کلام کی قسم کھانا درست ہے، کیونکہ کلام اللہ کی صفت ہے۔

البتہ خدا اپنی مخلوق کی قسم کھا سکتا ہے ، جیسا کہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے: " وَالشَّيْءِ وَضُحَاهَا ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَهَّأَ ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّهَأَ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا ۝ وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا ۝ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ " (سورہ شمس : 1-6)۔ ترجمہ:

آفتاب کی روشنی کی قسم (۱) اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے (۲) اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو ظاہر کر دے! (۳) اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لے (۴) اور آسمان اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا (۵) اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا (۶) اور قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے ٹھیک بنایا (۷)۔

ان آیات اور بہت سی دوسری آیات میں اللہ نے سورج، چاند، رات، دن وغیرہ کی قسم کھائی ہے، اور معلوم ہونا چاہیے کہ (فجر، شمس، لیل، وتر وغیرہ) کی قسمیں کھانا صرف خدا تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اور ہم انسانوں کو حق نہیں ہے کہ ہم ان چیزوں کے قسم کھائیں، کیونکہ نہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ آپ کے کسی صحابی نے سورج، صبح، رات، یا موسم کی قسم کھائی ہے، اگر جائز ہوتی تو ان چیزوں کی قسم کھائی ہوتی۔

لیکن خدا تعالیٰ جس چیز کی چاہتا ہے قسم کھا تاہے، اور خدا کی ان قسموں کا مقصد اس کی نعمتوں کو یاد دلانا ہے، جیسے: سورج، رات، دن، پہاڑ وغیرہ جو اس نے انسانوں کے لیے بنائے ہیں، اور خدا تعالیٰ ان نعمتوں کی قسم کھا کر ہمیں ان کی یاد دلانا چاہتا ہے، تو اس لحاظ سے صرف ان نعمتوں کا خالق (یعنی خدا) ہی ان کی قسم کھا سکتا ہے، نہ کہ ہم انسان جو کہ خود مخلوق ہیں، اس لیے ہمیں ان کی قسم نہیں کھانی چاہیے، کیونکہ یہ صرف خدا کے لیے خاص ہے جو اپنی مخلوق کی قسم کھا کر ہمیں ان نعمتوں کی یاد دلاتا ہے، اور اگر خدا کے سوا کسی اور کی قسم کھانا جائز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس سے منع کرنے کے بجائے ان آیات کا حوالہ دیتے ہوئے جن میں خدا نے اپنی مخلوق کی قسم کھائی ہے، اللہ تعالیٰ

کے سوا کسی اور کی قسم کھانے کے جائز ہونے کا حکم دیتے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَلَا إِنَّ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ، فَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللَّهِ أَوْ لِيَصْحَبُ" بخاري (2679) - مسلم (1646) " ترجمہ: جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے باب دادا کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، لہذا جو کوئی قسم اٹھا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اللہ کے نام کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔"

ایک اور روایت میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلَا يَحْلِفُ إِلَّا بِاللَّهِ" (جو قسم کھانا چاہتا ہے وہ صرف اللہ کے نام کی قسم کھائے)۔

راوی کہتے ہیں کہ: قریش اپنے باب دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ" (بخاري (3836) مسلم (1646) ترجمہ: اپنے باپ دادا کے نام کی قسم نہ کھاؤ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تائید کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ حَلَفَ مِنْكُمْ فَقَالَ فِي حَلْفِهِ: بِاللَّاتِ وَالْعُزَّىٰ فَلْيَقُلْ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَمَنْ قَالَ لِأَخِيهِ تَعَالَ أَقَامِرُكَ فَلْيَتَصَدَّقْ" (رواہ مسلم و غیرہ) ترجمہ: تم میں سے جس نے حلف اٹھایا اور اپنے حلف میں کہا: لات اور عُزَّىٰ کی قسم! تو وہ "لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" پڑھے، اور جس نے اپنے ساتھی سے کہا: اُو جواکھیلیں تو وہ صدقہ کرے۔ (بخاري (4860) مسلم (1648)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لات و عُزَّىٰ کی قسم کھانے والے مسلمان کو "لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" کہنے کا حکم دیا ہے (یعنی تجدید ایمان کرے) کیونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھا نا توحید کی تکمیل کے منافی ہے، ایسا کرتے ہوئے اس قسم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے تعظیمًا جھک گیا۔

مختصر یہ کہ اگر قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے چاند، سورج، زمین، آسمان اور دیگر مخلوق کی قسم کھائی تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ خدا تعالیٰ جو تمام جہانوں کا رب اور خالق ہے اپنی مخلوق کی قسم کھا سکتا ہے، لیکن ایک مخلوق کے لیے دوسری مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں، صرف خدا تعالیٰ یا

اس کے اسماء وصفات اور کلام پر قسم کھائے مثلاً کہے: "واللہ" یا "اللہ" کے کلام کی قسم" وغیرہ۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسوله النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة الشرح

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی، اس کی «۸» آیات ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورہ مبارک کا نام «الشرح» یا «انشراح» یا «الم نشرح» رکھنے کے بارے میں مفسرین کہتے ہیں کہ: اس سورت کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکمت اور ایمان کے نور سے منور کرنے اور ہدایت دینے اور شرح صدر ہونے سے ہوا ہے۔

ہاں، جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ رکھتا ہو، اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے سینے کو (دل) اسلام اور نیکی اور سعادت کے لیے کھول دیتا ہے، (انعام: ۱۲۵)

سورت «الشرح» «سورة الضحی» کے بعد نازل ہوئی ہے، یہ گویا کہ اس کا تکملہ ہے، کیونکہ یہ روح پرور سایہ اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رب کے فضل و کرم سے پھیلا ہے۔

سورة «الشرح» کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة الشرح مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس کا ایک (۱) رکوع، آٹھ (۸) آیات، ستائیس (۲۷) الفاظ، ایک سو دو (۱۰۲) حروف اور سینتیس نقطے ہیں۔

(قرآن کریم کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة مبارکہ کا سبب نزول

یہ سورہ اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے مسلمانوں کو ان کے فقر اور تنگدستی کی بناء پر طعن و تشنیع کی۔

ابن جریر نے حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت "إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" نازل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خوش رہو کہ تمہیں سکون اور راحت ملی ہے اور ایک مصیبت اور سختی کبھی دو آسانیوں اور راحتوں کو مغلوب کی نہیں کرسکتی۔

سورة «انشراح» کا تعارف

اس بات پر مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ سورت سورة الضحیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس کے مشتملات بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ نعمتوں میں سے کچھ کو شمار کیا گیا ہے، درحقیقت سورة الضحیٰ میں تین قسم کے عظیم تحفوں کا ذکر ہے، اور یہ تین عظیم تحفے سورہ انشراح میں بھی مذکور ہیں، اس سورت کی تین نعمتوں کا مواد تمام روحانی پہلوؤں پر مشتمل ہے اور تین محوروں کے گرد گھومتا ہے ایک تو ان تینوں نعمتوں کا اظہار ہے اور دوسرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے کہ مستقبل میں دعوت کی مشکلات ختم ہوں گی، اور آپ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک رب کی طرف ہی متوجہ رہیں اور اس کی عبادت کی ترغیب بھی دی گئی ہے، مجموعی طور پر اس سورت میں چند امور کا ذکر ہے، (۱) رسول پر اللہ کا خصوصی احسان (۲) اس بات کی تسلی کہ مشکلات ختم ہونے والی ہیں (۳) راہ رسالت میں جو مشکلات آئیں گی ان میں اللہ آپ کی اور تائید کرے گا، اور اس طریقے سے آپ نے اپنے فرائض احسن طریقے سے ادا کیے، سورہ انشراح میں آیات کا طرز بیان رب کے غیر معمولی فضل اور محبت اور تسلی سے بھرپور ہے، جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دل جوئی اور تسلی ہے۔

اس سورت میں، اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چاہتا ہے کہ ان شاندار کاموں کو سر انجام دینے اور اللہ کی راہ میں کوشش کرنے سے آپ کبھی باز نہ آئیں، جب وہ ایک کام کر لیں تو اس سے بڑا اور مشکل کام شروع کر دیں تاکہ اس کے نتائج سے بھی فائدہ اٹھائیں۔

سورة الشرح

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝۲ الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴ فَاِنَّ
مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۝۷ وَالْاِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸

سورت کا مختصر ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱	کیا ہم نے تیرے لیے تیرا سینہ نہیں کھول دیا (۱)
وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝۲	اور ہم نے تم پر سے تمہارا بھاری بوجھ نہیں اتارا؟ (۲)
الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳	وہ بوجھ جس نے تمہاری کمر جھکا دی تھی (۳)
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴	اور ہم نے تیرا ذکر اور آوازہ بلند کر دیا (۴)
فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵	پس بیشک ہر مشکل کی ساتھ آسانی ہے
اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶	بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے
فَاِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۝۷	تو جب اپنے کام سے فارغ ہو جاؤ تو محنت کر
وَالْاِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸	اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو

سورة الانشراح کی مختصر تفسیر

اس سورہ کی مبارک آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر احسانات اور احکام کے بارے میں بحث ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱	کیا ہم نے تیرے لیے تیرا سینہ نہیں کھول دیا (۱)

(یہ تقریری استفہام ہے، یعنی: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم نے سینے کو ایمان، ہدایت اور قرآن کے نور سے نہیں کھولا ہے، اور کیا ہم نے آپ کے دل کو غم سے آزاد نہیں کیا؟ اور آپ کو جاہلیت کے ماحول کے انتشار اور نبوت کے عظیم ذمہ داری کی سختیاں برداشت کرنے کی ہمت نہیں دی؟ -

لغات کی تشریح:

«نَشْرَحُ لَكَ صَدْرَكَ» کیا تیرے سینے کو نبوت اور اس کی پاکی کے ذریعہ ایمان اور حکمت سے لبریز کر کے نہیں کھولا؟

"شرح صدر" کا مطلب ہے سینہ کھولنا اور انسان کی صلاحیتوں میں اضافہ تاکہ وہ مصیبتوں کو برداشت کرسکے، اور مشکلات و مصائب میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرے۔

مفسرین نے لکھا ہے:

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی کے طور پر چنا تو ان کی سب سے پہلی درخواست شرح صدر تھی، جب انہوں نے کہا: (رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي) (طہ: ۲۵) ترجمہ: "اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے"۔

لیکن پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر مانگے خدا کا یہ فضل عطا ہوا اور خدا کی طرف سے ان کو شرح صدر ملی۔

ابن کثیر اس مبارک آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کے دل کو روشن اور کشادہ کر دیا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل کو روشن کر دیا اسی طرح آپ کو دی گئی شریعت کو بھی کشادہ کر دیا ہے یعنی اسے میسر اور آسان کر دیا، نہ اس میں طاقت سے زیادہ بوجھ ہے اور نہ ہی کمزوری اور تنگ نظری۔ (مختصر: ۶۵۲/۳)۔

تمام مفسرین الم نشرح کی تفسیر میں کہتے ہیں: شرح صدر کنایہ ہے سینہ کی وسعت پانے اور الجھنوں، اداسی اور گمراہی سے قبل از نبوت رہائی پانا، نبوت اور قیادت کے مسائل کو برداشت کرنے کی صلاحیت، ماحول کی خرابیوں اور کفار و مشرکین و دیگر کی طرف سے ملنے والی تکالیف پر صبر و تحمل (ملاحظہ ہوں: سورہ انعام آیہ: 125، سورہ زمر آیہ: 22، سورہ طہ آیہ: 25، سورہ نحل آیہ: 106)۔

ابو حیان نے آیت مبارکہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ: شرح الصدر سے مراد حکمت کے ساتھ اس کو روشن کرنا، اور نازل شدہ وحی کو حاصل کرنے کے لیے اسے وسیع کرنا ہے، جمہور کی رائے بھی یہی ہے، بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ شرح الصدر کا مطلب یہ ہے کہ بچپن میں جبرائیل نے آپؐ کا سینہ چاک کیا تھا، (یہ رائے ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے، (البحر: ۸/۳۷۸)

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ: شق الصدر نبوت کے مبادیات میں سے ہے، یعنی اس کے مقدمات اور بشارتوں میں سے ایک ہے۔

محترم قارئین:

چونکہ رنج و غم اور غصہ کو اگر کم نہیں کیا جاسکتا تو مشکلات کو برداشت کرنے کے لیے استطاعت کو بڑھانا چاہیے نہ کہ مقابلے میں پسپائی اختیار کی جائے، شرح صدر جس کا تذکرہ آیت مبارکہ میں آیا ہے، خدا کے خاص فضل و مہربانی ہے: "فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ" ترجمہ: (پس جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہے، اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے)۔

نفسیاتی طور پر دنیاوی مسائل اور پریشانیوں سے نبرد آزما ہوتے وقت ذہن کو اس پر مرکوز نہیں کرنا چاہیے، بلکہ توجہ اس آسانی پر مرکوز رہنی چاہیے، جسکا رب نے وعدہ کیا ہے اور اس کی سنت چلی آرہی ہے۔

آیت مبارکہ میں شرح صدر سے مراد: "الْمَنْشَرُ لَكَ صَدْرُكَ" اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ نور سکون اور اطمینان کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اور فکر کی وسعت ہے، اس توسع کا ایک مفصل مفہوم ہو سکتا ہے جس میں وحی اور رسالت کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی وسعت، اور اپنے دشمنوں اور مخالفین کی ہٹ دھرمی اور رکاوٹوں کے خلاف آپ کی برداشت اور استقامت بھی شامل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری انفرادی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے لیے بہترین مثال ہیں، وہ ہدایت کے ایسے چراغ ہیں کہ جس نے عالم انسانیت کو منور کیا، اور اپنی زندگی اور کلام سے خوبصورت روایات قائم کیں، اور زمین سے آسمان تک اور اس دنیا سے آخرت تک کے سفر کا ایک جامع منصوبہ پیش کیا، اس لیے اس کردار کی سوانح حیات اور موتیوں جیسے الفاظ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں، تقدس مآب کی اہم ترین سوانح میں سے

ایک شرح الصدر ہے، وہ طرز زندگی جس کا ذکر خدا نے قرآن میں بڑی عظمت کے ساتھ کیا ہے، اور اسے اپنی عظیم نعمتوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کی وسعت اور کشادگی ہے کہ رسالت کا بھاری بوجھ بھی آپ کے لیے قابل برداشت تھا، ایک ایسا بھاری بوجھ جو انسان کی کمر جھکا دیتا ہے۔

یہ شرح صدر ہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مصیبتوں کے مقابلے میں سربلند اور فتح مند بناتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کا نام بلند کرتا ہے، سچائی اور کمال کی راہ چلنے کا بہترین ذریعہ چوڑا سینہ یعنی شرح صدر ہے، سینہ جتنا چوڑا ہوگا، پرواز اتنی اونچی ہوگی، خدا کے محبوب کے دل کی وسعت اور کشادگی اس حد تک ہے کہ وہ خدا کے علاوہ دیگر امور پر بھی محیط ہے، اس کے نور اور مہربانی کے دسترخوان سے تمام جہان ریزہ خوری کرنے والا ہے، قلم اور اظہار اس کی بلند الہی روح کے ادراک سے قاصر ہے۔

سورہ انعام کی آیت: "۱۲۵" ہے: (فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِإِسْلَامٍ ۝ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَمَّا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ ۝ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝۱۲۵) پس جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہے، اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے، (یعنی: اس دل کو کھول دیتا ہے اور وسیع کر دیتا ہے تاکہ اسلام کو کھلے سینے کے ساتھ قبول کرے) اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ اور گٹھا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اس طرح خدا ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔

اس آیت کی میں تفسیر انوار القرآن کے مصنف لکھتے ہیں: عبد الرزاق، ابن جریر الطبری اور دیگر کی روایت کردہ حدیث شریف میں ہے: صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا: اے خدا کے رسول! انسانی سینہ کیسے پھیلتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (نور یقذف فیہ، فی نشرح لہ وینفسح) ایک نور ہے جو اس میں ڈالا جاتا ہے، اور پھر سینہ اس نور کے لیے کھلتا اور پھیلتا ہے یا نور کھلتا ہے پھیلتا ہے۔

کہنے لگے: کیا اس انشراح اور کشادگی کی کوئی نشانی ہے کہ اس سے پہچانا جاسکے: فرمایا: (الإنابة إلى دار الخلود، والتجافي عن دار الغرور، والاستعداد للبعث قبل لقاء

الموت) ہاں! اس کی نشانی ابدیت کے گھر کی طرف رخ کرنا ہے، دل کو دھوکے کے گھر سے پھیرنا اور اس میں آرام نہ پکڑنا اور موت کا سامنا کرنے سے پہلے موت کی تیاری کرنا۔

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: مؤمنوں میں سے زیادہ عقلمند اور سمجھدار کون ہے؟ فرمایا: "جو اکثر موت کو یاد کرتا ہو اور جو زیادہ موت کے بعد کے لیے تیاری کرتا ہو" اور جس کو خدا گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اس قدر تنگ کر دیتا ہے کہ اس میں ایمان اور ہدایت کی کوئی جگہ نہیں رہتی، ابن کثیر کہتے ہیں: یعنی اس کے سینے کو "لا الہ الا اللہ" کے قبول کرنے سے بھی تنگ کر دیتا ہے، یہاں تک کہ یہ کلمہ طیبہ بھی اس میں داخل نہیں ہوتا۔

زجاج کہتے ہیں کہ: حرج، تنگی کی آخری حد ہے، (گویا وہ مشکل سے آسمان کی طرف جارہا ہے) کیونکہ جو شخص آسمان کی طرف جاتا ہے وہ ہوا کے دباؤ اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے مشکل میں ہوتا ہے، اسے سینے میں جکڑن محسوس ہوتی ہے، جیسے اس کا دم گھٹتے والا ہو، واضح رہے کہ نئی علمی دریافتوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ یہ تنبیہ قرآن کریم کے معجزات میں سے ایک ہے کیونکہ یہ آیت جس علمی سچائی کا اظہار کرتی ہے اس کا علم اس دور میں نہیں تھا جب قرآن مجید نازل ہوا تھا، ہاں، یہ آیت ایک ایسے شخص کی روحانی حالت کا بتاتی ہے جسے اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے، جب کہ اس کا مقدر گمراہ ہی ہو، اس شخص کی اندرونی کیفیت کی مشابہت بیان کی گئی ہے، آسمان پر چڑھنے سے اپنے سینے میں سخت تنگی محسوس کرتا ہے گویا کہ اس کا دم گھٹتا جا رہا ہے، اور یہ مطلب کہ یہ قرآن کے نزول کے وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ اوپر چڑھنے سے انسان کا دم گھٹتا ہے۔

علامہ عبد الرحمن سعدی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے سعادت، ہدایت، بدبختی اور گمراہی کی نشانیاں اور علامات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: جس شخص کا سینہ اسلام قبول کرنے کے لیے کشادہ ہو جائے، یعنی: اس کا سینہ اور باطن کشادہ ہو گیا، اور ایمان کے نور سے منور ہوا، اور یقین کے نور سے زندہ ہوا اور سکون پایا، اور نیکی کو پسند کیا، اور نیک کام انجام دینے کو خوبصورت پایا، اور اس سے لطف اندوز ہوا، اسے مشکل نہیں لگا، یقیناً یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے رب نے اس کی رہنمائی کی ہے اور اسے صحیح ترین راستہ اختیار کرنے کی توفیق بخشی ہے۔

اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے، یعنی اسے بے حد تنگ بنادیتا ہے کہ اس میں ایمان اور یقین کی کوئی جگہ نہیں ہوتی، اور شکوک و شبہات میں ڈوبا ہوا ہوگا، اس تک کوئی بھلائی نہیں پہنچے گی، اور اس کا دل نیکی کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا، اور اس کا سینہ اس طرح تنگ ہو کر دھڑکتا ہے کہ گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے، گویا اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، لیکن جانے کا کوئی راستہ نہیں پاتا، اور یہ اس لیے ہے کہ وہ ایمان نہیں رکھتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر گمراہی اور عذاب ڈال دیا، کیونکہ اس نے رحمت اور بھلائی کا دروازہ اپنے اوپر بند کر رکھا ہے اور یہ وہ پیمانہ ہے جس میں ظلم و جبر نہیں ہے، یہ وہ طریقہ ہے جو بدلتا نہیں ہے، پس جو شخص معاف کر دے اور عطا کر دے اور خدا سے ڈرے وہ متقی ہے، اور اچھے دین کا اقرار کرے تو عنقریب ہم اس کے قدموں کے آگے ایک آسان راستہ رکھ دیں گے، اور اس کے لیے آسان کر دیں گے، اور جو شخص بخل کرے گا اور خود کو خدا سے بے نیاز کرے گا، اچھے دین کا انکار کرے گا تو ہم اسے جلد ہی مشکل راستہ دیں گے۔

اور ہم نے تم پر سے تمہارا بھاری بوجھ نہیں اتارا؟ (۲)	وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝۲

یعنی: اس طرح ہم نے آپ پر بوجھ ڈالا تھا اسے کم کر دیا، آپ کو درپیش مصائب اور مشکلات ختم کر دیں، ہم آپ سے راضی ہو گئے اور آپ پر اپنی بخشش اور رحمت کی بارش کر دی۔

مفسرین لفظ «وَضَعْنَا» کی تشریح میں لکھتے ہیں: ہم نیچے لائے۔

«وِزْر» لغت میں بھاری ہونے کے معنی میں ہے۔

لفظ "وزیر" بھی اس سے ماخوذ ہے، کیونکہ وہ حکومت کا بھاری بوجھ اٹھاتا ہے، گناہوں کو اسی وجہ سے "وزر" کہتے ہیں، کیونکہ گناہگار کے کندھوں پر بہت زیادہ بوجھ ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے نزول کے شروع میں (وزر) کو بہ معنی (وحی) کے بھاری بوجھ سے تعبیر کیا ہے۔

بعض نے گمراہی اور مشرکوں کی ہٹ دھرمی سے کیا ہے۔

اور بعض نے انتہائی ایذا رسانی سے۔

اور بعض نے چچا ابو طالب اور آپؐ کی اہلیہ خدیجہ کی وفات سے ہونے والا غم بتایا ہے اور بعض نے آخرت میں معصومیت یعنی گناہ سے پاکیزگی سے تعبیر کی ہے۔

لیکن بظاہر یہ پہلی تشریح کے مترادف ہے، اس کمر توڑنے والے بوجھ کا مقصد نبوت سے پہلے کے معاشرے میں کفر، شرک اور خونریزی، ظلم اور فساد سے پہنچنے والا درد اور رنج ہے اور نبوت کے آغاز میں آنحضرتؐ کی کوشش لوگوں کی پریشانی اور مشکلات دور کرنے کے لیے ہے۔

آیات کے شواہد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسالت اور نبوت کا مقصد، توحید یعنی اللہ کی عبادت اور بندگی کی طرف دعوت اور اس آلودہ ماحول سے فسق و فجور کے اثرات کو دور کرنا ہے، نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ دعوت کے آغاز میں تمام انبیاء علیہم السلام کو بڑی بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اور وہ صرف خدا کی مدد سے ہی ان پر فتح حاصل کر سکے تھے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ماحول کے حالات، کچھ وجوہات کی بنیاد پر زیادہ مشکل اور بوجھل تھے۔

وہ بوجھ جس نے تمہاری کمر جھکا دی تھی (۳)	الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳

«أَنْقَضَ» بھاری پڑ گیا تھا، بھاری بوجھ بن گیا تھا، مجازاً کمر توڑنے کا معنی دیتا ہے۔

ہمارا عظمت والا رب اپنے ایک اور عظیم تحفے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کیا ہم نے تجھ سے بھاری بوجھ نہیں اُتارا؟ وہ بوجھ جو تم پر سخت بھاری پڑ گیا تھا، (الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ)۔

«أَنْقَضَ» نَقَضَ کے مادے سے ہے جو رسی سے گٹان کھولنے کے معنی میں ہے، یا کسی عمارت کے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے حصے کو الگ کرنا، اور (انتقاض) ایسی آواز کو کہتے ہیں جو ایک عمارت کے دوحصوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونے کی صورت میں سنائی دیتی ہے، یا وزنی بوجھ اٹھانے کی وجہ سے کمر کے مہروں سے جو آواز آتی ہے۔

یہ لفظ عہد اور وعدے توڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، کہتے ہیں (نَقَضَ فُلَانٌ عَهْدَهُ) فلاں نے عہد توڑا ہے۔

اسی طرح اوپر والی آیت کہتی ہے کہ خدا نے وہ بھاری اور کمر توڑنے والا بوجھ تم سے ہٹا دیا، وہ کونسا بوجھ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی پیٹھ سے ہٹا دیا تھا؟ آیات کے دلائل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نبوت اور رسالت کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور مشکلات، توحید اور اس اکیلے ذات کی عبادت کی طرف دعوت کی سختیاں، اور اس آلودہ ماحول سے فساد کے اثرات کو دور کرنا تھا، صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں، بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کو دعوت کے آغاز میں ایسے بڑے مسائل درپیش تھے، اور وہ صرف خدائی مدد سے ہی ان پر فتح حاصل کرسکے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ماحول کے حالات کچھ زیادہ سخت، اور مشکل تھے۔

اور ہم نے تیرا ذکر اور آوازہ بلند کر دیا (۳)

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

کیا ہم نے تیرا ذکر بلند نہیں کیا اور آپ کی ساکھ نہیں بڑھائی؟ ہم نے آپ کا مقام اور مرتبہ بلند کیا اور آپ کی یاد اور شہرت کو مناروں، منبروں اور کتابوں میں بلند کیا، آپ یتیم تھے کوئی آپ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا، آپ بے کس تھے آپ کا کوئی حامی نہیں تھا، آپ کے چاچا، جن کو آپ کا ساتھ دینا تھا، آپ کے خلاف کھڑے ہو گئے، آپ کے ساتھ ہم تھے ہم نے آپ کو نہیں چھوڑا کہ آپ کو شکست دی جاتی۔

مجاہد نے کہا: کہ جب بھی اللہ کا نام لیا جائے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس کے ہمراہ لیا جائے گا۔

قتادہ نے کہا: خدا نے دنیا اور آخرت میں آپ کا نام بلند کیا، ہر مبلغ، گواہ اور عبادت گزار پکارتا ہے: (أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله)۔

حدیث شریف میں ہے: جبرئیل میرے پاس آئے اور فرمایا: اے محمد! تمہارا رب فرماتا ہے: کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ کے نام اور یاد کو کیسے بلند کیا؟ میں نے کہا: خدا جانتا ہے، اس نے کہا: کہ جب میرا نام لیا جائے گا تو تمہارا نام بھی ساتھ ہی لیا جائے گا، (مختصر: ۶۵۲/۳)۔

البحر میں آیا ہے کہ: پیغمبر کا نام شہادت، اذان، اقامت، تشہد اور خطبہ اور بہت سے مواقع پر قرآن و غیرہ میں خدا کے نام کے ساتھ جڑا ہوا ہے، انبیاء

اور ان کی قوموں سے کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں،
(البحر المحیط: ۳۸۸/۸)۔

اس بارے میں حسن بن ثابت نے کہا ہے: (وَضَمَّ إِلَهُ اسْمِ النَّبِيِّ إِلَى اسْمِهِ إِذَا قَالَ فِي الْخَمْسِ
الْمُؤَذِّنُ أَشْهَدُ وَشَقَّ لَهُ مِنْ اسْمِهِ لِيَجْلَهُ فِذْوُ الْعَرْشِ مُحَمَّدٌ وَهَذَا مُحَمَّدٌ) ترجمہ: خدا نے پانچوں
اذانوں میں پیغمبر کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ذکر کیا، اور اپنے نام سے ان
کے لیے ایک نام اخذ کیا، تاکہ انہیں عزت بخشے، عرش کے مالک خدا کا نام
محمود اور آپ کا نام محمد ہے، (مختصر) 652/3)۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝	پس بیشک ہر مشکل کی ساتھ آسانی ہے

یعنی: درحقیقت ہر سختی کے ساتھ آسانی ہے، ہر تنگی کے ساتھ ایک کشادگی
ہے، غم کے ساتھ خوشحالی ہے، اور اداسی کی رات کی بعد خوشی کی صبح
آتی ہے، لہذا مشکل اور پریشانی جاری نہیں رہے گی، اور مصائب و آلام
باقی نہیں رہیں گے۔

«عُسْرٌ يُسْرًا» یہ دونوں الفاظ متضاد ہیں، «عُسْر» کا مطلب سختی ہے اور
«يُسْر» کا مطلب آسانی۔

مفسرین نے کہا ہے: مکہ میں رسول اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مشرکین
کے ظلم و ستم کی وجہ سے سخت مشکلات میں تھے، اس لیے آپ کے دل کو
تسلی اور سکون دینے اور آپ کی امید کو مضبوط کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ
نے آپ سے آسانی اور راحت کا وعدہ کیا، جیسا کہ سورۃ کے شروع میں آپ
کو دی گئی نعمتوں کا شمار کیا اور فرمایا: جس نے یہ قیمتی نعمتیں تمہیں
عطا کی ہیں وہ تمہیں ان پر فتح یاب کرے گا، تیرے کام کو سنوارے گا، ان
مشکلات کو جلد ہی آسانی میں بدل دے گا، چنانچہ اس نے مبالغہ کی صورت
میں اسے دھرایا اور فرمایا:

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝	بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے

بلاشبہ سختی اور مشکلات کے ساتھ سکون اور آسانی ہے، اس میں کوئی
شک نہیں کہ ہر مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہوئی ہے، پس غمگین اور اداس
مت ہو، حدیث میں آتا ہے: سختی دو آسانیوں پر نہیں جیتی (حاکم و بیہقی)۔

مفسرین اس مبارک آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: «فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ»

یہ ایک خوشخبری ہے کہ جب بھی سختی اور مشکلات آتی ہیں آسانی ان کے ساتھ ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر سختی اور مشکل کسی بل میں چلی بھی جائے تو آسانی اس پر داخل ہوتی ہے اور اسے باہر لے آتی ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں: «سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۚ» (سورۃ الطلاق: 7) ترجمہ: خدا تعالیٰ سختی کی بعد آسانی لائیگا۔

جیسا کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فراخی اور کشادگی مشکل اور غم کے ساتھ ہے، اور آسانی کا تعلق مشکل کے ساتھ ہے، لفظ: "العُسْر" کا معرفہ ذکر ہونا دونوں آیتوں میں اس بات کی دلیل ہے کہ سختی اور مشکلات ایک ہے۔ اور لفظ "یُسْر" کا نکرہ آنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسانی دھرائی جائے گی۔

لفظ «العسر» معرفہ کا الف اور لام استغراق اور عموم کے لیے ہے، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مشکل چاہے کتنی سخت کیوں نہ ہو آخر میں آسان ہو جائے گی، اور آسانی اس کی ساتھ ہوگی، پھر اس نے اپنے نبی کو بطور اصل مخاطب اور مومنوں کو اس کی پیروی کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ خدا کا شکر ادا کریں، اور اس کی عظمت کے آگے اپنا فرض ادا کریں۔

آیت مبارکہ کا شأن نزول

روایت ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین مسلمانوں کو عزت کا طعنہ دیتے تھے۔

ابن جریر الطبری نے حسن بصریؒ سے روایت کیا انہوں نے کہا کہ: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے لیے خوشخبری ہے، تم پر آسانی آگئی ہے، کبھی بھی ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی۔

توجب اپنے کام سے فارغ ہو جاؤ تو محنت کر

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۚ

پھر جب تو اپنے کام کاج سے فارغ ہو جائے اور تیرے دل میں ایسا کچھ نہ رہے جو مشکلات کا باعث ہو تو دعا اور عبادت میں محنت کیا کرو، فرمانبردار بن جاؤ، نوافل اور فضائل پر زیادہ توجہ دو، نیک اعمال کو زاد راہ بناؤ۔

«فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ» لہذا جب آپ ایک اہم کام کو ختم کر لیں تو اس کے بعد دوسرا اہم کام شروع کریں، اور کوشش کریں، کہ ایک کام کے اختتام کو دوسرے کام کا آغاز بنائیں۔

"فَرُغْتَ" فارغ ہوا، مکمل کیا، اور فارغ رہے۔

«انصَبْ» مشقت اٹھاؤ، مؤمن کو متحرک اور با فراست ہونا چاہیے، ایک فرض سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے فرض میں مشقت اور محنت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، کیونکہ ہم زندہ اس لیے ہیں تا کہ مسلسل کام کریں بے کار نہ بیٹھیں۔

یاد رہے کہ یہ آیت مبارکہ ہر مسلمان کی زندگی کا خاکہ اور منصوبہ بندی کی نمائندگی کرتی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قائم کیا گیا تھا، تا کہ اس طریقہ اور منہج کو اپنی روز مرہ کی زندگی اور مسلمانوں کی زندگیوں میں لاگو کیا جائے تاکہ جنت تک پہنچ سکیں، جہنم کے عذاب سے بچ جائیں، یعنی جب بھی وہ کسی دینی کام سے فارغ ہو جائیں تو اپنے آپ کو دنیاوی کام کے لیے تیار کریں، یعنی انسان کسی بھی کام اور ذمہ داری سے فارغ ہو کر دوسری ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہو، اور کوشش میں لگ جائے، مثلاً جب بھی اسے نماز سے فرصت ملے تو اسے چاہیے کہ ذکر اور دعا کرے اور جب اس سے بھی فارغ ہو جائے تو دنیاوی کاموں میں مشغول ہو جائے، ایک مسلمان شخص سنجیدہ اور سخت زندگی گزارتا ہے، اس کو کبھی کھیل کود، سستی، بے روزگاری وغیرہ کے لیے وقت نہیں ملتا۔

اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو

وَالِی رَّبِّكَ فَارْغَبْ ۝۹۴

اور صرف اس سے امید رکھو اور دل لگاؤ، اس کے علاوہ کسی اور چیز میں خود کو مشغول مت کرو، یعنی صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہو، اپنی

توجہ اور اہتمام اس نا پائیدار اور ختم ہونے والی دنیا کی طرف مبذول مت کرو۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ: یعنی جب تم اپنے آپ کو دنیاوی معاملات سے آزاد کرلو اور اس سے قطع تعلق کرلو، تو عبادت کے لیے اٹھو، چستی اور خوش دلی سے خدا کی عبادت کی طرف بڑھو، اور اپنی نیت اور ارادہ خلوص کے ساتھ خدا کے لیے رکھو، (مختصر: 653/3)۔

اسی طرح مفسرین آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "وَالِی رَبِّكَ فَارْغَبْ" اپنی دعاؤں کے جواب کے لیے اپنے رب کی طرف رجوع کرو، ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جن کا کام کاج ختم ہو جائے تو وہ کھیل تماشے میں مشغول ہو جاتے ہیں، اپنے رب اور اس کے ذکر سے منہ موڑ لیتے ہیں، اگر تم نے ایسا کیا تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گے۔

بعض مفسرین نے آیت مبارکہ کے معنی میں لکھا ہے کہ جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ اور اسے مکمل کرلو تو دعا مانگو اور اپنی ضروریات اور حاجات کے لیے اس کی طرف رجوع کرو، جس نے یہ کہا ہے اس نے فرض نمازوں کے بعد دعا اور ذکر کے جائز ہونے پر استدلال کیا ہے۔

اسلام میں صبر کی تلقین کا تصور

ہمارا عظیم پروردگار فرماتا ہے: «وَاصْبِرْۢوۡا۟ۤ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَۙ» (سورہ انفال: 46) ترجمہ (صبر کرو بیشک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے: «اِنَّہٗ مَنۢ یَّتَّقِیْ وَیَصْبِرْۢ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُۤ اَجْرَ الْمُحْسِنِیۡنَۙ» (سورہ یوسف: 90) ترجمہ: جو شخص خدا سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو خدائیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

اور پھر سورہ زمر آیت (10) میں فرماتا ہے: "اِنَّمَّا یُوفٰی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَہُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍۙ" ترجمہ: (صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے ملے گا)، "فَاصْبِرْۢوۡۤ اِنَّ الْعَاقِبَۃَ لِلْمُتَّقِیۡنَۙ" (سورہ ہود: 49) ترجمہ: پس صبر کرو یعنی ثابت قدم رہو، یہی پرہیزگاروں کے لیے اچھا انجام ہے تمہیں صبر کی تلقین کرتا ہے کہ ان شاء اللہ مشکلات بہت جلد حل ہوں گی، کیونکہ یقیناً

سختی کے بعد آسانی ہے : "إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" (سورہ انشراح: 6) جی ہاں !
سختی کے ساتھ آسانی ہے۔

«إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا» کا مفہوم

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ اس آیت کے بیان کے باوجود بعض مسلمانوں کو اپنی زندگی کے آخری ایام تک مشکلات کیوں پیش آتی ہیں ؟ کیوں آفات ہمیشہ یکے بعد دیگرے ان کی زندگی میں پیش آتی ہیں ؟ (کسی راحت کے بغیر) یہاں تک کہ آخری عمر تک وہ مشکلات میں ہوتے ہیں، حالانکہ وہ سب سے زیادہ اطاعت اور عبادت کر تے ہیں؟

جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ : اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا ہے اور اس بھانے سے وہ ان کے بہت سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، کیونکہ مصائب، مشکلات اور آفات گناہوں کا کفارہ ہیں، اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو مصیبتوں اور آفات میں صبر اختیار کرتے ہیں، کیونکہ انہی مشکلات اور مصیبتوں کو اگر صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے تو یہ مشکلات اور مصائب گناہوں کے کفارہ کا موجب بنیں گی، شاید ہر ایک کو خدا کے اس فضل اور رحمت سے نوازا نہیں جائے گا کہ وہ مشکلات کے وقت صبر اور برداشت سے کام لے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :
"مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُصِيبْ مِنْهُ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھی بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے اس کو مصائب میں مبتلا کرتا ہے" (بخاری: 5645)۔

خدا تعالیٰ صبر کرنے والوں کے متعلق فرماتا ہے : "إِنَّمَا يُوفِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (سورہ زمر) صرف صبر کرنے والوں کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں : « قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْحُمَامَةِ مِنَ الزَّرْعِ، مِنْ حَيْثُ أَتَتْهَا الرِّيحُ كَفَأَتْهَا، فَإِذَا اعْتَدَلَتْ، تَكَفَأُ بِالْبَلَاءِ، وَالْفَاجِرُ كَالْأَرْزَةِ، صَمَاءٌ مُعْتَدِلَةٌ، حَتَّى يَقْصِبَهَا اللَّهُ إِذَا شَاءَ» (بخاری: 5644)۔

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ مؤمن کی مثال پودے کی

پہلی نکلی ہوئی ہری شاخ جیسی ہے کہ جب بھی ہوا چلتی ہے ، اسے جھکادیتی ہے، پھر وہ سیدھی ہوکر مصیبت برداشت کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، اور بدکار کی مثال صنوبر کے درخت جیسی ہے کہ سخت ہوتا ہے اور سیدھا کھڑا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اسے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے، (یعنی وہ مصیبت میں کم پڑتا ہے)۔

ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: (مَا يَصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ حَتَّى الشُّوْكَةِ يَشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ) ترجمہ: مسلمان کو جو بھی دکھ، گھٹن، حزن ملال اور تکلیف اور غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ اگر کانٹا بھی چھب جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں ضرور اس کی خطائیں معاف فرماتا ہے، (اس کے گناہوں کے کفارہ کا سبب بنے گا)۔

صحیح حدیث پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر) (مسلم: ۲۹۵۶) ترجمہ: دنیا مؤمن کے لیے قیدخانہ اور کافر کے لیے باغ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مؤمن بندے کے صبر اور شکر کے بارے میں فرماتے ہیں: (عجبا لأمرء المؤمن إن أمره كله خير، وليس ذاك لأحد إلا للمؤمن، إن أصابته سراء شكر، فكان خيرا له، وإن أصابته ضراء صبر، فكان خيرا له) (روایت مسلم) ترجمہ: مؤمن کا معاملہ عجیب ہے، اس کا ہر معاملہ اس کے لیے بھلائی کا ہے، اور یہ بات مؤمن کے علاوہ کسی اور کو میسر نہیں، اسے خوشی اور خوشحالی ملے تو شکر کرتا ہے، اور یہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے، اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو (اللہ کی رضا کے لیے) صبر کرتا ہے، یہ (بھی) اس کے لیے بھلائی ہوتی ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: (حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات) (مسلم: ۲۸۲۲ اور ترمذی: ۲۵۵۹) یعنی: جنت ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیزوں سے گھری ہوئی ہے۔

لہذا جب بھی کسی متقی مؤمن کو مصیبت آتی ہے تو اس کو چاہیے کہ اسے نعمت میں بدل دے، وہ کیسے؟ صبر، شکر اور خدا کی مقرر کردہ تقدیر سے راضی ہوتے ہوئے اس پر بھروسہ کرتے ہوئے اس مشکل کو دفع کرنے میں

تاکہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔

اس کے علاوہ ایسا بھی نہیں ہے جیسا کہ آپ سوچتے ہیں، کیونکہ ہر ایک کی زندگی میں خوشی اور ناخوشی دونوں ہوتی ہیں اور شاید بعض مؤمنین کو اپنے اعمال کی وجہ سے زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ۝۳۰) (سورہ شوریٰ: ۳۰) ترجمہ: اور جو بھی تمہیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے، اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق اس کا امتحان لیتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: (وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۝۱۵۵) (سورہ بقرہ: ۱۵۵) ترجمہ: اور یقیناً تمہیں خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی میں سے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیں وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بیشک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بیشک ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے کئی مہربانیاں اور بڑی رحمت ہے اور یہ لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ضرور آزمائیں گے اور مصائب میں گرفتار کریں گے، (جیسے قدرتی آفت، ٹوب جانا، نقصان اٹھانا، وہ اموال جو جابر اور ظالم لوگ طاقت اور زبردستی سے لے لیتے ہیں) لیکن کسی بھی صورت میں ایسا نہیں ہے کہ ساری زندگی سختی اور عذاب میں رہے، یہ تصور درست نہیں ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا مقصد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا کیا مقصد ہے؟

اول: شق الصدر کا واقعہ: یعنی: سینہ کو کھولنا، اس وقت پیش آیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی سعد میں حلیمہ سعدیہ کے پاس رضاعت کے لیے تھے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق چند ماہ، یا بعض محققین کی رائے کے مطابق چار سال کی عمر میں شق صدر کا واقعہ پیش آیا۔

مسلم نے انسؓ سے روایت کیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہم عمر بچوں

کے ساتھ کھیل رہے تھے، آپ کو اپنی جگہ سے اٹھا کر زمین پر لٹا دیا اور آپ کا سینہ چاک کر کے آپ کا دل نکالا اور اس میں سے خون کا لوتھڑا نکالا اور کہا: یہ ہے شیطان کا حصہ پھر اس نے آپ کے دل کو سونے کے طست میں زمزم کے پانی سے دھویا، پھر اس نے آپ کو لٹادیا، اور دوبارہ سے آپ کا سینہ سی لیا، لڑکے دوڑتے ہوئے حلیمہ سعدیہ کے پاس گئے اور کہا: انہوں نے محمد کو مار ڈالا! وہ سب آپ کو ڈھونڈنے کے لیے دوڑے، جب انہوں نے آپ کو ڈھونڈ لیا تو آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ انسؓ کہتے ہیں: کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے پر جبرائیل علیہ السلام کے سیے ہوئے نشانات کو دیکھتا تھا، (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء، جلد ۱، صفحہ: ۱۲۴، ح ۲۶۱)۔

اس واقعہ کے بعد حلیمہ سعدیہ خوف زدہ ہو گئی اور آپ کو آپ کے ماں کے پاس واپس بھیج دیا، شق صدر کا واقعہ آپ کی زندگی میں تین بار پیش آیا:

1- جب بچے تھے جیسا کہ مذکور ہوا، اور یہ روایت صحیح مسلم میں ہے، اور اس کی حکمت وہی تھی جو ان دو فرشتوں نے بیان کی تھی کی: "یہ بے شیطان کا حصہ تم سے" اور ایک خون کا لوتھڑا آپ کے دل سے نکال دیا۔

2- نبوت سے پہلے، اس کی حکمت یہ تھی مضبوط دل سے وحی کا سامنا کریں، حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب "الفتح" میں اسراء و معراج کی تفصیل میں کہا: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کا چاک کرنا نبوت کے دوران ثابت ہے، جیسا کہ ابو نعیم نے اس روایت کو اپنی "الدلائل" میں نقل کیا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

3- اسراء اور معراج کے واقعہ سے پہلے، اس کی حکمت یہ تھی کہ وہ خالص اور مضبوط دل کے ساتھ براہ راست خدا سے دعا کرنے کے لیے تیار ہوجائیں، یہ واقعہ صحیحین اور دیگر کتب احادیث سے ثابت ہے۔

گناہ کے اثرات

1- گناہ کے اہم ترین اثرات میں سے ایک علم سے محروم ہونا ہے، وہ علم جو خدا نے قرآن و سنت میں رکھا ہے اور دنیا و آخرت میں انسانی سعادت کا ذریعہ ہے، گنہگار لوگ اس علم سے محروم ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۲۸۲) (سورہ البقرہ: ۲۸۲) ترجمہ: اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بے شک علم خدا کا نور ہے اور گنہگاروں کو خدا کا نور نہیں دیا جاتا۔

2- گناہ اور فسق انسان کے دماغ کو خراب اور تباہ کردیتے ہیں، اور انسان سے ادراک اور اچھی سوچ کی قوت چھین کر انسان کو ہر معاملے میں پریشان کرتا ہے۔

سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے فرماتے ہیں: جو شخص خدا کا نافرمان ہو کر گناہ کرتا ہے، اس کی عقل ختم ہو جاتی ہے اور گناہ عقل کی روشنی کو ختم کر دیتا ہے، کمزوری اور سستی اس کے جسم کو گھیر لیتی ہے۔

3- گناہ اور معصیت دل کو کمزور کردیتے ہیں، اور اسے تاریک کھنڈرات میں تبدیل کردیتے ہیں، جہاں سے کوئی نیک ارادہ یا فیصلہ نہیں نکلتا، گناہ اور اس کے زخیرہ کرنے پر اس کے اصرار سے اللہ تعالیٰ گنہگار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے، اسی وجہ سے انسان دل کا اندھا شمار ہوتا ہے، اور غافلوں میں شامل ہو جاتا ہے، جہنم کی آگ سب سے پہلے دلوں پر حملہ کرتی ہے، اور اسے اپنے بدترین شعلوں سے جلاتی ہے۔

4- گناہ انسان کو ذلیل اور رسوا کرتا ہے اور اس کی عزت اور سربلندی کو چھین لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا" ۝ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۝ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُبْوَءُونَ ۝" سورہ فاطر: آیت (۱۰) ترجمہ: "اگر کوئی عزت اور

بلندی چاہتا ہے، بے شک ساری عزت اللہ ہی کے لیے ہے، اسی کے طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے اور نیک عمل اسے بلند کرتا ہے اور جو لوگ برائیوں کی خفیہ تدبیر کرتے ہیں ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور ان لوگوں کی خفیہ تدبیر ہی برباد ہوگی۔"

5- گناہ کے برے اثرات میں سے ایک حیاء کا ختم ہونا ہے، حیاء جو کہ توانائی کا ذریعہ ہے اور تمام نیک کاموں کا سرچشمہ ہے، گناہ کو دہرانے اور اس پر اصرار کرنے سے یہ حیاء ضائع ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ" (صحیح مسلم): حیاء خیر ہی خیر ہے۔

6- گناہ بندوں پر خدا کے رزق اور نعمتوں کی بربادی کا سبب بنتا ہے اور انسان کے رزق، روزی، عمر، علم اور عمل سے برکت ختم ہونے کا سبب بنتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمُ

بَرَكْتَ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾ (سورہ اعراف: ٩٦) ترجمہ: اگر واقعی بستیوں والے ایمان لے آتے اور بچ کر چلتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اوزمین سے بہت سے برکتیں کھول دیتے اور لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے انہیں اس کی وجہ سے پکڑ لیا جو وہ کمایا کرتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "إِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالدُّنْبِ الَّذِي يَصِيبُهُ" (ابن حبان- حسن) ترجمہ: انسان اس گناہ کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے جو اس سے سرزد ہو جاتا ہے۔

7 - گناہ شیطاں اور جنات کے لیے انسان کے قریب آنے اور اس پر غالب ہونے کا سبب بنتا ہے، اور پھر اسے ہر اس کرتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں، اور روز بہ روز انسان کو بگاڑ اور تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

8 - گناہ خاندان اور اولاد کی نافرمانی کا سبب بنتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل و جان سے پیاری اولاد کو اس نے خون جگر سے پالا ہوتا ہے، اس کو تکلیف پہنچانے اور نافرمانی کرنے کی جسارت کرتے ہیں، جبکہ خدا کی اطاعت اور بندگی انسان کو ان تمام مصائب سے بچاتی ہے، اور اس کی اولاد کو اس کے ہاتھ کی لاٹھی یعنی سہارا اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنادیتی ہے۔

9 - گناہ کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ جیسے انسان خدا کو بھول جاتا ہے، خدا بھی اسے بھول جاتا ہے، ایسے شخص کے لیے خدا تعالیٰ نے دو سزائیں

مقرر کی ہیں، ان آیات پر توجہ کریں:

الف: «وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾»

(سورۃ الحشر: ١٩) ترجمہ: اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا، جنہوں نے خدا کو بھلادیا تو خدا نے ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے یہ بدکردار لوگ ہیں۔

ب: "نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ۚ إِنَّ الْمُنْفِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۚ" (سورۃ التوبہ: ٦٤) ترجمہ: "وہ

اللہ کو بھول گئے تو اس نے انہیں بھلادیا، یقیناً منافق لوگ ہی نافرمان ہیں۔" خدا تعالیٰ انہیں دنیا اور آخرت میں بھلادیتا اور اپنے فضل و کرم سے محروم کر دیتا ہے۔

10 - گناہ خدا کے فرشتوں کو انسانوں سے دور کرنے کا باعث بنتا ہے، خدا کے فرشتے ہر حال میں انسان کے ساتھ ہوتے ہیں، اور انسان پر خدا کی رحمت، بخشش اور برکت کا ذریعہ بنتے ہیں، جب کوئی شخص

گناہ کرتا ہے یعنی اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو فرشتے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور انسان خدا کے فضل سے محروم ہو جاتا ہے۔

11 - گناہ کے نتائج میں سے ایک آب و ہوا، موسم، اور پھلوں کا نقصان اور

خرابی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ مِمَّا كَسَبَتْ آيَدِي

النَّاسِ لِيَذِيقَهُمْ بَعْضُ الَّذِي عَمِلُوا أَلْعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ" (سورة الروم: ٤١) ترجمہ:

"خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں

کے ہاتھوں نے کمایا، تاکہ وہ انہیں اس کا کچھ مزہ چھکائے جو انہوں

نے کیا ہے، تاکہ وہ باز آجائیں۔"

12 - گناہ انسانوں کو سیلاب، زلزلہ، طوفان، آسمانی بجلی اور دھماکوں کے

ذریعے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

ام المؤمنین زینب بنت جحشؓ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: یا

رسول اللہ اَمْهَلِكْ وَفِينَا الصَّالِحُونَ؟ قال: نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْحَبْتُ (متفق علیہ) ترجمہ:

کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان نیک لوگ ہوں گے؟ آپؐ نے

فرمایا: ہاں، جب فسق اور بے حیائی بڑھ جائے

سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«سَيَكُونُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ خُسْفٌ، وَقَذْفٌ وَمَسْخٌ» -

آخر زمانے میں زمین میں دھنسنا، زلزلے، ذلت و خواری، لعن طعن، بُرائی

اور بد صورتی ظاہر ہوں گے، پوچھا گیا کہ اے خدا کے پیغمبر! کب؟ کہنے

لگے: جب موسیقی کے آلات اور گلوکار خواتین ظاہر ہوں گی (صحیح جامع

الصغیر)

صدق اللہ العظیم وصدق رسوله النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة التين

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اس کی آٹھ (۸) آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کا نام "التین" رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے شروع میں: "وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ" کی قسم کھائی گئی ہے۔

نیز مفسرین نے اس سورت کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے: اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے چار اہم چیزوں کی قسم کھائی ہے، "وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ" وَطُورِ سَيْنِينَ" (انجیر اور زیتون کی قسم یا شام اور بیت المقدس کی زمین کی قسم) جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اس سورت کا نام "التین" ہے، اور یہ اس سورت کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

سورت کے شروع میں "تین: انجیر" اور "زیتون" کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ انجیر اور زیتون میں بہت سی برکات پوشیدہ ہیں۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ سورة التین میں اس قسم کی قسمیں انسان کی خوشنودی کے چار مراحل کی طرف اشار کرتی ہیں، اور سورہ آل عمران آیت ۳۳ پر ناظر ہے: (إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ) ترجمہ: "بیشک اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم کے گھرانے اور عمران کے گھرانے کو جہانوں پر چن لیا"

"تین" یہ اشارہ ہے جنت میں آدم علیہ السلام کے دور اور مقام کی، (کہ جنت ان مذکورہ اشیاء سے سچی ہوئی تھی)

"طُورِ سَيْنِينَ" موسیٰ علیہ السلام کے مقام کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل سورہ آل عمران میں ہے۔

"الْبَلَدِ الْأَمِينِ" یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مقام کی طرف اشارہ ہے، جو صرف دین اسلام کے سایہ میں قابل رسائی ہے (سورہ ابراہیم) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان مراحل سے گزرتا ہے تو احسن تقویم تک پہنچ جاتا ہے۔

"تین" اور "زیتون" کے بارے میں مفسرین کی روایات

متعدد مفسرین نے اپنی تفسیروں میں "تین" اور "زیتون" کے بارے میں بعض

روایات نقل کی ہیں، ان کے ماخذ اگرچہ ثقہ نہیں ہیں مگر صرف معلومات کی غرض سے درج کیے جاتے ہیں:

- 1- "تین" اور "زیتون" سے مراد وہی دو مشہور پہل ہیں۔
- 2- "تین" وہ مسجد ہے جسے حضرت نوح علیہ السلام نے جودی پہاڑ پر تعمیر کی تھی، اور "زیتون" شہر قدس کی مسجد ہے۔
- 3- "تین" اور "زیتون" سے مراد وہ زمینیں ہیں جہاں انجیر اور زیتون کے درخت اُگتے ہیں۔
- 4- "تین" اور "زیتون" شام کے دو پہاڑ کے نام ہیں۔
- 5- "تین" اور "زیتون" دو شہروں کے نام ہیں۔
- 6- "تین" اور "زیتون" شام کی دو مساجد کے نام ہیں۔
- 7- "تین" مسجد الحرام ہے اور "زیتون" مسجد اقصیٰ ہیں۔
- 8- "تین" دمشق کا شہر ہے اور "زیتون" قدس کا شہر ہے۔
- 9- "تین" دمشق کی مسجد ہے اور "زیتون" شہر قدس کی مسجد ہے۔
- 10- "تین" وہ پہاڑ ہے جس پر دمشق بنایا گیا تھا، اور "زیتون" شہر قدس کا ایک پہاڑ ہے۔
- 11- "تین" اصحاب کہف کی مسجد ہے (کہف: ۲۱) اور "زیتون" شہر قدس کی مسجد ہے۔
- 12- "تین" طور سینا پہاڑ ہے اور "زیتون" طور زیتا پہاڑ ہے۔
- 13- "تین" سے آدم علیہ السلام کا زمانہ مراد ہے، اور "زیتون" سے مراد نوح علیہ السلام کا دور ہے۔
- 14- "تین" اور "زیتون" فلسطین کی سرزمین ہے۔
- 15- بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ "زیتون" سے مراد وہی بیت المقدس کی زیتون ہے۔

کوہ زیتا یا کوہ زیتون

کوہ زیتون کا نام زیتون کے اس درخت سے لیا گیا ہے جو اس پہاڑ میں بکثرت پایا جاتا تھا، عرب کوہ زیتون کو کوہ "طور" یا کوہ "طورزیتا" کے نام سے بھی جانتے ہیں، اس لیے کہ طور کا گاؤں اس پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے، یہ پہاڑ بیت المقدس شہر کے مشرق میں واقع ہے، ایک ایسا پہاڑ ہے جس سے بیت المقدس کے پورے شہر کو دیکھا جاسکتا ہے، اس پہاڑ کی بلندی سطح سمندر سے تقریباً "۸۲" میٹر ہے، کہا جاتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم نے یہودیوں کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے کوہ زیتون پر پناہ لی۔

اور متی کی انجیل میں بیت المقدس سے مخاطب ہو کر کہا: اے یروشلم، اے انبیاء کے قاتل! تو ایسا شہر ہے جو خدا کے پیغمبروں پر پتھر پھینکتا ہے،

کئی بار میں نے چاہا کہ تمہارے فرزندوں کو اس طرح جمع کروں جیسے مرغی اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے جمع کرتی ہے، لیکن تم نہیں چاہتے تھے، پس تو اب ایک ویرانہ کی صورت میں باقی رہے گا۔

سورة التین کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة التین نے سورة البروج کے بعد شرف نزول پایا۔ سورة التین مکی ہے اس کا ایک (۱) رکوع، آٹھ (۸) آیتیں، بتیس (۳۲) الفاظ، ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) حروف اور تینتیس (۳۳) نقطے ہیں۔ (قرآن کریم کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة التین اور سورہ انشراح کے درمیان ربط و مناسبت

سورہ شرح میں تخلیق اور مزاج کے لحاظ سے سب سے کامل اور اعلیٰ ترین انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، اور سورة التین میں انسان کی ترکیب اور اس کی ظاہری ساخت اور کامیابی کے رُو سے نچلے درجے تک گرنے اور نورحق کی روشنی تک پہنچنے دونوں حالتوں کی خبر دیتا ہے۔

سورة التین کا سبب نزول

ابن جریر نے عوفی کے ذریعہ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ لوگ ایسے تھے جو بڑھاپے کی وجہ سے عقل اور سوچ کھو بیٹھے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں پوچھا گیا: چنانچہ خدا تعالیٰ نے وحی بھیجی اور انہیں معاف کیا اور فرمایا: کہ ان کو ان نیک اعمال کا اجر ملے گا جو انہوں نے اسلام کی راہ میں اپنی عقل سے محروم ہونے سے پہلے کیے تھے۔ (تفسیر و بیان کلمات قرآن کریم تالیف: شیخ حسنین محمد نطوف، و اسباب نزول تالیف علامہ جلال الدین سیوطی، سورہ تین)

سورہ تین کے نزول کا وقت

قتادہ کہتے ہیں کہ یہ سورہ مدنی ہے، اس بارے میں ابن عباسؓ کے دو قول ہیں: (۱) یہ سورہ مکی ہے، (۲) یہ سورہ مدنی ہے۔ البتہ جمہور علماء اسے مکی سمجھتے ہیں، اور اس کے مکی ہونے کی واضح علامت یہ ہے کہ اس میں مکہ کے لیے "وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ" (یہ سلامتی والا شہر ہے) کا جملہ استعمال ہوا ہے۔

واضح رہے کہ اگر یہ سورت مدینہ میں نازل ہوتی تو مکہ کے لیے "یہ شہر" کی عبارت استعمال نہیں ہوتی، اس کے علاوہ سورہ "تین" کے مشتملات کی طرف گہری نظر سے توجہ کی جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورت مکہ کے ابتدائی ایام میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے، کیونکہ اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ اس کے نزول کے وقت کفر اور اسلام کے درمیان کوئی تصادم شروع ہوا ہو، اور اسی لہجے میں ابتدائی مکی دور کی سورتیں دیکھی جاتی ہیں، جن میں لوگوں کو بہت مختصر اور تبلیغ انداز میں سمجھایا جاتا ہے کہ آخرت کا عذاب ضروری اور مکمل درست ہے۔

سورہ تین میں زیر بحث موضوعات

سورہ تین میں دو اہم مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اول: اللہ تعالیٰ کا انسان پر مہربانی کرنا

دوم: آخرت میں حساب اور سزاء پر ایمان

اس سورت کا آغاز ان مقدس اور محترم مقامات کی قسم سے ہوا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے لیے نزول وحی کے مقامات مقرر کیے تھے، ان مقامات میں "بیت المقدس"، "کوہ طور" اور "مکہ مکرمہ" شامل ہیں۔

اور اس نے قسم کھائی ہے کہ انسان کو سب سے خوبصورت شکل میں پیدا کیا گیا ہے، اگر وہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا تو اس کا مقام دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں پر ہوگا۔

اسی طرح سورہ تین میں حشر و نشر کے انکار کی وجہ سے ہونے والے کافر کی ملامت کی گئی ہے، کیونکہ ان تمام واضح اور قطعی دلائل کے بعد جو رب العالمین کی قدرت کے بارے میں ہیں کہ سب سے بہترین شکل و صورت میں انسان کی تخلیق کی گئی ہے، پھر وہ حشر و نشر کا انکار کرتا ہے: "لَقَدْ

خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ"

اور آخر میں: اس نے مؤمنوں کو انعام اور کافروں کو سزاء دے کر خدائی انصاف کا اظہار کیا ہے: "فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدَ بِالذِّنِّ، أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَكَمِينَ" ○ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جزاء اور قیامت ایسا امر ہے جو مسلم اور یقینی ہے۔

سورة التين

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ ۝١ وَطُورِ سَيْنِينَ ۝٢ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝٣ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝٤ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝٥ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝٦ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّكْرِ ۝٧ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۝٨

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ ۝١	قسم ہے انجیر کی ! اور زیتون کی !
وَطُورِ سَيْنِينَ ۝٢	اور طور سینین کی !
وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝٣	اور قسم ہے اس امن والے شہر کی (مکہ معظمہ)
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝٤	یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا کیا ہے
ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝٥	پھر ہم نے اسے لوٹا کر نیچوں سے نیچا کر دیا
إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝٦	مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے
فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّكْرِ ۝٧	پس (اے انسان!) اس کے بعد کونسی چیز تجھے جزا کے بارے میں جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟
أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۝٨	کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے

سورت کی تفسیر

محترم قارئین:

اس سورت کی مبارک آیات میں بنی آدم کی متوازن، اچھی اور خوبصورت ساخت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ ۝۱	قسم ہے انجیر کی ! اور زیتون کی !

"تین" لغت میں بہ معنی "انجیر" اور "زیتون" وہی مشہور زیتون ہے جس سے لوگ تیل حاصل کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ انجیر ہے جسے تم کھاتے ہو اور وہ زیتون ہے جس سے تم تیل نچوڑتے ہو (قرطبی: ۱۱۰/۱۹)

عکرمہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انجیر اور زیتون کے اگنے، بڑھوتری اور نشوونما کی جگہ کی قسم کھائی ہے اور انجیر زیادہ تر دمشق میں اور زیتون بیت المقدس میں پائی جاتی ہے (البحر: ۴۸۹/۸)

اور واضح بھی یہی ہے، کیونکہ کوہ "طور" اور "البلد الامین" کا اس پر عطف ہونا اس قول کے ثابت ہونے کی دلیل ہے، پس قسم ان مقدس مقامات کی کھائی گئی ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر وحی کا نزول فرما کر ان کو باعزت اور مبارک بنایا۔

یہاں قسم کھانے کا مقصد یہ دو پہل ہیں یا مقصد کچھ اور ہے؟

مفسرین نے اس بارے میں مختلف تاویلات اور تجزیے پیش کیے ہیں، متعدد مفسرین کا خیال ہے کہ اس سورت میں ان دونوں مشہور و معروف پہلوں کے ذکر سے مراد وہ مفید غذا ہے جو مختلف قسم کی شفاء بخش خصوصیات رکھتی ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سورہ میں اُن دو پہلوں سے "تین اور زیتون" مراد نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، اس سے مراد: شہر "دمشق" اور بیت المقدس میں واقع دو مشہور و معروف پہاڑ ہیں۔ یہ دونوں مقامات خدا کے بہت سے انبیاء اور بڑے پیغمبروں کا محل قیام رہے ہیں، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی جگہ ہے، اور دوسری حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی جگہ ہے، تیسری اور چوتھی آیات کی قسموں کا سیاق و سباق جو مقدس سرزمینوں کا ذکر کرتے ہیں سمجھ سکتے ہیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ: "التین" انجیر، اس سورت میں اس کا ذکر آدم علیہ السلام کے زمانے کی طرف اشارہ ہے جب وہ اور ان کی اہلیہ بی بی حوا جنت

میں اپنی شرمگاہوں کو ڈھانپنے کے لیے درخت کے پتوں اور ممکنہ طور پر انجیر کا استعمال کرتے تھے، جیسا کہ اس سورت میں مذکور ہے: (سورہ اعراف آیت: ۲۲)

لفظ "الزیتون"۔۔ زیتون سے مراد نوح علیہ السلام کا زمانہ ہے، جنہیں دوسرا آدم کہا جاتا ہے، گویا طوفان کے اختتام پر نوح علیہ السلام نے ایک کبوتر کو چھوڑا پانی میں اترنے کے بعد خشکی کی تلاش کے لیے، کبوتر زیتون کی شاخ لے کر واپس آیا، کبوتر کے واپس آنے سے اور اس کے زیتون کی شاخ لانے سے حضرت نوح علیہ السلام نے اندازہ لگایا کہ طوفان ختم ہو گیا ہے، اسی لیے اب زیتون کی شاخ بہت سے عربوں میں امن و سلامتی کی علامت کے طور پر جانی جاتی ہے۔

"طور زیتا" کی پہاڑی، بیت المقدس میں ہے (رجوع کریں: جزء عمّ شیخ محمد عبده)

مفسر ابو حیان اپنی تفسیر "البحر المحيط" میں لکھتے ہیں: "بظاہر اللہ کی مراد انجیر اور زیتون کی قسم کھانا ہے"، جی ہاں! اللہ تعالیٰ نے انجیر کی قسم کھائی ہے، کیونکہ انجیر ایک ایسا پھل ہے کہ جولذت کم کرنے والی خرابیوں اور نجاستوں سے پاک ہے، اسی لیے یہ چھلکے گودے، اور بیجوں سمیت کھایا جاتا ہے، اسی طرح انجیر بھی، دوا بھی ہے اور غذا بھی۔

انجیر نرم اور آسانی سے ہضم ہونے والی غذا ہے جو معدے میں زیادہ دیر نہیں رہتی، ایک نرم طبع دوا ہے، بلغم کو ختم کرتی ہے، گردے اور مثانے کو صاف کرتی ہے، جسم کو فربہ کرتی ہے، مسام کھولتی ہے اور قابل تعریف پھلوں میں سے ایک ہے۔

بہت سے ڈاکٹروں کا یہ بھی ماننا ہے کہ انجیر جسم کے لیے انتہائی مفید اور غذائیت بخش پھل ہے۔

اسی طرح زیتون بھی ایک پھل ہے، اس سے تیل بھی حاصل کیا جاتا ہے، اور اس سے بہت سی دوائیوں کے امتزاج میں استفادہ کرسکتے ہیں۔

اور طور سینین کی !

وَطُورِ سَيْنِينَ ۝۲

خازن نے کہا ہے کہ: اسے "سینین" اور "سینا" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت اور پھل دار درخت ہیں، اور ہر وہ پہاڑ جس میں پھل دار درخت ہوں، اسے "سینین اور سینا" کہتے ہیں (تفسیر خازن: ۲۶۶/۴)

یاد رہے کہ صحرائے سینا میں کوہ "طور سینین" واقع ہے، جس کی چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت سے دعا کی تھی، اس پہاڑ کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کانور چمکنے لگا، (سورہ مریم آیت: ۵۲ کی طرف رجوع کریں)

"طور سینین": وادی سینا ہے جو آج مصر اور فلسطین کے درمیان واقع ہے، کوہ طور ان پہاڑوں میں سے ہے جو شبہ جزیرہ سینا کے علاقے میں واقع ہے، اس پہاڑ کو دین ابراہیمی بالخصوص یہودیت میں ایک خاص مقام حاصل ہے، یہودیوں کی روایات کی بڑی تعداد اس پہاڑی سے متعلق ہے یہی ان کی روایات کا سرچشمہ ہے۔

کوہ طور سے مراد وہ پہاڑ ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے نکلنے کے تین ماہ بعد وہاں گئے تھے، وہاں پہنچ کر اس کے قریب خیمہ زن ہو گئے تھے۔ دین ابراہیمی کی بعض روایات کے مطابق خدا نے اسی جگہ بنی اسرائیل کو شریعت عطا کی تھی، اس پہاڑی میں ہی سامری نے بچھڑا بنایا تھا۔ اس پہاڑ میں پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آتی اور آگ کے ذریعہ زیتون کے درخت کے نیچے ان پر تجلی ہوئی، (خروج: ۱۶/۱۷) یہ پہاڑ لوگوں میں کوہ حوریب، جبل اللہ، اور جبل موسیٰ کے نام سے مشہور ہے، یہ پہاڑ سطح سمندر سے ۲۲۸۵ میٹر بلند ہے اور العریش سے ۳۰ میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے۔

"سینین" کا مطلب ہے سنہرا، بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی طور سینا ہے جو کہ سورہ مؤمنون میں آیا ہے۔

اور قسم ہے اس امن والے شہر کی (مکہ معظمہ)	وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ﴿۳﴾

"الْبَلَدِ الْأَمِينِ" سے یا شہر امین سے مراد : مکہ مکرمہ کے سرزمین ہے، ایسی سرزمین جو زمانہ جاہلیت میں بھی محفوظ علاقہ اور خدا کا حرم مانا جاتا تھا، اور وہاں پر کوئی کسی پر حملہ نہیں کرسکتا تھا، مکہ مکرمہ میں نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ جانوروں، درختوں، پودوں اور پرندوں کے لیے بھی شہر "امین" کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں کسی جانور کو ہلاک نہیں کیا جاتا اور نہ ہی کوئی پودا کاٹا جاتا ہے، سوائے اس قسم کے پودوں کے جن کی لوگوں کو ضرورت ہے (مزید تفصیل جزء عمّ شیخ محمد عبدہ میں مطالعہ کرسکتے ہیں)۔

"الْأَمِينِ" ایسی سرزمین جس میں امن وامان ہو (رجوع کریں سورہ بقرہ : 126، آل عمران : 97، قصص : 57)۔

ان آیات میں "طُورِ سَيْنِينَ" اور الْبَلَدِ الْأَمِينِ کے مفہوم واضح ہیں کسی بھی قسم کے اختلاف کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ : ایک حضرت موسیٰ کا اور دوسرا حضرت اسماعیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعث ہے۔

اگر ہم قرآن کی دیگر آیات کی روشنی میں غور کریں تو بات واضح ہو جائے گی کہ ان دونوں علاقوں میں ایک خاص مماثلت ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ دونوں انبیاء اور دوجلیل القدر نبیوں کی طرف منسوب ہیں، طور سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور "بلد الامین" میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، دونوں مبعوث انبیاء اور نزول وحی کی جگہیں ہیں۔

قسم کا ربط "طور سینین اور بلد الامین" کا جواب قسم کے ساتھ ربط بالکل واضح اور ظاہر ہے، کیونکہ یہ دونوں مقام وحی کا سرچشمہ ہیں، اور ان میں عظیم ترین تاریخی شخصیتوں کا ظہور ہوا، وہ اچھی طرح گواہی دیتے ہیں کہ انسان میں عظیم صلاحیتیں ڈالی گئی ہیں، اور وہ بہترین ساخت میں پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ وہ جلیل القدر انبیاء کہ جو اس بلند وبالا مقام پر پہنچے، ان میں سے ہر ایک نے ایک عظیم اور ہمہ گیر انقلاب برپا کیا، اور اندھیری رات میں مشعل فروزاں کی طرح چمکے، انہوں نے جاہل اور ستم زدہ معاشرے کے اندھیروں کو علم اور دین کی روشنی سے روشن کیا۔

ان چار پُر معنی قسموں کو ذکر کرنے کے بعد جن کی طرف ہم نے مختصراً اشارہ کیا، درج ذیل آیت میں قسم کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝	یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا کیا ہے

ہم نے انسان کو جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے بہترین اور خوبصورت کل میں پیدا کیا ہے، مجاہد نے کہا: "أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" یعنی: ہم نے اسے سب سے خوبصورت اور بہترین شکل میں پیدا کیا ہے (طبری: 156/30)۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا..." چاروں قسموں کا جواب ہے، "احسن" سب سے خوبصورت، بہترین، "تقویم" کا مطلب ہے کسی چیز کو صحیح طریقے سے، ایک معتدل نظام اور ایک قابل قدر معیار پر لانا، اور اس کا وسیع معنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر لحاظ سے متوازن اور قابل بنایا ہے، جسمانی، ذہنی اور روحانی طور پر، کیونکہ اس نے اسے ہر قسم کا ہنر دیا ہے، اور اسے بہت بڑے مقاصد کے حصول کے لیے تیار کیا ہے، اور انسان (جرم صغیر) چھوٹا جسم ہونے کے باوجود اس میں عظیم دنیا (عالم کبیر) رکھ دی اور اتنی خوبیاں عطا کیں کہ اس خلقت کی لائق بنا: "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (ہم نے اولاد آدم کو عزت و عظمت دی) (سورہ اسراء: 70)۔

وہی انسان جس کی تخلیق اور تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ ہے: "فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" ۱۳۰ "عظیم اور بابرکت ہے وہ خدا جو بہترین تخلیق کرنے والا ہے، لیکن یہی انسان ان تمام مراعات کے باوجود، اگر راہ راست سے ہٹ جاتا ہے، تو ایسے گرے گا کہ "أَسْفَلَ سَفِلِينَ" کی طرف چلایا جائے گا۔ چنانچہ اگلی آیت میں فرماتے ہیں: پھر ہم نے اسے پست ترین منزلوں تک پہنچادیا، یعنی "أَسْفَلَ سَفِلِينَ" سب سے نیچے تک پہنچادیا۔

کہتے ہیں کہ: اونچے پہاڑوں کے پھلو میں ہمیشہ گہری کھائیاں بھی ہوتی ہیں، اور انسانی ترقی کے اس چڑھتے ہوئے عروج کے مقابل ایک خوفناک منزل بھی نظر آتا ہے، کیوں ایسا نہ ہو کہ، جب انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال ہے کہ اگر وہ اسے اچھے طریقے سے استعمال کرے تو عزت کی بلند ترین چوٹی پر فائز ہو جائے، اور اگر وہ اس تمام ذہانت اور ہنر کو غلط طریقے سے استعمال کرے تو سب سے بڑی بددیانتی کرے گا، اور یہ فطری ہے کہ اسے نچلی سطح پر گھسیٹا جائے گا۔ آیت مبارکہ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" ۱۴۰ "ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَفِلِينَ" کے مفہوم سے پوری وضاحت سے ہمیں معلوم ہوا کہ: انسان اصل میں پست پیدا نہیں ہوا، اس کا زوال زندگی کے مراحل طے کرنے سے ہوتا ہے، درحقیقت انسان جو مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور عظیم ہے، اس کا زوال بھی تمام مخلوقات میں سب سے پست ہے، "أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ..... أَسْفَلَ سَفِلِينَ" .

جیسا کہ سورہ اعراف آیت "179" میں ہے "أُولَئِكَ كَانُوا لِنِعْمِ رَبِّ لَهُمْ أَضَلُّ" ۱۴۰ "أُولَئِكَ" (وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ ہیں) انسانی زوال کا سبب بننے والے بنیادی عوامل میں سے ایمان اور نیک عمل سے دوری ہے۔ واضح رہے کہ: ایمان ہر قسم کی پستی اور نزول سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

پھر ہم نے اسے لوٹا کر نیچوں سے نیچا کر دیا	ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَفِلِينَ ۱۴۰

پھر ہم نے اسے پستوں میں سے پست ترین بنادیا (اور اسے بدترین لوگوں کے گروہ میں شامل کیا) "رَدَدْنَاهُ" ہم اسے لوٹائیں گے، اسے جگہ دیں گے، لفظ "رَدَّ" کا اصل معنی واپس کرنا، اور ضمنی معنی جعل، یعنی: رکھنا اور بنانا (روح المعانی)۔

"أَسْفَلَ" مفعول به یا منصوب به نزع خافض ہے ، "سَفِيلَيْنِ" سب سے نچلے والے، پست لوگ ، جمع مذکر سالم ہے ، اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی انسانیت کو نظر انداز کرتے ہیں، ایمان اور دینداری کی اونچائی پر چلنے کے بجائے کفر اور بد دیانتی کی کھائی کی طرف چلتے ہیں۔ عالم اسلام کے مشہور مفسرین میں سے مجاہد اور حسن نے کہا ہے کہ: "أَسْفَلَ سَفِيلَيْنِ" سے مراد آگ اور جہنم کے سب سے نچلے درجے ہیں ، ضحاک نے کہا ہے کہ : یعنی ہم اسے سب سے پست عمر کی طرف لوٹائیں گے جو کہ بڑھا پا ہے (تفسیر قرطبی: 115/19)۔

مفسر آلوسی فرماتے ہیں : لفظ کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیامت کے دن کافر انسان کی حالت کی طرف اشارہ ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے خوبصورت اور اصلی شکل میں پیدا کرنے کے بعد وہ انتہائی بدصورت اور مکروہ بن جاتا ہے (آلوسی : 176/30)۔

"رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَفِيلَيْنِ" آیت مبارکہ کا یہ پیراگراف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو لوگ کفر، شرک ظلم، جبر اور دیگر لغزشوں کا راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ انسانیت کے مقام سے گرجاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نظروں میں نیچوں سے نیچے سمجھے جاتے ہیں، دنیا میں ناپاکوں اور آخرت میں دوزخیوں کی جماعت میں شامل ہوں گے، (اس کی تفصیل سورہ نساء : 145 ، صافات: 98 ، فصلت: 29 ، بینة: 6 میں مطالعہ فرمائیں۔

یہی انسان ان تمام صلاحیتوں اور سہولتوں کے ساتھ جو اسے دی گئی ہیں، اگر وہ راہِ راست سے ہٹ جائے، تو پھر وہ اتنا گرے گا کہ اسے گھسیٹ کر "أَسْفَلَ سَفِيلَيْنِ" تک لے جایا جائے گا، بعد کی آیت میں مزید فرمایا : سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے اور عمل صالح کرتے ہیں ان کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع نہیں ہو گا: "إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ"۔

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے	إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ٥٦

"غَيْرُ مَمْنُونٍ" نہ ٹوٹنے والا ، نہ رکنے والا، بغیر احسان جتائے (رجوع فرمائیں سورہ فصلت : 8 ، قلم: 3 ، انشقاق: 25)

"مُتْنُونٍ" یہاں "من" کے مادہ سے ہے بہ معنی : رکاوٹ یا نقصان کے ؛ لہذا "غَيْرُ مُتْنُونٍ" سے مراد ہمیشہ کا انعام جو ہر قسم کے عیب سے پاک ہوتا ہے، اور بعض نے کہا اس کا معنی منت احسان جتانے سے پاک ہونا ہے، لیکن پھلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ : نجات کے لیے صرف ایمان کافی نہیں ہے، ایمان اور عمل صالح قرب الہی کے بنیادی عناصر ہیں، ایمان اور عمل صالح سب سے اہم، بلکہ سب سے واضح اور اہم عوامل ہیں جو انسان کو جنت میں داخل کرنے کا سبب بنتے ہیں وہ ایمان اور نیک عمل ہے۔

یاد رکھیں کہ عمل کے بغیر ایمان کا کوئی اثر نہیں، ایمان کے بغیر عمل بھی فائدہ مند اور مفید نہیں، قرآن کی آیات پر مختصر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور معاشرے کی فلاح و بہبود کا انحصار دو چیزوں پر ہے : ایمان اور عمل صالح، ایمان والی زندگی اور اچھا عمل۔

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةًۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" (سورہ نحل، آیہ 97-134)۔
- سورہ بقرہ، آیہ (82)۔

ترجمہ: "جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مؤمن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی بخشیں گے، اور یقیناً ہم سے اس کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے۔"

اور دوسری آیت: "وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ" (سورہ بقرہ، آیہ 82) **ترجمہ:** "اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

"ایمان" اور "عمل صالح" ان چیزوں میں سے ہیں جن کا خدا تعالیٰ نے ہم سے مطالبہ کیا ہے، اور اسے بنی نوع انسان کے کمال اور سعادت تک پہنچنے کے لیے شرط قرار دیا ہے، یہ دونوں تصورات قرآن مجید میں بہت سے مواقع میں ایک ساتھ مذکور ہیں، اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق پر زور دیا گیا ہے، ان آیات کا ایک جائزہ لیتے ہیں: "وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنْ لَّهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرٰى مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ" (سورہ بقرہ آیہ 25) **ترجمہ:** اور ان لوگوں کو خوش خبری دے دیں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے کہ بیشک ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

"الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ" (سورہ رعد آیت 29) ترجمہ: جولوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے ان کے لیے خوشحالی اور اچھا ٹھکانہ ہے۔

"فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ" (سورة انبياء آیه 94) ترجمہ: پس جو شخص کوئی نیک اعمال کرے اور وہ مؤمن ہو تو اس کی کوشش کی کوئی نا قدری نہیں ہوگی، ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا فریضہ خدا تعالیٰ کے نزدیک "ایمان" اور "عمل صالح" ہے۔

علماء کرام "ایمان" اور "عمل صالح" کے درمیان ربط کو "درخت" اور "پھل" کے درمیان جیسا تعلق سمجھتے ہیں، جس طرح پھل دار درختوں میں سے صحت مند درخت پھلوں سے خالی نہیں ہوگا، اسی طرح ایمان عمل صالح سے الگ نہیں ہوگا، سوائے کمزور، اور کم نور ایمان کے جو ہوس اور خواہشات کے سامنے بے اثر ہو جاتا ہے، اور واضح تعبیر یہ ہے کہ اعمال صالحہ دل کے ایمان کی علامت ہیں۔

البتہ اس کا یہ مطلب یہ نہیں ہے کہ معصیت یا گناہ کبیرہ کے مرتکب کافر ہیں، جیسا کہ خوارج کا خیال تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مضبوط ایمان یقیناً اعمال صالحہ پر سبقت رکھتا ہے، حالانکہ ایسا لگتا ہے کہ فرائض کا بجالانا اور ممنوعات کو چھوڑنا ایمان سے زیادہ مشکل ہے، اصولاً اسے مقدم ہونا چاہیے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اعمال صالحہ کے سلسلے میں ایمان کی جڑ اور بنیاد کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے، ایمان اور عمل صالح کی تفسیر اتنی وسیع ہے کہ اس میں ایک طرف خدا پر ایمان کے تمام مراحل اور دیگر تمام اعتقادی بنیادیں، اور دوسری طرف قابل قدر ذاتی، معاشرتی، سیاسی اور عبادات کام کی انجام دہی بھی شامل ہے۔

"وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالْحَقِّ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ" (عصر/3-1) سورہ عصر میں زمانے کی قسم کھا کر کہتا ہے: "زمانے کی قسم! کہ بیشک ہر انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔"

اکیلے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں، ایمان اور عمل ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ایمان اور علم صالح کا تعلق

ایمان اور عمل صالح کا گہرا تعلق ہے، قرآن پاک کی متعدد آیات میں ایمان کے بعد اکثر عمل صالح کا بھی ذکر ہے، در حقیقت یہ دونوں ترازو کے

دوپلڑوں کی مانند ہیں، کہ ان میں سے ایک کے بغیر نہیں تولا جاسکتا ہے، عمل صالح کے بغیر ایمان کام نہیں آئے گا، اگر کوئی اسلام کے احکامات پر عمل کے بغیر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا ایمان دعویٰ سے زیادہ کچھ نہیں یہ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

قرآن کریم اس بارے میں کہتا ہے: "يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ" (انعام، 158)۔ ترجمہ: (مگر) جس روز تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آجائیں گی تو جو شخص پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا اس وقت اسے ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا یا اپنے ایمان (کی حالت) میں نیک عمل نہیں کئے ہونگے (توگناہوں سے توبہ کرنا مفید نہ ہوگا اے پیغمبر ان سے) کھدو تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

ایمان اور عمل صالح کو جوڑنے کے اثرات اور فوائد

قرآن کریم میں ایمان اور عمل صالح کے امتزاج سے حاصل ہونے والے فوائد اور ثمرات بتائے گئے ہیں کہ ان دونوں کا باہمی ایک قریبی اور براہ راست تعلق ہے، اگر ایمان روح کی گھرائیوں میں داخل ہو جائے تو اس کی شعاعیں انسان کے اعمال میں چمکتے ہیں، اور اس کے اعمال کو صالح بنادیتی ہیں، کیونکہ عمل صالح ایمان کے درخت کا پھل ہے، اور ایمان جڑ کی مانند ہے، اور میٹھے پھل کا ہونا جڑ کی صحت کی دلیل ہے، جبکہ عمل صالح کے بغیر ایمان بے ثمر درخت ہے۔

گناہوں کو مٹانا اور دور کرنا

نیک اعمال انسان کے پچھلے گناہوں کو مٹادیتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ" یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہے۔

سعادت اور نجات کا ذریعہ

انسان کی خوش بختی کا پیمانہ عمل صالح ہے، سعادت کے مختلف درجات اور مرتبے ہوتے ہیں، عمل صالح انسانی کمال کا پہلا مرحلہ ہے، جو کہ احساسات اور قلب و ذہن میں پاکیزگی کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مَنْ

عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أَنَّثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" (جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس حال

میں کہ وہ مؤمن ہو، ہم اسے پاکیزہ زندگی اور اجر دیں گے)، (سورہ نحل : 97)۔

نیک عمل انسان کی دنیا اور آخرت بدل دیتا ہے، اور مؤمنوں کو دنیا اور آخرت میں اچھی زندگی عطا کرتا ہے، ایمان کے ساتھ نیک اعمال سب سے بڑی قیمت رکھتے ہیں جو اپنے کرنے والوں کے لیے خوشحالی اور نجات لاتے ہیں۔

قرآن کے نقطہ نظر اور فہم سے واضح ہوتا ہے کہ نجات عمل صالح اور ایمان کا ہی نتیجہ اور اس کا ثمر ہے، اس لیے خوشی کا معیار ایمان اور عمل صالح کی حقیقت ہے نہ کہ صرف زبانی اور لسانی دعوے، سعادت کا آخری درجہ رب سے ملنا ہے، جو کہ عمل صالح سے ہی ممکن ہے، "فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا" جس کو رب سے ملاقات کی امید ہے پس اسے چاہیے کہ وہ عمل صالح کرے، سورہ عصر میں زمانے کی قسم کھا کر فرماتا ہے: "زمانے کی قسم! کہ بیشک ہر انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں" وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ " اور نیک اعمال کرتے ہیں، اس سورت میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اکیلے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں، ایمان اور علم صالح ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔

محبت اور دوستی پیدا کرنا

ایمان اور عمل صالح کے ثمرات میں سے ایک لوگوں سے دوستی اور محبت بڑھانا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا" (جولوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اللہ تعالیٰ ان کی دوستی اور محبت کو لوگوں کے دلوں میں جگہ دے گا)۔

پس دوستی کرنا ایمان اور عمل صالح میں سے ایک ہے، اور ان دونوں کے دیگر فائدے بھی مراد ہیں مثلاً: اجر اور اچھا بدلہ دینا، اجر کا ضائع نہ ہونا، خوف اور امید رکھنا، مغفرت پانا، خوش نصیبی، کشادہ رزق، خدا کی رحمت اور فضل سے فائدہ اٹھانا، تاریکی سے روشنی کی طرف رہنمائی، نقصان دہ نہ ہونا، بڑی فتح اور کامیابی، جنت اور اس کی ابدیت کا وعدہ وغیرہ۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا ثمرات اور فوائد اس شرط پر حاصل ہوتے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح کو یکجا کیا جائے، یعنی دونوں موجود ہوں، ان کا حصول عمل صالح کے ساتھ ایمان کی موجودگی پر منحصر ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کو انسان کی استطاعت اور طاقت کے مطابق مقرر

کیا ہے، تاکہ مؤمنین ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دے سکیں، آیات کے علاوہ بہت سی احادیث میں ایمان اور عمل صالح کے باہمی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام

تمام آیات و روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایمان اور عمل دوپروں کے مانند ہیں: کہ ایک پرسے اڑنا ممکن نہیں اور یہ دونوں لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں، اور آیات و سنت میں ایمان اور عمل صالح کا موازنہ کیا گیا ہے، اس تناظر میں روایات میں تضاد کا نہ ہونا دونوں کے درمیان براہ راست تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

پس (اے انسان!) اس کے بعد کونسی چیز تجھے جزا کے بارے میں جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟	فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدَ الدِّينِ، ۝

یعنی : اے منکر انسان! اب جب کہ تم جانتے ہو کہ اللہ نے تمہیں بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے اور وہی تمہیں تنزل کی طرف لوٹائے گا، تو پھر کیا چیز ہے جو تمہیں قیامت اور عذاب کو جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟ ایک قول یہ بھی ہے کہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے "یعنی اے محمد! ان واضح اور یقینی دلائل کے ظاہر ہونے کے بعد پھر کون ہے جو آپ کا انکار کرے گا؟"

کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے	أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَكَمِينَ ۝

اپنے فیصلے اور انصاف میں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہے، چونکہ اس نے انسان کو حسن و جمال اور بہترین ساخت کے ساتھ پیدا کیا ہے، پھر اس نے اپنے منکروں اور کافروں کو جہنم کی آگ میں جھونک دیا، اور اہل ایمان کو اعلیٰ درجات سے نوازا، پس اس کے انصاف کا تقاضا ہے کہ قیامت قائم کرے، تاکہ مظلوموں کو ظالموں سے ان کا اجر اور بدلہ ملے۔

تفسیر المیزان میں اس مبارک آیت کے ضمن میں لکھا ہے: ایک سرزنش والے سوال کے ساتھ نسل انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے، تمہیں قیامت کے عذاب سے انکار کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا؟ اگرچہ ہم نے نسل انسانی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ جن کو انعام دیا گیا ہے، اور دوسرا وہ جو اسفل السافلین کی طرف لوٹایا جائے گا، تو کیا خدا کے احکم الحاکمین ہونے کے علاوہ کو اور رائے ہو سکتی ہے، اور اس کا حکم کسی بھی حکمران

کے حکم سے برتر ہے، کیونکہ اس کا حکم استحکام اور نافذ ہونے میں کسی دوسرے حکمران کے حکم سے افضل ہے، اور یہ واضح اور حکیمانہ فیصلہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کے لیے مختلف سزائیں ہوں، اس لیے سزا کا ایک دن ہونا چاہیے، تاکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق سزاملے، انسانی عقل اور فطرت بھی یہ تجویز نہیں کرتی کہ دونوں گروہوں کے درمیان ثواب عذاب کا دن نہ دیا جائے۔

محترم قارئین:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے: "فَإِذَا قَرَأَ أَحَدُكُمْ: "وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ... فَأَتَى آخَرَهَا: أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَكَمِينَ؟... فَلْيَقُلْ: بلى وَأَنَا عَلَى ذَلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ." جب بھی تم میں سے کوئی: "وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ" پڑھے، اور اس کے آخر میں "أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَكَمِينَ" تک پہنچے، تو اس کے بعد کہے، ہاں! (اللہ تعالیٰ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے) اور میں تصدیق کرنے والوں میں سے ہوں۔

سورۃ التین کا پیغام

- 1- دنیاوی نعمتیں حتیٰ کہ کھانے پینے کی اشیاء قابل احترام ہیں اور خدائی قسم کی مستحق ٹھہری ہیں، "وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ"۔
- 2- خوراک اور تحفظ کے ذریعہ حاصل ہونے والی صحت اور تندرستی انسانوں کی سب سے اہم مادی ضروریات ہیں "وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ" ﴿١﴾ وَطُورِ سَيْنِينَ ﴿٢﴾ وَبَدَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ﴿٣﴾۔
- 3- وحی کا احترام حرمت زمینوں میں پھیل جاتا ہے "طُورِ سَيْنِينَ"۔
- 4- مکہ مکرمہ شہر کا امن و امان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے، جنہوں نے کھاتھا: "رَبِّ اجْعَلْ بَدَا الْبَلَدِ أَمْنًا" اور یہ دعا قبول ہوئی: "وَبَدَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ"۔
- 5- انسان تخلیق میں تمام دیگر مخلوقات سے افضل ہے: "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ"۔
- 6- اللہ تعالیٰ انسان کی ابتدا اور انتہا پر قادر ہے: "خَلَقْنَا رَدَدْنَاهُ"۔
- 7- انسان کی اصل تخلیق میں پستی نہیں ہے، اس کا زوال زندگی کے مراحل غلط طریقے سے طے کرنے سے ہوتا ہے، "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" ﴿٤﴾ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ﴿٥﴾۔
- 8- انسان مخلوقات میں سب سے برتر ہے، مگر اس کا گرنابھی تمام موجودات سے پست تر ہوتا ہے: أَحْسَنَ تَقْوِيمٍ.... أَسْفَلَ سَافِلِينَ" (جیسا کہ دوسری آیات

میں فرماتے ہیں: "أَوَلَيْكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ" ۔

9۔ ایمان اور عمل سے دوری پستی میں گرنے کا سبب ہے، اور ایمان ہرقسم کی پستی اور نزول سے دوری کا ذریعہ ہے: "رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَفَلَيْنَ.... إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ"۔

10۔ گوکہ خدا انسان کا خالق ہے اور وہ اپنی مخلوق کے ساتھ جس طرح چاہے معاملہ کرنے کا حق رکھتا ہے، لیکن وہ انصاف پر مبنی حکم کرتا ہے، اور بہترین فیصلہ کرنے والا ہے "أَحْكُمُ الْحَكِيمِينَ"۔

پہل اور میوہ جات کا ذکر قرآن کریم میں

زمین سے اُگنے والے تمام پودے ہر لحاظ سے اہم ہیں، اور خدا کی عظمت کی واضح نشانیاں ہیں۔

قرآن کریم میں پودوں کو "نبات" کے نام سے "20" سے زیادہ مرتبہ، درختوں کو "شجر" کے نام سے "20" گنا زیادہ، پھلوں کو "فاکھہ اور ثمرۃ" کے عنوان سے "30" سے زیادہ مرتبہ، اور اناج کو "حب" کے نام سے "9" اور نباتات کو "قضب اور بقل" کے نام سے دوبار ذکر کیا گیا ہے۔

انار "رُمَّان" کا لفظ تین مرتبہ قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے، (سورہ انعام ایت : 99، اور 141، سورہ رحمن : 68)۔

انجیر "تین" کا نام ایک ہی مرتبہ قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے، وہ سورہ "تین" آیت "1" میں، انجیر مضبوط ترین پھلوں میں سے ایک ہے، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ انجیر ایک بہترین غذا ہے، جسے انسان کسی بھی عمر میں استعمال کرسکتا ہے، انجیر بچوں، کھلاڑیوں اور کمزور یا بوڑھے افراد کے لیے قدرتی میٹھے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، وہ اپنی غذائیت کے لیے انجیر کا استعمال کرسکتے ہیں۔

کھاجاتا ہے کہ: "افلاطون" انجیر کو اس قدر پسند کرتا تھا کہ بعض لوگ اسے یعنی انجیر کو فلاسفروں کا دوست کہتے تھے۔

سقراط انجیر کو فائدہ مند مادوں کو جذب کرنے اور جسم سے نقصان دہ جراثیم اور بیکٹیریا کو دور کرنے والا سمجھتا ہے۔

"جالینوس" نے پھلوانوں کے لیے انجیر کی ایک خاص خوراک رکھی تھی، رومی اور یونانی پھلوانوں کو بھی انجیر دیا جاتا تھا۔

علماء کا کہنا ہے کہ انجیر مختلف وٹامنز سے بھر پور ہوتی ہے، اور بہت سی بیماریوں کے لیے اسے دوا کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر جب انجیر اور شہد کو برابر ملا کر پی لیا جائے تو یہ معدے کے السر کے لیے بہت مفید ہے۔

خشک انجیر کھانے سے یاد داشت مضبوط ہوتی ہے، اور انجیر میں جو معدنی عناصر ہیں وہ جسم اور خون کو متوازن رکھتے ہیں، انجیر کسی بھی عمر کے افراد کے لیے غذا ہے، اور کسی بھی موسم، اور ماحولیاتی حالات کے لیے غذا ہے۔

"عنب" انگور کا پھل، واحد اور جمع کی صورت میں "عنب اور اعناب" قرآن پاک میں انگور کا ذکر دس مرتبہ آیا ہے، (سورہ رعد آیت: 4، سورہ نحل آیت: 11، اور سورہ یس: 34، سورہ نحل آیت: 67، سورہ اسراء آیت 32، کہف: 42)۔

کھجور "رطب" کھجور کا درخت، (نخل، نخیل، نخلۃ) نخل اور نخیل کا لفظ قرآن عظیم الشان میں "20" مرتبہ آیا ہے، (سورہ رعد: 4، سورہ انعام: 99، سورہ ق: 10، سورہ انعام آیت: 141، سورہ یس آیت: 34)۔
قضاء کھیرا بنی اسرائیل کے قصہ میں مذکور ہے کہ وہ ایک کھانے سے سیر نہ ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام سے دیگر سبزیوں کے ساتھ کھیرا بھی مانگا (سورہ بقرہ آیت: 61)۔

"زیتون" کا نام قرآن پاک میں "6" مرتبہ آیا ہے، ایک اس کا ذکر براہ راست اس درخت کی طرف اشارہ ہوا جو کوہ سینا پر اگتا ہے، اور اس سے تیل پیدا ہوتا ہے، (اس کا ذکر سورہ مؤمنون آیت: 20 میں) اس طرح زیتون کے درخت کا نام دوبار اکیلے اور پانچ بار دوسرے پھلوں جیسے: کھجور، انار، انگور اور انجیر کے ساتھ استعمال ہوا ہے، قرآن عظیم میں زیتون کے درخت کو خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بتایا گیا ہے جو سورہ نحل کی آیت "11" میں بیان ہوئی ہے، اور زیتون کے درخت کا برکت والے پھلوں میں ذکر ہوا ہے (سورہ نور آیت: 35)۔

اسی طرح اللہ نے تعالیٰ زیتون کے درخت کی قسم کھائی ہے (سورہ نور آیت: 35)۔

طَلْح "کیلا"، کیلے کا ذکر قرآن پاک میں ایک بار آیا ہے کہ جنتی اس کیلے کے درخت سے کھائیں گے، جس کا پھل ایک دوسرے کی اوپر ڈھیر ہوگا، (سورہ واقعہ آیت: 29)۔

البتہ قرآن کریم کے اکثر مفسرین "طلح" کو کیلے کا درخت سمجھتے ہیں، لیکن فاروقی اسے (عصارہ) کہتے ہیں۔

پیاز "بصل" بنی اسرائیل کے قصے میں پیاز کا ذکر ہے کہ وہ ایک قسم کا کھانا کھاتے تھے، وہ مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پیاز مانگی (سورہ بقرہ آیت: 61)۔

"قوم" لہسن قرآن کریم اور بنی اسرائیل کے واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لوگوں کے مطالبات میں لہسن بھی شامل تھا، (سورہ بقرہ آیت: 61)۔

"مَنْ" ترنجبین قرآن کریم میں تین مرتبہ "مَنْ" کا ذکر ہوا ہے، بنی اسرائیل کو عطا کی گئی نعمت کے طور پر (سورہ بقرہ آیت: 57، سورہ اعراف آیت: 16، سورہ طہ: 80)۔

"کافور" کا لفظ قرآن کریم میں تین بار وہ بھی سورہ "الدھر" آیت: 5 میں استعمال ہوا ہے (سورہ انسان: 5)۔

"زنجبیل" ادرك، ایک بار قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے، اور اسے جنتیوں کا مخلوط مشروب کھا ہے (سورہ انسان: 17)۔

"عدس" دال، قرآن کریم اور بنی اسرائیل کے واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان مطالبات میں شامل تھی (سورہ بقرہ آیت: 61)۔

"یقطين" کدو کا ذکر قرآن پاک میں ایک بار سورہ "صافات" میں آیا ہے، اور اس میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کو مچھلی کے پیٹ سے بچا کر ان کے سرہانے پر دریا کے کنارے کدو کی بیل اگائی تا کہ وہ سورج کی تیز شعاعوں سے محفوظ رہیں۔

جنت کے پھل اور باغات

ان آیات و احادیث میں اس بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ہے کہ جنت میں کس قسم کے پھل دار درخت ہیں، یہ علم غیب کا حصہ ہے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ کتاب و سنت کے بعض شرعی نصوص کے مطابق جنت کے بعض پھلوں اور درختوں کے نام بتائے گئے ہیں، جیسے: انار، کھجور، سیب وغیرہ یا بیری کے درخت۔

لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اہل جنت جو پھل چاہیں گے فراہم کیا جائے گا، کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: "وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ" ۲۰ ○ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۲۱ ○ (سورہ واقعه)۔

یعنی: جس قسم کا پھل جسے وہ جنتی چاہیں، ان کے لیے بہترین اور خوبصورت شکل میں فراہم کیا جائے گا، اور انہیں ہر قسم کے پرندوں کا گوشت مہیا کیا جائے گا، جو وہ چاہیں، جس طرح چاہیں، کباب بنا کر یا پکا کر یا کسی اور طریقے سے، اور "يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ" ۵۵ ○ (سورہ درخان: 55) یعنی جنت میں وہ جو پھل چاہیں گے، جس کا دنیا میں کوئی نام ہے یا جس کی دنیا میں کوئی پہچان نہیں ہے، جس کی مانند کوئی نہیں

ہے وہ چاہیں گے بغیر کسی پریشانی اور مشقت کے ان کے لیے فوراً تیار ہو جائے گا۔

اور فرمایا: "وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ۝۳۲" (سورہ واقعہ: 32-33) یعنی وہ دنیا کی پھلوں کے مانند نہیں ہیں جو مخصوص اوقات میں نہیں مل سکتے اور مخصوص موسموں میں ہی ملتے ہیں، اور ان کا حاصل کرنا اور استعمال کرنا آسان ہے اور کوئی شخص کسی بھی حالت میں ان تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، اور فرمایا: "إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ ۝۳۱ وَفَوَاكِهٍ مَّيَا يَشْتَهُونَ ۝۳۲" یعنی: متقی لوگ مختلف سایہ دار، سرسبز اور گھنے درختوں کے درمیان اور بہتے چشموں کے پاس ہوں گے جو سلسبیل اور ریحق چشمے سے نکلتے ہیں، بہترین اور پاکیزہ پھل جو وہ چاہیں گے اور خواہش رکھیں گے ان کے لیے مہیا ہوگا۔

اور فرمایا: "وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۝ كُلًّا رِزْقًا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا ۝ قَالُوا هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ ۝ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۝ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۝ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۲۵" (سورہ بقرہ: 25) ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنادو کہ ان کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جب انہیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیے جائیں گے اور وہاں ان کے لیے پاک بیویاں ہونگی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو پھل ان کے پاس لائے جائیں گے وہ سب اچھائی اور خوبصورتی کے لحاظ سے ایک جیسے ہوں گے، اور ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گے، اور ہمیشہ ہوں گے۔

تفسیر سعدی میں ہے کہ: جنت کے پھل خوبصورتی اور ذائقے میں یکساں ہیں، اور ان میں کوئی خاص پھل نہیں ہے، اور اہل جنت ہمیشہ عیش و عشرت میں رہیں گے، وہ ہمیشہ پھل کھا کر لطف اندوز ہوں گے "وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا" بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنت کے پھل نام میں ایک جیسے ہوں گے، لیکن ذائقے میں مختلف ہوں گے، ایک گروہ کہتا ہے کہ ان کا رنگ ایک جیسا ہوگا، لیکن نام میں فرق ہوگا، کچھ کا خیال ہے کہ وہ خوبصورتی اور لذت میں ایک جیسے ہیں، شاید یہ بہترین قول ہو۔

جب بھی ان پر کوئی نعمت پیش کی جائے گی، چونکہ پھل دیکھنے میں ایک جیسے ہوتے ہیں، تو وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ پچھلے پھل جیسا ہے، لیکن

حقیقت میں ایسا نہیں ہوگا، ذائقہ اور خوشبو میں منفرد خصوصیات ہوں گے، اور ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، یہ آیات بتاتی ہیں کہ مطلوبہ پھلوں کی جنت میں کوئی حد نہیں ہے، اور یہاں تک کہ ایسے نئے پھل بھی ہوں گے جو دنیا میں موجود نہیں تھے۔

جنت کے درختوں کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے: "وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ ۝ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ۝ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۝ وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۝" (سورہ واقعہ) یعنی: خوش نصیب لوگ، سعادت والے لوگوں کی حالت کیسی ہے: یعنی ان کی حالت بہت اچھی ہے، "فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ" وہ بیری کے درختوں کے درمیان ہیں جن کے کانٹے ہٹالیے گئے اور کاٹے گئے ہیں، اور ان کی تکلیف دہ شاخوں کی جگہ پھل لگادیا گیا ہے، بیری کے درخت میں بہت سے وسیع فوائد ہیں اور اس کے سایہ کی خصوصیات ہیں انسان اس کے سایہ میں سکون پاسکتا ہے۔ "وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ" طلح ایک درخت ہے جو صحرا میں اگتا ہے، اور اس کا پھل لذیذ اور مزیدار ہوتا ہے۔

ابن ابی الدنیا سالم بن عار سے روایت کرتے ہیں کہ: انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کہتے تھے کہ: اللہ کرے کوئی دیہاتی بندہ آئے تاکہ اس کے سوالات سے ہمیں فائدہ ہو، ایک دن ایک دیہاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اللہ تعالیٰ نے جنت میں ایک درخت کے بارے میں بتایا ہے حالانکہ وہ تو وہ تکلیف پہنچانے والا ہے، اور میں نے نہیں سوچا تھا کہ جنت میں کوئی پریشان کن درخت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کونسا درخت؟ کہا: بیری کا درخت، اس درخت کے کانٹے ہیں، اس کا کانٹا تو پریشان کن ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مگر رب تعالیٰ نے فرمایا: "فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ" (سورہ واقعہ: 28) خدا نے اس کے کانٹے ہٹا کر ان کی جگہ پھل پیدا فرمایا ہے، ایسا پھل اس درخت سے نکلتا ہے کہ جو "72" رنگوں میں آتا ہے، اور اس کا کوئی رنگ دوسرے سے مشابہ نہیں ہے۔

اور فرمایا: "وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أَكْلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرَّمَانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۝" (سورہ انعام: 141)۔ ترجمہ: اور خدا ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کئے مچانوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور جو مچانوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح

کے ذائقے ہوتے ہیں اور زیتون اور انار جو (بعض باتوں میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض باتوں میں نہیں ۔

مختصر یہ کہ جنت میں ہر قسم کے پھل ہیں ، جیسے : سیب ، کھجور ، انگور ، انار ، زیتون وغیرہ، اور ہر قسم کے خوشبودار پھل اور پھول ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ ، جنت میں ایسی چیزیں ہیں جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھی ہیں، اور کسی کان نے نہیں سنی، اور ان میں سے کچھ بھی کسی کی سوچ میں کبھی نہیں آسکتی، خدا تعالیٰ ہمیں وہ سب نصیب فرمائے ۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ جزء - (30) سورۃ العلق

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی "19" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کا نام "علق" رکھنے کی وجہ اس کی دوسری آیت ہے، اسی طرح اس سورت کو "اقراء" اور "قلم" بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان "اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ" خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ" اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ" الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" سے اس کا آغاز کیا ہے۔

یہ سورہ آسمان اور انسان کے درمیان تقریباً چھ صدیوں (حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ کی درمیان کا زمانہ) کے بعد پھلا رابطہ ہے اور اسی ربط سے زمین پر بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، اور انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس میں، خصلتوں، مزاجوں، فطرت اور عادات میں ہونے والی تبدیلیاں متعین ہوتی ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سورت کی ابتدا قرآن مجید کی پہلی نازل شدہ آیات ہیں، لیکن اس سورت کا بقیہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قریش میں دعوت کی اشاعت اور اس دعوت کے خلاف ان کی تحریکوں کے بعد نازل ہوا۔

سورہ علق کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

یہ وہ پہلی سورت ہے جس کی پہلی پانچ آیات مکہ میں بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل ہوئیں، سورہ "علق" جسے سورہ "اقراء" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، مکی سورتوں میں سے ایک ہے، اس سورت میں ایک (۱) رکوع، انیس (۱۹) آیتیں، تہتر (۷۳) الفاظ، ایک سو ستانوے (۱۹۷) حروف اور ایک سو پچیس (۱۲۵) نقطے ہیں۔

(قرآن کی سورتوں میں حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)۔

سورہ علق اور سورہ تین میں ربط و مناسبت

سورہ تین میں انسان کی منفرد اور خوبصورت تخلیق کا حوالہ دیا گیا ہے، اور انسان کی تخلیق علق اور اس کی تخلیق کے مادہ سے بحث کی گئی ہے، یہ سورت ابدی دنیا کی حالت بھی بتاتی ہے، جو پچھلی سورت کا اعادہ کرتی ہے (آیات متبرکہ: ۵ اور ۷)۔

ملاحظہ

سورع علق کی (۱۹) انیسویں آیت میں سجدہ تلاوت ہے، آپ اسی تفسیر کی سورہ النجم میں سجدہ تلاوت کے حکم کے بارے میں تفصیلی معلومات پڑھ سکتے ہیں۔

سورہ علق کے مشتملات

مفسرین کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس سورت کے مشتملات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سورت پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

شروع میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے اور تلاوت کرنے کا حکم دیتی ہے، اور پھر انسان کی تخلیق کے بعد خون کے ایک حقیر لوتھڑے کے بارے میں بات کرتی ہے، اور انسان کی تکمیل کے بعد اگلے مرحلے میں وہ خدا کے فضل و رحمت کی روشنی میں علم، دانش اور قلم سے اس کی واقفیت کے بارے میں بحث کرتی ہے، اگلے مرحلے میں، وہ ناشکرے انسان جو خدا کی تمام نعمتوں اور دی ہوئی عزت کے باوجود سرکشی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے کے بارے میں بات کرتی ہے۔

آخر میں ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرتی ہے جو لوگوں کی ہدایت اور نیک کاموں میں رکاوٹ بنتے ہیں، سجدے کے حکم اور بارگاہ الہی میں تقرب حاصل کرنے کے حکم کے ساتھ سورت کا اختتام ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر سورہ علق کے موضوعات کا پورا خلاصہ درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے

1- وحی کے نزول کا آغاز بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم (مہر) پر۔

2- وحی کے نزول کا آغاز بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم (مہر) پر ۔

3- بدبخت ابوجہل کا قصہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کونماز پڑھنے سے منع کرنا۔

4- سورہ علق کانبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے بیان کے ساتھ آغاز ہوتا ہے، سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ یہ قرآن یعنی: " ابدی معجزہ " ان پر نازل کیا ہے، جب کہ وہ " غار حرا " میں اپنے رب کی عبادت میں مشغول تھے " اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۳ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ " اس کے بعد وہ اس دنیا میں انسان کی سرکشی اور طغیان پر بحث کرتی ہوئی کہتی ہے کہ جب بھی انسان کے پاس طاقت اور دولت ہوتی ہے تو وہ خدا کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے، اور اپنے پاس موجود نعمتوں اور دولت کی وجہ سے وہ سرکشی میں پڑ جاتا ہے، حالانکہ برعکس ان نعمتوں کے جو خدا نے اپنے فضل اور مہربانی سے اسے عطاء کی ہیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے، نہ کہ اس کی نعمتوں کا انکار کرے، اسی طرح یہ سورت آخرت کے انعامات کے حصول کے لیے اللہ کی طرف لوٹنے کی یاد دہانی کرواتا ہے: " كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ ۝۶ اِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۷ "۔

اس کے بعد یہ سورت اس امت کے فرعون ابوجہل کا واقعہ زیر بحث لاتی ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرایا کرتا تھا، اور بتوں کی مدد و نصرت کی خاطر پیغمبر کو نماز قائم کرنے سے روکتا تھا، " اَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى ۝۹ عَبْدًا اِذَا صَلَّى ۝۱۰ " سورہ کے آخر اور اختتام پر اس بدبخت کافر کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اس نے اپنی گمراہی اور سرکشی جاری رکھی تو اسے سخت سزا دی جائے گی، اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہدایت کی کہ اس مجرم اور گنہگار کے ڈرانے اور دھمکانے پر کان نہ دھریں، " كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۝۱۰ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۱ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۲ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝۱۳ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۴ كَلَّا ۝۱۵ لَا تَطِعُهُ وَاَسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۶ " جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ سورہ مبارکہ قرآن پڑھنے اور سیکھنے کی دعوت سے شروع ہوتی ہے، دعا اور عبادت کی وصیت و سفارش پر ختم ہوتی ہے، تاکہ علم کو عمل کے ساتھ ملایا جائے، ابتداء

اور انتہاء متواتر، منظم اور ایک جیسے رہیں۔

تاریخ اسلام میں وحی کا آغاز

عالم اسلام کے اکثر مفسرین اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ: سورہ علق کی ابتدائی آیات ہی پہلی نازل ہونے والی وحی ہے: "اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝" (سورہ علق آیات: 1 تا 5)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عبدالرزاق اور معمر بن زہری نے عروہ سے انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: سب سے پہلے چیز جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ نیند میں ایک سچے خواب کی صورت میں تھی، آپ جب بھی رات کو کوئی خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح سچ ثابت ہوتا، اس مرحلے کے بعد آپ نے تنہائی پسند کی، غار حرا میں الگ تھلک اور تنہا رہتے اور کئی راتوں تک عبادت کرتے رہتے، اپنا زاد راہ اور توشہ تیار کر کے اس خلوت میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

اس کے بعد خدیجہ کے پاس آتے اور دوسری راتوں کے لیے دوبارہ اپنا زاد راہ اور توشہ لے کر جاتے، یہاں تک کہ جب وہ غار حرا میں تھے، حق اور سچ ان تک پہنچ گیا، فرشتہ آپ کے پاس آیا اور پڑھنے کو کہا، آپ نے کہا کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: فرشتہ نے مجھے پکڑ کر سینے سے لگایا اور بھینچا، یہاں تک میں تھک گیا، اور بے بس تھا، میرے اندر توانائی نہ رہی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو: میں نے کہا مجھے پڑھنا نہیں آتا، اس نے دوسری بار مجھے پکڑ کر بھینچا، یہاں تک کہ میں تھک گیا، بے بس ہو گیا اور مجھ میں طاقت نہیں رہی، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو: میں نے کہا: مجھے پڑھنا نہیں آتا، پھر اس نے مجھے تیسری بار پکڑ کر دبایا اور جھنجوڑا، یہاں تک کہ میں تھک گیا، بے بس ہو گیا، اور مجھ میں توانائی نہ رہی، پھر کہا: "اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝" (اے محمد! پڑھو جو تم پر نازل ہوا ہے، اس کی شروعات

کرو) پڑھ اپنے پروردگار کا نام لے کر، جس نے (جہاں کو پیدا کیا) انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، (آپ کے خیال

سے ان عظمتوں اور احسانات کے بعد جو آپ دیکھیں گے کہ تلاوت کی تعلیم ان کے سامنے سادہ اور معمولی ہے) وہ جس نے علم سکھایا قلم سے، (انسانوں کو بہت ساری چیزیں سکھائیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کے ساتھ اس حالت میں گھر لوٹے کہ آپ کا جسم کانپ رہا تھا، جب خدیجہ کے پاس پہنچے تو کہا: "زَمَلُونِي زَمَلُونِي" (مجھے ڈھانپو، مجھے ڈھانپو) ان کو ڈھانپا گیا یہاں تک کہ خوف دور ہو گیا، پھر فرمایا: "يا خديجه مالي" اے خدیجہ! مجھے کیا ہوا ہے، خدیجہ کو آپ نے اس واقعہ سے آگاہ کیا، فرمایا: "قَدْ خَشِيتُ عَلَىٰ نَفْسِي" میں درحقیقت اپنے آپ پر ڈر گئی تھی۔

خدیجہ نے کہا: کبھی نہیں، کبھی نہیں! خوشخبری ہو آپ کو، اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ذلیل نہیں کرے گا، کیونکہ آپ رشتہ داری کا خیال رکھتے ہیں، اور صلہ رحمی بھی بجالاتے ہیں، آپ سچے ہیں اور سچ بولتے ہیں، آپ درد مندوں کی داد رسی کرتے ہیں، اور محتاجوں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی آفات اور حوادث کے موقع پر آپ دوسروں کے مددگار بن جاتے ہیں۔

پھر خدیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزی بن قصی کے پاس لے گئیں۔

ورقہ خدیجہ کے چچا کا بیٹا تھا، زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئی تھا، انجیل کی کتابوں کو عبرانی زبان سے عربی میں منتقل کرتا تھا، بوڑھا اور اندھا ہو گئی تھا، خدیجہ نے اس سے کہا: اے چچا کے بیٹے، اپنے بھائی کے بیٹے کی باتیں سنو، ورقہ نے کہا: اے چچا زاد بھائی تم کیا دیکھتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اسے بیان کیا، ورقہ نے کہا: یہ وہی راز دار تھے جسے جبرئیل کہتے ہیں، جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتے تھے، کاش میں اس وقت جواں ہوتا، کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَوْخَرَجِي هُمْ؟" (کیا وہ مجھے نکالیں گے؟) ورقہ نے کہا: ہاں! کوئی آدمی کبھی ایسی چیز نہیں لایا جو تم اپنے ساتھ لائے ہو، سوائے اس کے کہ اس سے دشمنی ہو کی گئی ہے، اگر میں زندہ رہا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا، لیکن کچھ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ورقہ وفات پا گئے.... الخ یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں زہری سے منقول ہے۔

آیت: "اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ..." در اصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا آغاز تھا، علامہ مبارکپوری کتاب "الرحیق المختوم" میں لکھتے ہیں کہ: مختلف قرائن، شواہد اور دلائل کو جانچ کر ہم 21 رمضان المبارک بروز پیر کی شام بہ مطابق سنہ 10 عیسوی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یوم ولادت کا متعین کر سکتے ہیں، کہ اس وقت ٹھیک چالیس قمری سال، چھ ماہ اور بارہ دن آپ کی باعزت زندگی گذر چکی تھی، جو کہ 39 شمسی سال اور 2 ماہ اور بیس دن کے برابر ہے۔

اسی طرح وہ آگے لکھتے ہیں: سیرت نگاروں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف نبوت اور وحی بھیجنے کے پہلے مہینے کے تعین کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے، بہت سے سیرت نگاروں کی رائی ہے کہ یہ ربیع الاول کا مہینہ تھا، ان میں سے ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔

بعض نے یہ بھی کھا ہے: یہ رجب کا مہینہ تھا، ہم نے ترجیح دی ہے کہ یہ رمضان کا مہینہ تھا، اور یہ اس آیت شریفہ کی وجہ سے ہے: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" اور دوسری آیت مبارکہ فرماتی ہے: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" کہ شب قدر رمضان کے مہینے میں ہی ہے، اور شب قدر وہی رات ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورہ دخان آیت: 3 میں فرماتا ہے، "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ" (سورہ الدخان: 3)۔

نیز اس دلیل کی بنیاد پر کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں رمضان میں قیام فرمایا، اور جبرئیل علیہ السلام کے نزول کا واقعہ بھی اسی مہینے میں پیش آیا، جیسا کہ سب جانتے ہیں، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رمضان کے مہینے میں وحی کانزول ہوا ہے، وہ بھی اس دن کے صحیح تعین کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، اس سلسلے میں مختلف روایات موجود ہیں بعض نے ساتواں دن کھا، بعض سترھویں اور بعض نے اٹھارواں کھا ہے۔

ابن اسحاق اور بعض دوسرے سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ یہ دن 17 رمضان کا دن تھا، تاہم، ہم نے ترجیح دی ہے کہ یہ 21 واں دن تھا، اس دلیل کے بنیاد پر کہ تمام سیرت نگار یا ان میں سے اکثر اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر کے دن مبعوث ہوئے، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "فیہ ولدت و فیہ انزل علی" اور دوسری

روایت میں ہے: "ذاک یوم ولدت فیہ ویوم بعثت اوانزل علی فیہ (صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 368؛ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 297، 299؛ بیہقی، جلد 4، صفحہ 286، 300: حاکم نیشابوری، جلد 2، صفحہ 62) " وہ رمضان کا مہینہ پیر کا دن ساتویں تاریخ تھی، اسی طرح چودھواں، اکیسواں اور اٹھائیسواں بھی موافق آتا ہے، صحیح احادیث کے مفہوم کے مطابق شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ایک رات ہے۔

اگر اس آیت کریمہ میں جو مذکور ہے کہ: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ۝۳" ابوقتادہ کی روایت کہ: آنحضرت کی بعثت پیر کے دن ہوئی تھی، ایک ساتھ جمع کر لیں، اسی طرح تقابلی کلینڈر کے مطابق جو اس سال رمضان کے دنوں کے ساتھ پیر کی مطابقت کا تعین کرتا ہے، ہمارے لیے یہ بات یقینی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت 21 رمضان المبارک کی رات کو تھی۔

سورت کے عمومی اور بنیادی مقاصد

- 1- انسان کی توجہ اللہ کی طرف ہو، جورب، خالق، عزت والا، سکھانے والا اور جہالت کے پردے ہٹانے والا ہے۔
- 2- انسان کی توجہ اس بات کی طرف ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خون کے لوٹھڑے سے پیدا کیا ہے، اور وہ رب العزت کی ربوبیت کے ماتحت ہے، اور علم و معرفت کا علمبردار ہے، اور جب وہ خود کو حاجتمند نہ سمجھے اور بے پروا پائے تو فساد اور سرکشی کرتا ہے۔
- 3- اس بات پر توجہ دینا کہ ہرچیز اللہ کی طرف لوٹتی ہے، ہرچیز کی ابتدا اور تکمیل اسی کے ہاتھ میں ہے۔
- 4- انسان کو اس کے فرائض سے آگاہ کرنا کہ اس کی تلاوت بلکہ اس کے تمام اعمال بھی خدا کے نام اور ہدایت کی راہ میں ہوں، اور تقویٰ کا حکم دے، حق کے ساتھ جنگ نہ کرے اور اس سے منہ نہ پھیرے اور جان لے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے، (اور وہ خدا کے محضر اور سامنے ہے)۔
- 5- اور اس بات کی طرف توجہ دلانا کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم ظالموں اور فاسقوں کی پیروی نہ کریں، اور خدا کے بندے اسی کے مطیع ہوں، اور اس کے قریب ہونا چاہتے ہوں۔

سورة العلق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۳ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَ طَغْيٰى ۝۶ أَن رَّأَاهُ اسْتَغْنٰى ۝۷ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى ۝۹ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۝۱۰ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى ۝۱۱ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝۱۲ أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلٰى ۝۱۳ أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرٰى ۝۱۴ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۝۱۵ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۶ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۷ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝۱۸ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۹ كَلَّا ۝۲۰ لَا تَطْعُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۲۱

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱	اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲	اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے پیدا کیا
اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۳	پڑھ اور تیرا رب سب سے زیادہ کرم والا ہے
الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴	وہ خدا جس نے قلم کے ساتھ (انسان کو کچھ چیزیں) سکھایا
عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵	اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا
كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَ طَغْيٰى ۝۶	ہرگز نہیں، بیشک انسان یقیناً حد سے نکل جاتا ہے
أَن رَّأَاهُ اسْتَغْنٰى ۝۷	اس لیے کہ وہ خود کو دیکھتا ہے کہ غنی ہو گیا ہے
إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸	یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے
أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى ۝۹	کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے
عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۝۱۰	ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے (ایسا روکنے والا عذاب الہی کا مستحق نہیں ہے؟)
أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى ۝۱۱	کیا تو نے دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہو
أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝۱۲	یا اس نے پرہیزگاری کا حکم دیا ہو

○ اَرءَيْتَ اِنْ كَذَّبَتْ وَتَوَلَّى ۝۱۳	کیا تو نے دیکھا اگر اس (منع کرنے والا) نے جھٹلایا اور منہ موڑا
○ اَلَمْ يَعْلَم بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝۱۴	تو کیا اس نے یہ نہ جانا کہ یقیناً اللہ دیکھ رہا ہے
○ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۝۱۵ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۶	ہرگز نہیں، یقیناً اگر وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور اسے پیشانی کے بالوں سے گھسیٹیں گے
○ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۷	یعنی اس جھوٹی خطا کار پیشانی کے بال
○ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝۱۸	پس وہ اپنے یاروں کی مجلس کو بلالے
○ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۹	ہم عنقریب جہنم کے فرشتوں کو بلالیں گے
○ كَلَّا ۝ لَا تَطْعُهُ وَاَسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۲۰	ہرگز نہیں، اس کا کھنا مت مان اور سجدہ کر اور بہت قریب ہوجا

سورت کی تفسیر

محترم قارئین:

آیات مبارکہ "1 تا 5" تک انسانی تخلیق کی حکمت اور اسے لکھنا پڑھنا سکھانے جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

○ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱	اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا

یہ اللہ تعالیٰ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلا خطاب ہے، اور اس میں پڑھنے لکھنے اور علم حاصل کرنے کی طرف بلانا بھی شامل ہے، کیونکہ یہی اسلام کا نصب العین ہے، اسلام کی امتیازی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی دعوت کا آغاز پڑھنے، علم اور قلم سے کیا، یعنی اے محمد! (اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے پیدا کیا)، (اے محمد! جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے پڑھو) اور اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے (سارے جہاں) کو پیدا کیا ہے، پڑھ کیونکہ پڑھنے سے علم اور معرفت حاصل ہوتی ہے، اور رب کی عبادت کی توفیق نصیب ہوتی، اور اللہ کے نام سے برکتیں اور کامیابیاں ملتی ہیں۔

کتنی خوبصورت بات ہے کہ اسلام کے مقدس دین کے پہلے آسمانی حکم میں ہمیں اس خصوصیت کے ساتھ ثقافتی حکم ملتا ہے، اس لوح اور تختی کا پڑھنا

جو پہلی بار بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھولی گئی، جو کہ باقاعدہ لکھی ہوئی تھی۔

اسی طرح "اقراء" کے حکم میں یہ اہم نکتہ ہے کہ جو کچھ تجھ پر نازل کیا جائے گا وہ پڑھنے کا بھی ہے نہ کہ صرف سمجھنے کا، اس کے نام پر پڑھ جس نے آپ کی مصلحتوں اور منفعاتوں کا خیال رکھا، یہ تعبیر زیادہ الفت او محبت پر دلالت کرتی ہے اور اطاعت کے لیے زیادہ رغبت دیتی ہے۔

اسی طرح "اقراء" کے حکم میں یہ اہم نکتہ بھی ہے کہ جو کچھ آپ پر نازل کیا جائے گا وہ صرف پڑھنے کا نہیں سمجھنے کا بھی ہے۔

جی ہاں! پڑھ اس کے نام پر جس نے تجھے پیدا کیا، تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے آپ کو اس صفت کے ساتھ ہمارے سامنے بیان کرتا ہے تا کہ ہمیں تخلیق کی نعمت یاد دلائی جائے، کیونکہ تخلیق کی نعمت سب سے بڑی اور پہلی نعمت ہے۔

یعنی: اے پیغمبر پڑھ خدا کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا، اگرچہ اس سے پہلے آپ نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ لکھنا، کیونکہ کائنات کو بنانے والی ذات اس پر بھی قادر ہے کہ آپ میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا کر دے۔

"الذی خلق" یہاں صفت تخلیق ذکر کرنے کی حکمت شاید یہ ہو کہ جس طرح مخلوقات پر تخلیق کا انعام اور احسان ہوا ہے، تو گویا اسے سب سے پہلا تحفہ اور انعام یہی دیا گیا ہے، یہاں خلق کا "مفعول" یعنی جو چیز تخلیق کی گئی ہے اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تمام کائنات اس کی تخلیق ہے۔

اللہ تعالیٰ اس مبارک سورت کا آغاز "اقراء" (پڑھنے) سے کرتا ہے، لیکن قرآن کا ذکر نہیں کرتا، علماء کے نزدیک اس آیت میں لفظ قرآن کا ذکر نہ کرنے کی مندرجہ ذیل دو وجوہات ہیں:

1- آیت کا عمومی معنی قرآن ہے، انداز بیان کے اسلوب کے مطابق ہر وہ چیز جو واضح ہو اس کا نام نہیں لیا جاتا۔

2- یہ علم جو "اقراء" سے شروع ہوتا ہے، اس میں ہر دینی علم بہ شمول حدیث، فقہ اور تمام عصری علوم مراد ہیں۔

پڑھو اپنے رب کے نام سے! اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ اپنے پڑھنے کی ابتداء بخشنے والے مہربان رب کے نام سے کرے، اللہ تعالیٰ انسان کے جسم اور روح دونوں کو بڑھا تا ہے، (رَبِّک کا لفظ دو لفظوں "خَلَقَ" اور "اَقْرَأ" کے درمیان آیا ہے) "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" -

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲	اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے پیدا کیا

پھر دوسری مخلوقات کی تخلیق کے زمرے میں خاص طور پر انسان کی تخلیق کا ذکر کیا اور فرمایا کہ: اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے سخت خون سے پیدا کیا، اور اس کے لیے منصوبہ بندی کی اسے چاہیے کہ امر اور نہی کرے، اور یہ امر ونہی انبیاء کے بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے سے ہوتا ہے۔

"خَلَقَ الْاِنْسَانَ" انسان کو آدم کی نسل سے پیدا کیا، انسانی تخلیق کی خصوصیت خدا کی خاصیت ہے، اس نے انسان کو ایک چھوٹے اور بے وقعت نطفے سے پیدا کیا ہے، آدم کو مٹی سے، انسان اور نسل انسان کو جمے ہوئے خون سے۔

"مِنْ عَلَقٍ" جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، یہ اسم جمع ہے، اس کا واحد "علقہ" ہے، جو گاڑھے اور جمے ہوئے خون کا وہ ٹکڑا جو نطفے میں چالیس دن گزارنے اور نشو و نما کے بعد "علقہ" میں بدل جاتا ہے، جو بچہ دانی کے جہلی پر چپک جاتا ہے، اور پھر چالیس دن کا دوسرا مرحلہ اس پر گزرتا ہے جو تیار ہو کر "مضغہ" بن جاتا ہے، رب کی مرضی اس کی تخلیق میں کار فرما ہوتی ہے کہ، یا تو اسے پیدا کرتا ہے، یا گوشت کے ٹکڑے کی صورت میں اسے رحم سے ساقط کر دیتا ہے، (یعنی یا تو بچہ صحیح سلامت دنیا میں آتا ہے یا پھر ساقط ہو جاتا ہے۔

معجزہ خلقت

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسانی جنس کو منفرد شکل و صورت میں خوبصورت اور دوممتاز چیزوں سے پیدا کیا ہے:

الف: بیضہ (انڈا ابتدائی شکل میں) جنسی خلیہ والے انڈے جو ابھی تک استعمال نہیں ہوئے ہوں یعنی مرد کے خلیے سے نہیں ملے۔

ب: اسپرم (نرکا جنسی خلیہ جو خصیہ میں بنتا ہے، اور منی پرفوارے کی طرح گرتا ہے جو کہ انڈے کو مفید بناسکتا ہے (Spermatozoa) منی یعنی مردانہ نطفے سے -

ان لاتعداد جنسی خلیوں میں سے عورت کے رحم میں ایک خلیہ انڈیل دیا جاتا ہے، اور وہ خلیہ ایک نیا وجود بنانے کا اپنا کام پورا کرنا شروع کر دیتا ہے، پھر حمل کی ایک خاص مدت کے بعد انسان کی پیدائش ہوتی ہے "فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" یہ آیت مبارکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہے کہ جس رب نے آپ کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا وہ آپ کو آن پڑھ سے پڑھنے والا بھی بناسکتا ہے یہ اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

تخلیق کا جوہر اہم مگر یہ کہ انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، زیادہ اہمیت کا حامل ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان مخلوقات کے گلشن کا پھول ہے، اگر وہ اپنی قدر جان لے تو وہ فرشتوں سے بھی اوپر ہے، اگر خود کو نہ پہچانے تو جانوروں سے بھی بدتر ہے۔

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۳	پڑھ اور تیرا رب سب سے زیادہ کرم والا ہے

اس کا فضل اور مہربانی بہت زیادہ ہے، اور اس کی عظمت اور مہربانی یہ ہے کہ اس نے انسان کو ہر قسم کا علم سکھایا ہے۔

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴	وہ خدا جس نے قلم کے ساتھ (انسان کو کچھ چیزیں) سکھایا

یہ اس کا فضل و کرم اور بے انتہا عنایت کی علامت ہے کہ انسان کو خون کے لوتھڑے سے انسانی شکل دی، اور اسے پڑھنا، لکھنا سکھایا، انسان کائنات میں وہ واحد ہستی ہے جو پڑھنے کے ذریعہ دوسروں کا پیغام سمجھتا ہے اور اسے لکھ کر محفوظ کرتا ہے، اور آنے والی نسلوں تک منتقل کرتا ہے، اس ترتیب سے وہ اپنے پیشروؤں کے تجربات سے مستفید ہوتا ہے۔

شیخ قرطبی نے کہا ہے کہ: اللہ تعالیٰ ہمیں علم اور تحریر کی فضیلت یاد دلاتا ہے، کیونکہ اس علم کے بڑے فائدے ہیں جو انسان کے احاطہ و اختیار سے باہر ہیں، اگر تحریر نہ ہوتی تو علم مرتب نہ ہوتے، نہ حکمتیں محفوظ ہوتیں، نہ پیشروؤں اور خدا کی نازل کردہ کتابوں کو قلمبند اور محفوظ کیا جاسکتا، اور اگر کتابت اور تحریر نہ ہوتی تو دنیا اور دین کے معاملات منظم نہ ہویاتے (تفسیر قرطبی: 19-120)۔

آیت مبارکہ سے کئی باتیں معلوم کی جاسکتی ہیں "قرآن" ، "علم" اور "قلم" انسان کی دیگر مخلوقات پر برتری کی علامتیں ہیں، اس آیت مبارکہ کے تناظر میں "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" سے ہمیں معلوم ہوا کہ قلم کا استعمال جہالت سے آزادی کا ذریعہ اور اللہ کی مہربانی اور ربوبیت کا مظہر ہے، اور لکھنا ایک مطلوبہ فن ہے، اور اس کی ترغیب اسلام نے دی ہے، اسی طرح "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" کے جملے میں ہم واضح طور سمجھتے ہیں کہ رب عظیم اپنے کام اسباب کے ذریعے انجام دیتا ہے۔

قلم سکھانے کا پہلا اور سب سے اہم ذریعہ ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لما خلق الله الخلق كتب في كتابه فهو عندہ فوق العرش ان رحمتی غلبت غضبی" یعنی: جب اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوق کو پیدا کیا تو اس نے عرش پر اس کے سامنے رکھی ہوئی کتاب میں لکھا: "میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے" ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اول ما خلق الله القلم فقال له اكتب فكتب ما يكون الى يوم القيامة فهو عندہ في الذكر فوق عرشه" یعنی: سب سے پہلے اللہ نے قلم پیدا کیا پھر اسے کہا کہ لکھو چنانچہ قلم نے قیامت تک جو کچھ ہونا تھا، وہ سب لکھ دیا اور یہ تحریر عرش پر خدا کے سامنے موجود ہے، (ماخوذ: از تفسیر ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی تفسیر سورہ تین)۔

قلم کی اقسام

قلم کی اقسام کے متعلق علماء فرماتے ہیں کہ قلم کی تین قسمیں ہیں:

- 1- قلم اول: جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور اسے لکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔
- 2- فرشتوں کے قلم، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں میں دیے ہیں جن سے وہ مقادیر، واقعات اور انسان کے اعمال لکھتے ہیں۔
- 3- لوگوں کے قلم، اللہ تعالیٰ نے یہ لوگوں کے ہاتھوں میں قلم دیے، جن سے وہ اپنی باتیں اور اپنے مقاصد لکھتے ہیں، کتابت، بیان کا حصہ ہے، بیان انسان کی خصوصیات میں سے ہے۔

تفسیر کے امام مجاہد نے ابو عمرو سے نقل کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام کائنات میں اپنی قدرت سے چار چیزیں پیدا فرمائی ہیں، ان کے علاوہ باقی کائنات کے بارے میں فرمایا: "کُنْ" یعنی: وجود میں آجاؤ تو یہ سب چیزیں وجود میں آگئیں، وہ چار چیزیں یہ ہیں: قلم، عرش، جنت عدن، اور آدم علیہ السلام۔

علماء کہتے ہیں کہ علم کتابت اور تحریر سب سے پہلے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائی گئی، اور انہوں نے سب سے پہلے لکھنا شروع کیا۔

(کعب احبار: ابواسحاق کعب بن متی الحمیری، ایک یہودی تھا جس کا تعلق یمن کے ایک قبیلہ ذوالکیلا سے تھا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں تھا، جب وہ مسلمان ہوا تو اس کے پاس یہودی کتابوں میں سے بشمول (عہد عتیق، اور عہد جدید) اور گذشتہ انبیاء کے واقعات کی کافی معلومات تھیں، بہت ساری خبریں اور اقوال جنہیں عام طور پر اسرائیلیات کہتے ہیں اسی سے منقول ہیں -

بعض علماء کہتے ہیں کہ لکھنے کا یہ ہنر سب سے پہلے حضرت ادریس کو سکھایا گیا تھا، دنیا میں سب سے پہلا کاتب بھی وہی ہے (ضحاک)۔

بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ جس نے بھی تحریر شروع کی وہ تعلیم اللہ کی طرف سے ہے -

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝	اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ماں کی کوکھ سے اس حال میں پیدا کیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا، اور اسے سماعت، بصارت اور حواس خمسہ اور علم کے اسباب عطا کیے، پھر انسان کو قرآن اور حکمت کی تعلیم دی، اور قلم کے ذریعہ بہت ساری چیزیں سکھائیں، وہ قلم جس سے علم اور حقوق درج کیے جاتے ہیں، جس خدا نے اپنے بندوں کو ایسی نعمتیں عطا کی ہیں جن کا وہ شکر ادا نہیں کر سکتا، پھر ان کو دولت مند بنا کر اور رزق کی فراوانی کر کے ان پر احسان کیا، لیکن انسان اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے جب خود کو بے نیاز دیکھتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے، اور ہدایت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، اور وہ بھول جاتا ہے کہ اسے اپنے رب کی طرف سے کیا ہوا ہے۔

بلکہ بعض اوقات یہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، کہ وہ ہدایت کو چھوڑ دیتا ہے

اور دوسروں کو بھی اس کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے، اس لیے نماز پڑھنے سے جو کہ بہترین اعمال میں سے ہے روکتا ہے۔

مفسرین نے اس آیت مبارکہ : "عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" کی تفسیر میں (اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا) کہا ہے کہ یہ پہلی قرآنی حقیقت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو پہلے لمحے میں حاصل ہوئی، یہ حقیقت اور سچائی آپ کے ذہن و شعور، آپ کی زبانی، آپ کے کام اور انداز فکر پر زندگی بھر چھائی رہی، اور اسے ایمان کی پہلی سیڑھی سمجھا گیا۔

امام شمس الدین ابو عبد اللہ محمد ابن قیم جوزیہ اپنی کتاب: "زاد البعاد فی ہدی خیر العباد" جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور خدا کے ذکر کا خلاصہ بیان کیا ہے میں کہتے ہیں: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں کامل ترین ہستی ہیں، آپ خدا تعالیٰ کے ذکر اور یاد میں مشغول ہوتے تھے، آپ کی تمام باتیں اللہ کے ذکر، یاد اور اس سے متعلق تھیں، قوم کے لیے اللہ کے احکام، ممانعت اور ضابطے بیان کرتے اور اللہ کے لیے ذکر و اذکار کرتے، اللہ کے اسماء و صفات کے بارے میں بتاتے، اسی طرح احکام و افعال اور وعدہ و وعید کا بیان، اس معبود کی تسبیح اور تقدیس اس کی یاد اور اس کا ذکر تھا، اس کی درخواست، دعاء، تمنا اور خوف خدا کی یاد تھی، آپ کی خاموشی اختیار کرنا اور دل کی یاد بھی خدا کی یاد تھی، ہر وقت ہر حالت میں آپ نے خدا کو یاد کیا، اور خدا کا ذکر کیا، کھڑے ہوتے وقت، پہلو میں بیٹھتے، گرتے، قدم رکھتے، سوار ہوتے، چڑھتے، اترتے، چلے پھرتے اور لیٹتے وقت، آپ کی سانسوں میں خدا کا ذکر جاری رہتا تھا، آپ جب بیدار ہوتے تو کہتے: "الحمد لله الذي أحيانا بعد ما أماتنا وإليه النشور" (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی طرف ہم کو لوٹنا ہے)۔

محترم قارئین:

مبارک آیات "6 تا 19" میں نافرمان، منحرف اور بے پرواہ انسان کی بغاوتوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

ہرگز نہیں، بیشک انسان یقیناً حد سے نکل جاتا ہے

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَإِطْغَىٰ ۖ

یعنی جب انسان ایمان سے خالی ہو تو دولت و ثروت اسے متکبر اور سرکش بنادیتی ہے، اور ظلم، تجاوز، فسق، فجور اور مکرو حیلہ میں حد سے گذر جاتا ہے۔

"کَلَّا" یہ بات قابل ذکر ہے کہ لفظ "کَلَّا" مکی سورتوں میں آیا ہے، یہ مدنی سورتوں میں مذکور نہیں ہے، وہ لفظ جو کسی چیز کے انکار یا رد کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے وہ عربی ادب میں "ردع" (انکار) کے نام سے مشہور ہے، جب کوئی کسی مطلب کا ذکر کرے یا آپ کو کسی سے جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہوتی تو، اس وقت لفظ "کَلَّا" استعمال ہوتا ہے۔

"کَلَّا" متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

مخاطب کی بات غلط ہونے کی صورت میں اسے ڈانٹتے، انکار کرتے اور تنبیہ کرتے وقت کہ جب اس کی بات غلط ہو تو اس کے جواب میں کہیں گے: نہیں، ایسا نہیں ہے۔

جواب لفظ "حقًا" کے معنی: (جی ہاں!) جو کہ قسم کے ساتھ ہو۔

"کَلَّا" استفہاحیہ کے معنی میں ہو، اگر اس سے پہلے کوئی ایسی چیز نہ ہو جو زجر یا نفی کا تقضا کرے۔

اس آیت میں یہ انکار اور نفی کے لیے ہے، "کَلَّا" البتہ یقین سے نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں اس کا معنی حقًا ہے یا: "کَلَّا" استفہاحیہ کے معنی میں ہے۔

"لَیَطْعَن" یہ طغیان کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے حد سے گذرنا، حد کو توڑنا، اور حد پر نہ رہنا، طاغی: یعنی اس نے حدود سے تجاوز کیا۔

وہ سرکش لوگ جو اب تاریک راہوں میں گم ہو چکے ہیں: وہ سمجھتے تھے کہ وہ بندوں کی جان، مال، زندگی، عقیدہ، ایمان اور آزادی پر حاکم ہیں، وہ لوگوں کو غلامی اور قید میں ڈالنے کے لیے ان سے آزادی چھین لیتے تھے، خاص طور پر ان کو اپنی فکری اور نظریاتی قید میں لاتے تھے (یعنی اپنے نظریات کا زبردستی پابند بناتے تھے)۔

آیت "6" کا سبب نزول

ابن منذر نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کا ہے: ابوجہل نے

کہا: کیا محمد تمہاری آنکھوں کے سامنے اپنا سرزمین پر رکھتا ہے (یعنی سجدہ کرتا ہے)؟ انہوں نے کہا: ہاں، اس نے کہا: میں لات اور عزی کی قسم کھاتا ہوں، اگر میں نے اسے ایسا کرتے دیکھتا، تو میں اس کی گردن پر سوار ہو کر اس کے چہرے کو مٹی میں رگڑتا، تو پھر یہ آیت: "كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ" نازل ہوئی۔

امام بخاری کی حدیث نمبر (4958) میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابوجہل نے کہا کہ اگر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ کے قریب نماز پڑھتے دیکھوں تو ان کی گردن پر سوار ہو جاؤں گا، جب یہ خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: اگر اس نے ایسا کرنا چاہا تو (لوفعلہ) لاخذه البلائکہ) تو عذاب کے فرشتے اسے پکڑ لیں گے۔

نسائی رحمہ اللہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ابوجہل نے ایسا کرنا چاہا، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ پلٹ کر اپنے منہ پر ہاتھ پھیر رہا تھا، کسی نے اس سے پوچھا: کیا ہوا ہے؟ کہا: میرے اور محمد کے درمیان آگ کا ایک گڑھا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔

اس لیے کہ وہ خود کو دیکھتا ہے کہ غنی ہو گیا ہے	أَنْ رَّاهُ اسْتَغْنَى ۝

یعنی جب انسان امیر ہو جاتا ہے تو سرمست، باغی اور سرکش ہو جاتا ہے، چونکہ اس نے تقویٰ کھودیا، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ طعن تشنیع کرتا ہے، اور حقوق ادا نہیں کرتا ہے، ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ: یہ بے نیازی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۝ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝" (سورہ فاطر: 15) (اے لوگو! تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ سب سے بے پروا، تمام تعریفوں کے لائق ہے)۔

اب اگر ان دونوں کی جگہ بدل دی جائے اور انسان اللہ کی بنسبت خود کو غریب نہ سمجھے، بلکہ خود کو امیر سمجھے تو اس کی ترقی رک جائے گی، لیکن اگر ہم خود کو اللہ کے علاوہ کسی اور کی نسبت امیر سمجھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو غنی سمجھ کر ہمیں اپنی غربت کا اظہار کرنا چاہیے، اور اس اظہار پر فخر بھی کرنا چاہیے یہ فقیری ہے کہ ہمیں ایک مقام تک پہنچا دیتی ہے، لیکن کسی کے سامنے اپنی بے بسی اور غربت کا اظہار نہ کریں کہ ذلیل ہو جائیں گے، کیونکہ ہم سب انسان برابر ہیں،

کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے، سوائے تقویٰ کے: "لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَبِيٍّ، وَلَا لِعَجَبِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا أَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى" (کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر سرخ کو کالے پر، اور کالے کو سرخ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقویٰ کے) (مسند احمد: 23489) و (السلسلة الصحيحة: 2700) حکم البانی۔

"إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" (بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے معزز وہ ہے جو زیادہ تقوی والا ہو) یہ نہیں فرمایا کہ: "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ غَنِيكُمْ" کہ جس کے پاس مال زیادہ ہو اس کی قدر و منزلت اللہ کے ہاں زیادہ ہے، درحقیقت وجہ عزت مال و دولت نہیں ہے، بلکہ "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ"۔

معزز قارئین:

اگر کسی شخص میں قابلیت نہ ہو لیکن مال اسے غرور میں مبتلا کر دے، جیسا کہ قارون نے کہا: "أَمَّا أُوتِيَتْهُ عَلَى عِلْمٍ عِنْدِي" (قصص: 78) یا طاقت اسے مغرور کر دے، جیسا کہ فرعون نے کہا: "أَلَيْسَ لِي مُلْكٌ مِصْرَ" (زخرف: 51) (کیا میرے پاس مصر کی بادشاہت نہیں ہے)، یا علم اسے مغرور بنادے "آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخْ مِنْهَا" (اعراف: 175) (ہم اسے اپنی آیات دیں (علم دیا) مگر وہ ان میں سے نکل گیا) تو یہ سب کسی کام نہیں آئیں گے۔

لیکن اگر ظرف اور قابلیت ہو، یہاں تک کہ تینوں صفات ایک آدمی میں جمع ہوں جیسے: حضرت یوسف، اور حضرت سلیمان، لیکن وہ پھر بھی مغرور نہیں ہوتا، کیونکہ سب کچھ خدا کی طرف سے سمجھتا ہے اپنی طرف سے نہیں، چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے کہا: "هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي" (نمل: 40) اور حضرت یوسف نے کہا: "رَبِّ قَدْ آتَيْنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ" (سورہ یوسف: 101) تو یہ باتیں اور رویہ قابل تعریف ہے، اور اگر اس کے برعکس کہ انسان اللہ کی طرف نہیں بلکہ اپنی طرف دیکھے، یعنی ان صفات کو اپنی ذاتی خوبی سمجھے تو یہ قابل مذمت ہے، باغی نہ خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے اور نہ وہ خدا کا بندہ ہے، وہ خدا کے احکام نہیں پہچانتا، اور نہ وہ دلائل کو قبول کرتا ہے، نہ وہ ضمیر کی پکار اور نہ مظلوموں کی فریاد سنتا ہے۔

یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے

إِنِّإِلَىٰ رَبِّكَالرُّجْعُۙ۝۱

بیشک اس دنیا میں آنے والے سب انسانوں کی واپسی تیرے رب کی طرف ہے، اور وہ سرکشوں، باغیوں اور نافرمانوں کو ان کے اعمال کی سزا دے گا۔

"رُجْعی" مصدر ہے رجوع کے مادہ سے، یعنی: واپس لوٹنا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت مبارکہ انسان کو سرکشی اور بغاوت کے نتائج سے متنبہ کرتی ہے، اور اسے ڈراتی ہے اور کہتی ہے کہ: اے سرکش انسان! تو کیوں تکبر اور سرکشی کرتا ہے؟ تو بھول گیا ہے کہ واپسی بھی اور موت بھی ہے، تم بھول گئے ہو کہ ایسی صورت حال ہوگی کہ تمہاری کارکردگی اور موقف کے حوالے سے تم سے باز پرس ہوگی، ایسا دن آئے گا کہ سب اللہ کی طرف واپس جائیں گے، پس جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو دیا ہے، ان پر غرور نہ کرو۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ: آیت عام ہے، اور اس میں ہر ظالم، متکبر اور سرکش شامل ہے، مفسرین لکھتے ہیں: ایک طویل مدت جب سورت کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد گزری تو پھر یہ آیات ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئیں، کیونکہ ابوجہل اپنی دولت کی فراوانی کی وجہ سے باغی بن گیا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ دشمنی کرتا تھا، البتہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہے نہ کہ خاص وجہ کا، (صاوی: 336/4، اور قرطبی: 19/123)۔

کیا تونے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰۙ۝۲

کیا تم اس شخص پر تعجب نہیں کرتے ہو جو بندوں کو رب کی اطاعت سے روکتا ہے؟ اور اللہ کے راستے اور خالق کی عبادت کرنے سے مخلوق کو روکتا ہے، نماز سے روکنا رب عظیم کی سب سے بڑی مخالفت اور حق سے لڑنا ہے، ان نیکیوں سے وہ شخص منع کرتا ہے حالانکہ خود بھی ہدایت کے راستے پر نہ ہو، اور دوسروں کو اس کام کی طرف دعوت دیتا ہو جو تقویٰ کے خلاف ہو۔

آیت مبارکہ کے نزول کے اسباب

ابن جریر نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل بن ہشام آیا اور آپ کو نماز پڑھنے سے منع کیا، تو

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ۝ عِبْدًا إِذَا صَلَّى ۝" ترجمہ: کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے، ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے (کیا یہ روکنے والا عذاب الہی کا مستحق نہیں ہے؟)

کیا نماز پڑھنا جرم ہے؟ کیا نماز ادا کرنا کسی کو ضرر اور نقصان دیتا ہے؟ (بخاری: 4958) اور متن کا لفظ جامع البیان طبری ہجر: 534/24 - (37689) (زادالمسیر ابن جوزی: 1549) -

اس آیت مبارکہ کا اشارہ ابوجہل کی طرف ہے، جو ابوالحکم سے مشہور تھا، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ابوجہل کا لقب دیا تھا، ابوجہل مکہ کے کٹر مشرکین میں سے تھا اور جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس نے کہا کہ میں جاکر (نعوذ باللہ) محمد کی گردن پر پاؤں رکھوں گا جب وہ نماز پڑھیں گے، اور ان کا گلا گھونٹ دوں گا، لیکن جب بھی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانا چاہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے پیچھے ہٹ جاتا اور اپنے ہاتھ سے منہ ڈھانپ لیتا، جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا: میرے اور اس محمد کے درمیان آگ کا گڑھا، اور خوف تھا، اور فرشتوں کے پر بھی حائل تھے، بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ میرے نزدیک آتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے (مسلم: 2797)۔

عِبْدًا إِذَا صَلَّى ۝	ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے (ایسا روکنے والا عذاب الہی کا مستحق نہیں ہے؟)

حقیقت یہ ہے کہ: نماز اللہ تعالیٰ کی بندگی کی علامت ہے، اس بنا پر شیاطین اللہ تعالیٰ کے ان بندوں سے ڈر اور خوف رکھتے ہیں جو نماز ادا کرتے ہیں اور اس پر قائم رہتے ہیں، نہ کہ ایسے انسانوں سے جو بے حس، بے عمل، اور بے نماز ہیں۔

أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ ۝	کیا تو نے دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہو

بتاؤ کیا اگر (یہ باغی ظالم راہ راست پر ہوتا) ہدایت پر ہوتا (تو خدا کے پاس اس کا کیا مقام اور مرتبہ ہوتا)۔

أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ ۝	یا اس نے پرہیزگاری کا حکم دیا ہو

یا یہ دوسروں کو نماز اور دیگر عبادات سے روکنے کے بجائے تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیتا، کیا یہ اس کے لیے بہتر نہیں ہوتا؟

کیا تونے دیکھا اگر اس (منع کرنے والا) نے
جھٹلایا اور منہ موڑا

أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۝۱۳

مجھے بتاؤ کہ اگر وہ قرآن اور ان تمام کتابوں اور احکام و تعلیمات کا انکار کرتا ہے جو انبیاء اپنے ساتھ لائے تھے، ایمان اور تمام اچھے اور پسندیدہ کاموں سے منہ موڑ لے تو وہ کس سزا کا مستحق ہوگا، اور اس کا حال قیامت کو کیسا ہوگا؟

یہ مبارک آیت اس عظیم مفہوم کو بیان کرتی ہے کہ یہ آیات صرف ابوجہل کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گھناؤنے فعل تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان تمام لوگوں کو شامل ہیں جو خدا کی عبادت خود بھی نہیں کرتے، اور اس کی راہ میں رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں کہ کوئی اور اللہ کی عبادت نہ کرے۔

تو کیا اس نے یہ نہ جانا کہ یقیناً اللہ دیکھ
رہا ہے

أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَى ۝۱۴

کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام حالات کو جانتا ہے اور اس کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے؟ یعنی وہ اس کی باتوں کو گنتا اور اس کے کردار کو لکھتا ہے، اس کے احوال سے واقف ہے، اور اپنی طرف اس کی واپسی کو مقرر اور متعین کر چکا ہے؟

اگر وہ عبادت میں رکاوٹ بننے اور حقیقت کے جھٹلانے اور حق سے منہ موڑنے سے باز نہیں آتا، تو ہم اسے اس کی پیشانی کے بالوں سے ضرور پکڑیں گے، اور اس کو اس کی صحیح جگہ تک لے جائیں گے، جیسا کہ ایک ذلیل اور خوار مجرم کو اس کے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے عدالت لے جاتے اور سزا دیتے ہیں۔

ہرگز نہیں، یقیناً اگر وہ باز نہ آیا تو ہم
ضرور اسے پیشانے کے بالوں سے گھسیٹیں
گے

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۝۱۵ لَنَسْفَعًا
بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۶

کبھی بھی نہیں! (جیسا وہ سوچتا ہے ایسا نہیں ہے) حقیقت ایسی نہیں ہے، میں رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر اس نے اللہ سے لڑنا اور اس کے بنی کو اذیت دینا بند نہ کیا تو ہم اس کی پیشانی کو سختی سے پکڑیں گے، اور سختی سے قتل کر دیں اور اس کے بعد ہم اسے جہنم کی آگ میں ذلت کے ساتھ جھونک دیں گے۔

"لَنَسْفَعًا" یہ "سَفَع" کے مادہ سے ہے، یعنی: کسی کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹنا زمین پر یہ اس کی تذلیل کی علامت ہے، شروع میں "لام" اور آخر میں تنوین، یہ تنوین نون خفیفہ کا قائم مقام ہے، اور جمع کا صیغہ بھی ہے، اس لیے اس میں تین تاکید ہیں۔

"لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ" اگر وہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے اور ہراساں کرنے سے باز نہیں آتا، اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا بند نہیں کرتا۔

"لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ" ہم پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹیں گے آگ کی طرف۔

"النَّاصِيَةِ" پیشانی کے بال، کیونکہ دماغ میں تمام تحریکی رویے کا مقام، ناصیہ یعنی ماتھے کا اکلا حصہ ہے۔

آیت مبارکہ میں غور کریں، اتمام حجت کا آخری مرحلہ ہے، دلیل کا اختتام کرنا ہے، اگر ابوجہل نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینا بند نہیں کیا، اور نماز پڑھنے سے روکنے پر کاربند رہا، اور نافرمانی، رکاوٹوں اور ترقی کی کمی جن میں وہ غرق ہو گیا ہے ان سے دست بردار نہ ہوا تو اس کی پیشانی کے بالوں سے توہین و تحقیر کے ساتھ پکڑ کر گھسیٹیں گے اور اسے دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے۔

بیسویں (20) صدی کے اواخر میں انسانی دماغ کے مختلف حصوں کے افعال پر ماہرین تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ: مجرم لوگوں کے دماغ میں ایک خاص گوشہ ہوتا ہے جو ان کی رہنمائی جرم کی طرف کرتا ہے، دماغ کا یہ گوشہ سر کے اگلے حصے میں اور ماتھے کے بال کے نیچے واقع ہوتا ہے، جسے ناصیہ کہتے ہیں، اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کیسے معلوم ہوا سوائے اس کے کہ یہ قرآن اور اللہ علیم کے کلام کے معجزات میں سے ایک ہے۔

یعنی اس جھوٹی خطا کار پیشانی کے بال

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۶

یعنی اس کی پیشانی وہ پیشانی ہے جو اپنے قول میں جھوٹی اور عمل میں خطا کار ہے، وہ خبریں پہنچانے میں جھوٹ بولتی ہے اور احکام میں غلطی کرتی ہے؛ لہذا اس کا ارادہ فساد پر مبنی اور عقیدہ منفی ہے۔

"كَاذِبَةٌ" جھوٹ بولنے والی -

"خَاطِئَةٌ" خطا کار۔

"التسهیل" میں ہے کہ: ناصیۃ کو ان اوصاف "کاذبۃ" اور "خاطئة" سے متصف کرنا جائز ہے، کیونکہ جھوٹے اور خطا کار کی بھی ناصیہ ہے۔

"خاطی": وہ ہے جو جان بوجھ کر گناہ کا مرتکب ہو جائے، اور "مخطی" وہ ہے کہ بغیر قصد اور ارادے کے اس سے سرزد ہو جائے (التسهیل: 4/209)۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُۥٓ ۝۱۸	پس وہ اپنے یاروں کی مجلس کو بلالے

اسے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں مدد کے لیے اپنے دوستوں کو بلانے دیں۔
نَادِيٌّ: یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ بیٹھتے ہیں، خاندان اور قبیلے والے ایک ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں۔

"نَادِيَهُ" یار اور ساتھی، وابستگان، رشتہ دار، یعنی وہ جس کی سزا یقینی ہو، اس کو چاہیے کہ مدد کے لیے اپنے یاروں اور رشتہ داروں کو بلائے اس مصیبت کو دفع کرنے میں اس کا ساتھ دیں، یہ اشارہ ابوجہل کی طرف ہے کہ وہ کہتا تھا: کہ میرے بہت سارے ساتھی اور دوست ہیں وہ میری مدد کریں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: انہیں بلالو، وہ بھی آجائیں۔

آیات "17" تا "18" کے نزول کے اسباب

ترمذی وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل آیا اور کہنے لگا: کیا میں نے تمہیں اس سے منع نہیں کیا تھا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دھمکی دی؟ تو ابوجہل نے کہا: تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس ملک میں زیادہ تر افراد جماعتوں قوموں اور قبیلوں کے اجتماعات کا تعلق مجھ سے ہے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی "فَلْيَدْعُ نَادِيَهُۥٓ ۝۱۸ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۹"۔

"كَانَ النَّبِيُّ جُيُوسًا أَبُوجَهْلٍ فَقَالَ: أَلَمْ أُنْهَكَ عَنْ هَذَا؟ أَلَمْ أُنْهَكَ عَنْ هَذَا؟ فَانْصَرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَبَّرَهُ، فَقَالَ أَبُوجَهْلٍ: إِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا يَهَانِدُ أَكْثَرُ مِنِّي، فَأَنْزَلَ

اللّٰهُ: "فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ" ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ (العلق: 17-18) فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: وَاللّٰهُ لَوْ دَعَا نَادِيَهُ لَأَخَذَتْهُ زَبَانِيَةُ اللّٰهِ" (ترمذی: 3349) و (السنن الکبریٰ نسائی: 11620) و (مسند احمد: 2321 و 3044) و (جامع البیان طبری طهجر: (538 / 24) 37685) حکم البانی: صحیح.

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝	ہم عنقریب جہنم کے فرشتوں کو بلالیں گے

ہم جلد ہی جہنم پر مقرر کیے گئے فرشتوں کو بلائیں گے، تاکہ اسے جہنم میں لے جائیں اور اس کی گھرائیوں میں پھینک دیں۔

"زَبَانِيَّةٌ" زَبْنِی کے مادہ سے ہے بمعنی محافظ، نگران اور مأمور، یہاں "زبانیه" سے مراد، سخت گیر، تند مزاج، تندخو فرشتے ہیں جو کہ جہنم کے نگران ہیں، اگر وہ ابوجہل اپنے قبیلہ اور یاروں کا نگران ہے، اور وہ اپنے قبیلہ اور یاروں کو مدد کے لیے بلائے گا، تو ہم بھی ان تندخو، سخت مزاج اور مضبوط شکنجے والے فرشتوں کو بلائیں گے کہ وہ انہیں پکڑ کر جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیں۔

"الزَّبَانِيَّةُ" یا جہنم کے نگران کی صفات

- 1 - وہ کسی پر ترس نہیں کھاتے (غلاظ)۔
- 2 - درشت خو، سنگدل (شِدَادٌ)۔
- 3 - اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔
- 4 - وہ بہت بڑے، مضبوط اور طاقتور ہیں۔
- 5 - وہ خدا کا حکم بجالاتے ہیں۔

اس خوفناک انجام کے تصور پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ سورت فرمانبردار مؤمن کی ہدایت پر ختم ہوتی ہے کہ وہ اپنے کام پر کار بند رہیں، اور اپنے ایمان اور طاعت پر ثابت قدم رہیں۔

آخر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کی عظیم طاقت تمام سازشوں پر غالب رہتی ہے، دوسروں کی ممانعت اور رکاوٹوں کے مقابلے میں ہماری ذمہ داری یہ ہونا چاہیے کہ ہم عبادات کی ادائیگی پر

مداومت کریں۔

ابوجہل کون ہے

قریش حجاز کے مشہور اور اہم عرب قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا، مشہور اور معتبر مؤرخین نے، اسلام کے ظہور کے زمانے میں قریش کے "25" درج ذیل قبائل متعارف کرائے ہیں: 1- بنی ہاشم، 2- بنی مطلب، 3- بنی حارث، 4- بنی امیہ، 5- بنی نوفل، 6- بنی حارث بن فہر، 7- بنی اسد، 8- بنی عبدالدار، 9- بنی زہرہ، 10- بنی تیم بن مرہ، 11- بنی مخزوم، 12- بنی یقطہ، 13- بنی مرہ، 14- بنی عدی بن کعب، 15- بنی سہم، 16- بنی جُمح، 17- بنی مالک، 18- بنی معیط، 19- بنی نزار، 20- بنی سامہ، 21- بنی ادرم، 22- بنی محارب، 23- بنی حارث بن عبداللہ، 24- بنی خزیمہ، 25- بنی بنانہ (مسعودی، مروج الذهب، جلد 1، صفحہ 277، بطون قریش)۔

ابوالحکم عمرو بن ہشام بن مغیرہ مخزومی، جو "ابوجہل" کے نام سے جانا جاتا ہے، قریش کے رئیسوں میں سے ایک اور مکہ کے مشہور مشرکین میں سے تھا، ولید بن مغیرہ کا بھتیجا تھا، مکہ کے مشہور تاجروں اور مالداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ: ابوجہل قبیلہ قریش سے ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچاؤں میں شمار نہیں ہوتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا والد عبد اللہ بن عبد المطلب بنی ہاشم ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بنی ہاشم کے خاندان سے تھا اور ابوجہل کا تعلق بنی مخزوم خاندان سے تھا، چنانچہ ان کا سلسلہ نسب مختلف ہے، (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ترجمہ جلد: 7 صفحہ 413)۔

ابوجہل کی سب سے زیادہ دشمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی، اور خاص طور پر ان لوگوں سے بھی جو نئے اسلام لائے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں اور دین اسلام کے ساتھ اس کی ضد اور دشمنی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اسے "ابوجہل" کہا جانے لگا، یہ ابوجہل تھا جس نے "سمیہ" عمار بن یاسر کی والدہ کو شہید کیا، اور پھر کچھ عرصہ بعد بالآخر وہ خود بھی جنگ "بدر" میں مارا گیا، اور تاریخ اسلام میں اس کا بدترین نام باقی ہے۔

ہرگز نہیں، اس کا کھنا مت مان اور سجدہ کر اور بہت قریب ہو جا

كَلَّا ۚ لَا تَطِيعُہُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۰

(ہرگز نہیں) اے محمد! حقیقت ایسی نہیں ہے جیسا کہ یہ کافر تصور کرتا ہے،

بلکہ آپ کی حفاظت اور مدد کی جاتی ہے؛ لہذا نماز چھوڑنے میں اس کی پیروی نہ کرو، بلکہ سجدہ ریز ہو کر اپنے رب کا قرب حاصل کرو، تاکہ تم رب تعالیٰ کی قربت اور دوستی حاصل کرسکو، جی ہاں! بندے کی رب کے قریب ترین حالت اس وقت ہوتی ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ:

"بندے کی اپنے رب کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب حالت وہ ہے جس میں اس کی پیشانی اللہ تعالیٰ کے لیے زمین پر سجدہ ریز ہو" (رواہ مسلم)۔

زمین پر سجدہ، رب العزت کے حضور بندگی اور عبودیت کی علامت ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے ذرائع میں وہ تمام کام شامل ہیں جو قرب کی نیت سے کیے جاتے ہیں، البتہ سجدہ قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیکن رکوع، اس میں اپنے پروردگار کی تعظیم کرو اس کے لیے جھک جاؤ، لیکن سجدہ، اس میں دعا کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ سجدہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس میں آپ کی دعائیں قبول ہوں۔

اسلام میں قلم کی اہمیت

قلم بزرگوں کا ترجمان تھا، قلم تیز (تلوار) سے بہتر تھا، اپنے جذبات اور باطنی احساسات اور تقاضوں اور احکامات کے اظہار کے لیے اور اپنی فکری ذخیرے کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے اور اپنے خیالات و نظریات کے اظہار کے لیے نسل آدم کو وسائل اور آلات کی ضرورت ہوتی ہے، جن میں سب سے اہم زبان اور قلم ہے، اگرچہ دوسرے طریقوں سے ایک دوسرے تک اپنا مطلب، مقصد اور پیغام کو پہنچانا ممکن ہے، جیسے اشاروں سے اور جانوروں سے ملتی جلتی آوازیں نکال کر، کہ ہم سے پہلے انسانوں نے ان طریقوں سے ہی اپنے خیالات کا تبادلہ کیا ہے، اور ایک دوسرے تک پیغام پہنچایا ہے، اسی طرح ہنسی اور رونابھی جس کا اظہار بچے اپنے والدین سے خوشی کے موقع پر ہنسی کے ذریعے، جب زبان سے کہنے کے قابل نہیں ہوتے، اور درد، غم، بھوک اور پیاس کا رونے کی صورت میں اپنے والدین اور اردگرد کے لوگوں سے اظہار کرتے ہیں۔

اور بعض اوقات خاموشی، بھوک ہڑتال، دھرنا، چہرے کے تاثرات کی تبدیلی وغیرہ انسانی خواہشات اور ضروریات کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہیں، لیکن اکثر اوقات زبان اور قلم کا استعمال ہوتا ہے، اور ان دو آلات میں سے قلم زیادہ اہم ہے، اس کا اثر ابدی اور پائیدار ہے، کسی دانشور نے کہا ہے کہ:

البيان بيانان: بيان اللسان وبيان الاقلام، بيان اللسان قد تدرسه اللاعوام وبيان الاقلام باق على مَرَّ الايام" بيان کی دو قسمیں ہیں: ایک زبان کا بیان، اور دوسرا قلم کا بیان، زبان کا بیان وقت گزرنے کے ساتھ پرانا ہو جاتا ہے، اور مٹ جاتا ہے، لیکن قلم کا بیان ہمیشہ رہتا ہے۔

قرآن کریم میں ہمارے رب نے قلم اور تحریر کی اہمیت کو اس قدر واضح اور اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قلم اور جو کچھ وہ لکھتا ہے اس کی قسم کھائی ہے: "ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ" قلم کی قسم اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں" (سورہ قلم: 1)

پڑھے لکھے لوگوں کے لیے یہ راز نہیں ہے کہ سب سے زیادہ مضبوط تاکید قسم کھانا ہے، اور قسم ایک اہم اور عظیم معاملہ پر کھائی جاتی ہے، قلم کی عظمت اور اہمیت اور جو کچھ وہ لکھتا ہے، یہ ہے کہ: یہ انسانی تہذیبوں کی ابتداء، علوم کے ارتقاء اور تکامل، افکار و نظریات کی بیداری، مذاہب کی تشکیل اور انسانی رہنمائی اور آگہی کا ذریعہ ہے کاغذ کے صفحے پر قلم کی نب کی حرکت بنی نوع انسان کی تقدیر کا تعین کرتی ہے، اس لیے انسانی معاشروں کی فتح و شکست کا دار و مدار قلم کی نوک پر ہے۔

قلم علوم و فنون کا نگہبان، منکرین کے افکار کا نگہبان، علماء کے افکار کا مضبوط ربط، بشر کے ماضی اور مستقبل کے درمیان رابطے کا پُل ہے، یہاں تک کہ آسمان و زمین کا ربط بھی اسی لوح و قلم کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، قلم ان لوگوں کو جوڑتا ہے جو وقت اور جگہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں، قلم بنی نوع انسان کا راز اور علوم کا خزانہ، صدیوں اور زمانوں کے تجربات کا جمع کرنے والا ہے۔

اگر قرآن اس کی قسم کھاتا ہے تو یہ ہمیشہ کسی بہت بڑی اور قیمتی چیز کی قسم کھاتا ہے، اور اس چیز کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک لافانی معجزہ ہے، خدا کی طرف سے لکھا گیا ہے جو قلم کا خالق ہے، قلم اور تحریر ان قوال میں سے ہے جو نہ صرف پرانے نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ہر آنے والے دن ان کے نئے پہلو ظاہر کر کے سامنے لاتے ہیں، قرآن میں قلم کے نام پر خدا کی قسم اس کے تقدس اور شرافت کا سب سے واضح ثبوت ہے، "ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ" قلم کی قسم اور جو کچھ وہ لکھتا ہے" (سورہ قلم: 1)۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلے رابطہ میں وہ قلم سے متعلق بات کرتا ہے: "الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" جس نے قلم سے لکھنا سکھایا (سورہ علق : 4) انسانی زندگی کا ایک ہم ترین واقعہ خط کا وجود میں آنا اور کاغذ یا پتھر پر قلم سے لکھنے کا ظہور تھا، جس نے تاریخی دور کو ماقبل تاریخ سے الگ کر دیا۔

بعض مفسرین نے سورہ "قلم" کی آیت "1" میں قلم کو ایسے قلم سے تعبیر کیا ہے، جس سے خدا کے عظیم فرشتے آسمانی وحی لکھتے ہیں، اور لوگوں کے اعمال نامے تحریر کرتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ آیت ایک وسیع معنی رکھتی ہے، جس میں سے یہ تفسیر اس کی ایک مثال ہے، جس طرح کہ "مَا يَسْطُرُونَ" کا وسیع مفہوم ہے، اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو انسانوں کی رہنمائی اور فکری، اخلاقی اور عملی اقدامات کے ذریعہ لکھا گیا ہے، اور یہ صرف آسمانی وحی یا انسانوں کے اعمال تک محدود نہیں ہے۔

بعض نے قلم سے خدا کی قسم کھانے کو اور جو کچھ وہ لکھتا ہے اسے نعمتوں میں سے ایک نعمت قرار دیا ہے، کیونکہ وہ قلم اور تحریر کی عظمت کو بات کرنے کے برابر سمجھتے ہیں، ان دو نعمتوں کی عظمت ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کلام اور قلم کی طرف کی ہے اور ان نعمتوں سے نوازا، اور ان دو نعمتوں کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی سکھایا۔

قرآن کریم اگر قلم کی قسم کھائے، تو اس کا مطلب ہے کہ قلم انسانوں کا راز دار ہے، اور وہ علم کا خزانہ ہے، صدیوں اور زمانوں کے تجربات کو جمع کرنے والا ہے، اور یہ بہت قیمتی اور قابل احترام معاملہ ہے، قلم اور اس کے ذریعہ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ دراصل انسانی تہذیب کی پیدائش اور علم کی نشو و نما اور افکار کی بیداری کا ذریعہ ہے، کیونکہ قلم اور تحریر خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، جس کی طرف خدا تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی رہنمائی فرمائی ہے، اور اس کے ذریعہ آنکھوں سے پوشیدہ واقعات اور دلوں میں چھپے ہوئے معانی ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں۔

قلم اور تحریر کے ذریعہ انسان اپنے سامنے کوئی بھی واقعہ پیش کر سکتا ہے جو زبان و مکان کے پردے کے پیچھے ہو۔

نتیجہ

قلم تہذیب کا معمار ہے، زبان تاریخ کا علمبردار اور انسانی معاشرے کے درمیان رابطے کا پل، علوم و فنون کا محافظ ہے: "کل علم لیس فی القرطاس ضاع" کوئی بھی علم جو کاغذ پر نہیں ہے ضائع ہو کر مٹ ہو جاتا ہے۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورۃ القدر

سورہ قدر مکہ میں نازل ہوئی اس کی "۵" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ :

اس سورت کا نام شب قدر کے نام پر رکھا گیا جس میں قرآن نازل ہوا، "قدر" کا مطلب عزت اور عظمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس سورت کے شروع میں فرماتے ہیں: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ"۔

اس سورت نے سورہ عبس کے بعد شرف نزول پایا، اس سورت کے مندرجہ ذیل نام ہیں:

1 - القدر -

2 - ليلة القدر -

3 - "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" -

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، مفسر ابوحبان کا "البحر المحیط" میں دعویٰ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک یہ سورہ مدنی سورتوں میں سے ہے، علی بن احمد الواحدی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہونے والی یہ پہلی سورت ہے، اس کے برعکس ماوردی فرماتے ہیں کہ: یہ سورت اکثر علماء کے نزدیک مکی ہے، امام السیوطی نے "الاتقان" میں بھی یہی لکھا ہے، ابن مردویہ نے ابن عباس، ابن زبیر اور عائشہ سے یہی قول نقل کیا ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے، سورہ کے معنی اور مشتملات سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہوگی۔

سورہ قدر کا موضوع

اس مبارک سورہ میں قرآن مجید کے نزول کا آغاز اور دوسرے دنوں اور مہینوں پر شب قدر کی فضیلت اور برتری بیان کی گئی ہے، شب قدر جس میں مقدس الہامات کی خوشبوئیں اور خدا کے جلال کی روشنیاں پھیلی ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو نزول قرآن کی حرمت سے اہل ایمان کو عطا

فرماتا ہے، اور آسمان سے طلوع فجر تک پاک طبیعت فرشتوں کے نزول کا ذکر کرتا ہے، پس کیا ہی عظیم رات ہے شب قدر، جو اللہ کے نزدیک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

اس سورت میں اصل بحث کا موضوع جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ قرآن کریم کی عظمت ہے، قرآن کریم کی شان و عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے نزول کی رات کو "شب قدر" کہا جاتا ہے، قدر کی رات، اہمیت کی رات، ایک ایسی رات جو خود قابل قدر ہے، ہزار راتوں سے بہتر، ایک انسان کی زندگی سے بہتر، انسان کی قسمت نوکا تعین کرنی والی رات، یہ رات قوموں کی تقدیر لکھنے والی رات۔

جس نے اس رات کی قدر کی اور اس رات میں شامل خدا کی اس عظیم نعمت کی وقعت رکھی، اس کی حفاظت کی اور اس کا شکر ادا کیا تو اس نے عزت و عظمت حاصل کی، اور جس نے بھی اس "شب قدر" کی عظمت پر توجہ نہیں دی، اس نے اس نعمت کو نہ پہچانا کہ آج کی رات اس کی زندگی میں آئی ہے، مگر اس کو اہمیت نہیں دی، تو وہ شخص ذلیل اور عذاب الہی کا سامنا کرے گا۔

سورة "القدر" کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة قدر کی آیات مختصر اور موزون ہیں، اس سورت کا ایک (1) رکوع، پانچ (5) آیتیں، اکتیس (31) الفاظ، ایک سو پندرہ (115) حروف اور اونچاس (49) نقطے ہیں۔

(یادر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس کی تفصیل کے لیے سورة "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة القدر اور سورة العلق کے درمیان ربط و مناسبت

سورة العلق میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اپنے رب کے نام سے قرآن پڑھیں اور سیکھیں، اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے نزول کا آغاز بیان کیا ہے، جو کہ شب قدر رمضان کی سب سے قیمتی اور باعزت رات ہے۔

سورة قدر کی فضیلت

سورة قدر کے مشتملات اور فضیلت جیسا کہ اس سورت کے نام سے واضح

ہے پہلے مرحلے میں شب قدر میں قرآن عظیم کا نزول بیان کیا گیا ہے ، اور پھر شب قدر کی اہمیت ، اس کی برکات اور اثرات بیان کی گئی ہیں، شب قدر میں قرآن عظیم کا نزول، شب قدر وہی رات ہے جس میں انسانوں کی سال بھر کی تقدیر اور قسمت کا تعین ہوتا ہے، یہ ایک اور دلیل ہے قرآن کے آسمانی کتاب ہونے پر۔

شب قدر کی فضیلت

"شب قدر" وہ رات ہے جس میں قرآن عظیم پیغمبر اسلام پر نازل ہوا اور اس رات میں عبادت کی فضیلت تمام راتوں سے زیادہ ہے، اس رات میں انسان کی ایک سال کی تقدیر کا تعین ہوتا ہے ، ایسی رات میں سب سے زیادہ نیک اعمال میں سے ایک "احیاء" ہے، جس کا مطلب ہے صبح تک ایک رات جا گنا، لہذا انسان کے لیے مناسب ہے کہ ایسی رات میں اپنے بُرے اعمال کے لیے استغفار کرے، کیونکہ یہ توبہ کی رات ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خصوصی کرم فرماتے ہیں، (لسان العرب)۔

قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو عزت اور عظمت سے نوازا ، اپنا آخری پیغام، بیش قیمت کتاب جو کہ ایک معجزہ ہے، اس امت پر نازل فرمائی تاکہ وہ ان کے لیے دستور حیات بنے ، ان کی مشکلات کا حل بنے، اس امت کی جسمانی اور روحانی امراض کا علاج اور شفا ہو ، اس امت کے لیے عزت و عظمت اور کامیابی اور سربلندی کی علامت بنے، اس کا نزول ان کے لیے وجہ صد افتخار ہو (جتنی یہ کتاب محترم اور با عظمت ہے) اسی طرح جس ہستی پر اتاری گئی وہ بھی زمین و آسمان میں سب سے برگزیدہ اور معزز ترین ہستی ہے ، یعنی جناب محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، یہ کتاب ان کی طرف منسوب کی گئی، اس قرآن کے نزول سے آسمانی رسالت کا سلسلہ تکمیل کو پہنچ گیا، اس کے نور کی کرنیں کائنات میں چار سو پھیل گئیں، پورا جہاں اس نور تاباں سے جگمگا اٹھا، اس ہدایت الہی نے انسانوں کو تھام لیا، ان کو سہارا دیا، اس قرآن کا نزول جس ہستی کے توسط اور ذریعہ سے ہوا ہے، وہ آسمانوں میں امین ، دیانتدار جانی جاتی ہے ، یعنی جبریل علیہ السلام ، انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب اطہر پر بتدریج نازل کیا۔ (شعراء : 193 تا 195)۔ (درآمدی بر علوم قرآن صفحہ : 55 و تفسیر فرقان)۔

قرآن کے بتدریج نزول کا فلسفہ

قرآن عظیم کے تدریجی نزول میں بڑی حکمت اور بہت سے راز ہیں، جن سے اہل علم واقف ہیں، ان میں سے چند راز اور حکمتیں یہ ہیں:

1 - مشرکین کے ظلم و ستم کے مقابلے میں پیغمبرؐ کے دل کو مضبوط رکھنا۔

2 - وحی کے دوران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن سلوک ۔

3 - آسمانی احکام کی قانون سازی میں قدم بقدم آگے بڑھنا۔

4 - مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کے حفظ اور سمجھنے کا آسان ہونا۔

5 - واقعات اور حوادث کے ساتھ رہنا، اپنے وقت میں ان سے محتاط اور باخبر رہنا، اور قرآن کے ذریعہ رب کی بارگاہ سے جڑے رہنا (جو ذات علیم اور حمید کی طرف سے نازل کیا گیا ہے) ، (در آمدی بر علوم قرآن صفحہ : 59 اور تفسیر فرقان)۔

سورہ قدر کا پیغام

1 - شب قدر انسان کے دماغ اور روح کی صحت اور خدا کی بارگاہ میں سربلندی کی رات ہے، "سَلَّمَ ۝ هِيَ حَتَّى مَطَلَعِ الْفَجْرِ"۔

2 - شب قدر رحمت کی رات ہے، اس میں انسان توبہ کے ذریعے خدا کے فضل کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔

3 - اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملات کی تقدیر انسانوں کی خوشی اور بھلائی پر مبنی ہے، الا یہ کہ انسان خود اس کے علاوہ چاہیں "سَلَّمَ ۝ هِيَ حَتَّى مَطَلَعِ الْفَجْرِ"۔

الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح

"اَنْزَلْنَا" ہم نے اتارا، "القدر" طاقت، بڑائی، شرف، وقار، قدر، اندازہ اور مقدار۔

"مَا اَدْرَاكَ" تم کیا جانتے ہو، کس چیز نے تجھے با خبر کیا، تجھے خبر نہیں

ہے (حاقہ : 3، مراسلات: 14، انفطار : 16 اور 17)۔

"أَلْفِ شَهْرٍ" ہزار مہینے "الروح" جبرئیل، یا ہر چیز کی روح، رحمت، "مِنْ كُلِّ
أَمْرٍ" ہر کام کے لیے، "سَلَامٌ" درود، تحفہ، سلامتی، امن وامان، "مطلع"
صبح سویرے، صبح کی سفیدی۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة القدر

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۝ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَامٌ ۝ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝	بلاشبہ ہم نے اسے (قرآن کو) قدر کی رات میں اتارا
وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝	اور تمہیں کیا معلوم شب قدر کیا ہے؟
لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝	قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے
تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۝ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝	اس میں روح (جبرئیل) اور فرشتے ہر کام کے (انتظام) کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں
سَلَامٌ ۝ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝	وہ رات فجر طلوع ہونے تک سلامتی ہے

سورة قدر کی تفسیر

اس سورت کی مبارک آیات میں قرآن کریم کے نزول کا آغاز اور شب قدر کی فضیلت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝	بلاشبہ ہم نے اسے (قرآن کو) قدر کی رات میں اتارا

ہم نے قرآن کو قیمتی اور اہمیت والی رات "لیلۃ القدر" میں نازل کیا ہے، قرآن کریم کے نزول کی وجہ سے یہ رات عبادت، شرافت، بڑائی اور مقام و مرتبہ میں ہزار مہینوں سے بہتر قرار پائی ہے۔

"أَنْزَلْنَاهُ" اکثر مفسرین کے فہم کے مطابق ضمیر "ہ" انزلناہ میں قرآن کی طرف لوٹتی ہے، اور نزول قرآن کے آغاز کا اشارہ ہے، اسم ظاہر کے بجائے ضمیر "ہ" کا ذکر اس کی غیر معمولی شہرت اور مثال کی وجہ سے ہے، اور اس کا مرجع سب کے ذہنوں میں ہے۔

خدا فرشتوں کے ذریعے اور ان کے وساطت سے دنیا کی معاملات کو انجام دیتا ہے، اس لیے قرآن کریم کی اکثر آیات میں افعال اور ضمیر جو خدا سے متعلق ہیں جمع کی صورت میں ذکر کیے گئے ہیں، جیسا کہ سورت کے شروع میں ہے کہ: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ" ہم نے قرآن کو نازل کیا، بہت سے مفسرین کی رائے کے مطابق قرآن پاک دو مرتبہ نازل ہوا، ایک مرتبہ شب قدر میں یکجا ہو کر جس کی طرف یہ سورہ اشارہ کرتی ہے، اور پھر بتدریج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ رسالت کے دوران، اس آسمانی کتاب کے نزول کے بارے میں قرآن کی تفسیریں دو طرح کی ہیں، ان میں سے کچھ لفظ "أَنْزَلْنَا" کے ساتھ جو کہ "انزال" کی اصل سے ہے، جس کا معنی ایک ہی بار نزول کے ہیں، اور کچھ لفظ "نَزَّلْنَا" کے ساتھ جو تنزیل کی اصل سے آیا ہے، جس کا مطلب ہے "بتدریج نزول"، ابن عباس کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے مکمل قرآن "لوح محفوظ" سے لے کر "دار العزة" تک دنیا کے آسمان پر نازل فرمایا، اس کے بعد وقت کے تقاضوں کے مطابق تئیس سال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج نازل ہوتا رہا، (مختصر: 659/3، اور قرطبی: 130/19)۔

تفسیر "جلوہ های از اسرار قرآن" کے مصنف لکھتے ہیں: قرآن کا نزول اور اتارنے کا مطلب اللہ کے پیغام کو اوپر سے نیچے بھیجنا بھی ہے، اور کلام الہی کے اعلیٰ درجے کو انسانی فہم و ادراک کے درجے تک نیچے پہنچا دینا بھی ہے، یعنی ہمارے عظیم رب اپنے اعلیٰ کلام کی سطح اور درجے کو اس حد تک نیچے لایا کہ زمین میں بسنے والے انسانوں کے لیے قابل فہم ہوا۔

"ليلة القدر" عظیم اور قیمتی رات، یہ اپنی اہمیت بڑھانے اور قسمت متعین کرنے کی رات ہے، کیونکہ قرآن کریم اسی میں نازل ہوا، جو کہ ہر لحاظ سے نور، رحمت، خیر، برکت، سلامتی اور سعادت ہے۔

قدر:

1- اس رات میں تقدیریں فرشتوں کے سامنے واضح اور معین ہوجاتی ہیں۔

2- اس رات کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہے، اور یہ ۸۳ سال کی عبادت کے برابر ہے؛ لہذا شب قدر اللہ تعالیٰ کے شکر بجالانے اور شکر گزاری کی رات ہے، کیونکہ بشر کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب سے اہم نعمت قرآن کریم کا نزول ہے، جو کہ اس رات میں ہوا یاد رکھنا چاہے کہ: ظرف اور

مظروف کا مناسب ہونا ضروری ہے، بہترین کتاب بہترین رات میں بہترین انسان پر نازل ہوئی۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ﴿۲۷﴾	اور تمہیں کیا معلوم شب قدر کیا ہے؟

اور آپ کو کیا معلوم ہوا کہ قدر کی رات کیا ہے؟ یعنی: تجھے کیسے پتہ چلے

گا کہ کونسی رات شب قدر ہے، (اور کتنی عظیم ہے) یعنی کس چیز نے تمہیں اس کی قدر و عظمت سے آگاہ کیا: (خازن : 4 / 275)۔

سوال شب قدر کی عظمت اور اہمیت کا ہے، یعنی: آپ نے شب قدر کی فضیلت اور شرف کے حتمی اور آخری درجے کو نہیں سمجھا ہے۔

"مَا أَدْرَاكَ" تم کیا سمجھتے ہو؟ "مَا أَدْرَاكَ" کی تعبیر اور اس موضوع کا مفہوم یہ بات ہم پر واضح کر دیتی ہے کہ اس رات کا صحیح وقت اور عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی معلوم نہیں تھا، دوسروں کو کیا معلوم! یہ آیت مبارکہ اس بابرکت رات کی اہمیت، قدر اور فضیلت کی وجہ بیان کرتی ہے کہ: جو رمضان کے مہینے کے آخری عشرہ میں چھپی ہوئی ہے، اسے یقین قطعی سے کوئی نہیں جانتا، اہل علم کے نزدیک شب قدر کو رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں چھپانے کی وجہ یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اس کو پوشیدہ رکھا ہے، تاکہ بندوں کو زیادہ عبادت کی ترغیب دی جائے اور وہ اپنی عبادات کو ایک رات کے لیے مخصوص نہ کریں، اور ہر ایک کے لیے ایمان کو مضبوط کرنے کا تربیتی نصاب بنے۔

ملاحظہ:

رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتیں (21، 23، 25، 27، 29) وہ بہترین تحفے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا کیے ہیں۔

"لَيْلَةُ الْقَدْرِ": قدر کی رات، لفظ "قدر" قرآن عظیم میں کئی معنی میں استعمال ہوا ہے:

الف: مقام اور مرتبہ، جیسا کہ فرماتا ہے: وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ (انعام : 91) (جیسا چاہیے تھا، انہوں نے خدا کے مقام اور عظمت کو ایسا نہیں پہچانا)۔

ب: تقدیر اور قسمت : جیسا کہ وہ فرماتا ہے: "جئت علی قدر یا موسیٰ" (طہ: 40) (اے موسیٰ! تم (خدا کی) تقدیر کے مطابق (اس مقدس مقام پر) آئے ہو)۔

ج: تنگی اور مشکلات : جیسا کہ فرماتا ہے "وَمَنْ قَدَّرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ" (طلاق: 7) (جس پر رزق روزی تنگ کر دے)۔

ابتدائی دو معنی: لیلۃ القدر کے لیے مناسب ہیں، کیونکہ شب قدر اہمیت والی رات ہے، تقدیر اور قسمت معین کرنے والی رات بھی ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝	قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے

"لیلۃ القدر" کی رات ان راتوں میں سے ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، "الف شہر" ہزار مہینے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ "الف شہر" سے مراد تکثیر ہے نہ کہ تعین اور محدودیت، اور یہ کہ لیلۃ القدر کو ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ان ہزار مہینوں میں ہر سال لیلۃ القدر کی ایک رات ہوتی ہے، تو پھر یہ کیسا حساب ہے؟۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ ہزار مہینے سے مراد وہ مہینے ہیں جن میں یہ رات نہ ہو، اس لیے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے (کذا ذکرہ ابن کثیر عن مجاہد)۔

مختلف ممالک اور شہروں میں مطالع کے فرق کے مطابق شب قدر بھی مختلف ہیں، البتہ اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ جہاں بھی شب قدر آتی ہے، وہاں لیلۃ القدر کی برکتیں حاصل ہوتی ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مفسرین نے کہا ہے کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ شب قدر میں ایک نیکی ان ہزار مہینوں کے عمل سے بہتر ہے، جن مہینوں میں قدر کی رات نہیں، تاریخی روایات میں آتا ہے کہ: (پہلی امتوں میں سے ایک امت میں) ایک شخص نے ہزار مہینہ اسلحہ اٹھائے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان متعجب ہوئے اور حیرت میں پڑ گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے ایک تمنا کی اور فرمایا: اے اللہ! میری امت کو مختصر ترین عمر اور بہت کم اعمال عطا کیے گئے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے قدر کی رات عطا کی اور فرمایا: شب قدر آپ اور آپ کی امت کے لیے ان ہزار مہینوں سے بہتر ہے جس میں اس شخص نے جہاد کیا، (اس قول کو ابن عباس اور مجاہد نے نقل کیا ہے)۔

مجاہد نے کہا: اس سے مراد نیک اعمال ہیں، روزہ رکھنا اور رات کی نماز

ہزار مہینوں سے افضل ہیں (مختصر: 659/3)۔

"اَلْفِ شَهْرٍ" کے بارے میں ایک یاد دہانی : 83 سال اور 4 ماہ

انسان کی مختصر زندگی کی وجہ سے اللہ رب العزت نے اس امت پر یہ احسان کیا ہے کہ اس رات میں عبادت کرنے سے ہمیں ایک لمبی عمر کی عبادت کرنے کا اجر و ثواب ملے گا، اس لیے کہ اتنی سی کم زندگی میں (۶۰ - ۷۰ - ۸۰) کی ہوتی ہے، اس میں ۸۳ سال تک عبادت ممکن نہیں ہے، اس لیے اللہ نے ایک رات کی عبادت ۸۳ سال کے برابر قرار دیدی، اس کے علاوہ لفظ "اَلْف" کو محدود کرنا بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کے معنی ہزار ہیں، بعض علماء اور محدثین نے اس کی مقدار ہزار مہینے مقرر کی ہے کہ ۸۰ سال سے چند سال اوپر ہیں، اور انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ نتائج زیادہ مناسب نہیں ہیں، اور آیات کے سیاق و سباق سے میل نہیں کھاتے، اللہ تعالیٰ لیلۃ القدر کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ" قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس پر بحث ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: "العبادة في ليلة القدر خير من الف شهر" بلکہ فرمایا: "لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ" قدر کی رات خود ہی ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اور یہ ہزار تکثیر کے لیے ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہزار کا مطلب بالکل ایک ہزار ہو، اس طرح کی تشریحات اور تعبیرات قرآن کریم اور عربی زبان میں بہت زیادہ استعمال ہوئی ہیں (کہ خاص عدد ذکر کر کے کثرت مراد ہوتی ہے)۔

مختصر انسانی زندگی کا مفہوم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَعْمَارُ أُمَّتِي مَا بَيْنَ السَّبْعِينَ إِلَى السَّبْعِينَ وَأَقْلَهُمْ مَنْ يَجُوزُ ذَلِكَ" (ترمذی: 355) اور (ابن ماجہ: 4236)۔

"میری امت کی عمریں ۶۰ سے ۷۰ سال کی درمیان ہوں گی، اور ان میں سے کچھ اس سے زیادہ عمر پاتے ہیں" چنانچہ خدا تعالیٰ نے ہمیں لیلۃ القدر جیسے یہ تحفے ہماری مختصر زندگی کے وجہ سے عطا کیے ہیں۔

ملاحظہ:

جس نے شب قدر میں عشاء اور فجر کی نمازیں با جماعت ادا کیں، اس کو بھی اس رات کا ثواب ملے گا، اور جس نے جتنی زیادہ عبادت کی اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا، صحیح مسلم میں حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے عشاء کی نماز با جماعت ادا کی اس نے آدھی رات کے قیام کرنے کا ثواب پایا، اور اگر فجر کی نماز جماعت سے پڑھی تو رات بھر کی شب بیداری کا ثواب پایا۔

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۝ مِنْ كُلِّ أَمْرِ ۝	اس میں روح (جبرئیل) اور فرشتے ہر کام کے (انتظام) کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں

اس رات اپنے رب کے حکم سے فرشتے اور جبرئیل، عبادت گزاروں اور شب بیداری میں عبادت کرنے والوں کے پاس آتے ہیں، ہر اس کام کی انجام دہی کے لیے جس کا حکم اللہ نے دیا ہے۔

"تَنَزَّلُ" یکے بعد دیگرے اترے۔

یہ فعل بہ معنی ماضی بھی ہو سکتا ہے، شیخ محمد عبده عمّ پارہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: الرُّوح: جبرئیل، فرشتوں اور ان کے سردار جبریل کا نزول زمین کی طرف خیر کی دعا اور استغفار طلب کرنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ عبادت کرنے والوں کے واسطے رات کو جاگتے ہیں، اور خود بھی عبادت کرتے ہیں، اور عظیم رب سے رحم اور بخشش مانگتے ہیں۔

"تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ" روح سے مراد، جبرئیل علیہ السلام ہے، حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بھی شب قدر آتی ہے تو جبرئیل فرشتوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں کے لیے چاہے مرد ہو یا عورت جو اللہ کے ذکر یا نماز میں مشغول رہتے ان کے لیے وہ رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

"بِإِذْنِ رَبِّهِمْ" اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس رات کو اترتے ہیں، یعنی وہ اپنی مرضی سے نہیں اترتے، بلکہ عظمت والے رب کے حکم سے آتے ہیں۔

"مِنْ كُلِّ أَمْرِ" ہر اس چیز کے بارے میں جو اس سال تقدیر میں لکھی جائے گی، اور ہر حکم کا مفہوم وہی چیز ہے جسے سورہ دخان آیت "5" میں (کام

اور حکیمانہ امر) کہا گیا ہے، اس رات فرشتے انسانوں کی تقدیر اور قسمت میں اللہ تعالیٰ جو کچھ فرماتا اور حکم دیتا ہے وہ لکھتے ہیں، انسان اس رات میں سچی عبادت اور دعا کر کے اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں، ابن کثیر اپنی تفسیر میں آیت مبارکہ کے جملہ: "مِنْ كُلِّ أَمْرٍ" کے بارے میں لکھتے ہیں حرف "من" یہاں بہ معنی "با" کے استعمال ہوا ہے، اسی طرح نحوی قواعد کے اعتبار سے حروف جارہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں، اور "من" اور "با" دونوں حروف جارہ ہیں، یعنی فرشتے سال میں روٹماہونے والے تمام تقدیر کو اپنے ساتھ لے کر زمین پر اترتے ہیں۔

بعض مفسرین جیسے مجاہد وغیرہ نے "مِنْ كُلِّ أَمْرٍ" کو "سلام" سے متعلق جانا ہے اور اس کا معنی یوں کیا ہے کہ یہ رات ہر قسم کی برائی، آفت اور بدی سے محفوظ ہے (تفسیر ابن کثیر)

وہ رات فجر طلوع ہونے تک سلامتی ہے	سَلَامٌ ۝ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

وہ رات صحت و سلامتی، رحمت اور رات کو جاگ کر گزارنے والے مؤمنوں پر فرشتوں کی طرف سے درود اور سلام کی رات ہے طلوع فجر تک، یہ رات مکمل امن اور سکون کی ہے، شروع سے آخر تک برکت ہے، کوئی بُرائی، فتنہ، ناخوشی اس کے پہلے لمحے سے طلوع صبح تک موجود نہیں ہے۔

"سلام" درود و سلام، یہاں فرشتوں کی دعا مراد ہے جو وہ مؤمنوں کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا مانگتے ہیں۔

سلامت: یعنی اس میں عبادت اور اطاعت، ہر چیز سے مؤمنوں کے لیے سلامتی اور امن و امان میں رہنے کا سبب ہے، یا یہ سالم کے معنی میں ہے، یعنی ایسی رات ہے جو سالم اور سلامتی سے وابستہ ہے۔

شیخ قرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: "سلام" اصل عبارت "ہی سلام" ہے، لفظ "ہی" حذف ہوا ہے، یعنی یہ رات سلام اور سلامتی ہی ہے، سراسر خیر ہے، شرنام کی کوئی چیز اس سے نہیں ہے (قرطبی)۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں: "تقدیری عبارت "سلام ہو" ہے، اور اسے "مِنْ كُلِّ أَمْرٍ" کی صفت بتاتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ یہ فرشتے ہر اس

امر کو لائیں گے جو خیر اور سلامتی والا ہو، (مظہری)۔

مجاہد آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "وہ سلامتی والی رات ہے کہ شیطان اس میں کوئی نقصان یا اذیت نہیں پہنچا سکتا"، شعبی کہتے ہیں کہ: "سَلَمٌ" سے مراد، فرشتوں کا شب قدر میں اہل مساجد پر سلام کرنا ہے، سورج کے غروب سے لے کر صبح طلوع ہونے تک، "هِيَ حَتَّى مَطْلَعِ الْفَجْرِ" یعنی: لیلۃ القدر کی برکتیں رات کے کسی حصے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ رات کے شروع سے طلوع فجر تک جاری رہتی ہیں۔

"مطلع" طلوع، ظاہر ہونا، طلوع کا وقت، جب ظاہر ہو، یہ مصدر میمی یا اسم زمان ہے۔

یاد دہانی

شب قدر مختلف مناطق میں ایک ہی ہے، کیونکہ رات وہی نصف کرہ زمین کا سایہ ہے، جو کہ دوسرے نصف کرہ پر پڑا ہے، اور یہ سایہ زمین کی گردش کے ساتھ حرکت کرتا ہے، اس کی مکمل گردش ایک بار چوبیس گھنٹوں میں پوری ہوتی ہے، یہ دورانیہ دھیرے دھیرے کرۂ ارض کے تمام حصوں پر چھاجاتا ہے، یہ کرۂ ارض کی مکمل رات ہے، اور قدر کی رات وہ ہے کہ جو چند گھنٹے پہلے اور بعد کے فرق سے تمام اہل زمین کی مہمان بنتی ہے۔

اس مہینے میں شیطان کے قید ہونے کے بارے میں علماء کی آراء

عام طور پر اس سلسلے میں علماء کے نظریات کا خلاصہ درج ذیل تین آراء میں نہیں کیا جاسکتا ہے:

1 - رمضان سے پہلے شیطان انسان کو گناہوں میں اس حد تک مبتلا کر دیتا ہے کہ اس کا اثر اس شخص پر رمضان کے آخر تک رہتا ہے، رمضان سے پہلے والے گناہوں کی وجہ سے وہ رمضان میں اطاعت اور عبادت نہیں کر سکتا، اس بنیاد پر شیاطین رمضان میں قید ہوتے ہیں، لیکن انسان رمضان سے پہلے والے گناہوں کے اثرات کی وجہ سے اچھے انداز سے اللہ کی عبادت کرنے سے محروم جاتا ہے۔

2 - شیاطین کا سربراہ جیل میں ہوتا ہے، جبکہ اس کے چیلے آزاد اور متحرک ہوتے ہیں۔

3- لیلۃ القدر میں کوئی بھی شیطان آزاد نہیں ہوتا، ہر ایک قید او رزنجیر میں بند ہوتا ہے، اس رات میں انسان ہر برائی سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ وہ تمام رات سلامتی ہے، غروب آفتاب سے طلوع فجر تک، وہ رات فرشتوں کے نزول کی رات ہے، پس تمام رات محفوظ اور سلامتی ہے ہر بری چیز سے۔

شان نزول

ابن ابی حاتم نے مجاہد کی سند سے (مرسل) روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے جہاد کی حالت کا ذکر فرمایا کہ وہ مسلسل ایک ہزار مہینے تک جہاد میں مشغول رہتے، کہ کبھی اپنی تلواریں زمین پر نہیں رکھتے تھے، مسلماً یہ سن کر حیران رہ گئے، اس وقت یہ سورہ "القدر" نازل ہوئی، اس ایک رات کی عبادت نے اس امت کو بنی اسرائیل کے مجاہدین کی ساری زندگیوں سے اونچا کر دیا، یعنی ایک ہزار مہینے کے برابر۔

مجاہد کی روایت کے مطابق ابن جریر نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عبادت گزار ہوا کرتا تھا کہ رات بھر عبادت میں مشغول رہتا اور صبح کو جہاد کے لیے نکلتا، دن بھر وہ جہاد میں مصروف ہوتا، اور اس طرح اس نے ایک ہزار مہینے اللہ کی عبادت میں گزاری، تو رب تعالیٰ نے سورہ قدر نازل فرمائی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر امت محمدی کے خصوصیات میں سے ہے (مظہری)۔

ابن کثیر اس قول کو امام مالک کا قول سمجھتے ہیں، بعض شوافع نے اسے جمہور کا قول قرار دیا ہے، خطابی اس پر اجماع کا دعویٰ رکھتے ہیں، لیکن بعض محدثین کا اس میں اختلاف نظر ہے (تفصیل کے لیے تفسیر ابن کثیر ملاحظہ کریں)۔

شب قدر اور قرآن کریم کا سبب نزول

الف: قرآن کریم کا نزول: شب قدر کی ایک خصوصیت اور فضیلت یہ ہے کہ قرآن عظیم، انسانی رہنمائی کی کتاب اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابدی معجزہ اسی رات میں نازل ہوا ہے، قرآن مجید کی آیتیں ان کا مطلب اور موضوع کی تائید کرتی ہیں: اول: سورہ "قدر" فرماتا ہے: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" ، **دوم:** سورہ بقرہ: 185 ، "شَهْرُ رَمَضَانَ

الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" ، سوم: آیات 3 اور 4 سورہ دخان) "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ" ۝ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝" کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا، بیشک ہم ڈرانے والے ہیں، اس رات کو ہر کام کا فیصلہ خدا کی حکمت کے مطابق کیا جاتا ہے۔

مبارک کا کیا مطلب ہے؟

لفظ مبارک جو آیت مذکورہ میں آیا ہے، برکت کے مادہ سے لیا گیا ہے، یعنی یہ رات رحمتوں سے بھری ہوئی رات ہے، یہ نہایت مفید اور نفع بخش رات ہے، جس میں نعمتوں اور رزق کی فراوانی ہے، اسی طرح ہمارا عظیم رب فرماتا ہے: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝" ترجمہ: بلاشبہ ہم نے اسے (قرآن کو) قدر کی رات میں اتارا، اور تمہیں کیا معلوم شب قدر کیا ہے؟ قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔"

رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" (سورہ بقرہ: 185) رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔ "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" ۝ "ہم نے اسے شب قدر میں اتارا" اس لیے مطلق حکم یہی ہے کہ شب قدر رمضان کے مہینہ میں ہے، جمہور مفسرین کے قطعی حکم کے مطابق شب قدر رمضان کے مقدس مہینے میں ہے، یہ وہ رات ہے جس میں قرآن عظیم نازل ہوا جو تمام نیکیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہے۔

شب قدر، وہ رات ہے جس میں قرآن کے نزول سے عالم انسانیت کی تقدیر کی تصدیق اور تعین ہوتا ہے، مسلم مفسرین قرآن کے نزول کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں:

1 - مجموعی طور پر ایک ہی بار میں نزول

2 - تدریجی نزول

نزول دفعی، یعنی قرآن عظیم شب قدر کو پوری طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوا، اور نزول تدریجی وہ نزول ہے جو کہ: 23 سال کے عرصے میں قرآن مجید بتدریج حالات اور واقعات کے مطابق پیغمبر اسلام پر نازل ہوا۔

متعدد مفسرین آیت : "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں "

"أَنْزَلْنَاهُ" سے مراد "ہم نے قرآن نازل کیا" نہیں ایسا نہیں کہ شب قدر میں پوری طرح سب کو عرش سے آسمان دنیا پر اتارا گیا، اور یہ بھی نہیں کی قرآن پہلی وحی کی رات مکمل نبی کے دل پر نازل ہوا تھا، یہ دو بے بنیاد دلیلیں اور قرآن کی ان صریح آیات کے مخالف ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے بتدریج نازل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

اس آیت کی تفسیر قرآن میں ہی تلاش کی جانی چاہیے، کوئی بھی رائے قرآن کی تفسیر سے متصادم ہو اسے ایک طرف رکھ دیا جائے اور اس سے تعلق نہ رکھا جائے۔

چنانچہ قرآن کریم اس بارے میں واضح طور پر کہتا ہے: "وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا" (سورة الاسراء: 16) ترجمہ: "اور قرآن عظیم، ہم نے اس کو جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ تو اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور ہم نے اسے، (تھوڑا تھوڑا) نازل کیا"، اسی طرح فرماتا ہے: "وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۖ كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا" (سورة فرقان: 32) "اور کافر کہتے ہیں: کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار گیا؟ اس طرح آہستہ آہستہ اس لیے اتارا گیا کہ اس سے تمہارے دل کو مضبوط کریں، اور اسی واسطے ہم اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔" یہ آیات صاف ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن کا نزول جدا جدا اور وقفے وقفے سے تھا، یہ آیات ان لوگوں کی رائے کو باطل کرتی ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن ایک ہی دفعہ میں نازل ہوا ہے۔

لفظ "أَنْزَلْنَا" قرآن کریم میں بارش کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے بتدریج اور وقفے وقفے سے بارش، نہ کہ آسمان سے تمام پانیوں کا ایک ہی وقت میں، ایک جگہ اور ایک وقت میں گرنا۔

قدر کے معنی

قرآن کی تصریحات سے یہ معاملہ اتنا یقینی ہے کہ شب قدر رمضان کے مقدس مہینے میں ہے، لیکن اس کی تاریخ کے تعین میں اختلاف ہے، اس بارے میں چالیس اقوال مذکور ہیں، لیکن تفسیر "مظہری" میں آیا ہے کہ ان تمام اقوال میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری

عشرے میں ہے، لیکن اس آخری عشرے میں کوئی خاص تاریخ متعین نہیں ہے، البتہ ممکن ہے کہ یہ ان راتوں میں سے کسی ایک رات میں ہو، یہ رات رمضان کے ہرمہینے میں بدلتی رہتی ہے، صحیح احادیث کے مطابق زیادہ امکان ہے کہ طاق راتوں میں ہو (21، 23، 25، 27، 29) اور شب قدر سے متعلق تمام احادیث میں، جن میں طاق راتوں کا ذکر ہے تطبیق دی گئی، اگر شب قدر اس میں ہو، اور ہر رمضان میں بدلتی رہتی ہو تو تمام احادیث اپنی جگہ صحیح اور مستحکم ہیں، ان میں سے کسی میں تاویل کی ضرورت نہیں ہے اس لیے اکثر فقہاء ائمہ نے کھاہے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرے میں بدل جاتی ہے۔

ابو قلابہ، امام مالک، احمد بن حنبل، سفیان ثوری، اسحاق ابن راہویہ، ابو ثور، مزنی، ابن خزیمہ وغیرہ سب نے یہی کھاہے، امام شافعی کی ایک روایت بھی اس قول سے متفق ہے، امام شافعی کی ایک اور روایت میں ہے کہ اس رات کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ طے شدہ ہے (تفسر ابن کثیر)۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تحروا ليلة القدر في العشر الاواخر من رمضان" (شب قدر کو رمضان کے آخری دس راتوں میں تلاش کرو) صحیح مسلم میں حضرت ابن عمرؓ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فاطلبوها في الوتر منها" قدر کی رات کو آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو (تفسیر مظہری)۔

اس بارے میں کہ رمضان کی راتوں میں سے کون سی رات شب قدر ہے، کیا یہ رات واقعی رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہے، اور وہ بھی طاق راتوں میں، یا جفت راتوں میں ہے، اس بحث کے لیے احادیث نبوی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

علماء متاخرین میں سے بعض نے ذکر کیا ہے کہ ليلة القدر رمضان کی "27" ویں رات ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ليلة القدر کے الفاظ سورة القدر میں ہیں، اور ليلة القدر کا لفظ عمومی طور پر "9" حروف پر مشتمل ہے، اس حساب سے $27 = 3 \times 9$ ہو جاتا ہے، لیکن سب سے پہلے تو یہ کھنا چاہے کہ ليلة القدر فضیلت والی رات میں سے ہے، جو سال بھر کی تمام راتوں پر فضیلت رکھتی ہے، اور اسے خاص برتری حاصل ہے، کیونکہ یہ رات قرآن اور اس کے نزول کی رات ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس رات

کی فضیلت کے بارے میں فرماتے ہیں: "مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ" (بخاری: 35) ترجمہ: "جو شخص شب قدر ایمان کے ساتھ محض ثواب آخرت کے لیے ذکر و عبادت میں گزارے، اس کے گزشتہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔"

احادیث مختلف ہونے کی وجہ سے شب قدر کے تعین کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رات رمضان المبارک کے آخرے عشرہ اور طاق راتوں میں ہے۔

عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: "أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يُخْبِرُ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، فَتَلَاخَى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ: "إِنِّي خَرَجْتُ لِأُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، وَإِنَّهُ تَلَاخَى فَلَانٌ وَفُلَانٌ، فَرُفِعَتْ، وَعَسَى أَنْ يَكُونَ خَيْرًا لَكُمْ، التَّيْسُوهَا فِي السَّبْعِ وَالسَّبْعِ وَالْخَمْسِ" (بخاری: 49)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حجرے سے نکلے، لوگوں کو شب قدر بتانا چاہتے تھے (کہ وہ کونسی رات ہے) اتنے میں دو مسلمان آپس میں لڑپڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو اس لیے باہر نکلا تھا کہ تم کو شب قدر بتلاؤں اور فلاں فلاں آدمی لڑپڑے تو وہ میرے دل سے اٹھالی گئی اور شاید اسی میں کچھ تمہاری بہتری ہو (تو اب ایسا کرو کہ) شب قدر کو رمضان کی ستائیسویں، انتیسویں و پچیسویں رات میں ڈھونڈا کرو، (البتہ یہاں مراد رمضان کا آخری عشرہ ہے)۔

عبد اللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ: "أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرُوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَّأَتْ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيًا فَلْيَتَحَرَّهَا فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ". (بخاری: 2015) ترجمہ: میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب کے خواب آخری سات راتوں پر متفق ہو گئے ہیں، اس لیے جو اس کو تلاش کرنا چاہے وہ آخری سات راتوں میں تلاش کرے"

ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں: "اعْتَكَفْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَشْرَ الْأَوْسَطَ مِنْ رَمَضَانَ فَخَرَجَ صَبِيحَةَ عَشْرِينَ فَنَحْنُ نَقُطِّبُنَا وَقَالَ: "إِنِّي أَرَيْتُ لَيْلَةَ الْقَدْرِ ثُمَّ أُنْسِيْتُهَا أَوْ نَسِيْتُهَا فَالْتَمِسُوهَا

فِي الْعَشْرِ الْآخِرِ فِي الْوُثْرِ... (بخاري: 2016) " ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے دوسرے عشرہ میں اعتکاف میں بیٹھے، پھر بیس تاریخ کی صبح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف سے نکلے اور ہمیں خطبہ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لیلة القدر دکھائی گئی، لیکن پھر بھلا دی گئی، اس لیے تم اسے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو..."۔

عبد اللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ: "أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الْتِهَسُوهَا فِي الْعَشْرِ الْآخِرِ مِنْ رَمَضَانَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي تَاسِعَةٍ تَبْقَى فِي سَابِعَةٍ تَبْقَى فِي خَامِسَةٍ تَبْقَى»." (بخاري 2021) " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو، جب نو راتیں باقی رہ جائیں، یا سات راتیں باقی رہ جائیں، یا پانچ راتیں باقی رہ جائیں..."۔

عبد اللہ بن عباسؓ دوسری روایت میں بیان کرتے ہیں: " قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «هِيَ فِي الْعَشْرِ الْآخِرِ هِيَ فِي تِسْعٍ يَمْضِينَ أَوْ فِي سَبْعٍ يَبْقَيْنَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ»." (بخاري: 2022) " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شب قدر رمضان کے (آخری) عشرہ میں پڑتی ہے، جب نو راتیں گزر جائیں یا سات باقی رہ جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد شب قدر سے تھی..."۔

شب قدر کے تعیین میں مروی احادیث کے مطابق یہ مختلف ہیں، اور شاید اس رات کو نہ جاننے کی حکمت یہ ہے کہ مؤمنین اس رات میں عبادت کا اجر و ثواب حاصل کرنے کی حرص کریں اور اس ثواب کو حاصل کرنے کے لیے آخری عشرہ میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں، لیکن اکثر علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ شب قدر ہر سال رمضان المبارک کی ستائیسویں میں ہے - واللہ اعلم۔

شب قدر کو پانے کی کوشش اور جستجو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے: "من قام ليلة القدر ايمانًا واحتسابًا غفر له ما تقدم من ذنبه" (جو کوئی شب قدر میں ایمان کے ساتھ اور حصول ثواب کی نیت سے عبادت میں کھڑا ہو اس کے تمام اگلے گناہ بخش دیے جائیں گے)۔

اہل سیر لکھتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود شب قدر کو تلاش کرنے کی کوششیں کرتے تھے، اور صحابہ کرام کو بھی تلاش کرنے کی

تشویق اور ترغیب دیتے تھے، منقول احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شب قدر تک پہنچنے کے لیے اس قدر نماز پڑھتے، دعا اور تلاوت کرتے کہ سال کے دوسرے دنوں میں ایسی کوشش نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے گھروالوں کو بیدار کرتے کہ وہ بھی شب قدر پالیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كَانَ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ الْأَوَّلُ وَأَخْرَأَ حَيَا اللَّيْلِ وَأَيَّقُظُ أَهْلَهُ وَشَدَّ الْمِئْزَرَ" (بخاری: 2024). رمضان کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر کو مضبوطی سے باندھ لیتے، (اپنی ازواج سے دور رہتے) اور اپنی راتوں کو عبادت کے ساتھ زندہ رکھتے اور اپنے اہل و عیال کو بھی جگاتے تھے۔

مسند میں عبادہ بن صامت سے مرفوع روایت ہے کہ: جس نے شب قدر کو حاصل کرنے کے لیے شب بیداری کی، اور اسے پائے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے پچھلے اور آئندہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

بعض صحابہ و تابعین کے بارے میں بھی آیا ہے، کہ آخری عشرے میں شب قدر تک پہنچنے کی امید میں غسل کرتے اور خوشبو لگا کر بہترین حالت میں شب قدر کو پالیں، اس لیے مسلمان روزہ داروں کے لیے لازم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سیرت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس مقدس رات کو حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں صرف کر دیں، بالخصوص رمضان کے آخری عشرے میں، یقیناً یہ رات رمضان المبارک کے آخری عشرے میں وہ بھی طاق راتوں میں ہے، اکثر و بیشتر امید یہی ہے کہ یہ ستائیسویں کی رات ہوگی۔

اس کی دلیل مسلم کی حدیث ہے جو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ وہ کونسی رات ہے، اور یہ وہ رات ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس رات کو شب بیداری کرنے کا حکم فرمایا، وہ رات ستائیسویں کی ہے"، اور ابی اس کی قسم کھاتے تھے اور کہتے تھے ان نشانیوں کے ساتھ جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائے ہیں کہ اس دن صبح سورج طلوع ہوگا، جس میں شعاعیں نہیں ہوگی۔

حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے خدا کے رسول! اگر مجھے شب قدر مل

جائے تو میں کیا کہوں ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو : " اللہم اِنک عفو کریم تحب العفو فاعف عنی " (رواہ احمد و ترمذی و صححہ الألبانی) ترجمہ: اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے ، معافی کو پسند کرتا ہے مجھے معاف کر دے ۔

ای خواجہ چہ جوی از شب قدر نشانی

هرشب، شب قدر است اگر قدرش بدانی
(سعدی شیرازی)

شب قدر کیوں متعین نہیں ہوئی ؟

علماء اور مفسرین لکھتے ہیں کہ ہر قیمتی چیز تک رسائی کی جدوجہد، کوشش اور ایک طرح کی محنت کی ضرورت پڑتی ہے، یہ معروف ہے ، ہر وہ چیز جس کی اہمیت زیادہ ہوگی تو اس کی قیمت بھی زیادہ ہوگی۔

شب قدر کی عبادت کی قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے، واضح رہے کہ اس رات کو دیکھنا اور حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور نہ ہی اتنے آسان طریقے سے پانا ممکن ہے، اگر کسی شخص کے لیے اس آسانی کے ساتھ اس رات تک رسائی ممکن ہو تو یہ تمام انسانوں کو میسر ہوگی، اسے حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد، عبادت اور محنت درکار ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ اس رات کا رمضان المبارک کی طاق راتوں میں پوشیدہ ہونے اور شب قدر کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ بندوں کی عبادت میں وسعت اور اضافہ اور ان کا پروردگار سے زیادہ قربت ہے، رب عظیم سے دعاگو ہیں کہ ہمیں یہ رات عطا فرمائے۔

ہر سال شب قدر کا اعادہ

سب سے پہلے تو یہ کھنا چاہیے کہ شب قدر بنیادی طور پر نزول قرآن کے پہلے سال میں تھی، لیکن اس آیت مبارکہ کا مفہوم : "تَنْزِيلُ الْمَلِكَةِ وَالرُّوحُ" جو کہ فعل مضارع ہے ، اس میں اس مقدس رات کی تکرار اور تسلسل کو ظاہر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شب قدر صرف اس سال کی پہلی رات پر منحصر نہیں تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا، بلکہ یہ مقدس رات ہر سال ماہ رمضان المبارک میں دہرائی جاتی ہے اور (فرشتے، روح) اس میں نازل ہوتے ہیں؛ لہذا ہر قمری سال اور رمضان المبارک کے مہینے میں یہ رات ہوتی ہے،

اس فرق کی ساتھ کہ اب قرآن نازل نہیں ہوتا ہے، بلکہ صرف فرشتے اور روح نازل ہوتی ہے، اور بنی نوع انسان پر رحمت الہی نازل ہوتی ہے، لیکن کیسے؟ یہ واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔

شب قدر کی عبادت ہزار مہینہ سے بہتر ہے

سال کے بعض ایام ایسے بھی ہیں جن کے اللہ کی ہاں قدر و قیمت اور خاص مقام ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم قدر کی رات ہے، ایسی رات جس کی تعریف میں قرآن کریم فرماتا ہے: "لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۖ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝" (قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے)، قرآن مجید سورہ قدر میں کہتا ہے: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۖ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝" ترجمہ: بلاشبہ ہم نے اسے (قرآن کو) قدر کی رات میں اتارا، اور تمہیں کیا معلوم شب قدر کیا ہے؟ قدر کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔"

رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" (سورہ بقرہ: 185) (رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے) اور پھر ہم سورہ قدر میں پڑھتے ہیں: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝" کہ ہم نے اسے شب قدر میں اتارا" قرآن کے مطلق حکم کے مطابق رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں شب قدر ہے، اب بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پچھلے انبیاء کی امتوں کی عمریں طویل ہوتی تھیں، اور شاید ان کی عبادت ہماری عبادت سے زیادہ تھی، مثلاً: نوح علیہ السلام کے پیروکاروں کے عمر ایک ہزار سال سے زیادہ ہوتی تھی، لیکن ہماری عمریں شاید ساٹھ، ستر سال سے اوپر نہ جائیں؛ لہذا ہم کتنی ہی عبادت کریں، ہماری عبادت ان کے درجے کو نہیں پہنچے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہے، رب العزت نے اپنے فضل و کرم کی بنا پر امت مسلمہ کو ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت کے برابر عطا فرمائی، اور خاص خوبصورتی کے ساتھ فرمایا: "لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۖ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝" کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اگر ہم 1000 کو 12 مہینوں سے تقسیم کریں گے تو یہ 83 سال کے برابر ہے، اگر کوئی شخص ساٹھ "60" کی عمر تک قدر کی راتوں میں عبادت کرے، اور ہم "60" کو "83" سے ضرب دیں تو یہ "4980" سال کے برابر ہو جاتا ہے، یہ ہے شب قدر کی فضیلت اور عبادت۔

شب قدر کی فضیلت اور برتری

یہ واضح ہے کہ خدا کی مخلوقات تخلیق کے اعتبار سے آپس میں ایک دوسرے پر فوقیت اور فضیلت رکھتی ہیں، اور یہ فضیلت اور بہتری جیسے مساجد کی جگہوں کی فضیلت غیر مساجد کی جگہوں پر اور مساجد کے ما بین بھی اور خاص اور عام میں جیسے مسجد الحرام کی فضیلت دوسری مساجد پر، اسی طرح وقت اور زمانہ کی فضیلت ایک دوسرے پر جس طرح ماہ رمضان کی فضیلت دوسرے مہینوں پر، یا عرفات کے دن کی فضیلت دوسرے دنوں پر، اسی طرح انسانی تخلیق میں ایک دوسرے پر فضیلت، البتہ تقویٰ کے اعتبار سے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلقت کی فضیلت دوسرے انسانوں کی تخلیق پر؛ چنانچہ اسی طرح شب قدر سال کی تمام راتوں پر خاص فضیلت رکھتی ہے۔

اس رات کی برتری اور فضیلت میں سے ایک فضیلت اس رات میں قرآن کریم کا نزول ہے، "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۚ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۚ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝" اور ایک بار پھر سورہ دخان آیت "3" میں فرماتے ہیں: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ" کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "من قام ليلة القدر إيماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه"، (رواہ الجماعة إلا ابن ماجہ). ترجمہ: (جو کوئی شب قدر میں ایمان کے ساتھ اور حصول ثواب کی نیت سے عبادت میں ہو اس کے تمام اگلے گناہ بخش دیے جائیں گے) اس رات کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں یعنی: (۸۳) سال سے بہتر ہے، اس کے برابر ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے کہ کتنی بہتر ہے، کیا دوبرابر، یا چار برابر، دس برابر یا سو برابر وغیرہ ان سب کا امکان ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی قدر کی رات عبادت کے لیے اٹھے اس کے تمام گناہ معاف کیے جائیں گے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام وہ فرشتے جو سدرۃ المنتھی میں سکونت رکھتے ہیں شب قدر میں وہ سب جبرئیل کے ساتھ دنیا میں اترتے ہیں، کوئی مرد عورت ایسی نہیں ہے جن کو وہ سلام نہ کریں سوائے اس

کے جو شراب پیتا ہو یا سور کا گوشت کھاتا ہو۔

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "جو کوئی بھی شب قدر کے خیر اور برکت سے محروم رہا، تو وہ مکمل محروم رہا" لیکن یہ ہر کسی کو حاصل نہیں ہوگا اور نہ ہی شب قدر کے اجر و ثواب اور برکات کے حصول میں ان کا کوئی دخل ہوگا، اس لیے آپ ان کے بارے میں نہ سوچیں۔

محترم قارئین:

شرعی نصوص اور قرآن کریم کی آیات کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ "شب قدر" رمضان کے مقدس مہینے کی راتوں میں سے ایک ہے، اسی لیے اس آخری عشرہ کو عبادت میں شرعی ہدایات کے مطابق گزارنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ ایک طرف قرآن کہتا ہے: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" قرآن کریم رمضان کے مہینے میں نازل ہوا، اور دوسری طرف سورہ مبارکہ کی پہلی آیت: "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر میں قرآن نازل ہوا، لہذا ان دو آیت شریفہ کے مجموعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شب قدر رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ہے، لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں میں سے کون سی رات ہے۔

اس حوالے سے جو روایات موجود ہیں ان میں شب قدر کو ان راتوں کے درمیان میں سے شمار کیا گیا ہے، پہلی ۱۷ ویں، ۱۹ ویں، ۲۱ ویں، ۲۳ ویں، ۲۷ ویں، ۲۹ ویں، بعض احادیث میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہے، اور یہ اکیسویں یا ۲۳ ویں راتوں میں سے ایک ہے، بعض روایات میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ شب قدر رمضان کے مقدس مہینے کی ۲۳ ویں رات کو ہے، ان میں سے وہ حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ ہے: "كَانَ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ الْأَوَّلُ أَحْيَا اللَّيْلَ وَأَيَّظُ أَهْلَهُ وَشَدَّ الْمِئْزَرَ" (بخاری: 2024)۔ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جاگتے اور اپنے گھروالوں کو جگاتے اور عبادت کے لیے کمر بستہ ہو جاتے۔

امام احمد اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے: "كَانَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَّلِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهَا" رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اتنی زیادہ محنت

کرتے تھے کہ سال کے دیگر دنوں میں اتنی نہیں کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شب قدر کونسی رات ہے تو میں کیا کہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللهم انك عفوت حب العفو فاعف عني" (اے اللہ! تو سب سے زیادہ بخشنے والا ہے، اور بخشش کو پسند کرتا ہے، پس مجھے بخش دے)۔

اس رات کی نمایاں نشانیاں اور علامات

شب قدر کی علامات اور خصوصیات کے بارے میں علمائے کرام نے احادیث نبوی کی بنیاد پر متعدد آراء پیش کی ہیں، جن میں سے چند آراء ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

مفسرین لکھتے ہیں: کہ لیلۃ القدر کی نمایاں نشانیاں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ نسبتاً پرسکون رات ہوتی ہے، اور مؤمن کا دل اس رات میں سکون پاتا ہے اور نیک کام کرنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔

کہتے ہیں: شب قدر کی صبح "سورج" کمزور اور سرخ دکھائی دے گا، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب قدر کے بارے میں فرمایا: میں نے شب قدر کو دیکھا لیکن مجھے بھلا دیا گیا، شب قدر رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں سے ایک رات ہے، اور یہ ایک معتدل رات ہے، نہ گرم، نہ سرد، روشن اور سفید ہے، گویا اس میں چاندپورا چمک رہا ہو، اس رات کو شیطان اس وقت تک نہیں نکلتا جب تک صبح طلوع نہ ہو۔

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو شب قدر کی خبر دینے کے لیے گھر سے نکلے، اس دوران انہیں دو آدمی ملے جو آپس میں لڑ رہے تھے تو آپ یہ خبر بھول گئے، شب قدر کو چھپانے میں حکمت ایسے ہی ہے جیسے موت اور قیامت کے دن کو چھپانے میں ہے، تاکہ جو شخص عبادت کا پابند ہے، وہ اپنی محنت اور جدجہد میں اضافہ کر دے، سستی اور کوتاہی نہ کرے، اور ایک مخصوص رات پر بھروسہ نہ کرے۔

لیکن بہ ہر صورت مسلمانوں کے لیے بہتر یہ ہے کہ رمضان المبارک کی ہر رات کو اس امکان کے ساتھ کہ یہ شب قدر ہے عبادت، تلاوت اور دعائوں

میں گزاریں، اور اپنی دعائیں تین یا چار رات یا پھر طارق راتوں کے ساتھ مختص نہ کریں۔

شب قدر میں قرآنی دعائیں

شب قدر میں پڑھی جانے والی سب سے افضل دعاؤں میں سے وہ دعا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو سکھائی ہے، جیسا کہ ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور حدیث کو بھی صحیح قرار دیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر مجھے شب قدر کا علم ہو جائے تو میں کیا کہوں؟ آپ نے فرمایا: "قُولِي: اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي" (کہو: اے اللہ! تو بخشنے والا ہے، معافی اور بخشش کو پسند کرتا ہے، پس تو مجھے معاف کر دے اور بخش دے) قدر کی راتوں میں ہر قسم کی دعا مانگ سکتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ جو دعائیں قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ دعائیں پڑھی جائیں، جیسے:

"رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۝ رَبَّنَا وَلَا تَحْبِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۝ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۝ وَاعْفُ عَنَّا ۝ وَاعْفِرْ لَنَا ۝ وَأَرْحَمْنَا ۝ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ" ویا "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۝ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ" ویا "قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۝ وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ" ویا "رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا" ویا "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ" ویا "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" ویا "رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ" ۝ یا وہ دعائیں پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں مذکور ہیں جیسے:

"اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهِ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ" ویا "اللَّهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُورِ كُلِّهَا وَاجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ" ویا "اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْهُدَى وَالتُّقَى وَالْعِفَافَ وَالْغَنَى" ویا "اللَّهُمَّ اغْنِنِي بِالْعِلْمِ وَزَيِّنِي بِالْجِلْمِ وَآكِرْمَنِي بِالتَّقْوَى وَجَمِّلْنِي بِالْعَافِيَةِ" ویا "اللَّهُمَّ مُقَلِّبِ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ" ویا "اللَّهُمَّ جَنِّبْنِي مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ وَالْأَهْوَاءِ" ویا "اللَّهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ الْأَشْيَاءِ إِلَيَّ وَاجْعَلْ خَشْيَتَكَ أَخَوْفَ الْأَشْيَاءِ عِنْدِي وَاقْطَعْ عَنِّي حَاجَاتِ الدُّنْيَا بِالشُّوقِ إِلَى لِقَائِكَ وَإِذَا أَقَرَّرْتَ أَعْيُنَ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ

دُنْيَاهُمْ فَأَقْرِءْ عَيْنِي مِنْ عِبَادَتِكَ".

فرشتے شب قدر میں کیوں اور کس کے لیے اترتے ہیں

اس رات کی نمایاں خصوصیات میں سے جبریل اور دیگر فرشتوں کا نزول ہے، اس آیت شریفہ کے مطابق: "تَنْزِيلُ الْمَلَكِ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ" ترجمہ: "اس میں روح (جبرئیل) اور فرشتے ہر کام کے (انتظام) کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں"، اس کے متعلق کہ روح سے کون مراد ہے؟ بعض نے کہا: "جبرئیل امین" ہے کہ جنہیں "روح الامین" بھی کہا گیا ہے، اور بعض نے "روح" کی بہ معنی "وحی" تفسیر کی ہے، سورہ "شوری" کی آیت "52" کے مفہوم کے مطابق: "وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ

أَمْرِنَا ۚ" ترجمہ: "اور اسی طرح (اے محمد) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی"، بعض مفسرین روح کو فرشتوں سے بڑھ کر ایک عظیم مخلوق سمجھتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ: فرشتے کسی خاص شخص پر نہیں اترتے، بلکہ شب قدر میں ملائکہ زمین پر اترتے ہیں تا کہ شب بیداری کرنے والوں پر سلام اور رحمت و مغفرت کی دعائیں بھیجیں، اور دعا مانگنے والوں کی دعاؤں پر آمین کہیں، فرشتوں کا نزول اللہ کی رحمت اور برکت کا نزول ہے، ہمارے عظیم رب فرماتے ہیں: "تَنْزِيلُ الْمَلَكِ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ" ترجمہ: "اس میں روح (جبرئیل) اور فرشتے ہر کام کے (انتظام) کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں۔"

آسمانوں سے زمین کی طرف (ہر کام کے لیے) یعنی: وہ اگلے سال تک ہر اس معاملے اور نظم کے انجام دہی کے لیے اترتے ہیں: جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا "روح": جبرئیل علیہ السلام ہے، اگرچہ لفظ "ملائکہ" میں وہ بھی شامل ہیں، لیکن ان کی شرف و عزت کی وجہ سے انہیں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، پس یہ عطف خاص بر عام میں سے ہے۔

فرشتوں کے نزول کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ زمین پر ہر قسم کی اطاعت دیکھتے ہیں، جو انہوں نے اہل آسمان میں نہیں دیکھی، اس کے علاوہ وہ اہل زمین کے گنہگاروں کی فریاد بھی سنتے ہیں جن کی آہ و پکار اور فریاد خدا تعالیٰ کے نزدیک تسبیح پڑھنے والوں کی تسبیح کے زمزمے سے زیادہ

محبوب ہے، تو اس وقت وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں: کہ آئیے ایک ایسی آواز سنیں جو ہمارے رب کو ہماری تسبیح سے زیادہ محبوب ہے۔

وہ اعمال جو شب قدر میں کرنے چاہیئے

مفسرین، محدثین اور علماء کی اکثریت کی رائے ہے کہ یہ سنت میں سے ہے کہ روزہ دار رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف میں بیٹھیں، نیکی اور ثواب سے لطف اندوز ہو جائیں اور شب قدر حاصل کر سکیں۔

اور مستحب ہے کہ آدمی خود کو عبادات جیسے نماز، تلاوت قرآن، سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہنے اور استغفار کرنے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھنے، دعا کرنے علمی گفتگو کرنے اس جیسے دیگر اعمال خیر میں مشغول رکھے۔

اعتکاف کرنے والے کا فضول باتوں اور افعال میں مصروف رہنا مکروہ ہے، جس طرح اس کے لیے یہ سوچ کر خاموش رہنا مکروہ ہے کہ اس کی خاموشی اسے خدا کے قریب کر دیتی ہے۔

رمضان المبارک میں تمام مقدس کتابوں کا نزول

حضرت ابوذر عفری رضی اللہ عنہ ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم کے صحیفے "3" رمضان کو، تورات "6" رمضان کو، انجیل "13" وین تاریخ کو، اور زبور "18" وین رمضان کو اتاری گئی ہے، اور قرآن کریم "24" رمضان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔

فرشتوں کا نزول خاص لوگوں کے لیے ہے

شب قدر میں فرشتے کسی خاص اور معین شخص کے لیے نہیں اترتے، بلکہ شب قدر میں ملائکہ زمین پر اترتے ہیں، تاکہ شب بیداری کرنے والوں پر سلام بھیجیں اور ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعائیں کریں، اور دعا مانگنے والوں کی دعاؤں پر آمین کہیں۔

فرشتوں کا نزول خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہے، جس طرح کہ قرآن کی تلاوت اور علمی حلقوں کے دوران اترتے ہیں، اور اپنے پر طالب علموں کے لیے پھیلاتے ہیں: "تَنْزِيلُ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحُ فِيْهَا يٰۤاٰدِنُ رَّبِّہُمْ ۝۱۰ مِنْ كُلِّ اٰمْرِ" ترجمہ: "اس میں روح (جبرئیل) اور فرشتے ہر کام کے (انتظام) کے لیے اپنے

پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں"، اور آسمانوں سے زمین کے (ہر کام کے لیے) یعنی: وہ اگلے سال تک ہر اس معاملے اور نظم کے انجام دہی کے لیے اترتے ہیں، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

کون سے انسان فرشتوں سے افضل ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مخلوقات میں سب سے افضل اور سب سے زیادہ عزت والے ہیں، اور آپ کی فضیلت تمام انسانوں، فرشتوں اور جنوں سے زیادہ ہے اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور فرشتوں کے علاوہ لوگوں کے بارے میں بھی بعض اقوال ہیں:

1 - یہ ہے کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے، علماء نے انسانوں کو فرشتوں سے افضل قرار دیا ہے، ان کا استدلال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا چنانچہ انہوں نے کھاکہ فرشتوں پر انسانوں کی فضیلت ہے، فرمایا: "وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْا" (سورہ بقرہ: 34) یعنی: (جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کے لیے سجدہ کرو، سب نے سجدہ کیا)۔

2 - یہ ہے کہ ملائک انسانوں کی بہ نسبت افضل ہیں، علماء کی ایک تعداد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی: اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ، وَاَنَا مَعَهُ اِذَا ذَكَرْنِيْ، فَاِنْ ذَكَرْتَنِيْ فِيْ نَفْسِيْهِ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ، وَاِنْ ذَكَرْتَنِيْ فِيْ مَلَآئِكَةٍ ذَكَرْتُهُ فِيْ مَلَآئِكَةِ خَيْرٍ مِنْهُمْ..." (بخاری: 7405) **ترجمہ:** خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں، اور میں اس کے ساتھ ہوں، جہاں بھی وہ مجھے یاد کرے، اور جب وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں، اور جب وہ مجھے مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہتر (فرشتوں کی) مجلس میں یاد کرتا ہوں..."

اور افضل ترین گروہ کے درمیان ذاکرین کو یاد کرنے کا مطلب ہے فرشتوں کے گروہ میں یاد کرنا، یہ حدیث بتاتی ہے کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں۔

3 - تیسرا نظریہ ہے کہ فرشتے انسانوں سے پہلے پیدا کیے گئے ہیں اور نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور وہ تکبر اور نافرمانی نہیں کرتے، اور

جو حکم ان کو دیا جاتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے، اور وہ شہوت پرست نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز بندے ہیں، اس بنا پر وہ افضل ہیں، لیکن انسان چونکہ خدا کی رضا کے مقام پر ہوتے ہیں اور رب کی طرف سے ان کی عزت ہوتی ہے، اور جنت میں ملائک انہیں خوش آمدید کہیں گے، اور انہیں سلام کریں گے، اس لیے انسان فرشتوں سے افضل ہیں (یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول ہے)۔

4 - چوتھا نظریہ خاموشی کا نظریہ ہے، یعنی وہ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے، (یہ شیخ ابن عثیمین کا قول ہے)، کیونکہ اس مسئلے (یعنی فرشتے یا انسان کا افضل ہونا) یہ نہ مفید ہے اور نہ ہی ضروری، اور نہ ہی کسی مسلمان کے لیے فائدہ مند ہے، اس لیے بہتر ہے کہ ان مسائل سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ایمان اور علم سے متعلق ہر کسی سے زیادہ حریص تھے، وہ کبھی بھی ان بحثوں میں شامل نہیں ہوئے اور ایک دوسرے سے نہیں پوچھتے تھے کہ فرشتے بہتر ہیں یا انسان؟ جس چیز کے بارے میں صحابہ نے خاموشی اختیار کی ہے بہتر ہے کہ ہم بھی خاموشی اختیار کریں، کیونکہ ایک شرعی اصول موجود ہے جس پر توجہ کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ "دین کے جس معاملے میں صحابہ کرام نے خاموشی اختیار کی ہے، جان لیں کی اس چیز میں پڑنا، ایک لایعنی اور فضول معاملہ سمجھا جاتا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔

کیونکہ جو چیز ہمارے لیے ضروری ہے وہ کلام اللہ یا سنت رسول یا صحابہ کرام سے لی جائے، اور اگر کسی دینی مسئلہ میں ان تین طریقوں میں سے کسی ایک میں بھی نہ ملے، پس معلوم ہونا چاہیے کہ وہ چیز دین کا حصہ نہیں اس لیے اس میں مشغول ہو جانا غیر ضروری ہے، (دیکھیں: شرح العقیدہ السفارینیۃ؛ علامہ ابن عثیمین صفحہ : 605) معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور فرشتوں میں افضلیت کا حکم لگانا غیر ضروری امر ہے اس بارے میں جاننے کی ضرورت نہیں ہے، اس سے اجتناب ہی بہتر ہے، اور ہم یہی کہیں گے کہ: خدا ہی بہتر جانتا ہے، والسلام۔

کیا واقعی شیطان فرشتوں کا استاد تھا؟

رہی بات کہ کیا واقعی ابلیس فرشتوں یعنی ملائک کا استاد تھا، شریعت کتاب و سنت صحیحہ میں اس بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اس لیے بغیر

دلیل کے اس طرح دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، جو بھی ایسا کہے اس کے پاس کتاب و سنت سے دلیل ہونا چاہیے، ورنہ بغیر علم کے ایسی بات نہ کرے، کیونکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝۳۱" (سورہ اسراء) ترجمہ: یعنی: اور جس چیز کو تم نہیں جانتے ہو اس کی پیروی نہ کرو" اللہ تعالیٰ بندے کو ایسی بات کہنے یا عمل کرنے سے منع فرماتا ہے جس کا اسے علم نہ ہو، اور اس معنی میں جھوٹی گواہی دینا، جھوٹ بولنا، بہتان لگانا اور دوسروں کو طعنے دینا، لوگوں میں عیب تلاش کرنا، علمی حقائق کو بدلنا، جعلی چیزیں اور دیگر فراڈ اور اندازے پر مبنی فریب اور اعمال ہیں: "کیونکہ کان، آنکھ اور دل سب سے سوال کیا جائے گا" یعنی: ان کے مالک سے پوچھا جائے گا کہ اس نے ان حواس کو کس طرح استعمال کیا؟ کیونکہ انسانی حواس ایسے آلات اور اوزار ہیں؛ کہ اگر وہ ان کو بھلائی کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ اجر کا مستحق ہے، اور اگر انہیں برائی کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ سزا کا مستحق، ایک قول کے مطابق: قیامت میں خدا تعالیٰ ان اعضاء کو بولنے کی صلاحیت دے گا جب ان سے سوال کیا جائے گا اور وہ ان کے مالکوں کے کاموں کے بارے میں بتائیں گے، جیسا کہ آیات اور احادیث اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں۔

بعض علماء نے جو یہ کھا ہے وہ یہ ہے کہ ابلیس خدا کے مقرب فرشتوں میں سے تھا، یعنی اگرچہ وہ فرشتہ نہیں تھا اور جن کی نسل سے تھا، لیکن وہ مقرب فرشتوں میں شامل تھا، اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: "إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِينٍ ۝۱ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ۝۲ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَتْمَعُونَ ۝۳ إِلَّا إِبٰلِيسَ ۝۴ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ۝۵ قَالَ يَا اِبٰلِيسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ۝۶ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعٰلِیْنَ ۝۷ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۝۸ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِیْنٍ ۝۹ قَالَ فَاخْرِجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَٰجِعٌ ۝۱۰" ترجمہ: "جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ بیشک میں تھوڑے سی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، تو جب میں اسے پورا بناچکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گرجاؤ، پس تمام فرشتوں، سب کے سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، اس نے تکبر کیا اور کافروں سے ہو گیا، فرمایا اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے، جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا؟ کیا تو بڑا بن گیا، یا تھامی

اونچے لوگوں میں سے؟، اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور تو نے اسے مٹی سے پیدا کیا، فرمایا پھر اس سے نکل جاؤ، کیونکہ بلاشبہ تو مردود ہے۔"

چنانچہ ایک قول کے مطابق: ابلیس کو مقرب فرشتوں میں سے نکال دیا گیا اور بعد میں اسے جنت سے بھی نکال دیا گیا، جیسا کہ علامہ سعدی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: "فَأَخْرَجَ مِنْهَا" خدا نے ابلیس سے کہا: آسمان اور قیمتی جگہ سے باہر نکل، "فَإِنَّكَ رَجِيمٌ" کیونکہ تو مردود اور خدا کی رحمت سے دور دھکیل دیا گیا ہے، اور فرماتا ہے: "وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا اِلَّا اِبْلٰٓسَ ۚ كَانَ مِنَ الْغٰٓثِیْنَ" (سورہ کہف: 50) "یعنی: یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا: "آدم کو سجدہ کرو" تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس وہ جنات میں سے تھا۔"

اس آیت سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں شامل تھا، لیکن پھر بھی قرآنی نصوص میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ابلیس فرشتوں کا استاد تھا؛ لہذا ہم اس جھوٹے دعوے کو مسترد کرتے ہیں، اور ان تمام مسلمانوں سے جو کتاب و سنت کے تابع ہیں، کہتے ہیں کہ وہ بغیر دلیل والے عقائد سے دوری اختیار کریں اور ان سے بچیں۔

فرشتوں اور جنوں میں فرق

فرشتوں اور جنوں میں متعدد اور بہت سے فرق ہیں، جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

- 1- جنات کو جلتی ہوئی آگ سے اور فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے۔
- 2- فرشتے مطیع بندے، فرمانبردار، خدا کے مقرب اور قابل احترام ہیں، جیسا کہ خدا کا فرمان ہے: "بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ" * لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِہٖ يَعْمَلُونَ" (الانبیاء: 26-27) "بلکہ وہ بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے (26) وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں"، اور فرماتا ہے: "لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ" (تحریم: 6) "وہ خدا کی نا فرمانی نہیں کرتے جس کا وہ انہیں حکم دے وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں"

البتہ جنات میں سے بعض مؤمن ہیں اور بعض کافر، جیسا کہ رب تعالیٰ ان کے متعلق قرآن میں خبر دیتا ہے: "وَإِنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۖ فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝۱۴" (سورہ جن: 14) "ہم میں سے کچھ فرمانبردار ہیں اور ہم میں سے کچھ ظالم ہیں۔"

ان میں سے بعض مطیع اور فرمانبردار ہیں اور بعض گنہگار بھی، اس بارے میں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَإِنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَلِكَ ۝۱۱" (سورہ جن: 11) "ہم میں سے کچھ صالح ہیں اور کچھ اس کے علاوہ ہیں" (یعنی: نافرمان اور بے دین) اور بھی بہت سی آیات اس بارے میں آئی ہیں۔

ان فرشتوں کے نام جو عرش الہی کو اٹھانے کے ذمہ دار ہیں

ایسے فرشتے ہیں جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں: "الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا ۝۹" (سورہ غافر: 7) "وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہیں۔"

اور فرماتا ہے: "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ۝۱۰" (سورہ حاقہ: 17) "اور تیرے رب کا عرش اس دن اٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے" ، کچھ علماء کہتے ہیں: جو عرش کے ارد گرد ہیں وہ مقرب فرشتے ہیں، چونکہ وہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اس لیے وہ افضل ترین فرشتوں میں سے ہیں (تفسیر ابن کثیر: 120/7) لیکن ان فرشتوں کے نام کتاب و سنت میں ذکر نہیں ہوئے ہیں، اور اکثر "عرش اٹھانے والے" فرشتوں کے نام سے مشہور ہیں؛ لہذا ہم بھی اس اصطلاح پر اکتفا کرتے ہیں، فرشتے ان غیبی مخلوقات میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، اور خدانے انہیں فرمانبردار اور مطیع بنایا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ فرائض ہیں جن کو انجام دینے کے لیے خدا نے انہیں خاص طور پر بنایا ہے۔

البتہ بعض فرشتوں کے نام کتاب و سنت میں آئے ہیں مثلاً

جبرئیل: وحی کا ذمہ دار، اسرافیل: صور پھونکنے کا ذمہ دار، اور عرش اٹھانے والوں میں سے ایک۔

میکائیل: بارش اور نباتات کے ذمہ دار، مالک، ہاروت و ماروت، رضوان، منکرو نکیر، اور دوسرے جن کے نام نصوص میں بیان ہوئے ہیں، اور اسی طرح نصوص میں جن کی صفات بیان ہوتی ہیں: جیسے رقیب و عتید (نگہبان اور دیکھ بھال کرنے والا) یا وہ فرائض کے ذریعے سے پہچانے جاتے ہیں: جیسے ملک الموت (موت کے فرشتے) و ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتے) یا نصوص میں عام طور پر جن کے فرائض کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے، جیسے: حلة العرش (عرش کو اٹھانے والے) اور الکرام الکاتبین (معزز لکھنے والے) والہ المولکین بحفظ الخلق (مخلوق کی حفاظت کے ذمہ دار) المولکین بحفظ الأجنة اولأرحام (رحم کے اندر نطفے کا ذمہ دار) طوائف البيت المعمور (بيت المعمور کے طواف کے ذمہ دار فرشتے) ملائكة السياحين (زمین میں گھومنے والے فرشتے) اور دوسرے فرشتے جن کے بارے اللہ اور اس کے رسول نے خبر دی ہے، اور ان تمام فرشتوں پر ہم ایمان لاتے ہیں جن کے نام اور ان کی صفات اور فرائض احادیث میں ذکر کیے گئے ہیں۔

کیا فرشتے مجسم ہیں

رب کے اس بیان کی بنیاد پر، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاں، فرشتے جسمانی مخلوق ہیں: "جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْجَحَةٍ" (فرشتوں کو پیغمبروں کی طرف بھیجا گیا ہے، وہ فرشتے جو پروالے ہیں)

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہیں

ہر ایک انسان پر دو فرشتے مقرر ہیں، ایک دائیں جانب کہ اس کی حسنات اور نیکیاں لکھتا ہے، اور دوسرا بائیں جانب جو اس کی برائیاں لکھتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: "إِذْ يَتْلَى الْمُتْلَقِيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدَانِ يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ" (سورہ ق: 17 - 18) "جب (اس کا ہر قول و فعل) دولینے والے لیتے ہیں، جو دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہیں (17) وہ کوئی بھی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک تیار نگران ہوتا ہے، جو لفظ ان کے منہ سے نکلتا ہے خیر اور شر میں سے اسے لکھ لیتے ہیں اور نگران و محافظ ہیں اس کی ہر حالت کے" یہ فرشتے چاہے سفر ہو یا حضر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں، اور ہر حالت میں، نماز میں، سجدے میں اس کے ساتھ ہیں اس کو

اکیلا نہیں چھوڑتے، مگر بعض خاص حالات میں، جیسے: رفع حاجت کے وقت، وہ اس کی باتیں اور اعمال لکھتے ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ فرشتے انسان کے ارادہ اور نیت، اور حوکچہ اس کے دل میں ہے اور دل میں کہتا ہے، اور جو نیت اور ارادہ کرتا ہے کہ وہ ایسا کرے گا فرشتے اسے لکھتے ہیں، اس لیے انسان اگر اچھی نیت کر لے تو اسے ثواب ملتا ہے، اور بُری نیت پر سزا پاتا ہے، کیونکہ نیت دل کا عمل ہے، فرشتے سن بلوغت سے انسان کے ساتھ مقرر ہوتے ہیں یہاں تک کہ انسان اس دنیا سے چلا جائے یہ فرشتے دنیا میں اس کی نیت، اعمال اور باتیں جو یہ کہتا ہے یا کرتا ہے لکھ لیتے ہیں۔

صدق الله العظيم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورۃ البینۃ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اسکی "8" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ :

اس سورت کو بینہ اس لیے کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کے فرمان: "لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ" (البینۃ: ۱) سے اس کا آغاز ہوا ہے، واضح رہے کہ اس سورت نے، سورۃ الطلاق کے بعد شرف نزول پایا ہے، بینہ کے معنی ہیں "روشن دلیل"۔

اس سورت کے تمام نام

اس سورت کے دیگر نام یہ ہیں: "قیامت، لم یکن، القیمۃ، بلد، الانفکاک و منفکین، البریۃ، اور لم یکن الذین کفرو" (روح المعانی)

سورۃ البینۃ کا سورۃ القدر سے ربط و مناسبت

اس سورت کا سبب نزول سورہ قدر کے سبب نزول کی طرح ہے "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" اگر پوچھا جائے کہ: البینۃ کا سبب نزول کیا ہے، جواب میں کہیں گے، اس لیے کہ بہت کفر اختیار کرنے والے اور اہل کتاب ان واضح دلائل سے متاثر ہوتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں۔

سورۃ البینۃ کے الفاظ، آیات اور حروف کی تعداد

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی ہے، البتہ بعض مفسرین کا یہ کہنا ہے کہ یہ سورہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے، جبکہ اس سورت کے متن کا مفہوم یہ ظاہر کرتا ہے: کہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوگی، اس لیے کہ اس میں اہل کتاب کا ذکر ہے، اور خاص کر یہ کہ مشرکین سے پہلے اہل کتاب کا ذکر، حالانکہ اہل کتاب سے تنازعہ اور ان کے بارے میں بحث مکہ مکرمہ کی تاریخ میں نہیں تھی، یہ تنازعہ مدینہ منورہ میں شروع ہوا۔

جمع وترتیب کے لحاظ سے سورہ "البینہ" قرآن کریم میں اٹھانوے نمبر پر ہے، جو کہ سورہ "قدر" کے بعد اور سورہ "زلزال" سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

ترتیب نزول کے لحاظ سے یہ سورت "100" ویں سورت ہے جو سورہ "طلاق" کے بعد اور سورہ "حشر" سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

سورہ "البینہ" کا ایک (1) رکوع، آٹھ (8) آیتیں، چورانوے (94) الفاظ اور تین سو ننانوے (399) حروف ہیں، لیکن "فرہنگ نامہ علوم قرآن" کے مطابق اس سورہ کے الفاظ کی تعداد "74" اور اس کے حروف کی تعداد "392" یا "404" بھی بتایا گیا ہے، (مرکز دائرة المعارف برزگ اسلامی، (اس کی تفصیل تفسیر احمد سورہ طور میں دیکھیں)۔

سورة البينة کی فضیلت

سورة البينة کی فضیلت سے متعلق ابی بن کعبؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ: لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَالَ: "نعم" قَالَ فَبَكَى " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب سے فرمایا: اللہ عزوجل نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں: "لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا" پڑھ کر سناؤں، ابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! (اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لیا ہے) اس پر ابی رضی اللہ عنہ (خوشی سے) رونے لگے، (صحیح مسلم)۔

سورة البينة کا سبب نزول

سورہ بینہ کا سبب نزول یا شان نزول کیا ہے؟ اس بارے میں کوئی خاص وجہ نہیں بتائی گئی، لیکن مجموعی طور پر اس سورت میں اہل کتاب (یہود و نصاری) کی سرزنش پر بحث کی گئی ہے، اور یہ جملے: "هُمُ شُرُكَاؤُ الْبَرِيَّةِ" اور "هُمُ خِيَرُ الْبَرِيَّةِ" کفر اختیار کرنے والے اور ایمان عمل و عمل صالح کرنے والوں کا انجام بتاتے ہیں، خاص طور پر لفظ (الَّذِينَ) اور "اولئک" اور ضمیر "ہم" جو کہ سبب جمع کے صیغے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مخاطب کوئی معین شخص نہیں، بلکہ ایک بڑی تعداد ہے۔

سورة البينة کے مشتملات

یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو سارے جہاں کے لیے رسول ہیں، اور واضح دلائل کے ساتھ اس رسالت کو بیان کیا گیا ہے:

1 - مادی وجوہات کی بنا پر بعض لوگوں کا پیغمبر سے اعراض؛ اسی طرح اس سورت میں جو عظیم نکتہ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت انبیائے کرام کو ایک بنیاد فراہم کرتی ہے، اور ایک اصول تشکیل دیتی ہے، وہ بنیادی اور اصول ہے توحید: اسی طرح اس سورت میں اہل کتاب اور مشرکین کی اسلام کے خلاف مختلف مزاحمتوں اور خلاف ورزیوں کا ذکر ہوا ہے، اس سورت کے ایک اور حصے میں اہل کتاب اور مشرکین کے اسلام کے خلاف مختلف موقف بیان کیے گئے ہیں، جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح کیے وہ بہترین مخلوق ہیں اور لوگ جو کفر، شرک اور گناہ کی راہ پر چلتے ہیں وہ بدترین مخلوق ہیں۔

2 - ایمان کی دعوت، نماز، روزہ، اور "اہل کتاب" یہ اصطلاح قرآن عظیم میں اکیس مرتبہ ذکر ہوئی ہے، اور ان میں سے بہت سی آیات میں "اہل کتاب" کی اصطلاح مشرکین کے مقابلے استعمال ہوئی ہے، جو ان دونوں گروہوں کے تصورات کے درمیان تصادم کی علامت ہے، قرآن کریم نے اپنے بہت سے احکام میں دونوں گروہوں کا الگ الگ تعارف کرایا ہے، مثال کے طور پر سورہ توبہ کی آیت "5" میں ہم پڑھتے ہیں: "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُواهُمْ وَأَحْضَرُوهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلٌّ مَّرْصِدٌ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝" (سورہ توبہ آیت: 5) "مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں پکڑو اور انہیں گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو، اور اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں، زکاة دیں تو پھر ان کا راستہ چھوڑ دو، بیشک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔"

قرآن کریم خاص طور پر اہل کتاب کا حکم بیان کرتا ہے، جب تک وہ ہتھیار نہ ڈال دیں اور جزیہ دینے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کا قتل جائز ہے، اور اگر وہ ہتھیار ڈال دیں یا جزیہ دے دیں تو بخش دیا جائے گا: "قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ

يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿٢٩﴾ (سورہ توبہ: 29) (لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں، اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ ماتحت ہوں)۔

دنیا میں اسلام کے علاوہ دو آسمانی ادیان ہیں، اور یقینی طور پر اور علماء اسلام کی اتفاق رائے سے ان کا شمار اہل کتاب میں ہو گا، ان سے مراد: یہودی اور عیسائی ہیں، قرآن کریم نے ان دونوں مذاہب کے اہل کتاب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور کھاہے: "أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أُنْزِلَ الْكِتَابُ عَلَى طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۖ وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَفِيلِينَ ﴿١٥٦﴾" (سورہ انعام: 156) (ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب تو صرف ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور بیشک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے یقیناً بے خبر تھے)۔

اگر ہم قرآنی آیات کو غور سے دیکھیں جو اہل کتاب کے بارے میں بیان کی گئی ہیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ قرآن عظیم نے اہل کتاب کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے:

1 - وہ ہے جنہوں نے اسلام کی حقیقت کو جان لیا، لیکن اس کو ماننے سے انکار کر دیا، ان قسم کے اہل کتاب مکمل طور پر قرآن کی سرزنش کی زد میں آئے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ: اس انکار کی وجہ کیا ہے، یہ خود غرضانہ خواہش ہو سکتی ہے جیسے طاقت، دولت، ہو س یا نفسانی خواہش کے علاوہ کچھ اور، قرآن نے ہر حالت میں اس کی مذمت کی ہے۔

2 - اہل کتاب میں سے وہ لوگ ہیں جنہیں اسلام کی حقیقت نہیں ملی، لیکن قرآن نے ان کی مذمت کی ہے، کیونکہ ان لوگوں نے انسانی اخلاقیات کو پامال کیا ہے، انہوں نے جان بوجھ کر توحید کو نقصان پہنچایا ہے، اسلام سے دشمنی کی ہے، پیغمبر اور مؤمنوں کو ستایا ہے، اور یہاں تک کہ یہ لوگ ان لوگوں میں سے تھے جن کے اعمال کی اسلام سے پہلے مذمت کی گئی تھی، کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب میں تحریف کی تھی اور اپنے پیغمبروں کو قتل کیا تھا۔

3 - وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کی حقیقت کو پہچان لیا، اور دین اسلام کو قبول کر لیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی مانا، یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت کو پہنچ چکے ہیں : (آیت 20 آل عمران) "فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا" ○ "یا سورہ آل عمران آیت 110" میں فرماتا ہے : "وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ" ○ -

4 - وہ لوگ ہیں جو باوقار اور بااخلاق ہیں، اگر چہ وہ اسلام کی حقیقت سے ناواقف ہیں، قرآن کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ لوگ زندگی بھر انسانی قوانین کے پابند رہتے ہیں، وہ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی زندگی خدا تعالیٰ سے وابستہ ہے، اور وہ لوگ قیامت اور فیصلے کے دن پر قائم ہیں، تمام وہ معیارات جو قرآن سے حاصل کئے گئے ہیں، ان سے آج کے زمانے کے اہل کتاب کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا ممکن ہے، اور یہ جاننا بھی ممکن ہے کہ کون قابل احترام ہے اور کون قابل مذمت۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ماضی کے ادیان کا ناسخ ہے، اور یہ ناسخیت مسلمانوں کے بنیادی عقائد میں سے ہے، اور واضح دلائل کے ساتھ ثابت ہے، اگر بعض آیات میں اہل کتاب کی تعریف کی گئی ہے اور ان پر احسان کیا گیا ہے، تو یہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ ان کا دین اسلام سے افضل ہے، بلکہ یہ فضل ان وجوہات اور صفات میں سے ہے جو اسلام کی صداقت اور ناسخیت سے متصادم نہیں ہے -

دین اسلام میں اہل کتاب کو مشرکوں سے بالکل مختلف نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے، تمام اہل کتاب کو کبھی مشرک کے برابر نہیں ٹھہرایا گیا، البتہ اہل کتاب میں سے صرف چند لوگ اپنے غلط اعمال اور عقائد کی وجہ سے مشرکوں کے برابر قرار دیے گئے ہیں -

قرآن کی بہت سی آیات جن میں یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں کے نام آئے ہیں، ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے؛ لہذا ان آیات کا حکم ہر دور میں تمام اہل کتاب کے لیے نہیں ہے، لیکن جو دلائل دیے گئے ہیں ان میں محتاط رہنا چاہیے اور ان دلائل کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہیے کہ آج کے اہل کتاب کافر ہیں یا نہیں؟ اور قرآن کے مطابق ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ پیغمبر کے زمانے کے اکثر اہل کتاب

جو پیغمبر کے ساتھ آمنے سامنے تھے وہ اس طرح تھے: دور حاضر کے اہل کتاب کے بارے میں قرآن کے عمومی نقطہ نظر کو جانچنے کے لیے تمام قرآنی آیات اور ان میں مذکور شواہد پر توجہ دینی چاہیے اور ان کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہیے۔

بہت سے معاملات میں ، قرآن کریم مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان باہم مشترکہ معاملات پر زور دیتا ہے: مثال کے طور پر فرماتا ہے: "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" (سورہ آل عمران: 64)، " وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَالْهُنَا وَالْهُكُمُ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ " (سورہ عنکبوت: 46) ، اور ان امور کو مد نظر رکھ کر دور حاضر کے اہل کتاب سے معاملات کرنے چاہیے ۔

اہل کتاب کے لیے ان عقائد کو دوبارہ پڑھنا مسلمانوں اور اہل کتاب کی آراء کے درمیان صحیح اور مربوط تعلق کی تشکیل کا ایک اہم ترین عنصر بن سکتا ہے ، اور یہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان ربط و تعلق پیدا کر سکتا ہے ، اور ایک طرح سے یہ غیر مسلموں کے ساتھ فکری برابری کو پھیلاتا ہے ۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة البينة

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ ۝ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ ۝ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۝ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۝ أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۝ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَاءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۝ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۝

سورت کا ترجمہ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان
نہایت رحم والا ہے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں
سے کفر کیا، باز آنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ
ان کے پاس کھلی دلیل آئے

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ
الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى
تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

اللہ کی طرف سے ایک رسول جو (ان پر) پاک
صحیفے پڑھ کر سناتے ہیں

رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝
فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ ۝

جن میں لکھے ہوئے مضبوط احکام ہیں
اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی، جدا جدا نہیں
ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی
دلیل آگئی

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ
بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ ۝

اور انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ
کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے
دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے
والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور
یہی مضبوط دین ہے

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ
الدِّينَ ۝ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ ۝

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے، وہ یقیناً بہترین مخلوق ہیں

ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈر گیا

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۝ أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۝ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝

جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۝ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۝

سورت کی تفسیر

اس سورت کے تحت ذیل کی مبارک آیات میں موضوعات: واضح دلیل اور مجازات کے مقابلے میں ذمہ داری، انذار (حق کا پیغام پہنچانا اور داعی کاپسندیدہ ہونا) کفر اختیار کرنے والوں کو دھمکی اور نیک لوگوں کو خوشخبری ہے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا، باز آنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آئے

"مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ" یعنی: یہود و نصاریٰ، "الْمُشْرِكِينَ" وہ تمام لوگ جو بت، آگ یا اس جیسی چیزوں کی عبادت کرتے تھے، اور ان کے پاس کتاب بھی نہ تھی، "مُنْفَكِّينَ" اپنے رویے کو چھوڑنے والے نہ تھے، "حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ" یہاں تک کہ آئے ان کے پاس واضح دلیل اور وہ دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی کتاب قرآن ہے، "الْبَيِّنَةُ" ایک واضح دلیل کہ جس سے حق و باطل ایک دوسرے سے ظاہر ہو کر الگ ہو جائیں۔

اس سورت مبارکہ میں وضاحت اور صراحت کے ساتھ نہیں کہا کہ انہوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا جو وہ کر رہے تھے، لیکن واضح ہے کہ اس سے مراد وہ کفر اور گمراہی ہے جس پر وہ اس وقت تھے جب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم ان کے پاس قرآن لائے البتہ ان کی اس گمراہی اور شرک کو بیان کیا ہے جس پر زمانہ جاہلیت سے قائم تھے، پیغمبر ان لوگوں کے لیے قرآن لائے اور انہیں ایمان کی دعوت دی، ان میں سے کچھ ایمان لائے اور ہدایت یافتہ ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہی اور جہالت سے بچالیا، اگرچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے اپنے کفر سے باز نہ آئے تھے، یہ آیت مبارکہ مشرکین اور اہل کتاب کے دو ایمان لانے والے گروہ ہوں کے بارے میں بحث کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت کی دوطرح سے تشریح کی جاسکتی ہے، ایک تفسیر کے مطابق یہ آیت مبارکہ اہل کتاب اور مشرکین کی بے وفائی اور بددیانتی کے بارے میں ہے، اور دوسری تفسیر کے مطابق اس سے مراد ان پر اتمام حجت کی تکمیل ہے، کفار کا دعویٰ یہ تھا کہ جب تک ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل نہ آئے ہم اپنے راستے پر قائم رہیں گے، اور اپنے مذہبی عقائد سے دستبردار نہیں ہوں گے، لیکن واضح صاف اور منطقی دلیل آنے کے بعد بھی وہ اپنے راستے پر قائم رہے، اور چند ایک کے علاوہ باقی ایمان نہ لائے، اس مضمون کی یہی تفہیم سورہ بقرہ کی آیت "89" میں بھی بیان کی گئی ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے وہ ایک نبی کے آنے کے منتظر تھے، اور اپنے لوگوں کو اس کی نوید سناتے تھے، لیکن جب "فلما جاءهم ماعرفوا كفروا" (مگر جب انہی ان کے پاس وہ چیز جسے وہ پہچانتے تھے) اسے انہوں نے نہیں مانا اور اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ بات یاد رکھیں کہ : لوگوں سے توقع نہ رکھیں کہ وہ بغیر کسی واضح دلیل کے اپنے عقائد اور طریقے ترک کر دیں گے، اسی طرح اس ضمن میں یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ: اتمام حجت اور ثبوت مکمل ہونے پر کفار و مشرکین ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کی طرف چاہے کفار ہوں یا مشرکین دلیل بھیج کر حجت مکمل کر دی ہے۔

رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿٩٨﴾
 صحیفے پڑھ کر سناتے ہیں اللہ کی طرف سے ایک رسول جو (ان پر) پاک

ایک پیغمبر اللہ کی طرف سے ان کی طرف بھیجا جائے اور (آجائے) پاک صحیفے (ان پر) پڑھ کر سنائے، جو شرک، جھوٹ، شیطان اور جن و انس کی مداخلت سے پاک ہوں، "يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً" یعنی یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانی اور علامت ہے کہ وہ پاک صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے، یعنی: جو کچھ

قرآن کے صحیفوں میں ہے اپنے دل و دماغ کے حافظے سے نہیں، بلکہ کتاب سے پڑھتا ہے۔

قرطبیؒ نے کھا ہے: یعنی وہ پتوں پر لکھے ہوئے مضمون پڑھتا ہے، وہ اسے یاد سے پڑھتا ہے نہ کہ دیکھ کر یا لکھے ہوئے سے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے (تفسیر قرطبی: 142/29) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مُطَهَّرَةٌ" یعنی یہ جھوٹ، باطل، شک، نفاق اور گمراہی سے پاک اور منزہ ہیں، قتادہ نے کہا: یعنی باطل سے پاک اور منزہ ہیں، (تفسیر قرطبی: 142/29)، "رَسُولٌ مِّنَ اللّٰهِ" محمد اللہ کے رسول، "صُحُفًا مُّطَهَّرَةً" باطل سے پاک اور صاف صحیفے، یہ "بَيِّنَةٌ" ایسا رسول اور پیغمبر جو اللہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا، کہ وہ باقاعدگی سے پاک اور صاف صحیفے اور پیغام پڑھے۔

لغت کے اعتبار سے صحیفے لکھے ہوئے اوراق کو کہتے ہیں، لیکن قرآن عظیم میں یہ لفظ اصطلاح کے طور پر ان کتابوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو پیغمبروں پر نازل ہوئی ہیں، اور خالص صحیفے سے مراد وہ صحیفے ہیں جو ہر قسم کے جھوٹ، ہر قسم کی گمراہی اور ہر قسم کی اخلاقی آلودگی سے پاک ہوں۔

تفہیم القرآن کے مفسر لکھتے ہیں: کہ اس موضوع کی پوری اہمیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب کوئی شخص قرآن مقدس کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتا ہے اور ان میں موجود مضامین جو کہ حقیقت اور عقل دونوں کے خلاف ہیں، اور اخلاقیات کے لحاظ سے انتہائی نچلے درجہ میں قرار پاتے ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد جب انسان قرآن پڑھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے قرآن کتنی پاکیزہ اور عظمت والی کتاب ہے (تفہیم القرآن)۔

فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ ۝ جن میں لکھے ہوئے مضبوط احکام ہیں

ان میں لکھے ہوئے پختہ، راست اور درست احکام ہیں، یعنی: ان صحیفوں میں ایسی آیات اور احکام ہیں جو حق اور انصاف کی بات کرتے ہیں، وہ احکام جو حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں اور ہدایت اور بھلائی کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں: کہ یہ حسی طور پر بھی پاکیزہ ہے، یعنی پاک انسان ہی اسے چھوسکتا ہے، اور روحانی، لفظی اور معنی کے لحاظ سے بھی مطہر اور پاک ہیں۔

عالم مفسر احمد بن محمد صاوی لکھتے ہیں: "صحف" سے مراد وہ اوراق ہیں جن پر قرآن لکھا گیا ہے، اور "کتب" سے مراد وہ احکام ہیں جو ان میں لکھے گئے اور قائم ہیں، اس لیے فرمایا: "کُتِبَ قِیَمَةُ" کیونکہ قرآن تمام پہلی کتابوں کا ثمر خلاصہ اور نتیجہ ہے، (حاشیۃ الصاوی علی تفسیر الجلالین: 342/4)۔

"قِیَمَةُ" یعنی: درست، سیدھا، مضبوط اور قائم کہ جس میں حق سے کوئی کجی یا انحراف نہیں ہے، بلکہ جو کچھ اس میں ہے وہ راستی، ہدایت اور حکمت ہے، "کُتِبَ قِیَمَةُ" سے مراد وہ صحیفے اور منصوبے ہیں جو وقت گزرنے کے باوجود اعتبار سے محروم نہیں ہوئے، اپنی طاقت اور اصلیت سے محروم نہیں ہوئے، لیکن بدقسمتی سے اہل کتاب اس مقدس کتاب کے شرف نزول پانے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے اور اسے انہوں نے جھٹلایا۔
وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ
بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۚ
ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیل آگئی

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی وہ منتشر نہیں ہوئے، یہاں تک کہ آگئی ان پر وہی ظاہر کرنے والی، یعنی وہ لوگ حق کے واضح ہونے اور راہ حق کے ظاہر ہونے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد انہوں نے سچے دین کے معاملے میں آپس میں اختلاف کیا، اور کچھ ان پر ایمان لائے اور کچھ کافر ہوئے، جب کہ ان کا فرض تھا کہ خدا کے دین اور اس کے نبی کے پیروی کرتے (جو کہ تصدیق کرنے والا ہے ان کی کتابوں کا) اور ایک ہی طریقے اور راستے پر قائم رہے، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا اور کتاب مقدس نازل ہوئی تو انہوں نے ایک دم اپنا موقف بدل لیا اور خدا کے دین میں اختلاف کرنے لگے۔

مفسر ابوسعود نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں کھاہے کہ: یہ آیت خاص طور پر اہل کتاب کی سرزنش کرتی ہے اور ان کے جرائم کو سخت اور سنگین بتاتی ہے، اور وہ یہ کہ ان کا اختلاف حالات کے واضح ہونے اور ہر قسم کے عذر اور بہانے ختم ہونے کے بعد ہوا ہے۔

"وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ" اہل کتاب یہودی اور عیسائی منتشر نہیں ہوئے، "إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَةُ" مگر بعد اس کے کہ واضح ثبوت یعنی محمد اور اللہ کی کتاب ان کے پاس آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے

سے پہلے یہودی کہتے تھے، ایک پیغمبر نبی آخر الزمان کے نام سے ظاہر ہوگا، اہل کتاب میں اس نبی کے ظہور پر اتفاق تھا، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو یہ دو گروہوں میں بٹ گئے: ایک گروہ آپ کی نبوت پر ایمان لایا اور آپ کا پیروکار بنا، جیسے: عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی، اور دوسرے گروہ نے کفر کیا اور بینہ کو قبول نہیں کیا، اور اپنی گمراہی اور ضد و عناد کی وجہ سے تقسیم ہو گئے۔

اس موقع پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اطمینان کے لیے بھی ہے، یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تقسیم آپ کو غمزدہ نہ کرے، کیونکہ اس تفرقہ کی اصل منشأ اور دلیل ثبوت کی کمی نہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ ضد و عناد ہے جو کہ اہل کتاب کی ایک پرانی عادت ہے۔

حدیث مبارک میں آیا ہے کہ: یہودی ایکہتر (۷۱) فرقوں میں اور عیسائی بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے تھے، عنقریب میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی، وہ سب کے سب جہنم میں ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ ایک فرقہ کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہوں گے جو میرے اور میرے صحابہ کے نقش قدم پر ہوں گے۔

اور انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ
وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ
لَهُ الدِّينَ ۖ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۝
اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے
لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف
ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ
دیں اور یہی مضبوط دین ہے

"وَمَا أُمِرُوا" انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا سوائے اس کے کہ اللہ کی عبادت کریں، اللہ عبادت کے لیے واسطہ نہیں چاہتا، چاہے یہ واسطہ بت ہو یا فرشتہ یا انسان، "مُخْلِصِينَ" اخلاص کے ساتھ، صرف میرے (اللہ) کے لیے "حُنَفَاءَ" انہوں نے تمام ادیان کو چھوڑ کر اسلام کی طرف رجوع کیا، توحید کے دین اور اکیلے اللہ کی عبادت، خالص اور سچا دین، بغیر کسی واسطے کے، "دِينُ الْقَيِّمَةِ" صحیح اور درست دین، قیمتی دین، "يُقِيمُوا الصَّلَاةَ" نماز اس طریقے سے ادا کریں، جس طرح خدا نے ان کو حکم دیا ہے، یعنی نمازوں کے اوقات میں، ان کے آداب اور ارکان کا لحاظ کرتے ہوئے کہ: تمام ادیان میں یہ حکم موجود تھا، (اللہ کے

حق کے طور پر) ، "يُؤْتُوا الزَّكَاةَ" یعنی: وہ مالی زکوٰۃ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کی ہے ، چاہیے کہ وہ مال غریبوں اور مسکینوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ادا کریں (لوگوں کے حقوق کے طور پر) وہ دین جو سچا، مستحکم اور سیدھا ہو اور بندے کو خدا کی رضا کی طرف لے جائے اور اللہ کے غضب سے دور رکھے، یہی خالص دین اسلام ہے ، "وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ" اور یہی مضبوط دین ہے ، یعنی وہ دین جو اخلاص کے ساتھ خدا کی عبادت کرنے اس کے علاوہ کے تمام باطل معبودوں کو چھوڑنے ، نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے ، اور محتاج بندوں کو زکوٰۃ ادا کرنے کا پیغام دیتا ہے ، یہ خدا کا واحد مضبوط اور مستحکم دین ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ
وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ
فِيهَا ۚ أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے
کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں ہوں گے، اس میں
ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہی لوگ بدترین
مخلوق ہیں

بلاشبہ مشرکین میں سے جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد کفر کیا، اور ان کے ساتھ ساتھ مشرکین بھی بالآخر جہنم کی آگ میں ہوں گے ، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ، نہ اس سے نکل سکیں گے ، اور نہ اس میں مریں گے ، یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں، یعنی: یہ خدا کے پیدا کی ہوئی بدترین مخلوق ہے ، کیونکہ انہوں نے حسد اور سرکشی کی بنا پر حق کو چھوڑا ہے۔

"إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا" جنہوں نے اسلام، پیغمبر اسلام اور کتاب کا انکار کیا، وہ یہودی اور عیسائی ہیں ، "أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ" وہی بدترین مخلوق ہیں ، اگر اس تعبیر پر کہ "وہ بدترین مخلوق ہیں" توجہ دیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ ایک انتہائی چونکا دینے والی تعبیر ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام جاندار اور غیر جاندار مخلوقات میں سے مردود تر اور زیادہ حقیر ان لوگوں سے زیادہ کوئی نہیں ہے ، جنہوں نے حق کو واضح ہونے اور دلیل کے مکمل ہونے کے بعد سیدھا راستہ چھوڑ کر گمراہی میں قدم رکھا ۔

امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں: اگر سوال کیا جائے کہ کافروں کے لیے ، فعل کا صیغہ "كَفَرُوا" اور بت پرستوں کے لیے اسم فاعل "وَالْمُشْرِكِينَ" کا جملہ کیوں استعمال ہوا ہے ؟ تو جواب میں کھاجائے گا: تا کہ یاد دہانی ہو جائے کہ

اہل کتاب شروع میں کافر نہیں تھے، بعثت سے قبل نبی کی تصدیق کرتے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے معترف تھے، لیکن بعد میں وہ بعثت کا انکار کرنے لگے، جبکہ ان کے برعکس مشرکین ابتدائی سے بتوں کی پوجا کرتے تھے، قیامت اور حشر کے دن کا انکار کرتے تھے۔

"أُولَٰئِكَ هُمُ الشُّرُكُورُ" کا فرمان، حصر کا معنی دیتا ہے، چونکہ وہ چوروں سے بدتر ہیں، اس لیے انہوں نے اللہ کی کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کو چھپایا، اور وہ ڈاکوؤں اور رہزنوں سے بدتر ہیں، کیونکہ حق کے راستے کو مخلوق خدا پر بند کر دیا (تفسیر کبیر: 49/31)۔

اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب اور پسندیدہ بننا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صحیح فرمان کے مطابق عمل کرے، جس میں بیان ہوا ہے کہ ایک دن ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر عرض کی کہ: "يَا رَسُولَ اللَّهِ دُلِّي عَلَى عَمَلٍ إِذَا أَنَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِي اللَّهُ وَأَحَبَّنِي النَّاسُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ: ارْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللَّهُ، وَارْهَدْ فِيمَا فِي أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ" [ابن ماجہ: 4102] حکم البانی : حسن۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جسے میں کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کرے، اور لوگ بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا سے بے رغبتی رکھو، اللہ تمہیں محبوب رکھے گا، اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جاؤ، تو لوگ تم سے محبت کریں گے" اس لیے اگر ہم اللہ کے پیارے بننا چاہتے ہیں تو دنیا ہمارے دلوں میں بسنی نہیں چاہیے: "وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا" (سورہ قصص: 77) "اور اپنا حصہ دنیا سے نہ بھول۔"

اس آیت مبارکہ میں "اہل کتاب" کو مشرکین پر مقدم رکھنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے پاس آسمانی کتاب، علماء، اور مذہبی رہنما موجود تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی نشانیوں کا ذکر بھی ان کی کتابوں میں واضح طور پر موجود تھا، اس لیے ان کی طرف سے محمد کی مخالفت اور بھی بدتر ہے۔

اور "شُرُكُورُ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کے منکر ہیں، (اگرچہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے) اس آیت مبارکہ میں أشقیاء یعنی بدبختوں

کے گروہ کا ذکر ہے، درج ذیل آیت میں نیک لوگوں کے مقام و مرتبہ کا تذکرہ ہے جیسا کہ فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۖ
أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۖ
جولوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے،
وہ یقیناً بہترین مخلوق ہیں

یعنی: وہ لوگ جو سچے دل سے ایمان لائے اور خلوص دل سے عملی عبادت کی، تو یہ بہترین لوگ اور سب سے افضل مخلوق ہیں، جو لوگ اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور خلوص کے ساتھ رب تعالیٰ کی عبادت کی، نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، اور اللہ تعالیٰ کے امر اور نہی پر عمل کیا تو پھر یہ لوگ: "أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" وہ بہترین مخلوقات میں سے ہے۔

یعنی تمام اعمال صالحہ میں سرفہرست نماز کی صورت میں اللہ سے تعلق کی اصلاح، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت میں مخلوق کے ساتھ تعلق کی اصلاح، اگر یہ دونوں اقدام صحیح طریقے سے کیے جائیں تو باقی اعمال صالحہ میں آسانی ہوگی، کیونکہ بقیہ اعمال صالحہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلق کو استوار کرنے اور مضبوط کرنے کی سمت میں ہیں جو نماز پڑھنے کے وقار اور مرتبے میں رکھے گئے ہیں یہ آیت کسی خاص شخص کو مخاطب نہیں کرتی، بلکہ جمع کا صیغہ آیا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں (یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر دینی احکام کی پابندی کرتے ہیں اور ممنوعات سے اجتناب کرتے ہیں) وہ اللہ تعالیٰ کے بہترین مخلوقات میں سے ہیں، یعنی: بہت سے لوگ جو اسلام جیسے مقدس دین، قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، اور پھر نیک عمل کرتے ہیں، وہ ان شاء اللہ "خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" کا حصہ ہیں۔

عالم اسلام کے مشہور مفسر امام ابن کثیر رحمہ اللہ دو آیات "6 اور 7" کی تفسیر میں فرماتے ہیں: خدا تعالیٰ حق سے منہ موڑنے والوں کے انجام کی خبر دیتا ہے، اہل کتاب منکرین اور مشرکین میں سے جو اللہ کی کتاب، قرآن اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء کی مخالفت کرتے ہیں، ان کا ٹھکانہ قیامت کے دن ابدی آگ جہنم ہے، یعنی وہ اس میں رہیں گے اور وہاں سے نہیں نکلیں گے، اور ان سے جہنم کی آگ نہیں ہٹائی جائے گی، اور یہ خدا کی مخلوقات میں بدترین مخلوق ہیں، پھر اللہ تعالیٰ صالحین اور ابرار کی حالت سے آگاہ

فرماتا ہے، جو دل سے ایمان لائے ہیں، اور وہ اپنے اعضاء کے ساتھ نیک اعمال انجام دیتے ہیں، تو وہ بہترین مخلوق ہیں۔

نیز مفسر اسلام امام طبری رحمۃ اللہ علیہ آیت: "6 اور 7" کی تفسیر میں فرماتے ہیں؛ جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور آپ کی نبوت کا انکار کیا، یہود، مشرکین، اور عیسائیوں میں سے وہ سب "فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا" ○ ہمیشہ جہنم کی آگ میں ہوں گے، اس سے کبھی نہیں نکلیں گے، اور کبھی بھی ان کو موت نہیں آئے گی، "خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" احادیث نبوی میں: اس جملے "خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" کی مثال کے بارے میں محدثین نے متعدد احادیث نقل کی ہیں: ان میں سے ایک حدیث کی سند صحیح ہے، جبکہ دوسری احادیث کی اسناد ضعیف ہیں، یا ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اس سلسلے میں جو صحیح حدیث نقل کی گئی ہے وہ ہے جو امام مسلم نے اپنی صحیح میں انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ کہا: "جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ! فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَلِكَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ" صحیح مسلم (4367)۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور کہا: "يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ" اے مخلوقات میں سے بہترین انسان! "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تو ابراہیم علیہ السلام ہیں" (یعنی یہ ان کا لقب ہے) یہ حدیث صحیح ہے، امام مسلم کے علاوہ بہت سے محدثین نے اسے روایت کیا ہے، جیسے سنن أبی داود: (4672) اور علامہ البانی اسے اپنی "صحیح أبی داود" میں لائے ہیں، اور سنن ترمذی میں لائے ہیں، اور مسند احمد میں (12361 اور 12440) اور معجم الأوسط طبرانی (1436) اور "مسند أبی یعلی الموصلی: (3842) امام بیہقی نے بھی "دلائل النبوة" میں اسے نقل کیا ہے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات تواضع کی دلیل ہے)۔

ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈر گیا

جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا
أَبَدًا ○ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا
عَنْهُ ○ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ○

"جَزَاؤُهُمْ" ان کا تحفہ جنت ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، "جَنَّتُ عَدْنٍ" ایسے باغات جہاں قیام مستقل ہے، "عَدْنٍ" دائمی اور مستقل رہائش، ابدی، "رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ" اور ثواب اور بدلہ کی وجہ سے وہ بھی اللہ سے راضی ہیں، جنت کے باغوں کے درختوں کے نیچے بہتی نہریں ہیں جو ہموار اور ہرطرف بغیر باڑ کے بہتی ہیں اور ہرطرف پھیلی ہوئی ہیں۔

جنت میں چار نہریں بہتی ہیں :

- 1 - پانی
- 2 - دودھ
- 3 - شہد
- 4 - صاف مشروب

جنت میں کسی کو کوئی رنج و غم، پریشانی، بیماری نہیں ہوگی، اور ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ وہ بہترین نعمتوں میں ہے، کوئی حسد، بغض اور کینہ موجود نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ جنت والوں پر نعمت پوری کرنے کے بعد انہیں بلائے گا۔ اور فرمائے گا: کیا تم راضی ہو؟ جنتی جواب دیں گے: ہاں ہم مطمئن اور راضی ہیں (1) اللہ تعالیٰ کہے گا: میں بھی تم سے راضی ہوں اور رب کے چہرے سے پردہ ہٹ جائے گا، (2) اور جنتی لوگ، اللہ تعالیٰ کو چودھویں کے چاند کی طرح دیکھیں گے، (3) یہ ان لوگوں کا اجر ہے جو اللہ سے ڈرتے تھے، اور اس کی اس طرح عبادت کرتے تھے گویا کہ وہ اسے دیکھتے ہیں اور گناہ نہیں کرتے تھے، اگر مجموعی طور پر ہم سورة البينة کی تفسیر پر توجہ دیں، جیسا کہ ہم نے شروع میں کھاتھا، یہ سورہ زیادہ تر اہل کتاب کی مذمت اور سرزنش کرتی ہے، اہل کتاب میں سے وہ لوگ جو سورة البينة کے نزول کے بعد اپنے دین اور مذہب پر قائم رہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا، انہیں بدترین مخلوق کہا اور ان میں سے جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کو بہترین مخلوق قرار دیا۔

اس سورہ مبارکہ کی آخری آیت مؤمنین کی دائمی، ابدی اور ہمیشہ رہنے والی درج ذیل چار صفات کی طرف اشارہ کرتی ہے:

الف: خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ہونا۔

ب: جَنَّتُ عَدْنٍ، (ہمیشہ کی جنتیں) جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔

ج: ان کی ابدیت اس پر امن جگہ پر ۔

د: خدا تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اس کی نہایت مہربانی اور عمومی رحمت سے راضی (توبہ: 72)، (رعد: 23)، (نحل: 31) ۔

مذکورہ احادیث کا اختتامیہ

1 - "إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ لِأَهْلِ الْجَنَّةِ: يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ، فَيَقُولُونَ: لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ، فَيَقُولُ: هَلْ رَضِيتُمْ؟ فَيَقُولُونَ: وَمَا لَنَا لَا نَرْضَى يَا رَبِّ وَقَدْ أُعْطِينَا مَا لَمْ تُعْطِ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ، فَيَقُولُ: أَلَا أُعْطِيكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذَلِكَ، فَيَقُولُونَ: يَا رَبِّ وَأَيُّ شَيْءٍ أَفْضَلُ مِنْ ذَلِكَ، فَيَقُولُ: أَجَلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهُ أَبَدًا" (بخاری: 6549 ارو 7518) (ومسلم: 2829). "اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا کہ اے جنت والو! جنتی جواب دیں گے ہم حاضر ہیں اے ہمارے پروردگار! تیری سعادت حاصل کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ پوچھے گا کیا اب تم لوگ خوش ہوئے؟ وہ کہیں گے کیا اب بھی بھلا ہم راضی نہ ہوں گے، کیونکہ اب تو، تونے ہمیں وہ سب کچھ دے دیا، جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں تمہیں اس سے بھی بہتر چیز دوں گا، جنتی کہیں گے اے رب! اس سے بہتر اور کیا چیز ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اب میں تمہارے لیے اپنی رضامندی کو ہمیشہ کے لیے دائمی کردوں گا یعنی اس کے بعد کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا"۔

2 - "إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ، يَقُولُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: تُرِيدُونَ شَيْئًا أَزِيدُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوهَنَا؟ أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ، وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: فَيَكْشِفُ الْحِجَابَ، فَمَا أُعْطُوا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَى رَبِّهِمْ عَزَّ وَجَلَّ" (مسلم: 181) ترجمہ: "جب جنت والے جنت میں داخل ہو جائیں گے، (اس وقت) اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا تمہیں کوئی چیز چاہیے جو تمہیں مزید عطا کردوں؟ وہ جواب دیں گے: کیا تونے ہمارے چہرے روشن نہیں کیے! کیا تونے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور دوزخ سے نجات نہیں دی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چنانچہ اس پر اللہ تعالیٰ پردہ اٹھائے گا تو انہیں کوئی چیز ایسی عطا نہیں ہوئی ہوگی جو انہیں اپنی رب عزوجل کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو"۔

3 - "كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ، فَنَظَرْنَا إِلَى الْقَبْرِ لَيْلَةً - يَعْنِي الْبَدْرَ - فَقَالَ: إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ، كَمَا تَرَوْنَ هَذَا الْقَبْرَ، لَا تَضَامُونَ فِي رُؤْيَيْتِهِ، فَإِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لَا تُغْلَبُوا عَلَى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلِ غُرُوبِهَا فَافْعَلُوا. ثُمَّ قَرَأَ: " وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ " [ق: 39]، [بخاری: 554 و 573 و 4851 و 7434 و 7436 مسلم: 633] . "ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند پر ایک نظر ڈالی پھر فرمایا کہ تم اپنے رب کو (آخرت میں) اسی طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو اب دیکھ رہے ہو، اس کے دیکھنے میں تم کو کوئی زحمت بھی نہیں ہوگی، پس اگر تو ایسا کر سکتے ہو کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے والی نماز (فجر) اور غروب سے پہلی نماز (عصر) سے تمہیں کوئی چیز روک نہ سکے تو ایسا ضرور کرو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ، ترجمہ: "پس اپنے مالک کی حمد و تسبیح کر سورج طلوع ہونے اور غروب ہونے سے پہلے" ، (اور نماز قائم کرو)۔

اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو شک و شبہ سے پاک کر، ہماری آنکھوں کو روشن کر دے اور ہماری بصارت کو اتنا بڑھادے کہ ہم تیرے سوا کسی اور کی خواہش نہ کریں اور تیرے سوا کسی سے نہ ڈریں - آمین یا رب العالمین۔

خشیت کیا ہے ؟

"خشیت" اس ڈر اور خوف کو کہا جاتا ہے ، جو تعظیم اور عظمت کی بنیاد پر ہو، "خشیت" حقیقی سعادت اور ربندگی کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے کا معیار ہے، جو اس صفت سے محروم رہے گا وہ گناہ اور عصیاں سے باز نہیں آئے گا، اور اسی میں گم ہو جائے گا، (روح المعانی)۔

اس مبارک آیت میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جنت اہل خشیت کے لیے ہے، "ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ" ایک اور آیت کہتی ہے : کہ صرف علماء اہل خشیت

میں سے ہیں، "إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" ○ پس جنت علماء کے لیے ہے، دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ تمام علماء اور اہل علم جنتی نہیں ہیں، کیونکہ قرآن کریم نے اہل جہنم کی اکثریت ان لوگوں کو کہا ہے جو علم و معرفت کے بعد گمراہ ہو گئے تھے "وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ" (سورہ جاثیہ: 23) اور یہ بھی کہ تمام ناخواندہ اور آن پڑھ لوگ جہنمی نہیں ہیں، پس وہ علم جو "خشیت" کا سبب

بنتا ہے، وہ جنت میں لے جانے کا بھی سبب بنے گا، یہ اصطلاحی علم نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب فطری اور الہی فہم ہے جو دل کی روشنی کا سبب بنے۔

محبت اور خوف سے اللہ کی عبادت کرنا

بعض صوفیا مسلمان کہتے ہیں کہ ہم صرف اللہ کی محبت کے لیے عبادت میں مشغول ہیں، یہ عقیدہ عموماً گمراہ صوفیاء کے منہج سے آیا ہے، اور یہ طریقہ خود ساختہ ہے، کوئی شک نہیں ہے کہ خدا کی محبت سب سے بڑا درجہ ہے عبادت کے درجات میں، لیکن مکمل عبادت نہیں ہے، اہل سنت کا منہج یہ ہے کہ خدا کی عبادت، محبت، خوف، امید اور ڈر پر مبنی ہو (رجاء اور خشیت) اور تمام عبادات کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً" (سورہ اعراف: 55)۔ ترجمہ: "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے"۔

اور اپنے انبیاء کے بارے میں فرمایا: "إِنَّهُمْ كَانُوا يُسِرُّونَ فِي الْحَيَاتِ وَيَدْعُونََنَا رَغَبًا وَرَهَبًا" (سورہ انبیاء: 90) ترجمہ: "یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ ڈھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے"، اور فرمایا: "يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ" (سورہ نحل: 50) ترجمہ: "اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں" اسی طرح کی دیگر آیتیں جو اس بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

کافر اور مشرک کے درمیان فرق

لغوی اصطلاح میں لفظ "کافر" گفّر سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے "ڈھانپنا"؛ چونکہ "کافر" یعنی ڈھانپنے والا، ایمان کی حقیقت کو اپنے باطل عقیدے سے ڈھانپتا ہے، اس لیے اسے کافر کہاجاتا ہے، لغوی اصطلاح میں: مشرک کا لفظ "شُرک" سے ماخوذ ہے، کیونکہ ایک مشرک آدمی کسی دوسرے کو خدا کی عبادت میں شریک کرتا ہے۔

امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں کہتے ہیں: مشرک او رکفر کے ایک معنی بھی ہوسکتے ہیں، اور دو الگ الگ معنی بھی ممکن ہیں، شرک خدا کی

عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ بتوں یا دوسری مخلوقات کی عبادت کرنا بھی ہے، جیسے کفار قریش، پس یہاں کفر کا معنی زیادہ عام ہے بہ نسبت شرک کے۔

کفر کی دو قسمیں ہیں

1 - چھوٹا کفر جیسے مسلمان سے لڑائی کرنا، اگرچہ اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن یہ مسلمان کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سبب المسلم فسوق وقتاله کفر" (مؤمن کو گالم گلوچ کرنا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سے جنگ کو کفر قرار دیا، لیکن یہ کفر دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

2 - بڑا کفر، جیسے احکام الہی کا انکار کرنا وغیرہ، یہ کفر انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

شرک بھی دو قسم کا ہوتا ہے:

1 - چھوٹا شرک جیسے: دین میں ریا اور دکھلاوا، لیکن ریا کار اسلام کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ اَخُوْفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ: وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ قَالَ: الرِّيَاءُ" (روایت احمد رقم 27742) ترجمہ: درحقیقت جس چیز کا مجھے تم لوگوں پر سب سے زیادہ ڈر ہے وہ شرک "اصغر" ہے، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ریا اور دکھلاوا۔

2 - شرک اکبر جیسے اللہ کے ساتھ بتوں اور دیگر مخلوقات کی عبادت کرنا، کہ یہ شرک انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے، یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کافر مشرک ہے، اور ایک مشرک کافر، کیونکہ رب تعالیٰ قرآن کریم میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو کافر کہہ کر فرماتے ہیں: "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا" (ببینہ : 6) ترجمہ: "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں"

اور سورہ توبہ انہیں مشرک کہا گیا ہے: "وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ

ابْنُ اللَّهِ ۝ ذَلِكْ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۝ يُضَاهِيُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۝ قَتَلَهُمُ اللَّهُ ۝ أَتَى
يُوفِكُونُ ۝ ۳۰ ۝ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۝ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا
لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا ۝ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۝ سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ ۳۱ " (سورة توبه: 30 - 31)

ترجمہ: " اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں مسیح خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے، یہ بھی انہیں کی ریس کرنے لگے ہیں، خدا ان کو ہلاک کرے یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں، انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا خدا بنالیا، حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔"

پس مشرک کافر ہے، کیونکہ مشرک نے بھی خدا کی حقانیت اور وحدانیت کو شرک سے ڈھانپ دیا ہے، اور ایک کافر مشرک ہے، کیونکہ اس نے اپنے مزاج، خواہش اور ضمیر کو خدا بنالیا ہے، اور خدا کے بجائے اس کی عبادت کرتا ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "أَفَرَأَيْتَ مَنْ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ..... (سورة الجاثية: ۳۳) ترجمہ: "بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔"

تو اس کے نتیجے میں، جو شخص جان بوجھ کر لوگوں کے لیے حلال کو حرام یا حرام کو حلال بناتا ہے درحقیقت وہ کافر بھی ہے اور مشرک بھی۔

نواقض اسلام کیا ہے؟ :

اول: سب سے پہلے خدائے واحد کی عبادت میں شریک ٹھہرانا، اور اس کے لیے شریک مان لینا: رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۝ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ" (سورة المائدة: 72).

اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک میں سے ایک مُردوں سے دعا مانگنا اور ان سے مدد طلب کرنا بھی ہے، اسی طرح ان کے لیے نذر ماننا، ذبح کرنا اور قربانی کرنا بھی ہے۔

دوم: دوسرا وہ شخص جو اپنے اور خدا کے درمیان (وسیلہ) واسطہ بنائے، اور اس ثالث سے کچھ مانگے، (یعنی اپنی دعا اس ثالث کی طرف متوجہ

کردے) اور اس سے شفاعت طلب کرے، اور اس پر بھروسہ کرے، علماء و مشائخ کا اجماع اس کے کفر پر ہے۔

سوم: تیسرا وہ جو مشرکوں کو کافر نہ سمجھے، یا ان مشرکوں کے کفر میں اس کو شک و شبہ ہو، یا ان مشرکوں کے مذهب کو صحیح جانے وہ کافر ہے۔

چوتھا: یا کسی کا یہ ماننا ہو کہ اللہ کے رسول کے علاوہ کسی دوسرے کی ہدایت اور احکامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رہنمائی اور احکامات سے بہتر ہیں، یا یوں کہے: اللہ کے رسول کے علاوہ کسی دوسرے کا حکم اور فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فیصلہ سے بہتر ہے، ایسے لوگوں کی طرح جو طواغیت کے حکم اور فیصلہ (کسی ملک کے غیر شرعی قوانین) کو شرعی اور دینی قوانین پر ترجیح دیتے ہیں، یہ سب کے سب کافر ہیں۔

پانچواں: وہ شخص جس کو کسی ایسی چیز سے نفرت ہو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امت اسلامیہ کے لیے انسانی رہنمائی، فیصلے اور قرآن و سنت کے احکام کے لحاظ سے لائے ہوں، اگرچہ وہ اس حکم پر عمل کرتا ہو، لیکن اگر وہ اس سے نفرت کرتا ہے، تو پھر بھی وہ کافروں میں شامل ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاحْبَطُاْ عَمَلَهُمْ" (سورہ محمد: 9) (یہ اس لیے کہ بیشک انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے)۔

چھٹا: جو کوئی دین اسلام کے کسی حکم یا شعار کا مذاق اڑائے اور تمسخر کرے، وہ دین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے لائے ہیں، یا اس کے ثواب، اجر اور نیکی اور بدلہ، جزا و سزا، عذاب کا انکار کرے، اس کی دلیل رب تعالیٰ کا یہ قول ہے: "وَلَيِّنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ اَبَاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶۵ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۚ اِنْ تَعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۭۙ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۶۶" (التوبہ: 65-66) ترجمہ: "اگر آپ ان سے پوچھیں تو وہ کہیں گے ہم تو باتیں بنا رہے تھے اور کھیل رہے تھے تو آپ (ان سے) کہہ دو کیا تم اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کر رہے تھے؟ (65) بھانے مت بناؤ، بیشک تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔"

ساتواں: جادو اور سحر اور اس میں جو کچھ شامل ہے، دوسروں تک پھیلا نا، اور اس پر عمل کرنے والا یا اس پر راضی ہونے والا وہ کافر ہو گیا، اس کی دلیل رب تعالیٰ کا یہ قول ہے: "وَمَا يَعْلَمِينَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ" (سورہ بقرہ: 102) (حالانکہ وہ دونوں کسی کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ کہتے کہ ہم تو محض ایک آزمائش ہیں سوتو کفر نہ کر)۔

اٹھواں: مشرکوں کی پشت پناہی اور مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد کرنا، اس کی دلیل رب تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ" (سورہ المائدہ: 51) (اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا تو یقیناً وہ ان میں سے ہے، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا)۔

نواں: جو شخص یہ مانتا ہو کہ کچھ بزرگ شریعت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے انحراف کر سکتے ہیں وہ شخص کافر ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے: "وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ" (سورہ آل عمران: 85) (اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھائے والوں میں سے ہوگا)۔

دسواں: خدا کے دین سے منہ موڑنا اور اعراض کرنا، اسلام کو نہ سیکھنا، اور اس پر عمل نہ کرنا، اس کی دلیل رب کا یہ فرمان ہے: "وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا" (سورہ البقرہ: 22) (اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی، پھر اس نے ان سے منہ پھیر لیا، یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں)۔

ان تمام قسم کی مخالفتوں میں مبتلا کسی شخص کے سنجیدہ ہونے یا مذاق کرنے یا ان مخالفتوں کے انجام سے ڈرنے وغیرہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا، سوائے اس شخص کے جو مُکْرَہ یعنی اس کے کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، حالانکہ وہ اس برے عمل اور نافرمانی کرنے پر راضی نہ ہو، یہ سب خطرناک چیزیں ہیں جن میں لوگ ممکن ہے کہ مبتلا ہو جائیں، اس لیے ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے کہ ان سے خود کو بچائے، اور ان گناہوں میں مبتلا ہونے سے ڈرے ان سے اجتناب کرے اور ان سے دوری اختیار کرے۔

انسانی قوانین کو خدائی قوانین پر مقدم اور اس سے بہتر جاننا

ہم نے چوتھے ناقض میں بعض مسائل پر بحث کی ہے، لیکن میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موضوع کی وضاحت کے لیے درج ذیل اضافہ شامل کردوں، کوئی بھی شخص یہ مانتا ہو کہ ملک کے ریاستی اور سرکاری قوانین جو کہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں، یہ الہی اور آسمانی قوانین سے بہتر ہیں، یا یوں کہے کہ اسلام کا حکم "20" بیسویں صدی کے لیے ناقابل موزوں ہے، یا یوں کہے کہ قانون الہی (دین اسلام) نقصان کا سبب ہے اور ترقی میں رکاوٹ ہے، اور بیسویں صدی کے مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب ہے، یا یوں کہے کہ دین اسلام صرف خدا اور بندے کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا ذریعہ ہے، زندگی کے دیگر معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، پس جس کسی کا یہ عقیدہ ہو وہ کافر ہے۔

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ چور کا ہاتھ کاٹنا اور کسی شادی شدہ زانی عورت یا مرد کو سنگسار کرنا موجودہ دور کے لیے ناقابل قبول ہے وہ بھی کافر ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کے کلام کے مقابلے میں انسانوں کے کلام کو ترجیح دیتا ہے اور اسے بہتر سمجھتا ہے، چنانچہ اس کا یہ دعویٰ باطل ہے اور کفر کا باعث ہے۔

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خرید و فروخت اور سزاؤں کے معاملات میں حکم خداوندی کو چھوڑ کر علاوہ کسی اور طریقے پر فیصلہ کرنا جائز ہے، وہ کافر ہے، اگرچہ وہ یہ نہ مانے کہ یہ حکم خدا کے حکم سے بہتر ہے، کیونکہ اس عمل اور عقیدے کی رو سے (مسلمانوں کے اجماع کے مطابق) اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے، اسے وہ حلال سمجھتا ہے، اور ایسا کام کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اور اس کی حرمت واضح اور ظاہر ہے، جیسے: زنا، شراب نوشی، سود، قضاء اور قانون الہی کے علاوہ پر حکم کرنا، مسلمانوں کے اجماع کی رو سے وہ شخص کافر ہے (عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز)۔

لہذا جو بھی مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے، البتہ ایک اہم نکتہ مد نظر رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام کے خلاف ورزی کرنے والے کام کا ارتکاب کرے تو فوراً اس کی تکفیر نہیں کرنی چاہیے، بلکہ تکفیر کے اصول و ضوابط ہیں، اس میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، کہ لوگوں کی فوری تکفیر کرنے لگے، ہم ذیل میں تکفیر کی شرائط کا جائزہ لیں گے۔

تکفیر کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، اور جس شخص کے اسلام کے متعلق یقین حاصل ہو تو ہم شک کی بنیاد پر اس سے اسلام نہیں چھین سکتے ، جب تک کہ اس میں تکفیر کے شرائط مکمل نہ ہو چکی ہوں، اور اس کی رکاوٹیں نہ ہٹائی گئی ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بصیرت اور علم کے ساتھ دوسروں کو خدا کی طرف بلائے ، کسی کو بھی لوگوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے ؛ لہذا جو کوئی اپنی زبان سے شہادتین کہتا ہے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتا ہے، ظاہراً اس پر اسلام اور مسلمان ہونے کا حکم ہوتا ہے، جب تک کہ اس نے کوئی ایسا عمل یا قول نہ کیا ہو جو اسے دائرہ اسلام سے خارج کر دے، تب تک اسے خارج کرنا جائز نہیں، اس بات پر قرآن و سنت سے بھی واضح دلائل موجود ہیں، اور اس امت کے سلف صالحین کا بھی اس پر اجماع ہے۔

1۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَيُّمَا امْرَأَةٍ قَالَتْ لِأَخِيهِ يَا كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا إِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَإِلَّا رَجَعَتْ عَلَيْهِ" (جس نے اپنے بھائی سے کہا: اے کافر! تو دونوں میں سے ایک (کفر کے) اس (نسبت) کے ساتھ لوٹے گا، اگر وہ ایسا ہی ہے جس طرح اس نے کہا (تو ٹھیک) ورنہ یہ اس (کھنے والے) پر لوٹ آئے گا)۔

2۔ ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْكَفْرِ أَوْ قَالَ عَدُوَّ اللَّهِ وَلَيْسَ كَذَلِكَ إِلَّا حَارَّ عَلَيْهِ" (اور جس شخص نے کسی کو کافر کہہ کر پکارا یا اللہ کا دشمن کہا، حالانکہ وہ ایسا نہیں تھا تو یہ (الزام) اس (کھنے والے) کی طرف لوٹ جائے گا)۔

ان آیات اور احادیث کے مطابق جو بھی اپنے مسلمان بھائی کے خلاف بلاوجہ لفظ "کافر" استعمال کرتا ہے اسے سخت سرزنش کی گئی ہے، اور اسے اللہ کے بارے میں بغیر علم کے بات کرنے پر سخت تنبیہ کی گئی ہے۔

تکفیر سے دوری کے بارے میں سلف کے چند اقوال

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "درحقیقت قبول کرنا، حرام کرنا، ثواب دینا، سزا دینا، تکفیر کرنا، اور فاسق قرار دینا یہ خدا اور اس کے رسول کا حق ہے، کسی اور کو ایسا حکم لگانے کا حق نہیں ہے، لوگوں کو چاہیے کہ وہ عمل کریں جسے خدا اور اس کے رسول نے فرض کیا ہے، اور جو کچھ خدا

اور اس کے رسول نے حرام گردانا ہے اسے حرام سمجھیں، خدا اور اس کے رسول جو کچھ بتایا ہے اس کی تصدیق کریں۔"

آیات، احادیث اور سلف صالحین کے کلام سے ہم پر واضح ہوتا ہے کہ تکفیر شرعی احکام میں سے ہے، جس کا حکم قرآن اور سنت نبوی ﷺ کی طرف لوٹنا ہے، اور سلف صالحین کا منہج بھی یہی ہے، یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے اجتہاد، یا اپنی سوچ اور گمان سے یا صرف اپنی عقل کے فیصلے سے کسی کی تکفیر کرے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ: ایک مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اس معاملے میں بغیر علم، معلومات اور قرآن و سنت کی دلیل کے بغیر بات نہ کرے، کیونکہ کسی کو اسلام میں داخل کرنا یا خارج کرنا یہ دین کے سب سے برے امور میں سے ہے، اور اس معاملے میں ہمارے لیے دین کے دیگر امور کی طرح خدا اور رسول کافی ہیں، اس لیے عام طور پر اس مسئلے میں حکم دینا دین کے واضح احکام میں سے ایک ہے، توہم پر واجب ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی پیروی کریں، اور بدعت کی ایجاد سے اجتناب کریں۔

تکفیر کے ضابطے، یا قوانین

واضح ثبوت کے بغیر مسلمانوں کی تکفیر کے معاملے کی حرمت بیان کرنے کے بعد اب ہمیں تکفیر کے اصول جاننے کی ضرورت ہے۔

اس معاملے میں ہمیں دو اہم اور بنیادی اصولوں کا علم ہونا چاہیے

1۔ وہ شخص جس نے کوئی ایسی بات کہی یا عمل کیا جو قرآن و سنت کے نصوص کے مطابق کفر ہے، لیکن موانع کی موجودگی اور شرائط نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تکفیر کا حکم جاری نہیں کیا جائے گا، اس لیے اگر کسی مسلمان سے کوئی کفریہ قول یا عمل سرزد ہو جائے تو حجت قائم کرنے اور شک و شبہ دور کرنے کے بغیر اس کی تکفیر کا حکم صادر نہیں ہوگا اور وہ شخص اسلام کے دائرے سے خارج نہیں ہوگا۔

اہل بدعت میں سے، خوارج، روافض، قدریہ اور جہمیہ نے اس قاعدے کی مخالفت کی ہے اور وہ حجت قائم کیے بغیر اور شبہ دور کیے بغیر تکفیر کرتے ہیں، بلکہ اپنے مخالفین کو کسی قول یا کفریہ عمل کے سزد ہوئے بغیر تکفیر کر دیتے ہیں۔

2 - یہ ہے کہ کوئی بھی ایسا گناہ جسے کفر کھاجاتا ہے کسی شخص کو ائره اسلام سے خارج نہیں کرتا، کیونکہ کفر کی دو قسمیں ہیں، کفر اصغر اور کفر اکبر، اس لیے بعض گناہوں کو کفر کھاجاتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ کسی شخص کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اِثْنَتَانِ فِي النَّاسِ هُمَا بِهِمَا كُفْرٌ الطَّعْنُ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ" (لوگوں میں دو باتیں ہیں، وہ دونوں ان میں کفر (کی بقیہ عادتیں) ہیں: (کسی کے) نسب پر طعن کرنا اور میت پر نوحہ کرنا)۔

اہل سنت و جماعت کا اجماع ہے کہ یہ دونوں کبیرہ گناہ آدمی کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتے، بلکہ کفر دُون کفر یا کفر اصغر ہیں، ان دو اصولوں اور دلائل کے بعد جو اس بارے میں ذکر کیے گئے اب لازمی ہے کہ وہ شروط اور موانع جو علماء نے اس بارے میں ذکر کیے ہیں جان لیں۔

تکفیر کی شروط اور موانع

تکفیر کی شرائط کو قرآن و سنت پر پرکھنے اور تحقیق کرنے سے اور اسلام کے نصوص کو مد نظر رکھنے سے ذیل کی صورتیں بنتی ہیں۔

1 - اس سے کفر آمیز عمل یا قول سرزد ہو جائے، خواہ وہ اسلام کا دعویٰ کرے۔

2 - حق کی وضاحت اور اس کے شبہ کو دور کرنے کے لیے اس کے پاس حجت اور دلیل پہنچ چکی ہو، اگر یہ حجت اہل علم اور صاحب رائے کا قول ہو تو اس کے پاس ثابت شدہ ہو۔

3 - بالغ اور عاقل ہو۔

4 - نو مسلم ہونے کی وجہ سے لاعلمی کا عذر نہ ہو۔

5 - مجبور نہ کیا گیا ہو۔

6 - صحرامیں رہنے کی وجہ سے علم اور اہل علم سے دور اور بے خبر نہ ہو۔

حکم تکفیر کے موانع

تکفیر کی شرائط جاننے کے ساتھ موانع تکفیر بھی جاننا ضروری ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

1 - جو بات قولی یا عملی کفر کا سبب بنتی ہے وہ اس میں ظاہر نہ ہو۔

2 - اس پر کوئی دلیل اور حجت قائم نہ ہوئی ہو، اب یاتو اس کے بلوغ تک نہ

پہنچنے کہ وجہ سے ، یا اس کے دل میں شبہ کی موجودگی کی وجہ سے
یا اسلامی ملک سے دوری کے سبب لا علمی کا شکار ہو ۔

3- بچہ ، پاگل یا ایسا بوڑھا نہ ہو کہ جو نہیں جانتا کہ وہ کیا کھ رہا ہے۔

4- اس چیز سے لاعلمی جن کی وجہ سے حجت قائم کی جاتی ہے ، جیسے کہ

اہل علم میں سے کوئی شخص نہ پایا جائے جو اسے دلیل و حجت فراہم کرے، یا یہ اپنے اس کفر سے معذور ہو، جیسے: وہ شخص جو صحرا میں رہتا ہو یا ابھی مسلمان ہوا ہو اور اسے شریعت کے احکام علم نہ ہو۔

5- کفریہ بات کہنے یا کام کرنے پر مجبور ہونا، جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

"إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ" (سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے، اور

اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو) یہ صورتیں تکفیر کے چند احکام، شرائط اور موانع ہیں، جنہیں علماء کرام نے بیان کیا ہے، لہذا ان کی پابندی اور ان کو مدنظر رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، (اور کسی کی تکفیر میں توقف کرنا ضروری ہے) علم کے بغیر مسلمانوں کے بارے میں حکم لگانے میں اکثر لوگوں کی جلدبازی کی وجہ سے فتویٰ تکفیر لگادیتے ہیں، حالانکہ زمانے میں بہت سے لوگ فتنوں کا شکار اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ علماء سے دور ہوتے ہیں یا لاعلمی ہوتی ہے یا ان کے دل میں شک شبہ ہوتا ہے، چنانچہ ان کی تکفیر کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

اس عظیم فتنہ سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کی طرف پلٹ آئیں، اور خدا کی رسی اور قرآن و سنت سے چمٹ جائیں، اور علماء سلف اور مصححین کی پیروی بھی رہنما ہے، عمر بن عبدالعزیز کہتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور گورنروں اور امیروں نے جو روایات قائم کیں، انہیں مضبوطی سے پکڑنا، خدا کی کتاب کی تصدیق کرنا، خدا کی اطاعت کی تکمیل اور خدا کے دین کو مضبوط کرنا ہے، کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کو بدلے، اور اس کے مخالف رائے رکھے، جو اس کے ذریعہ ہدایت پاتا ہے وہ ہدایت یافتہ ہے، اور اس کے ذریعے مدد طلب کرتا ہے، اس کی مدد کی جاتی ہے، اور جو اس کی مخالفت کرتا ہے اور غیر کی راہ پر چلتا ہے، خدا نے اس سے منہ موڑ لیا ہے، اور اسے جہنم میں بھیج دے گا، بہت ہی برا انجام ہے۔

اب اگر کوئی کفر کرے اور شرائط پوری ہو جائیں، اور امواع بھی نہ ہوں تو اس صورت میں کافر ہوگا، اور اسے توبہ کرنی چاہیے، اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے ارتداد کی حد کے طور پر قتل کر دیا جائے گا، اور ان احکام کو اسلامی حکمران کے ذریعہ انجام دیا جائے، شہریوں کے ذریعہ نہیں،

اور اگر کوئی شروع سے کافرتھا، اس پر اس ایمان نہیں تھا، تو وہ اصل کافر کہلاتا ہے، مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین کا پیغام اس تک پہنچائیں، اور اس کو اللہ تعالیٰ سے آگاہ کریں، باخبر رکھیں، اور اسے جہنم کی آگ سے ڈرائیں، جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے تیار کر رکھی ہے، اور دوسری طرف جنت کی نعمتوں کی بشارت دیں، اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں، اور اگر وہ ایمان نہ لائے تو اس کے ساتھ کافر جیسا سلوک کیا جائے، مثلاً: مسلمانوں کا حق یہ ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں اور بیویوں کی شادی کافروں سے نہ کریں، اور کافر ورثہ کو وراثت میں حصہ نہ دیں وغیرہ۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة زلزلة

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی ، اس کی آٹھ آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کو قیامت کے آنے سے پہلے شدید زلزلے کے ذکر کے ساتھ شروع ہونے کی وجہ سے زلزلہ یا زلزال کہاجاتا ہے، یہ سورۃ النساء کے بعد نازل ہوئی ہے۔

سورة الزلزال کا ربط و مناسبت سورة البينة کے ساتھ

سورہ بینہ میں مؤمنوں کے لیے جن انعامات اور کافروں کے لیے عذاب پر بحث کی گئی ہے، اس سورت میں یہ بتادیا گیا کہ: اب وہ وعدہ اور اس کے اثرات آچکے ہیں، سفید چہرے اور سیاہ چہرے اس دن کسی کا چہرہ ڈھکا چھپا نہیں ہوگا (سورہ آل عمران: ۱۰۶ اور ۱۰۷)۔

یہ سورہ بنیادی طور پر تین محوروں کے گرد گھومتی ہے: پہلے مرحلے میں "اشرط السّاعة" قیامت کی نشانیوں سے بحث شروع ہوئی ہے، جو انسانوں کے تمام اعمال کے بارے میں بتاتی ہے۔

دوسرے حصے میں، لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرنا، "اچھے" اور "برے" اور یہ کہ ہر شخص اپنے اعمال کا پھل حاصل کرے گا۔

اس سورت کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

اس سورت کا ایک (۱) رکوع، آٹھ (۸) آیتیں، سینتیس (۳۷) الفاظ، ایک سو اٹھاون (۱۵۸) حروف اور تیریا سی (۸۳) نقطے ہیں۔

(یادر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة الزلزال کے نزول کا وقت

سورة "زلزلہ" مکی ہے یا مدنی اس میں علماء کا اختلاف ہے، ابن سعود، عطاء، جابر اور مجاہد کہتے ہیں: یہ سورت مکی ہے، اور ابن عباسؓ کا ایک

قول بھی اس کی تصدیق کرتا ہے، قتادہ اور مقاتل کہتے ہیں: یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی ہے، ابن عباسؓ کا ایک اور قول اس کے مدنی ہونے کی تصدیق میں نقل ہوا ہے، اس کے مدنی ہونے پر ابو سعید خدریؓ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو کہ ابن ابی حاتم نے ان سے نقل کی ہے کہ جب "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ" وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" آیتیں نازل ہوئیں تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں اپنے سارے اعمال دیکھ سکوں گا؟ فرمایا: ہاں! پھر میں نے عرض کیا اور چھوٹے چھوٹے گناہ بھی؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ پس میں تو ہلاک ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابو سعید! مایوس نہ ہو، ہر نیکی اپنی طرح دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے، اس سورت کے مدنی ہونے کے بارے میں اس حدیث سے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ ابو سعید خدریؓ اہل مدینہ میں سے تھے، اور وہ غزوہ احد کے بعد بلوغت کی عمر کو پہنچے تھے۔

لہذا اگر یہ سورہ اس وقت نازل ہوئی جب وہ بطور مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جیسا کہ ان کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے تو یہ سورت مدنی ہونی چاہیے۔

سورت کا سبب نزول

سورہ "زلزال" کے نزول کی وجہ یہ تھی کہ کفار نے قیامت اور حساب کے بارے میں بہت کچھ پوچھا اور کہا: "أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ"، (قیامت کا دن کب ہے؟) (سورہ القیامہ: 6) اور اسی طرح کے دیگر سوالات تھے اس بارے میں، چنانچہ اس سورہ میں خدا تعالیٰ نے ان سے قیامت کی نشانیوں کے بارے میں بات کی، نہ کہ اس کے وقت کے بارے میں، تاکہ وہ جان لیں کہ قیامت کا علم صرف اسی کے پاس ہے، اس کا وقت معین کرنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

سورہ زلزال کی فضیلت

اس سورت کی فضیلت کے بارے میں احادیث موجو دہیں جن میں سے درج ذیل حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے ایک آدمی سے فرمایا: اے فلاں! کیا تم شادی شدہ ہو؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پاس شادی کے لیے کچھ نہیں ہے، آپ نے پوچھا:

کیا "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" تیرے پاس نہیں ہے؟ کہا: کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ سورہ قرآن کا "ثَلَاث" ایک تہائی حصہ ہے، فرمایا: "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ" تیرے پاس نہیں ہے؟ کہا: کیوں نہیں، فرمایا: یہ سورہ بھی قرآن کا رُبْع ہے، فرمایا: "إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا" تیرے پاس نہیں ہے؟ کہا: کیوں نہیں، فرمایا: یہ سورہ بھی قرآن کا چوتھائی حصہ ہے، پھر فرمایا تم شادی کرلو۔

اسی طرح دوسری حدیث میں: حضرت انس اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورہ "زلزال" قرآن کا آدھا حصہ ہے، اور "اخلاص" قرآن کا ایک تہائی حصہ ہے، اور "کافرون" قرآن کا چوتھائی حصہ ہے، (رواہ النسائی وابن ماجہ)۔

سورہ زلزال کا پیغام

- 1- قیامت کے موقع پر زمین میں ایک بڑے زلزلے کا آنا قطعی اور لازمی بات ہے، "إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا" (کیونکہ لفظ "إذا" اس معاملے میں استعمال ہوتا ہے جو یقینی ہو)۔
- 2- قیامت جسمانی ہے، صرف روحانی نہیں ہے (انسانی جسم جو زمین میں دفن ہیں، وہ قیامت کو نکلیں گے) "أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا"۔
- 3- قیامت انسان کے لیے حیرت کا دن ہے، "قَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا"۔
- 4- زمین بھی شعور رکھتی ہے: "يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا"۔
- 5- زمین قیامت کے گواہوں میں سے ہے: "يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ"۔
- 6- قیامت میں ہر قسم کے انکار کا راستہ بند ہے، "لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ"۔
- 7- خدا کے انصاف کی عدالت میں تمام لوگ برابر ہیں، "فَمَنْ يَعْمَلْ..... وَمَنْ يَعْمَلْ"۔
- 8- عذاب اور انعامات اللہ کی طرف سے عمل پر منحصر ہیں۔
- 9- عمل چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اس کا بھی حساب و کتاب ہے؛ لہذا نہ گناہوں کو چھوٹا سمجھیں اور نہ عبادت کو "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ"۔
- 10- اس دن عمل مجسم کو دیکھنا خود عذاب یا لذت ہے۔

سورة الزلزال کے مشتملات

عام طور پر اس سورت میں جن موضوعات کو زیر بحث یا گياھے وہ ہیں: قیامت کے وقت زمین پر ہولناک زلزلے کا واقع ہونا، جس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے وقت اور شدید زلزلہ آنے کے ساتھ زمین اپنا بوجھ با ہر پھینک دے گی، وہ بوجھ جو بہت سے مفسرین کے مطابق تو لوگوں کی وہ بڑی تعداد ہے، جو قبروں سے اٹھے گی، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن انسان واقعات کی وجہ دریافت کرے گا، اس حقیقت کی صراحت یہ ہے کہ زمین اپنا سب کچھ بتادے گی، اس عظیم دن کی خبریں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس دن کے واقعات خدا کی طرف سے ہیں، انسان مختلف گروہوں کی شکل میں قبروں سے زندہ ہو کر اٹھیں گے، اس دن کے انسانی اعمال کا صحیح حساب ہوگا اور یہ کہ ہر کوئی اپنے عمل کو یہاں تک ایک ذرہ کے مطابق ہو ان کے نتائج دیکھ لے گا۔

سورہ مبارکہ کے اہم ترین محوروں میں سے ایک "زلزلہ" ہے، یہ قیامت کے دن کے وحشت ناک زلزلے کی طرف اشارہ ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پہلی صور ہے، اس دن ان واقعات سے لوگ حیران رہ جائیں گے، سورة الزلزال کے اس حصہ کا پیغام یہ ہے کہ اس دن کے آنے سے پہلے مؤمنین کو چاہیے کہ وہ خود کو قیامت کے محشر پر حاضر ہونے کے لیے تیار کر لیں، سورہ زلزال کے دوسرے حصے میں قیامت کے دن انسان کے اپنے اعمال کے بارے میں بتایا گیا ہے، درحقیقت قیامت کا حساب بہت درست ہوگا، پس انسانوں کو اپنے اعمال کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔

یہ سورت زمین کو اعمال کے گواہوں میں سے ایک کے طور پر متعارف کراتی ہے اور سورہ زلزلہ اپنے مخاطبین پر بہت اچھا اثر چھوڑتی ہے، کیونکہ اگر کوئی اس حقیقت کی طرف توجہ کرے کہ جس زمین پر وہ کھڑا ہے اور اس کے ارد گرد موجود درخت، پہاڑ اور دیگر چیزیں اس کی تمام حرکات و سکنات کو جاگتی آنکھوں کی طرح محفوظ کر رہی ہیں۔

اور ایک دن وہ اس کے خلاف گواہی دیں گی تو، وہ اپنے آپ کو کبھی تنہا نہیں سمجھے گا اور کبھی گناہ کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ سورة زلزله

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۝ لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝	جب نفخہ اولیٰ میں زمین پوری شدت سے اور مسلسل ہلا دی جائے گی
وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝	اور زمین اپنے اندر کا بوجھ نکال باہر ڈال دے گی
وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝	اور انسان کہے گا اس کو کیا ہو گیا ہے ؟
يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝	اس روز وہ اپنے حالات بیان کرے گی
بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝	اس لیے کہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہے
يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۝ لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝	اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھادیے جائیں
فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝	تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا
وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝	اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا

سورة زلزله کی تفسیر

اس سورہ کی مبارک آیات میں ؛ قیامت کی آمد کی نشانیاں ، نیکی اور بدی کا بدلہ جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے ۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝	جب نفخہ اولیٰ میں زمین پوری شدت سے اور مسلسل ہلا دی جائے گی

جب زمین سختی سے جھٹکے کھائی گی اور پوری طرح ہلائی جائے گی اور اس کے پہاڑیاں تتر بتر ہوجائیں گے، اور اسکے ٹیلے ہموار ہوجائیں گے، اور زمین بغیر فراز و نشیب کے صاف چٹیل میدان بن جائے گی۔

اور زمین اپنا بوجھ اتار دے گی اور انسان خود سے کہے گا کہ : زمین کو کیا ہو گیا ہے ؟ (یوں زمین کانپے گی) اس دن زمین اپنی خبریں سنائے گی ، کیونکہ تمہارے رب نے اس کو وحی بھیجی ہے ، اس دن لوگ بکھرے انداز میں قبروں سے نکلیں گے ، تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں ، پس جس نے ذرہ بھر نیکیاں کی ہو اسے دیکھ لے گا ، اور جس نے ذرہ بھر برائیاں کی ہو وہ اسے دیکھ لے گا۔

"إذا... قیامت کے شدید زلزلہ کی طرف اشارہ ہے ، (مراجعہ کیا جائے : (سورہ حج : ۱)

لفظ " زلزلت " یعنی : وہ شدت سے لرز گیا اور پریشان ہوا، زمین اپنے اس بڑے زلزلے سے بہت زیادہ غیر متوازن ہوجائے گی ، جو اس کا آخری جھٹکا ہوگا ، یہ قیامت کے زلزلے کی نوعیت ہے ، دنیا کے زلزلے اس کی چھوٹی اور محدود مثالیں ہیں۔

" زلزالها " وہ زلزلہ جو زمین کے ساتھ مخصوص ہے ، اور کس طرح ہے اور کتنا شدید ہے رب عظیم کو معلوم ہے ، سورہ کا آغاز زمین پر آنے والے زلزلے کی خبر سے ہوتا ہے ، جو دنیا کے زلزلوں سے مختلف ہوگا ، کیونکہ دنیا میں زلزلہ عارضی اور قلیل مدتی ہوتا ہے ، اور اس سے جو نقصان ہوتا ہے وہ وقتی اور مقامی ہوتا ہے ، لیکن قیامت کا زلزلہ مکمل اور بڑی شدت اور مکمل مربوط نقصان کے ساتھ ہوگا ، انسان اس وقت مدبوش لوگوں کی طرح ہوں گے ، جب کہ وہ مدبوش نہیں ہوں گے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ " (الحج : ۲) (اور تم لوگوں کو مدبوش دیکھو گے ، جب کہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے)۔

روایات اور بہت سی تفاسیر اور علما اسلام کی تشریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ : مد فون چیزیں پہلے نکلیں گی ، لیکن یہ ممکن ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے جو چیزیں باہر نکلیں ، وہ وقت کے ساتھ ساتھ زمین کے نیچے

دب جائیں اور پھر قیامت کے دن باہر نکل آئیں، قیامت کے دن شاید مدفون چیزوں کے ظاہر ہونے کی حکمت یہ ہے کہ دولت کے چاہنے والے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مال و دولت بیکار ہے، اور انسان (کافر یہ صورت حال دیکھ کر) کہے گا کہ کیا ہوا ہے کہ زمین اس طرح لرز رہی ہے وہ تمام اچھی اور بری باتوں کا اظہار کرے گی، کیونکہ اس کو عظیم رب کی ہدایت اور حکم اسی طرح ہوگا۔

ترمذی اور دیگر کتب احادیث میں مرفوع حدیث ہے کہ جس نے زمین پر کوئی عمل کیا ہو، وہ عمل اچھا ہو یا برا، زمین اسے ایک ایک کر کے بیان کرے گی، اور یہ اس کی دلیل اور گواہی ہے، اس دن لوگوں کے مختلف گروہ بن کر (حساب و کتاب کی جگہ) آئیں گے، جو لوگ حساب سے فارغ ہو چکے ہوں گے وہ حساب کی جگہ سے واپس آجائیں گے، کچھ جنتی اور کچھ دوزخی، جنتی جنت میں جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں جائیں گے، تاکہ وہ اپنی حیثیت دیکھ سکیں، پس جس نے دنیا میں ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا، بشرطیکہ اس وقت تک برائی اور خیر باقی رہے، ممکن ہے کہ کفر کی وجہ سے نیکی ضائع ہو جائے، یا ایمان اور توبہ کی وجہ سے برائی معاف ہو جائے، یہ اس میں شامل نہیں ہوگا، کیونکہ نہ باطل شدہ نیکی نیکی کہلائے گی اور نہ معاف کی گئی برائی برائی رہے گی اس حشر کے میدان میں وہ سامنے نہیں آئیں گی۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے وقت اور اس کی نشانیوں میں سے ایک کے بارے میں فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی حتیٰ کہ علم اٹھا لیا جائے گا، زلزلے بکثرت آئیں گے، وقت کم ہوتا جائیگا، فتنوں کا ظہور ہوگا اور قتل و غارت عام ہوگی یہاں تک کہ تمہارے ہاں مال و دولت کی بہتات ہوگی، یعنی وہ عام ہو جائے گی۔ (بخاری: حدیث نمبر ۹۸۹)

قیامت کے اس بڑے زلزلے کے تصور کو سورہ حج کی آیت کافی حد تک مزید واضح کرتی ہے، وہ یوم جزا جس میں اللہ سبحان و تعالیٰ نے کفار کو عذاب دینے کا وعدہ کیا ہے اور فرمایا ہے: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ ۖ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ" (سورہ الحج) ترجمہ (اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، بیشک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے)

اور زمین اپنے اندر کا بوجھ نکال باہر ڈال دے گی

وَآخَرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝

اور زمین اپنے اندر کے خزانوں اور مردوں کو دوسرے نفخہ میں باہر پھینک دے گی ، زمین کے بوجھ سے مراد انسان ہے ، وہی فرض شناس مخلوق مراد ہے جو زمین و آسمان کے برابر وسیع جنت کے لیے پیدا کی گئی ہے ، وہ کافی وزنی اور بھاری ہے ، کیونکہ اس نے امانت کو قبول کیا ہے ، اور خدا نے زمین اور آسمان کو اس کے لیے مسخر کر دیا ہے ، اور اسے زمین پر اپنا جانشین بنایا کہ اگر اس کی عقل اس کی خواہش پر غالب آجائے تو فرشتوں سے افضل ہے ، اور اگر اس کی ہوس اس کی عقل پر غالب آجائے تو یہ جانوروں سے بھی کمتر ہے ۔

امام طبری اپنی تفسیر کی جلد : ۳۰ صفحہ : ۲۶۵ پر لکھتے ہیں : زمین تمام مردوں کے جسموں کو زندہ شکل میں پھینک دے گی ، اور زمین کے اندر موجود مردے اس پر بھاری پڑ جائیں گے ، ابن عباسؓ نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ : وہ اپنے اندر موجود مردوں کو نکال دے گی ، اور منذر ابن سعید فرماتے ہیں : یعنی اپنے پیٹ میں مدفون مردے باہر نکالے گی ، (الوسی : 30/209) ابن کثیر نے اپنی تفسیر کی جلد : 4، صفحہ 540 میں لکھا ہے : (یعنی مردوں میں سے جو کچھ زمین میں ہے اسے باہر پھینک دے گی ، سلف میں سے کئی لوگوں کی یہی رائے ہے) مسلم اور ترمذی کی حدیث شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا : "تلقى الأرض أفلاذ كبدها أمثال الاسطوان من الذهب والفضة فيجىء القاتل فيقول: في هذا قتلت، ويجىء القاطع فيقول: في هذا قطعت رحى ويجىء السارق فيقول: في هذا قطعت يدي، ثم يدعونه فلا يأخذون منه شيئاً"۔

ترجمہ : " زمین اپنے جگر کے ٹکڑے سونے اور چاندی کے ستونوں کی صورت میں اگل دے گی تو قاتل آئے گا اور کہے گا کیا اس کی خاطر میں نے قتل کیا تھا ؟ رشتہ داری توڑنے والا آکر کہے گا : کیا اس کے سبب میں نے قطع رحمی کی تھی ؟ چور آکر کہے گا : کیا اس کے سبب میرا ہاتھ کاٹا گیا تھا ؟ پھر وہ اس مال کو چھوڑ دیں گے ، اور اس میں سے کچھ نہیں لیں گے " یہ بات قابل ذکر ہے کہ زمین دوسرے نفخہ میں مردے باہر پھینک دے گی ، "اثقال " ثقل کی جمع ، بھاری بوجھ ، اس سے مراد تمام لاوا ، مدفون چیزیں ، خزانے اور مردے اور ان کے علاوہ ہیں جنہیں زمین قیامت کے دن باہر پھینکے گی ، جیسا کہ سورہ انشقاق کی آیت "4" میں فرماتا ہے : وَالْقَتْمَ مَا فِيهَا

وَتَحُلَّتْ ۝ (اسی طرح ملاحظہ ہوں سورہ : عنکبوت آیت "3" اور سورہ نحل : 7)

وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝	اور انسان کہے گا اس کو کیا ہو گیا ہے ؟

انسان کا یہ کہنا حیرت اور خوف سے ہے ، : الْإِنْسَانُ : ایک انسان جو زمین کے غیر معمولی جھٹکے اور خوفناک تبدیلیوں کو دیکھے گا ، تو وہ اپنے آپ سے کہے گا "مالہا" زمین پر کیا گزر رہی ہے ؟ اسے کیا ہو گیا ہے ، زمین پر کونسی آفت آئی ہے ، کونسی مصیبت میں گرفتار ہے ، جو اتنے زور سے ہل رہی ہے ، اور اپنے پیٹ میں موجود ہر چیز کو باہر پھینک رہی ہے ؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سوال کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا ، البتہ مومن آدمی اس کا علم اور آگاہی رکھتا ہے ، کیونکہ یہ اس کے عقیدے کا حصہ ہے ، اکثر مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس دن کے خوف و ہراس کو سمجھتے ہیں لیکن مومن نہیں ہیں اور قیامت کی نشانیاں صرف روئے زمین کے بدترین لوگوں کے لیے ظاہر ہوں گی ، اور اہل ایمان اور وہ بھی جن کے دلوں میں ذرہ بھر بھی ایمان ہے صحیح حدیث کے مندرجات کے مطابق قیامت سے پہلے ان کی جان ہوا کے جھونکے سے لی جائے گی ، اور وہ قیامت کا خوف و ہراس محسوس نہیں کریں گے ، اور جب وہ بیدار ہوں گے تو موجودہ حالات سے حیران نہیں ہوں گے ، کیونکہ (مومنین) سے اس دنیا میں وعدہ کیا گیتا تھا ، کہ ایسا ہی کچھ ہوگا ، جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے : "يَبْعَثُ اللَّهُ رِجًا كَرِيحٍ الْبَسَاطِ مَسَّهَا مَسُّ الْحَرِيرِ ، فَلَا تَذَرُكَ نَفْسًا فِي قَلْبِهِ مَثْقَالُ حَبَّةٍ مِنَ الْإِيمَانِ إِلَّا قَبَضَتْهُ ، ثُمَّ يَبْقَى شَرَارُ النَّاسِ عَلَيْهِمْ تَقُومُ السَّاعَةُ (مسلم: 1924 اور 2937 اور 2940)"

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝	اس روز وہ اپنے حالات بیان کرے گی

اس دن جو قیامت کا آغاز ہے ، زمین اپنے باشندوں اور اپنے لوگوں کے اچھے ، برے اعمال کی خبریں بہ زبان حال و قال بتائے گی ، کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔

"يَوْمَئِذٍ" : اس دن "إذا" سے بدل ہے ، "تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا" اس دن زمین اپنے مالک کو اپنی اچھی اور بری خبریں سنائے گی ، یہ بولنا اور بیان کرنا یا تو بہ زبان حال و قال ہے (یعنی زبان کے ذریعہ الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ)

اور زمین انسانی اعمال کی گواہ اور دیکھنے والی ہے ، یا یہ کہ بہ زبان حال ہوگا، یعنی اس وقت زمین کی جو حالت ہوگی وہ ہرچیز بیان کرے گی۔

اور اس دن صحیح اور غلط ظاہر ہو جائیں گے ، "أَخْبَارَهَا" زمین کی خبریں ، وہ کیفیت اور حالات جو اس وقت آنکھوں کے سامنے نظر آئیں گے ، یا اس پر لوگوں نے جو اعمال کیے تھے ، اب یہ اس کی گواہی دے گی ، کیونکہ دنیا میں ہرچیز لکھا ہوا محفوظ ہے ۔

واضح رہے کہ انسانی اعمال کے گواہوں میں سے ایک گواہ زمین بھی ہے ، زمین پر انسان جو کچھ بھی کرتا ہے ، خواہ برا ہو یا اچھا ، زمین اس کی گواہی دے گی ، اس نے جو کچھ بھی کیا ہے چاہے اطاعت ہو یا نافرمانی۔

حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت : "يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا" کی تلاوت کی ، اور فرمایا: کیا تم جانتے ہو زمین کی خبریں کیا ہیں؟ انہوں نے کہا: اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی خبر یہ ہے کہ وہ ہر ایک مرد اور عورت کے کیے کی گواہی دے گی ، کہ اس پر کیا عمل انجام دیے گئے تھے ، اور کہے گی کہ: فلان نے فلان دن فلان کام کیا تھا، اس کی خبریں اس طرح کی ہوں گی" (ترمذی نے اس کو روایت کیا اور کہا ہے: یہ حسن صحیح ہے ۔

دوسری حدیث میں آیا ہے: زمین سے بچو اور شرم کرو ، کیونکہ زمین تمہاری ماں ہے ، اور زمین پر جو کوئی اچھا یا برا کام کرتا ہے ، وہ اس کے متعلق خبر دے گی (طبری نے اسے معجم میں روایت کیا ہے)۔

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝	اس لیے کہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہے

کہ وہ کیا سنے اور کیا کہے ، اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے زمین کو بولنے کے قابل بنایا اور کلام کا حکم دیا ، "بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا" باء ، سببیہ ہے ، "أَوْحَىٰ" پیغام بھیجا ، حکم دیا (رجوع کریں ، سورہ نحل : 67) تا کہ اس پر پیش آنے والے تمام واقعات بیان کرے ، پھر نافرمان اور گنہگار کی شکایت کرکے اس پر گواہی دے گی ، اور مطیع و فرمانبردار کا شکریہ ادا کر کہ اس کی تعریف کرے گی۔

اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے تاکہ
ان کو ان کے اعمال دکھادیے جائیں

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا ۝
لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝

اس دن لوگ بکھرے ہوئے نکلیں گے اور محشر میں جائیں گے، تاکہ اپنے اعمال کے نتائج دیکھ لیں، یعنی: ایک ایک کر کے، الگ الگ، بغیر اجتماع کے، ہم خیال، ساتھی، دوست، شور و غل، جھگڑا اور تکبر کے بغیر، اس حقیقت کے باوجود کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورہ یاسین کی آیت "65" میں بیان کیا ہے: "آج ہم ان کے منہ پر مہر لگائیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے، ان کے پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔"

"يَصْدُرُ": قبر سے باہر آئیں گے، "أَشْتَاتًا" شتیت کی جمع، بکھرے ہوئے، اس سے مراد گروہ، گروہ اور ایک ایک فرد ہے، اور یہ حال ہے، علماء کی رائے کے مطابق "أَشْتَاتًا" شتیت کی جمع، بکھرے ہوئے، اس سے مراد گروہ، گروہ اور ایک ایک فرد ہے، اور یہ حال ہے، علماء کی رائے کے مطابق "أَشْتَاتًا" تین معنوں میں استعمال ہوا ہے:

1- منتشر اور اکیلا، کچھ دائیں طرف جا اور کچھ بائیں طرف جائیں گے، اور ہر ایک اکیلا ہوگا۔

2- مسلمان ایک طرف اور کافر دوسری طرف جائیں گے۔

3- ہر گروہ اور قوم اپنے ساتھیوں اور رہنماؤں کے ساتھ؛ مشرک کے ساتھ مشرک، سود خور کے ساتھ سود خور، "لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ" تاکہ اپنے اعمال کا صلہ دیکھیں، کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی، یعنی: وہ لوگ اس جگہ جائیں گے جہاں ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں گے، تاکہ وہ ان کو دیکھیں، اور اپنی سزا کا سامنا کریں، بعض اوقات انسان کو اپنے اعمال کا سامنا کرنا کسی بھی سزا سے زیادہ مشکل اور تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے، کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو دیکھنے سے لوگ گریز کرتے ہیں اور ان کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔

مفسرین لکھتے ہیں: قیامت کے دن لوگ اپنی قبروں سے مختلف اور پراگندہ حالت میں حساب کے مقام اور محل کی طرف نکلیں گے، ان میں سے کچھ مامون اور محفوظ ہوں گی، اور کچھ خوفزدہ، کچھ اہل جنت کے رنگ میں ہوں گے، اور کچھ اہل جہنم کے رنگ میں ہوں گے، جو کہ روسیاء ہوں گے، کچھ دائیں طرف مڑیں گے اور کچھ بائیں طرف، جیسا کہ وہ اپنے دنیا میں مذاہب اور طریقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

مفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: کہ لوگ گروہ گروہ کے طور پر حساب کے مقام کی طرف لوٹیں گے، یعنی: جب کہ وہ مختلف اقسام اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں گے: شقی سے سعید اور جنتی سے دوزخی تک، ہاں! وہ واپس آئیں گے: "تا کہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں" یعنی: تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے سامنے ان کے اعمال پیش کرے، اور ان سے کہے: یہ تم ہو اور یہ تمہارے اعمال، یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ: تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کے نتائج دکھائے، اعمال نہ صرف لکھے گئے ہیں بلکہ دیکھے جا سکیں گے، کہ انہوں نے کون سے گناہ، یا کون سے اچھے کام کیے ہیں، انسان اپنے تمام چھوٹے بڑے کاموں اور گناہوں کو دیکھ کر ان کا اعتراف کرے گا۔

یہاں عمل کی سزا کی بحث نہیں ہے، یہ نہیں کہا کہ: "لیرواجزاءہم" بلکہ کسی کمی بیشی کے بغیر ان کے اعمال بالکل درست اور مکمل طور پر ان کو دکھائے جائیں گے، سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ قیامت کے منظر اور انسانوں کے اعمال کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتا ہے: "يَوْمَ تَجُودُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا" (سورہ آل عمران: 30) وہ دن آئے گا جب ہر اس شخص کو جس نے کوئی کام کیا ہوگا وہ سامنے لا کر اسے دکھا یا جائے گا، لفظ "مُحْضَر" یہی ہے، مُحْضَر کا مطلب درحقیقت ان چیزوں کو زندہ کرنا ہے جو انسان کے خیال میں اس نے کیے ہیں، اور دوسرے لفظوں میں غائب ہو کر ختم ہوئے ہیں، اور قرآن کے تعبیر کے مطابق اڑ گئے ہیں: جیسا کہ قرآن کریم کی ایک اور آیت میں ہے: "وَكُلُّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَبْرِئَةً فِي عُنُقِهِ" ہر وہ عمل جو انسان نے کیا ہے، اس کو جمع کر کے اس کے ساتھ شامل کریں گے (طائر کا معنی: پرندہ ہے، اس سے مراد اعمال نامہ ہے)۔

"أَلْزَمْنَاهُ" کا معنی ہے ہم نے اس سے جوڑ دیا، "فِي عُنُقِهِ" اس کی گردن میں وہ اعمال جو اس نے کیے ہیں اور سمجھتا ہے کہ وہ ختم ہو گئے ہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر قول و فعل محفوظ کیا جاتا ہے۔

تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا	فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝
اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا	وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝

"مِثْقَالِ ذَرَّةٍ" مٹی کے ایک ذرے کے برابر، بعض اسے ایک چھوٹی چوٹی کہتے ہیں جو عربوں میں ایک علامت ہے (ملاحظہ ہو : سورہ نساء : 4 ، سورہ یونس : 6)۔

اہل علم بھی لفظ "ذرہ" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ : "ذرہ" وہ گرد و غبار ہے جو سورج کی شعاعوں میں نظر آتا ہے ، اور ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر تم اپنے ہتھیلی کو زمین پر رکھو اور پھر اسے اٹھاؤ تو مٹی کا ہر وہ حصہ جو تمہارے ہاتھ سے چپک جائے ایک ذرہ ہے ، (مسلم)۔

مفسر قرطبی فرماتے ہیں: اللہ نے یہ مثال اس لیے دی تاکہ یہ بتائے کہ وہ اولاد آدم کے کسی بھی چھوٹے، بڑے عمل سے لاعلم نہیں ہے، "إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ" کے مطابق ہے (ترمذی)۔

لفظ ذرہ کے بارے میں علماء کی رائے

- 1 - چھوٹی بھوری چوٹیاں ۔
- 2 - ریت کے ذرات
- 3 - وہ گرد و غبار جو سورج کی شعاعوں کے ساتھ دن کی روشنی میں نظر آتا ہے ۔
- 4 - ذرہ سے مراد ہر وہ چیز بہت کم ، اور بہت کم نیکی ، یہاں تک کہ ایک مسکراہٹ بھی، اعمال کے زمرے میں شمار کی جائے گی، اور اس کا بدلہ دیا جائے گا ، "فَمَنْ يَعْمَلْ..... وَمَنْ يَعْمَلْ" آیات مبارکہ کا مفہوم یہ بتاتا ہے کہ : اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی جزا اور سزا عمل کے بنیاد پر ہے ، عمل چاہے جتنے بھی چھوٹے کیوں نہ ہوں، اس کا حساب و کتاب موجود ہوگا، اس لیے ہمیں نہ گناہوں کو چھوٹا سمجھنا چاہیے اور نہ عبادات کو، اس کے ساتھ ساتھ اس دن عمل کا تجسم اور اس کو دیکھنا یا تو عذاب ہے یا لذت، حدیث شریف میں ہے: قیامت کے دن کوئی نہیں ہوگا، مگر خود کو ملامت کرے گا، کیونکہ اگر وہ نیک ہے تو خود سے کہے گا کہ میں نے اپنی نیکیوں میں اضافہ کیوں نہیں کیا، اور اگر اس کے علاوہ ہے تو کہے گا: میں نے گناہ کیوں نہیں چھوڑے؟ یہ حالت ثواب اور عتاب کو دیکھ کر ہوگی ، ابن مسعود رضی فرماتے ہیں آیت : "فَمَنْ يَعْمَلْ.." سب سے مضبوط آیت ہے قرآن کریم میں ۔

واضح رہے کہ : اس آیت کے عموم پر علماء کا اتفاق ہے ، کعب احبار

کہتے ہیں کہ : خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دو آیات نازل کی ہیں جو تورات ، انجیل ، زبور اور صحیفوں میں موجود ہر چیز پر مشتمل ہے ، وہ دو آیات یہ ہیں: "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ" وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ " نیز ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی روایت کردہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت نازل فرمائے : کیا قیامت کے دن میں اپنی برائی کا ایک ذرہ بھی دیکھوں گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر ! تم دنیا میں جو ناخوشیاں دیکھ رہے ہو یہ برائی کے ذرہ کے وزن کا کفارہ ہیں، لیکن اللہ تمہارے لیے خیر کے ذرے کا مثقال جمع کرے گا تا کہ تم قیامت کے دن اسے پاؤ۔

سعید ابن جبیرؓ آیت مبارک کے نزول کے بارے میں کہتے ہیں: جب آیت "وَيَطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ" نازل ہوئی ، تو مسلمانوں کا یہ گمان تھا کہ ضرورت مندوں کو دی جانے والی چھوٹی ضرورت پر ثواب نہیں ملتا، اور کچھ لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ چھوٹ گناہوں پر انہیں سرزنش نہیں کی جائے گی، جیسے : جھوٹ، حرام نظر، غیبت ، وغیرہ پر ۔

اور وہ کہتے تھے: کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف بڑے گناہوں کے ارتکاب سے بچنے کے لیے دوزخ کی دھمکی دی ہے، نہ کہ چھوٹے گناہوں پر! تب اللہ سبحان و تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی ۔

حدیث شریف میں ہے کہ : جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گدھوں کی زکوٰۃ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں مجھ پر اس منفرد اور جامع آیت کے علاوہ کچھ نازل نہیں کیا ہے، "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ" وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ " اس لیے اس آیت کو جامع آیت کہا جاتا ہے ، یعنی : منفرد، بے نظیر اور جامع ۔

یوم حشر کو شیطان کا فریضہ :

احادیث اور روایات سے یہ بات واضح ہے کہ قیامت کا دن قائم ہونے اور صور پھونکنے پر تمام موجودات و مخلوقات مرجائیں گی، اور یقینی طور پر اس جملے میں: ابلیس بھی تمام انس و جن کی طرح فنا ہو جائے گا، لیکن اس کے مرنے اور نابود ہونے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے، سوائے اس کے کہ سورہ "زلزلہ" کے عمومی مفہوم کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ: پہلے نفخہ میں بہت ہی ہولناک اور خوفناک زلزلہ آئے گا کہ جس کے ڈر

سے دودھ پلانے والی عورت اپنے بچے بھول جائے گی۔

قرآن کریم میں ہے کہ: "قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ" ٨٩، قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ٩٠
إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ٨١" سورہ ص: 79 و 81) ابلیس نے کہا: "اے میرے
پروردگار! پھر مجھے اس دن تک مہلت دے جس میں یہ لوگ اٹھائے جائیں
گے" یعنی مجھے قیامت سے پہلے نہ مارو، اور مجھے اس وقت تک مہلت
دے دو، جب تک آدم اور اس کی اولاد کو ان کے موت کے بعد دوبارہ زندہ
کیا جائے گا، خدا تعالیٰ نے فرمایا: "مان لیا" پس بیشک تو ان لوگوں میں سے
ہے جنہیں مہلت دی گئی ہے مقرر وقت کے دن تک "جسے میں نے مخلوق
کی فنا کے لیے مقرر کیا ہے۔

اس آیت میں ذکر ہوا کہ ابلیس کے پاس ایک وقت تک فرصت ہے، اس کے
معنی میں علماء اور مفسرین کے دوقول ہیں:
1۔ ابلیس کا مقررہ وقت معلوم ہے، مگر اس کا علم اللہ ہی کے پاس
ہے کہ کب اس کا انجام ہوگا۔

2۔ وہ وقت دوسرے نفخہ تک کا ہے، یعنی لوگوں کے اٹھائے جانے
کا وقت ہے، ابلیس کی قیامت تک مہلت مانگنے کی وجہ یہ تھی کہ موت
سے بچ جائے، کیونکہ اگر وہ قیامت تک مہلت پاتو موت سے بچ
جاتا لیکن خدا نے اسے مہلت تو دی لیکن قیامت تک نہیں، بلکہ "صَعَق"
کے دن تک جو تمام مخلوقات کی موت کا دن ہے، "وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعَقَ
مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ" ٥٠ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ
يَنْظُرُونَ ٥١" (سورہ زمر: 68)۔

(اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو
زمین میں ہے، سب بے ہوش ہو جائیں گے) یہ وہی دوسرا نفخہ یا
نفخہ صعق ہے۔

صعق: سے مراد ہے موت کا فوری واقع ہونا۔ صور: یہ صور یا سینگ
ہے، جسے اسرافیل پھونکے گا اور اس کی خوفناک آواز سے زمین و
آسمان کے تمام جاندار مرجائیں گے۔

3۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ "وقت معلوم" سے مراد وہی پہلا پھونک (فزع)
ہے کہ پھونکا جائے گا اور تمام مخلوق مرجائے گی، یعنی: دوسرے

پھونک کے بعد نہیں ہے، کیونکہ دوسرا پھونک موت کے بعد اٹھائے جانے کے لیے ہے، ابن عباس کی رائے بھی وہی پہلا نفخہ ہے، بعض حضرات نفخہ فزع اور صعق کو ایک نہیں سمجھتے، امام قرطبی کی کتاب "تذکرہ" میں ہے کہ: نفخہ فزع وہی صعق ہے، کیونکہ خوف اور دہشت ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزم ہیں، پہلے تو لوگ قیامت کی آواز کی وجہ سے خوف و ہراس سے دوچار ہو جائیں گے، پھر اپنی جان خالق کے سپرد کر دیں گے۔

لیکن قیامت میں سخت ترین عذاب اسی ابلیس کے لیے ہے، کبھی بھی اس کا عذاب ختم نہیں ہوگا، ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب میں رہے گا، اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مہلت دینے کے بعد فرمایا، "قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقُولُ" ۝ لَا مَلَكَ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (ص: 84 - 85)۔

اسی طرح رب تعالیٰ قسم کھاتا ہے کہ ابلیس اور اس کے پیروکاروں کو دوزخ میں داخل کرے گا، یہاں تک کہ دوزخ ان سے بھر جائے۔

قیامت کے دن لوگوں کو جمع کرنے کا طریقہ

مفسرین اس جسمانی حالت کے بارے میں لکھتے ہیں جس میں قیامت کے دن لوگوں کا حشر ہوگا: محشر کے دن لوگ ننگے پاؤں، بے لباس، اور غیر ختنہ شدہ اٹھیں گے، علماء اپنی دلیل صحیح مسلم اور بخاری کی حدیث سے لیتے ہیں جو کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّكُمْ مَحْشُورُونَ حُفَاءَ عُرَاءَ غُرْلًا ثُمَّ قَرَأَ: «كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعَدَّا عَلَيْنا إِنَّا كُنَّا فاعِلِينَ» (سورہ الأنبياء: 104) قیامت کے دن لوگوں کا حشر اس حال میں ہوگا کہ وہ ننگے بدن، ننگے پیر اور ختنہ کے بغیر ہوں گے، پھر آپ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت کی: "كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعَدَّا عَلَيْنا إِنَّا كُنَّا فاعِلِينَ" جیسے کہ ہم نے اول بار پیدائش کی تھی اسی طرح دوبارہ کریں گے۔

محدثین کہتے ہیں: کہ جب حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر برہنہ ہوگا، تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا مرد اور عورت سب ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ، وہ

منظر اس سے زیادہ خوفناک ہوگا کہ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں (مشکاۃ المصابیح: 57/3)۔

البتہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آدمی کو اسی کپڑوں میں اٹھا یا جائے گا جو وہ مرتے وقت پہنا ہوا تھا، ابو داود ابن حبان اور حاکم نے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہا کہ میرے لیے نئے کپڑے لے آؤ، پھر وہ کپڑا پہنا، اور کھاکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا: "إِنَّ الْبَيْتَ يَبْعَثُ فِي ثِيَابِهِ الَّتِي يَمُوتُ فِيهَا" "سلسلہ احادیث الصحیحہ، (نمبر: 1671)

(میت کو انہی کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں مرا تھا) حاکم نے اس حدیث کو بخاری اور مسلم کی شرائط کے موافق اور صحیح قرار دیا ہے، امام بیہقی نے اس حدیث اور سابقہ حدیث کے درمیان تین طریقوں سے تطبیق دی۔

1- وہ کپڑے جو مرتے وقت پہنے ہوئے تھے، قبر سے نکلنے بعد ننگے اور برہنہ بھیڑ کے سامنے کھڑے ہوں گے، لیکن حشر کے بعد جنتیوں والا لباس پہنیں گے۔

2- جب انبیاء اور ان کے بعد صدیقین، اور حسب مراتب دوسرے لوگ لباس پہنیں گے، ان میں سے ہر ایک کا لباس وہی ہوگا، جو انہوں نے مرتے وقت پہنا تھا، لیکن جب وہ خلد بریں میں داخل ہوں گے تو جنتی لباس پہنیں گے۔

3- لباس سے مراد اعمال ہیں مابعد والی حدیث کے مطابق، یعنی ہر انسان اس عمل کو انجام دینے کی حالت میں اٹھے گا مرتے وقت جس میں مشغول تھا، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلِبَاسُ الثَّقْوَىٰ ۖ ذَٰلِكَ خَيْرٌ" (سورہ اعراف

: ۲۶) "اور لباس پرہیزگاری کا سب سے بہتر ہے"، "وَيُثَابِقُ فَطْهَرٌ" (سورۃ المدثر: 4) "اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو" یعنی اعمال کو پاک رکھو۔

اپنے آپ کو آلودگیوں سے پاک رکھیں، امام بیہقی تیسرے جواب کی توجیہ کے طور پر اپنے چچا کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "يَبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلَى مَآمَاتٍ عَلَيْهِ" (النهاية ابن کثیر:

288/1) "ہر انسان اسی لباس میں اٹھایا جائے گا جس میں وہ فوت ہوا ہے، کیونکہ حدیث کا مفہوم دیگر وجوہات کی بنا پر یہ ہے کہ جو شخص موت کے وقت کفر، ایمان، شک یا یقین سے دنیا چھوڑ جائے تو وہ اسی حالت اور کیفیت میں دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اور بارگاہ الہی میں جلدی پیش

ہوگا، جیسا کہ ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ انسان کو اسی عمل پر اٹھایا جائے گا جو مرتے وقت انجام دیا تھا۔

صحیح مسلم کی حدیث عبد اللہ بن عمر سے اس مفہوم کی تائید کرتی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ عَذَابًا أَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ كَانَ فِيهِمْ ثُمَّ بُعِثُوا عَلَىٰ أَعْمَالِهِمْ" (اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی قوم کو سزا دے انہیں عذاب اور ہلاکت سے دوچار کرے، پھر انہیں اسی حالت میں زندہ کرے گا) (صحیح مسلم: 2206/2 ، نمبر: 2879)۔

اگر کوئی احرام کی حالت میں وفات پائے، تو قیامت کے دن لیبیک کہتے ہوئے اٹھے گا، بخاری اور مسلم حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حج کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا، اونٹ سے نیچے گرا اور مر گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ: "اغسلوه بماءٍ وسِدْرٍ وَكفّنوه في ثوبين ولا تحنطوه ولا تحبّروا رأسه فإنّه يبعث يوم القيامة ملبّياً" (مشكاة المصابيح : 520/1)۔

"اسے پانی اور ربیری کے پتوں سے غسل دو، احرام کے ہی دو کپڑوں میں اسے کفن دو، اسے خوشبو نہ لگاؤ اور نہ اس کا سر چھپاؤ، کیونکہ یہ قیامت کے دن لیبیک کہتا ہوا اٹھے گا"۔

شہید کو قیامت کے دن اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے زخم سے خون رس رہا ہوگا؛ خون کا رنگ توسرخ ہوگا، لیکن اس سے عطر کی خوشبو اٹھے گی، مذکورہ بالا روایات کے مطابق مرنے والے مریض کو "لا الہ الا اللہ" کی تلقین کرنا مستحب ہے، تاکہ توحید کی حالت میں اس کی موت آجائے اور قیامت کو اسی حالت میں اٹھایا جائے۔

ملاحظہ:

خدا تعالیٰ بعینہ اسی مردہ انسان کو زندہ کرے گا، یہ پیدائش دنیا کی زندگی سے مختلف ہے، ایک اہم فرق یہ ہے کہ نیا جسم بہت بلاؤں مصیبتوں کے باوجود فنا نہیں ہوگا، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ" (سورہ ابراہیم: 17) ترجمہ: "اور اس کے پاس موت ہر جگہ سے آئے گی، حالانکہ وہ کسی صورت مرنے والا نہیں"، حاکم نے عمرو بن

اودی سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ معاذ کھڑے ہوئے اور

کہا: "یا بنی اود! اِنی رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلّمون المَعَادِ اِلَى اللّٰہِ، ثُمَّ اِلَى الْجَنَّةِ اَوْ اِلَى النَّارِ، وَاِقَامَةُ لَا ظَعْنُ فِیْہِ، وَخُلُودٌ لَا مَوْتَ فِیْ اَجْسَادٍ لَا تَمُوتُ" (سلسلہ الاحادیث الصحیحہ: 1668)

یعنی: اے بنی اود! میں رسول خدا کا قاصد ہوں، تم خدا کی طرف لوٹنے کے بارے میں جانتے ہو، اس کے بعد آخری راستہ جنت یا جہنم ہے، قیامت میں زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے، کوئی نہیں مرے گا، سب کے سب ابدیت کے لئے پیدا کئے جائیں گے، اور موت کسی کے در پر دستک نہیں دے گی، اور جسم ایسے ہوں گے کہ انہیں موت نہیں آئے گی۔

دونوں زندگیوں کے درمیان فرق میں سے ایسی مخلوقات کو دیکھنا ہے جو ہم نے دنیا میں نہیں دیکھی ہوگی، یا انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے، کیونکہ اس دن انسان، فرشتوں اور جنات کو دیکھے گا، اس کے علاوہ قیامت کے دن ایک اور فرق اور تعجبات میں سے یہ ہے کہ جنتی کے منہ میں تھوک اور لعاب نہیں ہوگا، اور اس کا پیشاب اور پاخانہ بھی نہیں ہوگا، اس فرق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قیامت کے دن زندہ کی جانے والی مخلوق قیامت کی مخلوقات سے مختلف ہیں، جیسا کہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں: دونوں زندگیاں ایک نوع کی ہیں، اپنی صفات اور حالتوں میں یکساں ہیں، مشابہت اور مماثلت رکھتی ہیں، بعض دوسرے مواقع پر ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتیں، اسی بنا پر قیامت کو مبدأ کہتے ہیں، کیونکہ ہر چیز اپنی اصل اور بنیاد کی طرف پلٹے گی، اس لئے لفظ "أعاده" مبدأ قیامت کے متقاضی ہیں (مجموع الفتاوی: 253 / 17)۔

ملاحظہ:

جنت والے خوبصورت اور بہترین شکل و صورت کے ساتھ اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی شکل و صورت میں جنت میں داخل ہونگے، اور کوئی شکل و صورت اتنی خوبصورت اور کامل نہیں ہے، جس شکل و صورت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابوالبشر کی تخلیق کی ہے، خدانے حضرت آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، اس کی تخلیق کی تکمیل فرماتے ہوئے اس کو خوبصورت انداز میں بنایا؛ چنانچہ جو کوئی بھی جنت میں داخل ہو وہ آدم کی صورت اور ان کے جسمانی ساخت میں ہوگا۔

خدانے آدم کو بہت بلند قد کھجور کے درخت جیسا بنایا تھا، جس کا طول ساٹھ (60) گز تھا، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدانے آدم کو اپنی صورت میں پیدا فرمایا تھا، جس کے قد کی لمبائی ساٹھ (60) گز تھی؛ لہذا جو شخص بھی جنت میں داخل ہوگا تو اس شکل و صورت میں داخل ہوگا، کہ اس کی لمبائی ساٹھ گز ہوگی۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد انسانوں کے قد میں ہمیشہ کمی ہوتی رہی ہے۔ (صحیح مسلم: کتاب الجنة، باب یدخل الجنة اقوام افئدتہم مثل افئدة الطیر : 2841)۔

جنتیوں کی صورتوں اور چہروں کی خوبصورتیوں میں سے ایک خوبصورتی یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کی طرح بغیر داڑھی کے ہونگے، ایسا لگے گا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا ہے، اور وہ تینتیس سالہ (33) بن کر جنت میں داخل ہونگے۔

مسند احمد اور سنن ترمذی میں معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (یدخل اهل الجنة جردًا مردًا كأنہم مکحلون ابناء ثلاث وثلاثین)

اہل جنت اس طرح جنت میں داخل ہونگے جیسے مجرد اور بغیر داڑھی کے (بے ریش) ایسے خوبصورت ہونگے، جیسے آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے ہوں، اور 33 سال کے ہونگے، (صحیح مسلم: 7928)۔

ملاحظہ:

دوزخ والے بہت ہی ہولناک شکل و صورت میں موٹے فربہ (جن کے حجم کی مقدار کا اللہ کے علاوہ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا) دوزخ میں داخل ہونگے۔

حضرت ابو ہریرہ سے ایک حدیث مروی ہے (مابین منکبی الکافر مسيرة ثلاثة أيام للراكب المسرع) صحیح مسلم: باب النار یدخلها الجبارون (2190/4)

قیامت کے دن کافر کا جسم اتنا بڑا ہوگا کہ ایک تیز گھوڑ سوار تین دن میں اس کے دونوں شانوں کے بیچ کا فاصلے طے کر سکے۔

کافر کے جسم کا حجم اس لئے بڑا ہوگا تاکہ اس کے عذاب میں اضافہ ہو۔

امام نووی ان احادیث کی تشریح میں فرماتے ہیں: یہ سب اس لئے ہے کہ ان کی اذیت آخری حد کو پہنچ جائے، یقیناً ان سب باتوں پر ایمان لانا واجب ہے،

اس لئے کہ رسول صادق المصدق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے، (شرح نووی مسلم : 186/17)

ابن کثیر ان احادیث کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں : (لیکون ذلك انكى في تعذيبهم، واعظم في تعذيبهم ولهيهم، كمال شديد العقاب: (ليذوقوا العذاب) (نهایة: لابن کثیر)

ان کے جسم کی یہ بڑھوتری زیادہ عذاب چکھنے کے لئے ہے، جیسا کہ شدید العقاب والی ذات نے فرمایا: تاکہ عذاب کو چکھیں۔

عرش الہی کے پناہ گزین

بخاری اور مسلم اپنی صحیحین میں ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سَبْعَةٌ يَظْلُمُهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ الْإِمَامُ الْعَادِلُ وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ وَرَجُلٌ طَلَبَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ أَخْفَى حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ". (بخاری کتاب الاذان، باب «من جلس في المسجد» -

جس دن میدان حشر میں سورج کی جھلسادینے والی دھوپ میں لوگوں کو ایسی سختیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، جن کو بلند وبالا اور مضبوط پہاڑ بھی برداشت نہیں کرسکتے، اس دن سات برگزیدہ گروہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے تلے امن وسلامتی کے ساتھ رہیں گے، اور اس تکلیف اور خوف کو وہ محسوس نہیں کریں گے، جو دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہوگی۔

یہ گروہ بلند ہمت، پکے عزم اور پختہ ارادے کے حامل ہیں، اسلامی عقیدہ ان کے خون اور گوشت میں ملا ہوا ہے، کیونکہ اسلام کی اعلیٰ اقدار ان پر راج کرتی تھیں، یا وہ ایسے کاموں میں مصروف تھے جن کی اسلام کے ترازو میں بڑی اہمیت اور وزن تھا۔

1- ان لوگوں میں سے ایک امام عادل ہے، جس نے اپنی طاقت اور بہت سے وسائل کے باوجود فساد سے دوری اختیار کی، اور لوگوں کے

ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کیا، عدل کو شرعی معیارات اور اصولوں کے مطابق نافذ کرتا رہا۔

2- دوسرا نوجوان جس کی پرورش خدا کی بندگی میں ہوئی ہو، اور اس نے نفس امارہ کو تقویٰ کے لگام سے نکیل دی ہو، اور اپنے نفس اور خواہشات کی بات ماننے سے انکار کر دیا، اور اپنی عمر گناہوں میں آلودہ کر کے نہیں گزاری۔

3- وہ گروہ جو اطاعت اور بندگی کے ساتھ خدا کی مسجدوں کو آباد کرتے ہیں، اور اپنی روحانی فضا میں سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہیں، اور جب مساجد سے نکلتے ہیں تو ان کی روح اور توجہ مسجد کی طرف ہوتی ہیں۔

4- وہ لوگ جو ایک دوسرے سے محبت صرف خدا کی خاطر کرتے ہیں اور ان کی اخوت صرف خدا کے لیے ہے، ان کا جمع ہونا ایک ساتھ نیکی، تقویٰ اور اصلاح ہے، اور ان کی جدائی بھی نیکیوں پر مبنی ہوگی۔

5- وہ گروہ بھی کہ گناہ اور فتنہ کے مواقع خوبصورت عورت کی شکل میں انہیں میسر ہوتے ہیں، لیکن تقویٰ اور اللہ کا خوف انہیں خدا کی مرضی کے خلاف کام کرنے نہیں دیتی۔

6- وہ گروہ جو صرف خدا کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں، اور یہ انفاق سب سے پوشیدہ طریقے سے ہوتا ہے۔

7- سب سے آخری گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جن کے دل خوف خدا سے بھرے ہوئے ہیں، اور اس خوف اور ڈر کی وجہ سے تنہائی میں آنسو بہاتے ہیں۔

زلزلہ کو دفع کرنے کی خاطر نماز پڑھنا

پہلی بات یہ ہے کہ شریعت میں زلزلے کو دفع کرنے یا روکنے کے لیے کوئی نماز موجود نہیں ہے، اور ایسی کوئی حدیث بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے کہ صلاۃ کسوف کے علاوہ دفع مصائب جیسے: زلزلہ، طوفان وغیرہ کے لیے نماز پڑھی جائے، اس لیے علماء صلاۃ کسوف اور خسوف کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے نماز کو جائز نہیں سمجھتے، لیکن بعض فقہاء ابن عباسؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: (جس طرح کسوف کے لیے نماز پڑھتے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دیگر نشانیوں جیسے زلزلہ، طوفان، اور سیلاب وغیرہ میں سے کوئی نشانی ظاہر ہونے کی صورت میں نماز پڑھنا مستحب ہے، ابن عباسؓ کی

روایت اس طرح ہے: "أنه صلى في زلزلة بالبصرة كصلاة الكسوف، ثم قال: هكذا صلاة الآيات" (ابن عباسؓ نے شہر بصرہ میں زلزلہ کی وجہ سے نماز کسوف جیسی نماز پڑھائی، اور کہا: نشانوں کی نماز ایسی ہوتی ہے)۔

اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے (472/2) میں، اور عبدالرزاق نے (101/3) میں، اور بیہقی نے "السنن الکبریٰ: 243/3) میں ذکر کیا ہے، بیہقی نے کہا: یہ عمل ابن عباسؓ سے ثابت ہے، حافظ ابن حجر نے (فتح الباری: 521/2) اسے صحیح کہا ہے۔

علامہ کاسانی حنفی فرماتے ہیں کہ: خوف کے وقت نماز پڑھنا مستحب ہے، جیسے: سخت ہوا، زلزلہ اور اندھیرا (دن کے وقت) اور مسلسل بارش، کیونکہ یہ سب خوف ہیں، اور خوف و ہراس کا سبب بنتے ہیں (بدائع الصنائع: 282/2)۔

اور کتاب "منح الجلیل شرح مختصر خلیل" (333/1) جو کہ مالکیہ کی کتابوں میں سے ہے، اس میں مذکور ہے کہ: "زلزلہ اور دیگر ڈرانے والی نشانیاں جیسے: وبا اور طاعون کی نماز مستحب ہے، جماعت کی صورت میں دور کعت یا اس سے زیادہ، البتہ حنابلہ صرف زلزلہ کی نماز کو مستحب سمجھتے ہیں، اور وہ بھی ابن عباسؓ کی روایت کی رو سے، اس کے علاوہ کو جائز نہیں سمجھتے: "کشاف القناع" (66/2)۔

کتاب: "التبہید لبافی الموطأ من البعانی والأسانید" (318/3) میں آیا ہے کہ: "امام مالک، امام شافعی زلزلہ اندھیرا (دن کے وقت) اور شدید آندھی چلنے کی صورت میں نماز پڑھنے کے قائل نہیں تھے، جبکہ اہل علم کی ایک جماعت جس میں: امام احمد، اسحاق اور ابو ثور شامل ہیں ایسے مواقع پر نماز پڑھنے کے قائل تھے، ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے زلزلہ کے وقت نماز پڑھی ہے، اور امام ابو حنیفہ نے کہا: اگر کسی نے نماز پڑھی تو بہتر ہے، اور اگر نہیں پڑھی تو کوئی قباحت نہیں ہے۔

مؤلف مزید لکھتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ذکر نہیں ہوا ہے کہ آپ کے زمانے میں زلزلہ آیا ہو اور اس بارے میں آپ کا کوئی عمل ثابت ہو، سب سے پہلا زلزلہ عہد اسلام میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں آیا تھا، حماد بن سلمہ قتادہ، عبد اللہ بن حارث سے روایت کرتے ہیں کہ شہر بصرہ میں زمین ہل گئی، ابن عباسؓ رض نے کھاکہ:

اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ زمین میں زلزلہ آیا یا میرے پاؤں کی نیچے کی زمین ہل گئی؛ لہذا کھڑے ہوئے اور لوگوں کے ساتھ نماز کسوف ادا کی۔

امام نووی نے المجموع (61/5) میں کھاہے کہ: امام شافعی اس بات کے قائل تھے کہ آیات یعنی اللہ کی نشانیوں کی نماز انفرادی طور پر بغیر جماعت کے گھر میں پڑھ سکتے ہیں، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا یہ ماننا تھا کہ اللہ کی نشانیوں میں سے کسی بھی نشانی کے وقوع کے وقت نماز پڑھنا مشروع ہے، کہتے ہیں کہ: اور نماز کسوف (کی طرح) ہر نشانی جیسے زلزلہ اور اس کے علاوہ کے لیے نماز پڑھی جاسکتی ہے، یہ قول ابوحنیفہ، ایک روایت احمد اور حنابلہ کے محققین اور دوسروں کا ہے (الفنای الکبریٰ) (358/5) شیخ ابن عثیمین کسوف اور خسوف کے علاوہ کے لیے نماز پڑھنے کے بارے میں کہتے ہیں کہ: علماء کے اس بارے میں قول ہیں:

قول اول: کسی بھی نشانی کے لیے نماز نہیں پڑھی جائے سوائے زلزلہ کے، ان کا کہنا ہے کہ: بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا، طوفان اور شدید بارشیں ہوئی تھیں، لیکن ان چیزوں کیلئے نماز نہیں پڑھی گئی، البتہ زلزلہ کے متعلق ابن عباس اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ انہوں نے زلزلہ کے وقت نماز پڑھی تھی، تو ان کی دلیل صحابی کا عمل ہے۔

دوسرا قول: صرف سورج اور چاند گرہن کے لیے نماز پڑھی جاتی ہے؛ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَصَلُّوا"، یعنی: "جب بھی سورج یا چاند گرہن ہو جائے نماز پڑھو"، (متفق علیہ) ان دونوں کے علاوہ "ہولناک" نشانیوں میں سے کسی کے لیے بھی نماز نہیں پڑھی جاتی ابن عباس کا عمل ان کا ذاتی اجتہاد تھا۔

تیسرا قول: ہر ہولناک نشانی کے لیے نماز پڑھی جائے۔ ان کی پہلی دلیل ہے:

1- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی عمومیت ہے: "إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَاتَانِ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ، يَخَوِّفُ اللَّهُ بِهِمَا عَبْدًا" ، (بے شک سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دونشائیاں ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرا

تاھے، (مسلم : 9111) انھوں نے کہا: جس نشانی میں خوف وھراس ہو ، اس کے لیے نماز پڑھی جا سکتی ہے ۔

2- بعض نشانیوں میں اتنا خوف وھراس پیدا ہوتاھے کہ سورج گرھن سے زیادہ سخت ہوتاھے ۔

3- ابن عباسؓ اور علیؓ کے عمل سے جو کچھ منقول ہے ، اس سے معلوم ہوتاھے کہ نماز صرف چاند گرھن کے لیے نہیں ہے بلکہ ھروہ چیز جس سے خوف پیدا ہو اس کے لیے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

4- اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آندھی، کھڑک اور بجلی وغیرہ ہوتی تھی اور آپؐ نماز نہیں پڑھتے تھے ، تو یہ ھمارے قول کے خلاف دلیل نہیں ہے ، ھوسکتاھے کہ وہ عام سی ھوا ھو، جس کے لوگ عادی ھوں، لوگوں کے لیے خوفناک نہ ھو، یہ درست ہے کہ بعض بجلیاں بہت بری اور خوفناک ہوتی ھیں، لیکن نبیؐ کے دور میں بجلیاں اتنی خوفناک تھی بھی یا نہیں ؟ کون ثابت کرسکتاھے کہ ایسا تھا ؟ یہ تیسری رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی ہے جو کہ راجح بھی ہے ، (الشرح الممتع: 193/5) (خلاصہ کے ساتھ)۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ جزء - (30) سورة العاديات

سورة عادیات مکی ہے اس کی « ۱۱ » آیاتیں ہیں

وجه تسمیہ:

اس سورت کا آغاز عادیات پر حق تعالیٰ کی قسموں سے ہوتا ہے ، جس سے مراد "مجاہدین" کے تیز رفتار گھوڑے ہیں، جنہیں "عادیات" کہا جاتا ہے۔ یہ سورہ جو مکی سورتوں میں سے ایک ہے ، اس کے دو نام ہیں: العادیات، اور "وَالْعِدِيَّةِ ضَبْحًا" ، سورہ عادیات کو سورہ عتاب یا گلہ یا سرزنش سے بھی مشہور و معروف کیا گیا ہے ، اللہ تعالیٰ اس سورت کا آغاز جانور کی قسم کھا کر کرتا ہے ، اور اس سے مراد انسان کی ناشکری کا اظہار ہے ، سورة العصر کے بعد اس سورت کا نزول ہوا ہے ۔

عادیات: جمع ہے عادیہ کا، اور لفظ "عدو" کے مادہ سے دوڑنے کے معنی میں ہے ، گھوڑے کو بھی عادیہ کہتے ہیں ، پس عادیات دوڑنے والے یا کوئی بھی چیز جو رفتار کے ساتھ راستے کا سفر طے کرتی ہے۔

اس سورت کا نام سورہ مبارکہ کے محور سے گہرا تعلق رکھتا ہے ، جو درحقیقت ان نعمتوں کے مجموعے کی بحث ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا کی ہیں ، جن میں سے ایک یہ عادیات بھی ہے ، کہ اگر حقیقت میں شکر ادا کیا جائے تو انسان کمال کو پہنچ جاتا ہے ، جبکہ ان نعمتوں کی ناشکری کی صورت میں انسان عیب، کمزوری اور پسماندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

سورة العاديات کے نزول کا وقت

اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے ، حضرت عبداللہ بن مسعود ، جابر ، حسن بصری ، عکرمہ اور عطاء کہتے ہیں کہ یہ مکی سورتوں میں سے ہے ، حضرت انس ابن مالک اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ مدنی ہے ، حضرت ابن عباس سے دو قول منقول ہیں ، ایک یہ کہ سورت مکی ہے ، اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے ، لیکن سورت کا مضمون اور انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے ، بلکہ

مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے ۔

سورة العاديات کا ربط ومناسبت سورة الزلزال سے

الف: سورة الزلزال کی آیت "وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا" اور اس سورت کی "إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ" کے درمیان ربط اور مطابقت ۔

ب: پچھلی سورت کے آخر میں نیکی اور بدی کے بیان کا ذکر تھا، یہ سورت انسان کی ناشکری، حق کی نعمتوں سے انکار اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی مذمت کرتی ہے ۔

اس سورت کی آیات ، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة عاديات کا ایک (1) رکوع، گیارہ (11) آیتیں ، چالیس (40) الفاظ ، ایک سو ستر (170) حروف اور انتہر (78) نقطے ہیں۔

(قرآن کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے تفسیر احمد سورة الطور ملاحظہ کریں)

سورة العاديات کی تمہید

سورة عاديات میں خدا کی راہ میں مجاہدین کے گھوڑوں کے بارے میں بتایا گیا ہے، جب وہ دشمن پر حملہ کرتے ہیں، تو ان سے ایک زور دار آواز سنائی دیتی ہے، پھر تیز دوڑتے ہوئے پتھروں کے ساتھ ان کے نعل کے ٹکرانے اور رگڑ سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں، اور گرد و غبار اٹھتا ہے، سورت کا آغاز حملہ آور ہونے والے گھوڑوں پر قسم سے ہوئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے فضل اور عزت کو ظاہر کرتا ہے، قسم کھا ئی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ناشکرا ہے، وہ اس کی عنایات اور سخاوت کا انکار کرتا ہے، اور زبان حال وقال سے ناشکری اور انکار کا اظہار کرتا ہے، یہ سورت انسان کی فطرت اور دولت سے اس کی شدید محبت اور لگاؤ پر بھی بحث کرتی ہے، اور یہ بتاتی ہے کہ آخر انسان کو حساب و کتاب اور سزا کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں واپس لوٹنا ہے پر سورت ختم ہوتی ہے، اور ظاہر کرتی ہے کہ دولت اور مقام فائدہ مند نہیں ہیں، بلکہ صرف نیک اعمال ہی نفع بخش ہیں ۔

سورة مبارکہ کا سبب نزول

بزار ، ابن ابی حاتم اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے سپاہیوں کا ایک گھڑ سوار دستہ جہاد کے ایک میدان میں بھیجا، اور ایک مہینہ انتظار کیا، لیکن ان کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی ، پھر یہ آیات نازل ہوئیں: "وَالْعَدِیَّتِ ضَبَّحًا ۝۱۰۱ فَاَلْمُؤْرِیَّتِ قَدْحًا ۝۱۰۲ فَاَلْمُغِیْرَتِ صُبْحًا ۝۱۰۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝۱۰۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۱۰۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُودٌ ۝۱۰۶ وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِیْدٌ ۝۱۰۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخٰیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝۱۰۸ اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۝۱۰۹ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۝۱۰۱۰ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ ۝۱۰۱۱" (بزار نے مسند 82/3 میں شماره 2291 "کشف" ، اور واحدی نے (اسباب النزول میں : صفحہ 305) ، ودارقطنی نے (الأفراد: 236/3) شماره 2525 - اطراف الغرائب) اس کی تخریج کی ہے ؛ جس طرح کہ سیوطی نے (الدر المنثور میں 599/8) اس کو ذکر کیا ہے، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں " احمد بن عبدہ الضبی عن حفص بن جمیع ثنا سماک عن عکرمہ عن ابن عباس) سے اسے نقل کیا ہے، حکم سند: ضعیف، (حفص بن جمیع ضعیف ہے) اس حدیث کے ضعیف ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے، سماک کی روایت عکرمہ سے مضطرب ہے ۔

سورة العاديات کے مشتملات

اگر اس سورت کے مشتملات پر توجہ دی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس سورت کے شروع میں جگانے والی قسموں کا ذکر کیا گیا ہے ، اور اس کے بعد بنی نوع انسان کی بعض کمزوریوں جیسے : کفر اور دنیا پرستی کے بارے میں بات کی گئی ہے ، اور آخر میں ایک مختصر اور واضح اشارہ ہے قیامت کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے علمی احاطہ پر سورت کا اختتام ہوا ہے۔

سورت کی مبارک آیات کی تقسیم

سورت کی پہلی تا آیت "5" میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو عطا کی گئی عظیم نعمتوں کا تذکرہ ہے ، اور توقع کی گئی ہے کہ انسان ان نعمتوں کا شکر ادا کریں ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر انسان اپنی خواہشات، میلان اور تمنائوں کے تابع ہو کر اس طرف قدم نہیں اٹھاتے ، بلکہ شکرگزاری کے بجائے کفر اور ناشکری اختیار کرتے ہیں۔

آیت "6" پہلی پانچ آیات کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو نعمتیں عطا کی ہیں اور بندے سے شکر گزاری کی توقع کی گئی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، اور سورہ کی آیت "9" سے آخر تک مرنے کے بعد لوگوں کے دوبارہ زندہ ہونے اور ان کے ان اعمال کے ظاہر ہونے کی طرف اشارہ ہے جنہیں وہ چھپاتے تھے، اور انسان کی اعمال کی جزا اور سزا تک پہنچنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة العاديات

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا ۝۳ فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا ۝
إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝۵ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝۶ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝۷ أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا
فِي الْقُبُورِ ۝۹ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝۱۰ إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ خَبِيرٌ ۝۱۱

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ۝۱	قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر (جہاد کے میدان کی طرف بڑھتے ہیں)
فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا ۝۲	پھر (اپنی ٹاپوں سے) جنگاریاں اڑاتے ہیں
فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا ۝۳	پھر جو صبح کے وقت (دشمن پر) حملہ کرنے والے ہیں
فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا ۝۴	پھر اس موقع پر گرد و غبار اراتے ہیں
فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا ۝۵	پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جاگھستے ہیں
إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝۶	حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے
وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝۷	اور وہ خود اس پر گواہ ہے
وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝۸	اور وہ مال و دولت سے بہت زیادہ محبت کرنے والا ہے
أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝۹	کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا کہ جو (مردے) قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے
وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝۱۰	اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر کر دیا جائے گا
إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ خَبِيرٌ ۝۱۱	بیشک ان کا رب اس دن ان کے متعلق یقیناً خوب خبر رکھنے والا ہے

تشریح لغات و اصطلاحات

"الْعِدِيَّةُ" عَادِيَه کی جمع، سرپٹ گھوڑے، اس سے مراد کوئی بھی ایسی سواری، اور اسباب ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور اس کے احکام کو بجالانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، یعنی: غازیوں کے گھوڑے جو تیزی سے دوڑتے ہیں، "ضَبْحًا" تیز دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے ہانپنے کی آواز، "الموريات" مُورِيَّة کی جمع، چقماق کے پتھر کو ایک دوسرے پر مارنا، یہاں بہ معنی اسم فاعل ہے، "قَذْحًا" حال ہے، "قَادِحَات" اسم فاعل کے طور پر بھی ذکر کیا گیا ہے اور حال ہے، مراد پاؤں کے سموں کو زمین کے پتھروں پر مارنا ہے۔

"الْبُغِيَّاتِ" مُغِيرَه کی جمع، حملہ کرنے والے، مغیرات: آغارہ کے مادہ سے ہے، جس کا مطلب ہے کسی چیز کو اونچی جگہ سے نیچے جگہ پر اتارنا، اس لیے "آغارہ" کے معنی حملہ کرنے کے ہیں، "صُبْحًا" صبح کے وقت، مفعول فیہ ہے، اور اُسے بہ معنی اسم فاعل (مُصْبِحَات) بھی ذکر کیا گیا ہے، اسے زمانہ حال میں شمار کیا ہے، صبح: جب سورج طلوع ہوتا ہے اور اس کی روشنی چار سو پھیل جاتی ہے۔

"أَثَرْنَ" انہوں نے بیدار کیا، اٹھایا، یہ باب افعال ہے "إِثَارَة" کے مصدر سے ہے، اس کا مادہ "ثور" ہے، (ملاحظہ فرمائیں، سورہ بقرہ: 71، سورہ روم: 9 اور 48، سورہ فاطرہ: 9)۔

"وَسَطْنَ" بیچ میں گئے، بیچ کی طرف بھاگے، "الانسان" اس سے مراد وہ انسان ہے جس کی پرورش علم الہی کی روشنی میں نہیں ہوئی، اور انبیاء کی تعلیمات اس کے دل میں جاگزیں نہیں ہوئیں، اور اس نے آپ کو سرکش جبلتوں اور خواہشات کے حوالے کر دیا ہے، "لكنود"، "كَنَدَ" کے مادہ سے ہے، یعنی: خیر کے بغیر، خیر سے محروم ہو گیا، مبالغہ کے لیے ہے، بہت ناشکری کرنے والا، حق سے نا آشنا اور بے خبر، "بُعْثَر" باہر لایا گیا، اور زندہ ہوا (سورہ انفطار: 4) "حُصِّل" ہاتھ میں لگا، جمع ہوا، "خبیر" آگاہ، باخبر۔ (منقول: تفسیر نور)۔

مختصر تفسیر :

سورہ ہذا کی مبارک آیات میں: انسان خدا کی نعمتوں کا منکر، مال و دولت سے بے پناہ محبت کرنے والا اور آخرت کے بارے میں بے پرواہ ہے، جیسے موضوعات کے بارے میں بحث ہوئی ہے، -

وَالْعِدِيَّةِ ضَبْحًا ۝	قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر (جہاد کے میدان کی طرف بڑھتے ہیں)

یعنی: یہی دوڑنے والے ہیں جو اپنے تیز اور جارحانہ دوڑ سے اپنے سینوں سے تیز آواز نکالتے ہیں، یہ ان کے تیز و تند دوڑنے کی دلیل ہے، اور یہی ہیں کہ جب ان کے کھر پتھر سے ٹکراتے ہیں تو چنگاری اڑتی ہے، اور یہی ہیں جو صبح کے وقت حملے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اور یہی ہیں کہ جو تیز دوڑنے کی وجہ سے گردوغبار اڑاتے ہیں، اور یہی ہیں جو مخالف صفوں میں گھس کر انہیں چیر دیتے ہیں۔

ابن عباس ۛ فرماتے ہیں: گھوڑا جب دوڑتا ہے تو اس وقت اح، اح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اسے "ضبح" کہتے ہیں، مفسر ابو سعود کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم کھائی ہے کہ جب وہ دشمن پر حملہ کرتے ہیں تو ان کے حلق اور ناک سے ایک تیز آواز سنائی دیتی ہے (ابوسعود: 280/4)۔

علماء کے نزدیک "عادیات" کے دو معنی ہیں:

- 1 - اونٹ۔
- 2 - دوڑنے والے گھوڑے۔

تفہیم القرآن کے مفسر اس مبارک آیت کے تحت لکھتے ہیں: آیت کے الفاظ میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، بلکہ صرف و الْعِدِيَّةِ (قسم ہے دوڑنے والوں کی) فرمایا گیا ہے، اسی لیے مفسرین کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد کیا ہے، صحابہ و تابعین کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں، اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں، لیکن چونکہ دوڑتے ہوئے وہ خاص قسم کی آواز جسے ضبح کہتے ہیں، گھوڑوں ہی کی شدت تنفس سے نکلتی ہے، اور بعد کی آیات بھی جن میں

جنگاریاں جھاڑنے اور صبح سویرے کسی بستی پر چھاپہ مارنے اور وہاں گرد اڑانے کا ذکر آیا ہے، گھوڑوں ہی پر راست آتی ہیں، اس لیے اکثر محققین نے اس سے مراد گھوڑے ہی لیے ہیں، ابن جریر کہتے ہیں: دونوں اقوال میں سے یہ قول ہی قابل ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ اونٹ صبح نہیں کرتا، گھوڑا ہی صبح کیا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے صبح کرتے ہیں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ "ان آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ صبح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی، اور آگ جھاڑنے کا فعل بھی پتھروں پر کھروں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا، اسی طرح صبح سویرے چھاپہ مارنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔"

قرآن کی قسمیں

قرآن کریم میں مجموعی طور پر چوالیس سورتوں میں، ایک سو چار آیات میں ایک سواٹھارہ جگہوں پر قسم کھائی گئی ہے، قرآن مجید میں تینتیس سورتوں میں خالق کائنات کی چھیانوے (۹۶) قسمیں ہیں، ان میں سے تینتیس (۲۳) سورتوں میں سورت کا آغاز قسم سے ہے، اور دونوں قسمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قیامت کے دن کے اثبات اور اس دن انسان کے اعمال کے حساب و کتاب کے بارے میں آئی ہیں، اور چار قسمیں حضرت یوسف کے بھائیوں کی طرف سے ہیں، ایک قسم جادوگروں کی جو فرعون کے لیے کھائی کہ موسیٰ پر غالب آئیں گے، ایک اور قسم شیطان کی ہے جو خدا کے غیر مخلص بندوں کو گمراہ کرنے کے بارے میں ہے، اور پندرہ قسمیں مشرکین، منافقین اور قیامت کے منکرین کی ہیں (تفسیر کبیر صفحہ: 23 اور 24)۔

سوگند (sawgand) اصل میں سوکنتہ (saokanta) ماچس کے معنی میں ہے، اور قسم کھانا ماچس کھانے کا معنی دیتا ہے، کہ یہ گنہگار کو بے گناہ سے فرق کرنے کا ایک طرح کا امتحان تھا، پرانے زمانے میں ماچس کے ملاوٹ والا پانی ملزم کو پلاتے تھے، اور اس کے اثر سے یہ طے کرتے تھے کہ وہ مجرم ہے یا بے گناہ، پھر بعد والے زمانے میں یہ قسم کی جگہ استعمال ہوا ہے، (فرہنگ عمید، جلد 2، صفحہ: 1485)۔

قسم ایک اقرار اور اعتراف ہے جو ایک شخص اپنی عزت پر کھاتا ہے، خدا یا کسی کو گواہ بناتا ہے (فرہنگ فارسی معین، ڈاکٹر معین، جلد 2 صفحہ 1956:-).

عربی زبان میں لفظ "قسم" اور اس کے تمام مشتقات فارسی زبان میں لفظ "سوگند" کے مترادف ہیں، اور قسم کو اس لیے قسم کہا گیا ہے کہ یہ کلام کو دوحصوں میں تقسیم کرتا ہے، کہ صحیح کو غلط اور نادرست کو درست سے الگ کرتا ہے، جبکہ اصطلاح میں قسم ایک جملہ ہے جس کے ذریعے دوسرے جملے کی تاکید ہوتی ہے، (مغنی اللیب ابن ہشام: صفحہ 56)۔

شیخ محمد عبدہ قرآنی قسموں کے بارے میں کہتے ہیں: "جب آپ ان تمام چیزوں پر توجہ دیں گے جن کی قرآن میں قسمیں کھائی گئی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ کچھ لوگوں نے ان چیزوں کے فوائد سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کا انکار کیا یا انہیں حقیر جانا، مختصر یہ کہ وہ ان کی تخلیق کی حکمت سے غافل تھے، اور ان قسموں نے ان سب کا جواب دیا اور لوگوں کو شک و تردید، فریب اور غفلت سے نکالا، اور ہر مخلوق کی کامیابی کو صحیح طور پر ظاہر کیا۔ اعمال خیر کی تعظیم و تکریم کے لیے لوگوں کو ان کے کرنے کی ترغیب ملی، ان میں سے "وَالْعِدِيَّتِ ضَبْحًا" ترجمہ: قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر (جہاد کے میدان کی طرف بڑھتے ہیں)۔

دوسری طرف، قرآن کی قسمیں دنیا کے مسائل اور مخلوقات کی گہرائی میں انسانی فکر اور تحقیق کی رہنمائی کا بہترین ذریعہ ہیں، تاکہ ان کوششوں اور درستگی کے ذریعے علوم اور ردائش کے دروازے انسانی معاشرے کی طرف کھل سکیں، طنطاوی کے مطابق: "قرآن کی قسمیں علم کی کنجیاں ہیں" (الجواہر طنطاوی، جلد 25، صفحہ 258 ابوالقاسم رزاقی کی قرآن کی قسموں سے منقول)۔

پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں اڑاتے ہیں

فَالْمُورِيَّتِ قَدْ حَا۟۟۟

میں قسم کھاتا ہوں نعل سے آگ نکالنے والے گھوڑوں کی، جو اپنی تیز رفتاری اور شدت کی وجہ سے اپنے کھر سے چنگاریاں اڑاتے ہیں یعنی اپنی ٹاپوں سے شرارے جھاڑتے ہیں۔

چنگاریاں جھاڑنے کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ گھوڑے رات کے وقت دوڑتے ہیں، کیونکہ رات ہی کو ان کے ٹاپوں سے جھڑنے والے شرارے نظر آتے ہیں (تفہیم القرآن)۔

فَالْبَغِيْزَاتِ صُبْحًا ۝۳	پھر جو صبح کے وقت (دشمن پر) حملہ کرنے والے ہیں

پھر صبح کے وقت حملہ کرنے والوں کی، کہ صبح کے وقت (دشمن پر) حملہ آور ہوتے ہیں، مفسر اُوسی کہتے ہیں کہ: حملوں میں یہ معمول ہے، وہ رات کو حملہ کرتے تھے کہ دشمن کو پتہ نہ چلے، اور صبح کے وقت چھاپہ مار کار روائیوں کا آغاز کرتے تھے، تاکہ وہ دیکھیں کیا لاتے ہیں اور کیا چھوڑ جاتے ہیں (روح المعانی: 215/30)۔

فَأَتْرَنَ بِهِ نَقْعًا ۝۴	پھر اس موقع پر گرد و غبار اراتے ہیں

یعنی: وہ دوڑتے ہوئے دھول اڑاتے ہیں، اور اپنی تیز رفتاری سے مٹی کو ہوا میں اچھالتے ہیں، اس لیے کہ ان کی رفتار کافی تیز ہے، اور اپنے قدموں کو سختی سے زمین پر مارتے ہیں۔

فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا ۝۵	پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جاگھستے ہیں

پھر وہ دشمن کے لشکر کے بیچ میں گھس کر ان کا محاصرہ کرتے ہیں، اور دشمن کو غفلت میں رکھ کر ان کے بیچ میں داخل ہوتے ہیں تاکہ دشمن کو ان سے مقابلے کا موقع نہ ملے، خداتعالیٰ نے ان تین چیزوں کی قسم کھائی ہے، تاکہ مجاہدین کے گھوڑوں کا مقام اور مرتبہ بتادے جو کہ تیزی سے دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور ان کے کھروں سے آگ کی چنگاریاں اڑتی ہیں، اور صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کرتے ہیں، اور گرد و غبار اڑاتے ہیں، اور دشمن کے بیچ میں جگہ بناتے ہیں، اور ان کو پریشان اور افراتفری کا شکار بناتے ہیں، اللہ تعالیٰ میدان جنگ میں ان گھوڑوں کی خصوصیات ذکر کرنے کے بعد انسان کی سرزنش کرتا ہے کہ اے انسان! تو ناشکرا ہے، اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝۶	حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے

وہ خدا تعالیٰ کے احسان سے چشم پوشی کرتا ہے اسے بھول جاتا ہے اور اپنے رب کے نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے، **یعنی:** اس کا شکر بالکل معمولی سا ہے یا پھر نہ ہونے کے برابر ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ اس سے نعمتوں کے بدلے شکر گزاری چاہتا ہے۔

"کنود" اس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ انکار کرنے والا اور نعمتوں کی ناشکری کرنے والا ہو، حسن بصریؒ کنود کے معنی میں کہتے ہیں: کنود سے مراد وہ شخص ہے جو مصیبتوں کو یاد کر کے نعمتوں کو بھول جاتا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے کہا: لکنود کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرنے والا، حضرت حسن بصریؒ نے بھی یہ کہا ہے کہ وہ مصائب کو یاد کرتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

ابوبکر واسطی نے کہا: جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں خرچ کرے، وہ "کنود" ہے، اسی طرح ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ: کنود بمعنی قلیل الخیر، اور ارض کنود شور (تھوروالی) زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو، (تفسیر مظہری: جلد 7 ص: 467)۔

ترمذی نے کہا: جو آدمی نعمت کو دیکھے اور نعمت دینے والے کو نہ دیکھے وہ "کنود" ہے، اس قول کے مطابق اس کا معنی ناشکری ہے کہ اوپر اس لفظ کا ترجمہ ناشکرا کیا گیا ہے۔

آیت مبارکہ "وَالْعِدِیْتُ ضَبًّا" میں ہم نے ملاحظہ کیا کہ: جہاد اور دفاع اس قدر قیمتی ہیں کہ اللہ سبحان و تعالیٰ مجاہدین کے گھوڑوں کی سانس کی قسم کھاتا ہے، آیت مبارکہ میں ہم نے دیکھا کہ گھوڑے اللہ کی راہ میں دوڑتے ہیں، جبکہ انسان اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں ضد اور سرکشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۝	اور وہ خود اس پر گواہ ہے

یعنی انسان کا ضمیر اس سے باخبر ہے، یہاں تک کہ جن معاملات میں وہ بھانہ تلاش کرتا ہے یا عذر کرتا ہے وہ خود جانتا ہے کہ کیا کر رہا ہے، "شہید" شہد کے مادہ سے ہے، وہ شخص جو حاضر ہو اور کسی کام کی نگرانی کرتا ہو۔

لفظ "لَشَهِيدٌ" کے بارے میں علماء کی رائے:

- 1۔ انسان اپنے کاموں میں کوتاہی پر خود گواہ ہے کہ وہ شکر ادا نہیں کرتا۔
- 2۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کے بندے شکر گزار نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ انسانی روح میں موجود چیزوں سے باخبر ہے، اور ان پر گواہ ہے، جس طرح انسان اپنے اعمال قول و فعل کا گواہ ہے،

اسی طرح وہ نعمتوں کی ناشکری، نعمتوں کے انکار اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے عطایا کے انکار پر بھی گواہ ہے۔

یعنی: اپنی ناشکری کا خود گواہ ہے اور بہ زبال حال و قال اپنے خلاف یہ گواہی دیتا ہے، اس لیے کہ اس ناشکری کا اثر اس پر ظاہر ہے، قتادہ اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ: اس کا معنی یہ ہے کہ: "اللہ تعالیٰ اس ناشکری پر گواہ ہے۔"

اور وہ مال و دولت سے بہت زیادہ محبت کرنے والا ہے	وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝

اور اسے جمع کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے، اسے دنیاوی چیزوں سے لگاؤ ہے، مال و دولت سے محبت کرنے والا اور دنیا کا عاشق ہے، اور اسے دولت و ثروت جمع کرنے کا لالچ ہے، اس کے برعکس عبادت کا شوق، اور نعمتوں کی شکر گزاری میں اس کی دلچسپی بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ خدا کے قسم کھانے کی ایک اور صورت ہے، اور انسان کی دوسری صفت "کنود" ہے، یعنی ایسا انسان مال سے بہت زیادہ محبت کرنے والا اور بخیل ہے، اور وہ خیرات، زکوٰۃ اور نفقہ نہیں دیتا، اس کا خیر کسی کو نہیں پہنچتا، نہ کسی کو مالی نہ اخلاقی فائدہ پہنچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دولت کو خیر کہا ہے، ایک عام اصطلاح کے طور پر جو لوگوں میں مشہور ہے، کہ مال "خیر" ہے، یعنی اس کے ذریعے انسان کو بہت ساری نیکیاں نصیب ہوتی ہیں، اگر اسے اللہ کی رضا کی راہ میں خرچ کرے۔

یاد رہے کہ: اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ: مال میں دلچسپی انسان میں ایک فطری امر ہے، لیکن جو چیز قابل مذمت ہے وہ انتہائی اور ضرورت سے زیادہ محبت اور دلچسپی ہے جس میں ایک طرف انسان ہر طرح کی آمدنی اور دولت کے حصول میں مشغول رہتا ہے، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب کیے گئے حقوق ادا نہیں کرتا۔

مفسرین نے اس آیت کے مفہوم کے بارے میں دو قول بیان کیے ہیں، ایک یہ کہ انسان کو پیسے کا بہت زیادہ شوق ہے، دوسرا یہ کہ پیسے کی محبت کی وجہ سے وہ لالچی اور کنجوس ہے، مفسر ابن کثیر کہتے ہیں: "دونوں معنی صحیح ہیں" لہذا دونوں پہلوؤں کا خلاصہ یہ ہے کہ: انسان دولت

کی محبت میں حد سے تجاوز کرتا ہے، اور اس کے حاصل کرنے میں سخت محنت کرنے والا، اور اس کے ذخیرہ کرنے میں بہت مستعد ہوتا ہے کہ ہاتھ اور پاؤں میں فرق نہیں کرتا، مذکورہ بالا آیات سے درج ذیل نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

1- حرف "ف" کے ساتھ پانچ قسمیں مربوط ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی جنس سے ہیں، یعنی یہ دوڑنے والے ہی ہیں جو تیز دوڑنے سے اپنے سینوں سے ایک سخت آواز نکالتے ہیں، جو ان کے تیز دوڑنے کو ظاہر کرتی ہے، اور یہی ہیں کہ جب ان کے کھر اور نعل کسی پتھر سے ٹکراتے ہیں تو آگ کی چنگاریاں اڑتی ہیں، یہی ہیں جن کو صبح سویرے حملہ کرنے کے لیے چُنا گیا ہے، اور یہی ہیں کہ تیز دوڑنے کی حالت میں گرد و غبار اڑاتے ہیں، اور یہی ہیں کہ دشمن کی صفوں میں گھس کر کارروائی کرتے ہیں۔

اس طرز بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جن مفسرین کے نزدیک ان تیز دوڑنے والوں سے مراد صرف گھوڑے ہیں، ان کا استدلال ہے کہ کسی بھی دوسرے دوڑنے والوں پر یہ خصوصیات درست نہیں آتیں، البتہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد دور جاہلیت میں عربوں کے بے وقت حملے ہیں۔

2- مذکورہ بالا قسموں کا جواب یہ ہے کہ: یقیناً انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے، (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تفسیر جلوہ های از اسرار قرآن: حکمتیار)۔

قرآن عظیم میں متعدد آیات میں بعض ناشکرے بندوں کی صفات بیان کی گئی ہیں، جو مصیبت کے وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، لیکن خوشحالی اور نعمت کے وقت یا مصیبت رفع ہونے کے بعد اللہ سے منہ موڑتے ہیں اور اسے بھول جاتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیات: "63 اور 64" سورہ انعام میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "قُلْ مَنْ يُجِيبُكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ لَّيْنُ الْجَنَّةِ ۚ هَذِهِ لَتَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝۶۳ قُلِ اللَّهُ يُجِيبُكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ مُشْرِكُونَ ۝۶۴" ترجمہ: "کہو بھلا تم کو جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں سے کون چھٹکارا دیتا ہے (جب) کہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنهانی سے پکارتے ہو (اور کہتے ہو) اگر خدا ہم کو اس (تنگی) سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکر گزار ہوں، کہو کہ خدا

ہی تم کو اس (تنگی) سے اور ہر سختی سے نجات بخشتا ہے، پھر (تم) اس کے ساتھ شرک کرتے ہو۔"

اسی طرح فرماتا ہے: "وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا الْجُنُبَةَ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَابِلًا ۖ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ ۖ كَذَٰلِكَ زَيْنٌ لِّلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۲" "سورہ یونس: 12) ترجمہ: "اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا (ہر حال میں) ہمیں پکارتا ہے پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کردیتے ہیں تو (بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کو ان کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے ہیں۔"

"فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ ۖ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝۱۵ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۖ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝۱۶" (سورہ فجر) ترجمہ: "پس لیکن انسان جب اس کا رب اسے آزمائے، پھر اسے عزت بخشے اور اسے نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی (15) لیکن جب وہ اسے آزمائے، اور اس پر اس کا رزق تنگ کر دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے (16)۔"

"فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۖ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۖ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۖ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِن أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝۴۹" (سورہ زمر: 49) ترجمہ: "جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے، پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے (میرے) علم (ودانش) کے سبب ملی ہے (نہیں) بلکہ وہ آزمائش ہے، مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔"

"وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَیْنِ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۵۰ فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ یَجْلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۶۱" (سورہ التوبہ: 76 و 75) ترجمہ: "اور ان میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہم کو اپنی مہربانی سے (مال) عطا فرمائے گا تو ہم ضرور خیرات کیا کریں گے اور نیکوکاروں میں ہو جائیں گے، لیکن جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے (مال) دیا تو اس میں بخل کرنے لگے اور (اپنے عہد سے) روگردانی کر کے پھر بیٹھے۔"

رب تعالیٰ ایسے ناشکرے اور بے ایمان لوگوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ ایک دن آئے گا جس میں بازپرس ہوگی، قیامت قائم ہوگی، اور جو قبروں میں سوئے ہوئے ہیں وہ اٹھیں گے، اور جو کچھ سینوں میں ہے اس کو بھی دیکھا جائے گا، وہ سب رب کے سامنے کھڑے ہوں گے، اس دن وہ جان لے گا کہ اس کا رب دوسروں سے زیادہ اس کی حالت سے باخبر ہے، وہ جانتا ہے کہ کس نے کیا ناشکری کی ہے، اور کون کس انعام کا مستحق ہے، "وَلَيْنَ أَذْقَنَهُ رَحْمَةً مِّمَّا مِنْ بَعْدِ صَرَآءِ مَسْنَاهُ لِيَقُولَنَّ هَذَا لِيْٓ ۝ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۝

وَلَيْنَ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِيْ عِنْدَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۝ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا ۝ وَلَنُنِذِرَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝" (سورہ فصلت: 50) ترجمہ: "اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اس کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت برپا ہو، اور اگر (قیامت سچ بھی ہو اور) میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو میرے لیے اس کے ہاں بھی خوشحالی ہے، پس کافر جو عمل کیا کرتے ہیں وہ ہم ان کو ضرور جتائیں گے اور ان کو سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔"

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا کہ جو (مردے) قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے	أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝

کیا وہ (دنیا کے بھکاوے میں آنے والا انسان) نہیں جانتا کہ جو کچھ قبروں میں ہیں (سب حساب و کتاب کے لیے) دوبارہ اٹھائے جائیں گے، "إِذَا بُعْثِرَ" بیدار کر کے قبروں سے نکالا جائے، کیا یہ ناشکرا انسان جس نے مال و دولت کے پیچھے دل کھودیا ہے، یہ نہیں جانتا کہ ایک وقت آئے گا کہ: جب قبریں پھٹ جائیں گی، اور ان قبروں میں مدفون لوگوں کو قبروں کی گھرائی سے نکالا جائے گا، جہاں وہ ان کے کھنے کے مطابق میٹھے نیند سوئے ہوئے تھے، سورہ یس آیت "52" میں فرماتا ہے کہ: "قَالُوا يَوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۚ" جب وہ زندہ کیے جائیں گے تو کہیں گے: "ہائے ہماری بربادی! کس نے ہمیں ہمارے سونے کی جگہ سے اٹھادیا؟" انہیں اچانک یاد آئے گا کہ دنیا میں ایسا وعدہ دیا گیا تھا، "هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ" (یہ وہ ہی ہے جو رحمان ذات نے وعدہ کیا اور رسولوں نے سچ کہا تھا) حقیقت یہ ہے کہ: قیامت کا ذکر، ناشکروں اور دولت کے پجاریوں کے لیے تنبیہ ہے۔

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝۱۰

اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر
کر دیا جائے گا

جو راز اور اسرار دلوں میں چھپے ہوئے ہیں ان کو ظاہر کیا جائے گا، اور سارے راز کھل جائیں گے، یعنی جتنے بھی راز پوشیدہ ہوں گے سب کے سب اس دن ظاہر ہوں گے اور اس کے بارے میں حساب و کتاب ہوگا۔

"يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ" (سورہ طارق) اس دن سارے راز فاش ہوں گے) یہ مقام ہے کہ : "فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مَشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يُوَلِّتُنَا مَا لِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا" (سورہ کہف : 49) ترجمہ: "تو تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اسمیں (لکھا) ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہائے شامت، یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات چھوڑتی ہے نہ بڑی سب لکھ رکھا ہے۔"

جس دن ہم ان کے لیے کتاب اور اعمال نامے نکالیں گے جو مکمل طور پر کھول دیے جائیں گے، یعنی: ان سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہوگی، ہر چیز ان پر ظاہر کر دی جائے گی، اور ان سے کھا جائے گا: کہ اپنا نامہ اعمال خود د پڑ ہو: "وَكُلُّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَبْعَةً فِي عُنُقِهِ ۝ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝ اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۝ كَفَىٰ بِتَفْسِكِ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا" (الاسراء : 14-13) ترجمہ: اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بصورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے، اور قیامت کے روز (وہ) کتاب اسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا (کھا جائیگا کہ) اپنی کتاب پڑھ لے، تو آج اپنا محاسب خود ہی کافی ہے۔"

تم جو بھی کہو، یہاں وہ رب سے کچھ چھپا نہیں سکتا، یہ دنیا کی طرح نہیں ہے، کہ اس کی زبان کچھ اور کہتی ہے، اس کی آنکھیں کچھ اور دیکھتی ہیں، اس کے کان کچھ اور سنتے ہیں اور اس کے دل میں کچھ اور ہے، یہ حال ہے آج لوگوں کا، اسی لیے انہیں سکون نہیں ہے، چونکہ وہ ہر وقت اور ہر صورت حال میں ایک الگ شناخت اور شخصیت رکھتے ہیں، اسی لیے مکمل طور پر متزلزل، الجھنوں میں الجھے ہوئے اور پریشان ہیں۔

إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ خَبِيرٌ ۝۱۱

بیشک ان کا رب اس دن ان کے متعلق یقیناً
خوب خبر رکھنے والا ہے

اس کے بندوں کا کوئی کام اس سے پوشیدہ نہیں ہے، ان کو ان کی اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال اور افکار و نظریات پر مکمل آگاہی رکھتا ہے۔

"خبیر" کا مطلب ہے ظاہر اور باطن کا علم ہونا، اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی لوگوں کے معاملات سے باخبر ہے، البتہ قیامت کے دن یہ صفت "خبیر" ہونے کی سب پر ظاہر ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے، اس کی بازپرس بھی درست ہے۔

انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ پوچھنے، آزمائش اور حساب کا وہ دن ضرور آئے گا، کہ دلوں میں چھپے راز اور سینوں میں موجود ارادے ظاہر ہوں گے، اگر اس نے اپنی ناشکری کا اقرار نہ کیا اور اپنے ارادے کو نہ بدلا، اور اس کا ازالہ نہ کیا، تو قیامت کے دن اس کا سامنا رب العالمین سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے ڈر اور خوف

پہلی بات یہ کہ ہم اپنے مہربان اللہ سے کیوں ڈریں؟ اللہ تعالیٰ جو کہ کمال و جمال مطلق کا حامل ہے اور رحیم و کریم ہے، اس سے تو انسان کو محبت کرنا چاہیے؟، جواب: انسان کا اللہ سے ڈرنے کی بنیاد کا خلاصہ دو چیزوں میں کیا جاسکتا ہے:

1۔ بعض اوقات انسان کا خوف ان فرائض اور ذمہ داریوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس کے کندھوں پر ہیں، اور ممکن ہے کہ اس کو پورا کرنے میں وہ کوتاہی کرے، نتیجتاً وہ خدا کی عدالت میں اس کا جواب نہیں دے سکے گا، اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی یا دوسروں کے حقوق کا احترام نہ کرنے کی صورت میں اسے سزا دی جائے گی، یا محبوب کی نظروں میں اپنا مقام کھودے، اسے اپنے گناہوں کا ڈر ہے۔

2۔ بعض اوقات خوف اللہ کے مقام کی عظمت کو پہنچانے اور خدا کے لامحدود اور عظیم الشان وجود کی طرف توجہ کی وجہ سے ہوتا ہے، کبھی کبھی ملاقات کرنے والا اس کی شان و شوکت سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل میں خوف محسوس کرتا ہے، اس حد تک کہ وہ بولتے وقت ہکلاتا ہے، اور بعض اوقات اپنی بات بھی بھول جاتا ہے، حالانکہ اس عظیم شخصیت کو اس سے اور سب سے بے پناہ محبت اور پیار ہوتا ہے، اور اس سے کوئی غلط کام بھی سرزد نہیں ہوا، اس

قسم کا خوف عظمت کے ادراک کا عکس اور رد عمل ہے، یہ حالت صرف ان لوگوں کو حاصل ہوسکتی ہے جو خدا کی پاک ذات کی عظمت اور خدا کے بلند مرتبہ سے واقف ہوں، اور جنہوں نے اس کے قریب ہونے کی لذت کا مزہ چک لیا ہو۔

قرآن کریم اس حالت کو علم و معرفت والے بندوں کے لیے خاص قرار دیتا ہے، "إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" (سورہ فاطر آیت: 28) ترجمہ: "خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں، بیشک خدا غالب (اور) بخشنے والا ہے۔"

اس قسم کا خوف دنیاوی اور نفسانی اور خدا کے علم، قدرت اور حکمت کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے۔

خوف الہی، خواہ وہ پہلے معنی میں ہو یا دوسرے معنی میں، اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام اور مقام و مرتبہ اور انسانی وجود میں ان حقائق سے متعلق امور کی یاد دہانی اور اس کی طرف مکمل توجہ کا سب سے اہم عنصر ہے، اس وجہ سے خوف خدا اور ڈر کا مقام دنیاوی غفلتوں، انحرافات اور لغزشوں سے بچنے کے لیے سب سے قیمتی مظہر ہے، ایک وقت میں سچائی کی سمجھ کے ساتھ خوف انسانی وجود میں اندرونی اور روحانی خوشی کو ظاہر کرتا ہے، اس خوف سے جو خوشی وابستہ ہے، وہی خوشی دنیا کے عظیم ترین شخصیت کے سامنے ہونے کی خوشی ہے، کہ دباؤ کے باوجود اس کی وجہ سے ہونے والی موجودگی اور پریشانی کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا، اور اسے ہمیشہ خوبصورت ترین لمحے کے طور پر یاد رکھا جائے گا، خوف اور غصہ ہر وقت قابل مذمت اور تکلیف دہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو قربت کا عامل، زیادہ محبت، آخرت کی سعادت اور نجات اور مستقبل قریب میں خوف سے نجات کی ضمانت بھی ہے۔

اگر انسان ایک طرف خدا کی عظمت و بزرگی اور دوسری طرف اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کی وجہ سے خوف الہی تک نہ پہنچ سکے، اور حقیقی معنی میں عاجزی اور خوف اس کے وجود میں غالب نہ ہو تو وہ اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے اور توبہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، قیامت کے دن وہ ایک افراتفری اور انتہائی خوفناک صورتحال سے دوچار ہوگا، جس کی دہشت خدا کے سامنے ہونے کے خوف سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة القارعه

یہ سورت مکی ہے اس کی « ۱۱ » آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کا نام لفظ قارعه سے شروع ہونے کی وجہ سے جس کا معنی خوف و ہراس ہے "قارعه" رکھا گیا، سورت کے نام کا اس کے محور سے جس پر یہ سورت چل رہی ہے گہرا تعلق ہے، "قارعه" قیامت کے ناموں میں سے ایک ہے، جیسے "الحاقہ"، "الصّاحۃ"، "الغاشیۃ" وغیرہ، یہ سورہ بعد از سورہ قریش نازل ہوئی ہے۔

"قارعه" قَرَعَ یا فُرِعَ کے مادہ سے ہے، بمعنی کھٹکھٹانے کے ہے، "قارع" یعنی: ٹھوکنے والا، مِقْرَع: یعنی: ہتھوڑا، یا ٹھوکنے کا آلہ سے لیا گیا ہے، اور یہاں "قارعه" سے مرا قیامت ہے، کیونکہ یہ موجودہ حالات کو اپنے آنے کی ساتھ کچل دے گی۔

سورة القارعه کا مرکزی نکتہ

اس مبارک سورہ کی بنیادی اور عمومی توجہ درحقیقت لوگوں کو اس ہولناک واقعے سے آگاہ کرنا ہے، اور انہیں بے حسی اور ذمہ داری کی کوتاہی سے نجات دلانا ہے، نیز قیامت کے مسئلے کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کی اصلاح کرنا ہے، لوگوں کو ان کے عقیدے کے مطابق تقسیم کرنا قیامت اور قیامت کے واقعات میں سے ہے۔

سورہ کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

"سورة القارعه" مکی ہے، اس میں ایک (1) رکوع، گیارہ (11) آیتیں، پینتیس (35) الفاظ، ایک سو ساٹھ (160) حروف اور اٹھاسی (88) نقطے ہیں۔

(قرآن کی سورتوں میں حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے تفسیر احمد سورة الطور ملاحظہ کریں)

سورة القارعة اور سورة العاديات کا ربط وتعلق

سورة العاديات کے آخر میں قیامت کی تفصیل بیان کی گئی ہے، آیات "9 تا 11" لیکن سورة القارعة میں مجموعی طور پر قیامت کے دن اور اس کے کھڑکھڑانے کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

سورة القارعة کے مشتملات اور فضیلت

اس سورت کے موضوع، مشتملات اور ادبی اسلوب سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکی دور کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے، اس سورت میں قیامت کے ابتدائی اور بعد کے مراحل کو مختصر مگر جامع الفاظ کے ساتھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تمام ہیبت ناک مناظر دیکھنے والوں کے سامنے مجسم طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں، قیامت کے دن کا ذکر "القارعة" کے نام سے کیا ہے، جب تمام چیزوں کا ریزہ ریزہ ہو جانا اور ان کے درمیان ٹکراؤ ایک خوفناک آواز کی صورت میں ہوگا، جس دن موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا، اجرام فلکی اپنے مدار سے نکل کر ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے، پہاڑ چلنے لگیں گے، ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے، جیسا کہ خلا میں رنگین اون بکھری ہوئی ہے، خلا میں اور زمین پر موجود بڑے بڑے اجسام و اجرام کے ٹکرانے کی خوفناک آواز ہر طرف گونج رہی ہوگی، اس دن لوگ تتلیوں یا چھوٹی ٹڈیوں کی طرح خوف اور ڈر کے مارے ہر طرف بکھرجائیں گے، پھر قیامت کے اگلے مرحلے کا نقشہ کھینچ کر بتایا گیا کہ اس میں ہر ایک کی تقدیر اس کے اعمال کے وزن کے مطابق طے ہوتی گی، اگر اس کا عمل با عزت ہوا، تو اس میں وزن ہوگا، اس میں معیار ہوا، قیمتی ہوا، تو وہ ایک مطمئن زندگی حاصل کرے گا، لیکن اگر اس کا عمل ہلکا، خالی، فضول بے مقصد ہوا تو جہنم کی تپتی ہوئی آگ اسے اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور اس کے عمل کا بدلہ جہنم کا دھکتا گڑھا ہوگا۔

سورہ مبارکہ قارعة قیامت کے تصادم کی خصوصیت کو یاد دلاتے ہوئے اس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ہی دنیاوی نظاموں کے تمام روابط ٹوٹ کر اور جس طرح قدرت کا نظام ٹکرا جائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اسی طرح انسانوں کا مربوط نظام بھی فنا ہو جائے گا۔

قیامت کے آنے پر دوسرا نظام قائم ہوگا، اس نئے نظام میں لوگوں کی قدرو منزلت کا تعین معاشرتی حیثیت اور معاشی دولت کی بنیاد پر نہیں

کیا جائے گا ، بلکہ لوگوں کو جانچنے کا واحد معیار ہر ایک کا پاکیزہ عمل اور صحیح عقیدہ ہوگا، اس دن جس کی نیکیاں اس کے اعمال نامے میں بھاری ہوں گی اس کا انجام بہتر ہوگا، اور جس کے اعمال نامے میں نیک عمل نہ ہوں تو دوزخ کے عذاب سے دچار ہونے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

سورة القارعة کے پیغامات

- 1- قیامت ، متکبر اور متکبرانہ رویوں کو کچلنے والی ہے، "الْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ"۔
- 2- قیامت انسانی سوچ سے باہر ہے، نبی کو بھی وحی الہی کے بغیر اس کا علم نہیں "وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ"۔
- 3- قیامت انسان کے حیرت میں پڑنے اور بکھرنے کا دن ہے "كَالْفَرَّاشِ الْمُبْتُوثِ"۔
- 4- جنت عمل کے بدلے دی جائے گی نہ کہ خواہش اور آرزو پر "مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ، فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ"۔
- 5- مکمل خوش و خرم زندگی قیامت کے لیے خاص ہے، کیونکہ اس دنیا میں کامیابی کے ساتھ بیماری، چوری، حسد، نقصان وغیرہ بھی ہوتے ہیں "عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ"۔
- 6- زندگی سے مطمئن ہونا جنتی معاشرے کی نشانیوں میں سے ہے "فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ"۔
- 7- سزا اور انجام کی بنیاد عمل ہے جسے انصاف کے ترازو میں تولا جائے گا ، "ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ، خَفَّتْ مَوَازِينُهُ"۔

سورة قارعه کی آیات مبارکہ کی عمومی تقسیم

سورت کی پہلی تین آیات قیامت کے عظیم واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یعنی : وہی کھڑکھڑانے والی ۔
آیات "4 اور 5" میں حالات اور پہاڑوں کی صورتحال بتائی گئی ہے ۔
آیت "6" سے سورت کے آخر تک قیامت پر ایمان اور عدم ایمان کے مطابق لوگوں کی تقسیم بتائی گئی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة القارعة

الْقَارِعَةُ ١ مَا الْقَارِعَةُ ٢ وَمَا أَذْرِكْ مَا الْقَارِعَةُ ٣ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ٤
وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ٥ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ٦ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ٧ وَأَمَّا مَنْ
خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ٨ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ٩ وَمَا أَذْرِكْ مَا هِيَةٌ ١٠ نَارٌ حَامِيَةٌ ١١

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
الْقَارِعَةُ ١	کھڑکھڑانے والی
مَا الْقَارِعَةُ ٢	کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی ؟ (بڑی آفت کیا اور کیسی ہے ؟)
وَمَا أَذْرِكْ مَا الْقَارِعَةُ ٣	تم کیا جانو وہ بڑی آفت کیا ہے اور کیسی ہے
يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ٤	وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوجائیں گے
وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ٥	اور پہاڑ رنگ برنگے دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہوجائیں گے
فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ٦	تو لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے
فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ٧	تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا
وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ٨	اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے
فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ٩	اس کی جائے قرار گہری ہاویہ ہوگی
وَمَا أَذْرِكْ مَا هِيَةٌ ١٠	اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے ؟
نَارٌ حَامِيَةٌ ١١	ایک بھڑکتی ہوئی آگ

سورت کی تفسیر

محترم قارئین:

اس سورت کی مبارک آیات میں: قیامت کا خوف، اور انسان کی نیکی اور بدی کا پیمانہ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

الْقَارِعَةُ ۝	کھڑکھڑانے والی

"قَارِعَةُ" کھڑکھڑانے والی، مشکل اور بڑی آفت کو کہتے ہیں (جس کا ذکر سورہ رد آیت : "31" میں ہے) "الْقَارِعَةُ" قیامت کے ناموں میں سے ایک ہے۔ یعنی : دلوں کو ہلا دینے والی اپنے خوف و ہراس سے، یا اللہ کے دشمنوں کو کچلنے والے قیامت کے دن کے عذاب سے، دلوں کو دہلانے والی قیامت کو "الْقَارِعَةُ" کہا گیا ہے، کیونکہ یہ اپنی وحشت کی وجہ سے دلوں کو ہلا دے گی۔

"الْقَارِعَةُ" قرع کے مادہ سے ہے، اس کا لفظی ترجمہ: "ٹھوکنے والی" ہے، قرع کے معنی کسی چیز کو کسی چیز پر زور سے مارنے کے ہیں، جس سے سخت آواز نکلے، جس طرح کہ اس کی تعبیر سورہ رد آیت "31" میں آئی ہے : "وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتَّى يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۚ" ترجمہ: اور کافروں پر ہمیشہ ان کے اعمال کے بدلے مصیبت آتی رہے گی۔ یا ان کے مکانات کے قریب نازل ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ خدا کا وعدہ آپہنچے۔ بے شک خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے، یا ان کے گھر کے قریب کھیں نازل ہوتی ہے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان پورا ہو، یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

اہل کفر اپنے کیے کی وجہ سے مسلسل ایک کربناک آفت یا عذاب الہی سے دوچار رہیں گے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا: اس مبارک آیت میں "قارعة" سے مراد ایک بڑی آفت ہے جو انسانوں کی حالت کو بگاڑ دے گی، اور ان کے حالات کو اس طرح کچل دے گی کہ وہ دوبارہ وہ خود کو منظم نہیں

کرسکیں گے ۔

سورہ حاقہ میں یہ تعبیر اس طرح بیان کی گئی ہے : "الْحَاقَّةُ ۝۱ مَا الْحَاقَّةُ ۝۲ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝۳ كَذَّبَتْ ثَمُودٌ بِقَارِعَةِ ۝۴" (سورہ حاقہ: 1 تا 4) "(دن) واقع ہونے والی (قیامت) وہ واقع ہونے والی کیا ہے؟ (قوم) ثمود اور (قوم) عاد نے اس کھڑکھڑانے والی (قیامت) کو جھٹلایا" یہاں قارعہ سے مراد وہی بڑی آفت ہے ، ایک بڑی آفت جو ایسی صورت حال کی طرف لے جائے گی، جو انسانوں کے لیے سازگار نہیں ہوگی ۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے : "القارعة" قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے ، قیامت کا آغاز جو دنیا کو ہلا دے، اور اس کی خوف اور وحشت کفار، منافقوں اور مشرکوں کے دلوں کو لرزادے، بلاشبہ اس قسم کا خوف و دہشت کافروں ، منافقوں ، مشرکوں اور بدکاروں کو گھیر لے گی، جبکہ اہل ایمان خوش و خرم اور مصائب و آلام سے دور رہیں گے (اس کی تفصیل سورۃ البقرہ: 262 ، سورہ مائدہ: 69 ، سورہ یونس: 62 ، سورہ زخرف: 68 ، سورہ احقاف: 13 ، ملاحظہ فرمائیں)۔

مَا الْقَارِعَةُ ۝۴	کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی ؟ (بڑی آفت کیا اور کیسی ہے؟)

"ما" کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ یہ سوال اس کی عزت و تکریم کے لیے ہے، یعنی یہ سخت اور شدید ٹھونکنے والی کیا ہے؟

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۴	تم کیا جانو وہ بڑی آفت کیا ہے اور کیسی ہے

یہ تکرار خوف کی شدت اور قیامت کے دن دہشت کے بڑھنے پر بھی تاکید کرتی ہے، یعنی تم کیا جانو کہ وہ کھڑکھڑانے والی کتنی بڑی اور دہشت ناک ہے؟ یعنی وہ کھڑکھڑانے والی اس سے بڑی ہے کہ انسانی سمجھ اس تک پہنچ سکے اور اس کا ادراک کرے، اور اس کا تصور بھی کرے ، اس کے بعد خود ہی اگلی آیات میں اس کی وضاحت کرتا ہے:

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝۵	وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوجائیں گے

جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ادھر ادھر حیران و پریشان

پھر رہے ہوں گے، "الْمَبْثُوثِ" بکھرے ہوئے، "یوم" قیامت، یہ وہ دور ہوگا جو پہلی صور پھونکنے سے شروع ہوگا، اور لوگوں کے درمیان فیصلے پر ختم ہو جائے گا، "الْفَرَّاشِ" پروانے، اسم جنس ہے، ایسے پروانے مراد ہیں جو آگ کی روشنی کے گرد پریشان گھومتے ہیں، جلتے ہیں اور گرتے ہیں، عرب کے لوگ، نادانی، الجھن اور کام کے انجام سے بے خبری پر تتلی یا پروانے کی مثال دیتے ہیں۔

"الْمَبْثُوثِ" پھیلے ہوئے -

اور پہاڑ رنگ برنگے دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہوجائیں گے	وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُفُوشِ ۝

"كَالْعُفُوشِ" اُون، دھنی ہوئی اُون، "الْعُفُوشِ" دھنی ہوئی، یا دھنکی ہوئی اور گرد و غبار کی طرح ہوا میں بکھرے ہوئے ہوں گے، کیونکہ وہ زور سے ہلے گئے اور اُکھڑ جائیں گے، اور اپنی جگہ سے دور جا گریں گے، یہاں تک قارعہ یعنی قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے، یعنی جب وہ عظیم اور کربناک واقعہ پیش آئے گا جس کے نتیجے میں پورا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا تو لوگ اس طرح بھاگ کر منتشر ہوجائیں گے جیسے کہ کیڑے مکوڑے اور پتنگے جو روشنی کی طرف آتے ہیں اور ہر طرف بکھرے ہوتے ہیں، اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے، پہاڑوں کو رنگین اُون سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ ان کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، یہ اس خوفناک دن یعنی: قیامت کے دن کی خصوصیات کی دوسری تفصیل ہے۔

مفسر صاوی نے کھاہے کہ: انسان کی حالت کو پہاڑوں کے ساتھ اس لیے ذکر کیا تاکہ یہ بتائے کہ قارعہ مضبوط بڑے اور سخت پہاڑوں کو اس طرح متاثر کرے گا اگرچہ وہ پہاڑ مکلف بھی نہیں ہیں، لیکن وہ بکھر کر دھنی ہوئی اُون کی طرح ہوں گے، تو پھر ایک کمزور انسان کی کیا حالت ہوگی؟ (صاوی: 374/4)۔

پھر اس دن انسانوں کی حالت کا ذکر کیا جو دو قسموں میں تقسیم ہوں گے، ایک گروہ خوش نصیب، دوسرا گروہ بدبخت، بدنصیب۔

تو لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے	فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝

"ثَقُلْتُ" بھاری ہوئے، "مَوَازِيْنُهُ" جمع میزان، ترازو، اس کو جمع کی صورت میں ذکر کرنا اس کی تعظیم کے لیے ہے، یا جمع موزون، یعنی: انسانی اعمال کی وجہ سے، (ملاحظہ فرمائیں: سورہ اعراف: 8)۔

تو جس شخص کی نیکیوں کے اعمال نامے اور ترازو بھاری ہو گئے، یعنی اس کی نیکیاں زیادہ ہوئیں تو اس کے اچھے اور نیک کاموں کو ترجیح دی جائے گے، کیونکہ وہ پاکیزہ اور خوشی کا باعث ہیں، میزان یا ترازو کے بارے میں علماء کی تین آراء ہیں، اور تینوں نظریات درست اور تائید شدہ ہیں:

- 1- قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کے صحیفے تولے جائیں گے۔
- 2- انسان خود ہی ترازو میں تولے جائیں گے۔
- 3- قیامت کے دن انسان کے اعمال مجسم بنا کر تولے جائیں گے۔

یادر ہے کہ: جزاء و سزا کی بنیاد انسانوں کا عمل ہے، جس کو انصاف کے ترازو میں تولا جائے گا، "ثَقُلْتُ مَوَازِيْنُهُ" خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ۔

یہ آیت اور دیگر آیات قیامت کے پیمانے کے بارے میں بتاتی ہیں کہ وہ میزان اور پیمانہ حق ہے، اہل السنہ والجماعت کے صحیح عقیدے کے مطابق انسانی اعمال کو تولا جائے گا۔

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ،	تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا

"عِيشَةٍ" زندگی، "رَاضِيَةٍ" راضی کرنے والی، یعنی: ایسی زندگی جس سے وہ راضی اور خوش ہو، (ملاحظہ ہو: سورہ حاقہ 21) تو وہ اچھی زندگی میں ہوگا، یعنی: وہ پاکیزہ اور باوقار زندگی میں، نعمتوں سے بھری جنت میں، صحیح جگہ اور محفوظ مقام پر، صحت اور انسانیت کے مقام پر ہوگا، خوشی و سکون اور مسرت والی زندگی بسر کرے گا۔

"عِيشَةٍ" ایک ایسا لفظ ہے جس میں جنت کی تمام نعمتیں شامل ہیں، "راضی" رَضِيَ کے مادہ سے ہے، اطمینان قلب کے بعد کی حالت کو رضایت کہتے ہیں، اور ایسے شخص کو راضی کہا جاتا ہے، قیامت کے دن ہر کوئی اپنے حقوق پر مطمئن ہوگا، اور ہر کسی کو اپنے اعمال کے نتائج پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، اہل جنت جسم، روح اور دل کے لحاظ سے خوشی، سکون اور اطمینان میں ہوں گے، کوئی غم، غصہ اور ناراضگی ان

کو نہیں ہوگی، بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی سے راضی ہوں گے۔

اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے

وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝

"خَفَّتْ" ہلکے ہوئے، اس سے مراد نیکیوں کا ہلکا ہونا ہے، یا نیکیوں کا برائیوں کے مقابلے میں کم ہونا، یعنی: اس کے نیکیوں کا پلڑا نیکیوں کی کمی کی وجہ سے وزن نہ رکھتا ہو، اور اس کے گناہوں کا بوجھ زیادہ ہو تو وہ رحمت سے دور ہوگا، اور تباہی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

"خَفَّتْ" ثَقُلَتْ کے مقابلے میں ہے، خَفَّتْ: یعنی: ہلکا ہونا، خفیف: ہلکا، اس مبارک آیت کا یہی موضوع قرآن عظیم کی متعدد آیات میں مذکور ہے، اگر ہم آیات مبارکہ کے مفہوم پر غور کریں تو اس آیت کا مفہوم ہمارے لیے بالکل واضح ہو جائے گا۔

سورہ اعراف میں فرمایا گیا ہے کہ: "اس دن حق کا وزن ہوگا، پس جس کا پیمانہ وزنی ہوگا وہی نجات پائے والا ہے، اور جس کا پیمانہ ہلکا ہوگا، پس وہی ہیں جو خود کو نقصان میں ڈالتے ہیں" (اعراف: 98) اور سورہ کہف میں ہے: "کہہ دے کیا ہم تمہیں سب سے زیادہ خسارے والے لوگوں کے بارے میں بتائیں؟ وہ لوگ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں، یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے، سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے" (کہف: 1-3-105)

اور سورہ انبیاء میں فرماتا ہے: "اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف کے ہوں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے ایک دانے کے برابر عمل ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں (انبیاء: 47)۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کفر اور انکارِ حق اتنی بڑی بُرائی ہے کہ یہ لازماً بدی کے پلڑے کو جھکادے گی، اور کافر کے کسی نیکی میں اتنا وزن نہیں ہوگا کہ اس کی نیکیوں کے پلڑے کو وزنی کر کے جھکادے، البتہ مؤمن کے پلڑے میں اس کے ایمان کا وزن بھی ہوگا، پھر اس کے پاس

موجود ہر برائی کو برے اعمال کے پلڑے میں ڈال دیا جائے گا، اور اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اس کے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا اس کی برائیوں کا۔

فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝	اس کی جائے قرار گھری ہاویہ ہوگی

"اُمُّہ" اس کی ماں، یہاں مراد ہے: اس کا ٹھکانہ۔

اس لیے اس کا ٹھکانہ اور انجام جہنم کی آگ ہے، اور وہ اس کی تہہ میں گرے گا، اسے ماں "اُم" کھا گیا ہے، کیونکہ ماں اپنے پریشان بچے کو پناہ دیتی ہے، جہنم کی آگ بھی ان مجرموں کو جگہ دے گی، جیسے بچے اپنے ماؤں کی طرف پلٹتے ہیں، وہ بھی جہنم کی طرف جائیں گے، اور یہ ان کو ماں کی طرح گود لے لیگی، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ: ماں تمام بچوں کے لیے پناہ گاہ ہے، لیکن وہاں پر ماں جہنم ہے جو کہ جہنمی لوگوں کے ایک گروہ کی پناہ گاہ ہوگی، "ہَاوِيَةٌ" (ہوی) سے بمعنی گرنے کے ہے، اور دوزخ لوگوں کے گروہوں کی صورت میں گرنے کی جگہ ہے۔

مفسر ابوسعود فرماتے ہیں: "ہَاوِيَةٌ" جہنم کی آگ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، چونکہ یہ بہت گھری ہے، اسی لیے اسے "ہَاوِيَةٌ" کھا گیا ہے: جہنمیوں کے اس میں گرنے کا دورانیہ ستر (70) سال طویل ہوگا (ابوسعود: 282/5)۔

قتادہ نے کھا ہے "اُمُّہ ہَاوِيَةٌ" یعنی: اس کا سر جہنم کے پاتال میں الٹا ہوگا، لیکن پہلا قول واضح ہے، "فَأُمُّہ" (اُم) بمعنی ماں یا مرجع ہے، اس لیے "اُم" کو ماں کھا جاتا ہے کہ بچے مختلف اوقات میں اس کی طرف پلٹتے ہیں، وہ ان کے لیے پناہ گاہ ہے، لیکن یہ "اُم" کے لیے زیادہ معنی رکھتا ہے جب وہ باپ کے ساتھ ہوتا ہے، جب تک لڑکی کی شادی نہ ہو جائے وہ اُم نہیں بن سکتی؛ لہذا بیٹی کا ماں بننا ایک ایسی فضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ اسے عطا کرتا ہے، جب وہ بیٹی ہوتی ہے تو اسے صرف بیٹی ہونے کا مقام حاصل ہوتا ہے، جب اس کی شادی ہوتی ہے تو وہ بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ بیوی بھی ہے، اور اس کے علاوہ ماں دادی نانی بھی بنتی ہے، یعنی اسے مختلف عہدے ملتے جاتے، او رہر عہدے پر اس کا

استحقاق ہوتا ہے ، اس استحقاق کے مطابق اس کی عزت اور ربڑھ جاتی ہے، ماں کا مقام معین ہے "أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ" (بخاری : 5971 اور مسلم : 2548) "مخلوقات میں سے سب سے زیادہ حقدار اچھے سلوک کی باپ سے بھی زیادہ" بہ ہرحال "ام" یہاں بمعنی مرجع، پناہ گاہ اور سہارا کے ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علماء کی دورائے ہیں:

1- جہنم کی آگ اسے ماں کی طرح گلے لگائے گی ، گویا آگ اس کی ماں ہے، اور وہ ہمیشہ آگ میں رہے گا (اُمّہ یعنی اس کی ماں)۔

2- اس کے گناہوں کی وجہ سے اسے سر کے بل آگ میں پھینک دیا جائے گا (اُمّہ یعنی : سر کے اوپر کا حصہ)۔

ایسے لوگوں کا ٹھکانہ اور پناہ گاہ "ہَاوِيَه" ہے ، جس کا مطلب ہے گھری کھائی، اور وہ جگہ جہاں گرے ہوئے لوگ رہیں گے، وہ لوگ جو ذاتی کردار اور مادی اور روحانی لحاظ سے گرے ہوئے ہیں ، وہ لازمی ہاویہ میں ہوں گے، دنیا میں یہ کھاجاسکتا ہے کہ "ہَاوِيَه" دنیا میں کمزور صورت میں موجود ہے، وہ لوگ جو ایمان اور اخلاق کے لحاظ سے پیچھے ہیں، اور اپنے پیچھے رہنے پر فخر کرتے ہیں، یہ لوگ "ہَاوِيَه" میں ہیں، اور اسی میں گر گئے ہیں۔

وَمَا أَذْرٰكَ مَا هِيَهٗ ۝۱۰	اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے ؟

"مَا هِيَهٗ" (ما) استفہامیہ اور (ہی) ضمیر اور (ہ) سکتہ سے مرکب ہے (ملاحظہ ہو: سورہ حاقہ آیات: 19 ، 20 ، 25 ، 26 ، اور 29) استفہام خوفناک اور مشکل صورتحال کی وجہ سے ہے، یعنی خوف اور ردہشت کو بھڑکا کریہ تاثر پیدا کرنا کہ جہنم حد ادراک اور متعارف سے باہر ہے اس طرح کہ انسان اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔

"مَا هِيَهٗ" اگر چہ یہاں جہنم یا پاتال کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے ، لیکن جو لوگ نیکی اور اعمال صالحہ کے لحاظ سے پسماندہ ہیں اور ان کے اعمال ناموں میں نیک اعمال درج نہیں ہیں، تو وہ دونوں

معنی کے اعتبار سے گرے ہوئے ہیں، دنیا میں روحانی زوال اور آخرت میں مادی زوال، اس لیے دونوں زوالوں کو "ہاویہ" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

نَارُ حَامِيَةٍ ۱۱۰	ایک بھڑکتی ہوئی آگ

"حَامِيَةٍ" بہت زیادہ گرم اور جلانے والی (ملاحظہ ہو: سورہ غاشیہ: 4) یہ بہت گرم، ہر طرف پھیلی ہوئی اور سخت بھڑکتی آگ ہے، جس کا درجہ حرارت معمول کی حد سے بڑھ چکا ہے، (شدید الحرارة) یہ ایسی دہکتی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے، جس میں ذرا سا بھی رحم اور ہمدردی نہیں ہے، اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے تو اس سے بچ کر نکل جاسکے، جس کی گرمی دنیا کی آگ سے "70" گنا زیادہ ہے، انسان کا جسم اس آگ کو برداشت کرنے کے لیے بدل جائے گا، اور ہر بار جلنے کے بعد، اس کی جگہ دوسری کھال چڑھادی جائے گی تا کہ اسے دوبارہ عذاب دیا جائے۔

"حَامِيَةٍ" گرم، حم کے اصل سے ہے، یحم، حمًا وحمامًا بمعنی بہت زیادہ گرم اور شدید حرارت کے ہے، "ماء حمیم" کھولتا ہوا پانی، "نَارُ حَمِيمٍ" بھڑکتی ہوئی، بے انتہا گرم آگ، حدیث شریف میں ہے کہ: "نَارُ بَنِي آدَمَ الَّتِي تَوْقِدُونَ جِزْءًا مِنْ سَبْعِينَ جِزْءًا مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ..." (بنی آدم کی آگ جو تم جلاتے ہو جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے...)۔

اسی طرح حدیث مبارکہ میں ہے کہ: "إِنَّ أَهْلَ النَّارِ عَذَابًا: مِنْ لَهْ نَعْلَانِ، يَغْلِي مِنْهَا دِمَاغُهُ" (دوزخیوں میں سے سب سے ہلکا عذاب والا شخص وہ ہوگا جس کے دونوں جوتے آگ کے ہوں گے، ان سے اس کا دماغ کھولے گا)۔
(رب کریم ہمیں اپنے فضل و کرم سے اس سے محفوظ فرما)

قیامت اور اس کی نشانیاں:

قرآن کریم نے: 1500 "پندرہ سو سے زیادہ آیتوں میں قیامت اور اس کی نشانیاں کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، اگر قیامت کے بارے میں

مذکورہ آیات کے مجموعے کی تشریح اور تجزیہ کیا جائے تو ان آیات کو کئی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلی قسم: ان لوگوں کے جواب سے متعلق ہے جو مجموعی طور پر قیامت کا انکار کرتے ہیں، ان آیات کی دوسری قسم ان لوگوں کا جواب ہے جو قیامت واقع ہونے کے بارے میں شک و شبہ رکھتے ہیں، اور حیرت سے پوچھتے ہیں: کہ انسان جب مرجاتا ہے اور اس کا جسم مٹی ہو جاتا ہے، تو وہ کیسے زندہ ہوگا؟ اور اس کا گوشت، چمڑا، آنکھ اور بھوئیں وغیرہ دوبارہ پہلی حالت میں کیسے آئیں گے، چنانچہ رب ان کے جواب میں فرماتا ہے: "قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ" (سورہ یاسین 79) (کھدو کہ، انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ انہیں پیدا کیا تھا) ان آیات کی تیسری قسم اہل جنت کو عطا کردہ نعمتوں جیسے موضوعات سے متعلق بحث کرتی ہے، جن میں جنت کی زندگی، حور و غلمان اور شہد کی نہریں ہیں، اور اس دنیا کی تمام نعمتوں کے بارے میں بھی بحث کی گئی ہے۔ ان آیات کی چوتھی قسم میں خدا کے غضب اور جہنم کی آگ اور طوق، جہنمی لوگوں کی خوراک اور راستہ، ترازو اور عالم برزخ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اسی طرح بعض آیات ایسی بھی ہیں جو بالواسطہ طور پر قیامت کے بارے میں تو بحث کرتی ہیں لیکن قبر، عذاب، جنت اور جہنم کا براہ راست ذکر نہیں کرتیں، جیسے: "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ" (ترجمہ: "تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔")

محترم قارئین:

قیامت کے دن اور اس کی نشانیوں اور علامات کے بارے میں بہت سی احادیث و روایات موجود ہیں اور ہمارے رب نے اپنے نبی کے ذریعہ ہم انسانوں کو قیامت کے دن کی علامات اور واقع ہونے کے بارے میں آگاہ کیا ہے، کہ جنہیں چھوٹی اور بڑی نشانیاں کہا جاتا ہے: ان میں سے چند احادیث کا زیل میں تذکرہ کیا جا رہا ہے: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی مشہور حدیث ہے کہ: "بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ، شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَا يَرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى

فَحَذِّيهٖ، وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: (الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَتَقِيَمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا). قَالَ: صَدَقْتَ، فَعَجَبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيَصَدِّقُهُ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ، قَالَ: (أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ). قَالَ: صَدَقْتَ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ. قَالَ: (أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ). قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ. قَالَ: مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ). قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا، قَالَ: (أَنْ تَلِدَ الْأُمَّةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْخُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّيْءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ). ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ: (يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مِنَ السَّائِلِ؟ قُلْتُ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: (فَإِنَّهُ جَبْرِيلُ أَتَاكُمْ يَعَلِّبُكُمْ دِينَكُمْ). رَوَاهُ مُسْلِمٌ).

ترجمہ: ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک شخص آیا، اس کے کپڑے بہت سفید اور بال بہت کالے تھے، اس پر سفر کے آثار بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے، اور ہم میں سے کوئی اسے جانتا بھی نہیں تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر بیٹھا، اپنے گھٹنے کو آپ کے گھٹنے سے لگالیا اور اپنی ہتھیلیاں آپ کے رانوں پر رکھیں، پھر کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکاۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر اللہ کے گھر تک جانے کی استطاعت ہو، تو اس کا حج کرو، وہ بولا: آپ نے سچ فرمایا، ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ آپ سے سوال کرتا ہے اور پھر خود ہی آپ کی تصدیق بھی کرتا ہے، پھر کہا: اے محمد مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے، آپ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں اس کی کتب، اس کے رسولوں، آخرت کے دن پر اور ہر اچھی و بری تقدیر پر ایمان لاؤ، وہ بولا: آپ نے سچ فرمایا، پھر اس نے کہا: مجھے احسان کے بارے میں بتائیے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے، تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، وہ کہنے لگا: آپ مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے؟ آپ نے فرمایا: جس سے سوال کیا جا رہا ہے، وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں

جانتا، اس نے کہا: اچھا تو مجھے اس کی نشانیاں بتائیے؟ آپ نے فرمایا: (نشانیاں یہ ہیں کہ) لونڈی اپنے مالک کو جنے گی، تم دیکھو گے کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن، مفلس اور بکریاں چرانے والے بڑے بڑے محل تعمیر کریں گے، اس کے بعد وہ چلاگیا، میں کچھ دیر تک ٹھہرا رہا، پھر آپ نے فرمایا: اے عمر! کیا تم جانتے ہو کہ پوچھنے والا کون تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں، آپ نے فرمایا: وہ جبرئیل (علیہ السلام) تھے، وہ تمہیں تمہارے دین کے معاملات سکھانے آئے تھے۔"

محترم قارئین کرام: قیامت کا وقت یا قیامت کب شروع ہوگی؟ کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا حکم ہے کہ قیامت کے وقت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ" (سورہ زخرف: 58) یعنی: "اور قیامت کا علم اس کے پاس ہے۔"

البتہ قیامت کے قیام کی نشانیاں ہیں، ان علامات کے ظہور کی بنیاد پر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ قیامت کا وقت قریب ہے، ان نشانیوں کو شرع کی اصطلاح میں "اشراف الساعۃ" کا نام دیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے قیامت کی علامات اور نشانیاں جو اس کے قیام سے پہلے ظاہر ہوں گی۔

علامات قیامت:

علماء کرام نے علامات قیامت تین حصوں میں تقسیم کی ہیں، پہلا حصہ: پہلے حصے میں وہ نشانیاں اور علامات شامل ہیں جو اپنے اپنے دور کی نشانی اور علامات سے متعلق ہیں کہ آئی اور ختم ہوگئی ان میں سے۔

1- ایک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے۔

صحیحین میں ہے انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: "بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ. وَضُمَّ السَّبَابَةُ وَالْوُسْطَىٰ" (بخاری (6504)، وصحیح مسلم (2951))۔

2- چاند کا دو ٹکڑے ہونا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی خبر دی ہے، فرمایا ہے: "إِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَأُنْشِقَ الْقَمَرُ" (سورہ قمر: 1) ترجمہ: "قیامت قریب آپہنچی اور چاند شق ہوگیا۔"

3- مملکت حجاز میں آگ کا ظاہر ہونا، جس کی روشنی میں بصری میں اونٹوں کی گردنیں نظر آئیں گے: شیخین ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ تُضِيءُ أَعْنَاقَ الْإِبِلِ بِبُصْرَى" (بخاری (7118)، وصحیح مسلم (2902)). ترجمہ: "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ ارض حجاز سے ایک آگ نکلے گی جو (شام کے شہر) بصری میں اونٹوں کی گردنوں کو روشن کر دے گی"

"بُصْرَى" ایک مشہور شہر جو کہ موجودہ سوریہ میں واقع ہے، جسے حوران کھاجاتاہے، دمشق کے قریب ہے، (معجم البلدان: 441/1) اور (شرح نووی برصحیح مسلم: 30/18) اور (فتح الباری: 80/13)۔

یہ آگ اسی طرح ظاہر ہوئی جس طرح اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ 654 عیسوی کے دوسرے جمعۃ المبارک میں دی تھی، جو کہ مدینہ کے شرقی حصہ میں ظاہر ہو گئی، اور اس کی وجہ سے آگ کی وادی بہہ نکلی، وہاں کے لوگوں اور شام کے لوگوں نے اس کی روشنی کو دیکھا اور بصری کے لوگوں نے اس کی روشنی میں اونٹ کی گردنیں دیکھیں، جس طرح بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔

دوسرا حصہ:

دوسری قسم درمیانی علامات کی ہے، اور اس میں وہ نشانیاں شامل ہیں جو ظاہر ہوئیں مگر ختم نہیں ہوئیں، بلکہ زیادہ ہوئیں، اور بہت زیادہ پھیل گئی ہیں، کہ ان میں سے ایک یہ کہ لونڈی نے اپنے آقا کو جنم دیا، اور آپ دیکھتے ہیں کہ ضرورت مند، ننگے پاؤں لوگ اور چرواہے کثیر المنزلہ اور اونچی عمارتیں بنارہے ہیں، جیسا کہ حدیث جبریل میں ہے کہ: انہوں نے کہا: مجھے قیامت کے دن کے بارے میں خبر دیں، تو آپ نے فرمایا: "اس معاملے میں مسئلہ کو سائل سے زیادہ علم نہیں ہے" اس شخص نے کہا: پس مجھے قیامت کی نشانیوں سے آگاہ کر دیں، فرمایا: لونڈی اپنے آقا کو جنم دیگی، اور ننگے پاؤں اور برہنہ جسم والے مفلس، اور بھیڑ بکریاں چرانے والے چرواہوں کو دیکھو گے بڑی بڑی عمارتیں بنائیں گے۔

ان نشانیوں میں سے تیس (30) دجالوں کا ظاہر ہونا ہے ان میں سے ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرے گا، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَبْعَثَ دَجَالُونَ كَذَّابُونَ قَرِيبًا مِنْ ثَلَاثِينَ كُلَّهُمْ يُرْعَمُ أَنَّهُ رَسُولُ اللَّهِ" بخاری (3609)۔

ترجمہ: "تیس کے قریب کذاب جھوٹے دجال، مکار و دغا باز بھیجے جائیں گے، ان میں سے ہر شخص دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

سنن ابی داود اور ترمذی میں حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وَإِنَّهُ سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي كَذَّابُونَ ثَلَاثُونَ كُلَّهُمْ يُرْعَمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي" سنن ابی داود (4252)۔ ترجمہ: "میری امت میں بہت بڑے جھوٹ بولنے والے تیس ہوں گے، سب کے سب دعویٰ کرینگے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"

ان نشانیوں میں سے ایک دریائے فرات میں سونے کے پہاڑ کا ظاہر ہونا جس کے لیے لوگ آپس میں لڑیں گے، ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُحْسِرَ الْفُرَاتُ عَنْ جَبَلٍ مِنْ ذَهَبٍ يَقْتَتِلُ النَّاسُ عَلَيْهِ فَيَقْتُلُ مِنْ كُلِّ مِائَةٍ تِسْعَةٌ وَتَسْعُونَ وَيَقُولُ كُلُّ رَجُلٍ مِنْهُمْ لَعَلِّي أَكُونُ أَنَا الَّذِي أَتَجَوُّ" مسلم (2894)، بخاری (7119) "ترجمہ: "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دریائے فرات میں سونے کا پہاڑ نہ ظاہر ہو جائے، اور لوگ اس پر باہم جنگ کرنے لگیں، حتیٰ کہ ہر سو میں سے ننانوے قتل ہو جائیں گے، ان میں سے ہر بندہ کہے گا شاید میں زندہ بچوں گا،" یہ وہ علامات ہیں جن کے ظاہر ہونے کی مدت زیادہ دور نہیں۔

قیامت کی بڑی نشانیاں جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئیں
قیامت کی وہ عظیم نشانیاں جو ابھی تک نہیں آئی ہیں:

پہلی علامت: مہدی کا ظہور: مفسرین لکھتے ہیں کہ مہدی اہل بیت میں سے ایک آدمی ہوگا اور جب زمین ظلم و جبر سے بھری ہوئی ہوگی تو وہ آکر اسے عدل و انصاف سے بھر دے گا، ان کا نام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے موافق، اور اس کے والد کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کے نام کے موافق ہوگا (محمد بن عبد اللہ)۔

ابوداؤد اور ترمذی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتَّى يَمْلِكَ الْعَرَبُ رَجُلٌ مِنْ

أَهْلَ بَيْتِي يَوَاطِي أَسْمُهُ اسْمِي وَاسْمُ أَبِيهِ اسْمُ أَبِي يَمْلَأُ الْأَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا كَبَا مُلَيْتٌ ظُلْمًا وَجَوْرًا»
(سنن أبي داود 4 / 306 (4282) " ترجمہ: "دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہ میرے خاندان میں سے ایک شخص جس کا نام میرے اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام کی طرح ہے، زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے جس طرح وہ ظلم سے بھری ہوئی تھی"۔

دوسری علامت: مسیح دجال کا ظہور:

مسیح دجال آدم کی اولاد میں سے ایک آدمی ہوگا جو کہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا، اس کی وجہ سے بہت سارے لوگ فتنے سے دوچار ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں بعض خارق العادہ اعمال ظاہر فرمائے گا، وہ خدائی دعویٰ کرے گا، جس کا مؤمن آدمی پر کوئی اثر نہیں ہوگا، مکہ اور مدینہ کے علاوہ تمام شہروں میں داخل ہوگا، آگ اور جنت اس کے ساتھ ساتھ ہوں گے، اس کی آگ جنت، اور جنت آگ ہوگی۔

صحیح احادیث سے اس کا خروج ثابت ہے: ان میں سے عبد اللہ بن عمر و بن عاص کی روایت ہے، جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: "يُخْرِجُ الدَّجَالَ فِي أُمْتِي فَيَهْلِكُ أَرْبَعِينَ لَا أَدْرِي أَرْبَعِينَ يَوْمًا أَوْ أَرْبَعِينَ شَهْرًا أَوْ أَرْبَعِينَ عَامًا فَيَبْعَثُ اللَّهُ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَأَنَّهُ عُرْوَةٌ بَيْنَ مَسْعُودٍ فَيُظْلَبُهُ فَيَهْلِكُهُ مُسْلِمٌ (2940)۔" ترجمہ: "میری امت میں دجال نکل کر زمین پر چالیس تک رہے گا، مجھے نہیں معلوم کہ 40 دن یا 40 مہینے یا 40 سال، تو اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا جو عروہ ابن مسعود جیسا ہے، وہ دجال کو ہلاک کریں گے"۔

صحیحین میں عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بیچ میں کھڑے ہوئے اور خدا کی ایسی تعریف کی جس کا وہ حقدار ہے، پھر دجال کا ذکر کر کے فرمایا: "إِنِّي أُنذِرُكُمْ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا قَدْ أُنْذِرَ قَوْمَهُ لَقَدْ أُنْذِرَ نُوحٌ قَوْمَهُ وَلَكِنْ سَأَقُولُ لَكُمْ فِيهِ قَوْلًا لَمْ يَقُلْهُ نَبِيٌّ لِقَوْمِهِ تَعْلَمُونَ أَنَّهُ أَعْوَرُ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِأَعْوَرَ بِخَارِي" (3057)، و صحیح مسلم (169)۔ ترجمہ: "میں تمہیں اس سے ڈراتا ہوں، اور کوئی نبی ایسا نہیں آیا کہ اس نے اپنی قوم کو اس سے نہ ڈرایا ہو، ان میں سے نوح نے بھی اپنی قوم کو خبردار کیا، لیکن میں اس کے بارے میں وہ بات کہتا ہوں جو کسی نبی نے اپنی قوم سے نہیں کہی، دجال کانٹا ہے، جبکہ خدا ایسا نہیں ہے"۔

تیسری علامت: عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ، آسمان دنیا سے زمین پر

وہ زمین پر انصاف قائم کریں گے ، صلیب کو توڑے گا ، سورکو مارے گا ، دجال کا بھی خاتمہ کرے گا ، جیسا کہ احادیث رسولؐ اس کی دلیل ہیں: رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَإِنَّهُ لَعَلَّمُ لِلسَّاعَةِ" (سورة الزخرف: 61) ترجمہ: "اور وہ دراصل قیامت کی ایک نشانی ہے" ، مفسرین اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں استدلال کرتے ہیں ، اور یہ روایت ابن عباسؓ سے مروی ہے ، امام احمد اپنی مسند میں اس آیت کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں: "ہو خروج عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام قبل یوم القيامة" (المسند: 1 / 318)۔ (وہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے نزول ہے) جس طرح کہ صحیح احادیث سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر دلالت کرتی ہیں ، صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَيُوشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَكَمًا عَادِلًا فَيَكْسِرَ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلَ الْخَنزِيرَ وَيَضَعُ الْجُزْيَةَ وَيَفِيضُ الْمَالَ حَتَّى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ وَحَتَّى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا" بخاری (2222) ، و صحیح مسلم (155) -

ترجمہ: " اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ! یقیناً قریب ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام تم میں اتریں ، انصاف کرنے والے حاکم ہوں گے ، پس وہ صلیب کو توڑ دیں گے ، خنزیر کو قتل کریں گے ، جزیہ ختم کر دیں گے اور مال کی فراوانی ہو جائے گی حتیٰ کہ کوئی اس کو قبول نہ کرے گا۔"

چوتھی علامت اور نشانی : یاجوج و ماجوج کا ظاہرنا

یاجوج و ماجوج بہت ہی زیادہ تعداد میں ہوں گے کہ کوئی انہیں نہیں مار سکے گا ، کھا جاتا ہے کہ یہ یافت کے پوتوں میں سے ہیں جو نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا ، کتاب و سنت کے دلائل ان کے خروج پر دلالت کرتے ہیں: رب تعالیٰ سورہ انبیاء کی آیات: "96 اور 97" میں فرماتے ہیں: " حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ *وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارِ الَّذِينَ كَفَرُوا " ترجمہ: " یہاں تک کہ یاجوج اور ماجوج کھول دیئے

جائیں اور وہ بلندی سے دوڑ رہے ہوں، اور (قیامت کا) سچا وعدہ قریب آجائے تو ناگہاں کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔"

شیخین زینب بنت جحشؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن خوف کی حالت میں اس گھر میں داخل ہوئے اور فرمایا: "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرِّ قَدْ اقْتَرَبَ فُتُوحُ الْيَوْمِ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هَذِهِ وَحَلَقَ بِأَصْبَعِهِ الْإِبْهَامِ وَالَّتِي تَلِيهَا"۔ بخاری (3346)، و صحیح مسلم (2880)۔ ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ملک عرب میں اس برائی کی وجہ سے بربادی آجائے گی جس کے دن قریب آنے کو ہیں، آج یاجوج و ماجوج نے دیوار میں اتنا سوراخ کر دیا ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے اور اس کے قریب کی انگلی سے حلقہ بنایا۔"

پانچویں نشانی: کعبہ کا انہدام اور اس کے زیورات کا چوری ہونا

محدثین کعبہ کے انہدام اور اس کے زیورات چوری ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں: کہ حبشہ کا ایک شخص باریک پنڈلی اور لمبی ٹانگوں والا کعبہ کو ڈھا کر اس کے زیورات اپنے ساتھ لے جائے گا، ایک حدیث میں شیخین ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "يَخْرُبُ الْكَعْبَةَ ذُو السَّوِيقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ" بخاری (1591)، و صحیح مسلم (2909)۔ ترجمہ: "کعبہ کو دو پتلی پنڈلیوں والا حبشی خراب کرے گا"

امام احمد صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ فرمایا: "يَخْرُبُ الْكَعْبَةَ ذُو السَّوِيقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ وَيَسْلُبُهَا حُلِيِّهَا وَيَجَرِّدُهَا مِنْ كِسْوَتِهَا وَلَكَّأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ أَصِيلَعُ أُفِيدِعُ يَضْرِبُ عَلَيْهَا بِمُسْحَاتِهِ وَمَعُولِهِ" المسند: 2 / 220۔ ترجمہ: "کعبہ کو دو پتلی پنڈلیوں والا حبشی خراب کرے گا، اور وہ اس سے زیب و زینت کو ہٹا دے گا، جیسے اب میں اسے گنجے سر اور ٹیڑے جوڑ کے ساتھ کعبے کو بیلچے اور گٹھڑی سے مارتے ہوئے دیکھ رہا ہوں"

چھٹی علامت: دخان: یعنی دھواں

چٹھی علامت سے مراد ایک عظیم دھواں ہے جو کہ آسمان میں چھا جائے گا، اور لوگوں کو ڈھانپ کر اپنی لپیٹ میں لے گا، قرآن عظیم فرماتے ہیں:

"فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ" ۝ يَغْشَى النَّاسَ ۝ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (سورۃ الدخان "10-11) ترجمہ: "اچھا، انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا، اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ درد ناک سزا ہے۔"

اسی طرح حذیفہ بن اسید سے ایک حدیث مروی ہے کہ: "إِنَّمَا لَنْ تَقُومَ حَتَّى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالْجَالَ وَالْدَّابَّةَ" مسلم (2901) - ترجمہ: "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ دس نشانیاں ظاہر نہ ہوں، جن میں: دجال، دھواں اور دابة الارض ہے۔"

ساتویں نشانی: قرآن کریم کے حروف کا زمین سے آسمان کی طرف اٹھ جانا

قیامت کی بڑی نشانیوں میں سے ساتویں نشانی قرآن کے حروف کا زمین سے آسمان پر اٹھنا ہے، قرآن کی جو آیتیں اور سورتیں مصحفوں میں لکھی ہوئی ہیں، یا انسان کے سینوں میں محفوظ ہیں کچھ بھی نہیں بچے گا، اس کی دلیل حذیفہؓ کی وہ حدیث ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: "يَذْرُؤُا السَّلَامُ كَمَا يَذْرُؤُا شَيْءُ الثُّوبِ حَتَّى لَا يَذْرُؤَ مَا صِيَامٌ وَلَا صَلَاةٌ وَلَا نُسُكٌ وَلَا صَدَقَةٌ وَلَا يَسْرَى عَلَى كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ فِي لَيْلَةٍ فَلَا يَبْقَى فِي الْأَرْضِ مِنْهُ آيَةٌ..." (سنن ابن ماجہ 2 / 1344) ترجمہ: "اسلام ایسا ہی پرانا ہو جائے گا جیسے کپڑے کے نقش و نگار پرانے ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ یہ جاننے والے بھی باقی نہ رہیں گے کہ نماز، روزہ، قربانی اور صدقہ و زکاۃ کیا چیز ہے؟ اور کتاب اللہ ایک رات میں ایسی غائب ہو جائے گی کہ اس کی ایک آیت بھی باقی نہ رہ جائے گی۔۔۔"

آٹھویں علامت: سورج کا مغرب سے طلوع ہونا

سورج کا مغرب سے طلوع ہونے کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے: "يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ أَمِنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا" ۝ (سورۃ الانعام : 158) ترجمہ: "جس روز تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آجائیں گی تو جو شخص پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا اس وقت اسے ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں ہوگا یا اپنے ایمان (کی حالت) میں نیک عمل نہیں کئے ہونگے۔"

متعدد مفسرین کی رائے ہے کہ اس آیت میں رب تعالیٰ کی بعض آیات سے مراد سورج کا مغرب سے نکلنا ہے۔

طبری اس آیت کے بارے میں مفسرین کے اقوال ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "(وَأُولَى الْأَقْوَالِ بِالصَّوَابِ فِي ذَلِكَ مَا تَظَاهَرَتْ بِهِ الْأَخْبَارُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ ذَلِكَ حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا)" (تفسیر ابن جریر: جلد 8 / 97)۔ ترجمہ: "اس سلسلے میں سب سے اولیٰ اور درست وہ خبریں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بارے میں ہیں"۔

شیخین ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَإِذَا طَلَعَتْ فَرَأَاهَا النَّاسُ آمَنُوا أَجْمَعُونَ فَذَلِكَ حِينَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا" بخاری (4636)، و مسلم (157)۔ ترجمہ: "قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، جب لوگ اسے دیکھیں گے سب کے سب ایمان لے آئیں گے، اس وقت جو پہلے ایمان نہیں لایا تھا یا ایمان کے ساتھ کوئی نیکی نہیں کمائی تھی بے تو اس کا ایمان اس کو کوئی فائدہ نہیں دے گا"۔

نویں نشانی : زمین سے دابة الارض کا ظہور

وہ ایک عظیم مخلوق ہے، جس کی لمبائی ساٹھ ذراع اور اس کے ہاتھ، پاؤں، اور بال والے (جس کے جسم اور چہرے پر گھنے بال) ہوں گے، اور کہتے ہیں کہ اس کی تخلیق بھی دوسرے جانوروں کی طرح ہے، قرآن و سنت نے قیامت کے واقع ہونے سے پہلے اس کی دلیل دی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ○ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ○ ٨٢" (سورہ نمل: 82) ترجمہ: "اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان پر آپہنچے گا تو ہم ان کے لیے جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے"

ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ فرمایا: "ثَلَاثٌ إِذَا خَرَجْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا"

طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَالِدَّجَالُ وَدَابَّةُ الْأَرْضِ" مسلم (158). ترجمہ: "تین چیزیں ہیں جب ان کا ظہور ہو جائے گا، تو اس وقت کسی شخص کو، جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا یا اپنے ایمان کے دوران میں کوئی نیکی نہ کی تھی، اس کا ایمان لانا فائدہ نہ دے گا، (1) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، (2) دجال کا ظہور (3) اور دابۃ الارض (زمین سے ایک عجیب الخلقت) کا نکلنا۔

امام احمد ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تَخْرُجُ الدَّابَّةُ فَتَسْمُ النَّاسَ عَلَى خَرَاطِيهِمْ ثُمَّ يَغْمُرُونَ فِيكُمْ حَتَّى يَشْتَرِيَ الرَّجُلُ الْبَعِيرَ فَيَقُولُ مِمَّنْ اشْتَرَيْتُهُ فَيَقُولُ اشْتَرَيْتُهُ مِنْ أَحَدِ الْمُخْطَبِينَ" (المسند: 5 / 268) ترجمہ: دابۃ الارض نکلے گا اور لوگوں کی ناک پر نشان لگائے گا، یہاں تک کہ ان کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ ایک شخص اونٹ خریدے گا، اس سے پوچھیں گے کہ یہ اونٹ کس سے خریدا ہے؟ وہ جواب میں کہے گا: ان نشان والوں میں سے ایک سے (جس کی ناک پر دابۃ الارض نے نشان لگایا ہے)۔

دسویں نشانی اور علامت: ایک بڑی آگ کا ظہور

یہ آگ عدن (ایک بندرگاہ یمن میں) لگے گی، اور لوگوں کو ان کے اجتماع گاہ کی طرف ہانگ کہ لے جائے گی، یہ قیامت کی آخری نشانی ہے، اس نشانی کی دلیل حذیفہ بن اسید کی حدیث جو پہلے گزر چکی ہے، جو مسلم نے روایت کی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "وَأَخْرُذُكَ نَارًا تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ" مسلم (2901). ترجمہ: "اور اس کی آخری (نشانی) آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی لوگوں کو محشر کی جانب ہانک کہ لے جائے گی۔"

حذیفہ کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: "وَنَارٌ تَخْرُجُ مِنْ فُجْرَةِ عَدَنٍ تَرْحَلُ النَّاسَ" ترجمہ: "ایک آگ عدن کے کنویں سے ظاہر ہوگی جو لوگوں کو ہانک کہ لے جائے گی۔"

یہ سب سے بڑی نشانیاں تھیں جو قیامت کے وقوع سے پہلے ظاہر ہوں گی، جب نشانیاں آئیں گی تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق قیامت قائم ہوگی، اور روایت ہے کہ یہ نشانیاں ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کی

طرح یکے بعد دیگرے آئیں گی، جب ان میں سے کوئی ایک ظاہر ہو جائے تو اس کی پیچھے دوسری ظاہر ہوگی۔

طبرانی "اوسط" میں ابوہریرہؓ سے انہوں نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "خروج الآيات بعضها على إثر بعض، يتتابعن كما تتابع الخرز في النظام" (المعجم الوسيط: 5 / 148، (4283))۔

قیامت کی حتمی تاریخ پوشیدہ رکھنے کی حکمت

بعض مرتبہ دل میں خیال آسکتا ہے کہ قیامت کے وقوع کا زمانہ معین نہ کرنے کی وجہ کیا ہے، اس میں کونسی حکمت پوشیدہ ہے، جس کی تاریخ ہم انسانوں کو معلوم نہیں ہے، اس سوال کے جواب میں مفسرین نے کھاہے کہ قیامت کے آنے کی صحیح تاریخ کو چھپانا انسانی نفس کی اصلاح کے لیے ضروری ہے۔

قیامت کی صحیح تاریخ پوشیدہ ہے یہ ایک اہم معاملہ ہے کہ انسان کو اس کے وقوع پذیر ہونے کا یقین ہو، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ قیامت کس لمحے اس پر آکر اس کو گھیر لے گی، اس طرح انسان کو اپنے انتظار میں رکھے گی۔

تفسیر "فی ظلال القرآن" کے مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں: مجھول اور نا معلوم انسان کی زندگی اور اس کی نفسیاتی ساخت میں ایک لازمی عنصر اور عامل ہے، اس لیے انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ زندگی میں ان کے ایسی مجھول بھی ہو کہ اس کے انتظار میں وہ بیٹھے رہیں، اور اگر انسان کو سب کچھ مل جائے، تو اس کا یہ ہوگا کہ اس کی چستی، خوش مزاجی، جدوجہد اور کوشش رک جائے گی، تو اس کی زندگی پستی اور جمود سے دچار ہو جائے گی۔

جی ہاں! انسان مجھولات کے پیچھے چلتے ہیں، مجھولات کی وجہ سے وہ محتاط رہتے ہیں، اور احتیاط سے کام لیتے ہیں، وہ پر امید ہو کر تجربات کرتے رہتے ہیں، اور سیکھتے ہیں، اپنی طاقت اور ہنر اور اپنے آس پاس کی دنیا کے رازوں کو دریافت کرتے ہیں، دلوں اور احساسات کو قابو میں رکھنا، نامعلوم اور وعدہ شدہ قیامت ان کو طغیان اور سرکشی سے بچاتی ہے۔

وہ نہیں جانتے کہ قیامت کونسے دن اور کونسی تاریخ کو وقوع پذیر ہوگی،

اس لیے وہ مسلسل اس کے وقوع کے انتظار میں ہیں، اور مستقل اس کے لیے تیار ہوتے ہیں، چنانچہ قیامت کا مجھول ہونا ان لوگوں کے لیے مثبت نتائج لاتا ہے، جن کی فطرت سالم اور سیدھی ہو، لیکن جن کی طبعیت بگڑ جاتی ہے، اور خواہشات کی اطاعت کرتے ہیں، وہ غفلت اور جہالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور آخر کار تباہی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ (قیامت کا دن "تفسیر فی ضلال القرآن" جمع و اعداد احمد فائز صفحہ 98)۔

قیامت کے واقع ہونے کی پیشین گوئی

لوگ قیامت کے آنے کے بارے میں کثرت سے سوال کرتے ہیں، اور اکثر و بیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پوچھتے تھے، تو اس سوال کا جواب رب تعالیٰ کی طرف سے اس طرح آیا ہے "يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ" (سورۃ الاحزاب: 63)، "يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ" (النازعات: 42-44) رب تعالیٰ نے یہ علم کسی مقرب فرشتے اور کسی نبی مرسل کو نہیں دیا ہے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے وقوع سے متعلق جبرئیل کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا: "اس مسئلے میں مسئل سائل سے زیادہ باخبر نہیں ہے" اس بنا پر کوئی بھی گفتگو اس معاملے میں اور ہر وہ بات اس پر کہ قیامت فلاں سال وقوع پذیر ہوگی، رب پر ایک قسم کا جھوٹ باندھنا ہے، اور جو لوگ اس میدان میں نظریہ سازی اور بحث کرنے میں مصروف ہیں وہ در اصل قرآنی طریقہ اور پیغمبرانہ کردار کی مخالفت کرتے ہیں، اللہ و رسول لوگوں کو ایسی چیزوں کو ترک کرنے کی ہدایت کرتے ہیں، خدا اور رسول انسان کو ایسے دن کے لیے ایمان اور عمل صالح کے ساتھ تیار رہنے کی دعوت دیتے ہیں اور بس۔

جو لوگ اس بارے میں بات کرتے ہیں یا اس کی متعین معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو کیا لوگ سوچتے ہیں کہ جس چیز کو رسول ﷺ اور جبرائیلؑ نہیں جان سکے، اسے یہ لوگ جان جائیں گے، جو لوگ سلیم الفطرت ہیں اور خدا کی باتوں کو سنتے ہیں، ان کو اس بات سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور قیامت کے وقوع پذیر ہونے کی تاریخ متعین کرنے سے دست بردار ہونا چاہیے، اور ہم بھی ان کو خیر خواہی سے مشورہ دیتے ہیں، ہمیں اس مسئلے پر اتنی ہی بحث کرنی چاہیے جتنی نبی ﷺ، صحابہ کرام اور بزرگان دین نے کی ہے، اگر قیامت کے وقوع کی تاریخ جاننے میں بشریت کا کوئی فائدہ اور نفع ہوتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ انسان کو اس سے باخبر رکھتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس علم کو انسانوں سے ان مصلحتوں کی بنا پر چھپا رکھا ہے جو

انسانوں کے لیے اللہ کے مدنظر ہیں۔

اقتدا کرنے والوں کو اپنے پیشروؤں کی پیروی کرنی چاہیے اور ان کے حالات سے سبق سیکھنا چاہیے،

بعض اسلاف نے اس تناظر میں بحث کی ہے، اور قیامت کے وقوع ہونے کی نشانیاں بیان کی ہیں، ان کی طرف سے وقت مقررہ اچکا ہے، لیکن کوئی بھی حادثہ اب تک وقوع پذیر نہیں ہوا، ان حضرات میں علامہ طبری ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرما دے، علامہ طبری نے بعض نصوص سے یہ فہم لیا کہ دنیا بعثت نبوی کے پندرہ سو سال بعد اختتام پذیر ہوگی، (مقدمہ ابن خلدون ۹۱۸ء) اور اب طبری کی آخری تاریخ کو تقریباً ایک ہزار سال گزر چکے ہیں، لیکن ابھی تک ان کی پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی، ان حضرات میں سے ایک علامہ سیوطی بھی ہے، وہ اپنی کتاب (الکشف) میں لکھتے ہیں کہ قیامت پانچویں صدی کے شروع میں نبوت کے پہلے ہزار سال کے بعد قائم ہوگی، اور اب اس تاریخ کو بھی کئی سال گزر چکے ہیں جو انہوں نے متعین کیے تھے، لیکن قیامت قائم نہیں ہوئی، حتیٰ کہ اس کی بہت سی نشانیاں اب تک ظاہر نہیں ہوئی ہیں، (لوامع انوار البہیۃ: 66/2)۔

سہیل نے سورتوں کے شروع میں تکرار کو ہٹا کر حروف مقطعات کو جمع کیا اور (ابجد) کے جملے کے حساب سے کئی سو سال پہلے سے قیامت تک کے وقت کا تعین کیا (مقدمہ ابن خلدون: ۹۱)۔

بنی آدم میں بہت سے لوگوں نے اس معاملے پر تبصرہ کیا ہے اور بغیر دلیل کے غلط راہ پر چل پڑے، یہ تمام نظریات تخمینے اور اندازے ہیں اور ان میں کوئی صداقت نہیں ہے، اس بارے میں میرے پاس آخری اطلاع یہ ہے کہ ڈاکٹر بھائی نامی ایک شخص نے سورتوں کے شروع سے ریاضی کے اعداد دو شمار جو حروف مقطعات سے لیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قیامت سال (۱۸۱۰) ہجری میں واقع ہوگی، لیکن اس نظریہ کے بے بنیاد ہونے کے لیے میں یہ ضرور کہوں گا کہ اندازے اور وقت مقرر کرنے کی غلطیاں ثابت ہوچکی ہیں، ان سب نے یہی رویہ اختیار کیا تھا، ان میں صرف نشانی اور معین مدت کے بیان میں اختلاف ہے، اس لیے جو بھی حساب غلط معیار کی بنیاد پر ہوگا، وہ بالآخر غلط نکلے گا۔

علامہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے قیامت کی تاریخ پر تبصرہ کرنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ تمام لوگ جنہوں نے قیامت کی تاریخ کے بارے

میں بات کی وہ اس شخص کی طرح ہیں جس نے (الدر المنظم فی معرفۃ الاعظم) نامی کتاب لکھی اور دس دلائل بیان کرتے ہوئے قیامت قائم ہونے کی درست تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے، یا جنہوں نے حروف مقطعات یا ابجد کی بنیاد پر بات کی ہے یا جس نے (عنقاء مغرب) کی بارے میں لب کشائی کی ہے، یہ سب اگرچہ اپنے پیروکاروں کے نزدیک قدر اور اعتبار رکھتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر غلط اور جھوٹے ہیں، اور متعدد دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انہوں نے بغیر دلیل کی بات کی ہے اور کرتے ہیں، اگرچہ وہ کشف، اسرار و رموز کی پہچان کا دعویٰ رکھتے ہیں، ہم نے کہا اکثر ان کے، کیونکہ ان میں سے بعض غلطی سے اس بحث میں داخل ہو گئے تھے، دوسروں کو گمراہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، جیسے: طبری اور سیوطی، خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝۳۳" (سورہ العمران: ۳۳) ترجمہ: "اے نبی! ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جس کے لیے اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اس نے فرمائی ہے کہ نہیں۔"

یقیناً قیامت کی تاریخ جاننے کا دعویٰ بغیر علم کے دعویٰ ہے (مجموع الفتاویٰ، شیخ الاسلام: 342/4)

قیامت اور شب و روز کی بے برکتی کی نشانی

امام بخاری حدیث نمبر ۱۰۳۶ میں ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَقْبُضَ الْعِلْمُ، وَتَكْثُرَ الزَّلَازِلُ، وَيَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، وَتَظْهَرَ الْفِتَنُ، وَيَكْثُرَ الْهَرَجُ وَهُوَ الْقَتْلُ الْقَتْلُ، وَحَتَّى يَكْثُرَ فِيكُمْ الْمَالُ فَيَفِيضَ" ترجمہ: "قیامت اس وقت نہ آئے گی جب تک علم دین نہ اٹھ جائے گا، اور زلزلوں کی کثرت نہ ہو جائے، اور زمانہ جلدی جلدی نہ گزرے اور فتنے فساد پھوٹ پڑیں، اور ہرج کی کثرت ہو جائے، (ہرج) سے مراد قتل ہے، اور تمہارے درمیان قتل اور مال و دولت کی اتنی کثرت ہو گی کہ وہ ابل پڑے گی۔"

اور امام احمد نمبر (۱۰۲۶) میں ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، فَتَكُونَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ، وَيَكُونَ الشَّهْرُ كَالْجُمُعَةِ، وَتَكُونَ الْجُمُعَةُ كَالْيَوْمِ، وَيَكُونَ الْيَوْمُ كَالسَّاعَةِ، وَتَكُونَ السَّاعَةُ كَالْحَبْرَةِ السَّعْفَةِ" ترجمہ: "قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ زمانہ کی مسافت قریب ہو جائے گی، یہاں تک کہ سال مہینے کے اور مہینہ مثل ہفتہ کے اور ہفتہ مثل دن کے اور دن ایسا ہو جائے گا جیسے کسی چیز کو آگ لگے اور جلد بھڑک کر ختم ہو جائے (یعنی: بہت جلد جلد وقت گزرے گا)۔"

(اس کی اسناد صحیح مسلم کی شرط پر ہے، البانی نے صحیح الجامع میں نمبر ۴۳۳۲ اسے صحیح کہا ہے)

مذکورہ بالا دونوں احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قیامت کی نشانیوں میں سے زمانے کا نزدیک ہونا ہے، علماء زمانے کی قربت کے معنی میں اختلاف رکھتے ہیں، اور اس بارے میں بہت سارے اقوال ہیں، ان میں سے بہترین قول یہ ہے کہ: وہ زمانے کی نزدیکی کو حسی اور معنوی نزدیکی پر لے جاتے ہیں۔

روحانی نزدیکی

روحانی نزدیکی کا مطلب یہ ہے کہ برکت ختم ہو جائے، اور یہ آنے والے وقتوں میں واقع ہوگا، اس قول کو قاضی عیاض نووی اور حافظ ابن حجر نے اختیار کیا ہے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں: دن کے چھوٹے ہونے کا مطلب اس میں برکت کا نہ ہونا ہے، مثال کے طور پر دن گزر جاتا ہے لیکن اس سے ایک گھنٹے کے مقدار کا فائدہ اٹھا جاتا ہے۔

حافظ کہتے ہیں: سچی بات یہ ہے کہ اس کا مطلب ہر چیز اور یہاں تک کہ وقت سے بھی برکت کا ختم ہونا ہے کہ جو قیامت کے قریب ہونے کی نشانیوں میں سے ایک ہے، روحانی قربت سے مراد دور دراز مقامات کے درمیان رابطے کی آسانی اور ان فاصلوں کے درمیان سفر کی رفتار اور تیزی بھی ہوسکتی ہے اسے بھی زمانے کی نزدیکی کیا جاسکتا ہے، یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ ماضی میں جو فاصلے کئی مہینوں میں طے ہوتے تھے وہ اب چند گھنٹوں میں ہو جاتے ہیں۔

شیخ بن باز فتح الباری کی تعلیق (522/2) میں کہتے ہیں کہ: جس نزدیکی

کا حدیث میں ذکر ہے اس سے مراد شہروں اور براعظموں کے درمیان کی مسافت اور نزدیکی ہے جو ہوائی جہازوں، گاڑیوں اور دیگر وہ تمام چیزیں جو اس طرح کی بنائی گئی ہیں، ان کی وجہ سے کمی آئی ہے۔

حسی نزدیکی :

حسی نزدیکی سے مراد یہ ہے کہ زمانے کا مختصر ہونا محسوس کیا جاتا ہے، رات اور دن کے گھنٹے تیزی سے گزر جاتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ان گھنٹوں کے گزرنے میں کوئی فاصلہ ہی نہیں، اس واقعے کا رونما ہونا کوئی غیر ممکن چیز نہیں ہے، اس کی تائید کے لیے دجال کے زمانے کی طرف دیکھا جاسکتا ہے کہ اس کے زمانے میں ایک دن، سال، مہینے اور ہفتے کی طرف لمبا ہوگا، تو جس طرح دن لمبے ہوسکتے ہیں اسی طرح چھوٹے بھی ہو سکتے ہیں، کہ وہ دنیا کے نظم و نظام میں اختلاف اور دنیا کے خاتمے کی وجہ سے ہوگا۔

حافظ "الفتح" میں ابن جریر سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے کہا: زمانے کے نزدیک ہونے سے مراد جو حدیث میں ہے: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَكُونَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ" اس کے چھوٹے ہونے کی طرف اشارہ ہے، اس بنا پر چھوٹے ہونے کو حسی ہونا چاہیے، البتہ اس سے روحانی معنی بھی لیا جاسکتا ہے، لیکن حسی میں فاصلہ مراد نہیں ہوتا، اور شاید یہ ان چیزوں میں سے ہے جو قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے، لیکن روحانی نقطہ نظر سے اس سے وقت اور فاصلہ مراد ہوتا ہے، کہ دین کے علم رکھنے والے اس کو جانتے ہیں، اور دنیا والے اگر سمجھدار اور عقل مند ہیں تو وہ بھی جان لیں گے، کہ وہ پہلے کی طرح بڑے بڑے کام انجام نہیں دے سکتے، اس کی وجہ سے وہ شک و شبہ میں پڑ جاتے ہیں، لیکن اس کی وجوہات کا ادراک نہیں کر سکتے، شاید اس کی وجہ ایمان کا ضعیف ہونا ہے کہ یہ حد سے زیادہ خلاف شرع کام کرتے ہیں، اور اس سے سخت تر اور بدتر وہ خوراک اور کھانے ہیں کہ جن کے حرام ہونے میں کوئی شک و تردید نہیں ہوتا، اور اکثر لوگ اس کے حلال یا حرام ہونے کی پرواہ نہیں کرتے، بلکہ اپنی تمام تر کوششیں کو اسے حاصل کرنے کے لیے بروئے کار لاتے ہیں، اور اپنی عقل سے کام نہیں لیتے، اس بحث کا نتیجہ اور ماحصل یہ ہے کہ زمانہ، رزق و روزی، اور خوراک میں برکت مضبوط ایمان، خدا کے احکام کی پیروی اور اس کے نو ابی سے دوری اختیار کرنے میں ہے، اس دعویٰ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ"

ترجمہ: "اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے۔"

سیوطی نے الحاوی للفتاویٰ میں (۱/۳۳) مذکورہ حدیث کے معنی میں کہا ہے کہ: "کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد حسی صورت میں چھوٹا ہونا ہے، یعنی: رات اور دن کے اوقات قیامت کے قریب مختصر کر دیے جائیں گے، اور روحانی طور پر بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا مطلب ہے وقت کا تیزی سے گزرنا اور ہر چیز سے برکت کا ختم ہونا، حتیٰ کے زمانے سے بھی برکت ختم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں، واللہ اعلم۔"

ان تینوں اقوال میں: برکت کا ختم ہونا، رابطے کی سہولت اور حسی صورت میں قریب ہونا، کوئی تعارض نہیں ہے، اور یہ کہ حدیث ان سب کی طرف اشارہ کرتی ہے اس پر بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ: خطابی نے کہا ہے کہ: اس سے مراد زندگی سے لطف اندوز ہونا ہے، حافظ نے اس سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتا ہے: وہ چاہتا ہے کہ اس سے مہدیؑ کا خروج مراد ہے - واللہ اعلم۔ جب زمین پر حق ظاہر ہوگا، انصاف کا بول بالا ہوگا، اور لوگ زندگی سے لطف اندوز ہوں گے، مگر اس کی مدت مختصر ہوگی، لوگوں کی خوشی کے دن تھوڑے عرصے میں گزر جاتے ہیں، اور اگر یہ لمبا عرصہ تک رہے ہیں تو ناگوار ہو جاتے ہیں، نتیجتاً اس کی مدت کم ہوتی ہے، پھر حافظ کہتے ہیں کہ: میں کہتا ہوں کہ خطابی نے جو کچھ ذکر کیا اس میں وہ تاویل کی طرف گئے ہیں، کیونکہ زمانے میں نقصان نہیں ہوگا، ورنہ حدیث کی ضمانت دینے والا اسے ہمارے زمانے میں وجود میں لاتا، نتیجتاً ہم اس حدیث سے وقت کی کمی کے بجائے، دنوں کا تیزی سے گزرنا سمجھتے ہیں، کیونکہ ہمارا زمانہ ماقبل کے زمانے سے کوئی فرق نہیں رکھتا، اس حدیث سے مراد یہ نہیں ہے زندگی سے لطف اٹھایا جائے گا، بلکہ درست یہ ہے کہ زندگی سے برکات کا ختم ہو جائیں گے، ابن بطال کہتا ہے: اس سے مراد عبادت کی کمی کی وجہ سے لوگوں کی عمروں کا نزدیک ہونا ہے، یہاں تک کہ گناہوں اور فسق و فجور کے غلبہ کی وجہ سے اور فاسد انسانوں کے بکثرت ظاہر ہونے کی وجہ سے کوئی بھی نہیں ہوگا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ (ملاحظہ فرمائیں: فتح الباری: 21/13) شرح حدیث رقم: 7061 (اتحاد الجماعۃ للتویجری (497/1)،

(السنن الواردة فی الفتن وغوائلها والساعة وأشراطها) لأبی عمرو عثمان الدانی، تحقیق د/رضاء اللہ

المباركفوري. (أشراط الساعة) للوابل (صفحه 120)

یہ تاویل حدیث کی ظاہر کے خلاف ہے، اور یہ جملہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث کی روشنی میں رد کیا جاتا ہے، "السَّاعَةُ حَتَّى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ فَتَكُونَ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ.. الخ" اس کی ظاہر سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد زمانے کا نزدیک ہونا ہے نہ کہ لوگوں کی عمر کا۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ جزء - (30) سورة التكاثر

سورة التكاثر مکہ میں نازل ہوئی ہے

وجہ تسمیہ :

سورہ : تکاثر : اس لیے نام رکھا گیا کہ ہمارے عظیم پروردگار نے اس سورت کے شروع میں فرمایا ہے: "أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ": کثرت مال و اولاد اور یاروں ، خدمت گاروں پر فخر نے تمہیں غافل کر دیا، تو ہم کہیں گے اس سورہ کا نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے " أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ" یہ سورت: تکاثر: کے نام سے مشہور ہوئی، اس سورت کا آغاز ملامت اور سرزنش سے ہوتا ہے ، اس میں بہت سی آیات دنیا میں مصروف لوگوں کی تنبیہ کے لیے ہیں۔

سورة التكاثر کے سورہ القارعه سے ربط و مناسبت

سورہ قارعه میں قیامت کے دن کی بعض سختیوں اور نیکیوں کے مکافات اور بد کاروں کے عذاب کے بارے میں بتایا گیا ہے، اور تکاثر میں جہنمیوں کے عذاب میں گرفتاری کی حالت زار کی وجہ بیان کی گئی ہے، کہ دنیوی مال و دولت، اولاد، لشکر، نوکروں اور ہمنشینوں سے لگاؤ اور محبت، اور گناہوں میں آلودہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے دین سے غافل ہو گئے۔

سورة التكاثر کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورہ تکاثر سورہ کوثر کے بعد نازل ہوئی ہے، اس سورت کا ایک (1) رکوع ، آٹھ (8) آیتیں ، اڑسٹھ (68) الفاظ، ایک سو تیس (123) حروف اور انہتر (69) نقطے ہیں۔

(قرآن کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے تفسیر احمد سورة الطور ملاحظہ کریں)۔

سورة التكاثر کے نزول کا وقت

ابو حیان اور شوکانی فرماتے ہیں یہ سورہ تمام مفسرین کے نزدیک مکی ہے، اما م سیوطی نے بھی کہا ہے کہ مشہور ترین قول یہی ہے کہ یہ سورت مکی ہے، لیکن بعض ایسی روایات بھی ہیں جن کی بنا پر اس سورت کو مدنی کہا

گیا ہے وہ روایتیں یہ ہیں ؛ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی الحارث الحر انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے ، یہ دونوں قبیلے پہلے اپنے زندہ لوگوں کو گن کر ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے ، پھر قبرستان میں جا کر اپنے مردوں کو شمار کر کے ایک دوسرے پر فخر اور ناز کرنے لگے ، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا ، "أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ" لیکن اگر صحابہ اور تابعین کا طریقہ کار اس کے شان نزول کے بیان کے بارے میں دیکھا جائے تو شاید کہ یہ سورہ "تکاثر" اس وقت نازل ہوئی ہو ، بلکہ اس مفہوم کا اس پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو ان دو قبیلوں نے کیا تھا۔

امام بخاریؒ اور ابن جریر نے ابی بن کعب کی اس روایت کو نقل کیا ہے کہ ہم بنی آدم کے اس فرمان کو کہ " لو کان لابن آدم وادیان من مال لا بتغی وادیا ثالثا ولا یملأ جوف ابن آدم إلا التراب" ترجمہ: "اگر اولاد آدم کے پاس مال و دولت سے بھری دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی کو تلاش کرے گا ، اور بنی آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کچھ نہیں بھر سکتا" ، ہم اسے قرآن سمجھتے تھے کہ "أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ" نازل ہوئی ، اس روایت کو اس کے مدنی ہونے کی دلیل اس لیے قرار دیتے ہیں کہ ابی بن کعب مدینہ میں مسلمان ہوئے تھے ، لیکن ابی کے اس بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ صحابہ کرام کسی معنی کے بنیاد پر اسے قرآن سے سمجھتے تھے ، اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ اس روایت کو قرآن کی آیت سمجھتے تھے تو یہ بات قابل قبول نہیں ہے ، کیونکہ صحابہ کرام کی اکثریت ایسی تھی وہ کہ قرآن کریم کے ایک ایک حرف اور لفظ سے واقف تھے ، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ یہ حدیث قرآن سے مأخوذ ہے تو اس روایت کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مدینہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا ، انہوں نے پہلی بار یہ سورہ آپؐ کی زبان مبارک سے سنی ، ان کا خیال تھا کہ یہ نئی نازل شدہ سورت ہے ، اور پھر انہوں نے گمان کیا کہ رسول اللہؐ کی مذکورہ بالا حدیث اس سورہ سے لی گئی ہے ۔

ابن جریر ، ترمذی ، ابن المنذر اور دوسرے محدثین اس قول کو علی بن ابی طالبؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ہم عذاب قبر کے بارے میں شک اور تردید میں تھے کہ "أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ" نازل ہوئی ، اس روایت کو اس سورت کے مدنی ہونے کی دلیل اس لیے کہتے ہیں کہ عذاب قبر کے بارے میں مدینہ میں بات ک گئی تھی ، مکہ میں اس کا ذکر نہیں ہوا تھا ، لیکن یہ مطلب غلط ہے ، مکی

سورتوں میں بہت سارے مقامات پر اتنی صراحت کے ساتھ عذاب پر بات کی گئی ہے کہ جس میں شک و تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: سورہ انعام آیت 93، سورہ نحل، آیت 28، سورہ مؤمنون آیات: 99-100، غافر آیات: 45-46، یہ تمام سورتیں مکی ہیں، اس لحاظ سے اگر حضرت علیؑ کی روایت سے صرف یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سورہ : تکاثر: مذکورہ مکی سورتوں سے پہلے نازل ہوئی ہے، اور اس کے نزول نے صحابہ کرامؓ میں عذاب قبر کے بارے میں شک و تردد کا خاتمہ کر دیا تھا۔

ان سب روایات کے باوجود مفسرین کی بڑی اکثریت اس کے مکی ہونے پر متفق ہے، ہمارے نزدیک یہ سورہ نہ صرف مکی ہے، بلکہ اس کی مفہوم اور لحن بیان ایسا ہے کہ گویا یہ سورہ مکی دور کی ابتدائی نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے، (از تفہیم القرآن)

سورہ تکاثر کا محور

سورہ تکاثر کا موضوع دنیا پرستی اور دنیا پرستوں کا برا انجام ہے، اور یہ انسانوں کا زیادہ طلب کرنا اور مانگنا موت کے لمحے تک جاری رہتا ہے، سورت کا نام تکاثر باب تفاعل سے ہے، زیادہ طلب کرنے کا معنی دیتا ہے کثرت سے مانگنا اور ضرورت سے زیادہ مانگنا، کیونکہ تکاثر، کثرت کے مادہ سے لیا گیا ہے، اور کثرت تین معنی میں استعمال ہوتا ہے، پہلا معنی یہ ہے کہ انسان کی تخلیق ایسی کی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ کمانے اور مال و دولت میں اضافہ کے لیے کوشش کرتا ہے، چونکہ باب تفاعل سے ہے اس لیے کسی کام کے کرنے میں دو یا چند افراد کی شراکت کا معنی دیتا ہے، تیسرا معنی فخر کرنا ہے کہ اس کی رو سے مال و دولت کثرت سے حاصل ہونے میں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں، خاص کر اشرافیہ کے خاندان اور خصوصاً خواتین، قرآن کی یہ تعبیر سورہ حدید کی آیت "20"، میں دلچسپ انداز میں بیان ہوئی ہے، جہاں ارشاد ہے "إِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُوَ وِزْنٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۝ كَمْثَلٍ غَيْثٍ أَحْبَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيَجُ فَتَرَهُ مُضْفَرًا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۝ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۝ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝"، ترجمہ: "جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت (و آرائش) اور تمہارے آپس میں فخر (وستائش) اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (و خواہش) ہے (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کہ (اس سے کھیتی اگتی اور) کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے، پھر وہ خوب

زور پر آتی ہے پھر (اے دیکھنے والے) تو اس کو دیکھتا ہے کہ (پک کر) زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے، اور آخرت میں (کافروں کے لیے) عذاب شدید اور (مؤمنوں کیلئے) خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے۔"

سورہ تکاثر کی فضیلت

جناب رسول اللہ نے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا : کیا تم میں کوئی ہے جو دن میں ایک ہزار آیت قرآن کریم کی تلاوت کرے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کوئی یہ کر سکتا ہے کہ ہر روز ایک ہزار آیات پڑھ لے، آپ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی سورہ "الْهُكْمُ التَّكَاثُرُ" نہیں پڑھ سکتا؟ مطلب یہ ہے کہ سورہ "التكاثر" کا ہر روز پڑھنا ایک ہزار آیت پڑھنے کے برابر ہے، (مظہری بحوالہ حاکم اور بیہقی عن ابن عمر)

سورت کے بارے میں مختصر وضاحت

اللہ تعالیٰ اپنے کرم اور مہربانی سے انسان کو اپنی بندگی کی طرف دعوت دینے کی ابتدا اسے خواب غفلت سے جگانے سے کرتا ہے، اور اس سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے کہ : اے انسان! ایسا ہرگز مت سوچنا کہ موجودہ حالت اور اس دنیا کی زندگی جس کے تم عادی ہو گئے ہو ہمیشہ کے لیے باقی رہے گی، اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اے انسان! جان لو کہ اچانک ایک ایسی تبدیلی آئے گی کہ مکمل دنیا کو نا بود کر دے گی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ انسان کو جس چیز کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ یہ تصور کرتا ہے کہ اس سے کبھی الگ نہیں ہوگا، اور وہ چیز کبھی ختم نہیں ہوگی، وہ انسان جو اپنے مال و دولت، نعمت اور اسباب و وسائل پر خوش ہو جاتا ہے، اور ان کا عادی ہو جاتا ہے، تو وہ رفتہ رفتہ یہ بھول جاتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہر چیز جو اس کے پاس ہے سب کے سب فنا ہو کر ختم ہو جائے گی۔

یہاں اسے خواب غفلت سے بیدار ہونا چاہیے اور ہوش میں آنا چاہیے کہ یہ تصور اور خیال درست نہیں ہے، یہ حالت اور زندگی ایک دن ختم ہوگی، یہ دنیا ایک دم بدل جائے گی، ایک اور حالت اور دوسری دنیا وجود میں آئے گی کہ اس دنیا سے مشابہ بالکل بھی نہیں ہوگی، اس معاملے میں قرآن کریم کی بہت سی آیات اس تبدیلی اور تغیر کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ایسی حالت کہ اس میں انسان مرنے کے بعد زندہ ہو گا، اور دوسری حالت کے وجود میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہوگا تا کہ اس پر مقدمہ چلا یا جائے۔

مثال کے طور پر سورہ "تکاثّر" میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے، جو قیامت کے دن اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے غافل رہتے ہیں، اور بھول جاتے ہیں کہ یہ نعمتیں اللہ کی پہچان اور اس کے راستے کے انتخاب کا وسیلہ ہیں، اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جس دن رب تعالیٰ کے حضور میں حاضر کیے جائیں گے، اور ان سے پوچھا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور وسائل سے کیسے استفادہ کیا؟ ان سے اس طرح خطاب کر کے فرما تا ہے "الْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" اے عقلمند انسانو! اے وہ لوگو! جو دنیا کا مقام و مرتبہ حاصل کرنے میں مشغول اور سرگرم عمل ہو، اور اس راستے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہو، اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بھول گئے ہو، کیا تم نہیں جانتے، یا تم بھول گئے ہو کہ جس کے پاس جتنی نعمتیں اور مال و اسباب زیادہ ہوں اس پر ذمہ داری بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی؟ مقام و مرتبہ اور دولت و ثروت کے پیچھے ایسے لگے ہو کہ تمہاری جو اصل ذمہ داری ہے اور جو انجام تمہارے انتظار میں ہے اس سے غافل ہو گئے ہو، اور اسی طرح تم اس حالت میں ہو کہ موت تمہیں پکڑ لے، تم لوگ ہوش میں نہیں آتے اور خواب سے جاگتے نہیں ہو، یہاں تک کہ تم اپنی قبروں کو دیکھو گے (یعنی موت آئے اور ابدی جہاں میں پہنچ جاؤ)

اے غافل انسانو! اے وہ لوگو کہ تمہاری ساری سوچ اور فکر زیادہ مال و دلت جمع کرنا اور بلند مقام و مرتبہ حاصل کرنا ہے، کیوں تم اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بھول گئے ہو، اس طرح کی زندگی گزار رہے ہو، اس وقت تک ہوش میں نہیں آؤ گے جب تک ابدی جگہ نہ پہنچو، اے غافل انسانو! "كَلَّا سَوْفَ

تَعْلَمُونَ ۝ ۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝" اللہ تعالیٰ اس خطاب سے ان کی سرزنش اور ملامت کرتا ہے اور فرماتا ہے: نہیں، نہیں ایسا کام نہ کرو، بس کرو، یہ کام نہ کرو، غفلت بہت ہو گئی اب بس کرو، خود کو مال کے جمع کرنے میں مشغول نہ رکھو، اور تمہاری کوشش اور تحرک مال و دولت اور مقام و مرتبہ حاصل کرنے کے مقابلہ کے لیے نہ ہو، کیونکہ زیادہ دیر نہیں ہوگی کہ حقیقت جان جاؤ گے، اور ضرور جان لو گے کہ کیا خبر ہے اور کیا ہوگا۔

"کلا" نہیں، نہیں، خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور اس مقابلہ سے ہاتھ کھینچ

لو، "لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝" اگر تم جان لیتے کہ کیا انجام آگے آنے والا ہے، تو کبھی یہ کام نہ کرتے، کیوں غافل ہو؟ کیوں یہ نہیں سوچتے ہو کہ ایک دن

آئے گا کہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا ، کیوں ہوش میں نہیں آتے اور ہمیشہ دنیا کا مال جمع کرنے کی فکر میں ہو، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝۶ اللہ کی قسم اس جلانے والی شعلوں والی ، آگ کو ضرور دیکھو گے ، پہلے تو اسے دور سے دیکھو گے ، اس کے بعد: ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝۷ اس سے اتنے قریب ہو جاؤ گے کہ ایک طرح سے اس کا مشاہدہ کرو گے ، کہ اس میں شک و تردد کی کوئی گنجائش بھی نہیں رہے گی ، یقینی آنکھ کے ساتھ اسے دیکھو گے ، اور واضح طور پر جان لو گے کہ یہ آگ جہنم کی آگ ہے اور تم لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے ، کہ اس سے کوئی راہ نجات اور چارہ نہیں ہے ، یہ جان لو کہ اس دن ان تمام نعمتوں کے بارے میں جو تمہیں دی گئی ہیں پوچھا جائے گا، ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝۸ اس دن تم سے ان تمام نعمتوں اور سہولتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا جو تم کو فراہم کی گئی ہیں : تم سے پوچھا جائے گا ، کہ تم نے ان نعمتوں کو کیسے استعمال کیا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة التكاثر

أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝٣ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝٤ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝٦ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝٧ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝٨

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١	تمہیں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے غافل کر دیا
حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢	یہاں تک کہ تم نے قبرستان جا دیکھے
كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝٣	ہر گز نہیں، تم عنقریب جان لو گے
ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝٤	پھر ہر گز نہیں، عنقریب جان لو گے
كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝٥	ہر گز نہیں! اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہو تے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝٦	کہ یقیناً تم ضرور جہنم کو دیکھو گے
ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝٧	پھر یقیناً تم ضرور اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے
ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝٨	تم اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے

محترم قارئین: اس سورت کی آیات مبارکہ میں: دنیا کے مال و دولت پر فخر، اور انسان کے کردار سے متعلق سوال، جیسے موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١	تمہیں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے غافل کر دیا

یعنی: مال و اولاد زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے تمہیں خدا تعالیٰ کی اطاعت، اور آخرت کے لیے عمل کرنے سے غافل کر دیا، اور اسیر بنا لیا

ہے، ابن عباس اور حسن بصری آیت : " اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ " کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ " تکاثر " کثرت سے مشتق ہے ، اور مال و دولت جمع کرنے کا معنی دیتا ہے، اور دوسری روایت میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے " اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ " پڑھی اور فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ کسی غلط طریقے سے مال کمایا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فرائض مال میں رکھے گئے ہیں انہیں ادا نہ کیا جائے، (تفسیر قرطبی)

" التكاثر " تفاخر ، اور دنیاوی نعمتوں کی فراوانی پر فخر کرنا،

1 - دنیاوی معاملات میں لالچ اور زیادہ طلب کرنا اپنے لیے خرچ کیے بغیر ۔

2 - دو گروہ یا دو افراد کا آپس میں مقابلہ اور ضد۔

3 - نسب، اور قبیلے پر زبان سے شیخی مارنا، تفاخر کرنا۔

رب تعالیٰ کا یہ خطاب ان لوگوں کے لیے ہے جو دوسروں پر فخر کرنے اور شیخیاں مارنے کے لیے مال و دولت اور جائیدادیں کثرت کے ساتھ جمع کرنے میں مصروف ہیں ، ایسے کام انسان کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت سے روک دیتے ہیں، یہ لوگ اسی تکاثر و تفاخر میں مشغول ہوں گے کہ موت ان پر آجائے گی، ح الا انکھ مقابلہ عمل صالح اور ایمان میں ہونا چاہیے، یہ مقابلہ آخرت کی ابدی نعمتوں کے لیے ہونا چاہیے، نہ کہ عارضی اور وقتی کاموں میں، "الہاکم" لفظ " الہاکم " لَہُو سے لیا گیا ہے جو کہ حقیقت میں غفلت کا معنی دیتا ہے، لیکن عربی زبان میں اس لفظ کا اطلاق ہر اس مصروفیت کے لیے ہوتا ہے کہ انسان کی دلچسپی اس میں اتنی زیادہ ہو کہ وہ تمام تر وجود کے ساتھ اس میں منہمک ہو جائے اور دوسری اہم چیزوں سے غافل ہو جائے، جب لفظ "الہاکم" اس اصل سے استعمال ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر لَہُو اس قدر قابض ہو گیا ہے کہ تم اس سے زیادہ اہم کاموں کے بارے میں نہیں سوچتے ، تم اس کی طرف متوجہ ہو کر ہمیشہ اس کے بارے سوچتے رہتے ہو، اصفہانی " لَہُو " کے بارے میں لکھتے ہیں : " لَہُو " وہ ہے جو انسان کو فائدے والے اہم کام سے مصروف رکھے، "الہا" مصروف اور مشغول کرنے کے معنی میں ہے، " التکاثر " تکاثر بھی کثرت سے ماخوذ ہے، اس کے تین معنی ہیں : ایک یہ ہے کہ آدمی بہت زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، دوسرا یہ کہ لوگ ایک دوسرے سے زیادہ کمانے، جمع کرنے

میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں، تیسرا یہ کہ لوگ اس بنا پر کہ دوسروں سے زیادہ اور کثرت سے مال رکھتے ہیں فخر کرنے لگیں، شیخی مارنے لگے، تو پھر "أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ" کا معنی یہ ہے کہ اس تکاثر نے تمہیں اتنا زیادہ مشغول کر دیا ہے کہ اس سے تمہاری دلچسپی اور لگاؤ نے اس سے زیادہ اہم چیزوں سے تمہیں غافل کر دیا ہے، (تفہیم القرآن)

حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲	یہاں تک کہ تم نے قبرستان جا دیکھے

اپنے مردوں کی قبریں گننے لگے اور فخر کرنے لگے، زیادہ ہونے کے فخر نے اور ایک دوسرے پر کثرت میں مقابلہ اور ضد نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور آخرت کے لیے عمل سے غافل کر کے اسیر بنالیا ہے "یہاں تک کہ تم قبرستان تک پہنچ گئے" یعنی: کثرت کی طلب اور فخر و مباہات کو اس حد تک تم نے آگے بڑھایا کہ تمہیں موت نے آلیا، اور اس حالت میں قبروں میں دفن ہو گئے، یا یہاں تک تم لوگوں نے اسے آگے بڑھایا کہ اپنی کثرت دکھانے کیلئے قبرستان تک گئے، اور مردوں کو شمار کرنے لگے، حدیث شریف میں ہے کہ: "یہرم ابن آدم، ویبقى معہ اثنتان: الحرص والأمل" ترجمہ: "آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، لیکن دو چیزیں اس کے ساتھ باقی رہتی ہیں، ایک لالچ اور دوسری اس کی لمبی آرزوئیں" اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ: قبروں کی زیارت سنگدل لوگوں کے لیے شفا، بخش علاج میں سے ہے، کیونکہ یہ زیارت آخرت اور موت کو یاد دلانے والی ہے، اس لحاظ سے علماء مردوں کے لیے زیارت قبور پر اتفاق رکھتے ہیں، لیکن عورتوں کے لیے اس کے جواز میں اختلاف ہے، جوان عورتوں کا وہاں جانا حرام اور اڈھیر عمر عورتوں کے لیے مباح ہے، اگر عورتیں مردوں سے الگ قبروں کی زیارت کے لیے جائیں تو ان سب کے لیے جائز ہے، اگر مردوں کے ساتھ مخلوط ہو کر جانے میں فتنے کا اندیشہ ہو تو جائز نہیں ہے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝۳	ہر گز نہیں، تم عنقریب جان لو گے

غفلت اور دنیا پر فخر کرنے انجام جان لو گے، یہ سرزنش ہے انسانوں کے لیے ان کی کثرت طلبی پر، یعنی: اے انسانو! باز رہو اس چیز میں مشغول ہونے سے جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس سے دوری اختیار کرو کیونکہ مستقبل میں اللہ کی بارگاہ میں آخر کار تمہیں اپنی جہالت اور عبادت میں کمی اور عارضی دنیا میں مصروف ہو کر اپنے اور مستحکم گھر کو نظر انداز کرنے کا پتہ چل جائے گا، یعنی بہت جلد تم پر واضح ہو جائے گا کہ آخرت اس جلد فنا ہونے والی دنیا سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

"کلا": "ہاں، ایسا کام نہیں کرنا چاہیے تھا، اس فخر و مباہات کو چھوڑو"، "سَوْفَ تَعْلَمُونَ" جب قبر میں داخل ہو گے، اس وقت تم اس تکاثر اور تفاخر کی غلطی جان جاؤ گے، یعنی: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ ترقی، خوشی اور کامیابی کا مفہوم ہے دنیا کے زیادہ سے زیادہ اسباب اور سہولتیں حاصل کرنا، حالانکہ کامیابی ہر گز یہ نہیں ہے، بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا، اور جان لو گے کہ تم زندگی بھر کیا غلطی کرتے رہے ہو۔

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۱۰۲﴾	پھر ہر گز نہیں، عنقریب جان لو گے

پھر ایسا نہیں ہے، بہت جلد جان جاؤ گے، یہ تکرار تاکید اور تشدید کے لیے ہے، اور ایک سرزنش کے بعد دوسری سرزنش ہے، یعنی بہت جلد ہی اس دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے میں تمہاری غلطی تم پر ظاہر ہو جائے گی، اور دنیا میں مصروف رہنے اور اطاعت الہی سے منہ موڑنے کی برائی تم پر واضح ہو جائے گی، یعنی جب موت تم کو اپنے آغوش میں لے لیگی اور تم قبر میں دفن ہو جاؤ گی اور اس کی دہشت اور سختی کا مشاہدہ کر لو گے، تو دولت کی فراوانی پر گھمنڈ کرنے کا انجام جان لو گے، ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ" یعنی: جب آخرت میں عذاب سے دوچار ہو جاؤ گے تو جان لو گے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ تفسیر قرطبی: (20/176)۔

"کلا" "حقا" سرزنش کو منحرف خیالات اور طرز عمل کے خلاف دوہرایا جانا چاہیے، (کلا، ثم کلا، کلا) علما کے قول کے مطابق آیات کی تکرار قرآن میں دو دلیل کے بنا پر ہوتی ہے:

1- اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ ایسا نہ کرو، اور دنیا میں مشغول نہ ہو جاؤ (اپنا خیال رکھو کوئی تمہارے کام نہیں آئے گا)۔

2- دو آیتوں کے دو مختلف معانی ہوں، دوسری آیت کا معنی الگ ہو، پہلی آیت دنیا اور دوسری آیت آخرت کی طرف اشارہ کرتی ہو (کلا) پہلی آیت میں گناہوں پر سرزنش ہوگی، (سب سے پہلے دنیا میں گناہوں کے وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے) کیونکہ گناہ کا ارتکاب کرنا خود پریشانی اور تکلیف کا باعث بنتا ہے۔

"کلا" دوسری آیت خدا کے اخروی عذاب کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور محشر کے دن عذاب میں مبتلا کرے گا، اور محشر

پر اس کی وجہ سے، سورج کی تپش، جہنم کا خوف اور پل صراط پر کانٹے اور جہنم کی آگ سے عذاب دے گا۔

ہر گز نہیں! اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوئے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)	كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝

یعنی : اگر تمہیں یقینی علم ہوتا، جیسا کہ دنیا کی قطعی اور یقینی چیزوں کا تمہیں علم ہے کہ کیا انجام تمہارے انتظار میں ہے، اور کس ٹھکانے پر جاؤ گے، تو یقیناً یہ علم تمہیں کثرت طلبی اور فخر کرنے سے باز رکھتا، اور دنیا کی طلب کبھی تمہیں اس عظیم کام سے غافل نہ کرتی۔

جواب (لو) آیت مبارکہ میں محذوف ہے، اس وجہ سے کہ زیادہ خوف پیدا ہو، یعنی اگر تمہیں معلوم ہوتا تو دنیا کی عزت و تکبر تمہیں دھوکہ نہیں دیتی اور آخرت کی پریشانی اور دہشت سے تم غافل نہیں ہوتے، جیسا کہ نبیؐ نے فرمایا: "اگر تم جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور زیادہ روتے (یہ بخاری کی روایت کردہ حدیث کا حصہ ہے)، (از تفسیر صفوہ التفاسیر)۔

التسہیل میں ہے کہ : جواب (لو) محذوف ہے اور اس کی تقدیری عبارت یوں ہے : اگر تم جانتے ہوئے، تو بس کرتے، اور آخرت کے لیے تیاری کرتے، (لو) کا جواب ڈر اور خوف ایجاد کرنے کے لیے محذوف رکھا گیا، تاکہ سننے والا اس کی تعریف کرے جسے وہ بڑا سمجھتا ہے، جیسے آیت : "وَلَوْ تَرَىٰ اِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ" (التسہیل: 416/4)۔

"علم الیقین" یعنی : یقینی طور پر ہوگا۔

"لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ" (اگر تم یقینی طور پر اپنی دولت کی فراوانی پر شیخی مارنے اور گھمنڈ کرنے کا انجام جانتے) مگر تمہیں تو ادنیٰ سا علم بھی نہیں ہے، یعنی : یقینی علم نہیں رکھتے ہو، اگر علم الیقین بھی ہوتا تو تمہیں کافی ہوتا۔

یقینی علم وہ ہے جو حقیقت کے مطابق یقین سے پیدا ہو، یا عینی مشاہدہ سے یا کسی قطعی اور مستحکم وجہ سے وجود میں آیا ہو، جس پر عقل صحیح یا رسول اکرمؐ سے نقل ثابت اس پر دلیل ہو۔

کہ یقیناً تم ضرور جہنم کو دیکھو گے	لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝

مفسر آلوسی فرماتے ہیں: یہ پوشیدہ جواب قسم ہے جس پر وعید کو مؤثر اور دھمکی کو سخت کر دیا ہے، یعنی: پرورگار کی قسم تم دوزخ کی آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے، اور صاف صاف مشاہدہ کرو گے، کیا تم نے ایسا کوئی عمل انجام دیا ہے جو نجات بخش ہو اور تمہیں دوزخ کی آگ سے بچاسکے اور اس سے دور کر دے؟

پھر یقیناً تم ضرور اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے	ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝

البحر میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے "عین الیقین" لا کر اس وہم کو دور کر دیا ہے کہ پچھلی آیت میں جس رؤیت کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں مجازی معنی مراد لیا ہے (البحر: 508/8) یعنی: پھر تم دوزخ کو اس رؤیت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے جو بالکل یقینی ہے، بعبارت دیگر: یہ ان کی جہنم میں ابدی زندگی کی خبر ہے، یعنی: ان کی یہ رؤیت مسلسل، مستقل اور بلا تعطیل ہے، ابن کثیر فرماتے ہیں: یہ آیت پچھلی آیت میں ذکر شدہ سرزنش کی تفسیر ہے، یعنی: "لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ" حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: جب حضرت موسیٰ کوہ طور میں تشریف فرما تھے، تو ان کی قوم کے لوگ بچھڑے کی پرستش کرنے لگی، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو وہیں پر مطلع فرمایا کہ آپ کی قوم ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے، اس وقت ان کو اتنا اثر نہیں ہوا تھا جتنا قوم کے پاس آنے کے بعد ان کو دیکھ کر ہوا، بے ساختہ انہوں نے الواح تورات کو زمین پر رکھا، (رواہ احمد و الطبرانی بسند صحیح)۔

تم اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے	ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝

پھر اس دن تم سب سے ان نعمتوں کے بارے باز پرس ہوگی جو تمہارے پاس تھیں، یعنی: دنیا کی ان نعمتوں کو شمار کرنے کے مقام پر جس نے تم سے آخرت کا کام بھلا دیا تھا، پوچھے جاؤ گے کہ کیا تم نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا کہ نہیں۔

"ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ" لام تاکید ابتدا میں اور نون ثقیلہ آخر میں، یہ اس بات کی تاکید ہے کہ لازمی طور پر تم سے پوچھا جائے گا، "يَوْمَئِذٍ" جس دن دوزخ کو یقینی طور پر دیکھو گے، "عَنِ النَّعِيمِ" وہ نعمتیں جن کے تم مالک ہو اور جن سے تم لطف اندوز ہوئے، جیسے: صحت، فراغت، راحت، کھانا، پینا وغیرہ، جو نعمتیں تمہیں عطا کی گئی ہیں قیامت کے دن ان کے متعلق تم

سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کیا ہے کہ نہیں؟ صحت مند جسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہے، اور مال و دولت سے زکوٰۃ ادا کی ہے، مذکورہ بالانعمتوں کا جس نے شکر ادا کیا تو اسے نجات ملے گی، اور جس نے ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا تو مستحق عذاب ٹھہرے گا، ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت اور اطاعت میں خرچ ہونا چاہیے، کیونکہ ہم سے اس بارے میں پوچھا جائے گا، اس سلسلے میں مذکور احادیث اس سوال کی عمومیت کے لیے مفید ہیں، یعنی: تمام انسان بہ شمول مؤمن اور کافر کے سب سے پوچھا جائے گا، لیکن کفار سے سرزنش کے طور پر، کیونکہ انہوں نے نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا، اور مؤمن سے سوال کرنا یہ عزت کے لیے ہوگا، کیونکہ وہ شکر گزار تھے۔

حدیث شریف میں ہے مدینہ میں حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سے کس نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا، جبکہ ہم تو اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سایہ بان کے سائے کا درختوں اور دیگر چیزوں کے سائے کا جو آپ لوگوں کو گرمی، سردی سے محفوظ رکھتا ہے، اور گرمی کے دن ٹھنڈے پانی کا سوال کیا جائے گا۔

اسی طرح حدیث شریف ہے جو کہ ابن ابی شیبہ نے احمد بن لیبید سے روایت کی ہے، کہتے ہیں: "جب سورہ تکاثر نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے تلاوت کی جب اس آیت پر پہنچے: "ثُمَّ لَنَسْأَلَنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ" تو صحابہ کرام نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہم سے کونسی نعمتوں کا پوچھا جائے گا، جبکہ ہمارے پاس پانی اور کھجور کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، اور ہماری تلواریں ہمارے گلے میں لٹکی ہوئی ہیں، اور دشمن بھی سامنے ہیں؟ آخر وہ کونسی نعمت ہے جس کے متعلق ہم سے باز پُرس ہوگی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پوچھنا ایک حقیقت ہے تبدیل نہیں ہوگا۔"

اسی طرح حدیث شریف میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں کہ لوگ ان سے غافل ہیں: صحت، اور فراغت، یعنی: اکثر لوگ ان دو نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں، اور اپنا فرض ان کے متعلق پورا

نہیں کرتے ، بس جس کے ذمے جو حق ہے اسے ادا نہ کرے وہ درحقیقت نقصان اٹھانے والا ہے ۔

اسی طرح حدیث شریف میں یہ روایت ابی ہریرہؓ کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " لا تزول قدماء العبد يوم القيامة حتى يسأل عن أربع: عن عمره فيم أفناه، وعن شبابه فيم أبلاه، وعن ماله من أين اكتسبه وفيم أنفق، وعن علمه ماذا عمل به " (بندے کے قدم قیامت کے دن اس وقت تک ہل نہیں سکیں گے جب تک کہ اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا جائے: اس کی زندگی کے بارے میں ، اس نے وہ کیسے گزاری، اس کی جوانی کے بارے میں ، کہ اس نے کس طرح گزاری، اس کے مال و دولت کے بارے میں ، کہاں سے حاصل کیا ؟ اور کہاں خرچ کیا ، اور اس کے علم کے بارے میں کہ اس پر کیسا عمل کیا؟)۔

اسی طرح حدیث شریف میں مسلم اور اصحاب سنن سے مروی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے باہر نکلے تو حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ سے ملے ، آپ نے پوچھا کہ : اس وقت کونسی چیز تمہیں گھروں سے باہر لے آئی ہے ؟ ان دونوں نے کہا: بھوک نے یا رسول اللہ ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ، مجھے بھی یہی چیز باہر لائی ہے جو آپ دونوں کو باہر لائی ہے ، پھر وہ دونوں آپ کے ساتھ ایک انصاری کے گھر تشریف لے گئے ، وہ شخص گھر پر نہیں تھا، جب اس کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، تو کہا: خوش آمدید! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت کیا کہ: فلاں (تیرا شوہر) کہاں ہے ؟ عورت نے کہا: وہ ہمارے لیے میٹھا پانی لینے گیا ہے، اسی دوران وہ انصاری آدمی پہنچ گیا، بنی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دو دوستوں کی طرف نگاہ دوڑائی، اور کہا: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں: آج کسی کے پاس بھی مجھ سے زیادہ معزز مہمان نہیں ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا، اور خود کھجوروں کے باغ میں گیا، اور کھجوروں کا ایک گچھا لایا جس میں پکی کچی دونوں قسم کی کھجوریں تھیں، ان کو کھجور کھانے کی دعوت دی ، پھر اس نے چھری لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ ہو کہ کوئی دودھ والا جانور ذبح کر دو؟ پھر اس نے ایک دنبہ ذبح کر دیا، جب سب نے دنبہ کا گوشت اور کھجوریں کھائیں ، میٹھا پانی بھی پی کر سیراب ہوئے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ابوبکرؓ اور عمرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں پوچھے جاو گے۔

اسلام میں فخر

نسب پر فخر کرنا جہالت کی بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کاموں سے لاتعلقی اختیار کی ہے، اللہ کا فرمان ہے: "وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ" (سورہ زخرف: 32) اور ہم نے بعض کو بعض پر فوقیت دی۔

اُس فوقیت سے مراد دنیاوی امور ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَقَالُوا لَا تَنْزِلْ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ" ۝۳۱ اَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۝ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرِيًّا ۝ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ" ۝۳۲ (سورہ زخرف: 32) ترجمہ: "اور (یہ بھی) کھنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے پروردگار کی رحمت اس سے کھیں بہتر ہے۔"

ایک بندہ فقیر، دوسرا دولتمند، ایک بیمار، دوسرا صحت مند، ایک مضبوط طاقتور، دوسرا کمزور، آیت سے مراد یہ ہے۔

نسب پر فخر کرنا جاہلیت کے دعووں میں سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۝ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۝ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ" ۝۱۳ (حجرات: 13) "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بیشک خدا سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے"، قوم قبیلے بنانے کا مقصد ایک

دوسرے کو پہچاننا ہے نہ کہ فخر کرنا ۔

شیخی مارنا اور گھمنڈ کرنا

اخلاقی برائیوں میں سے ایک بہت ہی بُری انسانی خصلت فخر اور گھمنڈ کرنا ہے ، فخر سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کے سامنے گھمنڈ کرتا ہے ، اپنے اندر محسوس ہونے والے غیر حقیقی یا حقیقی کمالات کی وجہ سے ، اور ان پر فخر کرتا ہے ، فخر تکبر کا ایک حصہ ہے ، یا اس کی ابتدا تکبر سے ہوتی ہے ، اس لحاظ سے جتنی آیات اور روایات تکبر کے بارے میں آئی ہیں وہ شیخی مارنے کو بھی شامل ہیں ، فخر یا شیخی مارنا جہالت اور نادانی کی جڑ ہے ، جیسا کہ تکبر بھی جڑ ہے ، اس لیے جاہل انسان نہ کمالات کو پہچانتا ہے ، نہ ہی کمال کی اصل علت کو ، اس وجہ سے وہ بعض خامیوں کو کمال سمجھتا ہے ، اور اپنے خیالی کمال پر فخر کرتا ہے ، یا اپنے اندر موجود کمالات کو اپنی تخلیق سمجھتا ہے ، اور وہ کمال کے ماخذ و منشأ کو بھول جاتا ہے ، جو کہ خدا تعالیٰ ہے ، چنانچہ یہ دونوں خصوصیات جہالت کا حصہ ہیں ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: " لَا حُمْقَ أَعْظَمَ مِنَ الْفَخْرِ " (دوسروں پر شیخی مارنے سے بڑی حماقت کوئی نہیں) ۔

شیخی مارنے کا علاج

اخلاقی برائیوں کا علاج اور روک تھام اس وقت ممکن ہے کہ جب ان میں مبتلا شخص اسے واقعی برائی سمجھے اور ذاتی طور پر اس کے علاج کے لیے اقدامات کرے ، ورنہ اس مرض کا علاج معالجہ ناممکن ہو جائے گا ، کیونکہ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں وہ اسے اخلاقِ حسنہ کے زمرے میں شمار کرتے ہیں ، اور اس نکتہ پر توجہ نہیں کرتے کہ: " أَكْبَرُ الْفَخْرِ لَا تَفْخِرُ " ہے ، اسی لیے گھمنڈ سے روکنا ممکن نہیں ہے ۔

اس بنا پر علمائے کرام کا کہنا ہے کہ علاج کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ جو شخص اس مرض میں مبتلا ہو اسے یہ سمجھایا جائے کہ یہ خصلت اخلاقی برائیوں میں سے ہے ، اسے علاج معالجہ کی کوشش کرنی چاہیے ، مرض کے علاج کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ : اس مرض میں مبتلا شخص میں اس مرض کے عامل اور سبب کی تشخیص کی جائے ، مطلب

یہ کہ جو شخص گھمنڈ کر رہا ہے اس کے پاس کیا ہے، جس کی وجہ سے اس میں یہ بری صفت پیدا ہوئی ہے؟ یا اس چیز کی وجہ سے ہے جو صرف اس میں ہے، جیسے: علم، حسن، طاقت یا دولت ہے جس پر کہ وہ گھمنڈ کرتا ہے، یا جو کچھ دوسروں میں بھی ہے، جیسے: حسب و نسب اور رشتہ داروں کی نیکی و فضیلت پر شیخی مارنا، اگر پہلا ہے تو اسے سمجھنا چاہیے کہ ان چیزوں میں سے جو اس کے اندر ہیں تو اس میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے جو حسن دے کر قدرت نمائی کی ہے اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ حسن و جمال ایک دن گل سڑ کر مٹی میں بدل جائے گا، جیسا کہ پہلے نطفہ اور گندہ پانی تھا۔

دوسرے حصے میں، جیسے: دولت اور طاقت، سب سے پہلے اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک دربان ہے، اور اپنے وارثوں کے لیے ذخیرہ اندوزی کر رہا ہے، دوسرے لوگ اس کا یہ مال کھائیں گے، وہ اپنا حساب چکائے گا، یہ بات قابل فخر نہیں ہے، اور دوسری بات اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے، فخر کم ظرفی اور تنگ نظری کی وجہ سے ہوتا ہے، وہ شخص جو اپنے کم سے کم مال پر فخر کرتا ہے اور دوسروں کے مہنگے مال کو نہیں دیکھتا، چنانچہ وہ جہالت میں مبتلا ہے نہیں دیکھتا کہ، اس کی صلاحیت بھی ایک معمولی چیز ہے اور وہ بھی خیالی ہے مگر اس نے پھر بھی اسے اکڑ میں رکھا ہے، ایسے شخص کو اپنے حال پر افسوس ہونا چاہیے کہ اوروں نے سترشہر عشق کی سیر کی ہے، لیکن ہونٹوں پر سکوت کی مہر لگا رکھی ہے، لیکن وہ کسی گلی کے موڑ پر کھو گیا ہے، اور اپنی منزل کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھایا، اور کوئی فضیلت بھی حاصل نہیں کر سکا، اس کی آواز انکر الاصوات ہے جو گھمنڈ کے ساتھ اونچی ہے، اور کھوکھلے ڈرم کی طرح بج رہا ہے۔

علم الیقین کیا ہے؟ اور کن لوگوں کے لیے مخصوص ہے؟

علم الیقین کا موضوع جس کا ذکر سورۃ "تکاثر" آیت: 5 میں کیا گیا ہے، "كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ" ترجمہ: ہر گز نہیں! اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوئے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)۔

اگر علم الیقین اس طرح جان لو جیسا کہ دنیا کی قطعیات اور یقینیات کو جانتے ہو کہ کونسی قسمت تمہارا انتظار کر رہی ہے اور تم کہاں جا رہے

ہو بلاشبہ یہ سوچ آپ کو کثرت طلبی اور فخر کرنے سے روکے گی، اور دنیا کبھی تمہیں ایسے عظیم کام سے غافل نہیں کرے گی، علم یقین ایک ایسا علم ہے کہ جو حقیقت کے مطابق اعتقاد اور یقین سے پیدا ہوا ہو، اور معروضی مشاہدے سے یا کسی قطعی اور مستحکم دلیل سے نکلا ہو جو عقل صحیح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت اس پر دلالت کرے، علم یقین وہ نہیں ہے جو اہل تصوف کے ہاں تصور ہے کہ وہ ایک مقام و مرتبہ ہے جسے انسان حاصل کر سکتا ہے، اور پھر اس کے ذمے سے شرعی فرائض ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ" (سورة الحجر: 99) ترجمہ: "اور اپنے پروردگار کی عبادت کئے جاؤ یہاں تک کہ تمہیں علم یقین آجائے۔"

یہ درحقیقت قرآن کریم کے معنی کی تحریف ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ مکلفیت صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی علم یقین کے درجہ کو نہ پہنچ جائے، لیکن جیسے ہی وہ اس درجہ کو پہنچ جائے تو شرعی فرائض اس سے ساقط ہو جاتے ہیں، جبکہ علم یقین کا صحیح مفہوم اس آیت میں موت ہے، یعنی اس وقت تک عبادت کرو جب تک زندہ ہو، یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت جیسے: نماز وغیرہ انسان پر اس وقت تک فرض ہے، جب تک اس کی عقل کام کرتی ہے، لہذا مؤمن کو چاہیے کہ چاہے جس جسمانی کیفیت میں ہو اپنی حالت کے مطابق نماز پڑھے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: "کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اور اگر نہیں کر سکتے تو بیٹھ کر، اگر نہیں کر سکتے تو اپنی پہلو پر" اس لیے یہ آیت تصوف کی بات کو غلط ثابت کرتی ہے جو کہتے ہیں: "یقین" سے مراد اس آیت میں "معرفت" ہے؛ لہذا ان کے نزدیک معنی یہ ہے کہ اپنے رب کی اس وقت تک عبادت کرو، جب تک کہ تم علم اور معرفت کی حد کو نہ پہنچ جاؤ، پس جب ان میں سے ایک - ان کی رائے میں - علم کی حد کو پہنچ جائے، تو شرعی فرائض اس سے ساقط ہو جائیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رائے - جیسا کہ ابن کثیر نے کہا - کفر گمراہی اور جہالت ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ انبیاء اور ان کے اصحاب سب سے زیادہ خدا اور اس کے حقوق کے بارے میں جاننے والے تھے، اس کے باوجود وہ اپنی موت تک خدا کی عبادت میں مصروف اور نیک اعمال کرنے میں سب سے زیادہ متقی اور محتاط تھے، خدا تعالیٰ کے بارے میں ان کے علم کے کمال نے انہیں اپنے فرائض اور عبادت سے کبھی نہیں روکا، بلکہ عاجزی، خشوع، دعا میں ان کی محنت اور

بڑھ جاتی تھی، صوفیاء کے اس جھوٹے قول کی تردید میں ایک اور آیت کی گواہی لے سکتے ہیں، جو اہل جہنم کی زبانی ہے، خدا تعالیٰ ان کے متعلق فرماتے ہیں: "إِلَّا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ۝۳۹ فِي جَنَّاتٍ ۝۴۰ يَتَسَاءَلُونَ ۝۴۱ عَنِ الْجُرُمِ ۝۴۲ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۝۴۳ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيِّينَ ۝۴۴ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمُسْكِينِ ۝۴۵ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝۴۶ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝۴۷ حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِينَ ۝۴۸" (سورة المدثر: 39 تا 74). (مگر دائیں طرف والے جنتونمیں سوال کریں گے مجرموں سے تمہیں کس چیز نے دوزخ میں ڈال دیا؟ وہ کہیں گے: ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے، اور نہ ہم مسکین کو کھلاتے تھے، ہم بیہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر فضول بحث کیا کرتے تھے، اور ہم جزا کے دن کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ ہمارے پاس یقین آگیا) یقین سے مراد موت ہے اس آیت میں۔

یقین کے بارے میں قرآن مجید میں تین جملے ہیں " (1) علم الیقین ، (2) حق الیقین ، (3) عین الیقین ، خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: "إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ۝۹۵" (سورہ واقعه: 90) " كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝۹۶" (التكاثر: 5) ثُمَّ لَتَرَوْهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝۹۷" (التكاثر: 7) علم الیقین سے مراد وہ خبر ہے جس کا اظہار معتبر اور سچے لوگوں نے کیا ہو، اس طرح کہ اس کی صداقت یا وجود میں کوئی شک نہ ہو، عین الیقین اس وقت ہے جب وہ سنی ہوئی خبر کو دیکھے، اور حق الیقین اس وقت ہے جب اس خبر کو جانچے اور چھوئے، مثلاً: اگر معتبر اور دیانتدار لوگ کہیں کہ شہد میٹھا ہے، یہ علم الیقین کی طرح ہے، کہ ایک آدمی یقین کرتا ہے کہ شہد نام کی کوئی چیز ہے، جس کا ذائقہ میٹھا ہے، اور جب وہ اسے دیکھتا ہے تو عین الیقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے، اور جب وہ اسے پیتا ہے تو حق الیقین کی درجہ پر پہنچ جاتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے جس جنت کا ذکر انبیاء کی زبان سے مؤمنین کے لیے کیا ہے، وہ علم الیقین ہے، کیونکہ ان کو یقین ہے کہ آخرت میں ایک ابدی نعمت ہے جسے جنت کہتے ہیں، اور جب وہ اسے دیکھیں گے عین الیقین کے درجے پر پہنچیں گے اور جب جنت میں داخل ہوں گے اور جنت کی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے تو حق الیقین کے درجہ پر پہنچ جائیں گے، کیونکہ وہ اس تک پہنچے جس کے بارے میں انہیں بتایا گیا تھا، پھر اسے دیکھا، اور اس کا مزہ چکھا۔

مسلمان بھائی پر مسلمان کے حقوق

ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے حقوق اور فرائض پر یقین رکھتا ہے، وہ اپنے مسلمان بھائی کے حقوق کا احترام اور ان کی ادائیگی کا خود کو پابند سمجھتا ہے، مسلمان کو یقین ہے کہ دوسرے مسلمان بھائی کا احترام اور حقوق کی ادائیگی خدا کی عبادت اور قرب الہی ہے، جو مسلمان کو خدا سے نزدیک کرتا ہے، کیونکہ ان حقوق کو خدانے واجب کیا ہے، اس لیے خدا کا حکم سمجھتے ہوئے ان کا لحاظ کرنا چاہیے، یہ آداب اور حقوق نیچے بیان کے گئے تشریح کے مطابق ہیں:

1- جب کسی مسلمان بھائی سے ملاقات ہو تو سب سے پہلے اسے سلام کرنا چاہیے، اور کہے: "السلام علیکم ورحمة اللہ" اور اس سے مصافحہ

کرے، سلام کا جواب ایسے دینا چاہیے "وعلیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاتہ"

، کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَإِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا"

(النساء: 86) ترجمہ: "اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دو یا انہیں لفظوں میں سے دعا دو۔"

2- جب مسلمان بھائی کو چھینک آئے تو وہ: الحمد للہ کہے، اس کے چھینک کے جواب میں: "یرحمک اللہ" (خدا تجھ پر رحم کرے) کہے،

اور چھینکنے والا اس کے جواب میں کہے: "یہدیکم اللہ ویصلح بالکم"

"(اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارا حال درست کرے)۔"

3- جب مسلمان بیمار ہو جائے تو دوسرا مسلمان بھائی اس کے لیے دعا

کرے، اور اس کی عیادت کرے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے: "مسلمان

کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: (1) سلام کا جواب دینا،

(2) بیمار کی عیادت کرنا، (3) جنازہ میں شرکت کرنا (4) دعوت قبول

کرنا، (5) چھینک کا جواب دینا (متفق علیہ)۔

4- مسلمان کا مسلمان پر یہ حق ہے کہ جب وہ فوت ہو جائے تو نماز جنازہ

اور تکفین و تدفین کے معاملات میں شرکت کرے۔

5- جب بھی کوئی مسلمان بھائی کسی مسلمان بھائی سے کسی مسئلہ میں

مشورہ کرے اور کسی خیرونیکی کی تلاش میں ہو، تو ضروری ہے

کہ اسے نیکی اور خیر کا راستہ بتائے اور اسے مفید رہنمائی فراہم

کرے، یعنی: جس قسم کے مشورے کو وہ شخص اپنے لیے مفید سمجھتا ہے

، وہ مشورہ لینے والے شخص کو بھی دے۔

6 - جو کچھ ایک مسلمان اپنے لیے پسند کرتا ہے اسے دوسرے مسلمان کے لیے بھی پسند کرے، اور ہر وہ چیز جو اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ دوسرے مسلمان کے لیے بھی پسند نہیں کرے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ وَيُكْرَهُ لَهُ مَا يُكْرَهُ لِنَفْسِهِ" ترجمہ: "تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے اور وہ چیز اس کے لیے بھی ناپسند کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے۔"

7 - ایک مسلمان کے لیے پر ضروری ہے کہ دوسرے مسلمان کی ضرورت اور حاجت کے وقت مدد کرے، اور اسے بے یار و مددگار نہ چھوڑے۔

8 - ایک مسلمان کو چاہیے کہ دوسرے مسلمان کو ہراساں نہ کرے، اور کسی مسلمان کے مال، عزت اور ناموس پر حملہ کرنے سے باز رہے، کیونکہ حدیث میں ہے: "كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ" (مسلمان کی تمام چیزیں دوسرے مسلمان پر حرام اور قابل احترام ہیں: مسلمان کا خون، مال اور عزت و آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے) (مسلم)۔

9 - ایک مسلمان کو چاہیے کہ دوسرے مسلمان کے ساتھ عاجزی سے پیش آئے، اور شیخی نہ مارے، کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو اس مباح جگہ سے اٹھائے جس پر وہ پہلے سے بیٹھا ہے، اور اس کی جگہ خود بیٹھ جائے، "وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ" (سورہ لقمان: 18) ترجمہ: "اور (از راہ غرور) لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین میں اکڑ کر نہ چلنا خدا کسی اترانے والے کو پسند نہیں کرتا۔"

10 - کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ مدت تک تعلق منقطع رکھے۔

11 - کسی مسلمان کے بارے میں برائی کی باتیں یا غیبت نہ کی جائے، اور کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی تذلیل نہ کرے، اس کا مذاق نہ اڑائے، اس میں عیب تلاش نہ کرے، کسی کو برے القاب سے یاد نہ کرے، اور چغل خوری نہ کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ۚ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُمُ

بَعْضًا ۝ أَيُّحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۝ (حجرات: 12) ترجمہ:

اے اہل ایمان! بہت بدگمانی کرنے سے احتراز کرو کہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا ڈر رکھو بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے "

اور فرماتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۝ وَلَا تَلْبِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۝

بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۝ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝" (سورہ

حجرات: 11) ترجمہ: "مؤمنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے (مؤمن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام (رکھو) ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا گناہ ہے اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں۔"

12- کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ دوسرے مسلمان بھائی کی بُرائی کرے، چاہے مردہ ہو یا زندہ۔

13- کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان سے حسد، بغض رکھے اور اس پر شک کرے، اور اس کی جاسوسی کرے، کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: آپس میں حسد، بغض اور رنجش نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ مت موڑو، اور ایک دوسرے کے لین دین میں دخل نہ دو، اے اللہ کے بندو بھائی چارے سے رہو (مسلم)۔

14- کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو دھوکہ دے، اور اسے بچھاڑنے کی کوشش کرے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی دوسرے مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اور جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے درپے ہو وہ ہم مسلمانوں کی جماعت میں سے نہیں ہے (مسلم)۔

15- مسلمان اپنے عہد کا وفا دار ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۝" (مائدہ: 1) ترجمہ: "اے ایمان والو! اپنے عہد معاہدے کو پورا کرو۔"

16- ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرے اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

17- ایک مسلمان کو چاہیے کہ دوسرے مسلمان کی لغزشوں سے درگزر کرے، ان کے عیبوں کو چھپائے ان کے راز فاش کرنے کی کوشش نہ کرے، اس لیے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے: "فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَجِبُ الْمَحْسِنِينَ" (المائدہ: 13) ترجمہ: "تو ان کی خطائیں معاف کر دو اور (ان سے) درگزر کرو کہ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

18- ہر مسلمان پر واجب ہے کہ ضرورت پڑنے پر اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے، اس کی ضرورت پورا کرنے میں اس کے ساتھ تعاون کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ" (المائدہ: 2) ترجمہ: "اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔"

19- جب بھی کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی دوسرے مسلمان کے پاس پناہ لے، تو اس کو پناہ دینا چاہیے۔

سورة تکاثر کا پیغام

1- زیادہ دولت کی طلب اور گھمنڈ کی خواہش انسان کو فضول کاموں کی طرف لے جاتی ہے، "أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ"۔

2- زیادہ طلب کرنا قیامت کے حساب سے غفلت کا سبب ہے، (أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ "لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ" ۝۸)۔

3- زیادہ طلب کرنے کی خواہش کا دائرہ مرنے والوں کی گنتی تک جاتا رہے گا "حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ"۔

4- قیامت کے حالات سے ناواقفیت لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے، "أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ"۔

5- منحرف خیالات اور طرز عمل کے خلاف انتباہ کو دھرایا جانا چاہیے، "كَلَّا، ثُمَّ كَلَّا، كَلَّا"۔

6- ایمان اور یقین کے ذریعہ انسان مستقبل کو دیکھ سکتا ہے، "لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ"

الْيَقِينِ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ۔"

7 - جاہلیت کی ثقافت میں مقدار اور تعداد آبادی میں اتنی قیمتی تھی کہ مُردے بھی شمار میں لائے جاتے تھے، "حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔"

8 - زیادہ طلب کرنے، اور فخر کرنے کی سخت سزا ہے (الْهَكْمُ التَّكَاثُرُ... لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ۔"

9 - انجام کے بارے میں سوچنا فخر کرنے میں رکاوٹ ہے، "كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔"

10 - قیامت کے خطرناک حالات سے بچنے کے لیے یقین اور حقائق جاننے کی کوشش کرنی چاہیے "لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ۔"

11 - جو لوگ دنیا میں منہمک رہتے ہیں وہ کبھی یقین کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے "لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ۔"

12 - ایمان اور یقین کے درجات ہیں: "عِلْمَ الْيَقِينِ... عَيْنَ الْيَقِينِ۔"

13 - قیامت کے دن کا حساب ان نعتوں اور سہولتوں کی بنیاد پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو دی ہیں، اس لیے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں "لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔"

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة العصر

سورة عصر مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ، اس کی تین آیتیں ہیں

وجه تسمیہ:

اس سورت کا "العصر" نام کیوں رکھا گیا، تمام مفسرین کا جواب یہ ہے کہ: چونکہ ہمارے پروردگار نے اس کے شروع میں "العصر" کی قسم کھائی ہے ، زمانہ میں بہت سی مختلف اور متضاد شامل ہیں، جیسے: خوشی ، غم ، صحت ، بیماری ، دولت ، فقر، اسی طرح زمانہ، مہینے ، دن ، گھنٹے ، منٹ اور سیکنڈ جیسے حصوں میں زمانہ تقسیم کیا گیا ہے۔

سورة عصر کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة عصر مکی سورتوں میں سے ہے، جس کا ایک (۱) رکوع ، تین (۳) آیتیں ، چودہ (۱۴) الفاظ ، چوبتر (۴۳) حروف اور اکیس (۲۱) نقطے ہیں۔

(سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے تفسیر احمد سورة الطور ملاحظہ کریں)

سورة عصر کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن حصین فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے دو صحابی ایسے تھے کہ جب بھی آپس میں ملتے تو اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے یہاں تک کہ سورة عصر ایک دوسرے پر تلاوت نہ کر لیں ، (رواہ الطبرانی) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ: اگر لوگ صرف اس سورت میں غور و فکر اور تدبیر کریں ، تو ان کے لیے کافی ہے (ابن کثیر)

اس طرح مفسرین لکھتے ہیں کہ: مسلمان ہونے سے پہلے عمرو بن عاص مشرکین قریش کی طرف مسیلمہ کذاب کے پاس گئے ، تو مسیلمہ نے اس سے پوچھا : کہ اس دوراں تمہارے دوست پر کیا وحی نازل ہوئی ہے؟ عمرو بن عاص نے اس کے جواب میں کہا: ان پر ایک مختصر لیکن بہت بلیغ سورت نازل ہوئی ہے، مسیلمہ نے کہا: وہ سورت کیا ہے؟ عمرو بن عاص نے

سورة عصر پڑھی، "وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وَتَوَاصَّوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَّوْا بِالصَّبْرِ ۝۳

مسيلمہ کذاب اس سورت کو سننے کے بعد گہری سوچ میں ڈوب گیا، تھوڑی دیر بعد اپنا سر اٹھایا اور کہا: مجھ پر یہی وحی نازل ہوئی ہے، عمرو بن عاص نے اس سے کہا: کیا تم اسے میرے لیے پڑھ سکتے ہو؟ مسيلمہ کذاب نے پڑھنا شروع کیا: "یاوبر، یاوبر واثما انت ازنان وصدرو سائرک هقرتقر"

اے وبر، اے وبر، اور تم دو کان اور ایک سینہ کے سوا کچھ نہیں ہو، کیونکہ تمہارے دوسرے اعضاء گڑھے اور کھوکھلے ہیں، پھر عمرو کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ عمرو تم نے یہ سورہ جو مجھ پر نازل ہوئی اسے کیسا پایا؟ عمرو نے کہا: خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہیں جھوٹا سمجھتا ہوں، ابن کثیر کہتے ہیں: مسيلمہ کذاب ان فریبوں کے ذریعے قرآن کی مخالفت کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ بت پرستوں کو بھی قائل نہ کر سکا، امام شافعیؒ سورہ عصر کے مقام و مرتبہ کے بارے میں فرماتے ہیں، "اگر تمام لوگ اس سورت میں غورو تدبر کریں تو یہ سورت سب کے لیے کافی ہے۔"

نیز امام شافعیؒ مزید فرماتے ہیں: اگر اس سورت کے علاوہ کوئی دوسری سورت نازل نہ ہوتی تو یقیناً لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتی، کیونکہ اس سورت میں تمام علوم قرآن شامل ہیں۔

سورہ عصر کو دیکھتے ہوئے کہ یہ قرآن عظیم کی بہت مختصر سی سورت ہے، لیکن یہ اس قدر جامع ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اگر لوگ اس سورت کو غور و فکر کے ساتھ اس کے معانی و تشریحات کے ساتھ پڑھیں تو یہ سورت ان کے دین و دنیا کی درستگی کے لیے کافی ہے۔

اس سورت میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ تمام انسان خسارے اور نقصان میں ہیں، اس سورہ میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ انسان اس نقصان سے صرف اس وقت بچ سکتا ہے کہ جب اس میں درج ذیل خصوصیات ہوں، ایمان اور عمل صالح، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنا۔

انسان اور انسانی معاشرہ تباہی و بربادی سے اس وقت بچ سکے گا، جب وہ ایمان کی راہ پر گامزن ہوگا، اس کا ایمان اور یقین اس کے صالح عمل اور اچھی کارکردگی سے ظاہر ہوگا، اور جب وہ حق پر کاربند ہوگا، دوسروں کو بھی حق پر چلنے کی دعوت دے گا، اور ایمان کی صف میں

آگے بڑھنے، اعمال صالح کرنے اور حق کا دفاع کرنے کی مشکلات کو برداشت کرے گا، اور صبر اختیار کرے گا، آدھے راستے کا ساتھی نہ ہو، اور دنیا کے مصالح و منافع اور مراتب کی وجہ سے دائیں بائیں طرف منحرف نہ ہو، اور وہ اپنی جدوجہد کے راستے میں تھکاوٹ محسوس نہ کرتا ہو، اور دوسروں کو اپنے قول و فعل سے صبر کرنے کی دعوت دیتا ہو اور خود بھی صبر و تحمل کا نمونہ بنے۔

سورہ عصر کے پیغامات

1 - انسانی تاریخ کا دور قیمتی ہے اسی لیے خدا نے اس کی قسم کھائی ہے، اس کی عبرتوں سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے: "وَالْعَصْرِ"

2 - انسان ہر طرف سے خسارے میں ہے "لَفِي خُسْرٍ"

3 - جو شخص انبیا کی تربیت کے دائرے میں نہ ہو وہ نقصان میں ہے، "إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ"

4 - نقصان سے بچنے کا واحد طریقہ ایمان اور عمل ہے: "آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ"

5 - صرف اپنے بارے میں سوچنا کافی نہیں ہے، مؤمن دوسروں کی ترقی اور کامیابی کے بارے میں بھی سوچتا ہے، "تواصوا بالحق"

6 - صبر کی تلقین اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ حق کا حکم، "بالحق وبالصبر"

7 - ایمان عمل سے پہلے ہے، اسی طرح خود کی اصلاح معاشرے کی اصلاح پر مقدم ہے، "آمَنُوا وَعَمِلُوا... وتواصوا"

8 - ایمان اور عمل صالح اور دوسروں کو حق اور صبر کی تلقین کے بغیر انسان کا نقصان بہت بڑا ہے، "لفی خسر" "خسر" کا نکرہ ہونا، یعنی اس پر تنوین نقصان کے زیادہ بڑا ہونے کی علامت ہے۔

9 - حق کو قائم کرنے کے لیے استقامت کی ضرورت ہے، "تواصوا بالحق وتواصوا"

بالصبر

10 - معاشرہ کی اصلاح اس وقت ہوتی ہے، جب تمام لوگ نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے منع کرنے میں شریک ہوں، دوسروں کو نصیحت کرتے ہوں اور خود بھی نصیحت قبول کرتے ہوں، "تواصو بلحق" (لفظ "تواصو" تفاعل کے باب سے ہے دو طرف کے لیے ہوتا ہے)۔

11 - نقصان سے نجات اس وقت ممکن ہے جب انسان تمام اچھے کام کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگرچہ وہ ان تمام میں کامیاب نہیں ہوتا، "عملو الصالحات" لفظ "الصالحات" جمع کی صورت میں الف لام کے ساتھ آیا ہے۔

12 - ایمان کو جامع ہونا چاہیے، جزوی نہیں، دین کے تمام حصوں پر ایمان، نہ کہ بعض اجزا پر "الا الذین آمنو" (ایمان کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے تا کہ تمام مقدسات کو شامل ہو)

اس سورت کے عمومی مضامین

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اس سورت کی جامعیت ایسی ہے کہ بعض مفسرین کے نزدیک اس مختصر سی سورت میں قرآن کے تمام علوم اور مقاصد کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، اس کا آغاز "عصر" کے معنی خیز قسم، اور پھر تمام انسانوں کے خسارے میں ہونے کے ذکر سے ہوتا ہے، جو ان کی تدریجی زندگی کی طبعیت میں شامل ہے، اس کے بعد صرف ایک گروہ کو اس عمومی اصول سے الگ اور خارج کردیتی ہے، جو ان چار نکات کا حامل گروہ: "(۱) ایمان، (۲) عمل صالح، (۳) ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے ہیں، (۴) اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں" یہ چاروں اصول حقیقت میں اسلام کے عقیدہ، عمل، انفرادی اور اجتماعی پہلو پر مشتمل ہیں۔

"ایمان" محض ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ایک جامع اور مکمل تشریح اور تفصیل ہے، ایمان ایک ایسا یقین ہے جو انسان کی زندگی کو سمت دیتا ہے، اور یہ کہ وہ کیسی زندگی گزارتا ہے اس میں ایمان اہم کردار ادا کرتا ہے، اور یہ لوگوں کے خیالات اور اعمال کی قدر کرنے کا محور ہے۔ قرآن کریم میں جب بھی اللہ تعالیٰ "ایمان" کا ذکر کرتا ہے، تو اس کے بعد "عمل" کا بھی ذکر کرتا

ہے، تاکہ یہ بات لوگوں کے مد نظر رہے کہ عمل میں ایمان کے مظہر کی نشاندہی ہو۔

لہذا زبانی یا عقیدہ پر ایمان اس وقت تک ایمان نہیں ہے، جب تک ہم جس پر یقین رکھتے ہیں اس کے لوازم کے پابند نہ ہوں، اور اس کے اثرات کو قبول نہ کریں، فوائد کو سمجھنے کے نتیجے میں ایمان اس وقت مفید ہو تا ہے، جب انسان جو کچھ بولتا ہے اس پر دل سے بھی رکھتا ہو، اور اس چیز پر کہ جس کا ہمارے رب نے حکم دیا ہے عمل کرے، اسی لیے نہ تو صرف زبانی ایمان کافی ہے، نہ صرف دل کا یقین، بلکہ ایمان کے ثمرات عمل میں نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر ایمان انسانی جسمانی صحت کو بھی بہتر بنا تا ہے، اور یہ انسان کے قلبی ضروریات میں سے بھی ایک ہے، اللہ پر ایمان انسان کے دماغ اور روح پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان کو ذہنی سکون فراہم کرتا ہے، انسانی زندگی ہمیشہ مسائل، اتار چڑھاؤ اور رکاوٹوں سے بھری رہتی ہے، روحانی سکون کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر یقین اور بھروسہ رکھتا ہے وہ زندگی کی تمام مشکلات کا سامنا آسانی سے کر سکتا ہے، وہ ذہنی مسائل کو مکمل طور پر خود سے دور کر سکتا ہے، اور زندگی کے اتار چڑھاؤ میں زیادہ مضبوطی سے چل سکتا ہے، اس وجہ سے، اگر آپ نے غور کیا ہو تو، وہ لوگ جو دماغی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں عام طور پر وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایمان کے کمزور اور بے عمل ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ "آیت ۶۲" میں اللہ پر ایمان لانے والوں کے سکون کے بارے میں فرماتا ہے: "مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ... وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" ترجمہ: جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا.... ان پر نہ خوف ہوگا نہ غمگین ہوں گے)

1- جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کو لا متناہی طاقت کا مالک اور اپنا دوست اور مددگار سمجھتے ہیں، جیسا کہ ہمارے رب نے سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۷ میں وعدہ فرمایا ہے: "اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا ۖ يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" (اللہ تعالیٰ مؤمنوں کا مددگار ہے انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔

2- جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اللہ پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں جیسا

کہ اللہ تعالیٰ (سورہ طلاق کی آیت: ۳ میں فرماتے ہیں، "وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ" (جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہے)

3 - جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے معاملات اور اپنے اعمال اور اپنے کام کا نتیجہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں، اور اگر وہ کام مطلوبہ نتیجہ تک نہیں پہنچتا تو انہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ان کا دوست اور مددگار ہے، اس کام کو ان کے لیے خیر نہیں سمجھتا، اس لیے وہ پھر بھی مطمئن رہتے ہیں کہ اگرچہ ان کا عمل اور کام نتیجہ خیز نہیں ہوا، لیکن کوئی نقصان بھی ان کو نہیں پہنچا، شاید کہ اللہ اس معاملے کو اس کے فائدے میں نہیں سمجھتا تھا۔

4 - جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ خدا کے فیصلوں پر مطمئن رہتے ہیں۔

5 - جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اللہ کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔

6 - خدا پر ایمان کے اثراتے میں سے ایک تخلیق اور وجود کی دنیا کے بارے میں رجائیت ہے یعنی دنیا میں ہمیشہ پر امید رہنا، ایمان دنیا کے بارے میں انسان کے تصور کو اس طرح ایک خاص مثبت شکل دیتا ہے کہ دنیا کی تخلیق با مقصد ہے اور مقصد نیکی اور ارتقاء اور خوشبختی کی طرف لیجاتا ہے۔

7 - ایمان والا شخص پر امید ہونے کی وجہ سے صاف دل کی روشنی میں اپنی کوششوں کے مطلوبہ نتائج کی امید رکھتا ہے۔

8 - ایمان والے شخص کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے دنیا اس کی کوششوں سے لاتعلق نہیں ہے، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا ان لوگوں کی حامی اور موید ہوتی ہے جو سچائی، راستی، انصاف اور احسان کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں: "إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ" (سورہ محمد: ۷) ترجمہ: اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ "إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ" (سورہ توبہ: ۱۲۰) ترجمہ: "نیک لوگوں کا اجر اللہ کبھی ضائع نہیں کرتا" ایمان والا شخص خدا کی مدد اور زندگی کے بحرانوں میں امید رکھتا ہے، اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ خدا کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتا ہے، اور خدا سے یہ امید اضطراب کو ختم کرتی ہے۔

خدا پر ایمان کا ایک اور بابرکت اثر اپنے کام میں بامقصد ہونا ہے، کیونکہ مؤمن جانتا ہے کہ اس کی ذات خود بخود وجود میں نہیں آئی ہے، بلکہ حکمت والا خدا اسے دنیا میں لایا ہے، اور اسے ایک بہت بڑے مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، جو کہ خدا کی عبادت اور بندگی اور زمین پر خدا کا جانشین ہونا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اسے اپنے اعمال اور الفاظ کے لیے جوابدہ ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے، اس سے پہلے کہ یوم حساب آئے، اور وہ جانتا ہے کہ اسے جینے کے لیے کام کرنا ہے نہ کہ کام کرنے کے لیے جینا ہے، چونکہ حساب و کتاب آنے والا ہے اور ایک دن عقلمند اور بے وقوف بڑے، چھوٹے سے پوچھا جائے گا، اس لیے اسے چاہیے کہ زندگی کے تمام مراحل میں محتاط اور چوکنا رہے، اور کوئی ایسا کام نہ کرے کہ کل رب کے سامنے پیشی پر شرمندہ ہو۔

جس شخص کا دل اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہو، اس کو ڈر اور خوف نہیں ہوگا، کیونکہ وہ دنیا کی ہر چیز کا معاملہ ایمانداری سے کرتا ہے، اس لیے اسے کس چیز کا ڈر ہوگا؟ ایک مؤمن ہمیشہ اپنے آپ کو معزز اور باوقار سمجھتا ہے، کیونکہ وہ اس بستی سے جڑا ہے جس کے تابع سارا جہاں ہے۔ قرآن کی آیات میں "عزت" کا لفظ مؤمن کے لیے استعمال ہوا ہے، وقار اور عزت روح کی ایک ایسی حالت ہے جس کی وجہ سے وہ روح خود کو برتر سمجھتی ہے، ڈرتا وہ ہے؟ جو خود کو شکست خوردہ سمجھتا ہے، جب وہ روح کی قوتوں سے شکست کھا جاتا ہے جو اندرونی دشمن ہیں، تو پھر بیرونی دشمنوں سے بھی ڈرتا ہے۔

وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے، وہ وقت کا پابند ہوتا ہے، اور اپنی زندگی میں اعلیٰ نظم و ضبط رکھتا ہے، وہ اپنے وقت کو بہتر طریقے سے خدا کی عبادت میں استعمال کرتا ہے، اور زندگی کے لمحات کو زیادہ فائدہ اٹھانے اور اعمال صالحہ کے انجام دینے میں تیزی لانے کے لیے استعمال کرتا ہے، اس لیے وہ اپنی زندگی کو منظم کرنے میں بہت مستعد رہتا ہے، وہ اپنے عظیم مقاصد کے حصول کے راستے میں کوئی لمحہ اور موقع نہیں چھوڑتا، اور وہ اپنے اوقات کی منصوبہ بندی پر توجہ دیتا ہے۔

جو شخص خالص خدا پر یقین رکھتا ہے وہ اس دنیا کو ہی سب کچھ نہیں سمجھتا، بلکہ اس دنیا کے علاوہ وہ آخرت پر بھی یقین رکھتا ہے، اور اس کے مطابق اپنے تمام اعمال اور طرز عمل کو ترتیب دیتا ہے، اللہ پر یقین انسان میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے، اور کڑواہٹ کو میٹھا بنا تا ہے۔

جو اللہ پر یقین رکھتا ہے، وہ خدا کی خاطر اور نافرمانی اور گناہ کے سنگین نتائج کے خوف سے احتیاط سے کام لیتا ہے، اور کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس سے خدا اور خدا کے بندے ناراض ہوں، اور جو کچھ وہ کرتا ہے وہ خدا کے لیے ہوتا ہے، اور جو کچھ وہ نہیں کرتا وہ بھی خدا کے لیے ہوتا ہے اور وہ خدا اور رسول کے دین اور حکم سے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ لیتا ہے۔

سورہ "عصر" کی تفسیر کا خلاصہ

عام طور پر سورہ عصر کی تفسیر کا خلاصہ یوں بیان کیا جاتا ہے: مجھے قسم ہے اس زمانے کی جس میں نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کہ انسان اپنی زندگی ضائع کرنے کی وجہ سے بڑے نقصان میں مبتلا ہوتا ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیکیاں کرتے رہے، یہ ان کی ذات کی تکمیل ہے اور ایک دوسرے کو اعمال کی پابندی اور صبر کرنے کی تلقین کی، یہ دوسروں کی تکمیل ہے، اس لیے کہ جو لوگ یہ کمال خود حاصل کرتے ہیں اور پھر دوسروں کو بھی مکمل کرتے ہیں، ایسے لوگ نقصان میں واقع نہیں ہوتے، بلکہ فائدے میں ہیں۔

محترم قارئین: سورت میں جس بنیادی، عملی اور معجزہ نما نکتہ پر بحث کی گئی ہے، اور وہ نکتہ کہ ہر مؤمن مسلمان کو اس پہ گہری نظر رکھنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ انسان کو خسارے اور نقصان سے بچانے والی چار صفات ہیں: "ایمان، نیک عمل، حق کی نصیحت اور صبر کی وصیت"۔

یہ سورت ہم انسانوں کو سکھاتی ہے کہ ایک شخص سچی اور حقیقی نجات تب حاصل کر سکتا ہے جب وہ راست بازی کے یہ چار عناصر خود جمع کر لے، ہر مسلمان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ ان میں سے کسی ایک چیز کو کسی بھی وجہ یا دنیاوی مصلحت کی وجہ سے نظر انداز کرے اور اسے غیر اہم سمجھے، یا ان میں سے کسی ایک کی اپنی جگہ پر درست طور پر لحاظ نہ رکھے تو اس کی نجات کی کشتی بھنور میں پھنس جائے گی کر پار نہیں سکے گی، مطلوبہ ساحل (ہمیشہ کی سعادت) تک پہنچنے سے محروم رہے گا، اور دنیاو آخرت کا نقصان اٹھائے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة العصر

وَالْعَصْرِ ۝١ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝٢ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝٣ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٤ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝٥ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٦

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَالْعَصْرِ ۝١	زمانے کی قسم!
إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝٢	انسان در حقیقت بڑے خسارے میں ہے
إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝٣ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٤ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝٥ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٦	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے

سورت کی تفسیر

وَالْعَصْرِ	زمانے کی قسم!

زمانہ جو کہ انسانی زندگی کا سرمایہ، اور دو جہانوں کی سعادت کے حصول کے لیے کوششوں کا موقع ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں "العصر" زمانہ، وقت، اس سے مراد انسانیت کی تاریخ ہے جو انسانی زندگی کا سرمایہ ہے، اور بے مقصد قسم کی زندگی گزارنے سے انسان نقصان اٹھاتا ہے۔

لفظ "العصر" کے متعدد تراجم اور تشریحات کی گئی ہیں، بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ اور تفسیر عصر کے وقت سے کی ہے، بعض مفسرین نے العصر کو

زمانے سے تعبیر کیا ہے، خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے دور سے، اور اس طرح مفسرین نے اس لفظ کی مختلف تفاسیر اور تشریحات اور وضاحتیں کی، اگر ان مفسرین میں سے ہر ایک کے دلائل اور تشریحات کا تجزیہ اور جائزہ لیا جائے تو ان میں سے کسی نے بھی عصر کو مخصوص وقت اور مدت کے لیے مختص کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی، کہ کس تاویل سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ "عصر کے وقت" سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان خسارے اور نقصان میں ہے۔

لفظ "العصر" عام ہے، جسے خاص نہیں کرنا چاہیے، قسم اور اس کے جواب کا تعلق تب ہی دیکھا جاسکتا ہے جب ہم صیغے کو اپنے "عمومی" حال پر رکھیں، اسی طرح ہم اس سے کوئی بھی زمانہ اور زمانے کے نشیب و فراز کا معنی لے سکتے ہیں، زمانہ اس کے اور یہ مختلف نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ گواہی دیتے ہیں کہ انسان کو اپنی بے ایمانی، برے عمل اور نامناسب کردار اور حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین نہ کرنے کی وجہ سے نقصان اور خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے، "زمانے کی قسم" خدا تعالیٰ اس بنا پر زمانے کی قسم کھاتا ہے کہ زمانہ شب و روز کے گزرنے کا وقت، تاریکی اور روشنی کے پے در پے آنا، واقعات کی روشنی اور ظرف، زندگی کی مستقل مزاجی اور لوگوں کے مصالح اور منافع کی اپنی آغوش میں پرورش کرتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ چیزیں صانع عزوجل کے وجود کی واضح دلیل ہیں، لہذا اللہ تعالیٰ کا زمانے کی قسم کھانا زمانے کی عظمت اور اہمیت کی دلیل ہے، اسی لیے حدیث شریف میں ہے: "لاتسبو الدهر، فإن الله هو الدهر" زمانے کو گالی مت دو، کیونکہ خدا عزوجل خود زمانہ (کا خالق) ہے، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین نے العصر کی تفسیر: "صلاة وسطی" یعنی نماز عصر کے کئے ہیں، اس قسم کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو زندگی گزر چکی ہے اس کے مقابلے میں دنیا کی باقی ماندہ زندگی عصر اور مغرب کی نماز کے درمیانی وقت کی طرح ہے۔

اس لیے انسان کے لیے بے ضرر کاروبار میں مشغول ہونا ضروری ہے، کیونکہ آخری وقت قریب ہے، اور نقصانات کی تلافی ممکن نہیں، جبکہ "ابن کثیر" عالم اسلام کے مشہور مفسر نے پہلے مفہوم کو ترجیح دی ہے۔

انسان در حقیقت بڑے خسارے میں ہے

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِفِي خُسْرٍ ۝۲

"الْإِنْسَانَ" اس سے مراد مکلف انسان ہے "خُسْرٍ" نقصان اور ضرر، حقیقت یہ

ہے کہ : جو لوگ اپنی قیمتی عمر میں شیطان سے سودے بازی کرتے ہیں ،
ان کا نقصان ہوگا۔

(رجوع کریں : نمل/ 5، اعراف/ 178، شوری/ 45) اور جو لوگ اللہ سے
تجارت کرتے ہیں، وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں : صف : ۱۰-۱۳)

پچھلی آیت کی قسم کا جواب یہ ہے کہ : یقیناً انسان خسارے میں ہے "خسر
اور خسران" کاروباری نقصان، سرمایہ کا نقصان ، یعنی : ہر وہ شخص جو
تجارت ، کاروبار اور مادی محنت میں لگا ہوا ہے، اور اپنی زندگی دنیاوی
امور میں صرف کرتا ہے، تو ایسا آدمی حق کے نقصان اور گمراہی کی تباہی
کا شکار ہے، اس حکم سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے، سوائے ان لوگوں کے
جنہیں درج ذیل آیت میں مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے :

سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے	إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

"تَوَاصَوْا" ایک دوسرے کو نصیحت کی، "الْحَقِّ" حق اور سچ ۔

"الصَّبْرِ" صبر، ذکر خاص بعد از عام ہے، (مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور
نیک عمل کیے) یعنی : وہ مرد اور عورتیں جو اللہ پر ایمان اور عمل صالح
کو باہم جمع رکھتے ہیں نفع میں ہیں، نقصان میں نہیں ہیں، کیونکہ دنیاوی،
معاملات نے انہیں نیک اعمال سے غافل نہیں کیا، بلکہ اپنی آخرت کے لیے
عمل کرتے رہے، وہ لوگ جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے
رہے، وہی حق ہے جس کے لیے کھڑا ہونا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ: اللہ
تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر ایمان لانا اور ان تمام چیزوں کو بجا لانا
جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، اور ان تمام چیزوں سے بچنا جنہیں
اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، (سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ایک
دوسرے کو صبر کی تاکید کی ہے)، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز رہنے
میں صبر، اس کے فرائض کی ادائیگی میں صبر اور اس کے تکلیف دہ احکام
پر صبر۔

لہذا صبر ان اچھی صفات میں سے ہے جس کی مؤمنوں کو ایک دوسرے کو نصیحت کرنی چاہیے، چونکہ صبر دوسری خوبیوں سے زیادہ اہم ہے اس کا درجہ بھی ان سے بلند ہے، نیز، چونکہ حق کے لیے کھڑے ہونے والوں میں سے بہت سے لوگوں پر ظلم و ستم کیا جاتا ہے جس کا مقابلہ صبر سے ہی کیا جاسکتا ہے، چنانچہ صبر کی ضرورت، اہل ایمان کی واضح ضروریات میں سے ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں؛ "آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ حق ایک بھاری کام ہے کہ اس کے ساتھ مصائب و مشکلات وابستہ ہیں۔ اس لیے ہمارے رب نے اسے ایک دوسرے کو نصیحت کے ساتھ اور نصیحت کو صبر کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔"

عمل صالح کا قرآنی تصور

عمل صالح کا مطلب وہ کام ہے جو صحیح اور اچھا ہو، اسی طرح جہاں دو لوگوں میں اختلاف ہو تو اس اختلاف کو دور کرنا، اور دشمنی کو ختم کروانا یہ بھی عمل صالح ہے اس کے علاوہ نیک عمل سے مراد کوئی بھی صحیح اور نیک عمل ہو، جس کی بہت سی مثالیں ہیں قرآن کریم میں۔

اگر ہم اسلام کو دو اہم اور بنیادی اجزا میں بیان کرنا اور منحصر کرنا چاہیں تو ان میں سے ایک عمل صالح ہو گا، اس لیے کہ اسلام ایمان دو اہم اجزا حق اور عمل صالح پر قائم ہے۔

مسلمان اور مؤمن وہ شخص ہے جو اپنے دل میں حق پر ایمان اور یقین رکھتا ہے اور اچھے اعمال انجام دیتا ہے، لہذا توحید پرستی اور عمل صالح کو انسانیت کی پرواز کے دوبازو سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم ایمان کے ساتھ عمل صالح کو بھی اونچا مقام دلانے والے کے طور پر ذکر کرتا ہے۔ (سورہ فاطر ۱۰)

نجات پانے والے اور فلاح پانے والے صرف وہی ہیں جو ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں، وہ لوگ نہیں جو اصل سرمایہ میں نقصان کیے ہوئے ہیں، اور وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہیں۔ (سورہ عصر کی آیت: ۲ اور ۳)۔

سوال یہ ہے کہ قرآن نے کن امور مثالوں کو اعمال صالحہ قرار دیا ہے، اور ان کی طرف توجہ دینے اور اہتمام کرنے کا کہا ہے؟ قرآن کریم میں اعمال صالحہ کی بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

سورہ توبہ آیت: "۱۲۰ اور ۱۲۱" کلی اور جزی طور پر عمل صالح کی انجام دہی میں انہیں خدا کی راہ میں تکلیف پہنچتی ہے پیاس کی محنت کی یا بھوک کی یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں کہ کافروں کو غصہ آئے یا دشمنوں سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہر بات پر ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے کچھ شک نہیں کہ اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا، اور اسی طرح جو وہ خرچ کرتے ہیں کم یا زیادہ یا کوئی میدان طے کرتے ہیں تو یہ سب ان کے لیے (اعمال صالحہ) میں لکھ لیا جاتا ہے تاکہ خدا ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دے۔

ان آیات میں متعدد صورتیں بیان کی گئی ہیں جو عمل صالح کی عمومی اور جزوی مثالیں ہیں، ان سب میں وہ کونسی بنیادی اور کلیدی شرط ہے، کہ اللہ کی راہ میں ہونا نیکی اور عمل صالح ہے؟

اگر انفاق، سخاوت تھوڑی یا بہت ہو جائے، یا سختی اور مصیبتیں برداشت کی جائیں، اور دوسرے نیک کام انجام دیے، کہ جن میں مثبت ارادہ نہ ہو تو اس طرح کے نیک کام اس بندے کے اس شخص جیسے ہیں کہ جو ایک پر کے ساتھ اڑنا چاہتا ہے، کہ ایسا کام ناممکن اور نہ ہونے والا ہے۔

عمل صالح کے بغیر ایمان بھی انسان کے لیے کار آمد نہیں ہوتا، قرآن کریم کی آیات میں ہر جگہ دونوں کی شرطیت کی طرف اشارہ ہوا ہے، جب بھی دوزخ کی آگ سے نجات اور فلاح کی بات ہوگی تو ایمان کے ساتھ عمل صالح کی طرف اشارہ ہوگا، "۷۰" سے زائد آیات میں اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ان دونوں (ایمان اور عمل صالح) کے حصول کے بغیر نجات کا تصور نہیں ہوگا، اس کے علاوہ یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ سچے مؤمن وہ ہیں جو نہ صرف خود ایسے ہوں، بلکہ دوسروں کو بھی ایمان اور عمل صالح کی طرف بلائیں، درحقیقت اس آیت میں اسلام کے معاشرتی پہلو پر زور دیا گیا ہے، ایک لحاظ سے اسلام ایک ایسا دین ہے جو نہ صرف فرد کی نجات کا خیال رکھتا ہے، بلکہ معاشرے کی نجات بھی اس کے اہم ترین مقاصد اور اہداف میں سے ایک ہے، اسی لیے قرآن میں نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا اعمال صالحہ میں شمار کیا گیا ہے۔

قرآن کا یہ طریقہ بتاتا ہے کہ اسلام نہ صرف افراد بلکہ انسانی معاشروں کو بچانے کا سوچتا ہے، فرد کی آزادی اور نجات ضروری ہے، لیکن یہ مقصد ایک صالح معاشرہ اور صالح قوم فراہم کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اگر کوئی شخص اپنا خیال رکھتا ہے اور معاشرے پر توجہ نہیں دیتا تو وہ

یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ مستقبل میں کسی مشکل میں نہیں پڑے گا، فرد کی آزادی، خاص طور پر آج کے دور میں، معاشرے کی نجات اور آزادی پر منحصر ہے۔

خسران میں جنات بھی شامل ہیں

سورہ "عصر" میں اور اسی طرح احادیث نبویؐ کی ایک کثیر تعداد میں، بنی آدم خصوصاً مردوں کو مخاطب کیا گیا ہے؛ کہ انسان سراسر خسارے میں ہے، جبکہ مذکورہ روایات میں عورتوں اور جنوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

لیکن یاد رہے کہ: نقصان کے بارے میں رب کا خطاب، جو سورۃ العصر میں ہے، اس خسران میں مرد اور عورتیں، یہاں تک کہ جنات بھی شامل ہوں گے، کیونکہ دین اسلام ایک ایسا دین ہے جو مردوں، عورتوں اور جنوں تمام مکلفین کے لئے نازل کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "النساء شقائق الرجال" (رواہ احمد) معنی یہ ہے کہ عورتیں دین کے معاملات میں مردوں کی طرح ہیں، سوائے ان مسائل کے جن میں اسلام نے مرد اور عورتوں کے لئے فرق رکھا ہے، اور ان کا الگ الگ تعین کیا ہے، جیسے کہ گواہی اور وراثت کے مسائل وغیرہ، قرآنی آیات میں کچھ صفات ایسی بھی ہیں کہ ان میں مؤمن اور کافر دونوں شامل ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُون" ترجمہ: "پس جنات بھی انسانوں کی طرح عبادت کے مکلف ہیں"

سورہ عصر کی یہ آیت عموم کا معنی دیتی ہے، یعنی جن اور انسان دونوں بربادی اور نقصان میں ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کرتے رہے۔

جنت کا راستہ

جنت تک پہنچنے کے لیے ایک مسلمان مؤمن کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، شرعی حکم یہ ہے کہ خواہشات نفس کی مخالفت سے جنت کا راستہ حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے لیے مضبوط ارادہ اور فیصلہ کی ضرورت ہے۔

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حجبت النار بالشہوات، وحجبت الجنة بالہکارة" (جامع الاصول: (521/10) نمبر 8069).

ترجمہ: جہنم کو خواہشات سے اور جنت کو پسندیدہ چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔"

سنن نسائی اور ترمذی میں بھی ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اَذْهَبْ فَانْظُرْ إِلَيْهَا فَذْهَبْ فَانْظُرْ إِلَيْهَا ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ أَيْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا أَحَدٌ إِلَّا دَخَلَهَا ثُمَّ حَفَّهَا بِالْمَكَارِهِ ثُمَّ قَالَ يَا جَبْرِيلُ اذْهَبْ فَانْظُرْ إِلَيْهَا فَذْهَبْ فَانْظُرْ إِلَيْهَا ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ أَيْ رَبِّ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيتُ أَنْ لَا يَدْخُلَهَا أَحَدٌ" (جامع الاصول: (520/10) نمبر 8068)۔"

(جاؤ جنت میں دیکھو جو کچھ میں نے مؤمنوں کے لیے تیار کیا ہے، جبرائیلؑ گئے جنت اور اس کی تمام سہولیات کو دیکھا اور پھر واپس آکر کہا: اے رب مجھے تیری عظمت و بزرگی کی قسم، جو ان نعمتوں کے بارے میں سنے گا، وہ اس میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو جائے گا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جنت کو مصیبتوں سے گھیر لیا جائے، اور جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ جا کر دیکھو کہ میں نے جنتی لوگوں کے لیے کیا تیار کیا ہے، جبرائیلؑ گئے اور واپس آکر کہا: اے رب! مجھے تیری عظمت اور بزرگی کی قسم! مجھے ڈر ہے کہ کوئی اس میں داخل نہیں ہوگا۔

امام نووی نے شرح مسلم میں پہلی حدیث کی تشریح اس طرح کی ہے: یہ تمثیل بہت خوبصورت ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کی فصاحت و بلاغت کو ظاہر کرتی ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اس وقت تک جنت میں نہیں جائے گا جب تک کہ وہ کام نہ کرے جو اس کی طبعیت کے مطابق مشکل اور ناخوشگوار ہیں، اور جب تک وہ نا جائز لذتوں کو قربان نہ کرے، جہنم سے نہیں بچ سکے گا، ہاں! جنت اور جہنم خواہشات اور ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھکے ہوئے ہیں، جو پردوں اور رکاوٹوں سے گزرے گا وہ محبوب تک پہنچے گا، جنت کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کا مطلب ہے مشکلات کا سامنا کرنا، جہنم کی رکاوٹوں کو دور کرنے کا مطلب ہے لذتوں سے اجتناب کرنا۔

مکارہ اور مشکلات سے مراد کیا ہے؟:

عبادت میں کوشش کرنا، اور اس پر مکمل توجہ دینا، دین کی راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر و استقامت، نیکی کا حکم دینا برائی سے روکنا، حق کی تلقین کرنا، اور اللہ کی طرف بلانا، اور اس کی راہ میں جہاد کرنا، غصے کو دفع کرنا، عفو و درگزر سے کام لینا اور صدقہ دینا، اس شخص کے ساتھ نیکی کرنا

جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے، اور خواہشات کے مقابلے میں صبر کرنا وغیرہ۔ (شرح نووی علی مسلم: 165/ 17)

مدعیان نبوت

محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد کتنے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا؟ صحیح تعداد تو دستیاب نہیں ہے، لیکن صحیح احادیث نبوی ﷺ میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُبْعَثَ دَجَالُونَ كَذَّابُونَ قَرِيبًا مِنْ ثَلَاثِينَ كُلُّهُمْ يُرْعَمُ أَنَّهُ رَسُولُ اللَّهِ" (بخاری: ۳۶۰۹)، (قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تقریباً تیس جھوٹے دجال ظاہر نہ ہوں، جو سب کے سب نبی ہونے کا دعویٰ کریں گے) سنن ابی داود اور ترمذی میں، ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وَإِنَّهُ سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي كَذَّابُونَ ثَلَاثُونَ كُلُّهُمْ يُرْعَمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي" (سنن ابی داود: ۴۲۵۲)

ترجمہ: "میری امت میں عنقریب تیس جھوٹے (دعویدار) نکلیں گے، ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"

پہلا شخص جس نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا وہ مسیلمہ کذاب تھا جسے بعد میں مسلمانوں نے قتل کر دیا۔

صدر اسلام میں جھوٹے دعویدار ان نبوت

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، بعض اشخاص اکٹھے ہوئے اور خود کو نبوت کے دعویدار قرار دیا، ان میں سے چند لوگ اپنے لئے پیروکار تلاش نہ کر سکے، مشہور و معروف اشخاص میں سے: مسیلمہ بن ثمامہ کا ذکر کر سکتے ہیں جو اپنے پروپیگنڈے میں خود کو نبوت میں رسول اللہ ﷺ کا شریک مانتا تھا، اور عیسیٰ اور طلحہ بن خویلد وغیرہ، ان میں سے ہر ایک اپنے علاقے میں نبوت کا دعویٰ کرنے لگاتھا۔

مسیلمہ بن ثمامہ

مسیلمہ بن ثمامہ جو کہ ابا ثمامہ کے کنیت سے بھی مشہور تھا، (۱) ایک دن اپنے کچھ پیروکاروں کے ساتھ نبی ﷺ کے پاس گئے اور پیارے نبی کریم ﷺ سے کہا:

(۲) اگر اس طرح منصوبہ بنا لو کہ آپ کے بعد تمام کام میرے سپرد ہوجائیں (یعنی میں آپ کا جانشین بن جاؤں) تو آپ کی پیروی کر لوں گا، پیغمبر ﷺ نے اس کی طرف رخ مبارک کر دیا آپ ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی، فرمایا: اگر مجھ سے جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے مانگو تو میں یہ بھی نہیں دوں گا، اپنے کام میں اس چیز سے دشمنی نہ کرو، جسے خدا نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے، اگر تم منہ موڑ لو تو اللہ تعالیٰ تمہاری نسل ختم کرے گا، اور میں تجھے ویسا ہی دیکھتا ہوں جیسا خواب میں دیکھا تھا۔

وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس بحث و مباحثہ کے بعد اپنے قبیلے کی طرف گیا اور قبیلے والوں کے پاس پہنچنے کے بعد نبوت کا دعویٰ کر دیا، اور کہا کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ اس کی نبوت میں شریک ہوں۔

(۴) یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نے پیغمبر السلام کی نبوت کا انکار نہیں کیا، بلکہ ان کی طرح اپنے آپ کو پیغمبر سمجھتا تھا، اور کہتا تھا: "کہ میں اور محمد دونوں نبوت کے کام میں شریک ہیں" سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ: کچھ مدت گزرنے کے بعد مسیلّم اس قابل ہو گیا کہ چند آدمیوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لے، اس نے پیغمبر ﷺ کو مندرجہ ذیل مضمون کا ایک خط لکھا: "مسیلّم خدا کے پیغمبر کی طرف سے محمد خدا کے پیغمبر کی طرف، آپ پر سلام ہو یہ کہ میں (نبوت کے معاملے میں) آپ کا شریک ہوں، اور آدھی زمین ہماری اور آدھی قریش کی ہے، لیکن قریش تجاوز کر رہے ہیں" جب یہ خط رسول اللہ ﷺ کو پہنچا تو آپ ﷺ نے ان کا خط پڑھ کر درج ذیل عنوان کے ساتھ جواب بھیجا: "محمد خدا کے نبی سے مسیلّم جھوٹے کی طرف، سلام ہو اس پر جو نجات کا راستہ اختیار کرتا ہے، اما بعد زمین خدا کی ہے، جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور آخر انجام متقیوں کا ہے" (۵) (۴/۶)۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ "حبیب بن زہد" نامی ایک شخص کو مسیلّم کی طرف بھیجا، مسیلّم نے رسول خدا کے قاصد سے کہا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں؟ حبیب نے کہا: جی ہاں، مسیلّم نے پوچھا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں؟ حبیب نے کہا: میں گونگا بہرا ہوں، ان الفاظ کا کئی بار تبادلہ ہوا، یہاں تک کہ مسیلّم نے ایک ایک کر کے اس کے اعضاء کاٹے اور وہ شہید ہو گئے (۶/۷)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ مسیلّم کذاب نے رسول اللہ ﷺ کے دو اصحاب کو پکڑ لیا، اور ان میں سے ایک سے کہا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا ہاں، اور پھر پوچھا: کیا تم میری رسالت کی گواہی

دیتے ہو؟ اس نے کہا ہاں! اس کو چھوڑ دیا، پھر اس نے دوسرے کو طلب کیا اور پوچھا: کیا تم محمد ﷺ کے رسالت کی گواہی دیتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! کہا تم میری رسالت کی گواہی دیتے ہو؟ -

اس نے جواب دیا: کہ میں گونگا بہرا ہوں،.. اور وہ شہید ہو گیا: مسیلمہ کذاب رسول اللہ ﷺ کے احکامات کے بعد دعویٰ کر دیا کہ پیغمبر اسلام کی غیر موجودگی میں صرف وہی موجودہ پیغمبر ہے، لہذا لوگوں کو چاہیے کہ میری اطاعت اور مدد کریں (۷)۔

با الاخر، جب خلیفہ اول نے مسیلمہ کا خطرہ سنگین دیکھا تو اس کے خلاف لڑنے کے لیے کئی لشکر جمع کیے اور ان کے درمیان کئی چھوٹی بڑی جنگیں ہوئی، آخر کار خالد بن ولید کی کمان میں ایک سخت جنگ میں مسیلمہ مارا گیا، (۹)

حوالہ جات:

- 1 - زر کلی، خیر الدین، الأعلام (قاموس تراجم لأشهر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین)، جلد 7، صفحہ 226، دار العلم للبلايين، بیروت، طبع هشتم، 1989م.
- 2 - بعض اقتسابات میں یہ ذکر ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس نہیں گیا تھا، دوسروں نے اس سے نقل کیا، تو پیغمبر نے جواب دیا، (الاعم)، ج: ۷، ص: ۲۲۶)
- 3 - بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، محقق: الناصر، محمد زہیر بن ناصر، ج 4، ص 203، دار طوق النجاة، طبع اول، 1422ق.
- 4 - مقریزی، تقی الدین، إمتاع الأسماع بما للنبي من الأحوال والأموال والحفدة والمتاع، ج 14، ص 229، دار الكتب العلمية، بیروت، چاپ اول، 1420ق.
- 5 - اعراف، 128: "إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ"
- 6 - طبری، محمد بن جریر، تاریخ الأمم و الملوك، تحقیق: محمد أبو الفضل ابراہیم، ج 3، ص 146، دار التراث، بیروت، طبع دوم، 1387ق.
- 7 - عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، تحقیق: بجاوی، علی محمد، ج 1، ص 320، دار الجیل، بیروت، چاپ اول، 1412ق؛ ابن اثیر جزری، عز الدین أبو الحسن، أسد

الغابة في معرفة الصحابة، جلد 1، صفحه 443، دار الفكر، بيروت، 1409ق.

8 - البداية والنهاية، جلد 6، صفحه 341.

9 - ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد، تاريخ ابن خلدون (ديوان المبتدأ والخبر في تاريخ العرب و
البربر ومن عاصرهم من ذوى الشأن الأكبر)، تحقيق: خليل شحادة، ج 2، ص 502، دار الفكر،
بيروت، طبع دوم، 1408ق.

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30) سورة الهمزة

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی، اس کی "9" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کا نام "ہمزہ" ہے، کیونکہ اللہ عزوجل نے اس کا آغاز آیت :
"وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ" سے کیا ہے، یہ سورہ بعد از سورۃ القیامۃ نازل ہوئی
ہے، "ہمزہ" وہ شخص ہے جو لوگوں کی غیبت کرتا ہے اور لوگوں کے
عیب نکالتا ہے، اور انہیں قول، فعل یا اشاروں سے طعن دیتا ہے۔

سورہ ہمزہ کا سورۃ العصر سے ربط ومناسبت

سورہ "والعصر" میں نوع انسانی کے بارے بات کی گئی ہے، جس کے
بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ انسان خسارے اور ہلاکت میں ہے،
جبکہ یہ سورت خسارے میں رہنے والے اور دولت اکھٹی کرنے والے انسان
کے حالات جو دین سے بے خبر ہے کے بارے میں بیان کرتی ہے۔

سورہ "ہمزہ" کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورہ "ہمزہ" مکی سورتوں میں سے ایک ہے، اس میں ایک (1) رکوع، نو
(9) آیات، تینتیس (33) الفاظ، ایک سو پینتیس (135) حروف اور چھیالیس
(46) نقطے ہیں۔

(قرآن کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس
بحث کی تفصیل کے لیے تفسیر احمد سورۃ الطور ملاحظہ کریں)

سورہ ہمزہ کا سبب نزول

عالم اسلام کے مشہور محدث ابن ابی حاتم نے عثمان بن عمر سے روایت کیا
ہے : ہم نے ہمیشہ یہ سنا کہ آیت : «وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ» ابی بن خلف کے
بارے میں نازل ہوئی ہے، سدی سے روایت ہے کہ: یہ آیت اخنس بن شریق
کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اخنس بن شریق بن عمرو ثقفی مکہ کے بزرگوں اور با اثر لوگوں میں سے تھے، مگر اس نے مکہ میں اور ہجرت سے پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہت زیادہ پرتشدد کاوائیاں نہیں کیں، اخنس قریش کے ان سرداروں میں شامل تھا، جو ابوطالب کے پاس گئے تھے اور ان کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام دیا تھا، اس موقع پر اخنس نے کہا: ہمیں اور ہمارے معبودوں کو چھوڑ دو، ہم بھی تجھے اور تیرے معبود کو چھوڑ دیں گے۔"

اخنس ہجرت کے بعد اور جنگ بدر میں اپنے اموال کو مسلمانوں سے چھڑانے کے لیے جنگ سے دست بردار ہوا، بعض قبائل نے بھی اس کی پیروی کی، البتہ جنگ احد میں وہ کفار کے لشکر میں شامل تھا، اس کا بیٹا بھی اسی جنگ میں مارا گیا تھا، بالآخر اخنس فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گیا اور "مؤلفۃ القلوب" میں سے قرار پایا، یہاں تک کہ حنین کی جنگ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی سالوں میں اخنس کا انتقال ہو گیا (بلاذری، احمد بن یحیٰ نساب الأشراف وتحقیق، زکار، سہیل، زرکلی، ریاض: ج - 1، ص: 231، دارالفکر بیروت، چاپ اول، 1417 ق)۔

ابن جریر نے اہل رقبہ کے ایک شخص سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت جمیل بن عامر جمحی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ابن منذر نے بیان کیا کہ امیہ بن خلف جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیتا، اور آپ کا مذاق اڑاتا، تو پھر "وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ" آخر تک نازل ہوئی۔

تفسیر البحر المحیط کے مفسر ابو حیان الأندلسی لکھتے ہیں کہ: یہ سورت درج ذیل لوگوں میں سے کسی ایک کے بارے میں نازل ہوئی ہوگی: اخنس بن شریق، عاص بن وائل، جمیل بن معمر، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، اس میں شک نہیں ہے کہ یہ سورت ان سب کے لیے ہے جن میں یہ اوصاف ہوں، عام ہے۔

سورة همزة کی تمہید

اس سورہ مبارکہ میں تین سنگین گناہوں کے لیے سخت سزا کی وعید بیان کی گئی ہے، پھر اس سزا کی شدت بیان کی گئی ہے، وہ تین گناہ یہ ہیں:

"ہمز، لمز اور مال اکھٹا کرنا" ہمزہ اور لمزہ " متعدد معانی کے لیے استعمال ہوئے ہیں، جو اکثر مفسرین نے بیان کیے ہیں، مثلاً: "ہمزہ" کا معنی غیبت ہے، یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے عیب بیان کرنا، اور "لمزہ" کا معنی کسی کو اس کے سامنے لعن طعن کرنا، یہ دونوں کبیرہ گناہ ہیں، غیبت کا گناہ قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ میں متعدد بار بیان کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس میں ملوث ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں، اس لیے گناہ بتدریج بڑھتا اور بڑھتا جاتا ہے، اس کے برعکس آمنے سامنے گفتگو ہو تو دوسرا فریق دفاع کے لیے تیار ہوتا ہے، لہذا گناہ میں بڑھوتری نہیں ہوتی، اس کے علاوہ کسی کے عیب کو اس کے پیٹھ پیچھے بیان کرنا بہت بڑا ظلم ہے، کیونکہ اسے یہ سمجھ نہیں آتا کہ اس پر کونسے الزامات لگائے جا رہے ہیں، تاکہ وہ اپنا دفاع کرسکے، دوسری طرف "لمز" سخت تر ہے، کسی کو اس کے سامنے لعن طعن کرنا اور ایذا رسانی بہت سخت ہے، اس لیے اس کا عذاب بھی سخت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "شرار عباد اللہ تعالیٰ المشاءون بالنمیمة المفرقون بین الأحبة الباغون البراء العنت" اللہ کے بدترین بندے وہ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں، او دوستوں میں پھوٹ ڈالتے ہیں، اور بے گناہوں کے عیب کی تلاش میں رہتے ہیں، تیسری خصوصیت جس پر اس صورت میں عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے، وہ مال کی حرص اور اس سے محبت ہے، اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں اس طرح فرمائی ہے کہ: مال کی حرص اور اس سے محبت کے نتیجے میں وہ اسے بار بار شمار کرتا ہے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ شرعی نصوص کے مطابق مال جمع کرنا قطعاً ناجائز اور گناہ نہیں ہے، یہاں اس مال کو جمع کرنے کی مذمت ہے جس کے واجب حقوق ادا نہ کیے جاتے ہوں، یا مال جمع کرنے کا مقصد تکبر اور رفخر ہو، یا اس کی محبت میں انسان ایسا غرق ہو جائے کی انسانی تقاضوں کو نظر انداز کرے۔

سورہ ہمزہ کے دروس اور عبرتیں

- 1- یہ سورت بعث (مرنے کے بعد اٹھنا) کا عقیدہ اور سزا بیان کرتی ہے۔
- 2- اس سورت میں غیبت اور عیب تلاش کرنے سے بچنے اور دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

3- اس سورت میں ہر غیبت کرنے والے ، ملامت کرنے والے اور بخیل کے لیے عذاب جہنم کی سختی بیان کی گئی ہے ۔

سورة همزة کے مشتملات اور فضیلت

اس سورت میں ان لوگوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے: جو اپنی تمام تر طاقت مال جمع کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ نہ صرف اپنی تمام کوششیں دولت کی محبت میں لگاتے ہیں ، بلکہ انسان میں موجود تمام قدروں کو اس میں فنا کرتے ہیں، پھر وہ تنگ دستوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اس سورت کے آخر میں وہ ان کے دردناک انجام کے بارے میں بتاتی ہے کہ کس طرح انہیں ذلت آمیز طریقے سے جہنم میں ڈالا جائے گا ، اور جہنم کی جلتی ہوئی آگ سب سے پہلے ان کی دلوں پر چڑھ جائے گی اور ان کی روح اور جان کو جلادے گی ۔

سورة همزة کے اہم پیغامات

- 1-** دولت جمع کرنے کے نقصانات میں سے ایک نقصان دوسروں کی تذلیل ہے ، "ہمزة لہزة... جمع مالاً وعددة" ۔
- 2-** اخلاقی مسائل دین کا حصہ ہیں، ایک مؤمن انسان کو چاہیے کہ اپنی آنکھوں اور زبان پر قابو رکھے ۔
- 3-** ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں ہم دنیاوی مال اور دنیاوی عہدوں کے دھوکے میں نہ آئیں اور غرور نہ کریں ، "يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ"
- 4-** وہ لوگ مال خرچ کرنے کے بجائے ، دولت جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کی سوچ میں ہیں، قیامت کے کچلنے والے عذاب کے منتظر ہیں ، "جَمَعَ مَالًا وَعَدْدَةً... لَيُنْزِلَنَّ فِي الْخُطْمَةِ"
- 5-** زبان کی چوٹ اور طعنہ دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے ، کیونکہ اس کے بارے میں عذاب کی وعید ہے۔
- 6-** خدا جو آگ بھڑکا تاہے وہ نہ صرف جسم بلکہ مجرموں کی روح اور دل میں بھی داخل ہوتی ہے "نَارُ اللَّهِ الْبُوقَدَةُ . الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئَةِ"۔
- 7-** انسانی ذہن جہنم اور جنت کے حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہے "وَمَا

أَذْرَبَكَ مَا الْحَطَبَةُ -

8 - آگ کے لمبے ستون، جہنم والوں کے لیے فرار کا راستہ بند کر دیں گے: "إِنَّمَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ" فِي عَمَدٍ مُّمدَّدَةٍ -

مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح

"وَيْلٌ" ، واویلا ! شرم اور سخت عذاب، رسوائی اور مصائب، تباہی، ندامت اور پریشانی کی علامت۔

"لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُّهْزَةٍ" ہمزہ: غیبت کرنے والا، تہمت لگانے والا، بد زبان، عیب تلاش کرنے والا، (قلم: 11 ، ہجاز) "لہز" وہ شخص جو عام طور پر لوگوں کو نیچا دکھانے کے لیے ان کے عیب تلاش کرتا ہے، عیب جو، (حجرات: 11) -

"ہمزہ ولہز" معنی کے لحاظ سے دو مترادف الفاظ کی طرح ہیں، "لہزہ" چھپکے سے عیب تلاش کرنا، اور آنکھ، بھوئی اور سر کے اشارے سے اظہار کرنا، ابن عباسؓ کہتے ہیں: "ہمزہ" غیبت کرنے والا، اور "لہزہ" نیچا دکھانے والا اور طعنہ دینے والا، (پیٹھ پیچھے یا سامنے) "مالاً" مال و دولت کی فراوانی، "عدۃ" کئی مرتبہ اس دولت کا حساب لگایا اور شمار کیا، کیونکہ اس کے گننے سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے -

"أَخْلَدَهُ" اسے ہمیشہ رکھنے والا ہے، اسے ہمیشگی عطا کی ہے، "لَيُنْبَذَنَّ" (نبذ) لازماً گرا دیا جائے گا، بیشک اسے پھینکا جائے گا، "مَا الْحَطَبَةُ" زیادہ کچلنے والا، جہنم، پیٹو شخص کو حطمہ کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پیٹ کو جہنم سے تشبیہ دی گئی ہے -

"الْمُوقَدَةُ" : (وقد) شعلہ ور ہونا، "تَطَّلِعُ" : قابو پاتی ہے، اور غلبہ حاصل کرتی ہے، گھیرتی ہے، چڑھ جاتی ہے -

"الْأَفْدَةُ" : فواد کی جمع، دل، "مُؤَصَّدَةٌ" (وصد) سر ڈھکا ہوا ہمہ گیر، مسلط اور غالب، بغیر کھڑکی کے مکمل بند، (بلد : ۲۰) عمد : جمع عماد : ستون، "مُمدَّدَةٍ" لمبے اور پھیلے ہوئے (فرقان) -

سورت کا مختصر مفہوم

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ہر غیبت کرنے والے کو جہنم میں لیجانے کا وعدہ کیا ہے، چنانچہ اس سورہ میں اس نے غیبت کرنے والے عیب تلاش کرنے والے کی ایک خصوصیت بیان کی ہے جو کہ مال جمع کرتا اور اسے گنتا ہے، جبکہ اسے بھلائی اور رحمت کی راہ میں خرچ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کی مدد کرے گا، یہ دنیا میں ہمیشہ رہے گا اور کبھی نہیں مرے گا، اس کے نتیجے میں وہ زیادہ جائیداد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی لمبی عمر کی وجہ زیادہ جائیداد اور سرمایہ ہے، جب کہ وہ نہیں جانتا کہ یہ حرص ہے جو زندگی کو گھٹا دیتا ہے اور دنیا اور آخرت کی تباہی کا سبب بنتا ہے، جبکہ اس کے برعکس سخاوت اور خرچ کرنا زندگی طویل کر دیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ" اسے بڑا دکھانے کے لیے اور خوف و دہشت پیدا کرنے کے لیے، "حطمہ" کی تصریح میں فرماتے ہیں، "ثَأْرُ اللَّهِ الْمُوقَدَّةُ" وہ آگ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، اور زیادہ شدید ہونے کی وجہ سے:

"تَطْلُعُ عَلَى الْأَفْدَةِ" وہ جسم سے دل میں داخل ہو جاتی ہے، اس شدید حرارت کے باوجود وہ اس میں قید ہوں گے اور باہر جانے سے ناامید ہوں گے، اسی لیے اس آیت کے بعد کہتا ہے: "إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ" وہ آگ ان پر بند کی گئی ہے، "فِي عَمَدٍ" انہیں دروازوں کے پیچھے گھسیٹا گیا ہے، اس لیے وہ اس سے باہر نہیں نکل سکتے، اللہ قرآن عظیم کی ایک اور آیت میں فرماتا ہے: "جب بھی وہ غم کی وجہ سے وہاں سے نکلنا چاہیں گے، انہیں اس کی طرف لوٹا یا جائے گا" (سورہ حج: ۲۲) كَلْبًا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا ۖ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورة الہمزہ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّهَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي
الْحُطْبَةِ ۝ وَمَا آذْرُكَ مَا الْحُطْبَةُ ۝ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْآفِئَةِ ۝ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ
مُوصَدَّةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّهَزَةٍ ۝	بڑی ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝	جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝	وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا
كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطْبَةِ ۝	ہر گز نہیں، یقیناً وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا
وَمَا آذْرُكَ مَا الْحُطْبَةُ ۝	اور تجھے کس چیز نے معلوم کرایا کہ وہ حطمہ کیا ہے؟
نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝	اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے
الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْآفِئَةِ ۝	جو دلوں پر چڑھتی ہے
إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۝	یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی ہے
فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝	لمبے لمبے ستونوں میں

سورت کی تفسیر

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝۱	بڑی ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے

یعنی: تباہی ہے ہر غیبت کرنے والے اور طعنے دینے والے کے لیے، سورہ
ہمزہ ایک " ہلاکت والے لفظ " سے شروع ہوئی ہے " وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ "
کون ہے؟ " ہمزہ " مبالغہ کا وزن ہے، بنیادی طور پر اس لفظ کا معنی
ٹوٹنا ہے، غیبت کرنے والا شخص، غیر موجود شخص کو اپنی باتوں
اور طعنوں سے توڑ دیتا ہے، "ہمزہ" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو لوگوں
کے پیٹھ پیچھے غیبت کرے، "لمزہ" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو
آنکھ مار کر، سر ہلا کر یا اشارہ سے لوگوں کے سامنے کسی کی توہین کرتا
ہے، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ اور اخنس کو دھمکی آمیز
لہجے میں سرزنش کی ہے۔

"ہمزہ" یعنی وہ لوگ جو دوسروں کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں، اس سے
کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ حرکت ان کی زبان سے ہو یا ان کے طرز عمل
سے اس قسم کے لوگ اپنی ترقی اور آگے بڑھنے کو دوسروں کی تحقیر
و تذلیل اور عیب تلاش کرنے میں سمجھتے ہیں، وہ دوسروں کی شخصیت
کی کردار کشی کرتے ہیں۔

قرآن عظیم ایسے غیبت کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے: اس کام کی
مثال یہ ہے کہ: جیسے کوئی شخص اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت
کھاتا ہے، تو اپنے دینی بھائی کی شخصیت کو توڑ کر اپنے آپ کو اوپر
لے جاتے ہیں خود کو اچھا دکھانے کے لیے اسے برا دکھاتے ہیں،
بعض حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنی تعریف و توصیف میں
لگ جاتے ہیں، کسی کے لیے اپنی تعریف و توصیف کرنا بری بات نہیں،
لیکن ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کی تذلیل اور توہین کر کے اپنی حیثیت اور
شخصیت دکھانا چاہتے ہیں، یعنی دوسروں کو نیچا دکھا کر خود کو مضبوط
اور طاقتور ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ: "شرار عباد اللہ تعالیٰ المشاؤون بالنميمة، المفسدون بين
الأحبة"

ترجمہ: خدا تعالیٰ کے بدترین بندے وہ چغل خور ہیں جو دوسروں کے باہمی
رابطوں اور تعلقات میں خلل ڈالتے ہیں، پاکیزہ اور بے گناہ لوگوں کے عیب
تلاش کرتے ہیں۔

جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝۲

وہ اپنے جمع کردہ مال کی وجہ سے خوش ہوتا اور فخر کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس مال کی وجہ سے اسے دوسروں پر فضیلت اور برتری حاصل ہے ، وہ دوسروں کو چھوٹا اور کمتر سمجھتا ہے۔

عالم اسلام کے عظیم مفسر محمد بن جریر طبری نے کہا : یعنی وہ اسی کے اعداد و شمار رکھتا ہے ، اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا ، اور اس سے اللہ کا حق ادا نہیں کرتا : یہ صرف اسے جمع کر کے اس کی حفاظت کرتا ہے ، (طبری: ۳۰/۸۹) ۔

"الَّذِي جَمَعَ مَالًا" جو اپنی تمام تر کوششیں مال جمع کرنے میں صرف کرتا ہے ، "وَعَدَّدَهُ" اور یہ کہ وہ ہمیشہ اسے شمار کرتا رہتا ہے ، ذخیرہ اندوزی کرتا ہے مال و دولت خرچ کرنے اور صدقہ دینے کے لیے جمع نہیں کرتا ، بلکہ اسے گننے اور لذت کے لیے جمع کرتا ہے ، وہ امیر اور سرمایہ دار کہلوانا پسند کرتا ہے ۔

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝۳

وہ سوچتا ہے اسے اس کا مال ہمیشہ اور دائمی رہنے والا بنائے گا ، اور اس کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی نہیں مرے گا ، اور اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا ، اس لیے وہ ہمیشہ اپنے مال میں لگا رہے گا ، لیکن وہ یہ بھول گیا ہے کہ قبر میں اس کا مال و دولت اس کا جواب نہیں دے گی ، بلکہ اس کے اعمال صالحہ ہی اس کے مالک کو ہمیشہ کی زندگی میں امر کرتے ہیں ، مال و دولت نہیں ، بلکہ عمل کے ساتھ علم اس کے مالک کو ہمیشہ ابدی بنا دیتا ہے۔

مفسرین اس بارے میں لکھتے ہیں کہ شیطان آدم اور حوا کو جنت میں کیسے دھوکہ دینے میں کامیاب ہوا: شیطان نے ان سے دو باتیں کیں ، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : کہ اس درخت کے قریب نہ جانا " اَنْ تَكُونَا مَلَکَیْنِ اَوْ تَكُونَا مِنْ الْخَالِدِیْنَ " (سورہ اعراف : ۲۰) نہیں چاہتا کہ تم فرشتے بن جاؤ یا ہمیشہ یہاں رہو ، کیونکہ جو کوئی اس درخت کا پھل کھائے گا اسے ہمیشہ کی زندگی ملے گی ، اور " ملائکہ " میں سے بن جائے گا ۔

" ملک " وہ شخص جس کے پاس خاص سہولتیں ہوں، اور ملک کی طرح اسے " تملک " حاصل ہو ، کہتے ہیں کہ : ان کو ان دو جملوں کے ساتھ دھوکہ دیا۔

یہ واقعہ قرآن عظیم کی دو آیات میں بیان کیا گیا ہے ، کہ ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں ، ابلیس ایک قول میں کہتا ہے : " يَادْمُ هَلْ أَذُلُّكَ عَلَى شَجَرَةٍ " (سورہ طہ : ۱۲۰) ترجمہ : اے آدم : کیا میں تجھے دائمی زندگی کا درخت اور ایسی بادشاہی بتاؤں جو پرانی نہ ہو ؟ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے دو محرکات ہیں: جو کسی دوسرے مخلوق کے پاس نہیں ہیں: ایک یہ کہ وہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ رہے، اور دوسرا یہ کہ وہ ایسی سہولیات چاہتا ہے جو کبھی ختم نہ ہوں ، اب ان تین آیات کو آخر سے پہلی تک پڑھتے ہیں ، " اِيْحَسِبُ اَنَّ مَالَهُ اَخْلَدَهُ " انسان سوچتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا، جبکہ جو چیز ہمیں ابدی بنائے گی وہ آخرت کو سنوارنا ہے ، بھلائی اور خیر کی تلاش ہے، خدا کے بندوں کے فائدے کے لیے کام کرنا ہے، سچائی کے پیچھے چلنا ہے، خدا کی نظر میں اپنی قدر و قیمت پیدا کرنا ہے ، یہی چیز انسان کو ابدی بناتی ہے، "وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ" ہے (سورہ کہف آیت : ۴۶) (یعنی : نیک کام پائیدار ہے) اعمال صالحہ خدا کے نزدیک سب سے اعلیٰ ہیں اور ان میں سب سے زیادہ عزت اور اجر ہے ،

ہر گز نہیں، یقیناً وہ ضرور حطمہ میں پھینکا جائے گا

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝

"لیکن نہیں" یعنی: ایسا نہیں ہے ہ وہ غافل طعنہ مارنے والا مغرور شخص جو اور خود شخص سوچتا ہے ایسا نہیں ہوگا، بلکہ "یقیناً" اسے حطمہ میں ڈالا جائے گا" یعنی: وہ اور اس کا مال ایسی آگ میں ڈالے جائیں گے، جو ہر چیز تباہ کر دے گی۔

"كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ" (نبذ) یعنی: گرنا، اور پھینکنا، جس طرح جب کوئی شخص کچرے کے ڈھیر میں کوئی چیز پھینکتا ہے تو وہ بھی اسی طرح "حُطَمَةٌ" میں جا گریں گے، "حُطَمَةٌ" لغت میں بہ معنی "ہمزہ ہے" ، "حُطَمَةٌ" کی اصل "حطم" ہے، اور "حطم" یعنی، توڑنا، تحقیر کرنا اور کچلنا یہ لفظ قرآن کریم میں دو جگہ استعمال ہوا ہے، دونوں جگہ اس کا ایک دلچسپ معنی ہے:

ایک تو چیونٹیوں کی زبان سے ہے کہ جب سلیمان اور ان کے سپاہی آرہے تھے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: اپنے گھروں میں جاؤ، تاکہ: "لَا يَحْطَبَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُودُهُ" (سورہ نمل ۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے سپاہی تمہیں روند ڈالیں اور دوسرا موسم کے بارے میں جب پتے، پھول گرجاتے ہیں اور درختوں کی شاخیں "پتوں سے خالی" ہوجاتی ہیں، یعنی موسم خزاں کا ہوا جب درختوں سے خشک پتوں کو الگ کرکے "حُطْمَة" ویرانوں میں پھینک دیتا ہے، یہ بھی اپنی زندگی میں دوسروں کو توڑ دیتے تھے اور روند دیتے تھے، چنانچہ اب وہ خود بھی "حُطْمَة" جو توڑنے والی اور تحقیر کرنے والی ہے میں گر پڑیں گے اور ذلیل ہوں گے۔

وَمَا أَذْرٰكَ مَا الْحُطْمَةُ ۝	اور تجھے کس چیز نے معلوم کرایا کہ وہ حطمہ کیا ہے ؟

استفہام برائے تفخیم، جہنم کی آگ کا حیران کن اور خوفناک تعارف کرانا ہے، گویا جہنم کی کچلی والی آگ بھی ان چیزوں میں سے ہے جنہیں عقل نہیں سمجھ سکتی۔

نَارُ اللّٰهِ الْمَوْقِدَةُ ۝	اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے

یعنی: حُطْمَة بھڑکھائی ہوئی آگ جو کہ رب تعالیٰ کے حکم سے بھڑکھائی گئی ہے، حدیث شریف میں ہے کہ: ایک ہزار سال تک آگ جلائی یہاں تک کہ وہ بھڑک اٹھی پھر ایک ہزار سال تک جلائی یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی، اور اس کے بعد وہ ایک ہزار سال تک جلائی گئی یہاں تک کہ وہ سیاہ ہوگئی۔

قرآن کریم میں اس مقام کے سوا اور کہیں پر جہنم کی آگ کو اللہ تعالیٰ کی آگ نہیں کہا گیا، اس مقام پر اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنے سے نہ صرف اس کی ہولناکی کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ دولت اور دنیا سے فائدہ اٹھا کر مغرور اور متکبر ہو جاتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کس قدر نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ: وہ آگ کہ جس میں وہ اس قسم کے لوگوں کو ڈالے گا اسے خاص اپنی آگ کہا ہے، (تفہیم القرآن)

توجہ فرمائیے: جب آگ کی بحث ہوتی ہے، تو ہم انسان اس کی ظاہری اور بیرونی فہم کی طرف دھیان دیتے ہیں جبکہ اس آگ سے جو اکثر ہمارے باطن میں ہے غافل ہیں:

اللّٰہِی تَطْلُعُ عَلٰی الْاَفْدَہِ، ○	جو دلوں پر چڑھتی ہے

یعنی: حُطْمَہ ایسی آگ ہے جس کی جھلسانے والی گرمی دلوں تک پہنچ جاتی ہے، اور اس پر مسلط ہو کر اسے ڈھانپ لیتی ہے، دل کا خاص طور پر ذکر فرمایا، حالانکہ آگ سارے جسم کو لپیٹ میں لے لیتی ہے، یہ اس لیے کہ دل جسم کا سب سے نازک حصہ ہے، تھوڑی سی اذیت پر سخت تکلیف محسوس کرتا ہے، یا اس لیے کہ دل منحرف ارادوں، بری نیتوں، اخلاقیات اور برے کرداروں جیسے تکبر اور اہل فضل کو نیچا دکھانے کا مقام ہے۔

مشہور مفسر شیخ قرطبی نے کہا ہے "اَفْدَہ" کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ جب درد دل تک پہنچتا ہے تو انسان مر جاتا ہے، پھر وہ خود کو حالت مرگ میں پائیں گے مگر مریں گے نہیں، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے: "لَا یَمُوتُ فِیْہَا وَلَا یَحْیٰ" پس وہ لوگ زندہ ہیں، لیکن موت سے بدتر زندگی ہے۔

اِنَّہَا عَلَیْہِم مَّوْصَدَہٌ ○	یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی ہے

یعنی آگ ہر طرف سے دوزخیوں کو گھیری ہوئی ہوگی اور اس کے دروازے ان پر مکمل بند ہوں گے، اس لیے وہ ہر طرف سے اس کے احاطے میں ہوں گے، اور اس سے نہیں نکل سکیں گے۔

فِی عَمَدٍ مُمَدَّدَہٍ ○	لمبے لمبے ستونوں میں

یعنی وہ مضبوط اور لمبے ستونوں میں گھرے ہوئے ہیں، تا کہ کبھی بھی اس سے نہ نکل سکیں، اس سے بھاگنے کا راستہ بھی نہیں ہے، ستونوں کے لمبے ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لا متناہی وقت تک وہاں رہیں گے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ: ان پر دروازے بند ہوں گے، اور اس کا مرکزی ستون جو لوہے کا ہے، کیلوں سے مضبوطی سے جما ہوا ہے، اس سے بھاگنا نا ممکن ہے۔

"مُؤَصَّدَةً" یعنی: ایسی چیز جس سے الگ ہونا ممکن نہ ہو۔

کیا اسلام میں مال دولت جمع کرنا حرام ہے؟

قابل غور بات یہ ہے کہ دین اسلام نے مال و اسباب جمع کرنے سے قطعی طور پر منع نہیں کیا ہے، اور ذخیرہ شدہ مال کے مالک کو سخت تنبیہ بھی کی گئی ہے، لیکن اگر وہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں، چاہے اس نے حلال طریقے سے کتنا ہی جمع کیوں نہ کیا ہو۔

البتہ جو لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے بارے میں رب العزت ارشاد فرماتا ہے؛ "وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝۳۴" (سورہ توبہ: ۳۴) ترجمہ: "جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے، ان کو درد ناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔"

ابو داؤد میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَا بَلَغَ أَنْ تُؤَدَّى زَكَاةُ فَرْجِي فَلَيْسَ بِكَزٍّ" جس کا مال زکوٰۃ کی حد تک پہنچ جائے، اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے، پس وہ کنز نہیں ہے۔"

کنز: ہر وہ چیز جو جمع کر کے ذخیرہ کیا جائے، مال اکٹھا کرنا۔

امام مالک "موطا" (۵۹۵) عبد اللہ بن دینار سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: "سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ وَهُوَ يُسْأَلُ عَنِ الْكُزِّ مَا هُوَ فَقَالَ هُوَ الْمَالُ الَّذِي لَا تُؤَدَّى مِنْهُ الزَّكَاةُ"۔

ترجمہ: "میں نے سنا کہ عبد اللہ بن عمر سے کنز کے بارے میں پوچھا گیا کہ کنز کیا ہے؟ انہوں نے کہا: وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو" امام بخاریؒ خالد بن اسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: "خَرَجْنَا مَعَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، فَقَالَ أَعْرَابِي: أَحْبَبْتُ عَنْ قَوْلِ اللَّهِ: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ، وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (التوبة: 34) قَالَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا: مَنْ كَنَزَهَا، فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاةَهَا فَوَيْلٌ لَهُ، إِمَّا كَانَ هَذَا قَبْلَ أَنْ تُنْزَلَ الزَّكَاةُ، فَلَمَّا أُنْزِلَتْ جَعَلَهَا اللَّهُ طَهْرًا لِلْأَمْوَالِ. بخاري (1404)۔"

ترجمہ: ہم عبد اللہ بن عمرؓ کے ساتھ باہر گئے، ایک اعرابی نے ان سے پوچھا: اس آیت کے بارے میں مجھے بتاؤ: "وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ، وَلَا يَنْفِقُونَهَا

فِي سَبِيلِ اللَّهِ "ابن عمرؓ نے کہا : " جس نے سونا اور چاندی جمع کی اور اس کی زکوٰۃ نہیں دی، پس اس پر افسوس ہے ، اور یہ اس وقت سے متعلق ہے جب زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی ، جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو خدا تعالیٰ نے اسے (یعنی زکوٰۃ کو) مال کی پاکی کا سبب قرار دیا۔"

عبد الرزاق نے " مصنف " (۷۱۴۱) میں عبیداللہ بن عمر نے نافع سے اور اس نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا : "مأدی زکاتہ فلیس بکنز وإن کان تحت سبع أرضین، وما کان ظاہراً لا یؤدی زکاتہ فهو کنز" یعنی : "جس کی زکوٰۃ ادا کی گئی وہ کنز میں شمار نہیں ہوگا ، اگرچہ اسے سات زمینوں کے نیچے (ذخیرہ اور چھپا یا گیا) ہو ، اور جو مال ظاہر ہے اگر اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو وہ کنز ہے۔"

مختصر یہ کہ جس چیز کو حرام کہا گیا اور جس کے بارے میں سخت تنبیہ کی گئی ہے وہ ایسا مال ہے (یعنی وہ جمع شدہ مال ہے) جس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہو، یا وہ مال جو حد نصاب کو نہیں پہنچا ہو، اسے کنز میں شمار نہیں کیا جائے گا، اسلام نے مال جمع کرنے کو حرام نہیں کہا ہے، بلکہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے کو حرام کہا ہے۔

غیبت اور اس کا کفارہ

غیبت کا شمار شریعت میں کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے، اور غیبت کرنے والا شخص خدا کے سامنے زیر عتاب ہوگا ، اس گناہ کی سنگینی دو وجہ سے ہے:

- 1- یہ گناہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اس لیے یہ زیادہ خطرناک ہے ، کیونکہ یہ لوگوں پر ظلم کی ایک قسم ہے۔
- 2- غیبت کرنا لوگوں کے لیے بہت آسان ہے، سوائے اس کے جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، جبکہ یہ گناہ خدا کے نزدیک کبیرہ اور قابل نفرت ہے،

لہذا ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ زبان کی اس آفت سے محتاط رہے، اور اپنے آپ کو اس کبیرہ گناہ سے بچائے، مسلمانوں کی غیبت کا عادی بننے سے غیبت کرنے والے کے گناہوں کا بوجھ بڑھے گا ، اور اس کی تلافی یقیناً دشوار اور مشکل ہے ، کیونکہ ان میں سے اکثر گناہوں کا شمار لوگوں

کے حقوق سے ہوتا ہے ، البتہ غیبت کے کفارہ کے بارے میں چند اہم باتوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

پہلا: غیبت کا کفارہ ، خیر کی دعا کرنا ، خدا سے بخشش اور استغفار اس آدمی کے لیے جس کی غیبت کی گئی ہے۔

دوسرا: دعا اور استغفار اس کے لیے جس کی غیبت ہوئی ہے کفارہ کے لحاظ سے کافی نہیں ہے ، کیونکہ اصول یہ ہے کہ گناہوں سے اس وقت تک پاک نہیں ہوسکتا جب تک سچی توبہ نہ کرے ، اور خلوص دل سے پشیمانی کا اظہار نہ کرے ، اور گناہوں کی طرف واپس نہ جانے کا عزم کرے ، اس کے بعد امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے اور اس کے گناہ معاف فرمائے۔

جس کے ساتھ ظلم ہوا ہے یا حق تلفی ہوئی ہے جب تک وہ معاف نہ کرے تو گناہ معاف نہ ہوگا ، اس کی دلیل رسول اللہؐ کی صحیح حدیث ہے جس میں فرمایا: " مَنْ كَانَتْ لَهُ مَظْلَمَةٌ لِأَخِيهِ مِنْ عَرَضِهِ أَوْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لَا يَكُونَ دِينَارٌ وَلَا دِرْهَمٌ، إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدَرٍ مَظْلَمَتِهِ، وَإِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتٍ صَاحِبِهِ فَحُبِّلَ عَلَيْهِ" (بخاری : ۲۴۴۹)، ترجمہ: " اگر کسی شخص کا ظلم کسی دوسرے کی عزت پر ہو یا اور کسی طریقہ (سے ظلم کیا ہو) تو آج ہی اس دن کے آنے سے پہلے معاف کرا لے جس دن نہ دینار ہوں گے ، نہ درہم ، بلکہ اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوگا تو اس کے ظلم کے بدلے میں وہی لیا جائے گا ، اور اگر کوئی نیک عمل اس کے پاس نہیں ہوگا ، تو اس (مظلوم) کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی ۔"

اس حدیث میں لوگوں سے معافی مانگنے اور ان کی وفات سے پہلے ظلم کی تلافی کرنے کی بات کی گئی ہے ، کیونکہ قیامت کے دن نا انصافیوں کا معاوضہ نیکیوں سے ادا کرنا پڑے گا ، نہ کہ درہم اور دینار سے ، سچ یہ ہے کہ یہ نقصان حقیقی ہے۔

تیسرا: یہ کہ جو شخص غیبت کے گناہ سے چھٹکارا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اس سے معافی مانگنے کی بھرپور کوشش کرے جس کی اس نے غیبت کی ہے ، یعنی اس سے نرم الفاظ میں معافی تلافی اور معذرت کرے ، جتنا ہوسکتا ہے اس میں کوشش کرے ، خواہ اس کا دل جیتنے کے لیے اس کے لیے قیمتی تحائف دینا ہی کیوں نہ پڑے ، علما نے یہ تمام کام اس

بندے کو راضی کرنے کے لیے جائز قرار دیے ہیں ، لیکن سلف صالحین اور اہل علم فقہاء میں سے بہت سوں نے یہ رائے دی ہے کہ اگر غیبت کے معاملے میں معافی مانگنے سے کوئی بڑا فتنہ برپا ہونے کا اندیشہ ہو مثال کے طور پر دوسرے فریق کے غصہ بھڑکانے اور قطع صلہ رحمی رشتے ختم کرنے کا سبب بن سکتا ہو، یا دلوں کو بغض اور کینہ سے بھر دیتا ہو تو اس صورت میں اکثر علماء نے معافی طلب کرنے کو ترک کرنے کی اجازت دی ہے، اس حالت میں جس کی غیبت ہوئی ہے اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ، امید ہے کہ اس کی دعا کرنے، اور اس کے لیے اللہ سے بخشش مانگنے اور استغفار کرنے سے اس کے لیے اللہ کے ہاں اس غیبت کا کفارہ ہو۔

البتہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ غیبت کا گناہ اس وقت تک پاک نہیں ہوگا جب تک کہ جس کی غیبت کی گئی اس سے معافی نہ مانگے اور توبہ نہ کرے ، اور اس کے لیے کوئی کفارہ نہیں ہے، دعا اور استغفار غیبت کا گناہ نہیں مٹا سکتا، البتہ علماء کی اسی جماعت نے کہا ہے کہ اگر وہ شخص جس کی غیبت ہوئی ہے غائب ہو، یا فوت ہوگیا ہو تو اس صورت میں اس کے لیے دعا اور استغفار کرنا جائز ہے ۔

مختصر یہ کہ جس کی غیبت ہوئی ہے اس کے لیے خدا سے معافی مانگنا ایک وقتی، اضطراری عذر ہے جو بوقت ضرورت کیا جاتا ہے، شریعت نے خرابیوں اور مفسد کو دور اور مصلحتوں کے حصول کے لیے ضرورت کی صورت میں اسے مد نظر رکھا ہے، لہذا مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ان لوگوں کی غلطی اور غلط فہمی ظاہر ہو جاتی ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرنے میں بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں اس امید پر کہ دعا اور استغفار اللہ کے نزدیک اس کے کیے ہوئے غیبت کے کفارے کے لیے کافی ہے، جبکہ وہ نہیں جانتے کہ ان کا یہ تصور چند وجوہات کی بنا پر غلط ہیں:

1 - وہ بھول گئے ہیں کہ توبہ کی بنیادی شرط توبہ، پیشمانی اور اخلاص سے اللہ کی طرف رجوع ہے، بہت سے لوگ اس شرط کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

2 - درحقیقت لوگوں کے حقوق کی تلافی کا اصول یہ ہے کہ ان سے معاف کرانے کی بھرپور کوشش کی جائے، اگر فرض کیا جائے کہ اس کو اطلاع دینے میں (جس کی غیبت کی گئی ہے) کسی بڑے فساد کا اندیشہ ہو، تو اس صورت میں اس سے معافی مانگنے کے بجائے اس

کے حق میں دعاء اور استغفار کیا جائے تو اس کے لیے کافی ہوگا، ورنہ اصول یہ ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے اس کے پاس جاکر اس سے درگزر کرنے کی استدعاء کی جائے۔

3 - اگر وہ شخص جس کی غیبت کی گئی ہے کسی اور کے توسط سے اطلاع پائے کہ اس کی غیبت کی گئی ہے، تو اس صورت میں غیبت کرنے والے کے لیے لازمی ہے کہ براہ راست اس کے پاس جائے اور اس سے معافی مانگے، اس لیے کہ ممکن ہے کس کی غیبت کی گئی ہے اس کے دل کی تکلیف اور ناراضگی ختم ہو جائے اور وہ معاف کر دے، اگر وہ معاف نہ کرے تو اس صورت میں غیبت کے گناہ سے نجات اور خلاصی پانے کے لیے اس شخص کے حق میں دعا اور استغفار کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

4 - دعا کا طریقہ اس کے لیے دعا کرتے وقت اس کا نام لیکر دعا کرے، اس کے علاوہ وہ خود کو بھی دعا میں شامل کرے، مثلاً کہے کہ: "اللہم اغفر لی ولفلان:" اے پروردگار! مجھے اور فلان کو (جس کی غیبت کی گئی ہے) بخش دے: "اللہم تجاوز عنا وعنہ" اے پروردگار! میرے اور اس کے گناہ سے درگزر فرمادے، کوشش کرنی چاہیے کہ دعاء قبولیت کے اوقات میں نیت کے اخلاص اور سچائی کے ساتھ کی جائے، اور دعا بار بار دہرائی جائے۔

5 - یہ بتانا ضروری ہے کہ دعا اور استغفار کا مقصد درحقیقت کسی برے کام کو دور کرنا اور اچھے کاموں سے اس کا تبادلہ کرنا ہے، اس مقصد تک پہنچنے کے لیے (برے عمل کے اثر اور اس گناہ کو ختم کرنے کے لیے) لازمی ہے کہ دعاء اور استغفار کرے، اس مقصد کے لیے کوئی اور عمل نہ کیا جائے، ہاں البتہ ہر قسم کے نیک اعمال کیے جاسکتے ہیں، اور اس کا ثواب غیبت کیے گئے شخص کو ہدیہ کیا جاسکتا ہے، جیسے اس کے بدلے صدقہ دینا، یا اس کی مدد کرنا، اور سختیوں اور مصیبتوں میں اس کا ساتھ دینا وغیرہ، کہ یہ اعمال ان مصائب کی جگہ لے لیں گے جو اس پر آئے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: مظلوم کا حق صرف توبہ کرنے سے ساقط نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ حق ہے، اس معاملے میں کسی کو نا حق قتل کرنے والا اور دوسرے پر ظلم روا رکھنے والا ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، پس جو آدمی ظلم سے توبہ کرے تو صرف توبہ سے مظلوم کا حق ساقط نہیں ہوگا، بلکہ توبہ مکمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس

کی تلافی کرے، اس چیز کے ساتھ کہ اس نے اس پر جو ظلم کیا ہے، اگر وہ اس برائی اور نا انصافی کی تلافی دنیا میں نہ کرے تو اسے آخرت میں ضرور تلافی کرنی ہوگی، پس اس توبہ کرنے والے ظالم کے لیے لازمی ہے کہ بہت ساری نیکیاں کرے، تاکہ اگر مظلوم آخرت میں اس سے اپنا حق واپس لے لے، تو وہ مفلس نہ رہے، البتہ اگر خدا خود مظلوم کی تلافی کرنا چاہے، تو یہ اس کے فضل و کرم سے دور نہیں، وہ جس طرح چاہے شرک کے علاوہ برگناہ معاف کر دیتا ہے۔

ترمذی میں ایک حدیث جسے صحیح یا حسن کہا گیا ہے اس میں آیا ہے کہ: "إِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَإِنَّ اللَّهَ يَجْمَعُ الْخَلَائِقَ فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ، يَسْمَعُهُمُ الدَّاعِي وَيَنْفِذُهُمُ الْبَصَرُ، ثُمَّ يَنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مَنْ بَعْدَ كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرَبَ، أَنَا الْهَلِكُ، أَنَا الدِّيَانُ، لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ أَنْ يَدْخُلَ النَّارَ وَلَهُ عِنْدَ أَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَقٌّ حَتَّى أَقْصَهُ مِنْهُ، وَلَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ أَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَلِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ عِنْدَهُ حَقٌّ حَتَّى أَقْصَهُ مِنْهُ"۔

ترجمہ: "جب قیامت کا دن آئے گا تو خدا تعالیٰ تمام مخلوق کو ایک زمین پر جمع کرے گا، ایک داعی ان سب کو پکارے گا جسے دور اور قریب سے ہر کوئی سن سکے گا، اور خدا تعالیٰ فرمائے گا: میں دَیَّان (فیصلہ کرنے والا) ہوں، جہنمیوں میں سے کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ جہنم میں داخل ہو، جبکہ اس کا اہل جنت میں سے کسی ایک پر حق ہے، جب تک کہ وہ اپنا حق اس سے وصول نہ کرے، اور اہل جنت میں سے کسی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ جنت میں داخل ہو جب کہ اس کا اہل دوزخ میں سے کسی ایک پر حق ہے، جب تک کہ وہ اپنا حق اس سے حاصل نہ کرے۔"

صحیح مسلم میں ابو سعید خدریؓ سے حدیث مروی ہے کہ: "أَنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ إِذَا عَبَرُوا الصَّرَاطَ وَقَفُوا عَلَى قَنْطَرَةٍ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، فَيَقْتَصُّ لِبَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ، فَإِذَا هَذَبُوا وَنَقَوْا أَذُنَ لَهُمْ فِي دُخُولِ الْجَنَّةِ" ترجمہ: "یعنی جب جنتی راستے سے گزریں گے تو جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر کھڑے ہوں گے، اور ان میں سے بعض دوسرے سے بدلہ لیں گے اور جب وہ (گناہوں سے) پاک ہو جائیں گے اور بدلہ لیا جائے گا تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔"

خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُمُ بَعْضًا" (الحجرات: 12) ترجمہ: "اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔"

اور فرمایا: "أَيُّبُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ" ○ ○ ○ وَاتَّقُوا اللَّهَ ○ ○ ○ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ○ ○ ○ (الحجرات: 12) ترجمہ: "کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا ڈر رکھو بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ غیبت کرنے والوں کو توبہ کرنے کی تاکید فرماتا ہے، لیکن اگر وہ غیبت کرے یا بھتان لگائے، لیکن مظلوم کو اس کا علم نہ ہو، تو اس صورت میں بعض علماء نے کھاہے کہ: ظالم کے لیے توبہ کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے: کہ وہ مظلوم کو سے واضح طور پر کہے کہ اس کی غیبت کی ہے، اس کو اطلاع دے، اور بعض نے کھا ہے کہ اس کو اطلاع دینا شرط نہیں ہے، ضروری نہیں ہے، اکثر علماء کا یہی قول ہے، یہ دونوں اقوال امام احمد سے منقول ہیں، لیکن ان کی رائے ہے کہ اس صورت میں ظالم کو چاہیے مظلوم کے لیے نیک اعمال کرے، جیسے: اس کے لیے دعا اور استغفار کرنا، اور نیک عمل کرنا اور اس کا ثواب اس کے لیے دینا، یہ چیزیں غیبت اور بھتان کی تلافی اور کفارہ کے طور پر ہونگی، حسن بصری نے کھا: غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لیے استغفار کرے (مجموع الفتاوی: 178/18-189)۔

مختصر یہ کہ سب سے پہلے ایک متقی مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان اور گفتگو میں احتیاط کرے، اور اپنی زبان کو مسلمانوں کی غیبت اور برائی میں استعمال نہ کرے، تاکہ اس کے گناہوں کا بوجھ نہ بڑھے، لیکن اگر وہ اس کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، تو اسے چاہیے کہ سب سے پہلے سچی توبہ کرے، اور اس مسلمان کی غیبت کرنے سے دل سے ندامت محسوس کرے، اس کے بعد اصول ہے کہ اگر ممکن ہو تو غیبت کیے گئے شخص کے پاس جاکہ اس سے معافی مانگے، اگر ممکن ہو تو کسی طریقے سے اس کا دل جیت لے، تاکہ وہ اسے معاف کرے، اگر اس کو اطلاع دینے سے کسی بڑے فتنے یا شر کا امکان ہو، اور اس کے غصے میں اضافے کا اندیشہ ہو رشتہ داری ختم کرنے کا احتمال ہو، تو اس صورت میں بعض علماء نے کھاہے کہ ضروری نہیں ہے کہ اس سے کچھ کہے، بلکہ اس کے لیے خدا سے دعاء اور مغفرت کرنا کافی ہے، یا اس کے لیے نیک اعمال اور صدقہ کرے، اس کا ثواب اسے ہدیہ کرے، بعض دوسرے علماء نے کھا ہے کہ: اس سے معافی مانگنا

واحد راستہ ہے، سوائے اس کے کہ وہ فوت ہو گیا ہو، یا غائب ہو تو اس صورت میں اس کے لیے دعا اور استغفار کرے، لیکن اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس حالت میں غیبت کیے گئے شخص کے پاس جانے اور اس کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی بھلائی کی دعا کرے اور اپنے لیے بھی بخشش مانگے، امید ہے کہ یہ اس کے لیے کفایت کرے اور اس کے گناہ مٹ جائیں۔

چغل خوری

زبانی برائیوں میں سے ایک جو اسلام میں اخلاقی برائی سمجھی جاتی ہے، وہ چغل خوری ہے، چغل خوری اس کو کہا جاتا ہے کسی کی کھی ہوئی بات کو اس کے پیٹھ پیچھے کسی اور کے سامنے دھرایا جائے، مثلاً کہے کہ: فلان نے تیرے بارے میں ایسی بات کھی، یا تیرے متعلق ایسی ایسی باتیں کیں۔

حذیفہؓ ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چغل خور کے لیے جنت میں کوئی جگہ نہیں ہے" (فتح الباری: 474/10)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: "أی الإسلام أفضل؟ فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَبِدِّهِ" (متفق علیہ) ترجمہ: کونسا اسلام بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: "جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں"، مؤمنین کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو دوسروں کی عزت و تکریم میں داخل ہونے سے روکے، اور لغو باتوں سے اجتناب کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ كَانَ يَوْمًا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فليقل خيراً أُولِيصِتْ" (متفق علیہ) یعنی: "جو شخصی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے"۔

جو اپنی زبان کی حفاظت نہیں کرتا، اور کسی کی خبر یا باتیں کسی اور کے سامنے کھتا ہے، تو یہ تعلقات کو توڑنے اور لوگوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکانے کا سب سے بڑا اور راہم سبب بنتا ہے، خدا تعالیٰ نے بھی چغل خور کی مذمت کی ہے فرمایا: "وَلَا تُطْعُ كُلَّ خَلَافٍ

مَّهِينٍ * هَمَّازٍ مَّشَاءٍ بِنِيمٍ" (سورہ قلم: 10 - 11)۔ ترجمہ: "اور کسی ایسے شخص

کے کہے میں نہ آجانا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل طعنہ دینے والا چغل خور ہے۔"

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ایک باغ کے پاس سے گزر رہے تھے وہاں آپ نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں، جنہیں قبر میں عذاب دی جا رہی تھی، آپؐ نے فرمایا: "ان دو بندوں کو عذاب دیا جا رہا ہے، البتہ یہ کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں ہے، پھر آپؐ نے فرمایا: ہاں! ان کا گناہ بہت بڑا ہے، ان میں سے ایک اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا، اور دوسرا چغل خوری کرتا تھا" (فتح الباری: 317/1)۔

چغل خور کے متعلق ہمارا فرض کیا ہے؟

خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "۰۰۰ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝۳۶ (اسراء : ۳۶)" ترجمہ: "یقیناً کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باس پرس ہوگی۔"

اسی طرح فرماتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ۝۱ (سورہ حجرات: 6)" ترجمہ: "مؤمنو! اگر کوئی فرمان تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچادو پھر تم کو اپنے کیئے پر نادم ہونا پڑے۔"

جب بھی کوئی فاسق آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کرنی چاہیے، اور صرف اسے سن کر فوراً یقین کر کے اقدام نہ کیا جائے، کیونکہ تحقیق نہ کرنا او بات کو سن کر بلا تحقیق یقین کرنا بہت بڑے نقصان کا باعث ہوتا ہے، یہ انسان کے لیے گناہ کا مرتکب ہونے کا سبب بنے گا، کیونکہ اگر اس کی خبر کو کسی عادل اور دیانت دار کی خبر کی طرح مان لیا جائے تو اس کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، پھر جان و مال ناحق ضائع ہو جائیں گے، جس سے ندامت اور پشیمانی ہوگی، بلکہ کسی فاسق کی خبر سن کر اس کی تحقیق کرنی چاہیے، پھر اگر وجوہات و علامات اس کی صداقت اور سچائی پر دلالت کریں تو اس پر عمل کیا جائے اور اس کی تصدیق کی جائے، اگر دلائل وقرائن اس کے جھوٹا ہونے پر دلالت کریں تو اس کی تردید کی جائے۔

چغل خور سے متعلق ہوشیار رہنا

اگر چغل خور آدمی کسی کے لیے کوئی خبر لاتا ہے ، تو اس خبر کو سنتے ہوئے ذیل کے نکات کو لازمی مد نظر رکھنا چاہیے :

1 - چغلی والے آدمی کی بات کو نہیں ماننا چاہیے اور اس کی تصدیق نہیں کرنی چاہیے۔

2 - اس کو نصیحت کر کے اس عمل سے منع کرنا چاہیے۔

3 - اپنے غیر موجود بھائی کے متعلق برا گمان نہیں رکھنا چاہیے۔

اسے خود کو اس بات کی اجازت نہیں دینا چاہیے کہ چغل خور کی بات کسی اور کے سامنے دھرائے، یعنی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ فلان نے ایسا کہا، کیونکہ ایسا کر کے وہ خود بھی چغل خور بن جائے گا۔

ہر چیز کو سن کر اسے بیان نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کفی بالمرء إثماً أن يحدث بكل ما سمع" (روا ہ مسلم (5)) یعنی: "

ایک شخص کے گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو کچھ اس نے سن لیا اسے بیان کرے" یہ وہ مسائل ہیں کہ اگر انسان دل و جان سے انہیں سمجھ لے، تو دوسروں کو چغل خوری کے لیے کوئی موقع باقی نہیں رہے گا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل معاملہ برعکس ہے۔

1 - ایک مسلمان شخص کے متعلق چغل خور، غیبت کرنے والے اور برائی کرنے والے کی بات کو دھیان سے سنتے ہیں۔

2 - نہ صرف غیبت کو کان لگا کر سنتے ہیں، بلکہ غیبت سننے سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اور ساتھ ساتھ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ جس کی غیبت ہو رہی ہے اس کے بارے میں مزید بُری باتیں سُنیں۔

3 - سننے کے علاوہ، وہ خود بھی اس شخص کے ایسی باتوں کا ذکر کرنے لگتے ہیں کہ جو اس کو ناپسند ہیں، اس طرح غیبت سننے کے علاوہ خود بھی غیبت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

4 - چغل خور کی باتوں کی تائید بلکہ اس کی تحسین بھی کرتے ہیں، اور ایک اور غیر موجود مسلمان پر طعن کرتے ہیں۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30) سورة الفیل

یہ سورہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ، اس کی پانچ آیتیں ہیں

وجه تسمیہ:

اس سورت میں اصحاب فیل کا واقعہ ذکر ہونے کی وجہ سے اس کا نام "فیل" رکھا گیا ہے، یہ نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔ سورہ مبارکہ الفیل ایک عظیم تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے جزیرہ نما عرب کی تاریخ میں کافی مشہور تھا، یہ واقعہ اس پاک سر زمین پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور مہربانی کا اظہار تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے آخری نور اور نئے عقیدے کی افزائش گاہ کے لیے منتخب کیا تھا، اور ایک ایسا مقام ہو جہاں سے یہ نیا عقیدہ زمین کے دیگر خطوں کی طرف اپنی لشکر کشی کے مقدس مہم کا آغاز کرے، اور رہنمائی، سچائی، حق، نیکی، بھلائی اور اچھائی کو زمین کے چاروں اطراف میں پھیلا دے۔

سورت فیل کے نزول کا وقت

تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکی ہے، سورة الکافرون کے بعد اس کا نزول ہوا ہے، اگر اس کے تاریخی پس منظر میں نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

سورة الفیل کا سورة الہمزہ سے رابطہ و مناسبت

سورہ ہمزہ میں ایسے شخص کے بارے میں بحث کی گئی ہے جو عیب تلاش کرنے والا، طنز کرنے والا، اور ذخیرہ اندوز ہے، اس دھوکے میں رہتا ہے کہ وہ ہمیشہ رہے گا۔

اور سورة فیل میں اصحاب فیل کے واقعہ کا بیان ہے کہ وہ بہت مضبوط، مال دار مگر نافرمان تھے، خدا نے بزرگ و بر تر نے سب سے چھوٹے پرندے کے ذریعے انہیں کچل کر تباہ کر دیا اور وہ تمام دولت، طاقت، مقام اور مرتبہ ان کے کسی کام نہ آیا اور ان کی ہرچال ناکام ہو گئی۔

سورة الفیل کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

اس سورت میں ایک (۱) رکوع، پانچ (۵) آیتیں، چوبیس (۲۴) الفاظ، چورانوے (۹۴) حروف اور چھیالیس (۴۶) نقطے ہیں۔

سورة الفيل کا مکمل موضوع

یہ سورہ، جیسا کہ اس کے نام سے پتہ چلتا ہے، ایک مشہور واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مکہ میں اسلام کے عظیم پیغمبر محمد ﷺ کی ولادت کے سال پیش آیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے "خانہ کعبہ" کو کفار کے ایک بڑے لشکر سے محفوظ رکھا جو یمن سے ہاتھیوں پر سوار ہو کر آیا تھا۔

اس واقعے کو یاد دلانا متکبر اور ضدی کافروں کے لیے اللہ کی طرف سے تنبیہ اور سرزنش ہے کہ تم خدا کی قدرت کے سامنے ذرہ برابر بھی طاقت نہیں رکھتے، وہ خدا جس نے ہاتھیوں کی بڑی فوج کو ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے کچل دیا اور "جَارَّةٌ مِّن سِجِّيلٍ" چھوٹے کنکروں کے ساتھ، وہ اللہ اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ ان ضدی متکبروں کو سزا دے۔

سورة فیل دو حصوں پر مشتمل ہے:

پہلا حصہ: آیات "1 اور 2" اس سازش کے بارے میں بحث ہے کہ، جب زمین پر خدا کی حکمرانی کے مرکز کو ختم کرنے کے لیے کوشش کی گئی یعنی: خدا کے گھر بیت اللہ کو کیسے بے اثر کیا جائے، کیونکہ روئے زمین پر ایسے بندے نہیں تھے جو خدا کے دین اور اس کی حکمرانی کے مرکز کا دفاع کرتے تو خدا تعالیٰ نے خود براہ راست عملی اقدام کیا اور یہ خدا تعالیٰ کی سنت اور طریقہ ہے، پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی اس کے دین کے دفاع کے لیے کوئی نہیں ہوتا تو وہ خود براہ راست مداخلت دین دشمن قوتوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

دوسرا حصہ: تیسری آیت سے سورت کے آخر تک، سازش کرنے والوں کو تباہ کرنے کے بارے میں ہے، کمزور سازش کرنے والوں نے اپنے خیال کے مطابق بہت بڑے اور طاقتور ذریعے کو اللہ کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا اللہ نے کمزور ترین ذریعے کو ان کے طاقتور اسباب کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا، اور یہ بتادیا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی طرح نہیں ہے کہ طاقتور اور مضبوط ذرائع و اسباب کا محتاج ہو، بلکہ وہ کمزور ترین اسباب سے بھی بڑے کام لیتا ہے، جبکہ انسان سے اگر اس کے ذرائع و اسباب چھین لیے جائیں تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ اصحاب فیل کا واقعہ 570ء میں پیش آیا، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے "576ء" سال بعد، دشمن نے منصوبہ بنایا کہ اس

مرکز کو جو مسلمانوں کے اجتماع اور اتحاد کی جگہ ہے، اسے روئے زمین سے مٹا دے۔

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"الْمُرْتَر" کیا نہیں دیکھا تو نے؟ دیکھنے سے مراد، سننا اور با خبر ہونا ہے،) ملاحظہ کیا جائے: بقرہ آیات "243 اور 258 فجر: 6)۔ مخاطب اگر چہ پیغمبر ہیں، لیکن عام لوگ مراد ہیں، "اصحاب الفیل" ہاتھی والے، "الْمُيَعَّل" کیا نہیں بنا یا؟ "كَيْد" چال، سازش، "تَضْلِيل" (ضل): الجھنا، بگاڑنا، بے اثر ہونا، منزل سے ہٹ جانا۔

"طَيْرًا" پرندے، جمع اور مفرد دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، "أَبَابِيل" جھنڈ اور گروہ کے بعد گروہ، یکے بعد دیگرے اور پے در پے گروہ، "سَجِيل" سنگ اور گل کا معرب، وہ مٹی جو پتھر بن گیا ہو، (متحجر) مٹی جو سخت اور مضبوط ہوئی ہو، "كَعَصِفٍ" بھس، سوکھی گھاس، بوسیدہ درخت کا پتا، گندم اور جو کا بھوسا وغیرہ (رحمن: ۱۲) "مَأْكُولٍ" آفت زدہ اور کیڑے کا کھا یا ہوا، "كَعَصِفٍ مَأْكُولٍ" آفت زدہ پتا اور کیڑے کا کھا یا ہوا، چبایا ہوا پتا، اور جانوروں کے منہ سے گرا ہوا وہ پتا جس کا بیج کھایا گیا ہو، اور بھوسے میں تبدیل ہو گیا ہو، (روح البیان)۔

اصحاب فیل کا واقعہ (ہاتھی کی سواری)

اصحاب فیل کا واقعہ (ابرہہ اور اس کا لشکر) عبرت والے تاریخی، معجزانہ اور مشہور واقعات میں سے ہے کہ قرآن عظیم کے تمام واقعات میں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اس سورت کے موضوع، مشتملات اور انداز بیان سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس کی پانچ (۵) آیتیں ہیں۔

یاد رہے کہ یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کی ولادت کے سال پیش آیا تھا، رب عظیم نے کعبہ کو یمن سے ہاتھیوں پر سوار ہو کر آنے والے بڑے لشکر کے شر سے بچایا، یہ واقعہ جو "اصحاب فیل" کے نام سے مشہور ہے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ولادت کے سال پیش آیا تھا۔

مفسرین اس واقعے کی ابتدا کی بارے میں لکھتے ہیں: یمن پر برسوں تک حکومت کرنے والے بادشاہوں میں سے ذونواس نے ایک دن "یثرب" شہر کا سفر کیا، وہ اس سفر میں مدینہ سے ہجرت کر کے آنے والے یہودیوں کے پروپیگنڈے سے بہت زیادہ متاثر ہوا، یہودیوں کے پروپیگنڈے کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ ذونواس نے اپنے آبائی دین بت پرستی کو چھوڑ کر دین یہودیت قبول کر لیا۔

اس نئے دین کو ذونو اس کے دل میں گہرا اثر ڈالنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، اور یہ جنونی یہودیوں میں شامل ہو گیا، اس کی مذہبی انتہا پسندی اس حد تک پہنچ گئی کہ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا جزیرہ نما عرب کے سارے قبائل کو اور خاص طور پر وہ شہر جو اس کی سلطنت کے ماتحت ہے، دین یہود میں داخل کرے، اس لئے باقائدہ منصوبے کے تحت دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو طرح طرح کی اذیتوں اور جبر کا نشانہ بنایا، تاکہ اس دباؤ کے نتیجے میں لوگوں کو دین یہودیت قبول کر لیں، اور اس کی تابعداری کریں، ذونو اس اپنے دعوتی پروگرام کو بہت کم وقت میں چالاکی سے نافذ کرنے میں کامیاب رہا اور عربوں کی بڑی تعداد کو دین یہودیت میں داخل کر لیا۔

یمن کے شمالی اور پہاڑی شہروں میں سے ایک شہر "نجران" کے لوگوں نے کچھ عرصہ قبل مسیحیت کو قبول کر لیا تھا، اور اس کا اثر ان کے روحوں پر پڑا، تو انہوں نے اس مذہب کا بھرپور دفاع کیا، اسی وجہ سے انہوں نے ذونواس کی خلاف بغاوت کی، اور اس یہودی کی اطاعت سے انکار کر دیا۔

ذونواس کو نجران کے لوگوں کی یہ بغاوت پسند نہیں آئی، ان کے اس عمل سے وہ ناراض تھا، اس لیے انہیں اذیت دینے اور یہودی مذہب کو قبول کرنے پر مجبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ذونواس نے اپنے مذہبی مقصد کی تکمیل کے لیے ایک بڑی خندق کھودنے اور اس میں بہت زیادہ آگ جلانے کا حکم دیا۔

اور جو لوگ یہودی مذہب کے بنیادی اصولوں کے مخالفت کرتے، انہیں اس آگ میں جلاجاتا۔

ذونواس کے مبلغین نے نجران کے عیسائی پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد کو اس کھائی میں جلا دیا، اور متعدد لوگوں کو تلوار سے مار کر ان کے

ہاتھ، پاؤں، کان اور ناک کٹوا دیے، اور اپنا مذہب اہل نجران پر مسلط کر دیا۔

مؤرخین نے ان مذہبی مظالم میں ہلاکتوں اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۲۰ ہزار تک بتائی ہے جو اس زمانے کے آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ تھی، قرآن کریم کے مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے مطابق اصحاب اخدود کا جو قرآن پاک کی سورہ بروج میں ذکر ہے، وہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

لفظ "اخدود" زمین میں ایک بڑے گڑھے اور خندق کا معنی دیتا ہے، "اصحاب اخدود" وہ ظالم اور جابر تھے جو زمین کو کھودتے تھے اور اسے آگ سے بھر دیتے تھے، اور مؤمنین کو ایمان کے جرم میں اس میں پھینکتے تھے اور آخری شخص تک کو جلا دیتے تھے۔

"الاخدود" ایک شہر ہے جو نجران کے جنوب میں یمن کے ملک میں ہے جس کا ذکر قرآن عظیم میں سورہ بروج (آیت: ۳) میں ہوا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ اس شہر کے لوگ "یوسف ذی نواس" کے حکم پر اصحاب اخدود کی ظالمانہ آگ میں جلا دیئے گئے۔

مؤرخین لکھتے ہیں: کہ اس بادشاہ کا اصل نام: "یوسف ذی نواس بن زرعہ بن تبار اسعد ابوبکر" اور اس کا لقب "ذونواس" تھا، مؤرخین یہ بھی اضافہ کرتے ہیں: کہ ان مظالم کی گرفت میں نجران کے علاقے کے عیسائی رہنماؤں میں سے ایک رہنما اس جنگ اور قتل عام سے بچنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس کو اتنا موقع ملا اور وسائل دستیاب ہوئے کہ خود کو ذونواس کے سپاہیوں کے شہر سے مخفی رکھے اور شہر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو۔

یہ شخص قسطنطنیہ میں شہنشاہ کے دربار میں پہنچا، اور نجران کے عیسائیوں کے قتل عام کی داستان رومی بادشاہ کو سنائی اور مدد مانگی اور "ذونواس" سے بدلہ لینے کی درخواست کر دی۔

رومی شہنشاہ اس غم انگیز واقعے کا سن کر بہت سخت متاثر ہوا، درخواست کے جواب میں کہا: آپ کا ملک جغرافیہ کے لحاظ سے ہم سے بہت دور ہے، لیکن میں حبشہ کے بادشاہ "نجاشی" کو خط لکھتا ہوں تا کہ اس معاملے میں آپ کی مدد کرے، قسطنطنیہ کے شہنشاہ نے نجاشی کے دربار میں ایک خط بھیجا، نجاشی نے یہ خط پڑھ کر ایک بڑا لشکر (ساٹھ سے ستر ہزار آدمی) یمن کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کی کمان اور سربراہی "ابرہہ نامی

شخص کو دی گئی، جو "صبح" کا بیٹا اور اس کی کنیت ابو یکسوم تھا، ہکذا ایک اور روایت کے مطابق نجاشی نے اس لشکر کی سربراہی اور کمان میں "ارباط" نامی شخص کو مقرر کیا، اور "ابرہہ کو" جو کہ ایک جنگجو سپاہی تھا اس کے ساتھ کر دیا۔

"ارباط" کو حبشہ سے بحیرہ احمر کے کنارے تک، اور وہاں سے کشتیوں کے ذریعے یمن کے خطے تک پہنچاتا تھا۔

ذونواس کو جب اس معاملے کا پتا چلا تو وہ یمنی قبائل پر مشتمل ایک فوج اپنے ساتھ لے کر حبشیوں سے لڑنے کے لیے آیا، اور جب جنگ شروع ہوئی تو ذونواس کی فوج حبشہ کے لوگوں کے خلاف مزاحمت کرنے میں ناکام رہی، اور شکست کھا گئی، اور ذونواس اس شکست کو برداشت نہ کرتے ہوئے خود کو سمندر برد کر دیا اور سمندر میں غرق ہو گیا۔

حبشہ کے لوگ یمن میں داخل ہوئے، اور کئی سال تک وہاں حکومت کرتے رہے، "ابرہہ نے" کچھ عرصہ بعد "ارباط" کو قتل کر کے خود اس کا جانشین بن گیا، اور یمن کے لوگوں کو اپنا تابع بنایا، اور نجاشی کو جو کہ "ارباط" کے قتل کرنے سے غصہ میں تھا کسی طریقے سے راضی کر لیا۔

اس دوران جب "ابرہہ" یمن میں تھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس علاقے کے عرب خواہ وہ بت پرست ہوں یا مشرک یا دوسرے، مکہ اور خانہ کعبہ کی طرف خاص توجہ دیتے ہیں، چنانچہ ان کی نظروں میں کعبہ کا خاص احترام ہے اور ہر سال ایک بڑی تعداد میں یمنی لوگ خانہ کعبہ جاتے ہیں اور قربانی کرتے ہیں، اس نے دھیرے دھیرے سوچا کہ مکہ کا یہ روحانی اور معاشی اثر اور کعبہ کی زیارت سے جو تعلق قبائل عرب نے ایجاد کیا ہے، ایک دن اس کے لیے اور دوسرے حبشیوں کے لیے جو جزیرہ نما عرب اور ملک یمن میں آباد ہوئے تھے کسی پریشانی کا باعث بن سکتی ہے، یعنی ان کو یہاں سے نکال باہر کرنے کا سوچ سکتے ہیں۔

لہذا اس پریشانی کو ختم کرنے کے لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو یمن میں ایک شاندار ہیکل تعمیر کرے، اور اس کی خوبصورتی، تزئین اور آرائش میں خوب محنت کرے، اور اس علاقے کے عربوں کو جس طریقے سے بھی ہو اس کی طرف متوجہ کرے اور کعبہ کی زیارت سے روکے۔

ابرہہ نے یمن میں اس مقصد کے لیے جو معبد، ہیکل تعمیر کیا اس کا "قلیس" نام

رکھا، اور اس کے تعظیم، احترام اور آرائش و خوبصورتی میں آخری حد تک کوشش کی، لیکن اس کی برسوں کی کوششوں کا اس کو معمولی نتیجہ بھی نہیں ملا، اس نے دیکھا کہ عرب اب بھی خلوص، شوق اور جذبہ کے ساتھ ہر سال کعبہ کی زیارت اور حج کے فرائض انجام دینے کے لیے مکہ مکرمہ جاتے ہیں، اور اس کے شاندار معبد پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔

اس کے برعکس ایک دن اس کو اطلاع ملی کہ "کنانہ" کے اعراب میں سے ایک شخص "قلیس" کے معبد خانے میں گیا، اور اسے گندگی سے آلودہ کر کے واپس اپنے شہر کی طرف چلا گیا۔

تفسیر "جلوہ های از اسرار قرآن" کے مفسر لکھتے ہیں: "کہتے ہیں کہ القلیس کے کلیسا کی توہین کی گئی ہے، عبادت گاہ کے اندر کچرا پھینکا گیا، یا اس کے کسی حصے کو آگ لگا دی گئی، بعض لوگ اسے ابرہہ کے اعلان کے خلاف قریش کا جوانوں کی ردعمل سمجھتے ہیں، اور بعض لوگ اسے سازش کہتے ہیں جو عیسائیوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے کی گئی تھی۔"

بہر حال اس واقعہ کے بعد ابرہہ کے مشہور ترین مذہبی مرکز میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، اس نے مکہ جاکر خانہ کعبہ کو تباہ کرنے اور یمن کی روحانی اور اقتصادی طاقت کو بحال کرنے کا خود سے عہد کر لیا۔

ابرہہ (۵۷۰-۵۷۱) عیسوی میں ساٹھ سے ستر ہزار افراد پر مشتمل لشکر جس میں "۹ یا ۱۳" ہاتھی بھی تھے شہر مکہ کی طرف لے چلا، عربوں کو جب ابرہہ کے فیصلے کا علم ہوا، تو انہوں نے حملے کو پسپا کرنے کے لیے اپنی جنگی تیاریاں شروع کیں، اسی دوران یمنی عوام کے ایک مشہور شیخ "ذونفر" کے نام سے اپنے لوگوں کو کعبہ کے دفاع کے لیے بلایا اور دوسرے عرب قبائل کو بھڑکایا، اور ایک تقریر کے ذریعہ ان کی غیرت اور جذبے کو بیدار کیا کہ خدا کے دشمن خدا کے گھر کے خلاف لوگوں کا ایک گروہ لے کر ابرہہ کے خلاف جنگ کے لیے آ رہا ہے۔

لیکن اس کی فوجوں میں ابرہہ کے منظم فوجوں کے خلاف لڑنے کی قابلیت نہیں تھی، اس کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود ابرہہ کی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور جب اسے ابرہہ کے پاس لایا گیا تو اس نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا، تو ذونفر نے یہ دیکھ کر کہا: مجھے قتل مت کرو، شاید میرا زندہ رہنا تیرے لیے فائدہ مند ہو۔

بعد اس کے کہ ذونواس کی قوتیں جنگ میں شکست کھا گئیں تو یمنی قبائل کے ایک اور شخص "نفیل بن حبیب خثعمی" کے نام سے جہاد کا علم اٹھایا خانہ کعبہ کے دفاع کے لیے، ابرہہ کے فوجوں سے مقابلہ کے لیے کمر کس لی، ختم قبائل کے بہت سے آدمیوں کے ساتھ ابرہہ کے خلاف جنگ کے لیے آیا، لیکن وہ بھی "ذونفر" کے انجام سے دو چار ہوا اور ابرہہ کی فوجوں کے ہاتھوں قیدی بن گیا۔

ابرہہ کے فوج کے خلاف قبائل کی پے در پے شکست سبب بنی کے دوسرے قبائل کے لوگوں نے ابرہہ کے راستے میں آنے اور جنگ کرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور اس کی تابع داری اور فرمانبرداری کرنے میں عافیت جانی، ان میں سے ایک ثقیف قبیلہ تھا جو طائف میں رہتا تھا، جب ابرہہ آیا تو خوشامد اور چاپلوسی کے لیے اپنی زبان کھولی کہ ہم آپ کے فرمانبردار ہیں، اور مکہ پہنچنے اور آپ کو اس مقصد کے حصول کے لیے راستہ دکھائیں گے، ایک راستہ بتانے والا بھی آپ کے ساتھ کر لیں گے، یہ کہنے کے بعد ایک شخص "ابو رغال" کے نام سے اس کے ساتھ بھیج دیا، ابورغال نے ابرہہ کے لشکر کی مکہ سے چار کیلو میٹر دور "مغمس" کے مقام تک رہنمائی کی، وہاں پہنچنے کے بعد "ابورغال" بیمار ہو گیا، اور فوت ہو گیا اور انہوں نے اسے وہیں دفن کر دیا، جیسا کہ ابن ہشام لکھتے ہیں: اب جو لوگ وہاں پہنچتے ہیں وہ ابورغال کی قبر کو پتھر مارتے ہیں، جیسے ہی ابرہہ "مغمس" پہنچ گیا، اپنے سرداروں میں سے ایک سردار "اسود بن مقصود" کو مقرر کر دیا کہ اس علاقے کا مال مویشی لوگوں سے جمع کرے، اور ان کے ساری جائیداد اور مویشی ابرہہ کے پاس لے آئے۔

"اسود" اپنے سپاہیوں کو ایک کثیر تعداد کے ساتھ اس علاقے کی چاروں طرف لے گیا اور جہاں مال مویشی یا اونٹ ملے سب کو جمع کر کے قبضہ کر لیا اور ابرہہ کے پاس لے آیا۔

مؤرخین لکھتے ہیں ان اونٹوں میں دوسو اونٹ عبدالمطلب کے تھے، جو مکہ کی اطراف میں چر رہے تھے، "اسود" کے سپاہی ان کو ابرہہ کے پاس لے گئے، قریش کے سرداروں کو جب اس کی اطلاع ملی تو پہلے انہوں نے چاہا کہ ابرہہ کے ساتھ لڑکر اپنا قبضہ شدہ مال مویشی دوبارہ لے لیں، لیکن جب ان کو ابرہہ کے لشکر کی تعداد کے بارے میں معلوم ہوا تو اس ظالم کے تابع ہو گئے۔

اس موقع پر ابرہہ نے ایک شخص جس کا نام "حناطہ" حمیری تھا کو مکہ بھیج دیا، اور اس سے کہا کہ: تو مکہ شہر جاؤ اور قوم کے سرداروں کو پہچاننے کے بعد ان سے بات کر کے بتاؤ ہم مکہ میں جنگ لڑنے اور خونریزی کرنے نہیں آئے ہیں، بلکہ ہمارے آنے کا صل مقصد خانہ کعبہ کو ڈھانا ہے، اگر تم لوگ ہمارے کام میں رکاوٹ نہ بنو تو ہمیں تمہاری جان سے کوئی سروکار نہیں ہے، اور آپ لوگوں کے خون بہانے کا ارادہ نہیں ہے جب حناطہ اس مقصد کے لیے نکلنے لگا، اس سے کہا: اگر تو نے اندازہ لگایا یا محسوس کیا کہ قوم کے سرداروں کا ہم سے لڑنے کا ارادہ نہیں ہے تو انہیں میرے پاس لے آؤ۔

حناطہ دی گئی ذمہ داری کا حکم ملنے کے بعد شہر مکہ کی طرف روانہ ہوا، جب شہر مکہ پہنچ گیا تو اس نے قوم کے سرداروں اور بڑوں کو تلاش کرنا شروع کیا، مکہ کے باسیوں نے اس کو سیدھا عبدالمطلب کے گھر بھیج دیا، اس نے عبدالمطلب کے پاس پہنچ کر ابرہہ کا پیغام سنایا، اور اس سے کہا کہ: ابرہہ کہتا ہے کہ: میں اہل مکہ سے جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، میں آیا ہوں صرف کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے، اگر میرے اس مقصد کو مانتے ہو تو مذاکرات اور جرگہ کے لیے اپنا نمائندہ میرے پاس بھیج دو، اسی دوران اہل مکہ نے ایک مشاورتی جلسہ منعقد کیا، اور اس منصوبے کے بارے میں مشترکہ فیصلہ کیا، مکہ کے سرداروں نے ابرہہ کے اس دھمکی آمیز خط کے بعد عبدالمطلب کو مذاکرات کے لیے ابرہہ کے پاس بھیج دیا، عبدالمطلب نے جواب میں کہا: خدا کی قسم ہم ابرہہ کے ساتھ جنگ کا خیال نہیں رکھتے اور اس سے جنگ کرنے کی طاقت بھی ہم میں نہیں ہے، یہ تو خدا کا گھر ہے اگر خدا تعالیٰ چاہے تو اس کی تباہی کو روکے گا، نہیں تو خدا کی قسم ہم ابرہہ کو شکست نہیں دے سکیں گے۔

اس دوران عبدالمطلب اپنے چند فرزندوں کے ساتھ محاذ جنگ پر ابرہہ کی طرف چلے گئے، اس سے پہلے کہ عبدالمطلب ابرہہ کے کیمپ پہنچے اور ابرہہ سے ملے "ذونفر" نامی شخص کو عبدالمطلب کی آمد کا علم ہوا، اس نے ابرہہ کے پاس کسی کو بھیجا اور اسے عبدالمطلب کی عظیم شخصیت کے بارے میں آگاہ کیا اور ان سے کہا: یہ شخص قریش کا پیشوا اور سربراہ ہے، اور اس سرزمین کے عظیم ہستیوں میں سے ہے، اور وہ ایسا شخص ہے جو اس علاقے کے لوگوں کو اور صحرا کے حیوانات کی دیکھ بال کرنے والا اور پالنے والا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عبدالمطلب مبارک داڑھی، چوڑا کندھا، روشن اور پرکشش چہرے والے مضبوط آدمی تھے، جیسے ہی عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے تو ابرہہ اسے دیکھ کر بہت متاثر ہوا، کہتے ہیں کہ ابرہہ اپنے تخت سے نیچے اترا اور عبدالمطلب کے احترام میں ان کے مشیروں کے مشورے کے مطابق زمین پر ان کے قریب بیٹھ گیا، سلام کرنے کے بعد ابرہہ نے عبدالمطلب سے بات شروع کی، اور ان کے سامنے اپنا مقصد جو کہ کعبہ کے تباہی تھی پیش کر دیا۔

عبدالمطلب نے ابرہہ کی باتوں کو غور سے سنا اور اس کی گفتگو کے درمیان اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا، کچھ بھی نہیں کہا، ابرہہ نے گفتگو کے اختتام پر عبدالمطلب کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اگر آپ کی مجھ سے کوئی درخواست ہے تو کہہ سکتے ہیں، عبدالمطلب نے ابرہہ کے ترجمان سے کہا: تمہارے لشکر اور سپاہیوں نے میرے دوسو اونٹ لوٹے ہیں، ان کو ہدایت کریں کہ وہ مجھے واپس کر دیں۔

عبدالمطلب کی اس درخواست پر ابرہہ بہت حیران ہوا، اور مترجم سے کہا: عبدالمطلب سے کہو: جب میں نے تمہیں دیکھا تو میرے دل میں تمہاری عظمت پیدا ہوئی، لیکن جب میں نے تمہیں اپنے مال کے بارے مطالبے کی بات کرتے ہوئے سنا تو تیری عظمت میرے سامنے کم ہوئی، حیرت ہے کہ آپ اپنے اونٹوں کی واپسی پر اصرار کر رہے ہو، لیکن کعبہ جو تمہارے اور تمہارے باپ دادا کی عبادت گاہ ہے، اور میں نے اب اس کی ویرانی اور تباہی کے لیے کمر کس لی ہے تم کوئی بات نہیں کرتے۔

عبدالمطلب نے ابرہہ کو جواب دیتے ہوئے کہا: "اناربالابل وان للبيت رباً سيئنه!" ("میں ان اونٹوں کا مالک ہوں جن کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہوں، اور اس گھر کا مالک ہے جو کہ خود اس کی حفاظت کرے گا)۔

واقعی ایسا ہی ہوا، جب ابرہہ کی فوج وادی محسر کے علاقے میں پہنچی تو ابابیلوں نے ابرہہ کے لشکر پر حملہ کر دیا، (تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ) انہوں نے ابرہہ کی غاصب فوج پر پتھر برسانا شروع کر دیے اور ابرہہ کی اس ساٹھ (۶۰) سے ۷۰ ستر ہزار افراد پر مشتمل فوج کو شکست و ریخت سے دوچار کیا، اور کعبہ کو تباہی و بربادی سے بچالیا، یہ ایک آسمانی معجزہ ہے جو وادی محسر میں کعبہ کے دفاع میں پیش آیا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد ابرہہ نے عبدالمطلب کے اونٹ اور مویشی ان کو واپس کرنے کا حکم دیا، عبدالمطلب بھی اپنے اونٹ لے کر مکہ پہنچے، اور جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو شہر کے لوگوں اور قریش کو حکم دیا کہ وہ وہاں سے چلے جائیں، اور شہر کو خالی کر دیں،

پہاڑوں اور مکہ کے اردگرد کی وادیوں میں پناہ لے لیں، تاکہ اپنے بچوں اور اہل خانہ کی جان ابرہہ کے فوجوں سے محفوظ رکھیں۔
مکہ مکرمہ کو خالی کرنے کے حکم کے بعد عبدالمطلب قریش کے کئی سرداروں کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آیا اور خانہ کعبہ کے دروازے کو پکڑ رستے آنسوؤں اور غم سے نڈھال دل کے ساتھ گریہ و زاری کرنے لگا، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کو ہلاک اور نابود کر دے، اس کے الفاظ جو نظم کی صورت میں کہے یہ دو شعر ہیں:

یارب فامنع منهم حماکا

یارب لا ارجو لهم سواکا

امنعهم ان یخربوا قراکا

ان عدو البیت من عاداکا

اے رب! مجھے ان کے مقابلے کے لیے تیرے سوا کوئی امید نہیں ہے، اے رب! ان سے اپنی حمایت اور مہربانی کو روک دے کیونکہ گھر کا دشمن وہی ہے جو تجھ سے دشمنی رکھتا ہے، اور تو ان کو اپنے گھر کو تباہ کرنے سے روک۔

کعبہ میں خلوص کے ساتھ دعا کرنے کے بعد وہ خود اور ان کے ساتھی اردگرد کے پہاڑوں پر لوگوں کے پیچھے چلے گئے، اور انتظار کرنے لگے کہ ابرہہ اور خانہ کعبہ کا کیا بنتا ہے۔

کعبہ پر حملے کا مقررہ دن

کعبہ پر حملے کا وعدہ شدہ دن آنے کے بعد ابرہہ کی فوج منیٰ اور مروہ کے درمیان وادی محسر میں پہنچ گئی، ابرہہ کا جنگی ہاتھی جس کا نام محمود (ماموت) تھا سپاہیوں کے آگے آگے چل رہا تھا، اچانک آگے بڑھنے سے رک گیا، کعبہ کی طرف جانے سے انکار کیا، تو انہوں نے اسے ڈنڈوں سے مارا اور تیز دھار والے لوہے سے مارا، لیکن (ماموت) نے کعبہ کی طرف جانے سے انکار کیا، ابرہہ کی افواج کی شکست کا پہلا نشان حملے کے پہلے گھنٹے میں ظاہر ہوا۔

ابابیلوں کی آمد

مفسرین لکھتے ہیں کہ: ابرہہ کی فوجی دستے ابھی ہاتھی کو قابو کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک ابابیل سمندر کی طرف سے وادی محسر پر امنڈ آئے، ان ابابیلوں میں سے ہر ایک نے اپنی چونچ اور پنجوں میں کنکریاں اٹھا کر لشکر پر حملہ کر دیا، یہ کنکریاں جس کو بھی لگتیں وہ شدید زخمی ہو جاتا، اور اس کے زخموں سے خون اور پیپ جاری ہوتا، اس کا گوشت سڑ کر گر جاتا، کچھ زخمی ہو گئے، کچھ نے بھاگنے کو ترجیح دی۔

ابرہہ خود بھی اس خوفناک عذاب اور غضب الہی سے محفوظ نہ رہا، اور اس کے سر پر ایک کنکری پڑی، اور جب اس نے یہ حالت دیکھی تو اس نے چند لوگوں کو حکم دیا جو محفوظ رہے تھے کہ اسے واپس یمن کی طرف لے چلیں، بہت کوشش اور تکلیف کے ساتھ یمن پہنچا، اس کے جسم کا گوشت سڑ کر گرا، اور انتہائی کمزوری اور بے بسی کی حالت میں مر گیا۔

عبدال مطلب جو اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کو خانہ کعبہ کی حفاظت کے لیے بھیجا ہے، ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کا وقت آن پہنچا ہے، اس نے بلند آواز سے لوگوں کو کعبہ کے دشمنوں کی تباہی کی خوش خبری سنادی، اور ان سے کہا کہ: اپنے شہر اور گھروں کی طرف لوٹ جائیں، اور ان سے بچا ہوا مال غنیمت لے جائیں، لوگ خوشی اور جوش کے ساتھ شہر کو لوٹے۔

کہتے ہیں کہ: اس دن اہل مکہ کو بہت مال غنیمت ملا، اور قبیلہ خثعم جو لوٹ مار میں دوسرے قبیلوں سے زیادہ لالچی تھا دوسروں سے زیادہ مال غنیمت لے گیا، اور بہت سونا، چاندی، اونٹ اور گھوڑے ان کے ہاتھ لگے۔

بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ: ابرہہ کی فوج میں چیچک کی بیماری پھیلی گئی، جو بہت سے فوجیوں کی ہلاکت کا سبب بنی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُورَةُ الْفِيلِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيلِۙ ۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍۙ ۲ وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًاۙ اَبَابِيلَۙ ۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍۙ ۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّا كُوِلَۙ ۵

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيلِۙ ۱	تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍۙ ۲	کیا اس نے ان کی تدبیر کو بے کار نہیں کر دیا
وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًاۙ اَبَابِيلَۙ ۳	اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دیے
تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍۙ ۴	جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّا كُوِلَۙ ۵	تو ان کو ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھس ہو

سورت کی تفسیر

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيلِۙ ۱	تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟

خدا تعالیٰ نے اس سورت کی ابتداء اور شروع لفظ "اَلَمْ" سے کیا ہے، ان وجوہات کی بنیاد پر:

- 1 - خبر دینے کے لیے۔
- 2 - قریش پر احسان جتنا، اور کعبہ کی حفاظت جیسی نعمت کا ذکر، پھر نعمت کا عملی شکر۔

اے پیغمبر! کیا آپ نے مشاہدہ نہیں کیا، نہیں دیکھا، نہیں سنا کہ رب نے اصحاب فیل ہاتھیوں پر سوار ہو کر آنے والے لشکر کے ساتھ یعنی (ابرہہ کا لشکر جو کعبہ کو ڈھانے آیا تھا) کیا کیا؟ آیت مبارکہ کا خطاب بظاہر پیغمبر ﷺ سے ہے، لیکن درحقیقت مخاطب صرف قریش ہی نہیں بلکہ تمام عرب کے لوگ ہیں، جو اس واقعہ سے بخوبی واقف تھے، قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں "الْمُرَّةَ" (کیا تم نے نہیں دیکھا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان سے مراد صرف رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرنا نہیں بلکہ تمام لوگوں کو مخاطب کرنا ہے۔

یہاں پر "الْمُرَّةَ" کا جملہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اس وقت مکہ اور اس کے اطراف میں، اور عرب کے ایک وسیع علاقے میں مکے سے یمن تک لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جنہوں نے اصحاب فیل کی تباہی کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ ابھی تک زندہ تھے، کیونکہ اس واقعہ کو تقریباً چالیس سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا، اور تمام عربوں نے اس واقعہ کی مسلسل خبریں ان لوگوں سے سنی تھیں، جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے ان کے لیے بھی یہ واقعہ ایسا ہی تھا جیسا اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔

یہ دکھائی دینے والا اور محسوس معجزہ ہے، تنبیہ اور عبرت حاصل کرنے کے لیے، تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی طرف متوجہ ہوں۔

مفسر ابو سعود لکھتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی توجہ اپنے عمل کے معیار کی طرف مبذول کروائی ہے اور فرمایا: "كَيْفَ فَعَلَ" یہ نہیں کہا کہ: "الْمُرَّةَ مَا فَعَلَ رَبُّكَ" اس حقیقت کو یاد دلانے کے لیے کہ ایک بہت ہی خوفناک منظر پیش آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک عجیب و غریب طریقے سے تباہ کر دیا تھا جو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کی نشاندہی کرتا ہے، اور اس کے علم و حکمت کے کمال کو ظاہر کرتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی شان کو ظاہر کرتا ہے، اس واقعہ کو (نبوت کے تمہیدی آثار: وہ حیران کن واقعات جو نبی کو نبوت ملنے سے پہلے درپیش آئیں) میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ روایت ہے کہ یہ واقعہ پیغمبر ﷺ کی ولادت کے سال پیش آیا تھا۔

کیا اس نے ان کی تدبیر کو بے کار نہیں کر دیا

الْمُرَّةَ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝۲

کیا اس نے انہیں تباہ نہیں کیا؟ کیا خانہ کعبہ کو ڈھانے کی ان کی کوشش بے سود لا حاصل او برباد نہیں ہوئی؟ کیا ان کے حیلوں اور چالبازیوں کو بے فائدہ نہیں بنایا اور نتائج کو ان کے اپنے نقصان میں نہیں بدلا؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ رب نے ابرہہ کا تیر نشانے پر لگنے نہیں دیا۔

بلکہ جو پتھر انہوں نے کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے اٹھایا تھا اللہ ان کے اپنے پاؤں پر لگا، انہوں نے کعبہ کی عزت و عظمت کو کم کرنے کا سوچا تھا، کہ اسے تباہ کریں منہدم کر دیں، اس مقصد کے لیے اس نے ایک بڑی اور اچھی فوج تیار کی تھی، انہوں نے فوجی مہم کے لیے ایک بہانہ بنایا، اپنے سپاہیوں کے جذبات کو مذہبی بہانوں سے کعبہ پر فوری حملہ کے لیے اکسایا تھا، آپ لوگوں نے دیکھا کہ خدا تعالیٰ جو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، اس خدا نے ابرہہ کے منصوبے کو نا کام بنادیا، اور اس کے لیس فوج کو نابود کر دیا، اس کے رومی حامیوں کو بے بس اور لا چار کر دیا: ابرہہ کی مسلح افواج کی شکست اور بربادی نے نہ صرف خانہ کعبہ کی ساکھ اور حیثیت کو بچالیا، بلکہ ہر ایک پر یہ ثابت کر دیا کہ اس مقدس گھر اور یکتا پرستوں کی عبادت خانے کا مالک خدا کسی بھی حملے کے خلاف اس کا دفاع کرے گا، "تَضْلِيلٌ" ضلل کے مادہ سے ہے، ضلل، یضلل تضلیلا، الجھانے کے معنی میں ہے، مقصد سے ہٹ جانا، یہاں بے اثر کرنے کا معنی مناسب ہے۔

کیونکہ جب کوئی شخص پروگرام کے مطابق اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ایک راستے پر چل پڑتا ہے، لیکن باہر سے کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے، اور اسے راستے سے ہٹا دیتی ہے، یا روک دیتی ہے تو اسے کہتے ہیں: تضلیل: کسی کو اس مقصد سے ہٹانا یا الجھا دینا، جس کی طرف وہ جانا چاہتا ہے۔

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝۳	اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دیے

اپنے سپاہیوں میں سے ان پر پرندے مسلط کر دیے جو جھنڈ کے جھنڈ یکے بعد دیگرے آئے اور ہر طرف سے انہیں گھیر لیا "ابابیل" کسی خاص پرندے کا نام نہیں ہے، "طَيْرًا أَبَابِيلَ" یعنی پرندے فوج در فوج، جھنڈ کے جھنڈ مختلف گروہ کی شکل میں، ان پر ٹوٹ پڑے، تو پھر لفظ "طَيْرًا" پرندوں کے جنس کے معنی میں ہے، نہ کہ منفرد کے معنی میں پرندہ۔

مفسرین "ابل" اور ابابیل کی تفسیر میں مختلف معنی پیش کرتے ہیں، مفسرین میں سے ہر ایک نے ان پرندوں کی شکل و صورت کے بارے میں مختلف تفسیریں کی ہیں:

مفسرین ابابیل پرندوں کی تفسیر میں کہتے ہیں:

وہ ایسے پرندے جو سمندر سے باہر آئے تھے، اور ابرہہ کے سپاہیوں کو ان پتھروں سے جو ان کی چونچ میں تھے مارا اور ہلاک کردیا، ابن زید لکھتے ہیں کہ: وہ ایسے پرندے تھے جو سمندر سے باہر نکلے تھے، اور ان کے رنگ میں اختلاف کرتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ: وہ سفید تھے، اور بعض نے کہا: وہ سیاہ تھے، ایک اور قول کے مطابق: یہ سبز پرندے تھے، اور ان کے چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کتے جیسے اور ان کے سر درندوں جیسے -

محترم قارئین:

آیت مبارکہ "وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ" میں آپ نے ملاحظہ فرمایا: جس طرح ابرہہ نے جنگ کے لیے جانوروں (ہاتھی) کا استعمال کیا: خدا تعالیٰ نے بھی اسی کے مطابق اسے جواب دیا، لیکن ابرہہ نے ہاتھی جیسے سب سے بڑے جانور سے اور خدا تعالیٰ نے پرندہ جیسے چھوٹی مخلوق سے اس کا مقابلہ کر کے اسے نیست و نابود کردیا۔

رب تعالیٰ نے پرندہ بھیجا، غور کریں کتنا خوبصورت ہے، ہاتھی کے مقابلے میں پرندہ، وہ بھی چھوٹے پرندے ابابیل جیسے، ابابیل پرندے کی وضاحت کرتے ہیں، چڑیا کی طرح، شاید اس سے بھی چھوٹا۔

اس چڑیا کو وہ مالک خدا، قادر خدا، مقتدر خدا نے اس اصحاب فیل جیسے طاقتور، ناسمجھ، بے فکر اور بے عقل کی طرف بھیجا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ پس صرف اسلحہ اہم نہیں ہے، اہم وہ ہاتھ ہے جس نے اس اسلحہ کو تھاما ہے، اہم اسلحہ کا مالک ہے کہ اس نے کس مقصد کے لیے اسلحہ کو تھاما ہے؟ رب تعالیٰ نے خود ہی اس اسلحہ کو ہاتھ میں لیا ہے۔

مشہور مفکر و عالم شیخ محمد عبده (۲۶۶ھ، ۱۹۰۹، ۱۸۳۹، ۱۳۲۳) فرماتے ہیں: کہ اس نافرمان ابرہہ نے جب بیت اللہ کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا تو خدا نے ان پرندوں کے ذریعہ (سجیل) جیسی چیز ابرہہ اور اس کے لشکر پر ڈالی کہ اس سے بیماری (جراثیم والی) چیچک ان میں پھیل گئی جس میں

وہ مبتلا ہو گئے، اور کعبہ کو ڈھانے اور مکہ پر قبضہ کرنے سے پہلے نابود ہو گئے۔

شیخ محمد عبدہ جز و عم میں اس سورت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ان سپاہیوں میں چیچک کی بیماری پھیل گئی۔

عکرمہ نے کہا کہ: یہ پہلی چیچک ہے جو عربوں میں دیکھی گئی ہے،

یعقوب عتبہ کا بیٹا اس پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں کہتا ہے: پہلا واقعہ جو عرب دنیا نے دیکھا اسی سال میں تھا، اس نے ان کے جسموں کے ساتھ کچھ ایسا کیا جو شاذ و نادر تھا ان کے جسموں کا گوشت ٹکروں میں گر رہا تھا، سپاہی اور ان کا کمانڈر گھبرا کر پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے، حبشی فوج کا سربراہ بھی اس مرض میں مبتلا تھا، اس کے جسم کا گوشت مسلسل ٹکڑے ہو رہا تھا، یہاں تک کہ اس کا سینہ پھٹ گیا اور صنعاء میں مر گیا۔

جی ہاں! یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک (استثناء) نعمت تھی جو اللہ نے مشرک ہونے کے باوجود اہل مکہ کو عطا فرمائی، اور امن والے حرم کو غاصب دشمن کی چالوں اور مکاریوں سے محفوظ رکھا، تاکہ خاتم النبیین پیغمبر کے وجود مبارک کو برگزیدہ فرمائے، اور لوگوں کو دین حق کی تعلیم دے، اور آسمانی دین کی طاقت سے اس گھر کو برائیوں سے محفوظ رکھے۔

یاد رہے کہ: اللہ کا قانون صرف یہ نہیں ہے جو انسان کو معلوم ہو، اسے دیکھے اور جانچے، انسان خدا کے قانون کا تھوڑا سا حصہ جانتا ہے جتنی سمجھنے کی اس کی صلاحیت ہے، جبکہ اس دنیا میں بہت سی غیر معمولی چیزیں رونما ہوتی ہیں جنہیں انسان سمجھ نہیں پاتا، مثال کے طور پر ابرہہ کی فوج پر پتھروں کی بارش سے ابرہہ کی فوج کا ٹائیفائیڈ اور چیچک کا شکار ہو جانا، اور اس خطے کے عرب لوگوں کا صحت مند رہنا دنیا کی غیر معمولی چیزوں میں سے ایک ہے، (ماخوذ از فی ظلال القرآن)۔

الغرض اللہ نے ابابیلوں کے پے درپے گروہ بھیج کر ان مکاروں کی چال کو مٹا دیا، اور سنگریزوں کے ذریعے ان کو شکست دی۔ (سورہ ہود آیت: ۸۲ اور ۸۳) سورہ حجرات: آیت "۴۳ اور ۴۵" اور چبائے ہوئے بھوسے کی طرح ہو گئے، اور ان کے جسم پارہ پارہ ہو کر بکھر گئے، یہ ہے ان

نافرمانوں کی سزا اور بدلہ جو اللہ کے گھر کی تخریب اور اس کے احکامات کے مقابلے میں کھڑے ہوتے ہیں (تفسیر فی ظل).

تَرْمِيهِمْ بِحَجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ ۝	جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے

"سِجِّيلٍ" لغت میں پتھر اور مٹی کی ملاوٹ والے کنکر کو کہتے ہیں، اس کا اصل فارسی میں "سنگِ گل" تھا یعنی: ٹھیکری، جسے عربی میں تبدیل کر کے "سِجِّيل" کیا گیا۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: یہ لفظ دراصل فارسی کے الفاظ سنگ اور گل کا معرب ہے، اور اس سے مراد وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہو اور آگ میں پک کر سخت ہو گیا ہو، قرآن مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے، آیت "۸۵" اور سورہ حجر آیت "۷۴" میں کہا گیا ہے کہ قوم لوط پر سجیل قسم کے پتھر برسائے گئے تھے، اور انہی پتھروں کے متعلق سورہ ذاریات آیت "۳۳" میں فرمایا گیا ہے کہ وہ "حجارة من طين" یعنی: مٹی کے گارے سے بنے ہوئے تھے (ٹھیکری)۔

اصحابِ فیل پر برسنے والے پتھروں کے سلسلے میں دو باتیں انتہائی غور طلب ہیں:

پہلا: وہ کنکر ابرہہ کے جس سپاہی پر پڑتا اس کا جسم چھلنی ہو جاتا اور وہ مرجاتا۔

دوسرا: ان سنگریزوں کے برسنے کی وجہ سے ابرہہ کی فوج میں چیچک اور ٹائیفائیڈ کی بیماری پھیل گئی، کہ ان میں سے کچھ اس مرض کی بنا پر زمین پر گر گئے اور کچھ فی الفور مر گئے۔

یہ بیماری ان کے بھاگنے کا سبب بنی وہ وہاں نہیں ٹھر سکے (قریشی، سید علی اکبر، تفسیر احسن الحدیث، تہران، طبع سوم جلد ۱۲، صفحہ ۳۶)

بعض معاصر دانشوروں کا خیال ہے کہ پرندوں سے مراد طاعون پھیلانے والے جراثیم ہیں، یا ملیریا کے مچھر تھے یا چیچک کے جراثیم تھے، البتہ آیت کریمہ میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس نظریہ اور مفہوم کے خلاف ہو۔

عصر حاضر کے علماء اور مفسرین مزید کہتے ہیں کہ: ہم بھی اس نظریہ

کو پسند کرتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں، خاص طور پر یہ کہ اس نظریہ کو رد کرنے میں کوئی لغوی اور عملی رکاوٹ نہیں ہے جو پرندے کو جر ثومے سے تعبیر کرنے سے روکے اور ایسا بہت مرتبہ ہوا ہے کہ لشکروں اور فوجوں میں طاعون پھیل گیا جو انہیں شکست اور تباہی کی طرف لے گیا، (اعلام قرآن)

اسی طرح مفسرین "سجیل" کے بارے میں کہتے ہیں: مٹی جو پتھر جیسی تھی، اور دوسرا قول یہ ہے کہ: مٹی تھی، اور تیسرا قول یہ ہے کہ: "سجیل" وہی (سنگ و گل) ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ ایسا پتھر جو سوار شخص پر لگتا تو اس کے جسم کو چھلنی کرتا، اور وہ ہلاک ہو جاتا۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ: پرندوں کے پاس ایسے پتھر تھے جب کسی کو مارتے تو اس کے جسم میں چیچک ہو جاتی۔

عمر بن حارث بن یعقوب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: مذکورہ پرندوں نے پتھر اپنی چونچوں میں لیے تھے، اور اسے پھینکتے تو جسم کی جلد پر چھالے پڑ جاتے اور پھنسیاں پڑ جاتیں۔

فطری طریقے یا اللہ کی قدرت سے کنکریوں کا اثر

سورہ فیل اور اس کی تاریخی واقعہ پر ایک سر سری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب فیل کی ہلاکت فطری اور معمول کے طریقے سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس میں قدرت کی مافوق فطرت طاقت شامل تھی۔

الف: چھوٹے پرندوں کا اڑنا اور کنکریاں اپنے ساتھ لانا مخصوص لوگوں کو نشانہ بنانا اور بڑی فوج کو منتشر کرنا وغیرہ، یہ سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کسی نے ان کی رہنمائی کی ہے، وہ خود بخود اس طریقے سے ایسا کام کرنے کے قابل نہیں تھے۔

ب: اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزات اور عجیب امور صرف نبی کے ہاتھ سے ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ ہر ایسی حالت میں ہو سکتے ہیں جب خدا چاہے، اور ضروری سمجھے (تفسیر نمونہ مکارم شیرازی، جلد کا صفحہ ۳۴۳)

ج: وحی الہی کے ذریعے اصحاب فیل کا واقعہ سننا اور یہ بیان کرنا کہ اصحاب فیل کی ہلاکت ایک معجزہ ہے، ہمارے دعوے کی کوئی اور دلیل نہیں ہے۔

د: سورة الفیل کے نازل ہونے کے بعد اس کے مشہور ہونے اور ان کی تباہی میں خدائی معجزہ ظاہر ہونے کی وجہ سے قریش نے اس سورہ کے نزول پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

لیکن کنکریاں عام پتھروں کے علاوہ ہوسکتی ہیں اور اس میں ایٹمی مواد ہوسکتا ہے؟

پہلا: یہ خدا کی لا محدود طاقت ہے، اور خدا کنکری یا عام مٹی سے کسی شخص یا گروہ کو ہلاک کرنے پر قادر ہے، (وكان الله على كل شيء قديرًا)۔

دوم: دوسری بات یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ پرندوں کو کسی بھی جگہ بھیجنے پر بھی قادر ہے، کہ ایسے سنگریزے اٹھائیں کہ اس میں ایٹمی طاقت ہو، کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑے پیمانے پر دھماکہ کر سکتے ہیں۔

اور جیسا کہ ہم نے بتایا، بعض مفسرین نے اس احتمال کا ذکر کیا کہ ان پرندوں نے چیچک اور ٹائیفائیڈ کی وبا پھیلائی، جس سے اصحاب فیل مارے گئے (تفسیر جزء عم: شیخ محمد عبدہ، دار و مكتبة الهلال، بیروت ۱۹۸۰، جلد ۱، ص: ۱۶۰)

البتہ یہ صرف ایک امکان ہے، اصحاب فیل کی موت ایک خدائی معجزہ کی علامت ہے، جیسا کہ آیت بالا ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اصحاب فیل اپنی تمام شان و شوکت اور پوری طاقت کے ساتھ خانہ کعبہ کو ڈھانے آئے تھے، مگر خدا تعالیٰ نے بظاہر ان کو ایک چھوٹی اور معمولی فوج سے کچل دیا۔

چنانچہ اللہ نے ہاتھیوں کو پرندوں سے اور اس زمانے کے جدید ہتھیاروں کو کنکریوں کے ذریعے ناکارہ بنا دیا، تاکہ اس متکبر اور مغرور انسان کی کمزوری اور بے بسی اللہ تعالیٰ کی طاقت کے سامنے ظاہر ہو جائے۔

ذیل کی آیت میں ان کی مشابہت زراعت اور خوشے سے دی گئی ہے جس کے بیج کھائے گئے ہوں اور اس کا بھوسا باقی ہو:

تو ان کو ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھس ہو

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝

آخر کار خدا نے ان کو چبا یا ہوا (اور بکھرا ہوا) بنا دیا، اور ان کی اولاد کو بھی تباہ کر دیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب فیل ابابیل پرندوں کے ذریعے نشانہ بننے کے بعد یا تو بے جان لاشوں میں تبدیل ہو گئے، یا کنکریوں نے شدید حرارت کی وجہ سے ان کو اندر سے جلادیا، (تفسیر میزان، جلد ۲۰، ص ۳۶۵)۔

تفسیر البحر میں ہے کہ: حضرت محمد ﷺ کی ولادت کے بابرکت سال اتنے مضبوط دشمن کو پسپا کرنا، آپ کی نبوت کی بشارت میں سے شمار ہوگا۔

کیونکہ اس خصوصیت کے حامل پرندوں کا آنا خارق العادہ اور معجزات میں سے ایک معجزہ ہے، اور یہ انبیاء کی بعثت کی بنیاد اور پیش خیمہ شمار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کمزور ترین سپاہیوں کے ذریعے وہ بھی پرندے جو عموماً اتنے طاقتور اور موثر نہیں ہوتے ہیں شکست دے کر نیست و نابود کردیا، (تفسیر البحر: ۸/۱۵)۔

ہمارا رب اصحاب فیل اور ابرہہ کے سپاہیوں کی تباہی اور شکست بیان کرنے کے بعد سورہ قریش کی پہلی آیت میں جو درحقیقت سورہ فیل کا ضمیمہ ہے، فرماتے ہیں: "لَا يَلْفُ قُرَيْشٌ ۝۱ الْفَهْمَ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝۲ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۝۳ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۝۴ وَأَمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۝۵"

- 1 - اصحاب فیل کو ہلاک کردیا، تاکہ قریش ایک دوسرے سے اور مکہ کے لوگوں اور سرزمین سے آشنا اور مانوس ہو جائیں، تاکہ آخری پیغمبر کے ظہور کو پالیں اور اس کے ساتھ ہو جائیں۔
- 2 - ان میں الفت ڈالنا موسم سرما میں یمن اور گرمیوں کے موسم میں شام کی طرف سفر کرنے کے لیے۔
- 3 - پس ان کو چاہیے اس گھر (کعبہ معظمہ) کے رب کی عبادت کریں۔
- 4 - وہ خدا جس نے انہیں بھوک میں کھلایا اور خوف سے محفوظ رکھا۔

سورہ قریش میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ہاتھیوں کے لشکر کو تباہ کردیا، اور ان کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور ان کو پیسے ہوئے بھس کی طرح بکھیر دیا، تاکہ لوگ اس مقدس سرزمین سے مانوس ہو جائیں، اور پیغمبر اسلام کے ظہور کی تیاری ہو۔

"الفت" کے معنی ہیں اجتماعیت محبت کے ساتھ، یکجا کرنا اور ہم آہنگی، قریش اور مکہ کی مقدس زمین اور خانہ کعبہ میں محبت پیدا کرنا ہے، اور (رحلت قریش) سے مراد ان کا مکہ سے باہر کی طرف تجارت کے لیے جانا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ خدا نے چاہا کہ قریش گرمیوں کے سفر کے عادی ہوجائیں، اور ان کا ذریعہ معاش بن جائے، کیونکہ قریش اور اہل مکہ اس علاقے کے مرکزیت اور پر امن ہونے کی وجہ سے یہاں آباد ہوئے، اور بہت سے لوگ حجاز سے ہر سال یہاں آکے مراسم حج ادا کرتے تھے۔ اور معاشی اور ادبی تبادلے ساتھ بھی ہوتے تھے اس سر زمین کی مختلف نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

عام الفیل پیغمبر اسلام کی ولادت کا سال

روایات کے مطابق مؤرخین لکھتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے، نیز ان میں سے اکثر حضرات حضور ﷺ کی ولادت با سعادت کو ۱۷ ربیع الاول کو صحیح تاریخ مانتے ہیں، (صحیح السیرۃ النبویۃ، ابراہیم العلی، صفحہ 41)۔

اسی طرح مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ "عام الفیل" میں پیدا ہوئے، آپ کی ولادت کے وقت آپ کی والدہ ماجدہ ابو طالب کے گھر شعب بنی ہاشم میں مقیم تھی۔ (السیرۃ النبویۃ، ابن کثیر، جلد ۱، ص ۴۷)

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ "عام الفیل" میں پیدا ہوئے۔

ابی حویرث کہتے ہیں کہ میں نے عبدالملک بن مروان بن قباث بن اشم کو کہتے سنا: "اے قباث تم عمر میں بڑے ہو یا رسول اللہ ﷺ؟ قباث نے کہا: رسول اللہ ﷺ مجھ سے عمر میں بڑے تھے اور میں ان سے چھوٹا ہوں، پیغمبر ﷺ عام الفیل کو پیدا ہوئے۔"

مخرمہ کہتے ہیں: میں اور پیغمبر ﷺ دونوں عام الفیل کو پیدا ہوئے، ابن اسحاق سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عام الفیل ۱۲ ربیع الاول بروز پیر کو پیدا ہوئے، (تاریخ الطبری/ترجمہ، جلد 2، صفحہ: 707) "وكان مولد رسول الله في عام الفيل، بينه وبين الفيل خمسون ليلة" رسول خدا کی ولادت عام الفیل میں ہوئی تھی، ان کے اور عام الفیل کے واقعہ کے درمیان پچاس راتوں کا وقفہ تھا (تاریخ اليعقوبي، جلد ۲، صفحہ ۷)۔

قال أبو إسحاق: إبراهيم بن المنذر: هذا وهم، والذي لا يشك فيه أحد من علمائنا: أن رسول الله، صلى الله عليه وسلم، ولد عام الفيل، وبعث على رأس أربعين سنة من الفيل. (دلائل النبوة، جلد

اول صفحہ 79.

محمد بن عمر ہشام بن سعد سے ، اور زید بن اسلم سے ، عبد اللہ بن علقمة بن فغواء سے ، اور اسحاق بن یحییٰ بن طلحہ عیسیٰ بن طلحہ سے وہ ابن عباس سے ، اور موسیٰ بن عبیدہ ، محمد بن کعب سے ، اور محمد بن صالح عمران بن مناح سے اور قیس بن ربیع ابن اسحاق سے ، سعید بن جبیر سے ، اور عبد اللہ بن عامر اسلمی ابو تجرة کی بیٹیوں سے ، اور حکیم بن محمد اپنے باپ سے ، قیس بن مخزوم ان سب نے متفقہ طور پر نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عام الفیل کو پیدا ہوئے ۔

یحییٰ بن معین حجاج بن محمد سے ، وہ یونس بن ابی اسحاق سے ، اور وہ سعید بن جبیر سے ، اور وہ ابن عباس سے نقل کرتے تھے کہ انہوں نے کہا: پیغمبر ﷺ عام الفیل کو پیدا ہوئے ہیں۔

الطبقات الکبریٰ (ترجمہ: جلد ۱ ص ۹۵)

"قیل إنه ولد في شعب بنى هاشم، ولا خلاف أنه ولد عام الفيل؛ قيل، إنه ولد أول اثنين من ربيع الأول، وقيل: لاثنتي عشرة ليلة خلت منه عام الفيل، إذ ساقه الحبشة إلى مكة في جيشهم يغزون البيت، فردّهم الله عنه، و أرسل عليهم طيرا أبابيل. (الاستيعاب، جلد 1، صفحہ: 30)۔ وقد روى عن أبي جعفر محمد بن علي بن حسين عليهم السلام: أن قدوم الفيل للنصف من المحرم، وبين الفيل وبين مولد رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس وخمسون ليلة"۔

امام باقرؑ سے روایت ہے کہ: اصحاب فیل کی آمد محرم کے وسط میں تھی، پیغمبر ﷺ کی ولادت اور اس واقعے کے درمیان پچپن راتوں کا وقفہ تھا، (البداية والنهاية، جلد: 2، صفحہ: 262) (اس موضوع کی تفصیل آپ: تاریخ طبری ترجمہ، جلد 2، صفحہ: 707، تاریخ یعقوبی: جلد 2، صفحہ: 7، دلائل النبوة: جلد 1، صفحہ: 79، الطبقات الکبریٰ/ترجمہ: جلد 1، صفحہ: 92، البداية والنهاية: جلد 2، صفحہ: 262 میں ملاحظہ کر سکتے ہیں)۔

عام الفیل میں نبی ﷺ کی ولادت کے بارے میں روایات

جیسا کہ ہم نے کہا: مشہور مسلمان مصنفین رسول اللہ ﷺ کی ولادت با سعادت

کی تاریخ عام الفیل کو سمجھتے ہیں) وہ سال جس میں ابرہہ نے خدا کے گھر پر حملہ کیا تھا)

بعض نے ابرہہ کے حملے کے ۴۰ دن بعد کہا ہے، اور بعض نے " ۵۰ " دن بعد کہا ہے، امام باقرؑ بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ: ہاتھیوں کا حملہ ۱۰ محرم کو ہوا تھا، اور رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت اس کے ۵۵ دن بعد ہوئی تھی، کچھ نے کہا کہ عام الفیل پیغمبر کی پیدائش سے دس سال پہلے تھا، یہ ابن ابزی کا قول ہے، بعض دوسروں نے کہا ہے کہ عام الفیل حضرت رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے ۲۳ سال پہلے تھا، یہ شعیب بن شعیب کا قول ہے۔

کچھ لوگوں کا ایک غیر مانوس اور غیر مشہور قول ہے کہ نبی ﷺ کی ولادت عام الفیل کے ۳۰ ویں سال کو ہوئی، یہ موسیٰ بن عقیہ کا قول ہے جو زہری سے بیان کرتے ہیں۔

بعضوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت با سعادت عام الفیل کے چالیس (۴۰) سال بعد ہوئی ہے، یہ ابن عساکر کا قول ہے، جو کہ قابل قبول نہیں ہے۔

خلیفہ بن خیاط نے متعدد واسطوں کے ساتھ کلبی سے اور اس نے ابی صالح سے اور ابی صالح نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عام الفیل سے ۱۵ سال پہلے متولد ہوئے تھے، البتہ یہ قول نا قابل یقین ہے، اس لیے کہ خلیفہ بن خیاط خود کہتے ہیں کہ نبی ﷺ عام الفیل کو پیدا ہوئے تھے۔ (البدایہ و النہایہ، ابن کثیر، بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۷ / ۱۹۸۶، جلد ۲ صفحہ ۲۶۲)۔

پیغمبر ﷺ کی تاریخ وفات

مؤرخین کی مطلق اکثریت اپنی تحریر میں لکھتی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ بروز پیر، ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری، غروب آفتاب کے بعد، ۶۳ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے (اس موضوع کی تفصیل: صحیح مسلم، کتاب الفضائل جلد ۴، ص ۱۸۲۰ میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

کیا کعبہ بھی منہدم ہوگا

اس سے پہلے کہ خانہ کعبہ کی تباہی کے بارے میں لکھوں، یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ: خانہ کعبہ کی عمارت ۱۰ مرتبہ تعمیر ہو چکی ہے۔

اس کی بنیاد ملائکہ نے رکھی تھی، پھر حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا، پھر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کی، ان کے بیٹے اسماعیلؑ نے تعمیر کیا، پھر عمالقہ نے تعمیر کیا، اس کے بعد جرہم نے تعمیر کیا، پھر مضر نے، پھر قریش نے تعمیر کیا، پھر عبد اللہ بن زبیرؓ نے تعمیر کا، آخر میں حجاج بن یوسف الثقفی نے تعمیر کیا، اور اس تعمیر کی مرمت (سلطان مراد چہارم) جو عثمانی بادشاہوں میں سے بے نے ۱۰۴۰ ہجری میں کروائی، مسجد الحرام کے اندر سیلاب داخل ہونے اور اس کے نقصانات کی وجہ سے نئے سرے سے اس کی مرمت کی گئی، یہ عمارت مضبوط اور مکمل طاقت رکھتی ہے جس کی وجہ سے اب تک مستحکم کھڑی ہے۔

ملاحظہ:

سلطان رابع (چہارم) امجد اول کا پہلا بیٹا کوسم سلطان سے اور عثمانی ترک سلطنت کے خلفاء میں سے ایک تھا جس نے مصطفیٰ اول کی برطرفی کے بعد (۱۶۲۴ تا ۱۶۴۰) سلطنت عثمانیہ میں حکومت کی۔

سلطان مراد چہارم گیارہ سال کی عمر میں بادشاہی کے منصب پر پہنچے، ان کے دور حکومت میں کئی فوجی مہمات اور جنگیں ہوئیں، جن میں سے : قفقاز، ایران، آذر بائیجان ایروان اور تبریز کی فوجی مہمات کو یاد کیا جاسکتا ہے، ان کی ہی دور حکومت تھی کہ: صفویان، بغداد اور بین النہرین سلطنت عثمانیہ کے قبضہ میں آئے۔

مراد چہارم، ان تمام فتوحات اور خدمات کے بعد حواس نے اسلام اور عثمانی حکومت کے مفادات کے لیے کیں، بالآخر ۱۶۴۰ء میں ۲۷ سال کی عمر میں "نقرس" کی بیماری کی وجہ سے انتقال کر گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

کیا آخری زمانے میں کعبہ منہدم ہو جائے گا

امام احمد اپنی مسند میں ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یایع لرجل ما بین الرکن والمقام ولن یستحل البیت إلا اہله، فاذا استحلوه فلا یسأل عن ہلکة العرب، ثم تأتی الحبشة فیخربونہ خرابا لا یعبر بعدہ أبدا وھم الذین یتخرجون کنزہ" ترجمہ: "حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ایک آدمی کی بیعت کی جائے گی اور بیت اللہ کی حرمتوں کو پامال کرنے

والے اہل بیت اللہ ہی ہوں گے، جب وہ بیت اللہ کی حرمتوں کو پا مال کریں گے، تو پھر عربوں کی ہلاکت و بربادی عروج پر ہوگی، پھر حبشی آکر اسے ویران کر دیں گے، پھر بیت اللہ آباد نہیں کیا جائے گا یہی لوگ کعبہ کے خزانے نکالیں گے" (سلسلہ الاحادیث الصحیحہ: ۲۴۰/۱)۔

مسند میں امام احمد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حبشہ سے ذوالسویقین آکر خانہ کعبہ کو تباہ کر دے گا، اور اس کے خزانے کو لوٹ لے گا اور اس کا غلاف اتار دے گا، وہ منظر مجھ پر اتنا واضح ہے کہ جیسے میں اسے دیکھ رہا ہوں کہ اپنے بیلچے اور گینتی سے خانہ کعبہ کو تباہ کر رہا ہے۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "كَأَنِّي أَنُظِّرُ إِلَيْهِ أَسْوَدَ أَفْجَحٍ يَنْقُضُهَا حَجْرًا حَجْرًا يَغْنَى الْكَعْبَةَ" ترجمہ: "جیسے میں ایک سیاہ فام آدمی کو دیکھ رہا ہوں جس کی ٹانگیں چھوٹی ہیں، کعبہ کا ہر پتھر الگ الگ کر رہا ہے" ابن کثیر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ (۱۷۸/۱)

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خانہ کعبہ کو ایک حبشی آدمی چھوٹی ٹانگوں والا ویران کر دے گا، ذوالسویقین اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس ٹانگیں چھوٹی ہیں (سویقہ: ساق کی تصغیر ہے، اس حبشی آدمی کی ٹانگیں غالباً چھوٹے ہوں گی)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو حرم بنایا ہے، تو اس کے باوجود وہ حبشی شخص کعبہ کو کیسے تباہ کرے گا؟

جواب: حرم کا محفوظ ہونا ہمیشہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک مقررہ وقت ہے، اور وہ قیامت کا قریب آنا اور دنیا کا تباہ ہونا ہے۔

امام نووی کہتے ہیں: اس وقت کے لیے یہ قول صحیح ہے، سوائے اس کے کہ تمام بندوں کے لیے شرعی حکم ضروری ہے، اور خدا نے اسے اپنے بندوں پر لازم کیا ہے، اور جب کوئی نافرمان اور سرکش انسان کعبہ کی حرمت کو پامال کرتا ہے تو خدا اسے روکتا ہے۔

جیسا کہ ابراہیم کے ساتھ ہوا، بعض اوقات خدا اپنے علم میں موجود مصلحت اور حکمت کی وجہ سے، ایسے مجرموں کو نہیں روکتا، جیسا کہ قرامطہ کا واقعہ ہے کہ، انہوں نے خانہ کعبہ کا تقدس پا مال کیا اور خدا کے محفوظ حرم کے پاس ناقابل بیان جرائم کا ارتکاب کیا، ان کے ساتھ کچھ نہیں ہوا، یہ روایت ذوالخلصہ کے لیے بھی دہرائی گئی۔ (موضوع کی تفصیل کتاب "قیامت صغریٰ و کبریٰ" ڈاکٹر سلیمان اشقر میں ملاحظہ کرسکتے ہیں)

فرشتوں کا کعبہ

روایات میں کہا گیا ہے کہ: فرشتوں کا روئے زمین کے انسانوں کی طرح آسمان پر بھی خانہ کعبہ کی طرح ایک مقام ہے، جہاں وہ طواف میں مصروف ہیں اور قرآن کریم نے اس جگہ کو "بیت المعمور" کہا ہے، روایات میں ہے کہ ساتویں آسمان پر ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ساتویں آسمان پر فرشتوں کا خانہ کعبہ ہے، جہاں وہ اپنے حج کے فرائض انجام دیتے ہیں، اس کعبہ کا نام بیت المعمور ہے، سورہ طور میں ہمارے رب نے اس کی قسم اس طرح کھائی ہے، "وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ" (سورہ طور آیت ۴)۔

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ "...ثُمَّ رَفَعْنَا لِيَابَيْتِ الْمَعْمُورِ فَقُلْتُ يَا جِبْرِيلُ مَا هَذَا قَالَ هَذَا الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ يَدْخُلُهُ كُلُّ يَوْمٍ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ إِذَا خَرَجُوا مِنْهُ لَمْ يَعُودُوا فِيهِ آخِرُ مَا عَلَيْهِمْ" پھر انہوں نے مجھے بیت المعمور کا گھر دکھایا، میں نے کہا اے جبریل یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ بیت المعمور ہے۔

ہر روز ستر ہزار فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں اور جب وہ وہاں سے نکلتے ہیں تو دوبارہ اس طرف نہیں لوٹتے، (بخاری: ۳۲۰۷) اور مسلم (۱۶۴) یعنی: بیت المعمور ساتویں آسمان پر رہنے والے فرشتوں کا خانہ کعبہ ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم خلیلؑ کو دیوار کعبہ سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے دیکھا، کیونکہ وہ زمین پر کعبہ کے بانی ہیں، اور اس کا اجر عمل کے جنس سے ہیں۔

امام ابن کثیرؒ بیت المعمور کے محل وقوع کے بارے میں فرماتے ہیں بیت المعمور کعبہ کے عین اوپر اور اس کے متوازی واقع ہے، یعنی اگر وہ گرے تو مکہ کے کعبہ پر گرے گا، اور کہتے ہیں کہ ہر آسمان میں ایک گھر ہے جس کے رہنے والے اس میں عبادت کرتے ہیں، اور جو گھر آسمان دنیا میں ہے اسے "بیت العزّة" کہا جاتا ہے۔

ابن کثیرؒ کی روایت کہ بیت المعمور کعبہ کے متوازی واقع ہے دراصل حضرت علیؑ کی روایت ہے۔

ابن جریر خالد بن عر عرہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں: ایک شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا: بیت المعمور کیا ہے؟ حضرت علیؑ نے جواب میں کہا: "بیت فی السّماء یقال لہ الضراح بحیال الکعبۃ من فوقہا، حرمتہ فی السّماء کحرمتہ ہذا

فی الأرض یصلّی فیہ کلّ یوم سبعون الف ملک ولا یعودون الیہ أبداً" (ابن حجر: فتح الباری:

308/2).

یعنی: ایک گھر جو خانہ کعبہ کے عین اوپر ساتویں آسمان پر ہے اور بیت المعمور کی آسمان میں اتنی ہی عزت ہے جتنی زمین پر خانہ کعبہ کی ہے، روزانہ ستر ہزار فرشتے اس کی زیارت کرتے ہیں، اور جو فرشتے اس میں ایک بار داخل ہوتے ہیں دوبارہ کبھی ان کی باری نہیں آتی۔

شیخ ناصر الدین البانی نے عر کے عر کے سوا اس سند کے تمام رجال کو ثقہ قرار دیا ہے، عر سے متعلق کہتے ہیں کہ: وہ مستور الحال ہے، اس کے حالات پوشیدہ ہیں، مگر البانی کہتے ہیں کہ ایک صحیح مرسل روایت اس کے لیے شاہد ہے، اور کہتے ہیں قتادہ نے کہا: نقل کیا گیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ بیت المعمور کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا: بیت المعمور آسمان میں ایک مسجد ہے جس کے نیچے کعبہ واقع ہے، اس طرح کہ اگر وہ گرے تو کعبہ پر گرے گا۔

شیخ البانی نے کہا: خلاصہ کلام یہ ہے کہ جملہ "حیال الکعبہ" احادیث کثرت طرق کی بنا پر درست ہیں، اور اصول حدیث کے مطابق اس کا درست ہونا قابل تائید ہے (مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کریں "سلسلہ الاحادیث الصحیحة" نمبر: ۴۷۷۰)۔

سبق سیکھنا یا عبرت حاصل کرنا

کہتے ہیں کہ جب انسان دولت اور اقتدار تک پہنچ جاتا ہے تو اپنی حیثیت بھول جاتا ہے، اور اللہ کو بھول جاتا ہے، نمرود، فرعون، شداد، ہامان، ابرہہ اور ان جیسے دوسرے سب اسی گروہ میں سے ہیں، وہ اپنے ہاتھیوں، ٹینکوں اور توپوں سے کھیلتے ہیں، اور اپنے اسباب و وسائل پر فخر کرتے ہیں، لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایک کمزور پرندے سے ہلاک کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سارے کام شاندار اور خارق العادہ ہیں۔

حاصل شدہ سبق

1 - نبی ﷺ کو تسلی دینا اس ظلم و ستم کے خلاف جو قریش کے انکار سے آپ کو پہنچ رہا تھا۔

2 - قریش کو خدا کے غضب اور انتقام سے ڈرانا اور سرزش کرنا۔

3 - خلوق کی منصوبہ بندی میں خدا کی قدرت کا مظہر اور دین و شریعت کے دشمنوں سے اس کا انتقام۔

سورة فیل کا مقصد

- 1 - کعبہ کی حفاظت کی نعمت یاد دلانا تا کہ قریش شکر گزار ہوں۔
- 2 - کعبہ خدا کا گھر ہے اور خدا ہر حال میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔
- 3 - جب اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی چھوٹے پرندے سے حفاظت کی، تو مطمئن رہو کہ اللہ تعالیٰ مصیبتوں اور آفات میں تیری بھی حفاظت کرے گا۔
- 4 - قریش پر احسانات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کو یاد دلانا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہے اور آپ فکر نہ کریں، اور یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں۔

اسلام کے سوا عربوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟

اگر اسلامی عقیدہ، اسلامی تصورات اور افکار کو ایک طرف رکھ دیں تو ان کے پاس کیا چیز ہے جو وہ انسانیت کے سامنے پیش کرسکتے ہیں؟ اور اگر کسی قوم کے پاس انسانوں کے لئے کوئی پیغام نہیں ہے تو وہ قوم ہی کیا ہے؟ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جن اقوام نے کبھی انسانیت کی قیادت کی، ان کے پاس ایک فکر تھی، ایک پیغام تھا جو انہوں نے انسانیت کو دیا، جن اقوام کے پاس کوئی پیغام نہ تھا مثلاً تاتاری، جنہوں نے پورے مشرق کو روند ڈالا اور بربر جنہوں نے عالم عرب پر سے رومیوں کی سلطنت کو ختم کیا، یہ لوگ طویل عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے، بلکہ یہ ان اقوام ہی کے اندر گھل مل گئے جن کو انہوں نے فتح کیا تھا، یاد رہے کہ عربوں نے انسانیت کو جس نظریہ سے نوازا وہ فقط اسلامی نظریہ حیات تھا، اس نظریہ کی وجہ سے وہ عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے، جب انہوں نے اس نظریہ کو پس پشت ڈال دیا تو اس کرہ ارض پر ان کا کوئی کام ہی نہ رہا، تاریخ سے ان کا کردار ختم ہو گیا۔ آج عرب اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اس سبق کو یاد رکھیں، اگر وہ قوت اور قیادت چاہتے ہیں، تو اسلامی نظریہ اپنا کر ہی قیادت کے اہل رہ سکتے ہیں، ورنہ ان کی کوئی حیثیت قائم نہیں ہوسکتی، اللہ ہی ہے جو گمراہوں کو ہدایت دے سکتا ہے۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورۃ القریش

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اس کی چار (۴) آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کو "قریش" اس لیے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں قریش کو اپنی نعمتیں یاد دلانیں، اور اسے سورہ "ایلاف" بھی کہا جاتا ہے۔

سورہ قریش کے نزول کا وقت

اگرچہ ضحاک اور کلبی نے اس کو مدنی قرار دیا ہے، لیکن مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ مکی ہے، اور اس سورت میں موجود لفظ "رَبِّ هَذَا الْبَيْتِ"، "اس گھر کا رب" بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ مکی ہے، کیونکہ مدنی ہونے کی صورت میں، سورت کا مذکورہ جملہ کسی بھی طرح کی مناسبت نہیں رکھتا۔

سورہ قریش کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

اس سورت میں ایک (۱) رکوع، چار (۴) آیتیں، سترہ (۱۷) الفاظ، اناسی (۷۹) حروف اور اکتالیس (۴۱) نقطے ہیں۔

(قرآن کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے تفسیر احمد سورة الطور ملاحظہ کریں)۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ مبارک سورہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے، لیکن سورت کے مشتملات اور اس کا انداز بیان، خاص طور پر اس "گھر کے رب" والا حصہ سورت کے مکی نوعیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ: سورة الفیل اور قریش کا آپس میں گہرا تعلق ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی وقت اور ایک ہی مرحلے میں نازل ہوئیں، دونوں خطابات قریش سے متعلق ہیں۔

یہ سورت خدا کی نعمتوں کو بیان کرتی ہے اور قریش کو شکر گزار ہونے کی دعوت دیتی ہے، ایک نعمت یہ کہ تو قریش کو مضبوط اور مسلح دشمن پر فتح دلاتی اور دوسری یہ کہ خوف اور بھوک سے قریش نجات دی، ان نعمتوں کی انہیں یاد دہانی کرواتا ہے، اور انہیں یاد دلانا تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کعبہ اصحاب فیل کے شر سے محفوظ رکھا، اسی طرح تمہیں بھی ڈر اور خوف سے بچائے گا، اور تم پر رزق روزی کی فراخی کردے گا، تمہارے ڈر اور خوف کے حالات ختم کرے گا ایک پر امن

ماحول تمہیں عطا کرے گا، جس کے نتیجے میں تم گرمی، سردی، دن اور رات کو سفر کرسکو گے، اور اپنے تجارتی کاموں میں مصروف رہ سکو گے، کوئی بھی تمہارے معاملات اور تجارتی امور میں رکاوٹ نہیں بن سکے گا۔

رب عظیم نے دشمن کے خطرے کو دور کیا اور تمہیں امن کی نعمت سے نوازا۔

محترم قارئین:

جیسا کہ آپ نے مشاہدہ کیا ہے کہ ابرہہ کی فوجوں کی شکست کے بعد اس شہر میں سب سے پہلے امن آیا، اور ایک دن تھا کہ ہر طرف سے لوگ اس شہر میں داخل ہو رہے تھے، لیکن اس شہر کے باسیوں نے ناشکری کی، اس لیے پہلے تو ان کو فقر نے گھیر لیا، اور پھر خوف اور بد امنی نے ان کا دامن پکڑ لیا۔

ہمارا رب العالمین (سورہ ابراہیم: ۷) میں فرماتا ہے: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" ترجمہ: "اگر تم شکر گزار رہو گے تو میں تمہیں ضرور بڑھاؤں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو بلا شبہ میرا عذاب سخت ہے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمیں اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر وہ ہمیں شکر کرنے کا حکم دیتا ہے تو یہ ہمارے لیے ایک اور نعمت کا باعث بنتا ہے، اور ایک تربیتی ذریعہ بھی ہے، نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ ہمیں پہلے غور سے سوچنا چاہیے کہ نعمتیں دینے والا کون ہے؟ یہ توجہ، ایمان اور آگاہی شکر گزاری کی پہلی بنیاد ہے۔

شکر کا دوسرا مرحلہ، الفاظ کے ساتھ شکر ادا کرنا ہے، اور تیسرا مرحلہ شکر ادا کرنے کا جو سب سے اعلیٰ مرحلہ ہے وہ عمل کا مرحلہ ہے۔ عملی شکر یہ ہے کہ ہر ایک نعمت ہمیں کس مقصد کے لیے دی گئی ہے اس کا صحیح سوچنا اور اسے خود پر خرچ کرنا ہے، اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم نے نعمت کی ناشکری کی۔

سورہ قریش کا سورہ فیل سے ربطہ و مناسبت

سورہ قریش کے مجموعی موضوع اور مشتملات کا سورہ الفیل کے موضوع اور مواد سے اتنا گہرا ربطہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ سورہ سورۃ الفیل کے فوراً بعد نازل ہوئی ہوگی، اور اس قریبی مناسبت کی بنا پر بعض اہل علم نے ان دونوں سورتوں کو ایک سمجھا ہے۔

وہ روایات جو کہتی ہیں کہ یہ دونوں سورتیں مصحف ابی ابن کعب میں ایک ساتھ لکھی گئی ہیں، اور ان کے درمیان بسم اللہ بھی نہیں لکھی گئی ہے، اور

یہ کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے نماز میں بغیر کسی وقفے کے ان دونوں کو اکٹھا پڑھا، اس سے اس رائے کو مزید تقویت ملتی ہے۔

لیکن یہ رائے اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ وہ سرکاری نسخے جو حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی کثیر تعداد کی مدد سے لکھوائے، اور بڑے شہروں میں بھیجے تھے، ان میں ان دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ لکھی گئی تھی، اور اس وقت سے اب تک دنیا کے تمام مصحفوں میں یہ دو الگ الگ سورتیں لکھی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ دونوں سورتوں کا انداز بیان اس قدر مختلف ہے کہ وہ واضح طور پر دو الگ الگ سورتوں کی طرح نظر آتی ہیں۔

بالفاظ دیگر: یہ دونوں سورتیں اہل مکہ کو برکات کی یاد دلاتی ہیں، سورۃ الفیل دشمن کی ہلاکت کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ دشمن جو بیت اللہ کو تباہ کرنا چاہتے تھے، جبکہ یہ سورت معاشی اور معاشرتی برکت اور ان کے درمیان یکجہتی اور تسلسل اور سال کے دو موسموں میں سفر کرنے کا احسان یاد دلاتا ہے۔

سورہ قریش تصورات اور فہم کے لحاظ سے سورۃ الفیل سے تعلق رکھتی ہے: "إِلَافٍ قُرَيْشٍ" یعنی: قریش کی آپس میں جو محبت اور الفت تھی اس کی وجہ سے خدا نے ہاتھی والوں کو تباہ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو اہل مکہ کے لیے امن و سکون کا مقام بنایا، اور انہیں ظالموں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھا، جس طرح کے ہاتھی والوں کو ہلاک اور رسوا کیا۔

قریش اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی سرزمین میں ایک محفوظ مقام حرم اور کعبہ ہے، جبکہ ان کے اردگرد رہنے والے اچک لیے جاتے ہیں، (عنکبوت: ۶۷) اور دوسری قوموں میں لوٹ مار، قتل و غارت گری اور ظلم و ستم کی عادات اور صفات نمایاں تھیں، اس لیے اہل قریش کو چاہیے، جو اللہ تعالیٰ کے حرم کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں وہ سال کے دو موسموں میں ہر قسم کی ضروریات اور زندگی کے اسباب کے حصول کے لیے آسانی سے یمن اور شام تک سفر کرسکتے ہیں، چنانچہ انہیں چاہیے کہ خدا کی عبادت کریں، اس خدا کی جس نے ان کو نعمتیں بخشی ہیں، اور انہیں تحفظ دیا ہے، اور وہ دور دراز ممالک کے سفر میں محفوظ ہیں انہیں کوئی خوف نہیں ہے (سورہ نمل آیات: ۱۱۲ تا ۱۱۴)

سورہ قریش کی تمہید:

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اس سورت میں دو قیمتی نعمتوں کا ذکر ہے: جن کا اللہ نے اہل مکہ کو عطا کرنے کا احسان جتایا ہے، ان کو دوسفر

سے نوازا ہے، ایک سردی میں یمن کی طرف، اور دوسرا گرمیوں میں شام کا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے قریش کو دو قیمتی نعمتیں عطا کیں، کہ وہ سلامتی، استحکام، مال و دولت اور راحت تھی، یہ بات واضح ہے کہ معاشرہ کی معیشت اور امن اللہ کی بندگی اور عبادت کی راہ میں ہونی چاہیے، عبادت کے فلسفوں میں سے ایک منعم کی شکر گزاری ہے "فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ"۔

سورہ قریش کے مشتملات:

در حقیقت یہ سورہ "فیل" کی تکمیل سمجھی جاتی ہے، اس کی آیات اس کی واضح دلیل ہے، اس سورت کا موضوع قریش پر خدا کی نعمتوں اور ان کے ساتھ اس کی شفقت و محبت کا اظہار ہے، تاکہ ان کے شکر گزاری کے جذبات کو ابھارا جاسکے، اور وہ لوگ اس عظیم گھر کے رب کی عبادت کے لیے اٹھیں جس کی وجہ سے ان کی اتنی عزت ہے، اور یہ گھرانہ کے لیے باعث افتخار بھی ہے۔

جس طرح سورہ "والضحیٰ" اور سورہ "الم نشرح" کو ایک سورت سمجھا جاتا ہے، اسی طرح سورت فیل اور سورت قریش کو بھی ایک ہی سورت سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان کے مندرجات کا باہم تعلق بہت زیادہ ہے، جو ان کے ایک ہونے کا ثبوت ہوسکتا ہے، سورہ مبارکہ قریش اس بات پر زور دیتی ہے کہ قریش کے پاس سب بنیادی، سماجی نعمتیں ہیں، یعنی خدا کا گھر کعبہ قبیلہ کی اندرونی ہم آہنگی اور بقاء، چنانچہ انہیں اللہ کی اس نعمت کی شکر گزاری اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دی جارہی ہے، آخر میں اس نعمت کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے سورت اس کے نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی، بھوک اور معاشی دباؤ سے آزادی اور بیرونی خطرات سے تحفظ

یہ سورت اپنے تمام پڑھنے والوں کو یاد دلاتی ہے کہ ان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی کی برکات بھی ان کے رب کے فضل و کرم سے ہیں اس لیے ان کو چاہیے کہ اس رب کی عبادت کریں۔

سورہ قریش کی تلاوت کی فضیلت

ابو الحسن قزوینی کہتے ہیں کہ جب بھی کسی کو دشمن یا کسی آفت سے خطرہ ہو تو اس کے لیے سورہ "إِلَافِ قُرَيْشٍ" کا پڑھنا امن کا باعث ہوگا۔

امام جزری نے نقل کیا ہے کہ: یہ آزمودہ اور مجرب عمل ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ نے اپنی تفسیر "مظہری" میں اسے نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ: میرے شیخ حضرت مرزا جان جانان نے مجھے خوف اور خطرے

کے وقت اس سورت کو پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کا پڑھنا ہر آفت اور مصیبت سے بچنے کے لیے مجرب ہے، حضرت قاضی صاحب نے فرمایا ہے کہ: میں نے کئی بار آزمایا ہے، (معارف القرآن: عالم اسلام کے مؤلف حضرت علام مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی مترجم حضرت مولانا محمد یوسف حسین پور، سورہ قریش)۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ: جو شخص اس آیت کے مطابق خدا کی عبادت کرے گا، خدا اسے دنیا اور آخرت میں سلامتی اور بے خوفی کے اسباب فراہم کرے گا، اور جو شخص اس سے منہ موڑ لے، اس سے یہ دونوں نعمتیں چھین لی جائیں گی، جیسا کہ قرآن کریم کے ایک اور مقام پر فرمان ہے: "وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ" (سورہ نمل: ۱۱۲)

ترجمہ: "اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے"

سورہ قریش کا سبب کا نزول

حاکم وغیرہ نے ابو طالب کی بیٹی ام ہانیؓ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قریش کو سات صفتوں کے ساتھ برتری دی ہے "میں ان میں سے ایک ہوں، نبوت، کعبہ کی نگرانی، حاجیوں کو پانی پلانا، اصحاب فیل پر فتح، اللہ کی عبادت، انہوں نے سات سال تک خدا کی عبادت کی کہ اس وقت کوئی دوسرے گروہ نے ایسا نہیں کیا، اور خدا نے صرف ان کے بارے میں ایک سورت نازل کی ہے۔

حاکم نے حدیث کے تسلسل میں بیان کیا کہ یہ سورت قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس میں کسی اور کا ذکر نہیں ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی مکہ مکرمہ میں تیرہ سال قیام کے دوران دین اسلام کی تبلیغ اور کفار قریش کا آنحضرت ﷺ کو اذیت پہنچانا مکی سورتوں کے نزول کے ساتھ تھا، کہ خدا کی نعمتوں اور ابدی طاقت کو یاد دلانے کے لیے خدا مکہ کے تاریخی واقعات کو یاد کرواتا ہے، تاکہ مکہ کے کافر اللہ کی توحید اور محمدؐ کی رسالت پر ایمان لے آئیں۔

تفسیر کا خلاصہ

قریش عرب کے ایک قبیلے کا نام ہے اور یہ سورت محور کو ظاہر کرتی ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ یہ سورت بھی مکی ہے، اور اس کی

آیات کا محور وہی ہے جو سورہ فیل کی آیات کا ہے، سورت کا محور نقل و حمل سے متعلق ہے جو یہ قبیلہ کرتاتھا، اور اس کے نتیجے میں انہیں کافی فوائد اور برکتیں حاصل ہوتی تھیں، چنانچہ نعمتوں کے بدلے میں انہیں نعمتوں کے مالک کا شکر ادا کرنا چاہیے، اس کے بعد قریش کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا کیں ان کے بارے میں بحث ہے اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرنا اور وہ نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مقام و زمان کے تقاضوں کے مطابق اور ہر زمانے میں لوگوں کی استعداد و ہنر کے مطابق عطا کی ہیں، اللہ تعالیٰ جب بھی قرآن میں کسی نعمت کی بات کرتا ہے تو یہ لفظ لاتا ہے "فَلْيَعْبُدُوا" (پس عبادت کرو) اور لوگوں سے عبادت کر کے شکر کرنے کو کہتا ہے، چونکہ قریش کے لوگ سردیوں اور گرمیوں میں سفر کرنے کے عادی تھے، اس لیے اس نعمت کی شکر گزاری کے لیے انہیں اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کرنی چاہیے، جس نے انہیں بھوک کے وقت کھانا کھلایا، اور خوف کے دور میں امن دیا۔

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"ایلاف" (الف): مانوس ہونا، محبت بڑھانا، خوگر ہونا، "قریش" جیسا کہ ہم نے کہا صدر اسلام میں ایک مشہور و معروف قبیلہ تھا، جو کہ نصر بن کنانہ کی پشت سے ہے، اس قبیلے کی دیگر شاخیں بھی ہیں "رحلہ" کوچ کرنا، سفر "رحلہ": اس کی اصل رحل کے مادہ سے ہے، یعنی: گیا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا، کوچ کرنا سفر کرنے کا وقت ہو یا مقام اسے "مرحلہ" کہتے ہیں، "راحل" یعنی: فوت ہو گیا، یہ عام طور پر بڑے اور معزز شخصیات کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگر اس مقام و مرتبہ کے لائق نہ ہو تو کہتے ہیں: فوت ہو گیا، رحلت اور فوت میں فرق ہے۔

"الشِّتَاءُ" (جاڑے کا) موسم سرما۔

"وَالصَّيْفُ" موسم گرما۔

"فَلْيَعْبُدُوا" اس لیے انہیں عبادت کرنی چاہیے۔

"أَطْعَمَهُمْ" انہیں کھانا دیا، (قصص: ۵۷)۔

"مِّنْ جُوعٍ" بھوک کی جگہ، بھوک مٹانے کیلئے۔

حرف "من" بدلیہ یا تعلیلیہ ہے (تفسیر قاسمی)۔

ملاحظہ

لا یلاف میں جار مجرور متعلق ہے فعل محذوف، "اعجبوا لایلاف قریش" یا فعل

مذکور "فَلْيَعْبُدُوا" کے متعلق ہے، یعنی: "من اجل تسهیل اللہ علی قریش ما الفوہ واعتادوہ فی رحلتهم إلی الیمن فی الشتاء ورحلتهم إلی الشام فی الصيف" یا پچھلی سورت کے مفہوم کے مطابق جملہ "فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ" کے متعلق ہے، کہ ابرہہ کے لشکر کا شر ان سے دور کر دیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔

سورہ قریش کی آیات کی تقسیم

سورہ مبارکہ کی آیات "۱- ۲" قریش قبیلے کی خصوصیات کے بارے میں وضاحت کرتی ہیں جو اپنے دینوی مقاصد تک پہنچنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کرتا تھا۔

آیت "۳، ۴" قریش کی ذمہ داری بیان کرتی ہیں، البتہ یہ ذمہ داری تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔

اللہ کی طرف سے ان کو جو نعمتیں دی گئی تھیں ان نعمتوں کو بہترین، اچھے اور مطلوبہ طریقہ سے استعمال کریں۔

ایک اور نکتہ جس پر آیت "۴" میں زیادہ توجہ دی جانی چاہیے وہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ واضح مصیبتیں جو لوگوں کے سکون کو ذاتی اور شخصیت کے نقطہ نظر سے، یعنی جسمانی اور روحانی پہلو سے خراب کرتی ہیں ان کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتادیا گیا ہے۔

ان دو آفتوں سے مراد ہے: بھوک اور خوف، انسانوں کی جسمانی اور مادی لحاظ سے بھوک اور روحانی اور نفسیاتی لحاظ سے خوف اور ڈر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ قریش

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ إِلَهِهِمْ رَحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۚ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ
مِّنْ جُوعٍ ۚ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۚ

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ	قریش میں محبت ڈالنے کے واسطے
إِلَهِهِمْ رَحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۚ	ان کے دل میں سردی اور گرمی کے سفر کی محبت ڈالنے کی وجہ سے
فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ	تو ان پر لازم ہے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں
الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ ۚ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۚ	وہ جس نے انہیں بھوک سے (بچا کر) کھانا دیا ، اور خوف سے (بچا کر) امن دیا

سورہ قریش کی تفسیر

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ	قریش میں محبت ڈالنے کے واسطے

"ایلاف" مصدر ہے، جس کے معنی محبت ڈالنا ہے، اور "الفت" بمعنی: اجتماع، ہم آہنگی، مانوسیت اور انسانیت کے ہے، بعض مفسرین "ایلاف" کے معنی میں لکھتے ہیں کہ: "ایلاف" امت میں محبت ڈالنا، اور قریش میں محبت ڈالنا یا دوسرے قبیلوں میں جو ان کے ساتھ تھے، اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کو نیست و نابود کرنے کے بعد انہیں یہ الفت عطا فرمائی۔

لہذا یہ سورہ بعد سورہ فیل کے واقع ہے اور اس کے مشتملات اس بات کو ثابت کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، بعض مفسرین نے ان دونوں سورتوں کو ایک سمجھا ہے، اس کا مقصد قریش اور مکہ کی مقدس سرزمین

اور خانہ کعبہ کے درمیان اتحاد پیدا کرنا ہے، کیونکہ وہ اور تمام اہل مکہ اس سرزمین کی مرکزیت اور امن کی وجہ سے یہاں آباد ہو گئے تھے، حجاز کے بہت سے لوگ ہر سال حج کے فرائض ادا کرنے کے لیے وہاں آتے تھے، اقتصادی اور ثقافتی تبادلے کرتے تھے، اور اس ملک کے مختلف نعمتوں سے استفادہ کرتے تھے، یہ سب امن و امان سے رہتے تھے اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر کعبہ ابرہہ کی فوج کشی سے ویراں ہو جاتا اور اس امن تباہ ہو جاتا تو اس سرزمین میں عرب کو رہنے کی جگہ نہیں ملتی۔

اگلی آیت میں مزید فرماتے ہیں کہ: مقصد قریش کو سردیوں اور گرمیوں میں سفر کا خوگر بنانا تھا۔

قریش کی الفت سردیوں اور گرمیوں کے سفر میں ظاہر ہوتی ہے، مقصد یہ ہے کہ اس الفت نے قریش کو یہ موقع دیا کہ موسم سرما اور موسم گرما کے سفر سے بھر پور فائدہ اٹھائیں، قریش سردیوں میں جنوب "یمن" اور گرمیوں میں شمال (شام) تجارت کے لیے جاتے تھے، وہ لوگ دونوں موسموں کاروباری دوروں سے فائدہ اٹھاتے تھے، اور اس طریقے سے روزی کماتے تھے۔

"إِلْيَافِ قُرَيْشٍ" قریش میں محبت ڈالنے کے واسطے

اس جاہلیت کے رسم و رواج کے خلاف جو خونریزی اور جنگ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی، اس مبارک سورہ میں "ایلاف و الفت" کے الفاظ کا تکرار قریش پر خدا کے فضل اور رحمت کا اظہار ہے، رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ قریش کو یہ نعمت نصیب ہوئی کہ جب وہ دور جاہلیت میں تجارتی سفروں پر نکلتے تھے تو راستے میں دوسرے قبیلوں کی طرف سے ان پر ڈاکہ یا حملہ نہیں ہوتا تھا، کیونکہ اعراب کہتے تھے کہ: قریش خدا کے گھر سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا احترام کیا جانا چاہیے، لہذا اللہ تعالیٰ نے قریش کو حکم دیا کہ وہ اپنے دو موسم: سرما اور گرما میں جو تجارتی دوروں میں امن و سلامتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اس پر اللہ کا شکر ادا کریں، کیونکہ اللہ نے دونوں سفروں کو ان کے لیے محفوظ اور آسان بنایا ہے، پیار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف لوگ اپنے جسموں کو جوڑیں، بلکہ اس سے ہر دور میں دلوں کا ملنا مراد ہوتا ہے، قریش اور معاشرے کے دیگر افراد میں الفت پیدا ہوئی ہے، جب اللہ تعالیٰ اس طرح کی نعمتیں دیتا ہے تو اس کی نعمتوں کا نتیجہ اتحاد ہوتا ہے، یہ دلوں اور قلب کی تالیف

ہے، مکمل ہمدردی اور ہم فکری ہے، ہمدردی اور ہم فکری کے ساتھ ہی انسان بہت مرتبہ، اقتدار اور وقار حاصل کرتا ہے۔

عقلمند وہ ہے جو انجام کا سوچے، اگر انجام دور ہے تو ہم کہتے ہیں کہ کل کے بارے میں سوچنا ہی عقلمندی ہے۔

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، لیکن ہمارا منصوبہ کیا ہے؟ اگر سونے سے پہلے صبح کی منصوبہ بندی نہ کریں، ہماری صبح اچھی نہیں ہوگی، ہمیں ہر رات سونے سے پہلے روز مرہ کی کارکردگی کا جائزہ لینا چاہیے، اور کل کے لیے سازگار اور اچھا منصوبہ ترتیب دینا چاہیے، کہ ہمیں کیا کرنا ہے، تو پھر اس کے بعد ہم دعا کریں اور کہیں: "اللَّهُمَّ اجْعَلْ يَوْمَنَا خَيْرًا مِنْ أَمْسِنَا وَغَدًا خَيْرًا مِنْ يَوْمِنَا" ترجمہ: "اے اللہ ہمارا آج گزشتہ کل سے بہتر اور آنے والا کل آج سے بہتر کر"۔

البتہ یہ دعا منصوبہ بنانے کے بعد پڑھنا چاہیے، کیونکہ اسباب تیار کیے بغیر دعا موثر نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ نے کیوں الفت ڈالی؟ قریش کو ہم فکر اور ہمدرد بنانے کے لیے، رب تعالیٰ کی مدد بہت بابرکت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق کے آثار اور نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ معاشرے کے افراد میں مشترکہ فکر، صف بندی، اور ہم آہنگی پیدا ہو۔

ان کے دل میں سردی اور گرمی کے سفر کی محبت ڈالنے کی وجہ سے	الفِہْمُ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝۲

قریش اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا مقصود ہے، کیونکہ ابرہہ کے واقعہ کے بعد لوگ ان کی طرف دوسری نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کے قافلوں کے احترام اور حفاظت کے قائل تھے، قریش کو بھی راستے میں ایسی حفاظت کی ضرورت تھی، اور مکہ کی سر زمین کو بھی اس امن کی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر کی شکست کی صورت میں انہیں امن عطا کیا۔

ہم جانتے ہیں کہ مکہ کی سرزمین میں نہ باغات تھے اور نہ ہی زراعت، اس وقت زراعت محدود تھی، زیادہ تر آمدنی ان تجارتی قافلوں کے ذریعے فراہم ہوتی تھی، سردیوں کے موسم میں وہ جنوب کا رخ کرتے تھے، جو یمن کی سرزمین ہے، جہاں موسم نسبتاً گرم تھا، اور گرمی کے موسم میں شمال کی طرف یعنی شام کی سرزمین، جس کا موسم معتدل اور سازگار

تھا، یمن اور شام کی سرزمین، اس زمانے میں تجارت کے اہم مراکز تھے، مکہ اور مدینہ دونوں کے درمیان ایک مربوط ربطہ سمجھا جاتا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قریش مکہ میں تجارت کے ذریعے رہتے تھے، لہذا اگر تجارت کے یہ دونوں سفر نہ ہوتے تو ان کے لیے مکہ میں رہنا ممکن نہ تھا، اور اگر کعبہ کی قربت انہیں تحفظ فراہم نہ کرتی، تو وہ کوئی کام اور سرگرمیاں کرنے کے قابل نہ ہوتے۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ اس سورت کا تعلق اپنے ماقبل کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کی نظر میں معنی یہ ہے کہ ہم نے قریش کو الفت دینے اور شہر مکہ میں ان کے امن اور محفوظ اجتماع کو برقرار رکھنے اور ان کے سفر میں ان کے خوگر ہونے کے لیے ہاتھی والوں کو مکہ سے دور رکھا، اور انہیں تباہ کر دیا۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ	تو ان پر لازم ہے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں

یعنی اگر قریش اللہ تعالیٰ کی دوسری نعمتوں کی وجہ سے عبادت نہیں کرتے تو انہیں اس خصوصی نعمت کی وجہ سے اس کی عبادت کرنی چاہیے، جس کا ذکر کیا گیا ہے، قریش پر خدا سبحان و تعالیٰ کی طرف سے اس حقیقت کا اعلان در اصل بت پرستی سے اس کی بیزاری کا اعلان ہے، کیونکہ قریش بتوں کی پرستش کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ انہوں نے اس گھر کے ذریعے جو خدا وحدہ لا شریک کا گھر ہے دوسرے عربوں کی بنسبت عزت امن تحفظ اور برتری حاصل کی ہے، پس ان کو چاہیے کہ نعمتوں کی ناشکری نہ کریں اور شرک نہ کریں۔

امام رازی فرماتے ہیں: "جان لو کہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے ایک: نقصان کا دور ہونا، اور دوسرا فائدہ حاصل ہونا، چونکہ نقصان سے بچنا فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفیل میں نقصان سے بچنے کی نعمت اور سورہ قریش میں ان کے لیے نفع حاصل کرنے کی نعمت کا ذکر کیا ہے، ان کی توجہ ان دونوں نعمتوں کی طرف مبذول کرانے کے بعد ان کو اپنی عبادت کا حکم فرمایا، تاکہ ان کی اس عبادت کو ان نعمتوں کے مقابلے میں شکر کا درجہ حاصل ہو۔

الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۖ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۝	وہ جس نے انہیں بھوک سے (بچا کر) کھانا دیا، اور خوف سے (بچا کر) امن دیا

یعنی: اللہ تعالیٰ نے قریش کو ان دو سفروں کی وجہ سے کھانا دیا، اور ان کو شدید بھوک سے نجات دی جس میں وہ مبتلا تھے، "اور ڈر اور خوف سے محفوظ رکھا" کیونکہ اس وقت اعراب ایک دوسرے کو لوٹتے اور قیدی بنا لیتے تھے، لیکن قریش ان حملوں اور لوٹ مار سے خدا کے گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے، اسی طرح ان کی خود مختاری بھی حبشی فوج اور ہاتھیوں کے لشکر کے حملے کے خوف سے محفوظ رہی۔

پس ان تمام نعمتوں کے شکرانے کے طور پر صرف اس اکیلے خدا کی عبادت کریں، اس کے ساتھ بتوں کو شریک اور برابر نہ ٹھہرائیں، اور ان کی عبادت نہ کریں۔

اس امن کے بارے میں رب عظیم سورہ عنکبوت آیت "۶۷" میں فرماتے ہیں: "أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَفُونَ النَّاسَ مِنْ حَوْلِهِمْ ۖ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ۚ" ترجمہ: "اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ بیشک ہم نے ایک حرم امن والا بنادیا ہے، جب کہ لوگ اس کے گرد و نواح سے اچک لیے جاتے ہیں، تو کیا یہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں؟"

یہ امن، سکون اور عافیت ان کے باپ حضرت ابراہیم کی دعا کا نتیجہ ہے جنہوں نے یہ دعا مانگی تھی: "رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ" (بقرہ: ۱۲۶) ترجمہ: "اے پروردگار! اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے جو خدا پر اور روز آخرت پر ایمان لائیں ان کو کھانے کو عطا کر۔"

تو کیا قریش پر واجب نہیں ہے کہ وہ اس خدائے واحد کی عبادت کریں، جس نے انہیں بھوک سے بچایا اور ان کے خوف کو سلامتی اور راحت میں بدل دیا؟

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: یہ اس لیے کہ جو اس حکم الہی کی تعمیل کرے گا اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی سلامتی عطا کر دی جائے گی، اور جو

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی نافرمانی کرے گا اس سے دونوں سلامتیاں چھین لی جائیں گی، جیسا کہ سورہ نمل کی آیات "۱۱۲-۱۱۳" اس کی گواہ ہیں۔

حدیث شریف میں اسماء بنت یزید بن سکن انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورہ "لایلاف قریش" کی تلاوت کی، پھر فرمایا: اے گروہ قریش! افسوس ہو تم پر! اس گھر کے رب کی عبادت کرو کہ جس نے تمہیں بھوک میں کھلایا اور ڈر و خوف سے محفوظ رکھا۔

قریش کا موسم سرما اور بہار کا سفر

یہ بات مشہور و معروف ہے کہ مکہ کی سرزمین ایسی جگہ واقع ہے جہاں اہل مکہ کے استعمال کے لیے نہ تو کوئی کھیت ہیں اور نہ پھلوں کے باغ، اس لیے بیت اللہ کے بانی حضرت خلیل اللہ نے مکہ آباد کرتے وقت اہل مکہ کے لیے بارگاہ الہی میں اس طرح کی دعا فرمائی: اے اللہ اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا، "ارزق اہلہ من الثمرات" کہ ہر قسم پھل باہر سے درآمد کیا جائے، "یجیی الیہ ثمرات کل شیء" اس لیے مکہ کے لوگوں کا ذریعہ معاش اور زندگی تجارت کے لیے سفر کرنے اور وہاں سے اپنی ضروریات کی اشیاء لانے پر مبنی تھی۔

عام طور پر اہل مکہ سال میں دو مرتبہ سفر کرتے تھے، پہلا سفر گرمیوں میں ہوتا تھا، جب وہ شام (آج کے سورہ) جاتے تھے اور اپنا مال بیچتے تھے، اور دوسرا سفر پورے سال میں سردیوں کے مہینے میں ہوتا تھا جب قریش کے لوگ یمن جاتے تھے، اور عام طور پر مغربی افریقہ اور دور ایشیاء سے مصنوعات خریدتے تھے، یاد رہے کہ شام اور یمن کے لوگ مکہ کے لوگوں خاص طور پر اہل قریش کو خصوصی احترام سے دیکھتے تھے۔

ہمارا عظیم رب قریش کو یاد دلاتا ہے کہ: میں نے یہ تمام نعمتیں تمہاری قوم کو عطا کی ہیں، ان نعمتوں میں سب سے اہم نعمت دین اسلام اور رسول ﷺ کی نبوت تھی، جبکہ یہ دونوں نعمتیں عطا کرنے سے پہلے وہ بت پرستی میں مصروف تھے اور جہالت کی زندگی گزار رہے تھے۔

کعبہ کا رب

البیت کا اطلاق عام طور پر کعبہ پر ہوتا ہے، جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا، اور یہ خود ایک عظیم نعمت ہے

جس سے قریش کے لوگ مستفید ہوتے تھے، اور تجارت کے لیے مکہ کے شمال اور جنوب میں ان کا سفر اور دوسری قوموں کی نظر میں ان کی عظمت ایک اور نعمت تھی، جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھی، لیکن حیرت ہے کہ ان کو ماضی میں جو نعمتیں ملیں اور نعمت اسلام کو دیکھتے ہوئے، وہ خدا کی عبادت کی بجائے پتھر اور لکڑی کے بتوں کی پوجا کرتے تھے، کعبہ کا وہ عظیم اور مالک وہی خدا جس نے قریش کو بھوک میں سیر کیا اور خوف سے محفوظ رکھا اس رب کی عبادت کی بجائے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

مکہ کی تاریخ سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مکہ غیر ملکی حملوں اور زمینی و آسمانی آفات کے خطرات سے محفوظ رہا ہے، اور یہ نبوت کی عظیم نعمت کے وجہ سے ہے، کہ جس کو خدا نے مکہ کے خطہ میں ازل سے مقرر فرمایا تھا۔

ایک حدیث نبی ﷺ سے منقول ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے بنی کنانہ کو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے چن لیا، اور بنی کنانہ سے قریش کو، اور قریش سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم سے مجھے برگزیدہ کیا، اور یہ خاندان اور رسول اللہ ﷺ کی ذات ایک عظیم اور لاثانی نعمت ہے کہ جو خدا نے قریش قوم کو عطا فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کنانہ کو حضرت اسماعیلؑ کی تمام اولاد میں سے چن لیا، اور پھر کنانہ سے قریش کو، اور پھر قریش سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم سے محمد ﷺ کو برگزیدہ فرمایا: (البغوی عن وائلہ بن الاسقع) اسی طرح دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: کہ تمام لوگ خیر اور شر میں قریش کے تابع ہیں (رواہ مسلم عن جابر، مظہری)۔

خدا کے انتخاب کی وجہ جو کہ پہلی حدیث میں بیان کی گئی ہے، غالباً یہ ہے کہ ہر قبیلہ کچھ خاص خصوصیات اور صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے، کفر، شرک اور جاہلیت کے زمانے میں ان کے کچھ غیر معمولی ملکات اور اخلاق بھی تھے، حق قبول کرنے کی صلاحیت ان میں بہت زیادہ ہی کمال کی تھی، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور اولیاء اللہ انہیں میں سے ہیں (مظہری)۔

رسول اللہ ﷺ کے پر دادا! "ہاشم بن عبد مناف" وہ پہلا شخص ہے جس نے

سامان اور خوراک کے لیے شام تک تجارت کو وسعت دی، اور ان کے بعد قریش نے بڑے پیمانے پر تجارت شروع کی ہاشم کا اصل نام "عمر والعلہ" تھا، کیونکہ وہ قحط اور قلت کے وقت غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے اور روٹیوں کو توڑ کر شوربا میں سرید بناتے تھے اس لیے ان کا نام ہاشم پڑ گیا (ہشم کا معنی ہے: شوربا میں روٹی توڑ کر سرید بنانا)، (ہاشم: سرید بنانے والا)۔

قریش کے بارے میں مختصر معلومات

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قریش نضر بن کنانہ کی نسل سے قبیلوں کے ایک مجموعہ کا نام ہے، جس کی تصغیر "قرش" سے قریش لی گئی ہے، کیونکہ قرش ایک بڑا آبی جانور ہے (مچھلی کی قسم) جو جہازوں پر حملہ کرتا ہے، انہوں نے قبیلہ قریش کو ایک ایسے جانور سے تشبیہ دی جو دوسری آبی مخلوقات کو کھاتا ہے، جب کہ خود چیر پھاڑنے سے محفوظ ہے، اور دوسروں پر غالب ہے، اور کوئی اس پر قابو نہیں پاسکتا۔

لیکن مفسر ابو حیان کہتے ہیں: قریش کو اس نام سے منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تقریش کا مطلب جمع ہونا ہے، اور قریش منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے، قصی بن کلاب نے انہیں حرم میں جمع کیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قریش کا لفظ "تقریش" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے متحد کرنا، کیونکہ قصی نے اس قبیلے کے بکھرے ہوئے لوگوں کو جمع کیا تھا، اس لیے اس کا قبیلہ اس نام سے پکارا جاتا تھا، بعض لوگ قریش کو "قرش" سے مشتق کہتے ہیں، جس کے معنی تجارت ہے جو ان کا بنیادی پیشہ تھا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ مکہ کی سرزمین میں کوئی پیداوار نہیں تھی اور نہ ہی اس میں زراعت کے قابل زمین تھی، نہ اناج اور اجناس تھے کہ خود استعمال کرتے اور دوسروں کو پیش کرتے۔

اس لیے مکہ مکرمہ کے رہنے والوں نے کاروبار اور تجارت کو ذریعہ معاش بنالیا تھا، اور اپنی ضروریات کو باہر سے درآمد کرتے تھے۔

مکہ کا وجود اور دور جاہلیت میں عرب قبائل کے درمیان قریش کا جو احترام تھا، اور حرم کا علاقہ جو پر امن مقام تھا، اور عرب دنیا کے مختلف حصوں سے عرب قبائل کا مکہ کی طرف آمد و رفت، یا تو اپنے بتوں کی پوجا کرنا یا حج کے مراسم میں شرکت کرنا ہوتا تھا، رجب اور

ذی الحجہ کے مہینوں میں یہ آمدورفت ہوتی تھی، عرب کی تجارت کی ایک اچھی بنیاد تھی تاجر اور ان کے تجارتی مال کے تبادلے کے لیے اچھا موقع ہوتا تھا۔

حجاز کا کاروبار قریش کے لوگوں یعنی اہل مکہ اور طائف کے امیروں کے ہاتھ میں تھا، قریش کی تجارت شمال میں فلسطین اور سوریہ کے ساتھ، اور جنوب میں یمن کے ساتھ تھی، اور بعض اوقات تاجر سمندر کے راستے حبشہ اور نجد کے راستے حیرہ (عراق) سے مدین تک جاتے تھے، یہاں تک کہ روم، مصر، ہند کے ساتھ بھی کاروباری تعلق تھا۔

مکہ کے تاجر گرمیوں میں شمال کی طرف جاتے تھے جب موسم اچھا ہوتا تھا اور سردیوں میں جب موسم سرد ہوتا تو جنوب کی طرف جاتے تھے۔

قریش کے تاجر اپنے تجارتی دوروں میں خوفناک صحراؤں سے گزرتے تھے، اور سینکڑوں میل کا سفر کرتے تھے صحراؤں اور میدانوں سے ہوتے ہوئے جہاں ہر طرف مکمل ہولناکی اور خوف کا سماں ہوتا تھا، نہ راستہ، نہ پانی، نہ درخت، نہ کوئی آبادی اور نہ کوئی عمارت تھی، صرف شمال کی طرف سفر کرتے ہوئے یا وہاں سے واپسی پر "خیبر" اور "مدینہ" سے گزرتے تھے، اور جنوب میں "طائف" کی طرف جاتے اور پھر "تہانہ" وادی اور وہاں کا رہائشی علاقہ مکہ شہر سے باہر نکلتے بائیں جانب "بحیرہ احمر" کا ساحل تھا، اور مغرب کی طرف وسیع و عریض میدان، پہاڑ اور بہت سی خوفناک وادیاں تھیں، اور اس طرف خلیج فارس، اور جنوب میں دریائے عمان واقع تھا۔

اپنے تجارتی دوروں میں مکہ کے تاجروں نے اپنے قافلوں کی رہنمائی اور مدد کے لیے قدیم عربوں کی موجودگی کو استعمال کیا جو صحرائی راستوں سے اور راستوں کے درمیان آنے والی آبادیوں سے واقف ہوتے تھے۔

قریش شمال سے عرب کے آخری جنوبی مقام یعنی یمن اور حضرموت تک پہنچ گئے تھے، اور اپنے بازاروں میں تجارت اور سامان کا تبادلہ کرتے ہوئے قبائلی فخر اور ان میں اپنا اور نسلی و ادبی پہلوؤں کو پیش کرتے تھے، ان کے دلکش اشعار اور پر جوش خطابات میں فخر اور مباہات صاف نظر آتی تھیں۔

ان موسمی بازاروں میں سب سے مشہور بازار "سوق عکاظ" تھا، جس میں

رسول اللہ ﷺ بھی اپنی جوانی میں شرکت فرمائی تھی۔

قریش کے مشہور ترین بازار

عربی میں "سوق" کا معنی بازار ہے، جس کی جمع "اسواق" ہے، عرب میں دس موسمی بڑے بازار تھے جو زمانہ جاہلیت یعنی: ظہور اسلام سے قبل عرب کے مختلف علاقوں میں مشہور تھے۔

حج کی تقریب کے بعد ان کے بازار رجب اور ذولحجہ کے مہینے میں مکہ، عرفات اور منیٰ میں منعقد ہوتے تھے یہ عرب قبائل کی عظیم پہچان تھی، اور سب سے اہم مراسم کا ذریعہ اور بڑی مجلس تھی، جو سال کے مختلف مہینوں میں منعقد ہوتی تھی۔

متعدد بازار منعقد ہونے کے مقامات اس طرح ہیں، موجودہ اردن، یمن، بحرین، خلیج، مسقط، عمان، نجد بھی جو کہ موجودہ عرب ہے۔

اس وسیع و عریض علاقے میں تقریباً تمام عرب قبائل چاہے بت پرست ہوں یا نصرانی، یہودی، ستارہ پرست، اور تمام دیگر ادیان و عقائد کے پیروکار ہوں، شام، عراق، یمن، بحرین اور سواحل خلیج فارس، نجد، یمامہ، تھامہ اور حجاز سے شرکت کرتے تھے۔

ان کے کام اور ان بازاروں میں شرکت کی ترتیب یہ ہوتی تھی کہ ماہ ربیع الاول سے لے کر ماہ ذی الحجہ تک آخری بازاروں میں شرکت کے بعد وہ مکہ آتے اور حج کی تقریب میں شرکت کرتے، اور حج کے سیزن کے اختتام پر اپنے قبائل میں واپس جاتے۔

سال بھر عرب قبائل اپنے ذاتی، مادی اور روحانی مفادات کو اس طرح ترتیب دیتے تھے، یہ عرب کے یمن، شام، فارس، حبشہ اور دیگر مقامات کے عرب تجارتی دوروں کے علاوہ تھا، عرب تاجر اکثر اپنا سامان جو ان ممالک سے لاتے تھے، اپنی ان دس منڈیوں میں پیش کرتے تھے، اور دوسرے شرکاء ان کا تبادلہ اپنی مصنوعات کے ساتھ کرتے تھے مشہور مورخ یعقوبی نے عرب کے دس بازاروں کو بیان کیا ہے جن میں وہ تجارت کے لیے جمع ہوتے تھے، اور دوسرے لوگ بھی ان میں جمع ہوتے تھے، اس طرح وہ اپنی جان و مال کو محفوظ بناتے تھے، یعقوبی اس کی اس طرح تشریح کرتے ہیں:

- 1- عرب کے دس بازاروں میں سے ایک بازار ربیع الاول کے مہینے میں دومة الجندل میں لگتا تھا، اس بازار کے سربراہ دو قبیلوں عنسانی اور بنی کلب سے تھے۔
- 2- مشقر کا بازار بحرین میں حجر کے علاقے میں جمادی الاولى کے مہینے میں لگتا تھا، قبیلہ بنی تمیم اسے کھولا کرتا تھا۔
- 3- بازار صحار (مسقط اور عمان میں سمندر کے کنارے واقع ایک شہر ہے) ماہ رجب کی پہلی تاریخ کو لگایا جاتا تھا۔
- 4- بازار ریا، عرب صحار سے ریا بازار آتے تھے اور وہاں کے حکمران آل جلدنی ان سے ٹیکس لیتے تھے۔
- 5- بازار شحر (یمن میں بحر ہند کے ساحل اور بہرہ کی سرزمین پر) وہاں کا بازار پہاڑ کے پہلو میں ہے جہاں حضرت ہود کی قبر واقع ہے بہرہ کے اعراب اسے منعقد کرتے تھے۔
- 6- بازار عدن، رمضان کے مقدس مہینے کی پہلی تاریخ کو ہوتا تھا، اور وہاں سے تاجر عطر دوسری جگہوں پر لے جاتے تھے۔
- 7- بازار صنعاء رمضان کے وسط میں اس کا افتتاح ہوتا تھا۔
- 8- بازار رابیہ، یمن کے جنوب میں حضرموت میں منعقد ہوتا تھا، اعراب محافظوں کے ساتھ وہاں جاتے تھے کیونکہ حضر موت محفوظ ملک نہیں تھا، اور کندہ قبیلہ اسے منعقد کرتا تھا، اور لوگوں کی آمدورفت کی حفاظت کرتے تھے۔
- 9- بازار عکاظ، سرزمین نجد پر واقع تھا، عرب ذی قعد کے مہینے میں عکاظ کے بازار میں جمع ہوتے تھے، اس بازار میں سارے عرب قبائل قریش سمیت، اکٹھے ہوتے تھے، ان میں سے اکثر مضر کے عرب تھے، بازار عکاظ میں عرب لوگ ایک دوسرے کے مقابل فخر کرتے تھے۔
- 10- بازار ذی الجاز، عرب کے لوگ عکاظ اور ذی الجاز کے بازار سے حج کے مراسم میں شرکت کے لیے مکہ کی طرف آتے تھے، سب سے مشہور و معروف بازار جس کا اسلامی تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے وہ عکاظ کا بازار ہے، کیونکہ قبائل تمام بازاروں میں شرکت کرتے ہوئے آخر میں سوق عکاظ کی طرف آتے تھے، اور وہیں پر وہ اپنے فحرو غرور، شاعری، تقاریر میں، اپنا تعارف اور پہچان کروانے میں لگ جاتے تھے۔

اس بازار میں پیغمبر خدا بھی تشریف لے جاتے تھے، اور نبوت کے اعلان کے بعد بھی بازار عکاظ میں اپنی شرکت اور جو کچھ وہاں دیکھا تھا یاد فرماتے تھے۔

مختصر یہ کہ عرب قبائل اپنے بازاروں میں شرکت کے لیے شمال اور مغرب سے چلے آتے تھے، جن میں سے اکثر (یہودیوں، عیسائیوں اور ستارہ پرستوں کے علاوہ دیگر لوگ) مکہ میں داخل ہوتے، اور موسم حج کی تقریب میں شرکت کرنے اور طواف کعبہ اور اپنے بعض بتوں کی پرستش کے بعد اپنے اپنے ملک چلے جاتے تھے (تاریخ یعقوبی جلد ۱)

سورہ قریش سے حاصل شدہ اسباق

عالم اسلام کے عظیم مفسر امام فخر الدین الرازی نے فرمایا ہے کہ نعمتوں کی دو قسمیں ہیں: ایک نقصان کو دور کرنے والی، جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفیل میں بیان فرمایا، دوسری نعمت ہے فائدہ حاصل کرنا، جو اس سورت میں بیان ہوا ہے، اور بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے نقصان دور کیا، اور ان کو فائدہ پہنچایا، جن کا شمار دو عظیم نعمتوں میں ہوتا ہے، ان کو حکم دیا کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، اور ان نعمتوں کے بدلے رب کے شکر گزار بنیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے مظاہر کا اعلان

قریش کے لوگوں کو نعمتوں کی یاد دلانا، اور قریش پر کیا گیا اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان بیان کرنا، جس سے وہ رب کے شکر گزار ہوجائیں، لیکن جب وہ لوگ اس نعمت کے بدلے ناشکری کرنے لگے، تو ان کی ناشکری کی وجہ سے ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔

صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت واجب ہے غیر اللہ کی قطعاً ناجائز

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورۃ الماعون

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس کی سات "۷" آیتیں ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورت کو "ماعون" اس لیے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو گھر کی ضروریات کو دوسروں سے روکے رکھتے ہیں، اور اسے ہمدردی میں نہیں دیتے، اس سورت کو "سورہ دین" بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اس سورت میں اخروی سزا نہ ماننے والوں کی مذمت کی گئی ہے، اس سورہ کا نام "الماعون" سورت کی آخری آیت سے لیا گیا ہے، "ماعون" فاعول کے وزن پر، معن کے مادہ سے ہے، جو جاری ہونے کا معنی دیتا ہے، اور ماعون سے مراد وہ چیز ہے جو جاری و ساری ہو، اور کہیں نہیں رکتی ہو، اور بہ معنی بھلائی بھی ہے جو جاری ہو، وہ بھلائی جو معاشرے میں پھیلتی ہو اور پوری طرح رواں دواں ہوتی ہے، اور ہر ایک کا احاطہ کرتی ہے۔

اس سورہ کی مبارک آیات کا عمومی موضوع اس سورت کے نام سے واضح ہے جو "ماعون" کی اہمیت کو بیان کرتی ہے، اور یہ کہ اہل ایمان اور خاص طور پر قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو ہمیشہ خود کو نیک اعمال میں مشغول رکھنا چاہیے، اس طرح کہ قیامت پر ایمان کی تصدیق کا راستہ "ماعون" کے جاری رکھنے میں ہے، اور جو شخص اس نیکی کو اپنے کسی بھی عمل سے روکنے کا ذریعہ اور بنیاد فراہم کرتا ہے، قیامت کے دن اس کے ایمان میں کمزوری اور عیب کا سبب ہوگا۔

سورہ ماعون کے دیگر نام

اس سورت کے نام: "أَرْءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْإِيمَانِ، أَلْتَكْذِيبُ وَمَاعُونَ" ہیں، بعض علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے، لیکن راجح قول یہ ہے کہ پہلی (۳) آیات مکی ہیں اور آخری (۴) چار آیات مدنی ہیں، کیونکہ مدینہ کے منافقین کے بارے میں آیا ہے کہ وہ ظاہری طور پر اور مسلمانوں کے سامنے نماز پڑھتے تھے، جبکہ درحقیقت خفیہ طور پر جاسوس اور منافق تھے۔

سورہ "ماعون" "سورہ السلوک" (راہ و روش) سے مشہور ہے، اور "سورة التي يَعْلَمُ أَنَّ الْقُرْآنَ لَا يَدْرِي مِنَ الْعِلْمِ مَعَ الْعَبْلِ" یعنی: وہ سورت جو یہ سکھاتی ہے کہ قرآن صرف لفظی طور پر پڑھنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے، اور قرآن کا علم عمل کے ساتھ ہونا چاہیے، پس باطن میں اور صرف انسانی دل میں نہیں ہے، بلکہ اسے عمل میں دکھانا چاہیے، آپ پاک دل اور نیت کے بہانے گزارہ نہیں کر سکتے، کیونکہ دین کا علم زندگی میں عمل کے میدان تک ضرور پہنچانا چاہیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس سورت میں ہم سے چاہتا ہے کہ ہم قرآن پاک کو اپنا طرز زندگی بنائیں۔

سورة الماعون کے نزول کا مقام

جمہور کے مطابق یہ سورہ مکی ہے، اور مختصراً یہ دو قسم کے لوگوں کے بارے میں بحث کرتی ہے۔

1 - کافر اور خدا کی نعمتوں کے منکر، اور یوم حساب و جزا کا انکار کرنے والے۔

2 - وہ منافق جو اپنا کام اللہ کی رضا کے لیے نہیں کرتے، بلکہ اپنے اعمال اور نمازوں میں دکھلاوا کرتے ہیں، پہلے گروہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی ناپسندیدہ صفات یاد دلائی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ یتیم کی توہین کرتے ہیں، اسے تنگ کرتے ہیں اور اس کی تربیت کی فکر نہیں کرتے وہ کوئی بھی اچھا نہیں کرتے، چاہے وہ اچھا کام زبان کا ہو جس میں ان کو کوئی قیمت ادا کرنا بھی نہیں پڑتی، وہ اللہ کی عبادت اچھی طرح نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔

اور ان میں سے دوسرا گروہ منافقین کا ہے جو نماز میں کوتاہی کرتے ہیں اور اسے اپنے وقت پر نہیں پڑھتے، اور صرف اس کی ظاہری شکل ادا کرتے ہیں، ان کی نمازیں بے روح اور بے مقصد ہیں، اور ریاکاری اور دکھلاوے والی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کو موت اور تباہی سے ڈرایا اور ان کے عمل کی مذمت کی ہے۔

یاد رہے کہ: ابن عباسؓ اور قتادہ کے نزدیک سورة الماعون مدنی ہے، "ہبة اللہ" نابینا مفسر اس مبارک سورت کے نزول کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

اس سورت کا آدھا حصہ مکہ مکرمہ میں عاص بن وائل کے بارے میں اور آدھا حصہ مدینہ میں عبداللہ بن ابی منافق کے بارے میں نازل ہوا ہے۔

تفسیر "جلوہ های از اسرار قرآن" کے مفسر کا سورۃ الماعون کے مدنی ہونے کے بارے میں یہ استدلال ہے کہ: اس سورت کے مدنی ہونے میں دو وجوہات کو اہم سمجھا جاسکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مکہ میں دکھلاوا کرنے والے نمازیوں کا ذکر نہیں ہے، ریا کار نمازی مکہ میں نہیں، بلکہ مدینہ میں تھے، مکہ کے حالات ایسے نہیں تھے کہ یہ دوغلے ریا کار عناصر مسلمانوں کی طاقت اور اختیار کو دیکھ کر مراعات حاصل کرنے کے لیے صفوں میں شامل ہوتے، وہ نماز پر یقین نہیں رکھتے تھے، ان کی نماز خدا کی رضا کے لیے نہیں تھی، خود کو دکھانے کے لیے مسجد کی صفوں میں آکر نماز پڑھتے تھے۔

مکہ میں حالات ایسے تھے کہ جماعت کے ساتھ اور مشرکین کی موجودگی میں نماز پڑھنا مشکل اور مشرکین کو جنگ کی دعوت دینے کے مترادف تھا، یہ کام منافق اور ریا کار عناصر کا نہیں تھا۔

دوم: معاشرتی تعلقات اور مسائل پر بحث مدنی سورتوں کے مباحث میں سے ایک ہے، نہ کہ مکی سورتوں کے اس سورت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ریا کار نمازی "ماعون" دینے سے انکار کرتے ہیں "عام طور پر ایک محلے کے لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں" اس طرح کے مسائل پر بحث مکہ کے ماحول اور اس مرحلے سے متعلق سورتوں کا نہیں ہے۔

شہید سید قطب اس سورہ کی مکی اور مدنی نوعیت کے بارے میں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں، بعض مفسرین اس سورہ کو مکی اور بعض مدنی سمجھتے ہیں، جبکہ متعدد مفسرین کی رائے ہے کہ اس سورہ کی پہلے تین آیات مکی اور باقی آیات مدنی ہیں۔

تفسیر "فی ظلال القرآن" کے مفسر لکھتے ہیں: دوسرا نظریہ راجح ہے، تاہم اس سورت میں عام طور پر ایک مربوط اور متعلقہ وحدت ہے، اس میں اس عقیدے کی سچائیوں کی عمومی حقیقت کے اظہار کے لیے ایک نقطہ نظر ہے، ایک واحد نقطہ نظر جو ہمیں اس سورہ کو عمومی طور پر مدنی ماننے پر مجبور کرتا ہے، کیونکہ یہ سورہ جن موضوعات سے متعلق بحث کرتی ہے وہ قرآن کے مدنی موضوعات میں سے ہیں، زیر بحث موضوع ریا

اور منافقت سے متعلق ہے، نفاق اور ریاء مکہ میں مسلمانوں کی جماعت میں مشہور نہیں تھے، البتہ ان روایات کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اس سورت کے مکی اور مدنی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ ممکن ہے اس سورت کی آخری چار آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہوں، اور اس کی پہلی آیات کے ساتھ شامل ہو گئی ہوں، موضوع کی مماثلت کی وجہ سے۔

سورة الماعون کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة الماعون مکی ہے، اس میں ایک (۱) رکوع، سات (۷) آیات، پچیس (۲۵) الفاظ، ایک سو پندرہ (۱۱۵) حروف اور ساٹھ (۶۰) نقطے ہیں۔

(قرآن کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے تفسیر احمد سورة الطور ملاحظہ کریں)۔

سورة الماعون کا سورہ قریش سے ربطہ و مناسبت

الف: سورہ قریش نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ناشکروں کی سرزش کی، جبکہ اس سورت میں ان پر غریبوں کی پروا نہ کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی نہ کرنے اور ان کی مدد نہ کرنے کی مذمت ہے۔

ب: سورة قریش لوگوں کو خدائے واحد کی حقیقی عبادت اور بندگی کی طرف دعوت دیتی اور بلاتی ہے، اور سورہ ماعون نماز قائم کرنے میں غفلت اور کوتاہی کرنے والوں کی سرزش کرتی ہے۔

ج: سورہ قریش میں، ان نعمتوں کا ذکر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اہل قریش کو عطا کی تھیں، ان کے مقابلے میں وہ قیامت اور دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے، جبکہ سورة الماعون میں ان کو اور ان جیسوں کو روز قیامت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

سورة الماعون کا سبب نزول

سورة الماعون کے نزول کی وجہ بیان کرتے ہوئے مفسرین نے مختلف اقوال پیش کیے ہیں، ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ آیت عاص بن وائل سہمی کے بارے میں نازل ہوئی، مفسر سدی فرماتے ہیں: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ایک قول کے مطابق: یہ آیت ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی جو ایک یتیم کا کفیل تھا، تو وہ یتیم اس کے سامنے برہنہ حالت میں

آیا، اور اس نے اپنی جائیداد کا مطالبہ کیا، لیکن اس نے یتیم کو بھگا دیا ابن جریج کہتے ہیں کہ: یہ آیت ابوسفیان کے بارے میں نازل ہوئی جو ہر ہفتے ایک اونٹ ذبح کرتا تھا، اسی دوران ایک یتیم نے اس سے کچھ مانگا تو اس نے اپنی چھڑی سے یتیم کو دھکیل دیا۔

سورہ ماعون کا عمومی مواد

اس سورت میں ناشکرے، منکر، منافق اور ان میں سے ہر ایک کے عمل کے بدلے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، یہ سورت ان لوگوں کے لیے ہے جو بظاہر دیندار بنے ہوتے ہیں، لیکن عملی طور پر احکام پر عمل نہیں کرتے، ان کو تنبیہ اور سرزش کرتی ہے، اس سورت میں قیامت کے منکرین کی پانچ خصلتیں بیان کی گئی ہیں (خرچ کرنے سے گریز کرنا، یتیموں اور مسکینوں کو دھتکا رنا، دکھلاوا، نماز میں کوتاہی اور ضرورت مندوں کی مدد سے گریز)۔

اس سورت میں نماز میں ریا کاری، دکھلاوا اور سستی و کاہلی سے لے کر ہر چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور لوگوں کو یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دی گئی ہے، تاکہ وہ ابوسفیان کی طرح نہ ہوں، اور یتیموں کی عزت کریں، اور قیامت کے دن اور قیامت کے انکار، اور اس دن کے انسان کے عمل کے بدلے کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔

دوسرے لفظوں میں سورہ ماعون اس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دینداری صرف اللہ کے وجود کو تسلیم کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اچھے اور نیک اعمال انجام دینا، برائی اور ناشائستہ کاموں کو ترک کرنا بھی ضروری ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ سورۃ الماعون منفی سوچ رکھنے والے افراد دو اشخاص کا اصلی اور حقیقی چہرہ متعارف کراتی ہے:

- 1- وہ لوگ جو دین کے بارے میں منفی سوچ اور نظریہ رکھتے ہیں: "يُكْذِبُ بِالَّذِينَ" آیت مبارکہ میں دین اور قیامت کی تکذیب سے مراد وہی دل کی تکذیب اور انکار ہے، قولی نہیں ہے، کیونکہ سورہ کے مخاطب وہ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں، لیکن ان کی نماز میں منافقت، دکھاوا، سستی اور غفلت ہے۔

2 - جو یتیموں اور مسکینوں کے بارے میں برا رویہ رکھتے ہیں اور انہیں بھگاتے ہیں "يُدْعُ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ"

3 - وہ جو عبادات اور خاص طور پر نماز میں سست ہیں، اور خلوص نیت سے ادا نہیں کرتے (سَاهُونَ-يُرَآءُونَ)

4 - جو عام لوگوں کی خدمت اور ان کو بھلائی پہنچانے میں سستی کرتے ہیں اور کوتاہی کرتے ہیں: "وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ"

چنانچہ اس سورہ مبارکہ میں آیت: "۱ تا ۷" بیان کیا گیا ہے کہ: روح اور اخلاص کے بغیر عبادت کرنا سراسر بے اثر ہے، آپ یقین رکھیں کہ یہ نمازی کو اس کی منزل تک نہیں پہنچائے گی، اور دونوں مقام کے کٹھن اور دشوار راستوں سے نہیں گزارے گی، بلکہ یہ پکڑا جائے گا یہ سورہ عبادت کرنے والے کو سکھاتی ہے کہ: عبادت اور دینی شعار خالص ہو، دکھلاوے سے پاک، اور درست نیت کے ساتھ ہونی چاہیے، ایسے پاک دین کے سائے میں ذاتی اور معاشرتی زندگی میں انسان کو اپنے جیسے بنی نوع انسان کے ہاتھ گرم جوشی اور مضبوطی کے ساتھ تھامنا چاہیے، اور جو کچھ اس کی استطاعت میں ہو تو روز مرہ کی زندگی میں ضرورت مندوں کی مدد کرنی چاہیے۔

سورت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ خدا انسان کو تاکید کرتا ہے کہ وہ پاک چہرے کو ناپاک اور بیمار (مخلص اور ریا کا) چہروں سے الگ کر کے پہچان لیا کرے، اور جان لے کہ دین الہی کو جھٹلانے والے، انفرادی اور معاشرتی فریضہ کو نہیں سنتے، بلکہ مسلسل ناشکرے اور خود غرض ہوتے ہیں، اور کبھی یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کا نہیں سوچتے بلکہ دوسروں کو بھی بھلائی اور ان کی مدد کرنے سے روکتے ہیں، مظلوموں اور ضرورت مندوں کو سختی، تشدد اور برے الفاظ کہہ کر بھگا دیتے ہیں، اور ان کی تذلیل کرتے ہیں، اور انہیں پست اور کم تر سمجھتے ہیں (فجر: ۱۷ اور ۱۸)

حالانکہ بے سہارا ضرورت مند مالداروں کے مال اور جائیداد میں حق رکھتے ہیں۔ (معارج آیات: ۲۴ و ۲۵)

اب اگر وہ لوگ جن میں یہ ادنیٰ اور نچلی صفات ہوں اور ظاہری طور پر نماز ادا کریں اور اپنے آپ کو دیندار ظاہر کریں، تو ان پر افسوس! وہ اپنے

آپ کو خدا کی رحمت سے محروم کرتے ہیں، حالانکہ وہ نماز ادا کرتے ہیں، لیکن اس کی قدر نہیں کرتے،

اس کے ارکان اور آداب کی پابندی نہیں کرتے، وہ بہت سست اور غافل ہیں، اس کی بے قدری کرتے ہیں، جس طرح اسے ادا کرنے کا حق ہے ویسے ادا نہیں کرتے، تاکہ دل کی خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بنے، ان کا عمل سوائے منافقت اور دکھاوے کے کچھ نہیں ہے (مساد ۱۴۲)، (حریم: ۵۹، ۶۰)، (مدثر آیات: ۴۲ تا ۴۷)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُورَةُ الْمَاعُونِ

اَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْاٰیٰتِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِي يُدْعُ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يُخْصُ عَلٰی طَعَامِ الْمَسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ
لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرْآءُوْنَ ۝۶ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
اَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْاٰیٰتِ ۝۱	اور تم نے اس شخص کو دیکھا جو (روز) جزاکو جھٹلاتا ہے
فَذٰلِكَ الَّذِي يُدْعُ الْيَتِيْمَ ۝۲	یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔
وَلَا يُخْصُ عَلٰی طَعَامِ الْمَسْكِيْنِ ۝۳	اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴	پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے
الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵	وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں
الَّذِيْنَ هُمْ يُرْآءُوْنَ ۝۶	وہ جو دکھاوا کرتے ہیں
وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷	اور وہ (زکوٰۃ ادا کرنے اور) ضروریات زندگی (ادھار) دینے میں ہچکچاتے ہیں

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"اَرَأَيْتَ" کیا آپ نے دیکھا؟ کیا پہچانا؟ کیا آپ نے جانا؟ (کھف: ۶۳)،
(مریم: ۷۷)، فرقان

یہ بھی معنی ہے: مجھے بتاؤ، مجھے خبر دو، "يُكَذِّبُ" "کذب" کے مادہ سے اور صدق کے مقابل ہے، ایسی بات جو حقیقت کے خلاف ہو اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، یعنی: ایسا کلام جو حقیقت سے خالی ہو، اس کے مقابلے میں صدق ہے جو ایک حقیقت پر مبنی کلام ہے، "الدين" دین، مذہب، قانون،

جزا اور بدلہ، "یدع" (دع) سختی سے دھتکارتا ہے، تشدد اور توبہ کے ساتھ بھگاتا ہے، (طور: ۱۲، یدعون) پر تشدد طریقے سے پھینکے جاتے ہیں۔

"لَا يَخْضُ" (حض) حوصلہ افزائی نہیں کرتا، رغبت نہیں دلاتا، (حاقہ: ۲۴)

"طَعَامِ الْبُسْكِينِ" بے سہاروں کو کھانا کھلانا، "سَاهُونَ" (سہو) جمع ساہی، غفلت برتنے والے، بے خبر، حقیر سمجھنے والے، "يُرْآَوْنَ" دکھاوا کرتے ہیں، منافقت اور ریا کاری کرتے ہیں، "ماعون"، "معن" سے وہ اوزار اور سامان جو پڑوسی اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عام طور پر ایک دوسرے کو عاریتاً دیتے ہیں، جیسے گھریلو اشیاء، شادیوں میں کھانے کا سامان، جیسے: بیلچہ، برتن، مٹکہ اور اس جیسے چیزیں (فرقان)

تفسیر

اور تم نے اس شخص کو دیکھا جو	أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْإِيْمَانِ ۖ
(روز) جزا کو جھٹلاتا ہے	

دین کا انکار کرنے والا، اللہ اور اس کے رسول، یوم آخرت اور احکام کا انکار کرنے والا؟ اس استفسار کا مقصد حیرت پیدا کرنا ہے اور ساتھ ہی سننے والے کو اس کے بعد کہی گئی باتوں کو جاننے کی ترغیب دینا ہے۔

"أَرَأَيْتَ" رؤیت کے مصدر اور "رای" کے مادہ سے فعل ماضی ہے، جس کا معنی "دیکھنا" ہے، یہ دیکھنا ضروری نہیں ہے کہ ظاہر دیکھنا ہو، اللہ تعالیٰ نے کئی بار اس تعبیر کو یہاں اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان کیا ہے جو ان لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کا ایک طریقہ ہے جو کسی نہ کسی طرح سے غفلت میں پڑے ہوئے ہوں۔

یہاں خطاب رسول اللہ ﷺ کے لیے مخصوص ہے، اس کے بعد جو بھی نبی کا پیروکار ہو، کیونکہ یہ غفلت رسول اللہ ﷺ سے نہیں ہوئی لیکن خدا تعالیٰ چاہتا ہے ان کے توجہ ان لوگوں کی طرف کر دے جو دین پر ایمان نہیں رکھتے، نبی ﷺ کے بعد خطاب کا رخ ہم انسانوں کی طرف ہے جو عام طور پر غفلت سے دوچار ہیں اور ہوتے ہیں، ضروری ہے کہ ہمیں ایسی تنبیہ کی جائے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں

"أَرَأَيْتَ" ظاہرا "رؤیت" سے آتا ہے کہ کیا نہیں دیکھا یہ بات قابل ذکر ہے کہ

رؤیت دو طرح کی ہوتی ہے، آنکھ کی رؤیت، اور قلب کی رؤیت۔

تمام قرآن کی آیات میں جہاں لفظ "ارْءَيْتَ" استعمال ہوا ہے، اس سے مراد رؤیت قلبی ہے، لہذا اس صورت میں قرآن کے "ارْءَيْتَ" جتنے ہیں سب کے معنی اس طرح کیا جانا چاہیے: آپ کی کیا رائے ہے کسی ایسے شخص کے بارے میں جو، مثال کے طور پر، دین الہی کا انکار کرتا ہے؟ مثلاً یہ پہلا لفظ ہے جس پر خاص غور فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے، جب وہ فرماتا ہے: "ارْءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْذِّينِ" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین سے مراد قیامت ہے، کیونکہ قرآن کریم میں دین کے مختلف استعمالات ہیں، لیکن دین کے اہم ترین معانی اور استعمالات میں سے ایک قیامت بھی ہے، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں ہے کہ "مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ" اور سورہ انفطار میں "وَمَا آذْرُكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ" ○، یہاں بھی دین بہ معنی روز جزا کے استعمال کرتے ہیں۔

دین: دان کے مادہ سے بدین، دیناً کسی پر مسلط ہونے کے معنی میں ہے، "دینونت" بھی اس کا دوسرا مصدر ہے، جیسا کہ سورہ قریش میں عبد کے سلسلے میں ذکر ہوا ہے، عبد، یعبد، عبداً کے دو مصدر ہیں، یہاں بھی دینویت کا معنی زیادہ تر دین ہے، دائن خدا تعالیٰ ہے جو کہ غالب ہے، مدیون یا مدین وہ بندے ہیں جو خدا کی قدرت اور اقتدار کے ماتحت ہیں؛ لہذا یہاں دین سے مراد اطاعت ہے جو کہ دین کے معانی میں سے ہے، مثال کے طور پر "لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" ○ یعنی فرمانبرداری کرنے میں کوئی زبردستی نہیں ہے کیونکہ اگر زبردستی ہوتی تو اس صورت اخلاق ختم ہو جائیں گے، اگر اطاعت میں خلوص نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں، دین کا ایک اور معنی اجر و ثواب ہے، جو بندوں کو خدا کی طرف سے دیا جاتا ہے، اور درحقیقت یہ بندے کو فضل و کرم میں ڈھانپ کر اسے مقروض بنا دیتا ہے، تیسرا معنی اس کا بہ معنی قیامت ہے، کیونکہ اس دن خدا کے تمام بندے محکوم اور خدا بندوں کی قسمت کا حاکم ہوگا، اس دن حقیقت میں سزا اور جزا دی جائے گی اور اطاعت کرنے والوں کی صفیں نافرمانوں کی صفوں سے الگ ہو جائیں گی، اسی لیے دین کا معنی قیامت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، اور دین کے دیگر معانی بھی آئے ہیں، کہ ان میں سے: قانون، طریقہ اور منصوبہ، ہمیں آیات کے سیاق و سباق سے مطابقت رکھنے والے معانی استعمال کرنے چاہیے، ورنہ ہم آیات کے معانی میں غلطی کریں

گے مثلاً: "أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ" (الزمر: ۳) یعنی: خالص اطاعت اللہ کے لیے ہے، "لَا إِكْرَافَ فِي الدِّينِ" (البقرة: ۲۵۶) اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی جبر یا زبردستی نہیں ہے، "مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ" یہاں "یوم" کی تعبیر آئی ہے، اور لفظ دین کے اطلاق کو معین کر دیا ہے، کہ روز جزا یا قیامت کے دن کا مالک ہے، "إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ" ○ یہاں دین کا معنی فرمانبرداری یا قواعد، قانون اور ضوابط کے ہیں۔

یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔	فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ○۲

وہ نہ صرف اس کی مدد نہیں کرتا بلکہ اس کی توہین کرتا ہے اور اسے ذہنی تکلیف پہنچاتا ہے، "يَدُعُّ" اس کا اصل دُعُ کے مادے سے ہے، اس کا معنی ہے بھگادیا، خود سے دور کر دیا، البتہ بہت ہی برے طریقے سے بھگانا، یعنی: سختی اور تشدد سے دور کرنے کے لیے دُعُ لفظ استعمال ہوتا ہے، يَدُعُّ مضارع ہے، یعنی پر تشدد طریقے سے توہین کر کے بھگانا۔

اور "يَدُعُّ الْيَتِيمَ" کے جملے میں اس معنی کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ یتیم کو دور رکھتا ہے، اپنے پاس سے بھگاتا ہے، اور اسے دفع کرتا ہے، دین حق کا منکر یتیم کو نظر انداز کرتا ہے، مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، کوئی موقع نہیں دیتا، اس بارے میں کچھ نہیں کرتا، پس یتیموں اور مسکینوں کی حالت کا خیال کرنا دین حق کی شرطوں اور ایمان کی بنیادوں میں سے ہے، جس نے اس عملی فرض کا انکار کیا اس نے خدا کے فرمان کا انکار کیا اور اس پر ایمان نہیں لایا اور خدا کے دین کا انکار کیا۔

یہ بیان اس بات کی فیصلہ کن دلیل ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی وضاحت نہیں ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے: "أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْدِّينِ ○۱ فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ○۲ وَلَا يَحْضُ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ ○۳" سچی بات یہ ہے کہ خدا اور دین پر ایمان کے حقیقی معنی خدا کی تخلیق اور معاشرہ کے معاملات اور لوگوں کے حالات پر غور و فکر اور توجہ کا متقاضی ہے ورنہ ایمان نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے

کہ دنیا کے خالق، دنیا کے خدا، عادل، مہربان، رحم کرنے والے، اس خدا پر ایمان لانا جس سے ہر اچھی اور شایستہ و بہترین صفت شروع ہوتی، اور اس پر ختم ہوتی ہے، ہر اچھی چیز کا نقطہ آغاز اور اختتام خدا پر یقین ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم سچائی اور انصاف پر مبنی دنیا کے وجود پر ایمان رکھیں، کیونکہ خالق کی صفات اس کی تخلیق میں جھلکتی ہیں۔

"الْيَتِيمَ" یتیم: جو یتیم کے مادہ سے ہے، اس کا معنی منحصر ہونا ہے، اس کا اصل معنی دُر یتیم آیا ہے، دُر موتی کے معنی میں ہے، موتیوں کے متلاشی جب ان موتیوں کو تلاش کر لیتے ہیں، تو ان میں سے بعض موتی زیادہ دلکش ہوتے تھے، یہ موتی جنہیں عورتیں اپنے گلے میں لٹکا کر دوسرے موتیوں کے بیچ میں رکھتی تھیں، در یتیم کہتے تھے، جس کا معنی اکیلا، جب کہتے ہیں کہ: فلاں یتیم ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ اکیلا ہے، یتیم پندرہ سال کی عمر تک ہے، بالغ ہونے کے بعد اس پر لفظ یتیم لاگو نہیں ہوتا۔

یادر ہے کہ: یتیم کسی بھی دور میں معاشرے کا سب سے محروم طبقہ ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کسی یتیم کی محرومیوں کو دور نہیں کرتا، اس کی مدد نہیں کرتا تو وہ یقیناً معاشرے کے دیگر محروم طبقوں کے ساتھ بھی مہربان اور فیاض نہیں ہوسکتا، لہذا دین کے منکروں کی پہلی خصلت محروموں کو تباہ کرنا اور ستائے ہوئے لوگوں کو روندنا ہے۔

وَلَا يَجُزُّ عَلَى طَعَامِ الْيَتِيمِ ۝۳	اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا

حاجتمندوں اور مساکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دوسروں کو بھی نہیں دیتا، یعنی یہ شخص جو روز قیامت کا منکر ہے، وہ ہے جو اپنے بخل کی وجہ سے غریب کو کھانا نہیں کھلاتا، روزانہ ہی اپنے گھروالوں یا دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا ہے، کھانا کھلانا اسلام میں اعلیٰ ترین اقدار میں سے ہے، اور اگر غریبوں کو کھانا کھلایا جائے تو اس کی قدر بہت زیادہ ہے، عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر مسلمان ہو گئے، چونکہ عقلمند آدمی تھا، نبی ﷺ سے کہا: اب جب کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، نہیں چاہتا کہ بغیر کسی منصوبے کے رہوں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ذمہ داری دے دیں تاکہ اس منصوبہ اور ذمہ داری کی بنیاد پر اپنی شخصیت کو ترقی دے سکوں۔

تو نبی ﷺ نے ان سے بیان فرمایا: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَطْعِمُوا الطَّعَامَ" "کھانا دو، چاہے وہ ضرورت مند ہو یا وہ آدمی جو حاجتمند نہ ہو، سب کھالیں، وہ خود بھی اس پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی اسی کی تبلیغ کرے، اور جو کوئی اللہ کے لیے دسترخوان بچھاتا ہے، اسے یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا اجر دے گا، اور ایسے سخی لوگ بھی تھے جو اکیلے کھانا نہیں کھاتے تھے، اور اگر کبھی ان کے مہمان نہیں ہوتے تھے تو وہ اس دن روزہ رکھتے تھے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ دسترخوان پر برکت اس وقت ہوتی ہے، جب ان کے دسترخوان پر مہمان ہوتے ہیں، مہمان کی عزت ضروری ہے۔

ابراہیم خلیل اللہ کے گھر پر جب مہمان آئے تو پوچھا نہیں کہ کیا آپ لوگوں نے کھانا کھایا ہے؟ (کیونکہ مہمان سے سوال کرنا عزت اور غیرت کے خلاف ہے) ایک بچھڑے کو بھون کر مہمانوں کے سامنے لاکر رکھ دیا۔

"يَحْضُ" حض کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کا معنی ہے ترغیب دینا، حوصلہ افزائی کرنا، اس کا مضارع "يَحْضُ" ہے، اس طرح کہ یہ "دُعُ" کا مخالف نکتہ ہوسکتا ہے، "دُعُ" یعنی سختی سے روکا، دور کر دیا، "حُضُ" یعنی حوصلہ افزائی کی۔

"يَدْعُ" يَحْضُ کے مقابل ہے۔

طعام: کوئی بھی چیز کھلائی جاسکتی ہے، جو انسان کو سیر کرتی ہو، اس لیے پھل پر لفظ طعام کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے انسان کا پیٹ نہیں بھرتا۔

مسکین اور فقیر

"مسکین" مسکن کے مادہ سے ہے، اور "تسکن" یعنی رہنے لگے، ساکن ہو گئے، حرکت کرنے سے رک گئے، یہ اصطلاح اس شخص کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کو غربت نے چلنے پھرنے سے روک دیا ہو، یعنی فقر کے شدید ہونے کے وجہ سے حرکت نہیں کرسکتا، مسکین جس کا معنی چاقو ہے، اسی معنی سے ماخوذ کیونکہ جب جانور کو ذبح کرنے کے لیے چھری کا استعمال کرتے ہیں تو چھری پھرنے کے بعد جانور حرکت کرنا چھوڑ دیتا ہے، اور ہلتا بھی نہیں ہے، یعنی: اس کی حرکت روکنے کا ذریعہ ہے، غریب

اور مسکین میں فرق یہ ہے کہ غریب کے پاس کچھ نہیں ہوتا، وہ اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہو، جبکہ مسکین وہ ہے جس کی ضروریات فقیر کی بہ نسبت کم ہوں۔

فقیر اور مسکین کے بارے میں صحیح ترین قول یہی ہے، البتہ بعض علماء نے ان دونوں کی برعکس تعریفیں کی ہیں، ان دونوں طبقوں میں سے ہر ایک کو اس کی آمدنی کے مطابق اس کی ضروریات مد نظر رکھتے ہوئے دیا جاتا ہے، البتہ ضروریات ماحول کے فرق کے مطابق مختلف ہوتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ ایک صحیح حدیث میں فرماتے ہیں: "لیس المؤمن الذی یشبع وجارہ جائع إلی جنبہ"، "جو شخص پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی اس کے برابر میں بھوکا ہو، وہ مؤمن نہیں ہے" (السلسلہ الصحیحہ (149/1) و بخاری در (الأدب المفرد) (112)۔

شیخ البانی [ؒ] اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اگر کوئی امیر ہے تو اس کے لیے حرام ہے کہ اپنے بھوکے پڑوسی کو بھول جائے، اس پر واجب ہے کہ ان کے بھوک مٹانے کے لیے کوئی اقدام کرے، اور انہیں زندگی کی دیگر ضروریات بھی فراہم کرے۔"

نیز حدیث میں بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے حق کے علاوہ ہر شخص کے مال و جائیداد پر ایک اور حق بھی ہے، (اور وہ ہے ضرورت مندوں کو صدقہ کرنا) امیروں کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ سالانہ زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری سے آزاد ہو جائیں گے، اور ذمہ داری ان کے کندھوں سے اتر جائے گی۔

بلکہ ان پر دوسرے حقوق بھی بعض پیش آمدہ شرائط کی بنا پر ان پر واجب ہیں کہ انہیں ادا کریں، ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے اور تنبیہ میں شامل ہو جائیں گے: "وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَبِئْسَ لَهُمْ بِعَاقِبِ الْإِيمَانِ ۝۳۴ (سورہ توبہ: ۳۴) ترجمہ: "اور جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، تو انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔"

"يَوْمَ يُخْلَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فُتْكُوى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا نَفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝۳۵" سورہ توبہ (۳۵) ترجمہ: "جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا، یہ ہے جو تم نے اپنے لیے خزانہ بنایاتھا، سو چکھو جو تم خزانہ بنایا کرتے تھے"۔ (السلسلہ الصحیحہ 149/1)۔

لہذا ہر وہ مسلمان جو الحمد للہ روزی اور خوراک کے لحاظ سے سازگار حالات میں ہو، اور اس کا کوئی پڑوسی مالی اور معاشی لحاظ سے مشکلات کا شکار ہو، تو اس پڑوسی کے واجب حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ یہ امیر آدمی اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے اور اس کی مدد کرے، اپنی استطاعت کے مطابق اس کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ نے جو اسے دیا ہے اس میں سے اپنے ضرورت مند پڑوسی پر بھی خرچ کرے۔

محترم قارئین

سورۃ الماعون کی درج ذیل چار آیات بعض مفسرین کے مطابق: مدینہ کے بعض منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اس لیے سورہ کا آدھا حصہ مکی، اور آدھا مدنی ہے، چار مدنی آیات یہ ہیں:

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ۝	پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص بعض اوقات اور وقتاً فوقتاً نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ "وَيْلٌ" میں شامل ہے، تو نماز کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے والوں کا کیا حال ہوگا؟ جیسا کہ آیت مبارکہ میں ہے: "فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ" (پھر تباہی ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل رہے ہیں)

اور اس بات کو اہمیت نہیں دیتے کہ اگر وہ نماز پڑھتے بھی ہیں تو ثواب کی امید نہیں رکھتے، اور اسے ترک کرتے ہیں تو عذاب سے نہیں ڈرتے، اسی طرح وہ نماز سے غافل رہتے ہیں جب تک کہ اس کا وقت ختم نہ ہو جائے، اگر وہ مومنین کے ساتھ ہوں تو دکھلاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں، اگر مومنین کے ساتھ نہیں ہوتے تو وہ نماز نہیں پڑھتے۔

اسی طرح نماز کے وقت میں تاخیر کر کے یا اس کو لاپرواہی کے انداز میں پڑھنے سے یہ اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں، یا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے اور اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔

یاد رہے کہ: ہر نماز کا اجر نہیں اور ہر نمازی بھی جنتی نہیں ہے، ابن کثیر نقل کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو ان کے پوچھنے پر: "قَوْلٌ لِلْمُصَلِّينَ" کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ: "وہ لوگ جو نماز کو اس کے وقت سے تاخیر کر کے پڑھتے ہیں"

ابن عباسؓ اس آیت کے نزول کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ آیت ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب مومنین حاضر ہوتے تو دکھاوے سے نماز پڑھتے تھے، اور جب مومنین غائب ہوتے تو نماز کو چھوڑ دیتے، اسی طرح وہ مومنین کو چیزیں ادھار دینے اور ضروری گھریلو سامان دینے سے گریز کرتے تھے، بعض کتابوں میں لکھا ہے: "وَيْلٌ" یہ جہنم میں ایک گڑھے کا نام ہے، اسی طرح "وَيْلٌ" لفظ سرزش کے لیے ہے، جب بھی خدا اپنے بندوں کو کسی معاملے میں سرزش کرنا چاہتا ہے تو لفظ "وَيْلٌ" کا استعمال کرتا ہے۔

"مُصَلِّينَ" یہ صلاۃ کے مادہ سے ایک خاص قسم کی دعا ہے، مطلب ایک خاص قسم کی دعا جس کا ایک نظم اور ترتیب ہو، اس کے لیے لفظ صلاۃ کا استعمال ہوتا ہے، اور "مُصَلِّينَ" اسم فاعل ہے۔

الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝	وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں

جو اپنی نماز سے غافل ہیں اور اسے کم سمجھتے ہیں، اور اس کی پرواہ نہیں کرتے، اس کے ادا کرنے میں تاخیر کرتے ہیں، ابن عباسؓ نے کہا کہ: "وہ نمازی جو ثواب کی امید میں نماز نہیں پڑھتا، اور اگر اسے چھوڑ دے تو اس کی سزا سے نہیں ڈرتا" (تفسیر قرطبی: ۲۰/۲۱۱) رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ وہ لوگ ہیں جو نمازوں میں تاخیر کرتے ہیں" (ابن جریر)۔

مفسرین نے کہا ہے: چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ" اور لفظ

عَنْ" لایا ہے، معلوم ہوتا ہے اس سے مراد منافقین ہیں، اس لیے بعض اسلاف نے کہا ہے کہ: خدا کا شکر ہے کہ فرمایا: "عَنْ صَلَاتِهِمْ" اس لیے کہ اگر کہتا کہ: "فِي صَلَاتِهِمْ" تو اس کا تعلق مؤمن کے ساتھ بھی ہوتا، اور مؤمن بھی کبھی کبھار غلطی کرتا ہے اور نماز میں کوتاہی کرتا ہے۔

ان دونوں غلطیوں میں فرق واضح ہے، کیونکہ منافق کی غلطی نماز کو اہمیت نہ دینے کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لیے اسے نماز یاد نہیں رہتی، اور اس سے غافل رہتا ہے، لیکن جب مؤمن نماز میں غلطی کرتا ہے تو فوراً سجدہ سہو کر کے اس غلطی کا ازالہ کرتا ہے، تو دونوں میں فرق واضح ہے۔

"سَاهُونَ" یعنی: وہ لوگ جو غیر ارادی غلطیاں کرتے ہیں، وہ غلطیاں جو جان بوجھ کر نہیں ہوتیں، یہ بات قابل غور ہے کہ اسلامی شریعت کے مطابق: نماز میں غفلت کی تلافی اور معافی کی جاسکتی ہے، لیکن نماز سے غفلت، جس کا مطلب ہے کہ اسے ترک کرنا، کسی بھی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا، "عَنْ صَلَاتِهِمْ" (نہ کہ "فِي صَلَاتِهِمْ")

الَّذِينَ هُمْ يُرَآؤْنَ ۝	وہ جو دکھاوا کرتے ہیں

یعنی: ایک تو یہ ہے کہ وہ اپنی نمازوں سے واقف نہیں ہیں، لیکن وہ جو نماز پڑھتے ہیں، اس میں بھی منافق ہیں، یا یہ کہ وہ لوگ ہر اس نیکی میں منافق ہیں جو وہ کرتے ہیں تا کہ لوگ انہیں نیک کہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الرياء أخفى من دبيب النملة السوداء في الليلة المظلمة على المسح الأسود" "ریا اندھیری رات میں کالی چوونٹی کے رینگنے سے زیادہ پوشیدہ ہے۔"

"يُرَآؤْنَ" یہ رؤیت کے مادہ سے، اور ریا کا اصل بھی یہی ہے، کیونکہ جو شخص دکھاوا کرتا ہے، اسے یہ پسند ہوتا ہے کہ دوسرے اس کا کام دیکھیں، جو رؤیت کی اصل سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے "مرائی" یعنی وہ شخص جو پسند کرتا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے لوگ اسے دیکھیں۔

ریا کی چند اقسام

- 1- لوگوں کی محبت اور تعریف و توصیف کی خاطر اچھا کردار اور شخصیت دکھانا۔
- 2- سستا اور حقیر لباس پہننا یا کسی خاص رنگ اور وضع و قطع کا لباس پہننا تاکہ اس کے ذریعہ دنیا اور لوگوں کی نظر میں زہد کی ہیئت میں نظر آئے۔
- 3- کلام میں ریا کرنا، اور اس کا اظہار لوگوں پر غصہ اور افسوس کا اظہار کرنا، کہ وہ اطاعت کے کاموں سے دور ہیں۔
- 4- اپنی نماز اور صدقہ دوسروں کو دکھانا، یا لوگوں کے سامنے اپنی نماز کو مزین کر کے پڑھنا۔

منافق اور ریا کار میں فرق:

منافق اپنے ایمان کو ظاہر کرنے والا اور کفر کو چھپانے والا ہے، جبکہ ریا کار ایسی عاجزی دکھاتا ہے جو اس کے دل میں نہیں ہوتی، جو اس کی ظاہری عاجزی کو دیکھتا ہے، وہ اسے پرہیزگار اور دین دار اور اللہ سے ڈرنے والا سمجھتا ہے، اور اس سے عقیدت رکھتا ہے۔

علماء نے کہا ہے کہ دوسروں کو نیک اعمال دکھانے کا مقصد اگر انہیں اپنی پیروی کی ترغیب دینا ہو، یا خود سے کسی تہمت کی نفی کرنا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اور وہ (زکوٰۃ ادا کرنے اور) ضروریات زندگی (ادھار) دینے میں ہچکچاتے ہیں

وَيَمْنَعُونَ الْبَاعُونَ ۝

ماعون وہ ہے جو مسلسل گردش کرتا ہے اور چلتا رہتا ہے، جیسا کہ: کلہاڑی، دیگ، چمچہ، پلیٹ وغیرہ، اور اس کی طرح جو عام طور پر عاریتاً لوگوں کو دئیے جاتے ہیں، اس سے منع کرتے ہیں۔ (قاموس القرآن جلد: ۶ صفحہ ۲۶۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو چھوٹی چیزیں حتیٰ کہ زندگی کی عام استعمال کی چیزیں بھی دوسروں کو دینے میں کوتاہی کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ دوسروں کی مدد کی درخواست جو ان سے ہوتی ہے اور وہ ان کو پورا کرنے پر قادر ہوتے ہیں اس سے بھی کوتاہی کرتے ہیں اور یہ سبب بنتا ہے کہ معافی کا جذبہ ان میں پیدا

نہیں ہوتا، نتیجتاً دوسرے معاملات میں وہ اپنے مال سے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر پاتے، مال سے یہ دلچسپی اس خرچ میں رکاوٹ بنتی ہے کہ ان کی نماز، حقیقی نماز نہیں ہوتی۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ لفظ "ماعون" کا مفہوم درحقیقت زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ کو "ماعون" اس لیے کہا گیا کہ یہ مقدار کسی حساب سے بہت کم یعنی صرف چالیسواں حصہ ہوتا ہے، حضرت علی، ابن عمر، حسن بصری، قتادہ، ضحاک وغیرہ جمہور مفسرین نے اس آیت میں لفظ ماعون کو زکوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ (مظہری)

سورة الماعون سے حاصل شدہ اسباق

اس مبارک سورت سے حاصل ہونے والے اسباق مختصراً یہ ہیں:

- 1 - قیامت اور سزا کے عقیدہ پر تاکید
- 2 - جو دل قیامت اور عذاب پر ایمان و یقین سے خالی ہے، یقیناً اس دل کا مالک بدترین مخلوق ہے، اور یقینی طور پر اس سے کوئی بھلائی کا کام نہیں ہوگا۔
- 3 - غریبوں کا مال و دولت اور ان کے حقوق کھانے والوں کو ملامت اور سرزنش، جو ان کے حقوق غصب کر کے انہیں حقارت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔
- 4 - ان لوگوں کے لیے اور ملامتیں جو نماز میں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ انہیں کب اور کس وقت نماز پڑھنی چاہیے، ایسے عمل سے اللہ کی پناہ، یہ منافقین کی نشانیوں میں سے ہے۔
- 5 - گھر اور زندگی کی ضروریات میں تعاون نہ کرنا اور مسلمانوں کی مدد نہ کرنا منافقین کی خصوصیات میں سے ہے، حدیث میں ہے کہ: "من لم یهتم بامور المسلمین فلیس منهم" (جو مسلمانوں کے معاملات کی پرواہ نہیں کرتا، ان میں سے نہیں ہے) تو جو لوگ ان کی ضروریات پوری کرنے سے روکتے ہیں ان کا کیا حال ہونا چاہیے؟

اسلام میں نماز چھوڑنے والے کا حکم

قرآن عظیم سورہ مدثر کی آیات "۴۲ اور "۴۳ میں کہتا ہے کہ: "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ" (جب مؤمنین گنہگاروں سے پوچھیں گے کہ تم کس چیز کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہوئے ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے، (یعنی: ہماری نماز سے غفلت ہمیں اس سیاہ دن تک لے آئی) اور آگ سے دوچار کیا) جی حقیقتاً ایسا ہی ہے، نماز پر یقین نہ رکھنے اور اس کو مکمل طور پر ترک کرنے سے وہ عذاب جہنم کے مستحق ہوں گے۔

اور جو لوگ نماز کی فرضیت پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن عملی طور پر نماز نہیں پڑھتے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہیں عذاب "غی" کی وعید سنائی ہے "غی" جہنم میں ایک گڑھا ہے، خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: "خَلَفَ مِنْ بَعدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيًّا" (سورہ مریم آیت: ۵۹)

ترجمہ: "پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔"

لیکن جو لوگ نماز کو فرض سمجھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں، لیکن اس کی ادائیگی میں غفلت برتتے ہیں، اور اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کی نماز میں تاخیر ہوتی ہے یا اس کا وقت گزر جاتا ہے، قرآن کریم ان لوگوں کے بارے میں کہتا ہے: "فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ" (ترجمہ: پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے، وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں) (سورہ ماعون ۴ و ۵)

سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے متعلق میں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "هم الذين يؤخرون الصلاة عن وقتها" وہ لوگ ہیں جو نماز میں تاخیر کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کا وقت گزر جاتا ہے نیز جیسا کہ ہم نے اوپر کہا صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بين الكفر والایمان ترك الصلاة" ترجمہ: "ایمان اور کفر کے درمیان فرق نماز ہے" یعنی

اگر کوئی فرض نماز جان بوجھ کر ترک کرتا ہے تو وہ دائرہ ایمان سے خارج اور کفر تک پہنچ جاتا ہے۔

مسند کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من حافظ علی الصلوات کانت لہ نوراً وبرہاناً ونجاة یوم القیامة، ومن لم یحافظ علیہا لم یمکن لہ نورٌ ولا برہانٌ ولا نجاة، وکان یوم القیامة مع القارون وفرعون وھامان وابی بن خلف"

ترجمہ: "جس شخص نے نماز کی پابندی کی، نماز قیامت کے دن اس کے لیے نور، برہان اور نجات کا باعث ہوگی، جس نے (پانچ وقت) نماز کی پابندی نہ کی تو نماز قیامت کے دن اس کے لیے نہ نور، نہ برہان اور نہ ہی وسیلہ نجات ہوگی، اور وہ (بے نماز) قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ (جہنم میں) ہوگا۔"

ابو نعیم نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے: "من ترک الصلاة متعبدا کتب اللہ اسمہ علی باب النار ممن یدخلھا ومن ترک صلاة متعبدا احبط اللہ عملہ وبرئت منه ذمة اللہ تعالیٰ حتی یرجع للہ توبة"

"جو شخص جان بوجھ کر فرض نماز چھوڑتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا نام جہنم کے دروازے پر لکھ دیتا ہے، اور وہ جہنم میں داخل ہونے والوں میں سے ہے، اور جو شخص جان بوجھ کر فرض نماز چھوڑتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کو برباد کر دیتا ہے، اور خدا کی ذمہ داری کا مطلب ہے کہ وہ خدا کی حفاظت اور نگہداشت کے سائے میں نہیں ہے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے اور خدا کی طرف لوٹ جائے اور فرض نمازوں کی ادائیگی کا پابند اور ثابت قدم رہے۔"

اسراء و معراج والی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر ایسے لوگوں کے پاس نہ ہوا جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے تھے، پھر پہلی حالت پر آجاتے، رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل سے دریافت کیا کہ: یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جن کے سر نماز کے وقت بوجھل ہو جاتے تھے، اور وقت پر نماز نہیں پڑھتے تھے۔

اس لیے شریعت کا حکم ہے اور اس پر اجماع ہے کہ: جو کوئی بھی پانچوں نمازوں کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر اور مرتد ہے، یہاں تک کہ علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ شخص کا قتل واجب ہے۔

ائمہ اہل السنۃ و الجماعۃ کے نزدیک نماز چھوڑنے والے کا حکم

تمام علمائے اسلام کی رائے ہے کہ مسلمان آدمی کا سب سے پہلا فرض اور ہر انسان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں عظیم رب کی عبادت اور بندگی کا پابند رہے، عبادت کو ترک کرنا ایک مسلمان کے ذاتی اور بنیادی عمل میں کوتاہی سمجھا جاتا ہے۔

نماز دین اسلام میں عبادات میں سے ایک عبادت ہے، اور جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ جان بوجھ کر نماز چھوڑنا کفر کا سبب بنتا ہے، اور اس بات کی دلیل کہ نماز (جان بوجھ کر) چھوڑنا کفر ہے نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ" (احمد اور اصحاب سنن نے اس حدیث کو روایت کیا ہے)، مفہوم: "کافروں سے جو عہد ہمیں جدا کرتا ہے وہ نماز ہے، جس نے نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔"

لیکن اس مسئلہ کے تصور، تعریف اور تفصیل کے بارے میں کہ نماز جان بوجھ کر ترک کی جائے یا غیر ارادی طور پر اور اس کے ساتھ ساتھ نماز چھوڑنے والا شخص اس کی فرضیت سے منکر ہو، ایک ایسا موضوع ہے جس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ آدمی اس وقت تک کافر نہیں ہوتا جب تک کہ وہ نماز کی فرضیت کا انکار نہ کرے، اور احادیث: "بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ" کی کفر اصغر سے تاویل اور تعبیر کرتے ہیں۔

البتہ دوسرے علماء کے جاری کردہ سب سے زیادہ صحیح فتویٰ یہ ہے: کہ جان بوجھ کر نماز چھوڑنا کفر (اکبر) کا سبب بنتا ہے، اگرچہ اس کی فرضیت کا انکار نہ کرے، اور علماء اسلام میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو نماز چھوڑنے والے پر حکم جاری کرنے میں احتیاط برتتے ہیں، اور نماز چھوڑنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) پہلے گروہ میں وہ فاسق اور بے نماز لوگ شامل ہیں جو سستی اور کاہلی کی وجہ سے نماز چھوڑتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے پیروکار کہتے ہیں کہ: اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت کا انکار نہیں کرتا، یا اسے حقیر نہیں سمجھتا تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اور نہ ہی اسے قتل کیا جائے گا۔

نماز ترک کرنے والے سے متعلق امام شافعی اور امام مالک کا حکم

امام مالک اور امام شافعی نماز چھوڑنے والے سے متعلق فرماتے ہیں مذکورہ شخص فاسق اور مرتد ہے، کافر نہیں ہے، اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی، اس دوران اگر اس نے توبہ کی اور نماز پڑھی تو اسے چھوڑ دیا جائے گا، اور اگر توبہ نہ کی تو اسے شرعی حد کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔

شیخ عثیمین اپنے ایک فتویٰ میں مجموع فتویٰ اور رسائل (۵۴/۱۱) میں فرماتے ہیں: میرے لیے جو بات واضح ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ بے نماز شخص اس وقت کافر ہوجاتا ہے، جب وہ نماز کو بالکل ترک کر دے، یعنی: وہ بالکل نماز پڑھنا چھوڑ دے، اور ایک نمازی کی حیثیت سے اپنی پہچان کھودے، لیکن اگر وہ کبھی نماز پڑھتا ہے اور کبھی نہیں پڑھتا تو میرے خیال میں اس کے کفر کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا: "بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكَفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ" ترجمہ: "آدمی اور کفر میں فرق نماز کا ترک کرنا ہے"

اس لیے جو شخص کبھی کبھار نماز پڑھتا ہے، اسے مکمل طور پر تارک نماز نہیں کہا جاسکتا۔

شیخ عثیمین کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم

شیخ عثیمین اپنے فتویٰ کے استدلال کو نبی ﷺ کی اس حدیث سے مستند بناتے ہیں: "العهد الذی بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ" ترجمہ: "ہم میں اور ان (کافروں اور مشرکوں) میں فرق نماز کا ہے، لہذا جو اس کو چھوڑ دے گا وہ کافر ہوجائے گا"

اگر حدیث کے الفاظ پر غور کریں، تو دیکھیں گے کہ پیغمبر ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: کہ جس نے ایک نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوگا، اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ: انسان اور کفر و شرک میں حد فاصل ایک نماز ہے، بلکہ فرمایا: "تَرْكُ الصَّلَاةِ" یعنی: نماز کو بالکل چھوڑ دینا، ظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی ایک یا دو نماز چھوڑنے سے کافر نہیں ہوتا، مگر یہ کہ مکمل طور پر نماز چھوڑ دے، جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا۔

جو شخص کبھی نماز پڑھتا ہے اور بعض اوقات اسے چھوڑ دیتا ہے وہ فاسق ہوتا ہے، اور ایک بڑے جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے، درحقیقت اس نے جرم کیا ہے، تو یہ شخص جب تک نماز کی فرضیت کا انکار نہ کرے کافر نہیں ہوگا، البتہ بعض نمازوں کے چھوڑنے سے گنہگار اور نافرمان سمجھا جاتا ہے، لیکن جو شخص مکمل طور پر نماز ترک کر دے تو وہ کافر اور دین اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، خواہ وہ اسے سستی اور لاپرواہی سے چھوڑے یا جان بوجھ کر، مزید یہ کہ قرآن و سنت کے نصوص، اور صحابہ کی آراء اس کی تصدیق کرتی ہیں، یہاں تک کہ عبداللہ بن شفیقؒ نے نماز ترک کرنے والے کے کفر پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے، جبکہ اسحاق بن راہویہ نے تو اس بارے میں امت کے اجماع کا ذکر کیا ہے۔ (مجموع فتویٰ و رسائل شیخ عثیمین ۵۴/۱۱)

(۲): ان بے نماز افراد کا ہے، جو نہ صرف نماز نہیں پڑھتے، بلکہ نماز کی فرضیت کے بھی معترف نہیں ہیں: نماز پڑھنے کو ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ لوگوں میں نماز کے وجوب کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے متعلق احکام

علمائے کرام منکرین نماز کے متعلق کہتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو نماز کی فرضیت سے نہ صرف انکار کرتے ہیں، بلکہ نماز کے مقام و مرتبہ کی تحقیر و توہین کرتے ہیں، اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں، یہ لوگ دین کو نقصان پہنچاتے ہیں، چاروں ائمہ کے حکم کے مطابق ان لوگوں کے بارے میں جو نماز کی فرضیت کا انکار کرتے ہیں یا اسے حقیر اور ہلکا سمجھتے ہیں، اور ان کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان موجود نہ ہو، تو ایسا شخص ان کافروں کی طرح ہے جن کی صفت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی ہے: "وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ" (سورہ مائدہ: ۵۸) ترجمہ: "اور جب تم نماز کی طرف آواز دیتے ہو تو وہ اسے مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔"

اس طرح ہم ان لوگوں کی حیثیت سے واقف ہو جاتے ہیں جو نماز اور عبادت کو پسماندگی اور دقیانوسیت سمجھتے ہیں، اور نماز پڑھنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا نماز چھوڑنے والے سے متعلق حکم

امام ابو حنیفہؒ کے پیروکار نماز چھوڑنے والوں کے بارے میں کہتے ہیں: اگر کوئی شخص سستی اور لا پرواہی کی وجہ سے نماز چھوڑ دیتا ہے تو وہ فاسق ہے، ایسا شخص نماز ترک کرنے سے فاسق ہوگا، اور اس کی تادیب اور تعزیز کرنا واجب ہے، اس کو اس حد تک سزا دینی چاہیے کہ اس کے جسم سے خون جاری ہو جائے، جب تک نماز پڑھنا شروع نہ کرے اسے قید میں رکھنا چاہیے، اور روزہ چھوڑنے والے کا بھی یہی حکم ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے پیروکار مزید کہتے ہیں کہ: اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت کا انکار نہ کرے یا اسے حقیر نہ سمجھے تو اس کے کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اور اسے مارا بھی نہیں جائے گا۔

امام احمد کا تارک نماز کے بارے میں حکم

امام احمد اپنی مشہور ترین روایات میں فرماتے ہیں کہ نماز ترک کرنے والا کافر ہے اور اسے دین سے خارج اور "مارق" سمجھا جائے گا، اور اس کے لیے موت کے علاوہ کوئی سزا نہیں ہے، اور اس سے توبہ کرنا واجب ہے، اور نماز کی ادائیگی کے ساتھ اسے اسلام میں واپس لائیں، اگر وہ قبول کرتا ہے تو اسے جانے دو، اگر وہ نہ مانے تو اس کی گردن مار دی جائے۔

نماز چھوڑنے والے کے بارے میں امام شعرانی کی نصیحت

امام شعرانی جو عالم اسلام کے بہترین علماء میں سے ایک ہیں اپنی کتاب: "العهود البواثیق الحمیدیہ" میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام مسلمانوں سے یہ عہد لیا ہے جو بھی کسی بھی طبقے سے نماز چھوڑے چاہے وہ عالم ہو یا امی یا مقلد ہو تو اسے فرض نماز کی اہمیت سمجھائیں کہ کیا ہے، اور اسے پوری تاکید کے ساتھ یاد دلائیں، اپنے تمام رشتہ داروں اور جاننے والوں کو بتائیں کہ تارک نماز کا گناہ کتنا مذموم ہے اور وہ کونسا گناہ کر رہا ہے، اور یہ نماز ترک کر کے اپنے دین کو برباد کر رہا ہے۔

شیخ حبیب ابن عبداللہ کا تارک الصلاة سے متعلق حکم

شیخ حبیب ابن عبداللہ ابن علوی الحداد نے اپنی نصائح میں ذکر کیا ہے کہ: جس طرح نماز کی پابندی اور اسے جاری رکھنا تم پر فرض ہے، اسی طرح اس کا ضائع کرنا بھی تم پر حرام ہے، جیسا کہ تم پر واجب ہے، ایسا ہی آپ اپنے اہل و عیال اور بچوں پر بھی نماز کی ادائیگی میں سختی کریں،

اسی طرح جو بھی آپ کے ماتحت ہے اسے نماز قائم کرنے کا پابند کریں، اس سے نماز نہ پڑھنے کے بارے میں کوئی بھی عذر قبول نہ کریں، ان میں سے کوئی بھی آپ کا حکم نہ مانے تو آپ پر لازم ہے کہ اس پر غصہ کریں، اور اسے سزا دیں، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ آپ بھی انہیں لوگوں میں شامل ہوں گے جو خدا کے حقوق، نماز اور خدا کے دین کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اگر آپ نے ان کو سزا دی سرزنش کی، اور ان سے ناراض ہو گئے، اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، تو ان کو اپنے پاس سے بھگانا واجب ہے، کیونکہ یہ شیطان ہیں جن میں کوئی خیر اور برکت نہیں، ان سے دوستی کرنا اور ان کے ساتھ رہنا جائز نہیں، ان سے دشمنی کرنا، ان سے الگ ہونا اور ان سے دور رہنا واجب ہے، کیونکہ یہ خدا اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا: "لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۚ" (سورۃ المجادلہ: ۲۲)

ترجمہ: جو لوگ خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے انکی مدد کی ہے۔

محترم قارئین:

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نماز نہ پڑھنے کو کافروں کی خصوصیات میں سے شمار کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ: "وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ" (سورہ مرسلات: ۴۸) ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھک جاؤ تو وہ نہیں جھکتے۔

اور وہ غرور کے نشے میں اس قدر مست ہو جاتے ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ: اللہ اور اس کے نوابی کے سامنے عاجزی اختیار کرو اور فرمانبردار بن جاؤ تو وہ عاجزی نہیں کرتے اور فرمانبردار نہیں بنتے، چنانچہ قیامت کے دن ان کی حالت یہ ہوگی کہ: "يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَىٰ"

السُّجُودُ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ (سورہ القلم)

ترجمہ: جس دن پندلی کھولی جائے گی اور وہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے تو وہ طاقت نہیں رکھیں گے۔

قرآن کے مطابق ایک شخص اس وقت اپنی جان کی حفاظت سے لطف اندوز ہوگا اور اسلامی بھائی چارہ کے جھنڈے تلے آئے گا، جب وہ شرک سے توبہ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے، اللہ تعالیٰ حربی مشرکوں اور کافروں کے بارے میں فرماتا ہے: "فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخِوْا أَنْكُمْ فِي الدِّينِ ۖ وَنُقْضِلْ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ" (سورہ توبہ: ۱۱) "اگر وہ توبہ کر لیں (اور کفر سے پھر جائیں، اور اسلام قبول کر لیں، اور اسے ظاہر کرنے کے لیے) نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں (اب وہ تم میں سے ہیں، لہذا ان کو چھوڑ دو) اور ان کے لیے راستہ کھول دو، بیشک خدا کے پاس اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والوں کے لیے بہت زیادہ بخشش ہے، اور اس کی رحمت وسیع ہے تمام بندوں کے لیے۔"

اس کے بعد فرماتا ہے: "فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخِوْا أَنْكُمْ فِي الدِّينِ ۖ وَنُقْضِلْ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ"، مفہوم اور ترجمہ: اگر وہ (کفر سے) توبہ کریں اور (اسلامی احکام کی پابندی کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں (ان سے ہاتھ روکو) کیونکہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں (اور وہ ان چیزوں کے مستحق ہیں جن کے تم مستحق ہو، جو چیزیں تم پر واجب ہیں، وہ ان پر بھی واجب ہیں، ہم اہل علم و عرفان کے لیے اپنی آیات کا بیان اور وضاحت کرتے ہیں۔

قرآن ہمارے لیے آخرت کی تصویر پیش کرتا ہے، جہاں کافر اور ظالم جہنم میں ہوں گے، اور اصحاب الیمین مؤمنین ان سے پوچھیں گے: "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۚ ۝۳۲ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلُوبِينَ ۚ ۝۳۳ وَلَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمُسْكِينِ ۚ ۝۳۴ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَاطِئِينَ ۚ ۝۳۵ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۚ ۝۳۶" ترجمہ: تمہیں کس چیز نے سقر میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے، اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے، اور ہم بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر فضول بحث کیا کرتے تھے، اور ہم جزا کے دن کو جھٹلاتے تھے۔

ان کے جرم اور کفر کا پہلا مظہر یہ تھا کہ وہ نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے، جب بھی ہم حدیث نبوی کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں ایسی صحیح روایات ملتی ہیں جو نماز ترک کرنے والے کے کفر کی تصدیق کرتی ہیں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: "لَا تَتْرُكِ الصَّلَاةَ فَإِنَّ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَدًّا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللَّهِ" ترجمہ: "نماز (جان بوجھ کر) نہ چھوڑو، اگر کوئی (جان بوجھ کر) نماز چھوڑ دے تو خدا تعالیٰ کی ذمہ داری اس سے ختم ہوگئی۔"

طبرانی نے اس حدیث کو معجم اوسط میں اپنی سند سے روایت کیا ہے، اور منذری نے متابعات میں کہا کہ یہ قابل قبول ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن نماز کے بارے میں فرمایا: "جس نے نماز کی پابندی کی، نماز اس کے لیے روشنی، حجت اور حجاب ہوگی قیامت کے دن، اور جو اس کی پابندی نہیں کرے گا اس کے لیے کوئی نور، حجت اور نجات نہیں ہوگی، اور قیامت کے دن فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔" احمد بن حنبل نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اور بیہمی نے کہا کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔

نماز ترک کرنے والے کے بارے ابن قیمؒ کا حکم

دمشق کے شیخ ابن قیمؒ جو کہ (۶۹۱) ہجری میں پیدا ہوئے، نماز ترک کرنے والے کے بارے میں فرماتے ہیں، جو شخص سیاست اور امارت کی خاطر نماز ترک کرے گا تو اس کا فرعون کے ساتھ حشر ہوگا، اور جو مال و اسباب کی وجہ سے نماز ترک کرے گا اس کا قارون کے ساتھ حشر ہوگا، اور جس کا مقام و مرتبہ اسے نماز پڑھنے سے روکے گا وہ ہامان کے ساتھ اٹھے گا، اور جس نے مصروفیات اور کاروبار کی خاطر نماز ترک کی وہ ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

جب نماز کی پابندی نہ کرنے والوں کا حشر ان ظالموں کے ساتھ ہو جائے، جبکہ جہنم میں ان کا عذاب بہت سخت ہے، تو نماز کو پوری طرح ترک کرنے والے جنہوں نے عمر بھر اللہ کے حضور سجدہ نہ کیا ہو تو ان کی سزا کیسی ہوگی؟ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں "مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ حَبِطَ عَمَلُهُ" (احمد و

بخاری و نسائی نے بریدہ سے روایت کیا ہے) ترجمہ: "جس نے عصر کی

نماز چھوڑ دی اس کا نیک عمل ضائع ہو گیا۔"

جب ایک نماز ترک کرنے سے عمل ضائع ہو جاتا ہے تو تمام نمازوں کو ترک کرنے والے کی کیا سزا ہوگی؟

قرآن منافقین کی مذمت بیان کرتا ہے کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔

تو ان لوگوں کا کیا ہوگا جو نہ خوش دلی سے کھڑے ہوتے ہیں اور نہ ہی سستی سے، نیز جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے کی تکفیر یا دین سے خارج ہونے کے بارے میں صحابہ کرام میں سے کسی نے مخالفت نہیں کی ہے۔

امام ترمذی عبد اللہ بن شقیقؒ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نماز کے علاوہ کسی عمل کے ترک کرنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے، راوی کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ اس مسئلہ پر متفق تھے، اس لیے انہوں نے یہ نقطہ نظر کسی ایک صحابی کی طرف منسوب نہیں کیا۔

نیز علماء دین اور محدثین حضرات، صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء کی رائے بیان کرتے ہیں۔

حضر علیؓ نے فرمایا جو نماز نہیں پڑھتا وہ کافر ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہے، اسی طرح ابن مسعودؓ سے بھی مروی ہے کہ جس نے نماز ترک کی وہ بے دین ہے۔

جابر بن عبد اللہ کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم

جابر بن عبد اللہؓ نے واضح حکم لگایا ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا وہ کافر ہے۔

ابو درداء فرماتے ہیں: نماز نہ پڑھنے والا ایمان نہیں رکھتا، اور نماز اس نے نہیں پڑھی جس کا وضو نہ ہو۔

ایوب سختیانی سے مروی ہے وہ کہتے ہیں: یہ کہ نماز چھوڑنے والا کافر ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے حافظ منذری ان روایات اور پیشرووں کے معمولات کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: صحابہ کی ایک جماعت جن میں عمر بن خطاب، عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس، معاذ بن جبل، جابر بن عبد اللہ اور ابو درداء رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں، اور غیر صحابہ میں سے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبد اللہ بن مبارک یحیٰ، حکم بن عقبہ، ایوب سختیانی، ابو داود طیالسی، ابوبکر بن ابی شیبہ، زہیر بن حربؒ اور دوسروں نے کہا ہے کہ: جس نے جان بوجھ کر نماز کا وقت ختم ہونے تک

چھوڑ دی وہ کافر ہے، (الترغیب والترہیب، جلد 1، کتاب الصلاة، فصل الترہیب، من ترك الصلاة تعبدًا)۔

امام بن تیمیہؒ کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم

شیخ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ: نماز چھوڑنے والے کو سلام نہیں کرنا چاہیے، اور اس کی مہمانوازی قبول نہیں کرنا چاہیے... کسی باپ کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنی بیٹی کا نکاح کسی بے نمازی سے کرے، کیونکہ جو شخص نماز نہیں پڑھتا وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہے، اور وہ مسلمان لڑکی سے شادی کا مستحق نہیں ہے، وہ اس عورت اور اس کے بچوں کے سرپرستی میں امانت دار نہیں ہو سکتا۔

نیز اداروں اور کارخانوں کے مسلم مالکان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو ملازم رکھیں جو نماز نہیں پڑھتے، ورنہ ایسے عمل کے تحت وہ گناہ میں حصہ دار شمار ہوں گے، جو رب کے حقوق کو خالق اور رازق بے تلف کرے وہ بندوں کے حقوق کو لازماً نظر انداز کرے گا نقصان پہنچائے گا۔

اس اہتمام سے اس الہی فریضہ کے سامنے معاشرے کی ذمہ داری جو دین کا ستون اور بنیاد سمجھی جاتی ہے واضح اور ظاہر ہو جائے گی، نماز ایک ایسا فرض ہے جسے چھوڑنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ کسی ایسی سنگین بیماری یا مصیبت میں مبتلا ہو، کہ اس کی عقل اور اختیار جاتا رہے، جس کے نتیجے میں خدا کے حکم کو سمجھنا اس کے لیے مشکل ہو، دوسری صورت، اور دوسری بیماریوں میں نماز اس کے ذمے سے ساقط نہیں ہوگی۔

شریعت مریض کو مخاطب کرتی ہے

جتنا ہو سکے خود کو پاک رکھو اور وضو کرو، اپنی استطاعت کے مطابق نماز پڑھو اور کبھی نماز نہ چھوڑو، پانی سے وضو کرو، اگر پانی نہ ملے تو مٹی کے ساتھ تیمم کرو، کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر نماز پڑھو، اگر پھر بھی نہ کر سکو تو اپنی کمرٹ پر یا پیٹھ کے بل لیٹ کر، یا اپنے سر یا آنکھوں کے اشارے سے نماز پڑھو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ" (سورۃ تغابن: ۱۶) ترجمہ: "سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو"

معاشرہ اس فرض کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے، خاص طور پر حاکم اپنی رعایا اور ماتحتوں کا ذمہ دار ہے، جیسے: چھوٹے بچوں کے لیے باپ یا بیوی کے لیے شوہر۔

ہمارا رب العزت اس مسئلے میں فرماتا ہے: "وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا تَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى" (سورۃ طحہ: ۱۳۲) ترجمہ: "اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ، ہم تجھ سے کسی کے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے، ہم ہی رزق دیں گے اور اچھا انجام اہل تقویٰ کا ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورۃ تحریم: ۶) ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! خود کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں" جب شوہر اپنی بیوی پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے، نیز ایک باپ جو اپنے بچوں سے پیار کرتا ہے اور ہمدردی رکھتا ہے، اسے ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ انہیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے، اور انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت پر جس کی اہم بنیاد نماز ہے کار بند ہے۔

شیخ ابن بازؒ کا نماز چھوڑنے والے کے بارے حکم

شیخ ابن بازؒ اپنے فتوے میں نماز چھوڑنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ اس شخص کو بھی کافر سمجھتے ہیں جو جان بوجھ کر اپنی نماز میں تاخیر کرے، (مزید معلومات کے لیے رجوع کریں: "فتاویٰ اللجنة" (۵۰، ۶/۴۰))

جیسا کہ بعض دوسرے اہل علم کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی شرعی عذر کے ہمیشہ نماز کو قضاء کرے اس طرح کہ اس نماز کا وقت گزر جائے اور اگلی نماز کا داخل ہو، پس وہ کافر ہے، اور نماز کا وقت گزر جائے یعنی ظہر کی نماز کو غروب یا مغرب کی نماز کو عشاء تک تاخیر کر دے (یہ حکم نماز کے جمع ہونے کے امکان کی وجہ سے ہے) اور سلف کے علماء میں سے جو اس رائے کے حامل ہیں، ان میں محمد بن نصر المروزیؒ اور عبد اللہ بن مبارکؒ ہیں، لہذا اس قول کی بنا پر وہ شخص جو مثال کے طور پر صرف جمعہ کی نماز پڑھتا ہے، یا صرف عید بقر یا عیدرمضان میں نماز پڑھتا ہے، یا جو ایک دن پڑھتا ہے، اور دوسرے دن نہیں پڑھتا (اگرچہ وہ نماز کی فرضیت کا انکار نہیں کرتا) وہ کافر ہے۔

شیخ محمد بن صالح العثیمینؒ کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم

شیخ عثیمینؒ اپنے فتوے میں مذکورہ بالا حکم کی تصدیق کرتے ہوئے ایک اور جگہ ہمیشہ نماز چھوڑنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں، یعنی جو شخص ہمیشہ اور مسلسل نماز ترک کرتا ہے وہ کافر ہے، یہ مذکورہ بالا رائے برخلاف

ہے، اس قول کے کہ وہ شخص کافر ہے جو مکمل نماز ترک کرتا ہو، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا بھی یہی قول ہے، انہوں نے کہا ہے کہ: اگر کوئی ایک نماز پڑھے اور دوسری چھوڑ دے تو گویا اس کے دل میں یہ ارادہ ہے کہ وہ نماز کو یکسر چھوڑ دے گا، وہ باطنی طور پر کافر ہوگا، یعنی وہ کفر جسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اس کے اور اللہ کے درمیان ہے (مجموع الفتاوی: ۲۲/۴۹)، (۷/۶۱۵) اور (شرح العمدة): (۲/۹۴)، شیخ ابن عثیمین بھی اس کے قائل ہیں، جیسا کہ وہ کہتے ہیں: اس بارے میں جو دلائل سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نماز چھوڑنے والا کافر نہیں ہے، جب تک کہ وہ نماز کو مستقل طور پر ترک نہ کر دے، یعنی وہ خود کو نماز ترک کرنے کا عادی بنا دے، یعنی وہ ظہر کی نماز نہیں پڑھتا، اور اسی طرح عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نماز نہیں پڑھتا، اس حالت میں وہ آدمی کافر ہے، لیکن اگر وہ دن اور رات میں ایک یا دو فرض نمازیں پڑھے وہ کافر نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے متعلق یہ یقین نہیں آتا کہ اس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑنے کا ارادہ کیا ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بین الرجل وبين الشرك والكفر ترك الصلاة" ترجمہ: "انسان اور شرک اور کفر کے درمیان نماز ترک کرنا ہے" انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ: "ترك صلاة" "کوئی بھی نماز چھوڑنا کفر ہے" ("صلاة" نکرہ ہے) "الشرح الممتع" (۲/۲۶)۔

البتہ شیخ ابن عثیمین سے اس معاملے میں زبانی طور پر اس شخص کا حکم پوچھا جاتا ہے جو صرف جمعہ کی نماز پڑھتا ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ: ایسے لوگ ظاہری طور پر کافر ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ اس نے ایک ہفتے میں پینتیس فرض نمازوں میں سے صرف ایک نماز پڑھی تھی اور یہ ایک ہفتے کی نمازوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اور جو شخص پورے ہفتے میں ایک نماز پڑھتا ہے اسے نمازی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کا شمار تارک نماز میں ہوگا۔

شیخ ناصر الدین البانی کا نماز چھوڑنے والے کے بارے میں حکم

شیخ ناصر الدین البانی دوسرے علماء کے قول کی تائید کے ساتھ تارک نماز کو اس وقت کافر قرار دیتے ہیں جب وہ نماز کی فرضیت کا انکار کرے، ان کا خیال ہے کہ تمام واجب عبادات میں جب کوئی شخص ان کی فرضیت کا منکر ہو تو وہ کافر ہو جاتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ نماز کی فرضیت ہو یا روزہ کی، زکات وغیرہ کا وجوب ہو۔

وہ ور سستی و کاہلی سے نماز چھوڑنے والے کی تکفیر نہیں کرتے اگر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے، یعنی اگر اس شخص سے پوچھا جائے کہ: نماز

فرض ہے یا نہیں، اگر اس نے کہا کہ: ہاں واجب ہے، تو ہم اس کی تکفیر نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ نماز پر ایمان اور عقیدہ رکھتا ہے، اگرچہ اس نے نماز چھوڑ دی ہے، اور اس کی وجہ سے اس نے خود کو سخت عذاب میں مبتلا کیا ہے، لیکن وہ ایسا شخص ہے جس نے اپنی زبان پر شہادتین جاری کی ہیں اور اسلام کے احکامات کو مانتا ہے، لیکن اگر اس نے کہا کہ نماز کو واجب نہیں سمجھتا، تو یقیناً اس نے کفر یہ لفظ کہا ہے اور وہ کافر ہے۔

نماز چھوڑنے والے کے بارے میں عمومی نتیجہ

بعض علماء تو جان بوجھ کر ایک نماز چھوڑنے کو تارک نماز اور کفر کا باعث سمجھتے ہیں، اور بعض دوسرے علماء اس شخص کو کافر سمجھتے ہیں جو بالکل نماز نہیں پڑھتا اور مستقل نماز کو ترک کردیتا ہے، لیکن بعض اور علماء نماز کی فرضیت کا انکار کرنے والے کو کافر سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ تارک نماز نہ ہو۔

البتہ ابن عثیمین کا دوسرا قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے لیکن ان لوگوں سے جو نماز کی فرضیت کا انکار نہیں کرتے، یا نماز کو حقیر یا ہلکا نہیں سمجھتے، اس صورت میں نماز چھوڑنے پر کافر یا مرتد ہے، جیسا کہ ظاہر احادیث اور صحابہ کرامؓ وغیرہ کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے، یا وہ فاسق اور خدا سے دور سمجھا جاتا ہے۔

جو شخص نماز نہیں پڑھتا اس کے لیے سب سے بڑی رعایت یہ ہے کہ اسے فاسق سمجھا جائے کہ اسے کسی بھی وقت کفر کا اندیشہ ہوسکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں بعض گناہ دوسرے گناہوں کا سبب بن جاتے ہیں، جس طرح صغیرہ گناہ کبیرہ گناہوں کی طرف لے جاتے ہیں، اور کبیرہ گناہ کفر کا باعث بن جاتے ہیں۔

لہذا ایک مسلمان پر فرض ہے کہ اپنے اندر جھانک کر خدا کے سامنے توبہ کرے، اور اپنا دین درست کرے، اور نماز قائم کرنے کا فیصلہ کرے، جس طرح دین داروں پر فرض ہے کہ وہ بے نمازوں اور مسلسل نماز چھوڑنے والوں کو نصیحت اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اس کے بعد اگر باز نہ آئیں تو ان کے ساتھ تعلقات منقطع کریں اور میل جول چھوڑ دیں۔ اہم ملاحظہ: بہر صورت حکام پر واجب ہے کہ وہ نماز پڑھنے والے کو توبہ کرنے پر مجبور کریں، اس کے سامنے حکمت کے ساتھ خدا کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ نماز کے فوائد کی وضاحت کریں، اگر مذکورہ شخص توبہ کرے تو اسے چھوڑ دیں، لیکن اگر وہ ضد کرے اور نماز کے انکار پر اصرار کرے تو اسلامی کے حکم کے مطابق اسے اسلامی عدالت میں قتل کردینا چاہیے۔

نماز ترک کرنے والوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے یا منقطع کرنے کے بارے میں علماء کرام کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع نہیں ہونے چاہئیں، ان کے ساتھ رابطہ قائم رہنا چاہیے، انہیں اچھی نصیحت کے ذریعہ نماز پڑھنے کی دعوت دینا چاہیے۔

یہ شرعی حکم ہے کہ ایسے لوگوں کو دعوت دی جائے اور نصیحت کی جائے، اور انہیں آخرت کے عذاب سے ڈرایا جائے شاید وہ توبہ کر کے سیدھے راستے کی طرف لوٹ آئیں۔

الحمد لله سورہ ماعون تفسیر احمد کا اردو ترجمہ: ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۴۵ کو مکمل ہوا۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)
سورة الكوثر

سورة الكوثر مکہ میں نازل ہوئی، اس کی تین آیتیں ہیں۔

وجه تسمیہ:

ابن مردویہ نے عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن زبیر اور عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے، کلبی اور مقاتل بھی اسے مکی کہتے ہیں، اور جمہور مفسرین کا بھی یہی قول ہے، لیکن حسن بصری، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ نے اسے مدنی قرار دیا ہے، امام سیوطی نے اتقان میں اس قول کو صحیح کہا ہے، اور امام نووی نے مسلم کی شرح میں اسی کو ترجیح دی ہے، اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن مروویہ، بیہقی اور دیگر محدثین نے انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان ہلکی نیند کی حالت میں تشریف فرما تھے، اس کے بعد مسکراتے ہوئے سر اٹھایا، بعض روایات میں آتا ہے کہ حاضرین نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ آپ کس چیز پر مسکرا رہے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ لوگوں کے پوچھے بغیر خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔

"جیسا کہ حدیث میں ہے کہ: أغفی رسول الله صلى الله عليه وسلم إغفاءة، فرفع رأسه متبسها فإما قال لهم، وإما قالوا له: يا رسول الله لم ضحكت؟ فقال: إنه أنزلت علي أنفا سورة فقرأ «بسم الله الرحمن الرحيم، إنا أعطيناك الكوثر» حتى ختمها، فلما قرأها قال: هل تدرون ما الكوثر؟ قالوا: الله ورسوله أعلم! قال: فإنه نهر وعدني به ربي عز وجل في الجنة، وعليه خير كثير، عليه حوض ترد عليه أمتي يوم القيامة، آئيته عدد الكواكب» ألبانی (صحیح أبی داود) (4747) "

ترجمہ: "رسول اللہ ہلکی نیند سو گئے تھے، پھر آپؐ نے مسکراتے ہوئے اپنا سر نیند سے اٹھایا اور صحابہ کرام سے فرمایا: تم جانتے ہو میرے مسکرانے کی وجہ کیا تھی؟ یا صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے مسکرانے کی وجہ پوچھی، آپؐ نے فرمایا کہ: مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی پھر آپؐ نے اس کی تلاوت کی، یہاں تک کہ وہ سورت مکمل کر لی، پھر آپؐ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ کوثر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا

رسول بہتر جانتے ہیں ، آپؐ نے فرمایا: کوثر ایک نہر ہے جسے خدا تعالیٰ نے جنت میں مجھے عطا فرمائی ہے، اور اس میں خیر ہے، قیامت کے دن میری امت کے لوگ اس پر وارد ہوں گے، اس کے برتن ستاروں کے برابر ہیں کچھ لوگ اس سے روکے جائیں گے، میں کہوں گا: اے رب ! یہ میری امت میں سے ہیں، لیکن مجھ سے کہا جائے گا: آپ کو نہیں معلوم کہ آپؐ کے بعد انہوں نے کیا کیا چیزیں ایجاد کیں۔

سورة "کوثر" نام رکھنے کی وجوہات

اس سورہ کے دو نام ہیں: "الکوثر اور النحر" لیکن قرآن کے نسخوں میں اس سورت کو "کوثر" کہا جاتا ہے، اس سورت کا نام "الکوثر" کیوں رکھا گیا ہے؟ اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ اس سورت کا آغاز "إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ" سے ہوا ہے، اگرچہ ابن کثیر سمیت بعض مفسرین کے نزدیک یہ سورہ مدنی ہے۔ "کوثر" بروزن "فعل" صیغہ مبالغہ اور کثرت کے مادہ سے ہے، یہاں کثرت کے معنی دیتا ہے، یعنی: کثرت تمام چیزوں کو شامل ہوگی، آنے والی آیات کے مطابق اس سے مراد خیر کی فراوانی ہے، ہر اس چیز کی کثرت جس کی انسان کو طلب اور ضرورت ہو، اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کو اس طرح بنایا ہے کہ زیادہ کی مانگ اس کی طبعیت کی خصوصیات میں سے ہے، البتہ اس کی تعدیل ہو کر متوازن ہونا چاہیے، وہ بہت زیادہ دولت اور اعلیٰ رتبہ چاہتا ہے، اور لمبی زندگی چاہتا ہے، یقیناً انسان کی خواہش ہے کہ اس کو موت نہ آئے، نہ مرے، یہ سورت کا مفہوم ہے۔

یہ بھی مکی سورت ہے، اس لیے واضح ہے کہ سورت کا محور بصیرت کی اصلاح ہے، جب کوئی اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہتا ہے، تو اسے کمزوری یا کمی محسوس نہیں کرنی چاہیے، نہیں تو وہ اپنی دعوت میں کامیاب نہیں ہوگا، یہ بہت اہم نکتہ ہے، کوثر والوں میں سے ہونا چاہیے اور کم پر قناعت کرنا چاہیے۔

سورة الكوثر اور ماعون کے درمیان ربط و مناسبت

سورة الماعون میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور جھوٹوں کی چار خصلتیں بیان کی ہیں۔

- 1 - بخل، (ماعون آیات: ۲-۳)
- 2 - نماز میں غفلت اور اسے غیر اہم سمجھنا (ماعون آیت ۵)
- 3 - نماز میں ریا اور دکھلاوا (ماعون آیت: ۶)

4 - پڑوسیوں کو معمولی چیزوں میں مدد کرنے سے گریز کرنا (ماعون
آیت: ۷)

سورة الكوثر میں ان چار مذموم، قبیح، مکروہ، اور ناپسندیدہ صفات کے مقابلے
میں سورة الكوثر میں چار پسندیدہ صفات جو پیغمبر خاتم کو عطا کی گئی
تھیں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

الف: بخیل کے بخل کے برعکس وافر اور مستقل بھلائی (إِنَّا آعْطَيْنَكَ الْكُوثَرَ)۔

ب: نماز ادا کرنے میں استقامت : "فَصَلِّ"۔

ج: اپنے رب کی رضا کی خاطر نماز میں اخلاص اور پاکیزگی : "فَصَلِّ لِرَبِّكَ
وَأَنْحَرْ"۔

د: قربانی کرنا اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا، "منع ماعون" کے برعکس
، یعنی : پڑوسیوں کو امانت دینے سے گریز کرنا۔

سورة الكوثر کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورہ کوثر میں (۱) رکوع، تین (۳) آیات ، گیارہ (۱۱) الفاظ ، سینتیس (۳۷)
حروف اور اٹھارہ (۱۸) نقطے ہیں ، قرآن مجید کی سب سے مختصر
سورتوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

(یادر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس
کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)۔

ایک مشہور قول اور مفسرین کے قول کے مطابق جیسا کہ اوپر اس کا ذکر
ہوا ہے یہ مکی سورتوں میں سے ہے، لیکن عکرمہ ، حسن اور قتادہ کہتے ہیں
کہ: سورہ کوثر مدنی ہے ، ابن کثیر کی بھی یہی رائے ہے۔

سبب نزول:

امام سیوطی اپنی کتاب " اسباب النزول " میں سورہ کوثر کے نزول کے بارے
میں لکھتے ہیں: ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ: قریش ایسے
شخص کو جس کے بیٹے فوت ہو جاتے اسے "ابتر" اور بے اولاد
کہتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ کے بیٹے کا انتقال ہو گیا، تو عاص بن وائل نے

کہا: محمد ابتر اور بے اولاد ہو گئے، پھر خدا تعالیٰ کا یہ کلام نازل ہوا: "إِنَّا
أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ" ترجمہ: بلا شبہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی۔

مذکورہ کتاب کے محقق عبدالرزاق المہدی اس روایت کی تعلیق میں کہتے
ہیں: واحدی نے "۸۷۳" نمبر کے ساتھ اس روایت کو یزید بن رومان سے روایت
کیا ہے، اور یہ مرسل روایت ہے، لیکن درج حدیث کے ساتھ قوی ہوجاتا
ہے، بیہقی نے "دلائل النبوة" میں محمد بن علی (بن حسین بن علی بن ابی
طالب) سے اس طرح روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کے بیٹے کا نام قاسم
تھا، مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ: خدا کا یہ کلام عاص بن وائل کے بارے
میں نازل ہوا، جس نے کہا تھا کہ: میں محمد کا دشمن ہوں، طبری نے
۳۸۲۱۷ میں مجاہد سے، اور ۳۸۲۱۸، ۳۸۲۱۹ میں قتادہ سے اور
۳۸۲۱۵، ۳۸۲۱۶ میں سعید بن جبیر سے مرسل روایت کیا ہے، یہ سب مجموع
الفتاویٰ کے مطابق قوی ہیں۔

تفسیر انوار القرآن میں ہے کہ: مشرکین رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیروکاروں
کو کمزور اور کمتر سمجھتے تھے، اور آپ ﷺ کے بیٹوں کی وفات پر خوش
تھے (قاسم کی مکہ میں اور ابراہیم کی مدینہ میں)، اور مؤمنین کے سخت
اور مشکل حوادث میں مبتلا ہونے پر خوشیاں مناتے تھے، تو پھر یہ سورت
نازل ہوئی تاکہ یہ اعلان کرے کہ خدا کے رسول اللہ ﷺ مضبوط اور کامیاب
ہیں، اور ان کے پیروکار غالب ہیں، اور آپ کی اولاد کی موت سے آپ
کی شان میں کوئی کمی نہیں آئی، رسول اللہ ﷺ کے دشمن آخر کار دم کٹے
اور بے نام و نشان ہوں گے، ان کا نام و نشان اور شہرت باقی نہیں رہے گی۔

مفسر ابو حیان کہتے ہیں کہ کوثر کے بارے میں چھبیس اقوال ہیں، لیکن
صحیح وہی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: "جنت میں ایک نہر ہے،
جس کے کنارے سونے سے بنے ہوئے ہیں، اور اس کے بہنے کی جگہیں
موتیوں اور یاقوت کی ہیں، کستوری سے زیادہ خوشبو والا اور شہد سے
زیادہ میٹھی ہے" ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: کوثر سے مراد بہت زیادہ
خیر ہے (البحر: ۸/۵۱۹)، ابن عباسؓ نے کہا: کوثر سے مراد خیر کثیر (بہت
زیادہ بھلائی) ہے، جو مفسرین کے تمام اقوال کو شامل ہے، کیونکہ رسول
اللہ ﷺ کو بہت سی فضلتیں عطا کی گئی ہیں، ان میں سے نبوت، کتاب، حکمت،
علم، شفاعت، حوض، مقام محمود، بہت سے پیروکار، دشمنوں پر فتح، اور
فتوحات کی کثرت اور دیگر بہت سی بھلائیاں عطا ہوئی ہیں۔

سورة کوثر کی تمہید

سورة کوثر جو مکی سورتوں میں سے ایک ہے جو کہ اس بارے میں بحث کرتی ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو کیا کچھ عطا کیا ہے، اور یہ کہ آپ کو دنیا اور آخرت کی کون کونسی بھلائیاں عطا کی ہیں ان میں سے حوض کوثر، اور دیگر جامع اور قیمتی نعمتیں ہیں، اور اپنے پیغمبر کو پیغام دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے شکر کے طور پر نماز قائم کریں اور قربانی کریں۔

اس مبارک سورت کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کو بشارت دی جارہی ہے کہ آپ کے دشمن بے نام و نشان ہوں گے، اس سورت میں اللہ تعالیٰ وضاحت فرماتا ہے کہ اس کے نبی کے دشمن بے نسب اور دم کٹے ہیں۔

یاد رہے کہ اس سورت میں دو غیبی خبریں ہیں: ایک کوثر کا تحفہ، اور وہ بھی اس وقت جب مکہ میں آپ ﷺ خالی ہاتھ تھے، اور آپ کا کوئی بیٹا نہیں تھا، اور دوسرا دشمن کا بے نام و نشان ہونا جن کی بہت سے اولاد تھی۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُورَةُ الْكَوْثَرِ

إِنَّا أَعْطَيْنَكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُحْضِرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
إِنَّا أَعْطَيْنَكَ الْكَوْثَرَ ۝	بلا شبہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی
فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُحْضِرْ ۝	پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝	بیشک تمہارا دشمن ہی بے اولاد رہے گا

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"إِنَّا" یقیناً ہم نے "أَعْطَيْنَكَ" ہم نے آپ کو تحفہ دیا ہے، "الْكَوْثَرُ"، (کثرت) زیادہ خیر اور بھلائی، کوثر: کثرت کا مبالغہ ہے "قدم فلان بکوثر کثیر" فلان ڈھیر سارے خیر اور بھلائی کے ساتھ واپس آیا، "صَلِّ لِرَبِّكَ" صرف اپنے رب کے لیے نماز پڑھ، ایسی نماز جو دکھاوے سے خالی ہو، "أُحْضِرْ" صرف اپنے رب کے لیے اور صرف اس کے نام پر قربانی کر، نہ کہ کسی اور مقصد کے لیے، تکبیر کہتے ہوئے ہاتھ اپنے سینے (چہرہ) تک اٹھائیں، (غریب القرآن)۔

"وانحر" خدا تعالیٰ کا بندوں کے متعلق شفقت اور مہربانی ہے، (تفسیر کبیر) "شانی" "شناً": برا اور بدتمیز دشمن، (سورہ مائدہ: ۲ اور ۸ شأن: دشمنی) "الْأَبْتَرُ" خیر اور برکت سے خالی، بے اصل اور بے نسب، بے نام و نشان، بے اولاد، بانجھ

کوثر عربی زبان میں

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا : "کوثر" عظیم تحفہ اور خیر کثیر ہے، یعنی ایک ایسی نیکی جو کئی سمتوں میں فراوانی کے ساتھ ہو، اس لیے کہ لفظ ہر خیر کو شامل ہے، جو رسول اللہ ﷺ کو عطا کی گئی ہے، حوض کوثر دیگر خیر اور برکتوں سمیت، صحیح نصوص اور احادیث کے مطابق کوثر: ایک ایسی نہر جس کے کنارے سونے سے بنے ہوئے ہیں اور اس کی نالی موتیوں اور یاقوت سے بنی ہے، اور وہ کستوری سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سفید ہے، جو بھی اس سے پیئے گا اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی (رواہ ترمذی)

تفسیر

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ	بلاشبہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی

ہم نے آپ ﷺ کو بہت ساری بھلائیاں عطا کی ہیں، اس سورت میں تمام باتوں کے مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں، جیسے سورۃ الضحیٰ اور سورہ الم نشرح، ان تینوں سورتوں کے اہم مقاصد میں سے ایک نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا ہے ان تمام حوادث، واقعات اور دشمن کے مسلسل بد زبانیوں کی وجہ سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے وعدے پورا کرتا ہے، سورۃ الضحیٰ میں خدا تعالیٰ نے تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا: "وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ" (ضحیٰ: ۵) "اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا" اس سورت میں فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے وعدے پر عمل کیا: "إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ"۔

یاد رہے کہ: نعمتوں کی فراوانی، اور خوشی میں اپنے پروردگار کو نہیں بھولنا چاہیے۔

اس سورت میں دو غیبی خبریں ہیں

ایک نبی ﷺ کو کوثر کا عطا ہونا، وہ بھی مکہ معظمہ میں جب رسول اللہ ﷺ خالی ہاتھ تھے، اور آپ کا بیٹا بھی فوت تھا، اور دوسرا دشمن کا بانجھ ہونا، جس کی اولاد بھی تھی اور بہت سی دولت بھی تھی۔

ہمارے عظیم رب خوبصورت انداز میں فرماتے ہیں: "إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ" ترجمہ: "ہم نے تجھے کوثر (بہت ساری خیر اور بھلائی) عطا کی"۔

"أَعْطَيْنَا" بمعنی ہم نے دیا اور بخش دیا ہے، یہ جو باریکی لفظ "أَعْطَيْنَا" میں موجود ہے وہ اعطاء میں ہے، اور اعطاء میں ایک قسم کی تعظیم اور احترام اس آدمی کے لیے ہے جو ایسی چیز کو لیتا ہے جس کا وجود ہے، دراصل جب احترام کرنا مقصود ہو تو پھر کہتے ہیں کہ ہم نے عطا کیا، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ لفظ "أَعْطَيْنَا" کا فاعل اللہ ہے، لیکن اس موقع پر جمع کے صیغے کے ساتھ بیان ہوا ہے بجائے اس کے کہ کہتے: میں نے یہ تجھے دیا، کہتا ہے کہ: ہم نے دیا، یہ ایک جلالت شان، بڑائی اور بلند مرتبہ و مقام اور قدرت کا اظہار ہے۔

"أَعْطَيْنَا" جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا عطاء کا معنی صرف دینے اور بخشنے کے ہیں، ایسا دینا اور بخشنا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو یقیناً کسی قسم کا احسان جتائے بغیر ہے، اور اگر غیر اللہ کی طرف سے ہے تو یہ مذمت کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، اور بغیر مذمت کے بھی، اسی طرح اگر یہ بخشش خدا کی طرف سے ہو تو اس سے انسان میں مثبت تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اگر دینے والا خدا کے علاوہ کوئی اور ہے تو ہمیں کسی بھی لمحہ ذلت کے انتظار میں رہنا چاہیے، یا اس کے پشیمان ہونے کا انتظار کرنا چاہیے، کہ اسے ہم سے واپس لے، پر سکون اور پر اعتماد طریقے سے انسان کو جو کچھ دینے والا ہے وہ صرف وہی عظمت والا رب ہے، اس ذات نے جو کچھ ہمیں دیا ہے وہ واپس نہیں لے گا، لیکن افسوس ہے کہ انسان خدا کی نعمتوں کا سب سے کم شکر ادا کرتا ہے، اور ان لوگوں کا سب سے زیادہ شکر ادا کرتا ہے جو کم سے کم دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ شکر کے طلبگار ہوئے ہیں۔

تفسیر جلوہ ہائے ازا سرار قرآن سورة الكوثر میں لکھتے ہیں: صیغہ "أَعْطَيْنَا" (ہم نے آپ کو دیا) میں یہ بتایا ہے کہ "کوثر" سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو نبی کریم ﷺ کو دی گئی تھیں، وہ نعمتیں جسے نبی ﷺ اپنے تمام وجود کے ساتھ محسوس کرتے تھے، اور آپ کے لیے اتنی قابل فہم تھیں کہ اس کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

"الکوثر" کا اطلاق ان نعمتوں پر جو نبی ﷺ کے اختیار میں ہیں یا جنت میں عطا کی جائیں گی سورت کی روح اور الفاظ کے ساتھ مطابقت نہیں بنتی۔

پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝

یعنی آپ ﷺ کو جو بے شمار نعمتیں دی گئی ہیں کے بدلے میں دو عمل کرنے کا مطالبہ ہے، پہلا عمل: اپنے رب کے لیے صدق دل سے نماز پڑھ اور سجدہ کر، مفسرین کی اصطلاح میں (اپنے خالق سے براہ راست تعلق قائم کرنا) یہ بات قابل ذکر ہے کہ: شکریہ فوری طور پر ہونا چاہیے "فَصَلِّ" حرف فاء تسریع کے لیے ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ اس عظیم نعمت کی وجہ سے جو آپ کو عطا ہوئی ہے، اونٹ کی قربانی کر، جو عربوں کے ہاں بہترین مال شمار ہوتا تھا۔

"فَصَلِّ" جس عمل کو "کوثر" کے شکریہ کے طور پر انجام دیا جاسکتا ہے وہ "نماز" ہے، "فَصَلِّ لِرَبِّكَ" ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ: دینی احکام عقل اور فطرت کے مطابق ہیں، عقل نعمتوں کا شکر ادا کرنا ضروری سمجھتی ہے، اور دین بھی یہی حکم دیتا ہے۔

رب عزوجل فرماتا ہے: ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے صدق دل سے ہمارے لیے اپنی فرض نمازیں جاری رکھو "اور قربانی کرو" میری رضا کے لیے میرے نام پر، بت پرستوں کی طرح نہیں کہ جو میرے علاوہ دوسروں کے لیے قربانی کرتے ہیں۔

التسہیل میں ہے کہ: مشرکین نماز پڑھتے ہوئے سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، اور بتوں کے لیے اونٹ قربان کرتے تھے، اس لیے خدا تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ کی نماز اور قربانیاں خالص میرے لیے ہوں، اونٹوں کی قربانی صرف اس کے لیے ہو، یعنی توحید اور اخلاص کا حکم دیتا ہے۔

قتادہ، عطاء اور عکرمہ کہتے ہیں کہ "وانحر" کا معنی عید الضحیٰ کی نماز پڑھنا اور اس میں قربانی ذبح کرنا ہے، ابن کثیر کہتے ہیں: درست یہ ہے کہ "نحر" سے مراد حج اور مناسک میں جانور ذبح کرنا، ہدیہ اور قربانی کرنا، ابن کثیر نے اس بارے میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے، اللہ تعالیٰ نے عطا کردہ نعمتوں کے مقابلے میں انسانوں کے لیے جو فرض اور ذمہ داری بیان کی ہے، وہ نعمت کا شکر ادا کرنا ہے، لیکن جس نکتے کی طرف توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ نعمت اور شکر میں تناسب لازم ہے، اس کا

مطلب یہ ہے کہ نعمت جتنی بڑی اور عظیم تر ہو تو اس کے لحاظ سے زیادہ شکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سورہ میں ہمارے رب عزوجل نے نبی کریم ﷺ کو کوثر کی نعمت دینے کا ذکر کیا ہے، "کوثر" ایک صفت ہے جو کثرت سے ماخوذ ہے، اس کا معنی خیر اور نعمتوں کی کثرت اور بہتات کا ہے، اس عظیم نعمت اور زیادہ خیر کے لیے بہت زیادہ شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کے بدلے میں رسول اللہ ﷺ کے کاندھوں پر دو ذمہ داریاں ڈالی ہیں اور فرمایا: "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنْحَرْ" اب جبکہ یہ حال ہے تو صرف اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔

ملاحظہ فرمائیں: کوثر کے شکر کے طور پر سب سے پہلا فرض نماز ہے، نماز سب سے جامع اور مکمل عبادت ہے، اور وہ اس طرح کہ اس میں قربت کے حصول کے لیے قلب حاضر ہوتا ہے اور زبان حمد اور سورت کے تلاوت کے ساتھ اور جسم کے اعضاء رکوع سجود کے ساتھ مصروف ہوتے ہیں۔

دوسری ذمہ داری جو کوثر کے تشکر کے طور پر ہے وہ نحر کرنا یعنی قربانی ہے، "وانحر" سے تفسیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قربانیوں میں سے اونٹ زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اور مسلمان اس میں بہت دلچسپی رکھتے تھے، اور اونٹ نحر کرنا بڑی قربانی اور جذبہ کے بغیر ممکن نہ تھا، چونکہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ کوثر کی نعمت اور اس کے شکرانے کے درمیان توازن قائم ہو، اس لیے نماز پڑھنے اور اونٹ کی قربانی کا حکم دیا۔

نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کا اللہ کے سوا کسی اور کے لیے بجالانے کا کوئی معنی نہیں ہے، خاص طور پر "رب" کے مفہوم کے حوالے سے جس سے مراد نعمتوں کا تسلسل، تدبیر اور پروردگار کی ربوبیت ہے، کیونکہ "رب" لفظ کا مطلب ہے وہ مالک جو اپنے مملوک کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، خدا تعالیٰ کا حکم "فَصَلِّ لِرَبِّكَ" مشرکوں کے اعمال کے برخلاف ہے جو بتوں کو سجدہ اور ان کے لیے قربانی کرتے تھے، حالانکہ اپنی تمام نعمتوں کو رب کی طرف سے سمجھتے تھے بہر حال، تعبیر "لربک" سے عبادات میں قرب کی نیت کی ضرورت واضح ہے۔

"فَصَلِّ" اور "وَأَنْحَرْ" کے درمیان کیا ربطہ ہے؟

ان دونوں جملوں کے درمیان تعلق کو واضح کرنے کے لیے ہمیں پہلے "وَأُنْحَرِّ" کی تشریحات کو دیکھنا چاہیے، اس کے نتیجے میں ہم ان دونوں جملوں کے درمیان تعلق کی نشاندہی کرتے ہیں۔

الف: "وَأُنْحَرِّ"، نحر کے مادہ سے ہے، بمعنی: گلے والی جگہ، اور یہاں اونٹ کا گلہ مراد ہے، اگر آپ نے سنا یا دیکھا ہوگا اونٹ کو کاٹنے کے لیے دوسرے جانوروں کی طرح اس کی گردن نہیں کاٹتے، اسی لیے اونٹ کو پہلے نحر کیا جاتا ہے، یعنی اس کے حلق میں بڑا چھرا گھونپا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بہت سا خون بہہ جاتا ہے، اور اس کا جسم سست پڑ جانے یا کمزور ہونے کے بعد زمین پر گرتا ہے، پھر اس کی گردن کاٹ کر سر الگ کرتے ہیں، اس عمل کو نحر کہتے ہیں، جس کا مطلب قربانی ہے، اور ہوسکتا ہے کہ نماز کے حکم کے بعد "نحر" کا حکم دینے کی وجہ بندے کے اللہ کے ساتھ تعلق کے بعد، بندوں کے بندے کے ساتھ تعلق کی طرف اشارہ ہو، یعنی اگر انسان کا خدا کے ساتھ تعلق ہو تو وہ معاشرے سے اپنا تعلق منقطع نہیں کرسکتا، کہ غریبوں اور مسکینوں کا خیال نہ رکھے، بلکہ دونوں تعلقات کو مضبوط رکھتا ہے۔

ب: لفظ "وَأُنْحَرِّ" سے مراد قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونا ہے، کیونکہ "نحر" کے مادہ کے معنی حلق کے ہوتے ہیں، پھر عرب اسے ہر چیز کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے، یہاں بھی خدا تعالیٰ قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونے کا حکم دے رہا ہے، درحقیقت یہ نماز کی شرائط میں سے ایک شرط ہے جس کی نشاندہی کی گئی ہے۔

یہ آیت قربانی پر عید کی نماز کو مقدم رکھنے کی دلیل ہے اور یہ جمہور کی رائے ہے، اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھی جائے اور ہدی و قربانی منیٰ میں ہو، یہاں اس امر کا بیان آپ کی امت کی تعلیم کے لیے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہاں نماز سے مراد عید کی نماز اور نحر کا معنی قربانی کرنا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ وہ نماز اور قربانی دیگر نمازوں اور مناسک کو بھی شامل ہو۔

ج: اس سے مراد تکبیر کے دوران ہاتھ گلے یا چہرے کے سامنے اٹھانا ہے۔

آیت "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُخِّرْ" سے معلوماتی اسباق

آیت "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُخِّرْ" جس نصیحت آموز سبق کا استنباط کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ:

- 1- وہ نعمتیں جو پیغمبر اسلام کے لیے ذمہ داری لاتی ہیں، "اعطیناک....فصل۔"
- 2- شکر یہ فوری ہونا چاہیے، (فصل) میں "حرف فاء تسریع کے لیے ہے"
- 3- دینی احکام عقل اور فطرت کے مطابق ہوتے ہیں، عقل بھی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہے، دین بھی یہی حکم دیتا ہے "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُخِّرْ"
- 4- چونکہ نعمت کا تحفہ اسی کی طرف سے ہے "إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ" اس لیے شکر بھی اسی کا ہونا چاہیے "فَصَلِّ لِرَبِّكَ"
- 5- اللہ سے تعلق انسانوں سے تعلق پر مقدم ہے، "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُخِّرْ"
- 6- اس اتفاق کی اہمیت ہے جو ایمان اور عقیدت کے ساتھ ہو، (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُخِّرْ)
- 7- اس نماز کی قدر و قیمت ہے جو اخلاص کی ساتھ ہو، "لِرَبِّكَ"

بیشک تمہارا دشمن ہی ہے اولاد رہے گا	إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ○

جب آپ ﷺ کے بیٹے وفات پا گئے، تو عاص بن وائل نے کہا: اسے چھوڑ دو، وہ بغیر پشت کا آدمی ہے، "ابتر" یعنی اس کی نسل باقی نہیں رہی، پس جب وہ مرے گا تو اس کا نام بھلا دیا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور اعلان فرمایا کہ یہ کافر خود ابتر ہے، اگرچہ اس کی اولاد بھی ہو، کیونکہ وہ خدا کی رحمت سے محروم ہے، اس کا نام لعنت اور نفرت کے سوا نہیں لیا جائے گا، لیکن نبی کریم ﷺ کا نام قیامت تک مینار و منبر پر لوگوں کی زبانوں پر رہے گا، آپ کا نام اللہ کے نام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا، اور مؤمنین قیامت تک ان کی پیروی کریں گے، پس وہ ان کے لیے باپ کا درجہ رکھتے ہیں، اس پر درود و سلام ہو خدا کا۔

"تفسیر جلوہ های از اسرار قرآن" کے مفسر اس بارے میں لکھتے ہیں کہ: اس آیت مبارکہ سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس وقت نازل

ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں نے آپ ﷺ صحابہ کرام کو مکہ میں محاصرے میں لے لیا، مکمل روابط منقطع کر دیے تھے، مکہ کے تمام اقوام اور قبائل سے آپ ﷺ تعلقات کے منقطع کر کے انہوں نے محسوس کیا کہ نبی ﷺ کو لوگوں سے الگ کر دیا ہے اور ان کے درمیان اثر و رسوخ کے راستے بند کر دیئے ہیں (جلوہ های از اسرار قرآن، سورة الكوثر)

اس طرح آیت میں دو موضوع قابل ذکر ہیں:

- 1 - دو تاکید کا موجود ہونا (أَنْ اَوْ هُوَ) اس بات کی علامت ہے کہ یقیناً اور ضرور تمہارا دشمن اور بد خواہ بغیر اولاد رہے گا۔
- 2 - "شائنی" اسم فاعل ہے، یعنی: اس میں ماضی، حال اور مستقبل کے دشمن شامل ہیں، اس لیے قرآن کے اس اشارے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ نبی کا دشمن ہر دور میں بے نسل رہے گا۔

سورة کوثر کی تفسیر انس بن مالک کی حدیث کے تناظر میں

انس بن مالک بن النصر بن ضمضم، ان کا لقب: ابو حمزہ ہے، جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، ان کا شمار جلیل القدر صحابہ کرام میں ہوتا ہے، جو کم عمری میں نبی ﷺ پر ایمان لائے تھے، نبی ﷺ کے خدمت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ، اکثر غزوات میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ رہے، عالم اسلام کے معتبر محدثین میں سے ہیں، آپ سورہ کوثر کی تفسیر میں فرماتے ہیں: أغفی رسول الله صلى الله عليه وسلم إغفاءة، فرفع رأسه متبسها، فإما قال لهم، وإما قالوا له: يا رسول الله لم ضحكت؟ فقال: إنه أنزلت على أنفا سورة فقرأ (بسم الله الرحمن الرحيم، إنا أعطيناك الكوثر) حتى ختمها، فلما قرأها قال: هل تدرون ما الكوثر؟ قالوا: الله ورسوله أعلم! قال: فإنه نهر وعدنيہ ربی عز وجل فی الجنة، وعليه خير كثير، عليه حوض ترد عليه أمتی يوم القيامة، آئيته عدد الكواكب) الباني صحيح أبي داود میں (4747). ترجمہ: رسول اللہ ﷺ ہلکی نیند سو گئے تھے، پھر آپ ﷺ مسکراتے ہوئے نیند سے اٹھے اور صحابہ کرام سے فرمایا: آپ لوگوں کو میری مسکرائے کی وجہ معلوم ہے؟ یا صحابہ کرام! نے آپ ﷺ سے مسکرائے کی وجہ پوچھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے (پھر آپ نے پوری سورت پڑھ دی)۔

خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ سے فرماتا ہے: "إِنَّا آعْطَيْنَاكَ الْكُوثَرَ"، ہم نے آپ کو بہت ساری بھلائیاں اور بہت سارا فضل اور نعمتیں دی ہیں، جن میں وہ نہر یا

حوض بھی شامل ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عطا کیا ہے، جس کو "کوثر" کہا جاتا ہے، اس کی لمبائی ایک ماہ کی مسافت ہے اور چوڑائی بھی ایک ماہ کی مسافت ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے، اور اس کے برتن اور پیالے آسمان کے ستاروں کے برابر ہیں اور انہی کی طرح جگمگاتے ہیں، جس نے ایک بار حوض کوثر کا پانی پی لیا اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی۔

جب اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ پر اپنے احسان کا ذکر فرمایا، تو آپ ﷺ کو نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأُحْزَرْ" پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر، یعنی: اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو دنیا اور آخرت میں بہت سی بھلائیاں عطا کی ہیں، لہذا ان نعمتوں کی شکر گزاری کے لیے آپ صدق دل سے ہمارے لیے فرض نمازیں جاری رکھیں، اور ہماری رضا، اور نام پر قربانی کریں، ان مشرکوں کی طرح نہ کریں جو غیروں کے لیے نماز پڑھتے ہیں، اور غیروں کے لیے قربانی کرتے ہیں، مشرکوں میں بہت سے لوگ تھے جو خدا کے سواء کسی اور کے لیے قربانی کرتے تھے، لہذا اللہ عزوجل نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ آپ کی نماز اور قربانی میرے لیے خالص ہو۔

قتادہ عطاء اور عکرمہ کہتے ہیں کہ: "وانحر" سے مراد عیدالاضحیٰ کی نماز پڑھنا اور قربانی ذبح کرنا ہے، ابن کثیر کہتے ہیں کہ "نحر" سے مراد حج اور مناسک میں ہدیہ اور قربانی کے طور پر جانور ذبح کرنا ہے، ابن کثیر نے اس بارے میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔

"إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ" (یقیناً تمہارا دشمن خود ہی ابتر ہے)

یعنی بلاشبہ یہ تیرا ہی دشمن ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیوں سے محروم ہے، بے نسل ہے، اس کا کوئی انجام نہیں ہے، یا یہ کہ تیرا جو دشمن ہے جس کی موت کے بعد اس کی کوئی نیک نامی نہیں ہوگی، زمانہ جاہلیت میں جس آدمی کے ہاں نرینہ اولاد نہیں ہوتی تھی تو اسے ابتر کہا جاتا تھا، حسن بصریؒ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کو ابتر کہنے سے مشرکین کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ اپنے آخری ہدف تک پہنچنے سے پہلے دعوت کے آدھے راستے میں ناکام ہوجائیں گے، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ یہ دشمنان رسول اللہ ﷺ ہیں جو کہ ناکام اور بے نشان رہیں گے" (مراجع: تفسیر انوار القرآن، تفسیر علامہ عبدالرحمن سعدی اسباب النزول سیوطی)

مفسرین کے نزدیک "کوثر" کے معنی کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: بعض نے صحیح احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ: "جنت میں ایک نہر ہے" بعض نے کہا ہے کہ: "جنت میں حوض ہے" اور بعض نے کہا: اس سے مراد وہ خیر کثیر ہے جو نبی ﷺ کو عطا کیا گیا ہے، بعضوں نے کہا کہ یہ صحابہ کرام کی جماعت ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا ساتھی چن لیا، لیکن اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ خیر کثیر ہے جو آپ ﷺ دیا گیا ہے، ان میں سے ایک حوض کوثر ہے جو جنت میں ہے، اور آپ ﷺ کو عطا کی گئی ہے، اس کی تصدیق و تائید کے لیے بہت سارے دلائل موجود ہیں، مثال کے طور پر حضرت عائشہؓ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: "إِنَّا أُعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ" کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: "نَهْرٌ أُعْطِيَ نَبِيَكُمْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاطِئَاهُ عَلَيْهِ دُرٌّ حَبُوفٌ آيَتُهُ كَعَدَدِ النُّجُومِ" (بخاری: ۴۹۶۵)

ترجمہ: "ایک نہر ہے جو نبی ﷺ کو دی گئی ہے، اور اس کے دونوں کناروں کے درمیان موتیاں ہیں، اس کے برتنوں کی تعداد ستاروں کے برابر ہے۔"

ابن جریر الطبری امام المفسرین، کوثر کے معنی کے بارے میں تمام مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں کہ بہت سی روایات کے مطابق ہمارے نزدیک کوثر جنت میں ایک نہر ہے جو نبی کریم ﷺ کو دی گئی ہے۔

"ابتر" کون ہے؟

علم لغت کے علماء کہتے ہیں کہ "ابتر" لفظ "بتر" سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کاٹنا، جوہری نے "بَتَرْتُ الشَّيْءَ" کی تعریف کسی چیز کو ختم ہونے سے پہلے کاٹ دینے کے طور پر، اور "انبتار" کو انقطاع، اور "سیف باتر" کو کاٹنے والی تلوار کے طور پر اور "ابتر" کو دم کٹا اور بغیر کسی پیچھے چلنے والے کو کہا ہے۔

راغب کے مطابق ابتر دم کٹے جانور کو کہا جاتا ہے، پھر جس آدمی کی نسل نہ ہو کہ اس کا جانشین بنے اس کے لیے کہا جاتا ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کی بنا پر کہ جو بات اللہ کے ذکر کے بغیر شروع کی جائے اسے "ابتر" کہتے ہیں۔

ابن منظور کی رائے بھی ان دو رائے کے قریب ہے، ابن عباس اور سدی

کی روایت کے مطابق قریش ایسے شخص کے لیے جس کی نرینہ اولاد مرتی اسے "ابتر" کہتے تھے۔

لفظ صرف ایک ہی بار ذکر ہوا ہے وہ بھی اس سورت "کوثر" کی تیسری آیت میں، اور اس میں نبی ﷺ کے دشمن کا تعارف ہوا ہے، "إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ" (وہ تیرا ہی دشمن ابتر ہے) "شائئ" ماہر لسانیات نے اس لفظ کا معنی مبغض، یعنی بغض رکھنے اور نفرت کرنے والے کا کیا ہے، (ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، محقق، مصحح، میر دامادی، جمال الدین، جلد 1، صفحہ 102، بیروت، دار الفکر

للطباعة والنشر والتوزيع، دار صادر، طبع سوم، 1414ق)

عالم اسلام کے مشہور مفسر ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس لفظ سے مراد دشمن ہے، لیکن بعض اقوال کے مطابق بعض لوگ اپنا تعارف "شائئ" پیغمبر کے دشمن سے کراتے تھے، اور قرآن نے بھی ان کے جواب میں یہی لفظ استعمال کیا ہے: جیسا کہ عاص بن وائل کہتا تھا کہ: میں محمد کا شائئ ہوں (طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، جلد 30، صفحہ 212، بیروت، دار المعرفة، طبع اول، 1412ق)۔

سورة الكوثر کا پیغام

- 1 - سب سے زیادہ اور بڑی نیکی سب سے چھوٹی سورت میں رکھی گئی ہے، "إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ"۔
- 2 - چھوٹی سے چھوٹی بات میں سب سے زیادہ خطاب کیا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو پانچ مرتبہ مخاطب کیا ہے، ان میں دو صورتیں امری اور قانونی، اور عبادی ہیں۔
- 3 - ذمہ داری کے مقام پر، ہمیشہ حکمی خطاب استعمال نہیں کرنا چاہیے، (تین صورتوں میں خدا تعالیٰ کا خطاب عام ہے۔)
- 4 - دینی فرائض کی ادائیگی کے ذریعے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ضروری ہے (فصل)۔
- 5 - اگر انسان کو خیر کثیر یا بہت زیادہ نعمتیں میسر ہوں تو اسے چاہیے کہ اس میں سے کچھ دوسروں کے لیے خرچ کرے۔
- 6 - وافر نعمت کو معاشرے میں ظاہر کرنا چاہیے، تاکہ دوسرے اس سے فائدہ اٹھائیں، "وانحر"۔
- 7 - رسول اللہ ﷺ کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کا نتیجہ "ابتر" ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

8 - اس دشمن کے مقابلے میں جو تباہی کا ارادہ رکھتا ہے نرمی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، "إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ"۔

سورہ کوثر پڑھنے کا ثواب

سورہ کوثر پڑھنے کے ثواب کے بارے میں ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے آپ فرماتے ہیں، "جو شخص سورہ کوثر کی تلاوت کرے گا، اللہ تعالیٰ حوض کوثر اور جنت کی ہر نہر سے اسے پانی پلائے گا، اور عید الاضحیٰ کے دن قربانی والوں کے برابر اجر و ثواب عنایت فرمائے گا"۔

حوض کوثر

لفظ "کوثر" کثرت بمعنی خیر کثیر ہے، کوثر، جنت میں یا میدان محشر میں ایک حوض ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو عطا کی ہے، اور مؤمنین جنت میں داخل ہونے کے موقع پر اس کے پانی سے سیراب ہوں گے۔ مفسرین نے کوثر کے معنی کے بارے میں مختلف اقوال و روایات نقل کی ہیں، بعض مفسرین نے صحیح احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ "کوثر" جنت میں نہر ہے، بعض کہتے ہیں کہ جو خیر کثیر نبی کریم ﷺ کو عطا کیا گیا ہے وہی حوض کوثر ہے، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ کوثر: قرآن کریم اور نبوت ہے، بعض مفسرین کا یہ خیال ہے کہ: اس سے مراد صحابہ کرام کی وہ کثیر تعداد ہے جنہیں اللہ نے آپ ﷺ کے ساتھی ہونے کی حیثیت سے انہیں چن لیا۔

البتہ اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ خیر کثیر ہے جو آپ ﷺ کو دیا گیا ہے، ان میں سے ایک حوض کوثر ہے جو جنت میں ہے، اور آپ ﷺ کو عطا کی گئی ہے، اس کی تصدیق اور تائید کے لیے بہت سارے دلائل موجود ہیں، مثال کے طور پر حضرت عائشہؓ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ" کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا: "نَهْرٌ أُعْطِيَهُ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاطِئَاهُ عَلَيْهِ دُرٌّ مُجَوَّفٌ آيَتُهُ كَعَدَدِ النُّجُومِ" (بخاری: ۴۹۶۵) ترجمہ: "ایک نہر ہے جو نبی ﷺ کو دی گئی ہے، اور اس کے دونوں کناروں کے درمیان موتیاں ہیں، اس کے برتنوں کی تعداد ستاروں کے برابر ہے"۔ خدائے بزرگ نے اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ کو ایک بڑا اور وسیع حوض عطا کر کے جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے اور جس کی خوشبو کستوری کی خوشبو سے زیادہ ہے، آپ کی عزت اور توقیر کی ہے، حوض کوثر کے جام اور پیالے ستاروں کی طرح زیادہ ہیں، اس کا صاف پانی کوثر کے دریا سے اس حوض میں داخل ہوتا ہے،

وہی کوثر کی نہر جسے اللہ تعالیٰ نے جنت میں محمد ﷺ کے لیے خاص کیا ہے۔

محمد ﷺ کے امتی اس تالاب کے پاس آئیں گے، جو اس حوض کے پانی سے پیے گا، وہ کبھی بھی پیاسا نہیں ہوگا۔

اس تالاب کے محل وقوع کے بارے میں علماء کی مختلف آراء ہیں: امام غزالی اور قطبی کی رائے ہے کہ یہ حوض پل صراط عبور کرنے سے پہلے میدان حشر میں واقع ہے، اس دعویٰ کے لیے یہ سند پیش کرتے ہیں کہ اس حوض میں آنے والے بعض لوگ دوزخ میں جائیں گے، اگر یہ حوض پل صراط کے بعد ہوتا تو بعض لوگوں کو واپس دوزخ کی طرف بھیجنا ممکن نہ تھا۔ (تذکرہ: ۳۰۲)۔

علامہ ابن صحر نے امام بخاری کا قول نقل کیا ہے کہ: یہ حوض پل صراط کے بعد ہے، کیونکہ امام بخاری نے حوض کوثر سے متعلق احادیث پل صراط اور شفاعت کی احادیث کے بعد لکھی ہیں (فتح الباری: ۱۱ / 466)

حوض کوثر کا طول و عرض

روایات کے مطابق حوض کوثر کی لمبائی اور چوڑائی اور اس کے ہر کونہ کی مسافت ایک ماہ کے برابر ہے۔

اہل علم کوثر کے پانی کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا پانی جنت سے آتا ہے، اس کے پانی کی گزرگاہ اور نالہ جنت سے کھینچے گئے ہیں، ان میں سے ایک سونے کا ہے اور ایک چاندی کا، اس کے برتنوں تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہے۔

حوض کوثر کے بارے میں مذکور احادیث

اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے ان احادیث کو قارئین محترم کی خدمت پیش کرتا ہوں، جو خطیب تبریزی نے اپنی مشکاة میں ذکر کی ہیں:

1 - بخاری اور مسلم نے عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (حوضی مسیرۃ شہر، وزوایاہ سواء۔ مأوۃ أبيض من اللبن، وریحہ

أطیب من المسک، وکیزانہ کنجوم السماء، من یشرب منها فلا یظمأ أبداً)

ترجمہ: میرے حوض کی چوڑائی ایک ماہ کی مسافت ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اور اس کے آب خورے آسمان کے ستاروں کے برابر ہیں، جو اس میں سے ایک بار پی لے گا اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی۔

2 - حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (إن

حوضی أبعد من أيلة من عدن لهو أشد بياضاً من الثلج، وأحلی من العسل باللبن، ولا نیتہ أكثر

من عدد النجوم، وإني لأصد الناس عنه كما يصد الرجل إبل الناس عن حوضه، قالوا: يا رسول الله! أتعرفنا يومئذ؟ قال: "نعم لكم سيماء ليست لأحد من الأمم، تردون على غراً محجلين من أثر الوضوء" رواه مسلم

ترجمہ: میرے حوض (یعنی کوثر کے) دونوں سروں کے درمیان کا فاصلہ ایلہ اور عدن کے درمیانی فاصلہ سے زیادہ ہے، اور بلاشبہ اس حوض کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے، جس میں دودھ ملا ہوا ہے، اور اس کے آبخورے آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں، اور یقیناً میں دوسری امتوں کے لوگوں کو اس حوض پر آنے سے اس طرح روکوں گا، جس طرح کوئی شخص غیر لوگوں کے اونٹوں کو اپنے حوض پر آنے سے روکتا ہے، صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ (اس وقت) آپ ہمیں پہچان لیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں میں تمہیں پہچان لوں گا، دراصل تمہاری ایک خاص علامت ہوگی، تمہاری پیشانیاں اور تمہارے ہاتھ پاؤں، وضو کی نورانیت کے سبب روشن اور چمکدار ہوں گے (مسلم) 3۔ ایک اور روایت حضرت انس سے منقول ہے کہ: آپ ﷺ نے فرمایا: (تری فیہ أباريق الذهب والفضة كعدد نجوم السماء)۔

ترجمہ: اس حوض میں سونے چاندی کے آبخورے ہوں گے، (جو اپنی چمک دمک اور) تعداد کے اعتبار سے آسمان کے ستاروں کی طرح دکھائی دیں گے۔

4۔ ایک اور روایت میں حضرت ثوبانؓ سے یوں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ سے اس حوض کے پانی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "أشد بياضاً من اللبن، وأحلى من العسل يغت فيه ميزابان يمدانه من الجنة، أحدهما من ذهب والآخر من ورق"۔

"اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے، اس حوض کو لبریز رکھنے کے لیے دو زور دار پر نالے گرتے ہیں جو جنت (کی اس بند) سے آتے ہیں (جس کا نام بھی کوثر ہے) ان میں سے ایک پر نالہ سونے کا ہے اور ایک چاندی کا"۔

حوض کوثر پر کون لوگ آئیں گے اور کون اس سے روکے جائیں گے
کافی ساری احادیث اس بارے میں موجود ہیں کہ کون سے لوگ حوض کوثر پر وارد ہوں گے اور کون اس سے روکے جائیں گے، بخاری مسلم میں

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لیردن علی الحوض رجال من صاحبی، حتی إذا رأیتهم، ورفعوا الی، اختلجوا دونی، فلا قولن: أی رب، أصحابی، فلیقالن لی: إنک لا تدری ما أحدثوا بعدک"

"حوض پر میرے ساتھیوں میں سے کچھ آدمی آئیں گے حتی کہ جب میں انہیں دیکھوں گا اور ان کو میرے سامنے کیا جائے گا تو انہیں مجھ (تک پہنچنے) سے پہلے اٹھا لیا جائے، میں زور دے کر کہوں گا: اے میرے رب! یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا، آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا نئی باتیں نکالیں۔"

بخاری اور مسلم ابی حازم کے واسطے سے سہل بن ساعدیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "أنا فرطکم علی الحوض، من ورد شرب، ومن شرب لم یظأ أبداً، ولیردن علی أقوام أعرفهم ویعرفوننی، ثم یحال بینی وبینهم، قال أبو حازم: فسمع النعمان بن أبی عیاش وأنا أحدثهم هذا الحدیث، فقال: هکذا سمعت سهلاً یقول؟ فقلت: نعم، قال: وأنا أشهد علی أبی سعید الخدری لسبعته یزید، فیقول: فاینهم منی، فیقال: إنک لا تدری ما أحدثوا بعدک، فأقول: سحقاً سحقاً لمن بدل بعدی"

ترجمہ: "آپ ﷺ فرماتے تھے کہ میں حوض کوثر پر تم سے پہلے رہوں گا، جو وہاں پہنچنے گا اور جو اس کا پانی پی لے گا وہ اس کے بعد کبھی پیاسا نہیں ہوگا، میرے پاس ایسے لوگ بھی آئیں گے جنہیں میں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہنچاتے ہوں گے، پھر میرے اور ان کے درمیان پردہ ڈال دیا جائے گا، ابو حازم نے بیان کیا کہ نعمان بن ابی عیاش نے بھی سنا کہ میں ان سے یہ حدیث بیان کر رہا ہوں تو انہوں نے کہا کہ تو نے سہلؓ سے اسی طرح یہ حدیث سنی تھی؟ میں نے کہا کہ ہاں، انہوں نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ابو سعید خدریؓ سے یہ حدیث اسی طرح سنی تھی، ابو سعید اس میں یہ بھی بیان کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں کہوں گا کہ یہ لوگ مجھ میں سے ہیں، نبی کریم ﷺ سے اس وقت کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ ﷺ کے بعد انہوں نے کیا تبدیلیاں کردی تھیں؟ میں کہوں گا دوری ہو دوری ہو ان کے لیے جنہوں نے میرے بعد دین میں تبدیلیاں کردی تھیں۔"

اور بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بینما أنا قائم علی الحوض، إذا زمرة، حتی إذا عرفتهم خرج رجل من بینی وبینهم، فقال: هلم، فقلت: إلی أین؟ فقال:

إلى النار والله، فقلت: ما شأنهم؟ فقال: إنهم قد ارتدوا على أدبارهم القهقري، ثم إذا زمرة أخرى، حتى عرفتهم خرج رجل من بيني وبينهم فقال لهم: هلم، قلت: إلى أين؟ قال: إلى النار والله، قلت: ما شأنهم؟ قال: إنهم قد ارتدوا على أدبارهم، فلا أراه يخلص منهم إلا مثل همل النعم."

ترجمہ: میں (حوض پر) کھڑا ہوں گا کہ ایک جماعت میرے سامنے آئے گی اور جب میں انہیں پہچان لوں گا تو ایک شخص (فرشتہ) میرے اور ان کے درمیان سے نکلے گا اور ان سے کہے گا کہ ادھر آؤ میں کہوں گا کدھر؟ وہ کہے گا کہ واللہ جہنم کی طرف، میں کہوں گا ان کے حالات کیا ہیں؟ وہ کہے گا کہ یہ لوگ آپ کے بعد الٹے پاؤں (دین سے) واپس پلٹ گئے تھے، پھر ایک اور گروہ میرے سامنے آئے گا، اور جب انہیں بھی پہچان لوں گا تو ایک شخص (فرشتہ) میرے اور ان کے درمیان میں سے نکلے گا، اور ان سے کہے گا کہ ادھر آؤ، میں پوچھوں گا کہ کہاں؟ تو وہ کہے گا، اللہ کی قسم! جہنم کی طرف، میں کہوں گا کہ ان کے حالات کیا ہیں؟ فرشتہ کہے گا یہ لوگ آپ ﷺ کے بعد الٹے پاؤں واپس پلٹ گئے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ ان گروہوں میں سے ایک آدمی بھی نہیں بچے گا، مگر یہ کہ چوپایوں کی طرح چھوڑ جائیں گے۔"

امام قرطبی اپنی کتاب "التذکرہ" میں مندرجہ بالا احادیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: علماء اسلام نے حوض سے متعلق احادیث کے بارے میں کہا ہے کہ: وہ تمام لوگ جو دین سے پھر گئے اور مرتد ہو گئے یا جنہوں نے دین میں ایسی بدعتیں پیدا کیں، جن سے خدا تعالیٰ راضی نہیں ہے، اور اس کی اجازت نہیں دی، ان سب کو حوض تک پہنچنے سے روکا جائے گا، اور انہیں وہاں سے بھگادیا جائے گا، لیکن ان کے ساتھ سخت سلوک کیا جائے گا، اور انہیں حوض کی نزدیک جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو گئے ہیں، اور انہوں نے کوئی اور راستہ اختیار کیا ہے، جیسے کہ خارجی فرقے، گمراہ روافض اور معتزلی جنہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے، ان سب نے خدا کا دین بدل دیا ہے، اسی طرح وہ ظالم لوگ جنہوں نے بہت زیادہ ظلم و ستم جاری رکھا، اور حق کے آواز دبانے، اور حق کے پیروکاروں کو قتل کرنے، اور انہیں ہراساں کرنے کے اقدامات کیے، وہ بھی جو کھلم کھلا کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے، اور گناہوں کو کم تر سمجھا، اور کج روی، بدعت اور خواہشات جیسے مسائل کا شکار ہوئے، ان سب کو بھی حوض کوثر سے بھگا دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ اگر انہوں نے صرف اعمال میں کوئی گناہ کیے ہوں، لیکن صحیح عقیدہ رکھتے ہوں تو ان کو ایک مدت تک حوض سے روکا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے بعد وضو کی روشنی کی وجہ سے جس سے وہ پہنچانے جائیں گے، ان کو حوض تک پہنچنے کی اجازت دی جائے گی، اگر وہ نبی ﷺ کے عصر کے منافقین ہوں جو بظاہر ایمان کا اظہار کرتے تھے اور باطن میں کفر کی پیروی کرتے تھے، بظاہر انہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے، پھر ان کی چادریں ہٹا کر ان سے مخاطب ہوں گے، اور ان سے کہا جائے گا: دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ۔

یاد رکھیں کہ جہنم میں ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں رہے گا، جن کے دلوں میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہ ہو، اور ہر حق کو ٹھکرا کر باطل کی پیروی کی ہو، (التذکرہ: صفحہ: ۳۰۶)

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30) سورة الكفرون

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ " ۶ " آیتیں ہیں

وجه تسمیہ:

اس سورت کا نام "کافرون" اس لیے رکھا گیا ہے، کہ ہمارے رب عزوجل نے اپنے نبی کو ہدایت دی ہے اور حکم فرمایا ہے کہ کافروں کو ایک ایسے پیغام کے ساتھ مخاطب کریں، جو توحید کو متضمن اور شرک سے بیزار اور مسلمانوں کی عبادت کی آزادی کا اعلان ہو، اس سورت کا نام "الکفرون" ہے، جو اس سورت کی ابتدائی آیت سے لیا گیا ہے۔

اس سورہ کی مبارک آیات کے خلاصہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ: دشمن اس مرحلے پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ کرنا چاہتا ہے، مشرکین اس بات کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں کہ نبی ﷺ کو استقامت سے اور سمجھوتہ قبول نہ کرنے سے اور ان کے مذہب اور معبودوں پر مسلسل وار کرنے سے روکیں، اور انہیں لچک پیدا کرنے پر مجبور کریں۔

اس سورت کے دیگر نام

اس سورت کے دوسرے نام یہ ہیں: مُنَابَذَہ (دشمنی اور جھگڑا) اخلاص، (مشقشہ) شاید اس کا معنی فصیح اور زوردار بیان ہے۔

سورة الكفرون اور سورة الكوثر کے درمیان ربطہ

یہ سورہ مکہ میں سورہ کوثر کے بعد نازل ہوئی، سورہ کوثر میں خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت میں اخلاص کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ اس سورت میں توحید اور اس دنیا کو وجود بخشنے والے خدا کی عبادت اور شرک سے دوری اور نفرت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ کفر اور ایمان کے درمیان حد فاصل واضح ہو جائے۔

سورة الكافرون کے الفاظ، آیات اور حروف کی تعداد

جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں کہ: سورة الكافرون مکی ہے، اس کا ایک (۱) رکوع، چھ (۶) آیات، چبیس (۲۶) الفاظ، بیانوں (۹۲) حروف اور چھتیس (۳۶) نقطے ہیں۔

(یادر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة الكافرون کی فضیلت

سورة الكافرون کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكُفْرُونَ" اجر و ثواب کے لحاظ سے "قرآن مجید کے ایک چوتھائی حصے کے برابر ہے" (یہ حدیث حسن ہے، البانی نے سلسلۂ احادیث صحیحہ میں نمبر ۵۸۶ پر ذکر کیا ہے)

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا ہی اچھا ہے سورہ کافرون اور اخلاص کہ فجر سے پہلے دو رکعتوں میں پڑھی جائیں۔"

ایک حدیث ہے: "عن فروة بن نوفل رضى الله عنه أنه أتى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله علمني شيئاً أقوله إذا أويت إلى فراشي فقال: اقرأ قل يا أيها الكافرون فإنها براءة من الشرك" (ترمذی)

ترجمہ: فروہ بن نوفل سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایسی چیز سکھائیں کہ جب بھی میں بستر پر سونے جاؤں تو اسے پڑھوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكُفْرُونَ" کیونکہ اس سورت میں شرک سے بیزاری ہے۔

سورت کا سبب نزول

مکہ مکرمہ میں ایک ایسا دور گزرا ہے، جب قریش کے مشرکانہ معاشرے میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوا تھا، لیکن قریش کے سردار اس بات سے کہ نبی ﷺ کو کسی طریقے سے کسی سمجھوتہ یا صلح پر آمادہ کریں نا امید نہیں ہوئے تھے، اس لیے وہ لوگ وقتاً فوقتاً

رسول اللہ ﷺ کے سامنے صلح اور مصالحت کی مختلف تجاویز پیش کرتے تھے، تاکہ آپ ﷺ ان میں سے کسی ایک کو قبول کر لیں، اور ان کے درمیان جو کشمکش اور اختلافات پیدا ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں، اس بارے میں مختلف روایتیں کتب احادیث میں نقل کی گئی ہیں:

1 - طبرانی اور ابن ابی حاتم ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ہم تم کو بہت سا مال و دولت دیں گے تاکہ تم مکہ کے سب سے امیر ترین شخص بن جاؤ، ہر اس عورت اور لڑکی سے تمہاری شادی کروادیں گے جو تم چاہو، لیکن شرط یہ ہے تم ہمارے معبودوں کی توہین نہ کرو اور ان کو برا بھلا نہ کہو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو ایک سال تک ہمارے بتوں کی پرستش کرو، نبی ﷺ نے فرمایا: میں انتظار کروں گا کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم اور رہنمائی آتی ہے، چنانچہ یہ سورت اور آیت نازل ہوئی، "قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ تُأْمُرُونِي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ" (سورہ زمر: ۶۴) ترجمہ: "کہو اے نادانوں! تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں غیر خدا کی پرستش کرنے لگوں" (طبری: ۳۸۲۲۵)، (طبرانی، معجم الوسیط میں: ۲/۶۶، المکتب الاسلامی دار عمارت بیروت) ابو خلف، داود، عکرمہ اور ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔

ابو خلف ایک مجہول شخص ہے اور اس کا استاد داود بھی ضعیف ہے، خاص طور پر جو احادیث وہ عکرمہ سے روایت کرتا ہے، پس اسناد کمزور ترین اور متن باطل ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایسی پیشکش کا انتظار نہیں فرماتے تھے، جس میں شرک کی دعوت ہو، یہ خبر ابن عباسؓ سے درست نہیں ہے، بلکہ موضوع ہے، (تفسیر شوکانی: ۳۰۳۳، تخریج محقق)۔

2 - عبدالرزاق نے وہب سے روایت کیا ہے کہ: کفار قریش نے نبی کریم ﷺ سے کہا: اگر تم پسند کرو تو ہم ایک سال تک تمہاری پیروی کریں گے، اور تم ایک سال ہماری پیروی کرو، تو پھر اللہ تعالیٰ نے سورة الكافرون نازل فرمائی، عبدالرزاق نے ابراہیم احوں اور وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے، مرسل، لیکن جو غلط الفاظ پچھلی حدیث میں تھے وہ اس میں نہیں ہیں، حدیث بغوی میں دیکھیں۔

3 - ابن ابی حاتم نے سعید بن میناء سے روایت کیا ہے: ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن مطلب اور امیہ بن خلف پیغمبر ﷺ سے ملاقات کے لیے

آئے: انہوں نے کہا: اے محمد! آئیں ہمارے بتوں کی عبادت کریں ہم آپ کے خدا کے عبادت کریں گے، ہم اپنے تمام کاموں میں شریک ہوں گے، اس کے بعد سورة الكافرون نازل ہوئی (طبری ۳۸۲۲۶) نے ابن اسحاق اور سعید بن میناء سے روایت کیا ہے (ملاحظہ کریں: لباب النقول فی اسباب

النزول، شان نزول سورة کافرون، بہ تحقیق عبدالزاق البہدی)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے ایک بار یا ایک مجلس میں نہیں بلکہ کئی بار اور مختلف مجالس و مواقع پر رسولؐ کو ایسی پیشکش کی تھی، اس وجہ سے ضروری تھا کہ ایک مضبوط اور فیصلہ کن جواب دے کر ان کی اس امید کو مایوسی میں تبدیل کر دیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں رعایت دینے اور رعایت لینے کی بنیاد پر سمجھوتہ کبھی نہیں کریں گے۔

سورت کا خلاصہ

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ سورت بعثت کے پہلے سال یا دوسرے سال نازل ہوئی، اس سورت میں "کافرون" کا عمومی معنی پیغمبر کے مخالفین یا توحید کے منکرین ہیں، کفار سے مراد حضرت ابراہیم کی نسل سے مشرکین قریش تھے، وہ خود کو ابراہیم کے مذہب کے پیروکار سمجھتے تھے، لیکن انہوں نے اس خالص اور توحیدی مذہب میں بہت سے انحرافات پیدا کئے تھے، یہاں تک ان کے عقائد اور رسوم میں صرف ظاہری مشابہت تھی، حضرت ابراہیم کے دین اور توحید کی روح کا ان میں کوئی اثر موجود نہیں تھا۔

سورہ کافرون کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ مؤمنین کو چاہیے کہ اپنا طرز فکر غیر توحیدی خطوط سے الگ کریں، اور یہ جان لیں کہ مذاہب اور فرقوں کی ظاہری مماثلت ان کی یکسانیت اور حقانیت کی وجہ نہیں ہے، ایسا بھی نہیں ہے کہ اگر کوئی یہودی، عیسائی، سکھ حتیٰ کہ بعض منحرف اسلامی مذاہب جو خدا اور اس کی عبادت کی بات کرتے ہیں، تو یہ ان کی حقانیت کی دلیل ہو اور خالص محمدی اسلام سے کوئی فرق نہ ہو، کیونکہ توحید کی روح اور خدائے واحد کی سچی عبادت ان تحریف شدہ ادیان اور مذاہب میں سے کسی میں بھی موجود نہیں ہے۔

محترم قارئین

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں کو خدائے واحد کی عبادت کی طرف راغب کرنے اور ستاروں، چاند اور سورج کی عبادت سے روکنے کے بعد شرک اور بت پرستی کا مقابلہ کرنا شروع کیا، اور نمرود کے ساتھ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا جہاد کا فیصلہ کیا، (یعقوبی-ج ۱، ۲۳، ۱) بالا آخر رب کی طرف سے ان کو حکم ہوا کہ بابل سے فلسطین اور وہاں سے جزیرۃ العرب کی طرف ہجرت کریں، اور مکہ کی سرزمین پر اپنے بیٹے کی مدد سے خانہ کعبہ کی تعمیر کریں، حضرت ابراہیمؑ اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں کامیاب ہوئے اور اپنے بیٹے کے ساتھ ملکر بیت اللہ بنا اور حج کے مناسک ادا کیے، (یعقوبی: جلد/275)۔

حضرت اسماعیلؑ مکہ میں آباد ہوئے، اور وہاں کے ایک قبیلے میں شادی کی، اور ان کی اولاد اور بچے جزیرہ نما عرب میں رہنے لگے، یہاں تک کہ خانہ کعبہ کی نگرانی عمرو ابن لہی کو ملی۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ عمرو ابن لہی کی زندگی میں ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے توحید سے پیچھے ہٹ کر خانہ کعبہ کو بت خانہ بنادیا، عربوں نے اس کی پیروی کی، اس طرح جزیرۃ العرب میں بت پرستی نے خدا پرستی کی جگہ لے لی، عرب میں زمانہ جاہلیت کی اصطلاح اسی وقت سے شروع ہوئی، اگرچہ پیغمبر اسلام کے تمام آبا و اجداد موحد تھے، اور عربوں کو توحید کی طرف بلاتے تھے، لیکن اس دعوت نے ان میں کوئی رجحان پیدا نہیں کیا۔

شرک و بت پرستی عربوں کے طرز عمل، منشاء اور اعمال کی بنیاد بن گئی جس کا عبدالمطلب کے دور اقتدار میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، زنا اور عصمت فروشی کے پھیلاؤ کی وجہ سے عبدالمطلب نے زنا کرنے والوں کے لیے حد مقرر کی، اور بعض طوائفوں کو نکال دیا، (یعقوبی: جلد/363)۔

کچھ بدعات قبیلہ قریش نے زائرین کعبہ کے لیے ایجاد کی تھیں جنہیں عربوں نے قبول کیا تھا ان میں یہ بات بھی تھی کہ حاجی اپنے پہلے طواف کے لیے احرام کا لباس قریش سے خریدیں، ورنہ وہ کعبہ کا برہنہ طواف کریں، (یعقوبی: جلد/336)۔

یہ بدعت قریش نے دوسروں پر اپنے استحقاق کو بڑھانے کے لیے لگائی تھی، اسی طرح حج کے مراسم انجام دینے کا طریقہ اور اپنے خیموں

کی شکل تمام عربوں سے مختلف رکھی تھی، البتہ یہ تمام بدعات قبول کی گئیں، اور عربوں نے ان قوانین کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کی نہ ہی انہوں نے کوئی حساسیت دکھائی۔

برہنہ حالت میں خانہ کعبہ کا طواف اس قدر پھیل چکا تھا کہ عربوں کو معمولی سی چیز لگتی تھی، اور مجبوراً عبد المطلب کو اس پر پابندی لگانا پڑی۔

ظہور اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں عربوں کی عادات، رسم و رواج میں سے ایک عادت تھی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنگ کی حالت میں ان کی لڑکیاں دوسرے قبائل کی قیدی اور لونڈیاں بن جائیں، اور قبیلے کی نسل اور خون کی پاکیزگی ختم ہو جائے، اس جرم کی انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، اگرچہ یہ قتل ظلم کی انتہا ہے، اور عربوں کی جہالت کا واضح ثبوت ہے، بلکہ عورتوں پر عربوں کے مظالم صرف اس فعل تک محدود نہیں تھے، بلکہ مرد بیوہ عورتوں سے نکاح کرتے تھے تاکہ ان کی جائیداد اور اولاد کو قبضے میں لے لیں، پھر ان عورتوں کو چھوڑ دیتے تھے، (سورہ نساء آیت: ۱۹)

عرب کی جہالت کی ایک اور علامت یہ تھی کہ ان کے درمیان اختلافات کو مذاکرات اور سمجھوتہ کے ذریعے حل نہیں کیا جاتا تھا، وہ مسلسل جنگ و جدال کے ذریعے اپنی رائے دوسروں پر مسلط کرتے تھے، اسی لیے ان کی دشمنی کبھی ختم نہیں ہوتی تھی، بلکہ اوس اور خزرج کے دو مشہور قبیلے مدینہ میں کئی سالوں سے ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے (یعقوبی: ج ۱، ۳۹۵) اسلام کا ظہور اور نبی ﷺ کی مدینہ کی طرف ہجرت ان کے درمیان سو سال سے زائد جاہلانہ جنگوں کے خاتمے کا سبب بنی۔

نبی ﷺ کی جوانی میں ہی خانہ کعبہ سیلاب کی وجہ سے خراب ہو گیا، اور پھر دوبارہ تعمیر کیا گیا، اس وقت قریش کے سردار اور رہنما اس بات پر کسی معاہدے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ حجر اسود کو اس کے اصل مقام پر کونسا قبیلہ نصب کرے گا، اس لیے سب نے خون کے آخری قطرے تک لڑنے کی قسم کھائی، کہ اپنے قبیلے کی عزت کا دفاع کریں۔

ان رویوں کی شدت اور تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ بعض روایات جو عربوں نے نسل در نسل قائم رکھی تھیں اور ان کا احترام کرتے تھے، بعض اوقات ان کی خلاف ورزی ہوتی تھی، مثلاً جنگ اور لوٹ مار سال کے

چار مہینوں میں حرام تھی، بعض اوقات عرب جنگ شروع کرنے کے لیے ان چار ماہ کی تاخیر کرتے تھے، تاکہ وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکیں، اس عمل کو نسیئی کہتے تھے، جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، (طبری: ۸۳۸)

مہذب لوگوں کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی ادارہ یا رسم ان کے طرز زندگی میں ظاہر ہو جائے جو ان کے رابطوں میں آسانی پیدا کرے، یا ان کی ثقافت حاصل کرنے کا سبب بنے، تو ایسے ادارہ کی نہ صرف حفاظت کریں گے، بلکہ اس کی تعمیر و ترقی بھی بھرپور کریں گے، قصی ابن کلاب نے جب خانہ کعبہ کی ذمہ داری سنبھالی تو اس کے اقدامات میں سے ایک یہ تھا جو قبیلہ قریش کو شان و شوکت میں لایا، کہ قریش کے لیے دارلندوہ بنایا، تاکہ جب بھی قریش کو کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو تو دارلندوہ میں جمع ہو جائیں، اور مشورہ و بحث مباحثہ کر کے فیصلہ کریں، دارلندوہ قریش کے لیے مجلس شوری کی حیثیت رکھتا تھا، جس کے قیام سے قصی نے قریش کے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور تعاون کے کردار کو فروغ دینے کا ارادہ کیا تھا، اور مختلف گروہ اس کے ذریعے اپنے اختلافات کو بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کے ذریعے حل کریں۔

قریش قبائل میں نہ صرف تعاون اور اتحاد کا جذبہ نہیں تھا، بلکہ ان کے اندرونی اختلافات بھی ختم نہیں ہوتے تھے، قصی کی اولاد کے درمیان اختلافات اس وقت شدت اختیار کر گئے جب انہیں خانہ کعبہ کی سیادت ملی، اور بنی عبدالدار اور بنی عبد مناف نے اپنے حق حاصل کرنے کے لیے آخری بندے تک لڑنے کی قسم کھائی، جب امیہ نے اپنے چچا ہاشم سے مخالفت اور مقابلہ کرنا شروع کیا تو اختلاف بحث و مباحثہ سے بالکل بھی حل نہیں ہوا، اور دارلندوہ ان کے اختلافات رفع کرنے کا ذریعہ نہ بن سکا، جس وقت قریش کے زعماء اور رؤساء مشاورت کے لیے دارلندوہ میں جمع ہوئے وہ وقت نبی ﷺ کی بعثت کا زمانہ تھا، اور وہ بھی اس لیے کہ نبی ﷺ کو ختم کرنے کے لیے ایک متحدہ موقف اپنائیں، بالآخر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ قریش کے ہر قبیلہ میں سے ایک نوجوان منتخب کیا جائے، اور یہ سب کے سب اکٹھے رات کو نبی کریم ﷺ کو ختم کرنے کے لیے شب خون ماریں، اور نبی ﷺ کو قتل کر دیں، اس صورت میں بنی ہاشم قریش کے تمام قبیلوں سے انتقام نہیں لے سکیں گے، اور ان کو مجبوراً ان تمام خون کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہوں گے، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہر سال جزیرہ نمائے عرب کے تمام حصوں سے عرب مکہ مکرمہ میں

کعبہ کی زیارت کے لیے جاتے تھے، زائرین کا استقبال اور ان کی فلاح و بہبود کعبہ کے ذمہ داریوں میں سے ایک تھی، قصی کے زمانے کے عہدوں میں سے رفادت، یعنی حاجیوں کو کھانا کھلانا اور سقایت، یعنی ان کے لیے پانی مہیا کرنا تھا۔

جب ہاشم خانہ کعبہ کا سربراہ بنا تو اس نے اپنی تمام دولت اسی راہ میں خرچ کر دی، اور قریش کو بھی اس خدمت کی مسلسل ترغیب دی، عبدالمطلب بھی خانہ کعبہ کے سربراہی میں پہنچ کر اس راستے پر چلے، اور ان کا دسترخوان اتنا وسیع تھا کہ پرندے اور مویشی بھی اس سے مستفید ہوتے تھے، مگر بعد کے قریش نے نہ صرف یہ خدمات فراہم نہیں کیں، بلکہ طواف کرنے والوں کے لیے خوراک اور لباس سمیت مشکل حالات پیدا کیے، یہ صورت حال ظہور اسلام تک جای رہی، دین اسلام کے ظہور کے بعد اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے پھیلاؤ اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، قریش کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ کی بڑھتی ہوئی پیشرفت کا مشاہدہ کیا اور اس دین کی طرف لوگوں کی توجہ خاص طور پر مکہ کی اہم شخصیات جن کا اثر و رسوخ تھا اس نئے توحید سے بھرپور دین کی طرف میلان کا مشاہدہ کیا، تو پیغمبر ﷺ کو پیشکش کی کہ اسلام اور ان کے انحرانی عقائد کے درمیان مماثلت کو دیکھتے ہوئے پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو کفار کے اجتماعی اور شرک آمیز مذہب کو قبول کرنا چاہیے، اگر پیغمبر ﷺ کفار کا دین قبول کرتے ہیں، تو وہ بھی دین اسلام قبول کر لیں گے یہی وہ وقت تھا جب سورہ کافرون نازل ہوئی اور اعلان کیا کہ قریش کے مشرکانہ عقائد اور اسلام کے توحید پر ستانہ عقائد میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے، اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ مسجد حرام تشریف لائے اور واضح طور پر اپنا موقف یوں بیان فرمایا: میں تمہارے دین کا کبھی پیرو نہیں تھا اور نہ کبھی اس کی پیروی کروں گا، جیسا کہ تم لوگوں نے کبھی بھی خالص توحید کی پیروی نہیں کی ہے، میرا دین میرے لیے ہے، اور تمہارا دین تمہارے لیے، ان دونوں میں کوئی مشترکات نہیں ہیں۔

اس سورت کے عمومی لہجے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سورت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی ایک تعداد کفار کے مقابلے میں اقلیت میں تھی، اور رسول اللہ ﷺ پر ان کی وجہ سے سخت تنگی اور دباؤ تھا، اس وجہ سے کفار چاہتے تھے کہ پیغمبر اسلام پر مزید دباؤ بڑھائیں، تاکہ اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جائیں، لیکن پیغمبر ﷺ ایک فیصلہ کن اور قطعی جواب کے ساتھ کفار کے

سامنے ٹٹ گئے اور کفار کو منہ توڑ اور اٹل جواب دیا، ایسا جواب جس نے کفار کے لیے کسی قسم کے سمجھوتے اور سودے بازی کا دروازہ کھلا نہیں رکھا، ایسا جواب جسے سن کر کافر مایوس گئے، پیغمبر ﷺ جنگ کی بات نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنی مزاحمت اور طاقت کو آسمانی نطق سے ان پر واضح کرتے تھے، اس سورت میں نبی ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کفار مکہ کے مذہب سے اپنے ناگواری کا کھلے عام اظہار کریں، اور انہیں بتادیں کہ تم لوگ بھی آپ ﷺ کے دین کو نہیں مانتے، لہذا نہ آپ ﷺ دین سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور نہ ان کے دین آپ ﷺ کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے، پس کفار کو نبی ﷺ کی سمجھوتہ سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہونا چاہیے۔

یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک مثال ہے کہ وہ دین اور اسلام کی بنیاد پر اپنے دشمنوں سے کبھی سمجھوتہ نہ کریں، اور جب بھی ان کی طرف سے ایسی خواہش کی جائے تو ان کو مکمل طور پر مایوس کر دیا جائے، خاص طور پر اس سورت میں دو مرتبہ اس معنی پر زور دیا گیا ہے، کہ: "میں تمہارے معبودوں کی پرستش نہیں کروں گا"، اس طرح دوسری بار تاکید ہوئی ہے کہ: "تم ہرگز میرے معبود خدائے واحد کی عبادت نہیں کرو گے" یہ ان کی ضد کا ثبوت ہے، تو نتیجتاً: "میرے لیے میرا دین توحید، تمہارے لیے تمہارا بوسیدہ اور شرک سے آلودہ دین۔"

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة الكافرون

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُونَ ۝ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُونَ مَا اَعْبُدُ ۝ وَلَا اَنَا عٰبِدُ مَا عٰبَدْتُمْ ۝ وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُونَ مَا اَعْبُدُهُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝

سورت کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُونَ ۝	کہدے اے کافرو!
لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝	میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو
وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُونَ مَا اَعْبُدُ ۝	اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں
وَلَا اَنَا عٰبِدُ مَا عٰبَدْتُمْ ۝	اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی
وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُونَ مَا اَعْبُدُهُ ۝	اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں
لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝	تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"يَٰٓأَيُّهَا": اے، جی ہاں، "الْكٰفِرُونَ" یقین نہ رکھنے والے، "لَا اَعْبُدُ" میں عبادت نہیں کرتا، "ما" جس کی "تَعْبُدُونَ" تم عبادت کرتے ہو، "عِبْدُونَ" عبادت کرنے والے، عبادت گزار، "ما" اس کی، بمعنی "ما" موصولہ "الذی" یا بمعنی "من"، خدا (شمس: ۵ اور ۶) "عَبَدْتُمْ" تم نے عبادت کی۔

توجہ: مکہ کے کافر رہنماؤں کے ایک گروہ سے خطاب ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، "لَا اَعْبُدُ مَا

"تَعْبُدُونَ" "لَا" جب فعل مضارع پر آتا ہے تو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے، یعنی: میں تمہارے ان بتوں کی کبھی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو، (اعراب القرآن درویش...) "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اے کافرو! ہمارے اور تمہارے معبود بھی الگ الگ ہیں، اور عبادت بھی مختلف ہے، (ملاحظہ کریں: یونس آیت: ۱۳) شعراء آیت: ۲۱۶

تفسیر:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُونَ ۝۱	کہدے اے کافرو!

"قل" کہدو، کس سے کہو؟ واضح ہے کہ کافروں سے کہدو، معلوم ہوتا ہے کافروں نے نبی ﷺ سے کچھ کہا ہے، کہ لفظ "قل" استعمال ہوا ہے، لیکن یاد رہے کہ قرآن مجید کے دوسرے مواقع میں جہاں لفظ "قل" آیا ہے یہ نہیں کہا جاسکتا، یعنی: کہ اس سے پہلے کوئی بات کہی گئی ہے، بلکہ قرآن کریم کی دوسری آیات کے مفہوم پر دھیان دینا چاہیے۔

لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝۲	میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو

رسول اللہ ﷺ خوبصورت انداز اور عزم جزم کے ساتھ ان کے جواب میں فرماتے ہیں: "میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو" ان بتوں کی ہرگز پرستش نہیں کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو، میں تمہارے خداؤں اور معبودوں سے بیزار ہوں، ایسے جھوٹے خدا جو عبادت کرنے والوں کو نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، اور نہ کسی مصیبت کو رفع کر سکتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ کے مفہوم میں وہ تمام معبود شامل ہیں جن کی کفار اور مشرکین نے عبادت کی ہے یا کرتے ہیں، خواہ وہ فرشتے ہوں، جن ہوں، انبیاء ہوں، اولیاء ہوں، زندہ یا مردہ انسانوں کی روحیں ہوں، سورج اور چاند ہوں، سیارے اور ستارے ہوں، جانور، درخت، سمندر، بت، خیالی معبودوں کے مجسمے ہوں، یا دوسرے معبود ہوں۔

اس آیت کے سیاق سباق سے واضح ہوتا ہے کہ کفار نے پیغمبرؐ کو دعوت دی تھی کہ: اے پیغمبر! ہمارے بتوں کی پرستش کرو، جس کی ہم پرستش کرتے ہیں، ان کی عبادت کرو، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا! اس دعوت کو رسول اللہ ﷺ نے

پورے عزم کے ساتھ رد کر دیا، اور آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو، واضح ہے کہ کفار کی درخواست کا رد کیا گیا ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ نہیں، میں تمہارے بتوں کی عبادت نہیں کرتا۔

آیت مبارکہ: "لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ" سے واضح ہوتا ہے کہ: اتحاد کے نام پر اصولوں اور اقدار سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں	وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُونَ ۝۳

تم اس کے بھی پرستار نہیں ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، یعنی تم اس سچے خدا کی عبادت نہیں کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں، جو واحد اور اکیلا ہے، میں سچے خدا یعنی رب العالمین کی عبادت کرتا ہوں اور تم پتھروں اور بتوں کی عبادت کرتے ہو، خدا نے رحمان کی عبادت اور خواہشات اور بتوں کی عبادت میں بہت فرق ہے۔

آیت کے مفہوم سے کفار کے دو پیشکشیں ظاہر ہوتی ہیں: (۱) نبی کریم ﷺ سے کہتے ہیں: اے پیغمبر! ہمارے بتوں کی عبادت کرو (۲) ہم بھی تمہارے خدا کی عبادت کریں گے۔

چنانچہ اس آیت کے مفہوم سے واضح ہوا کہ کفار نے کہا اگر تم ہمارے بتوں کی عبادت کرو تم ہم اس کے بدلے میں تمہارے خدا کی عبادت کریں گے یہ ایک سمجھوتہ والی تجویز تھی جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھی گئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ: وہ کہتے ہیں کہ آؤ ہم سب مشرک بن جائیں، ایک ہو جائیں۔

پہلا: کفار نے کہا: ہم دونوں، دونوں کی عبادت کریں گے، بتوں کی پوجا کریں گے اور خدا کی بھی۔

دوسرا: کفار نے کہا: اے پیغمبر! مثال کے طور پر ایک سال آپ انہیں ہمارے بتوں کی عبادت کریں اور اگلے سال ہم آکر آپ کے خدا کی عبادت کریں گے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا: پیغمبر اسلام نے کفار کے ان دونوں سمجھوتوں کو پوری قوت کے ساتھ رد کر دیا۔

وَلَا اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۝	اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی

یہ تاکید ہے کفار کی پچھلی کوشش برائت پر، اور کافروں کی امید کو ختم کردیتی ہے، اس لیے کہ آپؐ نے فرمایا: نہ ابھی، نہ مستقبل میں کبھی بھی میں ان بتوں کی پرستش نہیں کروں گا، جب تک زندہ ہوں ہر گز تمہارے بتوں کی عبادت نہیں کروں گا۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ! یہ تجاویز اس وقت نبی کریمؐ کو پیش کی گئیں، جب وہ اپنی طاقت سے کچھ کر نہیں سکے، پھر انہوں نے یہ تجاویز پیش کرنا شروع کیں سمجھوتہ کرنے کے لیے لیکن یہاں خوبصورت نکتہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ واضح طور پر فرماتے ہیں کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، "لَا اَعْبُدُ" یعنی: نہ ابھی نہ آئندہ، میں کبھی بھی ان کی عبادت نہیں کروں گا، غور کریں لفظ مضارع کا استعمال ہوا ہے کہ نہ ابھی، نہ مستقبل میں تمہارے بتوں کی پوجا کروں گا۔

مکمل طور پر مسترد جواب نے بحث و مباحثہ اور سمجھوتہ کی ہر صورت کو پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ ختم کردیا، رسول اللہؐ کو یہی کہنا چاہیے تھا، کہ میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور تم عبادت نہیں کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، پیغمبرؐ نے یہ نہیں کہا: "مَا تَعْبُدُونَ" بلکہ کہا:

وَلَا اَنْتُمْ عِبَادُونَ مَّا اَعْبُدُہ ۝	اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں

یعنی: تم مستقبل میں بھی میرے خدا کی عبادت نہیں کرو گے۔

دیکھیں: "عبادت کرنے والے" کا تعلق کس سے ہے؟ اس کا تعلق حال سے ہے، "عبادت نہیں کروں گا" کا تعلق کس سے ہے؟ حال اور مستقبل دونوں سے ہے، کیا مضبوط اور خوبصورت بیان ہے۔

پیغمبرؐ فرماتے ہیں: میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، میں مضبوط اصولوں کی بنیاد پر یہ بات کہتا ہوں، اس لیے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، لیکن تمہاری عبادت نہ کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، ابھی تم عبادت نہیں کرتے ہو لیکن آنے والے وقت میں اپنے دین کی بے بنیادیت کا احساس ہو سکتا ہے، (یہ اظہار بیان کی ایک پختہ قسم ہے)

میں "اصلاً" اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، لیکن تم "فعلاً" ابھی عبادت نہیں کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ اس بحث و مباحثہ میں کافروں کے لیے ایمان لانے کا دروازہ بند نہیں کرتے، کفار کے لیے اسلام کی طرف واپسی کے راستے کھلے چھوڑ دیتے ہیں، لیکن بتوں کی پوجا کی طرف اپنا راستہ مکمل طور پر بند کر دیتے ہیں، اور اپنی پوری قوت سے اعلان کرتے ہیں کہ: میرے لیے بت پرستی گرنا ممکن نہیں ہے، لیکن تم پر واپسی کا دروازہ بند نہیں ہے، ابھی "فعلاً" جس کی میں عبادت کرتا ہوں تم نہیں کرتے ہو۔

کفار کو قرآن عظیم کے لطیف بیان پر توجہ دی جانی چاہیے جو کہتا ہے:

1 - جس کی تم عبادت کر رہے ہو اس کی بنیاد کمزور ہے، بے بنیاد اور غیر منطقی ہے، تم اپنے آپ میں تبدیلی لا سکتے ہو، لیکن میں جس کی عبادت کرتا ہوں، وہ ایک مضبوط بنیاد پر مبنی ہے، جو ناقابل تغیر ہے، جسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا - "وَلَا آتَا عَابِدٌ مَّا عَبَدُتُمْ" میں اس کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔

2 - تم ماضی میں بھی بہت ساری چیزوں کی پوجا کرتے تھے، لیکن میں تمہارے ماضی کو بھی نہیں مانتا، ماضی میں بھی میں تم سے نہیں تھا، اور نہ ہی بت پرست تھا۔

اس آیت کے لطیف مفہوم سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ پیدائش سے توحید پرست تھے، یہ نہیں کہا کہ: میں اب سے نہیں ہوں، یعنی: پہلے بھی نہیں تھا، اب بھی نہیں ہوں، مکمل طور پر فرماتے ہیں "وَلَا آتَا عَابِدٌ مَّا عَبَدُتُمْ": "میں اس کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں جس کی تم پہلے عبادت کرتے تھے" میں تم لوگوں سے بالکل مختلف ہوں، اور بنیادی طور پر تم لوگوں سے کوئی وجہ مشترک نہیں ہے مجھ میں، نہ پہلے تھی اور نہ آئندہ کی، تمہاری نظریاتی بنیاد کمزور ہے، جس کی کوئی اصل نہیں ہے، تمہارے پاس تمہاری دعوت کی کوئی بنیاد اور اصل نہیں ہے، تمہاری دعوت کی جڑیں کھوکھلی اور غیر منطقی اور ناقابل قبول ہیں۔

محترم قارئین:

اگر پوچھا جائے کہ شرک اور اسلام کی سرحد کیا ہے؟ واحد منطقی جواب جو موجود ہے اور ہم پوری قوت سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اور کفر کے

درمیان سرحد "عبادت" ہے، یہاں تک کہ کفار نے بھی کفر اور اسلام کے درمیان سرحد "عبادت" سمجھا، یعنی خدا پرستی اور غیر خدا پرستی میں، اس لیے ان کے سمجھوتے کی تجویز کے اصول کو اس کے مطابق فارمولے بنائے، جو لوگ خدا کی عبادت کرتے ہیں وہ مشرک نہیں ہوتے، لیکن جب غیر اللہ کی عبادت کی جائے تو مذکورہ شخص مشرک ہوگا، مشرکین کی دعوت کی بحث بھی عبادت تھی، کہ ہم تیرے خدا کی عبادت کریں گے، تو آپ ﷺ اور ہمارے خدا کی عبادت کرو۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝۱	تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین

لیکن رسول اللہ ﷺ نے جواب پوری وضاحت کے ساتھ دیا، اور آپ ﷺ نے سختی سے فرمایا کہ ہم اپنے دین کی بنیادی باتوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، تم اپنا شرک رکھو، میں اپنے توحید کے ساتھ رہوں گا، میرا دین الگ ہے تمہارا دین الگ ہے، میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرنے والا نہیں ہوں اور تم میرے معبود کی پرستش کرنے والے نہیں ہو، میں تمہارے معبودوں کی عبادت کر ہی نہیں سکتا، اور نہ تم اس بات پر آمادہ ہو کہ میرے خدا کی عبادت کرو، اس لحاظ سے میرا اور تمہارا راستہ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتا، آیت مبارکہ کفار کی عبادت سے بیزاری کی انتہاء کا اظہار کرتی ہے، اور صرف اللہ کی عبادت کی تاکید کرتی ہے۔

مفسرین نے کہا ہے کہ: پہلے دو جملوں سے مراد یہ ہے کہ ہمارے اور تمہارے معبود کے مفہوم میں مکمل اختلاف ہے، کیونکہ مشرکین کے معبود سے مراد بت ہے، اور محمد ﷺ کے معبود سے مراد خدائے رحمان ہے، نہ ہمارا معبود ایک ہے اور نہ ہماری عبادت۔

ایک اصول کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ دین میں سودے بازی نہ کرو، دشمن کے ساتھ کوئی سازش اور سمجھوتہ نہ کرو، اور غلط تجاویز کے تکرار کے خلاف اپنے موقف کا اعادہ کرو، واضح رہے کہ قرآن کریم میں بعض مواقع پر تکرار تاکید کے لیے ہے، جیسے: "كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝۱" ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝۲" (تکاثر: ۳، ۴) "فَقَتِلَ كَيْفَ قَدَرًا ۝۱ ثُمَّ قَتِلَ كَيْفَ قَدَرًا ۝۲" (مدثر: ۱۹، ۲۰)

تو اس سورت مبارکہ میں بھی تکرار تاکید کے لیے ہوسکتی ہے، تاکہ مشرکین مسلمانوں کے سر تسلیم خم کرنے سے مایوس ہو جائیں، اور یہ مؤمنین کے لیے استقامت کی تلقین کے لیے ہو، تاکہ اپنے مؤقف پر ثابت قدم رہیں۔

نیز اس آیت مبارکہ میں امت مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے کہ دین کے اصولوں میں کسی قسم کے سمجھوتہ کی گنجائش نہیں ہے، عبادت ہمارے دین کا بنیادی حصہ ہے، یہ ہمارے دین کی سرحد ہے، میرا دین کیا ہے؟ توحید، تمہارا دین کیا ہے؟ شرک، توحید اور شرک جمع نہیں ہوسکتے، اگر میں تمہارے بتوں کی عبادت کروں تو مشرک ہو جاؤں گا، اپنے دین پر قائم نہیں رہ سکوں گا، اگر تم لوگ اپنے بتوں کے ساتھ ساتھ میرے خدا کی عبادت کرو گے تو پھر بھی مشرک ہی رہو گے، اگر اپنے بتوں کو چھوڑ کر میرے رب کی عبادت کرو گے تو موحد بن جاؤ گے، پھر یا تو موحد ہونا چاہیے یا مشرک، دونوں بیک وقت نہیں ہوسکتے، میری اور تمہاری عبادت میں تطبیق پیدا کرنا نا ممکنات میں سے ہے۔

یہ ایک اعتقادی بحث ہے، اور ہمارے لیے ایک اعلان ہے اس مخصوص مرحلے اور مسلمانوں کے لیے رسالت کے انکشاف کے مواقع پر: کہ تمہیں دین کے اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، خدا کی عبادت توحید کا اصول ہے ہمیں اس پر سمجھوتہ کرنے کا اختیار نہیں ہے، نبی ﷺ نے اعلان کیا کہ سمجھوتہ کرنا ممکن نہیں "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ"۔

عقیدہ کی بنیادی باتوں اور اصولوں میں سمجھوتہ کی کوئی جگہ نہیں ہے

اس سورہ میں عقیدہ کے بنیادی اور اصولوں میں عدم سمجھوتہ کا اعلان اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم توحید کی بنیادی باتوں اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتے، فروعی مسائل میں درگزر کرسکتے ہیں، اگر کسی حالت میں ایسی شرائط ہوں جس میں مفادات کا تقاضا ہو کہ ہم نرمی اختیار کریں، لیکن حق کے اصولوں سے پیچھے ہٹنے کا اختیار نہیں رکھتے۔

پیغمبر اسلام کی طرف سے بتوں کی عبادت کی نفی کی تکرار کیوں ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے بت پرستی کی نفی کو کیوں دہرایا، اس بارے میں س بعض مفسرین کا خیال ہے کہ: یہ تکرار مشرکین کی مکمل مایوسی پر زور دینے اور ان کے راستے کو اسلام سے الگ ثابت کرنے کے لیے ہے،

توحید اور شرک کے درمیان سمجھوتہ نہ ہونے کا اثبات ہے، دوسرے لفظوں میں وہ لوگ حضور ﷺ کو شرک کی طرف دعوت دینے پر اصرار کرتے تھے، اور دہراتے تھے، قرآن عظیم نے بھی ان کے رد کو دہرایا۔

ایمان اور کفر کی اصطلاح

جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایمان اور کفر دو متضاد عقائد ہیں ان کے بارے میں جاننا انتہائی اہم اور ضروری ہے، ایمان کی تعریف میں علماء فرماتے ہیں: ایمان سے مراد اللہ رب العزت کا دین ہے، وہی دین جو اللہ رب العزت نے اپنے بندوں پر نازل کیا، اور اسی کے لیے مخلوق کو پیدا کیا اور دینداروں کو دنیا میں ہدایت دی اور آخرت میں ان کو سکون اور سلامتی عطا فرمائی، جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُونَ" (سورہ انعام آیت: ۸۴)

ترجمہ: "وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا ۖ يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" ترجمہ: "اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انہیں اندھروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے"

علماء کا مزید کہنا ہے کہ! اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنی رضامندی کے ساتھ قبول کرنا، اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ایمان ہے، درحقیقت ایمان: زبان سے کہنا، دل سے ایمان لانا اور اعضاء سے عمل کرنا ہے جو اطاعت سے بڑھتا ہے، اور گناہ سے گھٹتا ہے، پس وہ شخص وہ شرک سے چھوٹے گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے اس سے ایمان کا نام سلب نہیں ہوتا، اور دوسری طرف اس کو کامل مؤمن بھی نہیں کہا جاتا، بلکہ وہ مؤمن ہے لیکن ناقص الایمان۔

اسی طرح ایمان کی تعریف میں مزید اضافہ کرتے ہیں کہ: ایمان اسلام کا نظریاتی پہلو ہے، جس کا آغاز سوچ اور استدلال سے ہوتا ہے، دل کے ساتھ یقین اور زبان کے ساتھ اس کا اظہار اور عمل میں جاری ہوتا ہے، قرآن کریم ایمان کی تعریف میں کہتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ

وَالْكِتَابِ الَّذِي آتَيْنَا مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝۱۳۱

ترجمہ: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور ان کتابوں پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کیں، اور جو شخص اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت (کے ساتھ) کفر کرے تو یقیناً وہ گمراہ ہوا، بہت دور گمراہ ہونا۔"

ایمان کی تعریف میں بعض اہل علم کہتے ہیں کہ: ایمان انسان کی روحانی چیزوں سے آخری لگاؤ ہے جو اس کے لیے مقدس ہیں اور اس کے لیے محبت اور ہمت دکھانے کے لیے تیار ہیں۔

قرآن کریم کے دو بازو ہیں: علم اور عمل، خالی علم ہو تو اس کو کفر کے ساتھ جمع کیا جاسکتا ہے، اور صرف عمل ہو تو یہ نفاق کے ساتھ منسلک ہوسکتا ہے، مسلمان دانشوروں کے درمیان ایمان کی حقیقت کے بارے میں تین نظریات ہیں:

- 1 - "اشاعرہ" کے نزدیک ایمان: خدا کے وجود، اور اس کے پیغمبروں اور نواہی کی تصدیق ہے۔
- 2 - "معتزلہ" کے نقطہ نظر سے ایمان کا مطلب ہے ان فرائض اور ذمہ داریوں پر عمل کرنا جس کا خدا نے ہمیں حکم دیا ہے۔
- 3 - ایمان: دنیا کی حقیقتوں کے بارے میں علم اور معرفت، اور اس طرح سے روح کا کمال ہے، لیکن عرفا کے ایمان کا مطلب ہے خدا کی طرف رجوع کرنا اور خدا کے علاوہ ہر چیز سے منہ موڑنا۔

کفر:

کفر سے مرا دین اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرنا، یا دین اسلام کو چھوڑنا، اور خدا تعالیٰ کے دین کے علاوہ کسی دوسرے دین کو اختیار کرنا ہے، خواہ وہ تکبر یا ضد سے ہو یا گزرے ہوئے آباد و اجداد کے ساتھ تمسک کی بناء پر، یا مال و دولت، مقام و مرتبہ کی لالچ کی وجہ سے، الکفر: لغت میں کسی چیز کو چھپانا یا مخفی رکھنا ہے، اور شریعت کی اصطلاح میں کفر سے مراد: "ضد اور رسول پر ایمان نہ لانا، قطع نظر اس کے کہ یہ عدم ایمان تکذیب کے ساتھ ہو، یا شکوک و شبہات کے ساتھ، یا

حسد اور تکبر کی وجہ سے اس سے منہ موڑنا ہو، یا خواہشات کی پیروی کی وجہ سے ہو جو رسالت کی پیروی میں رکاوٹ ہو، تو کفر اس شخص کی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کردہ چیزوں میں سے جو اس تک پہنچادی گئی ہیں ان کا انکار کرے، اس سے قطع نظر کہ یہ انکار دل سے ہو، نہ کہ زبان سے، یا زبان سے ہو دل سے نہیں، یا دونوں سے ہو، یا کوئی ایسا نص صریح موجود ہو کہ اس کام کو کرنے والا اسلام سے خارج ہوتا ہے (ملاحظہ فرمائیں: مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ: ۱۲/۳۳۵ اور الاحکام فی اصول الاحکام ابن حزم: ۱/۴۵)۔

ابن حزم نے "کتاب الفصل" میں کہا ہے: کسی ایسی چیز کا انکار کرنا (جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اور) اس کے تصدیق کے بغیر ایمان حاصل نہ ہو تو کفر ہے، اور ہر اس چیز کا تلفظ کرنا جو دلیل سے اس کا تلفظ کفر ہو تو وہ کفر ہے، اور ہر اس عمل کا انجام دینا جس کے کفر پر دلیل موجود ہو تو وہ کفر ہے۔

اور آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کفر:

یعنی: شیطان کا دین جو دنیا میں گمراہی اور آخرت میں انسان کے لیے عذاب کا باعث ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کے بارے میں فرمایا جنہوں نے ہدایت الہی کو قبول نہیں کیا اور اس سے منہ موڑ لیا:

"وَالَّذِينَ كَفَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ" ترجمہ: "اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے دوست باطل معبود ہیں، وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لاتے ہیں، یہ لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

جزیرۃ العرب میں بت پرستی کے اسباب

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں بت پرستی کے اثر اور ظہور کے تین بنیادی عوامل تھے:

پہلا: ایک شخص عمرو ابن لحيی کے نام سے خزاعہ قبیلے کا سربراہ جو اپنے زمانے میں مکہ میں زیادہ طاقت اور اثر و رسوخ والا تھا، اور کعبہ کا بھی متولی تھا، وہ شام کی طرف سفر کرتا ہے، وہاں عمالقہ کے ایک گروہ کو بتوں کی پرستش کرتے ہوئے دیکھتا ہے، جب ان لوگوں سے اس عبادت کی وجہ پوچھتا ہے تو وہ کہتے ہیں: یہ بت ہمارے لیے بارش

برساتے ہیں، اور ہماری مدد کرتے ہیں، عمرو بن لحيیٰ ان سے کہتا ہے کہ اسے بھی ایک بت دیں، چنانچہ انہوں نے اسے ایک بت "ہبل" کے نام سے دے دیا، تو اس نے اس بت کو کعبہ میں لا کر نصب کیا اور لوگوں کو اس کی عبادت کی طرف دعوت دے دی، اس کے علاوہ دو اور بت، "اساف" اور نائلہ" بھی کعبہ کے پاس رکھے اور لوگوں کو ان کی عبادت پر آمادہ کیا۔

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: عمرو بن لحيیٰ وہ پہلا شخص تھا جس نے اسماعیل کے دین کو تبدیل کیا، اور بت پرستی کی بنیاد رکھی، اور میں نے اس کو آگ میں دیکھا۔

دوسرا: جب مکہ میں اسماعیل کی اولاد میں اضافہ ہوا تو لامحالہ اپنی زندگی کی حالت بہتر بنانے کے لیے دوسرے شہروں اور علاقوں میں گئے، خانہ کعبہ میں دلچسپی کے بنا پر ان میں سے ہر ایک مکہ کی تعظیم کی خاطر حرم سے ایک پتھر اپنے ساتھ لے گیا، اور جہاں بھی اترے، وہ پتھر بھی کسی جگہ رکھ دیا، اور کعبہ کی طرح اس کے گرد طواف کرنا شروع کیا، تو آہستہ آہستہ اس کام کا اصل محرک فراموش ہو گیا، اور ان میں سے ہر ایک پتھر بت میں تبدیل ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرستی عربوں میں رائج ہو گئی۔

تیسرا: بادیہ نشین لوگ کچھ چیزوں کو اچھا سمجھتے تھے، اسی وجہ سے وہ ان کی عبادت کرتے تھے، یا ان کے لیے ان کے سادہ تصور کی بنیاد پر نمونہ بناتے تھے، اور پھر یہی بتوں کے وجود میں آنے کا سبب بن گئی۔

ملاحظہ:

بہر حال مذکورہ عوامل بت پرستی کے اثرات کی ابتداء تھے، لیکن اس کی نشوونما اور بقاء کا سبب صرف ان صورتوں تک محدود نہیں ہوسکتا، مثلاً عربوں کی جہالت، اور جاہ طلبی نے بت پرستی کے پھیلاؤ اور بقاء میں بہت بڑا اثر ڈالا، ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ اس کا اپنا ایک خاص بت ہو، قبائل کے شیوخ اور سرداروں کی قدرت طلبی انہیں دوسرے قبائل کی پیروی کرنے نہیں دیتی تھی، اور اندھی تقلید ایک عنصر تھا جس کی وجہ سے عربوں میں بت پرستی کی نمایاں توسیع ہوئی، رفتہ رفتہ یہ امور اتنے مؤثر ہوتے گئے کہ کچھ عرصے کے بعد ہر گھر میں برکت کے لیے ایک بت موجود تھا، یہاں تک فتح مکہ کے وقت ان بتوں کی تعداد ۳۱۰ تک پہنچ گئی تھی، البتہ یہ بتانا ضروری ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے منکر نہیں تھے،

اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو زمین اور آسمان کا خالق سمجھتے تھے، جیسا کہ سورہ لقمان آیت: ۲۵، سورہ زمر آیت: ۳۸ اور سورہ زخرف آیت: ۹ میں (اس مضمون کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

بتوں کی تنوع کی وجہ

بتوں کی تنوع کی وجہ بیان کرتے ہوئے علماء نے اپنے تجربات کی بنیاد پر مختلف وجوہات لکھی ہیں، ان میں دو وجوہات یہ ہیں:

- 1- عربوں کا احساس برتری: یہ احساس باعث بنا کہ ہر قبیلہ اپنے لیے ایک خاص بت کا انتخاب کرے، اور دوسرے بتوں کی عبادت سے پرہیز کرے، چنانچہ بت پرستی کے بڑھنے سے بتوں کی تعداد بڑھتی گئی۔
- 2- ہر ایک بت ایک خاص معبود تھا، جس کی کسی خاص موقع پر پوجا کی جاتی تھی، مثال کے طور پر: "منات" زندگی، موت اور تقدیر کا معبود تھا، لہذا جن مسائل کی کثرت کا انہیں سامنا تھا، اس کی وجہ سے وہ مختلف بتوں کو ماننے لگے، اور ہر معاملے کے لیے ایک خاص بت کو مد نظر رکھیں۔

نتیجہ خیز اسباق کا خلاصہ

- 1- قضاء اور قدر کے عقیدے کی تصدیق اور تاکید، اور یہ کہ خدا جانتا ہے کہ کافر ازل سے ہی کافر تھا، اور مؤمن ازل سے ہی مؤمن تھا۔
- 2- اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی عصمت کا نگہبان تھا، مشرکین کے اس باطل پیشکش کو قبول کرنے میں۔
- 3- اہل ایمان اور اہل کفر و شرک کے درمیان عظیم فاصلوں کی موجودگی پر تاکید۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسوله النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة النصر

یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی اس کی تین " ۳ " آیات ہیں

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کا نام "نصر" اس لیے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ" اور اس سے مراد فتح مکہ ہے، یعنی وہ عظیم فتح جو فتح المفتوح کہلائی، بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ: اس سے مراد فتح مکہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عمومی فتح ہے جو اسلام کے مقدس دین کی ہے۔

اس سورت کے دیگر نام:

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ: اس سورت کو "تودیع" بھی کہا جاتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ: رسول اللہ ﷺ اس کے نزول کے بعد صرف ستر دن تک حیات رہے، اور ۱۰ ہجری ربیع الاول کے مہینے میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں: یہ نزول کے لحاظ قرآن کریم کی آخری سورہ ہے، ابن عمرؓ کہتے ہیں: یہ سورت رسول اللہ ﷺ پر ایام تشریق کے وسط میں نازل ہوئی، اس لیے آپؐ کو معلوم ہوا کہ پیغام الوداع ہے، اس وقت آپؐ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہوئے اور اپنا مشہور خطبہ دیا، جو حجتہ الوداع کا خطبہ ہے، اس سورت کی فضیلت کے بارے حدیث میں ہے کہ: "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ قُرْآنُ الْوَعْدِ فَكُنْ مِنَ الْوَارِثِينَ"۔

سورة النصر کے نزول کا وقت

سورة النصر کے نزول کے وقت کے بارے میں مفسرین نے مختلف روایات لکھی ہیں: جو ذیل میں مختصراً لکھی جاتی ہیں:

الف: فتح مکہ آٹھویں سال رمضان المبارک کے مہینے میں ہوئی، بعض کہتے ہیں: یہ سورہ ہجری کے دسویں سال میں نازل ہوئی، کہا جاتا ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد حضور اکرم ﷺ ستر دن اس دنیا میں رہے،

اور ماہ ربیع الاول ۱۰ ہجری کو رحلت فرما گئے، اسی لیے اس سورت کو سورہ "تودیع" کہا جاتا ہے۔

ب: بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ: یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی، جس کا خدا نے نبی ﷺ سے وعدہ کیا تھا، جیسا کہ سورۃ القصص میں ہے! "إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدُكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۖ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ مَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝۸۵" (سورہ قصص آیت: ۸۵)

ترجمہ: "بے شک جس نے تجھ پر یہ قرآن فرض کیا ہے وہ ضرور تجھے ایک عظیم الشان لوٹنے کی جگہ کی طرف واپس لانے والا ہے۔" اس سورت میں اس کے علاوہ خدا تعالیٰ پیغمبر اسلام کو فتح مکہ کی بشارت دیتا ہے، خوشخبری یہ بھی دیتا ہے کہ رب اس فتح میں پیغمبر اسلام کی مدد کرے گا، اور لوگ گروہ گروہ جوق درجوق دین اسلام میں داخل ہوں گے، تاکہ ان میں سے بہت سارے اس کے مددگار بن جائیں، جب کہ اس سے پہلے وہ رسول اللہ ﷺ کے سخت دشمن تھے۔ مفسرین اپنی تشریحات میں لکھتے ہیں کہ: فتح کی اطلاع دینا اس کے وقوع سے پہلے دراصل یہ نبوت کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے، امام فخر رازیؒ اس قول کو زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ: یہ سورہ منیٰ حجۃ الوداع میں نازل ہوئی، پھر آیت:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (مائدہ: ۳) نازل ہوئی، اس آیت

کے بعد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں اسی (۸۰) دن رہے، پھر سورہ نساء کی آیت کلا لہ نازل ہوئی، (۱۲ و ۱۷۶) اور آپ ﷺ کی عمر کے پچاس (۵۰) دن باقی تھے، پھر آیت: "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ (توبہ: ۱۲۸ اور ۱۲۹)

نازل ہوئی، اور حضور ﷺ مزید پینتیس دن زندہ رہے، پھر آیت: "وَاتَّقُوا يَوْمًا

تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ (سورہ بقرہ: ۲۸۱) نازل ہوئی کہ اکیس (۲۱) دن آپ ﷺ

کی رحلت میں باقی رہ گئے تھے، حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ: جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ میری وفات قریب ہے، اور میرا مقررہ وقت آچکا ہے (مسند احمد، ابن جزیر، ابن المنذر، ابن مردویہ) دوسری روایتوں میں جو ابن عباسؓ سے منقول ہیں، یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس سورت کے نزول سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کو اطلاع ملی ہے کہ آپ کی وفات کا وقت قریب ہو گیا ہے (مسند احمد، ابن حریر، طبرانی، نسائی، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ)۔

ام المؤمنین ام حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ: جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ میں اس سال اس دار فانی کو الوداع کہوں گا، یہ سن کر فاطمہؓ رونے لگیں، اس کے بعد آپ ﷺ فرمانے لگے: تم میرے خاندان میں پہلا فرد ہو جو مجھ سے ملو گی، یہ سن کر وہ ہنس پڑی، (ابن ابی حاتم، ابن مردویہ) بیہقی نے ابن عباسؓ سے تقریباً اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ بخاری وغیرہ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے بزرگ صحابہ کے ساتھ اپنی مجلس میں بلایا، جو جنگ بدر میں شریک تھے، ان کی مجلس میں بلا کر بٹھا دیتے تھے، بعض بزرگوں کے لیے یہ عمل خوش آئند نہیں تھا، اس لیے انہوں نے احتجاج کیا اور کہا کہ ہمارے بھی اس کے عمر کے بچے ہیں، تو ہماری مجلس میں صرف اس کی اجازت کیوں دے رہے ہیں، (امام بخاریؒ اور ابن جریرؒ نے بیان کیا ہے کہ جس شخص نے یہ کہا وہ عبدالرحمن بن عوفؓ تھے، عمرؓ نے جواب دیا کہ آپ علم کے لحاظ سے اس کے مقام سے خوب واقف ہیں، پھر ایک دن انہوں نے بدر کے شیوخ کو بلا یا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لائے، میں نے محسوس کیا کہ اس دن مجھے بلانے کی وجہ یہ ہے کہ عمرؓ انہیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ وہ مجھے مجلس اور اجتماع میں جانے کی اجازت کیوں دیتے تھے، جہاں وہ خود موجود ہوتے تھے، گفتگو کے دوران حضرت عمرؓ نے بدر کے بزرگوں سے پوچھا کہ "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ

وَالْفَتْحُ" کے بارے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کچھ نے کہا: اس سورت میں ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ جب خدا کی مدد آئے اور فتح نصیب ہو تو پاکیزگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں، اور اس سے استغفار کریں، بعض نے کہا: اس سے مراد شہروں اور قلعوں کی فتح ہے، اور کچھ خاموش تھے، اس کے بعد عمرؓ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: کیا ابن عباسؓ کی رائے تمہاری طرح ہے؟ میں نے کہا: نہیں، انہوں نے پوچھا آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری سمجھ یہ ہے کہ اس سے مراد آپ کی وفات ہے۔

درحقیقت اس سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ جب اللہ کی مدد آئے گی تو فتح و نصرت ملی گی، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی رسالت کی مدت پوری ہو چکی ہے، اور اس کے بعد آپ اللہ کو پاکیزگی کے ساتھ یاد کریں، اور اس سے استغفار کریں، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: میری رائے بھی یہی ہے، ایک اور روایت میں اضافہ ہے کہ عمرؓ نے پھر بزرگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ تم مجھ پر کیسے الزام لگا سکتے ہو، جب کہ تم نے خود اس

نوجوان کو اس مجلس میں لانے کی وجہ دیکھ لی ، (بخاری ، مسند احمد، ترمذی ، ابن جریر ، ابن مردویہ، بغوی ، بیہقی وا بن المنذر)۔

دوسری حدیث جو ابن عباسؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: جب سورہ نصر نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " اس کے نزول کے ساتھ مجھے میری وفات کی خبر دی گئی ہے " ، صحابہ کرامؓ بھی اس معنی پر متفق ہیں، اور انہوں نے اس مفہوم کو اس بات سے سمجھا کہ اس میں تسبیح اور استغفار کرنے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ دعوت پہنچانے کا کام مکمل ہو چکا ہے ، یہ بذات خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ پیغمبر حق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخت سفر باندھیں ، روایت ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "إن عبدا

خیرہ اللہ بین الدنیا و بین لقاءہ و الآخرۃ فاختر لقاء اللہ" ترجمہ : بے شک اللہ نے بندے کو دنیا، آخرت اور اپنی ملاقات میں اختیار دیا، پھر اس نے اللہ سے ملاقات کا انتخاب کیا"۔

محترم قارئین :

اللہ نے اپنے نبی کو جس چیز کی بشارت دی تھی وہ پوری ہوئی، لیکن جو حکم اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے بعد اپنے نبی کو دیا وہ یہ ہے کہ نبیؐ اس چیز پر اس کا شکر ادا کریں ، اور خدا کو پاکیزگی کے ساتھ یاد کریں ، اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں، دین کی فتح ہوگی، اور اس کی کامیابی میں اضافہ ہوگا، کیونکہ شکر ادا کرنا، تعریف کرنا اور استغفار کرنا کامیابی میں اضافہ کا ذریعہ ہیں، شکر ادا کرنے کی مثال، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: " لَیْسَ شَکْرُکُمْ لَآ زَیْدًا لَّکُمْ " (سورہ ابراہیم : ۷) ترجمہ: "اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دونگا"۔

بے شک اسلام کی عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں، اور خلفاء راشدین کے دور میں اور اس کے بعد ایسی عظمت اور فتح پہنچی کہ ادیان آسمانی میں سے کوئی بھی اس تک نہیں پہنچا، اور لوگ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ دوسرے ادیان سے اتنے متاثر نہیں ہوئے۔ انسان کو اپنی فتح پر شکر گزار ہونا چاہیئے، فتح کے بعد اکثر لوگ فخر اور تکبر کا شکار ہوتے ہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ فتح ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا نتیجہ ہے، دوسروں سے خود کو برتر محسوس کرتے ہیں ، اور مراعات لینا چاہتے ہیں ۔

دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں ان میں غرور اور خود پسندی نظر آتی ہے، لیکن انسان کو ہمیشہ اللہ کی یاد میں مصروف رہنا چاہئیے، کسی فراموشی کے بغیر اس کے راستے پر چلے، بغیر کسی جرم کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے بغیر کسی بغاوت کے، یقیناً بہت کم لوگوں میں یہ صفات ہوتی ہیں۔

دوسرا نکتہ جو مفسرین اس سورت کی تفسیر میں لکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آ رہا ہے، اور چونکہ آپ کی زندگی بہت قیمتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے، اور اہم امور جیسے: نماز، حج وغیرہ کو استغفار کرنے پر معاف کر دیتا ہے، لہذا خدا کا اپنے نبی کو حمد و ثنا کرنے اور خدا تعالیٰ سے معافی مانگنے کا حکم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی زندگی کا وقت ختم ہو گیا ہے، چنانچہ رب سے ملنے کی تیاری رکھیں، اور اپنی زندگی کو بہترین چیزوں کے ساتھ اختتام تک پہنچائیں، سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ: اس سورت کے نزول کے بعد تمام جزیرۃ العرب اور دیگر غیر عرب قبائل مسلمان ہو گئے، انہوں نے اللہ کے دین کو دل سے قبول کیا، رب کی تسبیح و تقدیس اور حمد و ثنایا، اس کے دربار کی طرف رجوع کیا، اور جوش و خروش کے ساتھ اسلام کی آزادی کی خوشی کا خیر مقدم کیا، دین اسلام سے مراد وہ دین ہے جسے یہ آیات بیان کرتی ہیں (سورہ آل عمران: ۱۹ اور ۸۵) "دین اسلام کے علاوہ کسی سے کوئی دین قبول نہیں، اور جو ایسا کرے گا وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا" (تفہیم القرآن اور تفسیر فرقان)

سورة النصر کی آیات، الفاظ اور حروف

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے "سورة النصر" مدنی ہے، اس کا ایک (۱) رکوع، تین آیتیں، انیس (۱۹) الفاظ، بیاسی (۸۲) حروف اور چونتیس (۳۴) نقطے ہیں۔ (واضح رہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)۔ مفسرین کے اجماع کے مطابق یہ سورت مدنی سورتوں میں سے ہے۔

سورة النصر اور کافروں کے درمیان ربط و مناسبت

سورة الکافرون میں مذکور ہے کہ دین اسلام اور اسلام کے علاوہ دین ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، اور یہ کہ کفار کے دین اور مذہب کو ختم ہونا ہے، یہ سورت دین اسلام کی فتح و ظفر اور عوام الناس کے دین اسلام میں جوق در جوق داخل ہونے کی خبر دیتی ہے۔

سورة النصر کے نزول کے اسباب

عبدالرزاق نے "مصنف" میں عمر اور زہری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے وقت اس شہر میں داخل ہوئے، اور آپ ﷺ نے خالد بن ولید کو اس شہر کے نچلے علاقے کی طرف بھیجا، اور وہ معزز آدمی (خالد) کا اپنی فوجوں کے ساتھ اس علاقے میں قریش کے چند فوجوں سے آمنہ سامنا ہوا، اور ان سے جنگ ہوئی، اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو شکست دی اور مسلمانوں کی فتح ہوئی، اس وقت مسلمانوں نے اپنے ہتھیاروں کو نبی ﷺ کے حکم کے مطابق شکست کھانے والوں کی گلے سے ہٹالیا، پھر مشرکین نے اسلام قبول کیا۔

سورة النصر کے عمومی موضوعات

اس سورت کے عمومی موضوعات یہ ہیں:

- 1- فتح مکہ اور نبی آدم پر خدا کا احسان۔
- 2- لوگوں کے ایمان لانے کی پیشین گوئی۔
- 3- نبی ﷺ کی رحلت کی طرف اشارہ۔
- 4- انسان کا عظمت والے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔
- 5- خدا تعالیٰ کا توبہ قبول کرنا اور اس کی لامتناہی رحمت اور فضل۔

سورت کا موضوع

یہ سورت ہجرت کے بعد نازل ہوئی، جس میں رسول اللہ ﷺ کو فتح کی عظیم بشارت دی گئی، جو کہ فتح مکہ اور اس کے بعد لوگوں کا گروہ اور ٹولیوں کی شکل میں اسلام کے مقدس آغوش میں آنا ہے، اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر نبی کریم ﷺ کو حمد و ثناء اور استغفار کی دعوت دی گئی، اگرچہ اسلام میں بہت سی فتوحات ہوئیں، لیکن فتح مکہ کے علاوہ مندرجہ بالا خصوصیات کے ساتھ کوئی فتح نہیں ہوئی، خاص طور پر یہ کہ بعض روایات کے مطابق عربوں کا عقیدہ تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ مکہ کو فتح کر کے اس پر غلبہ حاصل کر لیں تو یہ ان کی صداقت کی دلیل ہوگی، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ سورت "صلح حدیبیہ" کے چھٹے سال ہجرت کے بعد اور "فتح مکہ" سے دو سال پہلے نازل ہوئی تھی، لیکن تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ" سے مراد فتح مکہ ہے، اور یہ اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس بات کو لفظ "إِذَا جَاءَ" سے جانتے ہیں کہ یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی، تفسیر "روح المعانی" میں "بحر المحيط" کے حوالے سے ایک روایت ہے جو اس حقیقت سے متفق ہے کہ اس سورت کا نزول "غزوہ خیبر" سے واپسی کے بعد بیان ہوا ہے، اور فتح خیبر فتح مکہ سے پہلے تھا جو کہ مشہور و معروف ہے۔

اسی طرح تفسیر "روح المعانی" میں عبد بن حمید کی سند کے مطابق حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سورہ کے نزول کے بعد دو سال تک حیات رہے، اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی، کیونکہ فتح مکہ سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی وفات تک کا عرصہ دو سال سے کم تھا، (یہ اس صورت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ۱۰ ہجری کو ہوئی، جب یہ سن ۱۱ ہجری میں ہوئی، کیونکہ سن ۱۰ ہجری کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حج کے فرائض ادا کیے، اور سن ۱۰ ہجری میں حجتہ الوداع ہوئی، پس وفات کا سال ۱۱ ہجری ہوا)۔

فتح مکہ رمضان المبارک کے مہینے میں ۸ ہجری میں ہوئی، اور نبی کریم ﷺ کی وفات ربیع الاول کے مہینے میں سن ۱۰ ہجری میں ہوئی، (سن ۱۱ ہجری کو آنحضرت کی وفات کا سال ہے کیونکہ ۱۰ ہجری حجتہ الوداع ہوا ہے جو کہ ذوالحجہ کے مہینے میں ہے، کہ ربیع الاول کے بعد ہے) اس لیے اس کا مفہوم جو بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سورت فتح مکہ یا حجتہ الوداع کے وقت نازل ہوئی تھی، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت صحابہ کرام کو پڑھ کر سنائی، تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے (مزید معلومات کے لیے مراجعہ فرمائیں: "بیان القرآن" کی طرف)۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی، اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو سنائی تو وہ سب خوش ہوئے، اس موقع پر حضرت عباسؓ نبی ﷺ کے چچا یہ سن کر رو پڑے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ سے پوچھا آپ کیوں رو رہے ہیں؟ حضرت عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ کے جواب میں فرمایا: میرا خیال ہے کہ آپ کی وفات کی خبر اس سورت میں دی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مطلب وہی ہے جو آپ کہتے ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُورَةُ النَّصْرِ

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ ۝ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

سورت کا ترجمہ

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝	جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝	اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ ۝ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝	تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"إِذَا جَاءَ" جب وہ آیا، جس وقت آیا، "نَصْرُ اللَّهِ" مؤمنین کے لیے اللہ کی مدد و نصرت، دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے "الفتح" کامیابی، اس سے مراد فتح مکہ ہے، جس کے بعد جزيرة العرب میں بت پرستی کا خاتمہ ہوا، اور اسلام دنیا کے دوسرے ممالک میں پھیلنے کے لیے تیار ہو گیا، "و رایت" اور دیکھا، "ناس" لوگ، "يدخلون" دخل کے مادہ سے بمعنی: داخل ہوتے ہیں، اندر آتے ہیں، "فی دین اللہ" خدا کا دین، یہاں اس سے مراد خدا کی تدبیر اور خدا کا راستہ ہے، "افواجا" جمع فوج در فوج، جماعت جماعت، گروہ گروہ، "سبح" تسبیح کہیے، دعا کریں، "استغفره": (غفر) اس سے استغفار کرو، اپنی قوم کے ایمان کی کمی کی آرزو اور شدید دکھ کے لیے معافی مانگنا، (ملاحظہ فرمائیں: انعام: 33، حجر: 97، ہود: 12، فاطر: 8، محمد: 19، فتح: 2) "تَوَّابًا" تَوَّاب، توبہ کے مادہ سے ہے، در اصل توبہ، اوبہ تھا، اور "اوبہ" کا ہمزہ "ت" سے بدل گیا تو "توبہ" ہوا، یعنی: انسان جس راستے پر ہے اس سے واپس آکر توبہ کرنے والا بن جاتا ہے، البتہ خدا تعالیٰ بھی

توبہ والا ہے، لیکن خدا کی توبہ کی نوعیت اور انسان کی توبہ کی نوعیت میں فرق ہے، انسان کی توبہ کا مطلب یہ ہے کہ: وہ جس راستے پر ہے اس سے پلٹ جائے اسے خدا نے اس پر متوجہ کیا یا خود اس کو ادراک ہوا، یا کوئی نیک آدمی اس کے راستے میں آکر کہے کہ تم سے غلطی ہو رہی ہے، تو وہ توبہ کر کے واپس آجاتا ہے، لیکن خدا کا توبہ یہ نہیں ہے کہ وہ کسی رستے پر چلے پھر اس سے واپس ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا توبہ ہونا دراصل بندے کی توبہ کے لیے اس کی بے تابی ہے، خدا کی توبہ کا ایک معنی یہ ہے کہ بندوں کو توبہ کی توفیق دیتا ہے، اور دوسرا معنی توبہ کی قبولیت ہے، پس اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق بھی دیتا ہے اور توبہ قبول بھی کرتا ہے۔

ملاحظہ:

اعراب مکہ کے دو بڑے قبیلے بنو بکر اور خزاعہ تھے، جو اسلام کے بعد بنو بکر کفار کی حفاظت میں تھے، اور خزاعہ مسلمانوں کی حفاظت میں تھے، ان کا عہد و پیمان تھا کہ خصم کی حفاظت میں ایک دوسرے کی خلاف ورزی نہیں کریں گے، لیکن کافروں نے خیانت کی اور قبیلہ بنو بکر کے لوگوں کو خفیہ طور پر قبیلہ خزاعہ کے لوگوں کو قتل کرنے کے لیے بھیجا، قبیلہ خزاعہ نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ انہوں نے اپنے عہد کو توڑ دیا ہے، آپ ﷺ مدینہ میں تھے، اہل مکہ کو بتائے بغیر آپ نے اپنے اصحاب کا لشکر اکٹھا کیا اور مکہ کی طرف روانہ ہوئے، چنانچہ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم فرمایا کہ مکہ کے اردگرد کے تمام پہاڑیوں میں آگ کے شعلے بھڑکائیں، تاکہ کفار مکہ پر دہشت اور وحشت طاری ہو، اس کے بعد مکہ میں داخل ہوئے تو کفار بغیر مزاحمت کے پیچھے ہٹ گئے، خانہ کعبہ میں موجود "۳۶۰" بتوں کو اللہ کے فرمان کے مطابق توڑنے کا حکم فرمایا، یہ واقعہ سن ۸ ہجری کو پیش آیا، اور ۹ ہجری میں فتح مکہ کے بعد تمام عرب اور قبائل ایمان لائے اور مسلمان ہو گئے، اور یہ سال الوفود کے سال کے نام سے مشہور ہوا، رسول اللہ ﷺ ۱۰ ہجری کو جس وقت حجتہ الوداع کے لیے تشریف لے گئے، اس وقت پورا جزیرہ العرب اسلام کی حکمرانی میں تھا، اور پورے خطے میں کوئی شرک باقی نہیں بچا تھا۔

سورت کی تفسیر

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝۱	جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے

یعنی: اے محمد ﷺ! جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح تمہارے دشمنوں قریش کے خلاف ظاہر ہو جائے، اور مکہ تمہارے دشمنوں قریش کے خلاف ہو جائے، اور مکہ تمہارے لیے کھول دیا جائے، یعنی: حق تعالیٰ تجھے وسعت عطا کر دے، دلوں، آنکھوں اور کانوں کو حق قبول کرنے کے لیے کھول دے، مکہ مکرمہ اور دوسرے شہروں کو آپ ﷺ کے ہاتھوں فتح کرائے، مفسرین نے کہا: فتح مکہ کا اس کے وقوع سے پہلے خبر دینا، غیب کی خبر دینا ہے، یہ نبوت کے آثار میں سے ہے۔

نصر: اس سے مراد اس بات کی تصدیق ہے کہ دشمنوں کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کو ان پر فوقیت حاصل ہے، "فتح" دشمنوں کی سرزمین کو فتح کرنا اور ان کے گھروں میں داخل ہونا، نیز ان کے دلوں کو حق قبول کرنے کے لیے کھولنا ہے، پس "نصر" اور "فتح" میں فرق یہ ہے کہ: نصر: ایک سبب کی طرح ہے "فتح" کے لیے، اسی وجہ سے نصر ذکر پہلے کیا گیا اور پھر فتح کو اس پر عطف کر دیا، خدا کی مدد کا انحصار لوگوں کی دین کی مدد پر ہے، "إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ" (محمد آیت: ۷)، لفظ "تواب" گیارہ مرتبہ قرآن کریم میں آیا ہے، نو، ۹ مرتبہ لفظ رحمت کے ساتھ مذکور ہوا ہے "تَوَّابًا رَحِيمًا" اور ایک بار حکمت کے ساتھ، (سورہ نساء آیت: ۱۷) صرف ایک مرتبہ اس سورت میں آیا ہے۔

حقیقی فتح و نصرت اللہ کی طرف سے ہے، اس لیے ہمیں اوزاروں آلات اور انسانی قوت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ممکن ہے تمام اسباب اور وسائل ہوں، لیکن پھر بھی شکست کھا جاؤ، "وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ" (آل عمران: ۱۲۶)

وَرَأَيْتِ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝۲	اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں

یعنی: اے نبی ﷺ! نصرت اور فتح آنے کے بعد، آپ دیکھیں گے عرب اور غیر عرب دونوں کو گروہ گروہ اور ٹولٹیوں کی مشکل میں کہ دین میں داخل ہوں گے، کہ تجھے اللہ نے ان کی طرف مبعوث فرمایا ہے، یاد رہے کہ فتح مکہ

سے پہلے لوگ ایک ایک کر کے اسلام قبول کرتے تھے، لیکن فتح مکہ کے بعد، جوق در جوق اسلام قبول کریں گے، مفسر ابن کثیر کہتے ہیں کہ: عرب قبیلے فتح مکہ کے منتظر تھے اور کہتے تھے کہ: اگر اپنی قوم پر غالب آجائے گا تو معلوم ہوگا کہ پیغمبر ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مکہ کو کھول دیا تو لوگوں نے گروہ گروہ اسلام قبول کر لیا، اور ابھی فتح کو دو سال نہیں ہوئے تھے، کہ پورا جزیرۃ العرب ایمان کے سایہ میں متحد ہو گیا، اور تمام قبائل اسلام کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے (مختصر: ۶۸۷) قرطبی کہتا ہے کہ: "اذا" بمعنی "قد" ہے، یعنی: "قد جاء نصر اللہ" کیونکہ یہ سورہ بعد فتح مکہ نازل ہوئی ہے۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کے مکہ فتح کرنے کے بعد عربوں نے کہا: لیکن اب جب کہ محمد ﷺ اہل حرم پر غالب آگئے اور کامیاب ہو گئے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اصحاب فیل کے حملے سے محفوظ رکھا تھا، یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ محمد ﷺ حق پر ہیں، لہذا انہوں نے لڑائی اور مزاحمت کرنا چھوڑ دیا، اور یکے بعد دیگرے بڑے بڑے گروہوں کی شکل میں اسلام میں داخل ہو گئے، اور یہ لہر ایسی تھی کہ: ایک قبیلہ مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاتا، جمہور فقہا اور بہت سے علمائے دین کی یہ رائے ہے کہ: تقلیدی ایمان درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان گروہوں کے ایمان کے صحیح ہونے کا حکم دیا ہے جو کہ ایک تقلیدی ایمان تھا، اور اسے نبیؐ پر اپنے سب سے بڑے احسانات میں شمار کیا ہے، اگر ان کا ایمان درست نہیں ہوتا تو اس موقع ان کا تذکرہ نہیں فرماتے۔

تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے	فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۖ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

یہ آیت رب کی تسبیح بیان کرنے کا حکم دیتی ہے، اور اس کے ساتھ حمد کو جمع کیا ہے، ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ! قرآن کریم نے تکبیر اور تحمید سے زیادہ خدا کی تسبیح کا حکم دیا ہے، لفظ "تسبیح" قرآن کریم میں الفاظ تکبیر اور تحمید سے زیادہ آیا ہے، "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ" پس تسبیح کرو، حمد کے ساتھ، یعنی: نیکی کر کے برائی کو چھوڑنا، یعنی: کمزوریوں اور عیبوں کو چھوڑ کر کمالات اور اقدار کی طرف جانا، تسبیح ان کوتاہیوں کے لیے جو ہوئی ہیں، اور حمد ان

کامیابیوں کے لیے جو حاصل ہوئی ہیں، "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ" سبحان الله والحمد لله، کتنا خوبصورت ہے، جب ہم اسے زبان پر جاری کرتے ہیں تو ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ مجھے عملی طور پر خامیوں اور کمزوریوں سے دور رہنے اور خوبیوں اور کمالات کی طرف جانے کے راستے پر چلنا چاہیے، ہمیں ہمیشہ ایسا ہونا چاہیے،

حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف بھی ہے اور اس کا شکر ادا کرنا بھی ہے، اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو پاک اور منزہ قرار دینا ہر لحاظ سے۔

"وَأَسْتَغْفِرُ" اور اس سے معافی مانگو، اپنے رب سے کہو کہ: اس خدمت کو انجام دینے میں اگر کوئی غلطیاں، کوتاہیاں اور سہو سرزد ہوئے ہیں، تو ان سے درگزر فرمادے۔

اللہ کی تسبیح، فتح کے عظیم واقعات کے بارے میں حضور ﷺ کی خوشی کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو آپ ﷺ یا لوگوں میں سے کسی کے خیال میں بھی نہیں آئی تھی، اپنی بہترین کاریگری اور اپنے نبی ﷺ کے ساتھ روح کو حوصلہ دینے والا رویہ، اور ان پر خدا کا عظیم احسان ام القریٰ کی فتح اور نصرت پر "اس سے معافی مانگو" اپنی کوتاہیوں کے لیے، تواضع اور انکساری کے طور پر اللہ کے لیے، اپنے عمل کو چھوٹا اور حقیر جاننا، نیز اپنی امت کو یہ بات سکھانے کے لیے (یقیناً اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے) یعنی یہ اس کی شان ہے کہ استغفار کرنے والوں کی توبہ قبول کرے، اور ان کی طرف رحمتوں کے ساتھ آئے۔

حتیٰ کہ پیغمبر بھی، خواہ کتنی ہی تسبیح اور تعریف کرے، اسے اس کے آخر میں استغفار کرنا چاہیے۔

"إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا" وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔

مسلمانوں کو اس عظیم فہم سے آگاہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم مسلمانوں کو ہمیشہ یہ سکھاتا ہے کہ وہ کسی عبادت، یا اپنے دین کی خدمت کو بڑا کام نہ سمجھیں، بلکہ اللہ کی راہ میں اپنی جان فدا کرنے کے بعد بھی یہ تصور کر لیں کہ حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، نیز جب بھی انہیں کوئی کامیابی نصیب ہو تو وہ اسے اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ نہ سمجھیں، بلکہ اسے خدا کا فضل سمجھیں، اور اس پر فخر اور تکبر کرنے کے بجائے عاجزی کے ساتھ

اپنے رب کے سامنے سر جھکا دیں، پاکیزگی، توبہ اور معافی کے ساتھ اس کی تعریف کریں۔

جب بھی موت قریب محسوس ہو تو تسبیح پڑھنی چاہیے اور کثرت سے استغفار کرنا چاہیے: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وفات سے پہلے یہ کلمات پڑھتے تھے، میں نے عرض کی کہ: یا رسول اللہ ﷺ یہ کون سے کلمات ہیں: جو آپ حال ہی بہت کثرت سے پڑھتے رہتے ہیں، آپ نے جواب دیا کہ میرے لیے ایک نشانی مقرر کی گئی ہے جب میں اسے دیکھوں تو ان کلمات کی پڑھنے کی طرف رجوع کروں، اور وہ نشانی یہ ہے: "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ" (مسند احمد، مسلم، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردویہ) اس سے ملتی جلتی بعض دوسری روایات میں عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجود میں یہ کلمات کثرت سے پڑھتے تھے: "سُبْحَانَكَ اللَّهُ وَبِحَمْدِكَ. اسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ" اور یہ ان کی طرف سے قرآن کی سورہ نصر کی تفسیر تھی (بخاری، مسلم، ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر)۔

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی کے آخر میں ہمیشہ اور ہر وقت آپ کی زبان مبارک پر درج ذیل کلمات جاری تھے: "سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ" ایک دن میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ یہ ذکر کثرت سے کیوں پڑھتے ہیں؟ فرمانے لگے: مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے، اور پھر انہوں نے یہ سورت پڑھی۔

عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کثرت سے یہ ذکر کرنے لگے: "سُبْحَانَكَ اللَّهُ وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي، سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُ اغْفِرْ لِي إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ" (ابن جریر، مسند احمد، ابن ابی حاتم) ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس سورت کے نزول کے ساتھ آپ ﷺ آخرت کے لیے محنت اور کوشش، جدوجہد میں اتنے مصروف ہو گئے جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں کی تھی (نسائی، طبرانی، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ عبادت میں زیادہ کوشش کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں سوج جاتے تھے (قرطبی)۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سورہ "نصر" قرآن کی آخری سورت ہے، یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوئی۔

بعض روایات میں بعض آیات کا نزول اس کی ترویج نہیں کرتا، جس طرح فاتحہ سب سے پہلی سورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سورہ فاتحہ سے پہلے کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوئی تھی، اور سورہ مدثر اور مزمل کی چند آیات کا نزول سورہ فاتحہ سے پہلے نزول کی تردید نہیں کرتا۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ سورہ حجتہ الوداع میں نازل ہوئی، اور اس کے بعد آیت: "الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا" (فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمِهِ ۚ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۳) (سورہ: مائدہ: ۳) نازل ہوئی، اور ان آیات کے بعد رسول اللہ ﷺ صرف اسی دن دنیا میں رہے، (اور اسی (۸۰) دن کے بعد انتقال فرما گئے) اس کے بعد دو آیات کلالہ نازل ہوئیں، کہ اس کے بعد آپ کی عمر کے پچاس (۵۰) دن باقی رہے، پھر آیت: "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝۱۲۸" (سورہ توبہ آیت: ۱۲۸) نازل ہوئی، اس کے بعد آپ ﷺ کی زندگی کے صرف تیس (۳۰) دن باقی تھے، پھر اس کے بعد آیت: "وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۝۳۰ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۲۸۱" (سورہ بقرہ آیت: ۲۸۱) نازل ہوئی، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اکیسویں (۲۱) مقاتل کے روایت مطابق ساتویں دن وفات پائی، (قرطبی)

تکبر: ہمارا عظیم رب (سورہ نحل کی آیت: ۲۳) میں خاص خوبصورتی کے ساتھ فرماتا ہے: "خدا تعالیٰ متکبر لوگوں کو پسند نہیں کرتا" "تکبر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے اعلیٰ اور بلند سمجھے اور ساتھ ہی خود کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھے، اور دوسروں کو اپنی نظر میں چھوٹا جانے۔

قرآن عظیم سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۴۶ میں کہتا ہے کہ: "عنقریب جو لوگ زمین پر ناحق بڑائی کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں اپنی آیتوں پر ایمان لانے سے روک دوں گا" اور "جو لوگ بغیر کسی وجہ کے خدا کی آیات میں جھگڑتے ہیں، آخر وہ لوگ خدا اور مؤمنین کے غضب کا نشانہ بنتے ہیں، اور یہ اس طرح ہے کہ خدا ہر متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے" (آیت: ۳۵ سورہ غافر)

تکبر یہ ہے کہ: انسان اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ سمجھے اور یہ گھمنڈ رکھے کہ وہ ان سے برتر ہے، اور دوسروں کو کم سمجھے، یہ تکبر بعض اوقات انسان کو خدا انبیاء اور رسولوں کو مقابلے میں سرکشی اور نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے، اور کبھی انسانوں اور اللہ کے بندوں کے درمیان خود کو برتر سمجھنے کا باعث بنتا ہے، کبر اور تکبر، استکبار: معنی میں ایک دوسرے سے قریب ہیں، کبر: ایک ایسی حالت ہے جس میں انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس صفت کے ساتھ متصف ہو جاتا ہے، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنی جان اور وجود کو دوسروں سے بڑھ کر سمجھتا ہے، سب سے بڑا تکبر خدا کے سامنے حق کو قبول کرنے سے انکار، اور پوچھنے پر اسے تسلیم نہ کرنا ہے، (مفردات راغب اصفہانی) تکبر اور غرور خدا کی شریعت اور حکم میں بہت سنگین جرم ہے، خدا متکبروں پر بہت غضب ناک ہوتا ہے، لہذا تکبر اور غرور مسلمانوں کے مقابلے میں حرام ہیں، اور یہ ان قابل ملامت خصلت اور دلوں کی ان بیماریوں میں سے ہے، جن کا علاج کیا جانا چاہیے۔

قرآن کریم میں تکبر کو سب سے زیادہ قابل مذمت انسانی خصلتوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے، بعض آیات میں لفظ "متکبر" کے ساتھ تصریح کی گئی ہے، وہ آیات جو دوزخ کو متکبروں کی جگہ کے طور پر متعارف کراتی ہے: "فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَلَيْئَْسَ مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ ۝۲۹" (سورہ نحل آیت: ۲۹) ترجمہ: "پس جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہو، سو بلاشبہ وہ تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانہ ہے۔"

اور تکبر مسلمانوں کے جنت میں داخل نہ ہونے کا سبب بنتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ فرمایا: "لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر" (مسلم: ۱۳۱) ترجمہ: "جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر اور غرور ہو جنت میں داخل نہیں ہوگا" جس دن خدا بندوں کو زندہ کرے گا اور حشر کے میدان میں جمع ہوں گے، متکبروں کو انتہائی ذلت آمیز حالت میں اٹھائے گا، ایک حدیث میں امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "يَحْشُرُ الْمُتَكَبِّرُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْثَالَ الذَّرِّ فِي صُورِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ" (شکاة المصابيح: ۲/۲۶۳۵) (شمارہ: ۵۱۱۲)

ترجمہ: "قیامت کے دن متکبر لوگ چیونٹیوں کی طرح اکھٹے ہوں گے، جبکہ ذلت اور بدبختی انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی۔"

"الذر" بمعنی چوٹٹی کے ہیں، جس طرح عام طور پر لوگ ان چوٹٹیوں پر توجہ نہیں دیتے، تو اسی طرح قیامت میں کوئی ان لوگوں پر توجہ نہیں دے گا، اور وہ پیروں تلے روندے جائیں گے۔

لہذا ہر مسلمان جس کو یہ مرض لاحق ہو اسے اس کے علاج و معالجے کے بارے میں سوچنا چاہیے، اور غرور و تکبر کے بجائے عاجزی اور انکساری کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، اور جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے معزز و ہی بے جو زیادہ متقی ہو، "إِنْ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ" (سورہ الحمراء: ۱۳)

ترجمہ: "درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ متقی" یعنی: تمہارے درمیان برتری اللہ کے نزدیک صرف تقویٰ کے ساتھ ہے، پس جس کے پاس تقویٰ ہے، وہ عزت و عظمت کا مستحق ہے، اس لیے حسب و نسب، دولت اور دنیاوی عہدوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں۔

تقویٰ اور تکبر ایک دل میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، اور جو تقویٰ والا ہو، وہ تکبر اور غرور کی خصلت سے پاک ہے، اور جس کو یہ اندرونی بیماری ہے اسے چاہیے کہ توبہ کرے، اور مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے مقابلے میں تکبر اور غرور نہ کرے، تاکہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ بیماری ٹھیک ہو جائے، اور عاجزی، انکساری کو اپنے دل میں جگہ دے، اللہ تعالیٰ مؤمنوں کی صفات اس طرح بیان فرماتے ہیں: "أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ" (سورہ مائدہ 54) "یعنی: مؤمنوں کے سامنے عاجزی اور کافروں کے سامنے سخت اور مضبوط ہیں۔"

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30) سورة مسد (الهب)

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی، اس کی پانچ (۵) آیتیں ہیں۔

وجه تسمیہ:

اس سورت کا نام "مسد" اس لیے رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے آخر میں فرمایا: "فِي جَيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ" نیز بعض مصاحف اور تفاسیر کی روایات کے مطابق اس سورت کا نام اس کے پہلے لفظ "تبت" بمعنی "نقصان دہ ہونا" سے لیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے شروع میں فرماتا ہے: "تَبَّتْ يَدَايَ اَنِ لَّهَبٍ وَتَبَّتْ" بعض مصاحف میں اس سورت کو "ابو لہب" کے نام پر یا "الہب" کہا گیا ہے۔

عالم اسلام کے مشہور مفسر ابو حیان اندلسی نے جو ساتویں صدی کے مفسرین میں سے ہیں اس سورت کا نام "سورة الہب" بتایا ہے، اس کے علاوہ کسی اور نے یہ نام نہیں بتایا ہے، (ملاحظہ فرمائیں: رسالۃ التحریر و التنویر) ابن عاشور محمد طاہر ۱۹۰۶ عربی میں مخطوطہ)

سورة مسد کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة مسد مکی ہے، اس کا ایک (۱) رکوع، پانچ (۵) آیتیں، چوبیس (۲۴) الفاظ، اکیاسی (۸۱) حروف، اور چونتیس (۳۴) نقطے ہیں۔

(واضح رہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں، اس بحث کی تفصیل کے لیے سورة "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة مسد کا سورة النصر سے ربطہ و مناسبت

اس سورت کا پچھلی سورة "النصر" سے تعلق اور مناسبت یہ ہے کہ ہجرت، نصرت اور فتح اور اللہ کے دین میں لوگوں کے داخل ہونے کے بعد کفار کا سر جھک جانا چاہیے (یا ان کے سرداروں کا قلع قمع ہونا چاہیے) یہی وجہ ہے کہ اس سورت کا اس سے پہلی والی سورت سے گہرا تعلق ہے جو کہ سورة نصر ہے، اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے لیے فتوحات کے مظاہر

میں سے ایک مظہر یہ ہے کہ اس دور کے سخت ترین دشمن ابو لہب کو تباہ کر دیا، ہر دور میں اس دشمن کا صرف نام اور اس کے وسائل بدل جاتے ہیں، لیکن خدا کے دین سے دشمنی اور لوگوں کے دین میں داخل ہونے پر سختی کرنا ایسی صفت ہے جو کہ تبدیل نہیں ہوتی۔

سورہ مسد کا موضوع

اس سورت کا مرکزی موضوع ابو لہب اور اس کی بیوی ام جمیل کا انجام ہے، جو اسلام کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے، اور سزا اور ان کو شدید سرزنش، اور ان کی تباہی کے بارے میں اطلاع ہے، کیونکہ ابولہب ہی وہ تھا جس نے اپنے تمام کام ترک کر دیے تھے، اور صرف یہی ذمہ داری لی تھی کہ: رسول اللہ ﷺ کی دعوتی کام میں خلل ڈالے، اور پوری قوت کے ساتھ لوگوں کو ایمان لانے سے روکے، چنانچہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے آخرت میں ایک جلتی ہوئی آگ کی وعید سناتا ہے، جس میں وہ جلے گا، اور یہ عذاب اس کے بیوی کے لیے بھی ہے، کیونکہ وہ بھی اس دشمنی اور اذیت و تکلیف پہنچانے میں شریک تھی۔

سورہ مسد میں اہم ترین پیغام

اس سورت کا سب سے اہم پیغام اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ دولت، مقام اور انبیاء کے ساتھ خاندانی تعلق خدا کے غضب کو روک نہیں سکتا، ابو لہب کی طرح، جیسا کہ وہ قریش کے سرداروں میں سے تھا، رسول اللہ ﷺ کا چچا اور مال و دولت کا مالک تھا، لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز اس کے کام نہ آئی، اور نہ اس کے لیے خدا کے حضور کوئی قرب حاصل کیا، خدا کا وعدہ یہ ہے کہ: "خدا کے نزدیک تم میں سے سب سے بہترین وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

سورہ مسد سے واقفیت

یہ سورت، جو تقریباً نبی کریم ﷺ کی کھلی دعوت کے آغاز میں نازل ہوئی تھی، وہ واحد سورت ہے جس میں کسی ایک شخص کا نام لے کر سخت حملہ کیا گیا ہے، اسلام اور پیغمبر اسلام کا دشمن اس زمانہ میں ابولہب تھا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے: ابولہب کی رسول اللہ ﷺ سے خاص دشمنی تھی، وہ اور اس کی بیوی اسلام کی راہ میں کسی قسم کے خلل اور بدزبانی کرنے سے دریغ کرتے تھے، قرآن عظیم صراحت سے کہتا ہے: دونوں جہنمی

ہیں، اور یہ معنی درست ثابت ہوا، بالآخر دونوں دنیا سے بغیر ایمان کے گئے، یہ قرآن کی واضح پیشین گوئی ہے۔

سورہ مسد کی فضیلت

سورہ مسد کی فضیلت کے بارے میں، نبی کریم ﷺ سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اس سورت کی تلاوت کرے گا، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اور ابو لہب کو ایک جگہ جمع نہیں کرے گا"، یعنی: وہ جنتی ہوگا، جبکہ ابو لہب جہنمی ہے، یہ کہے بغیر معلوم ہے کہ یہ فضیلت اس کی ہے جو اس سورت کو پڑھ کر اپنی راہیں ابو لہب کی راہوں سے الگ کرے، ان کی طرح نہیں کہ جو زبان سے تو پڑھتے ہیں، لیکن ابو لہب جیسا عمل کرتے ہیں۔

سورہ مسد کا شان نزول

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب آیت: "وانذر عشیرتک الاقربین" نازل ہوئی، اور رسول اللہ ﷺ کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور اہل و عیال کو تنبیہ کریں اور انہیں دعوت دیں اسلام کی طرف (اپنی دعوت کا اعلان کریں)۔

رسول اللہ ﷺ کوہ صفا کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور کہا کہ اس پہاڑ کے پیچھے دشمن ہے جو اچانک حملہ آور ہوگا، سب باخبر ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہوجاؤ) مکہ کے لوگوں نے جب یہ آواز سنی تو کہنے لگے: کون پکار رہا ہے؟ کہا گیا: "محمد" ہے بہت سے لوگ آنحضرت کے ارد گرد جمع ہو گئے، تو آپ فرمایا: مجھے بتاؤ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آنے والا ہے جو تم پر حملہ کرے گا، تم مجھے سچا سمجھو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں، ہم نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: "انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید" ترجمہ: "میں سخت عذاب سے، جو تمہارے سامنے آرہا ہے، تمہیں ڈراتا ہوں" (تمہیں توحید کی طرف اور بتوں کو چھوڑنے کی دعوت دے رہا ہوں) ابو لہب نے جب یہ تقریر سنی تو کہا: تم ہلاک ہوجاؤ تم نے اس لیے ہمیں جمع کیا تھا؟ اسی وقت یہ سورت نازل ہوئی: "تَبَّتْ یَدَاآئِیْ لَہٖ وَتَبَّ" یعنی: ابو لہب کے دونوں ہاتھ برباد ہوں، (اس سے مراد ابو لہب خود ہے)۔

صحیح بخاری اور مسلم میں سعید بن جبیرؓ سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا: "صَعِدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّفَا ذَاتَ يَوْمٍ، فَقَالَ: يَا صَبَاحًا. فَاجْتَمَعَتْ إِلَيْهِ قُرَيْشٌ، قَالُوا: مَا لَكَ؟ قَالَ: أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ الْعَدُوَّ يَصْبِحُكُمْ أَوْ يَمَسِّيَكُمْ، أَمَا كُنْتُمْ تُصَدِّقُونِي؟ قَالُوا: بَلَى، قَالَ: فَإِنِّي نَذِيرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيِ عَذَابٍ شَدِيدٍ فَقَالَ أَبُو لَهَبٍ: تَبًّا لَكَ! أَلَيْهَا جَمَعْتَنَا؟ فَأَنْزَلَ اللَّهُ".

یہاں بعضوں نے مزید اضافہ کیا ہے کہ: جب ابو لہب کی بیوی (ام جمیل) کو یہ خبر ہوئی کہ یہ سورت اس کے اور اس کے شوہر کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تو وہ نبی کریم ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے آئی، اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا اور کہنے لگی: میں نے سنا ہے کہ محمد ﷺ نے میرا مذاق اڑایا ہے، خدا کی قسم! اگر وہ مجھے ملے تو میں اس کے منہ پر پتھر ماروں گی، میں خود بھی شاعر ہوں، پھر اس نے کچھ اشعار لکھے، جس میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی مذمت کی گئی۔

ابو لہب اور اس کی بیوی کا اسلام کے لیے خطرہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کھلم کھلا ان کی مذمت کرتا ہے تو اس کے اور بھی اسباب ہیں جن کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

ضروری وضاحت

ابو لہب کا نام "عبدالعزی" تھا، وہ عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھا، چہرے کا رنگ لال سرخ ہونے کی وجہ سے ابو لہب کے نام سے شہرت پائی، قرآن کریم نے اس کا نام مشرکانہ ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیا، ابو لہب کی کنیت کی مناسبت جہنم کی لہب سے تھی، ابو لہب اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے سخت اور شدید ترین دشمنوں میں سے تھا، کہ نبی کریم ﷺ کو تکلیف اور اذیتیں پہنچاتا تھا، جب بھی نبی کریم ﷺ لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے تو ابو لہب آپ ﷺ کی تکذیب کرتا تھا۔ (ابن کثیر)

اسی طرح مؤرخین ابو لہب کے بارے میں لکھتے ہیں: ابو لہب اس شخص کی کنیت ہے جس کا نام "عبدالعزی" ہے، "عبدالعزی" یعنی: عزى کا بندہ، عزى قریش کے ایک بڑے بت کا نام تھا، قریش کے تین بڑے بت تھے: لات، منات اور عزى، بلکل جیسے: رب، اللہ اور ملک، ان لوگوں نے بھی تین بتوں کے نام اسی کے مطابق رکھے تھے۔

عبدالغزى نبى ﷺ کے چچاؤں میں سے تھا، پیغمبر ﷺ کے تین چچا تھے، عباس، عبدالمطلب اور یہی عبدالغزى، یاد رہے کہ: وہ نہ صرف رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، بلکہ آپ ﷺ کی دو بیٹیوں رقیہ اور ام کلثوم کے سسر بھی تھے۔

ابو لہب جو نبی کریم ﷺ کے چچا اور آپ ﷺ کے کنبے میں سے تھا، آپ کی دشمنی میں اس نے تمام حدیں پار کر لی تھیں۔

بعض مفسرین ابو لہب کے لقب کے بارے میں لکھتے ہیں: "لہب" یعنی: آگ کا شعلہ، اگرچہ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ اس کا چہرہ سرخ ہونے کی وجہ سے ابو لہب کہا گیا، لیکن بعض دوسروں نے کہا ہے کہ: چونکہ وہ شخص بہت شعلہ بیان تھا، اور بہت زیادہ شیطانی کرتا تھا، اور بہت زیادہ آگ بھڑکاتا تھا، اس لیے یہ لقب اس کے لیے چنا گیا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُورَةُ الْمَسَدِ

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝ مَّا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَامْرَأَتُهُ
حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝

سورت کا ترجمہ

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝	ابو لہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا
مَّا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۝	نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا (۲)
سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝	عنقریب وہ شعلے والی آگ میں داخل ہوگا
وَامْرَأَتُهُ ۝ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝	اور اس کی بیوی بھی جو ایندھن اٹھانے والی ہے
فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝	اس کے گلے میں کھجور کی چھال کی رسی ہوگی

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"تب" تباہ ہو گیا، کاٹا گیا، نقصان اٹھانے والا ہو گیا، چونکہ یہ بد دعا نفرت کے موقع پر بیان ہوئی ہے، اس لیے مضارع کا معنی ہوگا، جیسے: تباہ ہو جانا، کاٹا جانا، مردہ باد! "وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ" (مؤمن: ۳۷) ترجمہ: "فرعون کی تدبیر (اپنی) تباہی کے سوا کچھ نہ تھی، "يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ" ابو لہب کے دونوں ہاتھ، یہاں جزء سے مراد کل ہے، ہاتھ سے مراد اس کی ذات ہے، (رجوع فرمائیں: جزء عم شیخ محمد عبدہ) ابو لہب آپ ﷺ کے چچا اور آپ ﷺ کے سخت ترین دشمنوں میں شمار ہوتا تھا، ہمیشہ وہ اور اس کی بیوی ام جمیل اسلام کے مخالف اور مسلمانوں کو اذیت دینے کی تلاش اور جستجو میں تھے۔

"مَا أَغْنَىٰ" بے نیاز نہ کیا، فائدہ نہیں پہنچایا، "سَيَصْلَىٰ" (صلی) بہت جلد آگ میں داخل ہوگا، اور اس میں جلے گا، (سباء: ۱۰، ابراہیم: ۲۹، اسراء: ۱۸) "ذَاتِ لَهَبٍ" شعلے والی، بھڑکتی، اور روشن (مرسلات: ۳۱) "الْحَطْبِ" ایندھن، "جِدٍ" گردن، "حَبْلٍ" تار، رسی "مَسِدٍ" کھجور کی چھال اور پتوں وغیرہ سے بٹی ہوئی رسی، یہ آیت حال ہے، اور ایک شخص کی تحقیر و تذلیل ہے، یہ حشر صرف ابو لہب اور ام جمیل کا نہیں، بلکہ جو قرآن کی مخالفت کرتا ہے، اور اس کے احکام کو دنیا میں پھیلانے اور اس کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالتا ہے، جہنم میں ان کا ساتھی ہوگا۔

ملاحظہ:

ابو لہب کا کوئی بیٹا لہب کے نام سے نہیں تھا، لیکن شاید اس کے چہرے کے لال ہونے کی وجہ سے اسے ابو لہب کہا گیا ہو۔

سورت کی تفسیر

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝	ابو لہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا

یہاں مراد اس سے اس کا عمل ہے، یعنی: اس کا کیا ہوا کام ہلاک ہوا، علماء بلاغت کہتے ہیں کہ: "يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ" میں مجاز مرسل کا استعمال ہوا ہے، یعنی: جزء کا اطلاق ہوا ہے اس سے مراد کل ہے، لہذا معنی یہ ہے کہ: ہلاک ہو ابو لہب خود اپنے تمام وجود سمیت، یہ نفرت آمیز جملہ ہے اس کے خلاف۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ: "اور ہلاک ہو گیا" یہ جملہ اللہ سبحانہ کی طرف سے خبر ہے، اس پر لعنت بھیجنے کے بعد، کہا جاتا ہے کہ ابو لہب کی ہلاکت کی تعبیر ماضی کے صیغے کے ساتھ بیان کی گئی ہے، گویا اس کا نقصان میں واقع ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہو چکی، اور ایسا ہی ہوا، کیونکہ ابو لہب دنیا اور آخرت میں ہار کر ہلاک ہو گیا۔

ابو لہب کی مہم جوئی، برائیوں اور فتنہ انگیزیوں اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکانے میں اس کے کردار کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سورت اس کے اور اس کی بیوی کے بارے میں نازل ہوئی، اس کے اس برے عمل کی مذمت ایک مستقل سورت کی شکل میں کی گئی ہے کہ

رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں ان کا کردار بد ترین تھا۔

"تبت" یعنی: کٹ جانا چاہیے، "یَدَا" اصل میں "یَدَانِ" تھا، یعنی دونوں ہاتھ، ابو لہب کے دونوں ہاتھ۔

"وتبَّ" اور کاٹا گیا، کٹا ہوا ہو، "یَدٌ" سے کیا مراد ہے؟ یَدٌ سے مراد صرف یہی انگلیاں ہیں، جبکہ قرآن کریم میں لفظ "ید" کے دوسرے معنی بھی آئے ہیں، مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ: "يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ" (سورہ فتح: ۱۰) ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تمام ہاتھوں کے اوپر ہے" یعنی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے لیے ہم ہاتھ تو نہیں مان سکتے، یا دوسری جگہ فرماتا ہے: "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" (سورہ آل عمران: ۲۶) مثال کے طور پر ہم بھی جب کہتے ہیں کہ اے اللہ! نیکی اور بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے، یعنی: تیری قدرت میں ہے، پس یہاں یَدٌ سے مراد قدرت ہے، یا: "قُلْ إِنَّ الْفُضْلَ بِيَدِ اللَّهِ" (آل عمران: ۷۳) فضل خدا کے ہاتھ میں ہے، یا: "مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ" (مؤمنون: ۸۸) ہر چیز کی مکمل بادشاہی اس کے ہاتھ میں ہے، یا اس شخص کے لیے جس نے رب کی آیات سے منہ موڑا ہے کہتا ہے: "مَا قَدَّمَتْ يَدُكَ" (سورہ کہف: ۵۷) جس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھيجا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ آخرت میں اللہ کے سامنے حاضر ہو، جبکہ ہمارے بہت سارے کام ہماری سوچ اور زبان کے ساتھ ہیں، نہ کہ ہاتھ ساتھ، پس "ید" ان مواقع پر مجاز ہے، یا دوسری جگہ فرماتا ہے: "بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ" (سورہ بقرہ: ۲۳۷) یعنی جس کے اختیار میں نکاح کا انعقاد ہے، مثال کے طور پر لڑکا اور لڑکی یا تو خود شادی کرتے ہیں یا کسی کے ذریعہ جس کے اختیار میں عقد اور نکاح ہے۔

اس سورت میں ہاتھ سے مراد ابو لہب کا مادی ہاتھ مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں ہاتھ کا استعمال مجاز طریقے سے ہوا ہے، اور یہ طاقت اور قدرت کی علامت ہے، یعنی شرک کی طاقت، مخالفت کی قوت اور دشمنی کی قوت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کرتی ہے، اور اسلام کو تباہ کرنا چاہتی ہے، وہ منفی قوت جو اسلامی تحریک اور انقلاب کے خلاف صف آراء ہو چکی ہے، یہ طاقت کٹ جائے، نابود ہو جائے، اور یہ دراصل ایک نعرہ ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ نعرہ نہیں لگاتا، یہ تو واضح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو یہ ضرور ہوگا، اگر وہ چاہے تو کفار اور اسلام کے دشمنوں کو کاٹ

ڈالے، اور خدا کو ان پر لعنت بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم انسان ہی نعرے لگاتے ہیں، اور انسانوں کے نعرے ان کے دل کی خواہشات کا اظہار ہوتے ہیں، فلاں مردہ باد، فلاں زندہ باد، یہ ایک قوم کی خواہشات کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن خدا کو نعرے کی ضرورت نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ابولہب کی جان لے لیتا، اس کے ہاتھ کاٹنے اور اس پر لعنت بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، بہر صورت یہ ایک الہی پیغام ہے کہ زمانے کے ابولہبوں کے کام کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، غداروں کے ہاتھ کاٹے جائیں، جارحوں اور جابروں کی طاقت ختم ہو جائے یہ دراصل اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے، ایک ایسا قانون ہے جو دنیا میں رائج ہے۔

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ: ابولہب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں رہتا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ اذیت پہنچاتا تھا، حج کے موسم میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی قافلے کو دعوت دینے جاتے تو یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جاتا اور قافلہ والوں کو کہتا کہ اس کی باتیں نہ سنو، یہ (نعوذ باللہ) جھوٹ بولتا ہے، یہ تمہیں تمہارے اصل معبودوں سے دور کرے گا، جو "لات، منات اور عزی" ہیں۔

مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۖ	نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا (۲)

اس نے کس بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھا؟ اس بنا پر کہ وہ ایک امیر شخص تھا، وہ اپنے وقت کے حساب سے کروڑپتی تھا، لیکن اپنی تمام تر دولت اور معاشرتی حیثیت کے ساتھ اور قرآن کے مطابق اپنی تمام کمائی کے ساتھ کہاں گیا اور کیا کیا؟ نہ اس کی جائیداد اور نہ ہی معاشرے میں اس کے عہدے نے اسے فائدہ دیا، اور نہ اس کو عذاب سے بچایا۔

اکثر انسانوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اگر امیر ہیں یا طاقتور ہیں، یا ان کا کوئی اونچا مقام و مرتبہ ہے تو لوگ ان کی حمایت کریں گے، وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دولت اور عہدے کی بنیاد پر جو چاہیں کرسکتے ہیں، ان لوگوں کے لیے ہی فرماتا ہے کہ: ان میں سے کوئی بھی چیز تیری محتاجگی کو ختم نہیں کرتی، کوئی چیز تمہارے کسی کام نہیں آئے گی، اس سے تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوگا، ابن زیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں آپ کا دین قبول کر لوں تو مجھے کیا فضیلت ملے گی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی جو دوسرے مؤمنوں

کو حاصل ہوتی ہے، ابولہب نے کہا: گویا کہ دوسروں کے مقابلے میں مجھے کوئی اضافی استحقاق نہیں ملے گا؟ پیغمبر اسلام نے فرمایا: اس سے بڑھ کر کیا چاہتے ہو؟ ابولہب غصے میں آگیا اور کہنے لگا: "تبا لہذا الدین تبا ان اکون وھولاء سواہ" ہلاکت ہو ایسے دین پر، جو مجھے اور ان لوگوں کو برابر کہتا ہے۔

"وَمَا كَسَبَ" اس کی جائیداد خواہ مال ہو یا اولاد، "وَمَا كَسَبَ" اس سے بعض مفسرین نے آمدنی کا معنی لیا ہے، یعنی: وہ منافع جو وہ اپنی جائیداد سے کماتا ہے، وہ اس کا کسب ہے، دوسرے مفسرین نے اس سے مراد اس کی اولاد لی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بنی آدم کی اولاد بھی اس کے کسب میں سے ہے، (ابوداؤد، ابن ابی حاتم) یہ دونوں معنی ابولہب کے انجام سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ جب وہ بیمار ہوا تو اس کی جائیداد بھی اس کے کوئی کام نہ آئی، اور اس کی اولاد نے بھی اس کو اپنی حالت پر بے کسی کے عالم میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کو عذاب الہی سے ڈرایا، تو ابولہب نے کہا: میرا یہ بھتیجا جو کچھ بھی کہتا ہے اگر وہ سچ ہے تو میرے پاس بہت سا مال و اولاد ہے ان سب کو دے کر اپنے آپ کو بچالوں گا، اس کے یہ کہنے پر آیت: "مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ" نازل ہوئی، جب وہ عذاب الہی میں گرفتار ہوا تو اس کی اولاد اس کی میت کو احترام کے ساتھ دفن کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئی، تو اس طرح چند سالوں میں جو پیشین گوئی ابولہب کے بارے میں اس سورت میں ہوئی تھی وہ پوری ہوئی دیکھی۔

مال: ان تمام چیزوں کی خاصیت جو انسان کے لیے پسندیدہ اور محبوب ہیں، یعنی: انسان ان سے فطرتاً محبت کرتا ہے، اصل لفظ "مال" میں سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس کی خواہش ہوتی ہے، اور اس میں ایک خاص کشش ہوتی ہے، لہذا مال کی محبت ایک فطری اور طبعی چیز ہے، دین نے ہمیں مال جمع کرنے، مال اور دیگر سہولیات سے فائدہ اٹھانے سے منع نہیں کیا ہے، بلکہ ہمیں ناجائز ذخیرہ اندوزی اور مال پرستی سے منع کیا ہے، اس طرح کہ مال ہی انسان کا سب کچھ ہو جائے اور اقدار کے حصول اور سمجھنے کے لیے ہماری تشخیص کا معیار بن جائے، فرمایا: "مَالُهُ وَمَا كَسَبَ" "مَا كَسَبَ"، مالہ کے علاوہ ہے،

مال وہ چیز ہے جو موجود ہے، اسے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن "مَا كَسَبَ" وہ جو موجود نہ ہو، اور حاصل کیا جاتا ہو، خدا تعالیٰ آنے والے مؤمنوں کے دل کے اطمینان کے لیے آنے والے وقت سے متعلق فرماتے ہیں کہ: جو کچھ اب موجود ہے، اور کفار کے سرداروں کے پاس ہے، اور جو کچھ مستقبل میں انہیں ملے گا، ان کا کوئی بھی مسئلہ یا مشکلات حل نہیں کرسکے گا، چنانچہ مؤمن انسان اپنے آپ کو بے وقعت، کمتر اور حقیر محسوس نہیں کرتا۔

سَيَصْلَىٰ نَارًا إِذَا تَلَهَّبَ ۝۳	عنقریب وہ شعلے والی آگ میں داخل ہوگا

یعنی: ابو لہب کو جلد ہی ایک دہکتی ہوئی آگ میں عذاب دیا جائے گا، جو اس کی کھال کو جلا دیگی، وہ آگ جہنم کی آگ ہے، "ذَاتَ لَهَبٍ" شعلے والی آگ، ایسی آگ جو بھڑکتی اور شعلے والی ہے، درحقیقت وہ ایک قسم کی آگ ہے، اس شخص کا نام ابو لہب ہے تو اس کی تقدیر "ذَاتَ لَهَبٍ" ہے، ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، ابو لہب بھی دشمنی کی آگ بھڑکا تا تھا، جس نے جو کچھ بویا وہی کاٹے گا جس نے اپنے ظلم و ستم اور بد عنوانی سے لوگوں کے مال و جان اور زندگیوں میں آگ لگا دی، اور ان پر تشدد کیا، لازمی طور پر اس کا حشر بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

وَأَمْرَأَتُهُ ۝۴ خَمَّالَةَ الْخَطَبِ ۝۴	اور اس کی بیوی بھی جو ایندھن اٹھانے والی ہے

اور اس کی بیوی بھی اس آگ میں گرے گی، جو لکڑی اٹھانے والی ہے، "خَمَّالٌ" وہ جو بوجھ اٹھاتا ہے۔

"خَمَّالَةَ الْخَطَبِ" لکڑی اٹھانے والی، چغلی اور شر انگیزی کی طرف اشارہ ہے، کہ نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکا کر لوگوں کی باہمی محبت و الفت کو آگ لگاتی تھی، اور سب کی دوستی اور رشتہ داری کے روابطہ اور تعلقات کو ختم کردیتی تھی، یہ ایک تمثیلی استعارہ ہے اس شخص کی فتنہ انگیزی پر جو آگ میں لکڑیاں ڈالتا ہے، تاکہ وہ بھڑک اٹھے۔ (اسراء: آیات ۴۰ تا ۴۸ کی شرح و تفصیل)

کہتے ہیں: "ولم يمش بين الناس بالخطب الرطب" (فلاں نے لوگوں کے درمیان چغل

خوری اور فتنہ انگیزی نہیں کی) "وَأَمْرَأَتُهُ" اس کی بیوی، ام جمیل، "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" یعنی: کانٹے اور جھاڑیاں، مؤرخین لکھتے ہیں کہ: چونکہ ابو لہب کا گھر آپ کی دیوار سے متصل تھا، اس لیے اس کی بیوی کانٹوں کا ڈھیر لے کر آتی، اور رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے کے لیے آپ ﷺ کے راستے میں بچھاتی تھی، اس لیے اسے لکڑ ہارا کہا گیا۔

سعید بن جبیر کا کہنا ہے کہ جو خود پر گناہ لادتا ہے اس کے بارے میں ایک محاورہ کہا جاتا ہے: "فَلَانٌ يَحْتَبِ عَلَى ظَهْرِهِ" (فلاں اپنی پیٹھ پر لکڑیاں لادتا ہے) پس "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کا معنی ہے گناہوں کا بوجھ اٹھانے والی۔

ابو لہب کی بیوی، ام جمیل حرب کی بیٹی ابو سفیان کی بہن اس کا شمار خواتین شعراء میں ہوتا تھا۔

جیسا کہ ہم نے کہا کانٹے اور گوہر لے کر رات کو رسول اللہ ﷺ کے راستے میں ڈالتی تھی، یا اس سے مراد یہ ہے کہ ابو لہب کی بیوی بڑے گناہوں کا بوجھ اٹھانے پر نبی ﷺ سے دشمنی کے سبب اور اپنے شوہر کو ان کے اذیت پہنچانے پر ترغیب دینے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے کر جہنم کی ایندھن کو اٹھاتی تھی۔

یا یہ اس کی چغل خوری سے کنایہ ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں میں دشمنیاں اور جھگڑے بھڑکاتی تھی، ہمارے ہاں ایک مشہور مثال ہے: کچھ لوگ فتنہ کی آگ بھڑکاتے ہیں اور کچھ لوگ اس میں لکڑیاں لاکر اس کو ایندھن فراہم کرتے ہیں، ام جمیل بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان موجود حسد کی وجہ سے اپنے شوہر کو نبی ﷺ سے دشمنی پر اکساتی تھی، تو شوہر آگ جلانے والا ہے، یعنی دشمنی کی آگ اور اس کے شعلے کو بھڑکاتا اور ہوا دیتا ہے، جبکہ اس کی بیوی مجلس و محفل میں آگ پھیلانے والی۔

ملاحظہ:

"وَأَمْرَأَتُهُ" اس کی بیوی، انسانی تاریخ میں خواتین کے مثبت یا منفی کردار کی طرف اشارہ کرتا ہے، یعنی: عورتیں اچھی بھی ہوسکتی ہیں اور اس کے برعکس بھی، پوری تاریخ، یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی عورتوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے، اب ہم اس کردار کو ایک طرف چھوڑ کر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عورت معاشرے میں بے کار ہے، وہ بھلائی کی طرف دعوت

دے سکتی ہے، وہ خیر کی حامی اور اہل خیر بھی ہوسکتی ہے، یا برائی کی حامی اور اہل شر بھی ہوسکتی ہے، اس کی واضح مثال اس سورت مسد میں ہے۔

اس کے گلے میں کھجور کی چھال کی رسی ہوگی	فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝

مسد: کھجور کی چھال جس سے رسی بنائی جاتی ہے، وہ رسی جس میں لکڑیوں کا گٹھڑا باندھا کر لایا جاتا ہے، وہ کھردرے ریشے سے بنی رسی اس کے گلے کا طوق بن جائے گی، اس کے ذریعے اس پر جہنم کی آگ کے شعلے بھڑکائے جائیں گے، اس کا گلا دبا کر اسکو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔

روایت ہے کہ ابو لہب کی بیوی کے پاس زیورات کا ایک شاندار ہار تھا، اس نے کہا: میں لات اور عزی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس ہار کو محمد ﷺ کی دشمنی میں استعمال کروں گی، اس لیے قیامت کے دن اس کا ہار آگ کی زنجیر بنے گا، ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ سبحان و تعالیٰ آخرت میں اس کی سزا کو اسی شکل اور حالت میں جو اس کی دنیا میں تھی بیان کرتا ہے، کیونکہ آخرت کی سزا مجرم کے فعل کی نوعیت کی ہے، اور اس کے جرم کے مطابق ہے۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ: اس سورت کے نزول کے وقت ام جمیل، ابو لہب کی بیوی اپنے ہاتھ میں ایک پتھر لے کر مسجد الحرام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئی، اس وقت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، تو اس نے ابو بکر صدیقؓ سے کہا: مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے دوست نے میرا مذاق اڑایا ہے، اور اب میں اس کے ساتھ یہ اور یہ کرنے آئی ہوں، لیکن اللہ نے اس کی آنکھیں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے سے اندھی کر دیں، اور ادھر ادھر بہت تلاش کیا، مگر آپ ﷺ کو نہیں دیکھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس سے پوچھا کہ: کیا تم میرے ساتھ کسی کو دیکھتی ہو؟ ام جمیل نے کہا: کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟ میں تیرے ساتھ تیرے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتی، علماء نے کہا کہ یہ سورت ایک واضح معجزہ اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کی ایک واضح دلیل ہے، کیونکہ اللہ نے "سَيَصْلَىٰ نَارًا اِذَا تَلَهَّبَ" کے نزول کے ساتھ اعلان فرمایا کہ ابو لہب اور

اس کی بیوی ایمان نہیں لائیں گے اور دنیا و آخرت میں ان کا انجام بدبختی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، پس اس خبر کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لایا، نہ ظاہری، نہ باطنی طور پر، نہ کھلم کھلا، نہ پوشیدہ۔

"جید" گردن، ایک نازک پتلی اور خوبصورت گردن کو کہا جاتا ہے، جو عموماً خواتین کی گردن ہوتی ہے، اور خواتین کے سینے کے اوپری حصے کو بھی کہا جاتا ہے، جو ہار پہننے سمیت سنگار کرنے کی جگہ ہے، اور اس جگہ کو بھی کہا جاتا ہے جہاں عورتیں اپنے زیور سنوارتی ہیں، پس اس سے مراد گردن نہیں ہے، کیونکہ گردن کو "عنق" یا "رقبہ" کہا جاتا ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں لٹکایا جائے گا، اس عورت کا وجود فطرت نسوانی کے برعکس سخت اور کھردری فطرت ہے، اس کے اندر نرم وملائم جذبات اور احساسات کے بجائے سخت اور مخالفانہ کیفیت پائی جاتی ہے، یعنی بطور مثال "جید" جو اس کے وجود میں زینت و آرائش کا مقام ہونا چاہیے، عورت کی فطرت محبت اور پیار ہے، مگر اس کے بجائے اس میں نفرت، کینہ پر تشدد جذبات، اور بری عادات ہیں۔

"حبل" ایک موٹی ڈور، کھجور کے درخت کی چھال سے بنی ہوئی رسی: مسد ہے، موٹی رسی، جو کھجور کے درخت کی چھال سے بنی ہوئی ہو، جس سے اس کی موٹائی اور کھردرا پن میں اضافہ ہوتا ہے، (یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھڑک اٹھے گی اور اس قید، ذلت اور عذاب کا مزہ چکھائے گی) نیز آیت مبارکہ میں لفظ "مسد" سے مقصود ابو لہب اور اس کی بیوی اور ان لوگوں کی تذلیل کرنا، ان کی بے قدری، تحقیر اور انہیں غصہ دلانا ہے، نبی خاتم کو تکلیف پہنچانے اور کتاب مقدس کے احکام کی نافرمانی اور خدا کے دین کے خالص حدود اور دائرے کی توہین کی وجہ سے ہر دور اور ہر زمانے میں۔

کیا واقعی ابو لہب کے ہاتھ کاٹے گئے تھے؟

اس سورت کی پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ: "تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ" ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور (ابو لہب) پر موت واقع ہو، آیت مبارکہ کا کیا مطلب ہے؟ کیا واقعی اس کے ہاتھ کاٹے گئے تھے یا نہیں؟ امام بخاری اور متعدد محدثین ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں: انہوں نے کہا: "لَمَّا نَزَلَتْ

هَذِهِ الْآيَةُ: وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ "یعنی جب (سورہ شعراء کے آیت: ۲۱۴) "وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" (اے پیغمبر: اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا) نازل ہوئی، تو رسول اللہ ﷺ اپنے گھر سے باہر نکل کر صفا پہاڑ پر چڑھ گئے، پھر انہوں نے اونچی آواز میں پکارا: صباحا! ("عرب یہ جملہ اس وقت کہتے تھے جب ان پر کوئی دشمن اچانک حملہ آور ہوتا، تاکہ سب باخبر ہو کر معاملے کے لیے تیار ہوجائیں) جب قریش نے یہ پکار سنی تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے یہ کس کی پکار ہے؟ جواب دیا گیا کہ محمد ہے، چنانچہ انہوں نے پکار کا جواب دیا اور آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہو گئے، پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے خطاب فرمایا: اے بنی فلاں! اے بنی فلاں! اے بنی فلاں! اے بنی عبد مناف! اے بنی عبد المطلب! (اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپ ﷺ نے آواز دی) پھر سب لوگ ہمہ گوش ہو کر سننے لگے کہ محمد ﷺ اس قدر کونسی اہمیت والی بات کرنے لگے ہیں کہ سب کو بلایا ہے، اس کے بعد: حضور ﷺ نے فرمایا: بھلا بتاؤ تو اگر میں تم کو اطلاع دوں کہ کچھ سوار اس پہاڑ کے دامن سے برآمد ہو رہے ہیں جو تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہم نے تجربہ میں آپ کی کوئی بات چھوٹی نہیں پائی، فرمایا تو میں عذاب شدید آنے سے پہلے تم کو اس سے ڈرا رہا ہوں کہ عذاب شدید میرے سامنے ہے، ابو لہب بولا تجھے ہلاکت ہو، کیا اسی لیے تو نے ہم کو اکٹھا کیا تھا تو یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا اس پر اسی دن "تَبَّتْ يُدَا أَيْ لَهَبٍ وَتَبَّ" نازل ہوئی۔

کیا ابو لہب جہنمی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کفار اور مشرکین دوزخ میں داخل ہوں گے، اور یہ قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بعض لوگوں کے جہنم میں ہونے کی اطلاع دی ہے، جن میں سے موسیٰ کے زمانے کا فرعون بھی ہے۔

رب عظیم سورہ ہود (آیت: ۹۸) میں فرماتے ہیں: "يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوَرْدُ الْمَوْرُودُ" ترجمہ: "وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا (جیسا کہ ان کو گمراہی کی طرف لے جاتا تھا) اور ان کو دوزخ میں جا اتارے گا، اور جس مقام پر وہ اتارے جائیں گے وہ بہت برا ہے"

اور ان میں سے نوح اور لوط کی بیویاں بھی تھیں: "صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا اِمْرَاةَ نُوحٍ وَامْرَاةَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يَغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ" (سورة التحريم آیت: ۱۰) ترجمہ: "خدا نے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے، وہ ہمارے بندوں میں سے دونیک بندوں کے نکاح میں تھیں، انہوں نے ان دونوں کی خیانت کی، تو وہ اللہ سے (بچانے میں) ان کے کچھ کام نہ آئے (کہ انہیں دنیوی اور آخرت کی کمر توڑ اور جلانے والے سے عذاب بچائیں) اور کہہ دیا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔"

اہل دوزخ میں سے ایک ابو لہب اور اس کی بیوی بھی ہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل (سورہ مسد: ۵-۱) میں ہے اسی طرح ان افراد میں سے ایک عمرو بن عامر خزاعی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے دوزخ میں اس حالت میں دیکھا کہ اس کی آنتیں نکلی ہوئی تھیں۔

(یہ روایت صحیح ہے، بخاری اور مسلم نے اس کو روایت کیا ہے) ان اشخاص میں سے ایک عمار بن یاسر کا قاتل ہے، معجم طبرانی میں عمرو بن عاص اور ان کے بیٹے سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قاتل عمار و سالبہ فی النار" (صحیح الجامع: ۴/۱۱۰ شمارہ: ۴۱۷)

قیامت اور ان سے سوالات و جوابات کا موضوع

اس بارے میں کہ کیا قیامت کے دن کافروں سے سوال و جواب ہوگا، علماء کے مختلف نظریات ہیں: شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: امام احمدؒ کے پیروکاروں میں سے متاخرین کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، وہ جو کفار کے محاسبہ پر یقین نہیں رکھتے جیسے: ابوبکر عبدالعزیز، ابو الحسن تیمی، قاضی ابو یعلیٰ وغیرہ، جبکہ دوسرا گروہ جو کافروں کے حساب و کتاب پر یقین رکھتا ہے، جیسے: ابو حفص بر مکی، ابو سلیمان دمشقی اور ابوطالب۔ (مجموع الفتاویٰ شیخ الاسلام: ۴-۳۰۵)

لیکن حق یہ ہے کافروں کا محاسبہ ہوگا، اور ان کے اعمال تو لے جائیں گے، درج ذیل آیات اس دعوے کی سچائی کا ثبوت ہیں:

خدا عزوجل "سورة القصص: ۶۲" میں فرماتے ہیں: "وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ اَيْنَ

شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝۲۲" ترجمہ: "اس دن (کو یاد کرو) جب خدا انہیں پکارے گا، اور ان سے کہے گا: وہ شریک کہاں ہے جو تم نے میرے لیے سوچے تھے؟" اے مشرکوا! اب جب کہ حجاب اور پردے ہٹ چکے ہیں، حساب و کتاب اور بے بسی کا وقت ہے تو بتاؤ ان بتوں، انسانوں اور جن کو تم معبود سمجھتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے کہ اگر تمہیں عقاب اور خالق کی سزا سے بچائیں۔

"وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ۝۲۵" (سورة القصص: ۶۵) ترجمہ: "اس دن کو یاد کرو جب خدا تعالیٰ مشرکوں سے کہے گا! کہ تم نے انبیاء کو جواب دیا؟"۔

"فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَا أَذْرَكَ مَا هِيَ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۰" (سورة القارعة: ۱۱-۷) ترجمہ: "تو لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے، تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا، اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے، اس کی جائے قرار گھری ہاویہ ہوگی، اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟، ایک بھڑکتی ہوئی آگ۔"

"وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ۝۱۰۳* تَلْفَحُ وُجُوهُهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ۝۱۰۴* أَلَمْ تَكُنْ أَتَىٰ تُثَلَّىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝۱۰۵" (سورة المؤمنون: ۱۰۵-۱۰۳)

ترجمہ: "اور وہ شخص جس کے (دنیوی اعمال و اقوال) پلڑے ہلکے ہو گئے، یہی لوگ ہیں (جنہوں نے) اپنی عمر ضائع کی) اپنی جانوں کا نقصان کیا، جہنم ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، ان کے چہروں کو آگ جھلسائے گی اور وہ اس میں تیوری چڑھانے والے ہوں گے (اللہ ان سے فرمائے گا) کیا میری آیتیں تم پر پڑھی نہ جاتی تھیں، تو تم انہیں جھٹلایا کرتے تھے؟۔"

سوال یہ ہے کہ کفار کا کیوں حساب و کتاب ہوگا، جبکہ ان کے اعمال تو ضائع ہو چکے ہیں اور باطل ہیں؟ اس سوال کے مندرجہ ذیل متعدد جوابات دیے گئے ہیں۔

1۔ ان کے خلاف ثبوت پیش کرنا اور ان کے بارے میں عدل الہی کا اعلان کرنا، خدا تعالیٰ دوسروں سے زیادہ عذر قبول کرتا ہے، اور عادل

مطلق ہے، اس بنا پر وہ کفار سے سوال کرے گا اور ان سے حساب لے گا، اور ان کو ان صحائف اور دستاویزات جن میں ان کے اعمال محفوظ ہیں کے بارے میں بتائے گا، اور ترازو کو ان کے گناہوں کی کثرت اور برے اعمال کے مطابق ظاہر فرمائے گا۔

"وَنَضْعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۚ وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۚ وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ" ترجمہ: "اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف کے ہوں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا، اور اگر رائی کے ایک دانہ کے برابر عمل ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔"

"وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يُؤْتِلَتْنَا مَالٌ هَذَا الْكِتَابُ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا" ترجمہ: "اور کتاب (ہر کسی کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں) رکھی جائے گی، (اور مؤمن جو کچھ اس میں ہے خوش ہوں گے) پس تو مجرموں کو (کفر اختیار کرنے والے) دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے، جو اس میں ہوگا اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی، مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے، اور انہوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

امام قرطبی فرماتے ہیں: کہ خدا دنیا اور آخرت میں مخلوق کا حساب و کتاب کرے گا تاکہ حجت کی تکمیل اور حکمت کا اظہار ہو (تذکرہ: ۲۴۵)۔

2- خدا جل جلالہ ان کو سرزش کرنے اور سزا دینے کے لیے ان کا حساب کرے گا، حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: محاسبہ کا مقصد کفار کے اعمال کو ظاہر کرنا اور ان اعمال کی بنا پر ان کی سرزش کرنا ہے، اور دوسرا مقصد برائی کے مقابلے میں اچھائی کا توازن رکھنا ہے، اگر خدا تعالیٰ کا مقصد پہلا معنی ہے تو یقیناً وہ لوگ ان اعمال کی وجہ سے قابل محاسبہ ہوں گے، اور اگر دوسرا معنی مراد لیا جائے، اور حساب کا مقصد یہ ہو کہ کیا کفار کے پاس کوئی نیک اعمال ہیں جس کی بنا پر وہ جنت کے مستحق بنیں تو یہ صریح گمراہی ہے (مجموعہ فتاویٰ: ۳/۳۵)

اس تنبیہ اور سرزنش کا تذکرہ بہت سی نصوص میں کیا گیا ہے:

"وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبَّنَا قَالَ فَذُقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ" (سورة الانعام: ۳۰) ترجمہ: "اور کاش تم (ان کو اس وقت) دیکھو جب یہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اور وہ فرمائے گا کیا یہ (دوبارہ زندہ ہونا) برحق نہیں تو کہیں گے کیوں نہیں پروردگار کی قسم! (بلکل برحق ہے) خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب کے مزے چکھو۔"

"يَا مَعْشَرَ الْإِنسِ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يْقُصُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ أَنْفُسِنَا وَغَرَّبْنَاهُمْ حَيَاةَ الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ" (سورة الانعام: ۱۳۰) ترجمہ: "(اس دن خدا ان سے کہے گا) اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے پاس تم میں سے کوئی رسول نہیں آئے، جو تم پر میری آیات بیان کرتے ہوں اور تمہیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ وہ کہیں گے ہم خود پر گواہی دیتے ہیں اور انہیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ خود پر گواہی دیں گے کہ یقیناً وہ کافر تھے۔"

"وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ وَقِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ" (سورة الشعراء: ۹۱-۹۲) ترجمہ: "اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے ظاہر کردی جائے گی، اور ان سے پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے۔"

"وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ" (سورة القصص: ۷۴) ترجمہ: "پھر ان سے کہا جائے گا کہ پکارو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو، یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے، اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے، کاش یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے" (کہ آج ایسے عذاب میں گرفتار نہ ہوتے)۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ: اگرچہ کفار کے نیک اعمال کی ان کے کفر کی وجہ سے کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن لوگوں کی نظروں میں ان کی رسوائی اور بدبختی ظاہر کرنے کے لیے ان کے اعمال کا وزن

کیا جائے گا، (النهاية، ابن کثیر: ۲/۳۰)

3- کافر شریعت کے فروعات کے پابند ہیں، جیسا کہ وہ شریعت کے اصولوں کے بھی پابند ہیں، اس لیے ان سے ان کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

قرطبی کہتے ہیں کہ: کفار شریعت کے فروعات کے مکلف ہیں، اور شریعت کے فروعات کے بارے میں ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی، فروعات میں کوتاہی کی صورت میں ان کو سزا دی جائے گی۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَوَيْلٌ لِلْمُشْرِكِينَ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ" (سورہ فصلت آیت ۶-۷) ترجمہ: "تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے، جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔"

اور خدا تعالیٰ مجرموں کے بارے میں فرماتے ہیں: "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيِّينَ * وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ" (سورہ المدثر: ۴۶-۴۲)

ترجمہ: "تمہیں کس چیز نے دوزخ میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے، اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے، بلکہ ہم بے مقصد بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر صرف باتیں کیا کرتے تھے، اور ہم جزا کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے۔"

4- کافر اپنے کفر اور گناہوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے گناہوں کی حد کے مطابق جہنم میں جائے گا اور جہنم کی آگ کے بھی مختلف درجے ہیں، جس طرح جنت کے مختلف درجات ہیں، اگر کسی کے کفر اور گمراہی کی شدت زیادہ ہو، اس کا عذاب بھی اسی مقدار کے مطابق زیادہ ہوگا، یہاں تک کہ بعض کافر بھی جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے، اور منافقین بھی اسی گروہ میں سے ہیں: "إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" (سورہ النساء: ۱۴۵) ترجمہ: "بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں: کم برائیوں والوں کے عذاب سے زیادہ برائیوں والوں کا عذاب زیادہ ہوگا، کفار میں سے جس کی بھی نیکیاں

اور حسنت ہوں گی عذاب کی شدت سے کم کی جائے گی، جیسا کہ ابوطالب کا عذاب ابو لہب کے عذاب سے کم اور ہلکا ہے، اس لیے کافروں کا حساب ان کے عذاب کے درجات کے اظہار کے لیے ہے، نہ کہ جنت میں جانے کے لیے، (شیخ الاسلام: ۴/۳۵)۔

امام قرطبی کفار کے اعمال کے بارے میں دو باتیں کہتے ہیں: پہلے تو کفر اور ان کے گناہوں کو ترازو کے ایک پلڑے رکھا جائے گا، کفار کے پاس نیکیاں نہیں ہوتیں کہ دوسرے پلڑے میں تولی جائیں، اسی لیے نیکیوں کا پیمانہ خالی ہونے کی وجہ سے برائیوں کا پیمانہ بھاری پڑ جائے گا۔

پھر نیک اعمال مثلاً: صلہ رحمی، صدقہ، دوسرے کا غم رکھنے والا، ہمدردی لوگوں کے ساتھ جو اچھا سلوک کرتے ہیں، اچھائیوں اور نیکیوں کے پلڑے میں رکھا جائے گا، لیکن برائیوں کا پلڑا بھاری ہونے کی وجہ سے جھک جائے گا۔ (تذکرہ: ۳۱۴)

پہلا نکتہ صحیح ہے، کیونکہ کافر کے اچھے اور معروف اعمال شرک اور کفر کی وجہ سے ضائع ہو چکے ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی کوئی قدر نہیں کی جائے گی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ" (سورہ الزمر: ۴۰) ترجمہ: "اگر تو نے شرک کیا تو یقیناً تیرا عمل ضائع ہو جائے گا"۔

"وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" (سورہ البقرہ ۲۱۷) ترجمہ: "اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے، پھر اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہو تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی لوگ ہیں آگ والے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں"۔

حدیث میں آیا ہے کہ: "إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ خَالِصًا وَابْتَغَىٰ بِهِ وَجْهَهُ" ترجمہ: "بیشک اللہ تعالیٰ کوئی عمل نہیں قبول کرتا جب تک کہ وہ خالصاً اللہ کی رضا کے لیے نہ ہو" شرک اور ریا سے پاک ہو، (نسائی باب چہارم، از ابی امامہ...)۔

صحیح روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کافر دنیا میں اپنے نیک عمل

سے فائدہ اٹھائے گا، اور قیامت کو اس حال میں آئے گا کہ اس کا کوئی نیک عمل نہیں بچا ہوگا۔"

صحیح مسلم اور مسند احمد میں آیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مُؤْمِنًا حَسَنَةً، يَعْطِي بِهَا فِي الدُّنْيَا (وفی روایۃ یثاب علیہا الرزق فی الدنیا) ویجزی بہا فی الآخرة، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِهَا بِحَسَنَاتٍ مَا عَمِلَ بِهَا اللَّهُ فِي الدُّنْيَا، حَتَّى إِذَا أَفْضَى إِلَى الْآخِرَةِ لَمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَةٌ يَجْزِي بِهَا" (سلسلة الصحيحة: ۸۶-۱ نمبر ۵۳) ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کسی مؤمن پر اسکی نیکیوں کے بارے میں ظلم نہیں کرتا، مؤمن اپنے اعمال کا بدلہ دنیا اور آخرت میں دیکھے گا، لیکن کافر کو اس کے تمام اعمال کا اجر اس دنیا میں ملے گا، اور جب وہ دوسرے جہاں میں جائے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی۔"

ان آیات اور احادیث کی توجیہ جو کفار سے سوال و جواب نہ کرنے کی بارے میں ہیں

اگر کہا جائے کہ: گذشتہ بحثوں کے مطابق یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کفار سے سوال و جواب کیا جائے گا، اور اگر ایسا ہے تو اس کے مخالف جو نصوص ہیں ان کی کیا توجیہ پیش کریں گے؟ ان میں سے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَا يَسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ" (سورہ قصص: ۷۸) ترجمہ: "اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔"

"فَيَوْمَئِذٍ لَا يَسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ" (سورہ الرحمن: ۳۹) ترجمہ: "پھر اس دن نہ کسی انسان سے اس کے گناہ کے متعلق پوچھا جائے گا اور نہ کسی جن سے" (کیونکہ وہ وقت دنیا کو فنا کرنے کا وقت ہوگا نہ کہ پوچھ گچھ کا)۔

"هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ * وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ" (المرسلات: ۳۵-۳۶) ترجمہ: "آج کا دن، ایسا دن ہے (خدا کی آیات کو جھٹلانے والے بات نہیں کریں گے) کہ وہ نہیں بولیں گے، (کیونکہ اللہ نے ان کے منہ پر مہر سکوت لگایا ہوا ہے) اور نہ انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ عذر کریں۔"

اس طرح کے بہت سارے نصوص: یہ بات قابل ذکر ہے کہ پچھلے نصوص اور ان نصوص میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے، علماء نے ان دو

طرح کے نصوص میں تطبیق و توفیق کے مختلف طریقے بتائے ہیں: اول: کافروں سے شفاء سکون اور راحت کے لیے پوچھ گچھ نہیں ہوگی، بلکہ ان کی سرزش اور سزا کے لیے پوچھ گچھ ہوگی، مثلاً سوال جیسے: تم نے ایسا ویسا کیوں کیا؟ بات کرنے اور معافی مانگنے کے بارے میں بھی نہیں ہے یعنی خدا تعالیٰ ان سے حسن سلوک نہیں کرے گا، بلکہ ان سخت الفاظ میں غصے میں ان سے پوچھے گا (تذکرہ: ۲۸۶)

دوئم: یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے استفہامی انداز میں سوال نہیں کرے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے باخبر اور جاننے والا ہے، استفہام کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ کفار سے سوال تصدیقی اور تقریری ہوگا، مثلاً: ان سے پوچھا جائے گا کہ ایسا کیوں کیا؟ (تذکرہ: ۲۷۸)۔

حسن بصری اور قتادہ کہتے ہیں: کفار سے ان کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو جانتا ہے، اور فرشتوں نے انہیں لکھا ہے، (لوامع الانوار البہیة: ۱۷۴/۲)۔

سوم: یہ کہ کفار سے قیامت کے بعض مواقع پر پوچھ گچھ ہوگی، قرطبی کہتے ہیں کہ: قیامت کے کئی مراحل اور صورتیں ہیں بعض مراحل میں کافروں سے حساب لیا جائے گا، اور بعض مراحل میں نہیں۔

سفارینی: عکرمہ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں: قیامت کے دن لوگوں کو بہت سے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا، اسی بنا پر امام احمدؒ قرآن کے نصوص کے جوابات کے سلسلے میں کہتے ہیں: سب سے پہلے جب لوگوں کو زندہ کیا جائے گا تو وہ ساٹھ (۶۰) سال تک نہ بولیں گے اور معذرت کرنے کی اجازت ہوگی تاکہ وہ معافی مانگ سکیں: "رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ" (سورہ السجدہ: ۱۲) ترجمہ: "اے ہمارے رب! (ہم نے دیکھ لیا،) جس چیز سے ہم نے خود کو اندھا کر لیا تھا، اور ہم نے سن لیا (جس سے ہم نے خود کو بہرا بنا لیا تھا اب ہمیں پچھتاوا ہے)، پس ہمیں واپس بھیج (دنیا میں) کہ ہم نیک عمل کریں (اور کامیابی کے ساتھ تیرے کے سامنے پیش ہوں) بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں (قیامت اور تیرے پیغمبروں کے کہنے پر)۔"

اور جب انہیں بولنے کی اجازت دی جائے گی تو وہ کشمکش میں پڑیں گے، "ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ" (سورہ الزمر: ۳۱) ترجمہ: پھر تم

قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھگڑو گے " اور اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا، اور ہر کسی کا حق اس کے ہتھیلی میں رکھے گا، یعنی: جب نا انصافی اور ظلم کا حساب لگے گا اور پیش کریں گے تو وہ لڑیں گے اور جھگڑیں گے: پھر ان سے کہا جائے گا: "قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَىٰ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُم بِالْوَعِيدِ" (سورہ ق: ۲۸) ترجمہ: "اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے پاس جھگڑا مت کرو، حالانکہ میں نے تو تمہاری طرف ڈرانے والا پیغام پہلے بھیج دیا تھا۔"

چہارم: قرطبی اس آیت سے متعلق کہتے ہیں: "وَلَا يَسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ" (سورة القصص: ۷۸)

ترجمہ: "اور مجرموں سے ان کے گناہوں (تحقیق و ترحیم) کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا" (بلکہ ان سے تذلیل اور تحقیر کا سوال ہوگا) بیان کرتا ہے کہ: یہ سوال مؤمنوں کو کافروں سے الگ کرنے کے لیے کیا جائے گا، یعنی قیامت کے دن فرشتوں کو کافروں سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ: تمہارا دین کیا ہے؟ اور تم نے دنیا میں کیا کیا ہے؟ کیونکہ مؤمنوں کے چہرے تازہ اور سینے کھلے ہوئے ہوں گے، اور کافروں کے چہرے اداس اور سیاہ ہوں گے، اور فرشتے ان کے چہروں کے خدوخال سے پہچان لیں گے، اس لیے جب فرشتوں کو یہ ذمہ داری سونپی جائے گی کہ کافروں کو جہنم کی طرف لے جائیں، تو ان کے ظاہری علامتیں اور آثار ان کے پہچاننے کے لیے کافی ہوں گی، مزید تعارف کی ضرورت نہیں ہوگی، (تذکرہ: ۲۸۷)۔

پیغمبر اسلام کی بیٹیوں کا ابو لہب کے بیٹوں سے نکاح

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دو بیٹیوں کا نکاح ابو لہب کے بیٹوں سے کیوں کروایا، جبکہ وہ مسلمان نہیں تھے، سب سے پہلے تو یہ جاننا کہ: نبی ﷺ کی بیٹیاں یہ ہیں: "زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ"، "زینب" کا نکاح رسول اللہ ﷺ نے "ابی عاص" سے کرادیا تھا، جب مشرکین سے شادی کرنا منع قرار پایا، تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے مشرک شوہر سے الگ کر دیا، جب بعد میں ابی عاص مسلمان ہو گیا تو نبی ﷺ نے زینب کو واپس کر دیا "رقیہ" کو پیغمبر ﷺ نے "عتبہ بن ابی لہب" کے نکاح میں دے دیا، "ام کلثوم جو رقیہ کی چھوٹی بہن ہے، پیغمبر ﷺ نے اسے عقیبہ بن ابی لہب کے نکاح میں دے دیا، فاطمہ زہراء "نبی کریم ﷺ نے "علی ابن ابی طالب"

کے نکاح میں دی، جو نبی کریم ﷺ کی وفات کے چھ (۶) ماہ بعد وفات پاگئیں۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے سورہ "المسد" یعنی: "تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ" نازل فرمائی تو ابو لہب اور اس کی بیوی "ام جمیل" جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کہا ہے، یعنی: ایندھن اکھٹے کرنے والی کا لقب دیا تو غصے میں آگئی اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ نبی کریم ﷺ کے بیٹیوں کو طلاق دیں، اور ابو لہب نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرا سر تم دونوں کے سروں پر حرام ہو اگر تم دونوں محمد ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق نہیں دوگے، تو اس کے بیٹوں نے نبی کریم ﷺ کے بیٹیوں کو طلاق دیدی، اور یہ طلاق نکاح کے تھوڑے عرصے بعد ہوئی تھی، اور ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی صرف نکاح ہوا تھا، (کتاب: الا ستعیاب فی معرفتہ الاصحاب صفحہ: ۵۹۳)۔

اس کے بعد حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں رقیہ سے شادی کرکے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، اور حبشہ میں ان کا بیٹا ہوا جس کا نام: "عبداللہ" رکھا اس تاریخ کے بعد حضرت عثمان کی کنیت: ابو عبداللہ ہوئی۔

اور غزوہ بدر میں چونکہ رقیہ کو "حصبہ" خسرہ کی بیماری لگ گئی تھی (جو آلودہ پھل، سبزی اور پانی کھانے پینے سے لگتی ہے) اور حضرت عثمان کی جہاد میں شرکت کرنے کی نیت تھی آپ ﷺ نے حکم دیا اپنے بیوی "رقیہ" کے پاس رہے لیکن بالآخر اس بیماری کی وجہ سے رقیہ وفات پاگئیں۔

پھر نبی ﷺ نے اپنی صاحبزادی "ام کلثوم" کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کردیا، یہ نکاح ہجری کے تیسرے سال ماہ ربیع الاول میں ہوا تھا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، یہاں تک کہ نو (۹) ہجری کو وفات پاگئیں، چونکہ حضرت عثمانؓ نے نبی کریم ﷺ کے دو بیٹیوں سے نکاح کیا تھا اس لیے ان کو "ذوالنورین" یعنی "دو نور والے" کا لقب ملا۔

لیکن اس مسئلے کے بارے میں کہ ابو لہب کے بیٹوں نے جو اللہ کا دشمن تھا پیغمبر کے بیٹیوں سے جو کہ اللہ کا رسول تھا شادی کیوں کی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتداء اسلام میں ایک مسلمان کی شادی کافر سے

جائز تھی ابھی منع نہیں ہوئی تھی، اس کی نہی بعد میں نازل ہوئی تھی کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَأَمْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَآتُوهُنَّ مَا أَنْفَقُوا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكُوفِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَ أَلَا مَا أَنْفَقُوا ذَلِكَمُ حُكْمُ اللَّهِ بِكُمْ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ" (سورہ المتحنتہ: ۱۰)

ترجمہ:

اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں نے اپنے کافر بیویوں کو طلاق دی اور کافر عورتوں سے نکاح کرنا بھی منع قرار پایا، کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَ" (سورۃ البقرہ: ۲۲۱)

ترجمہ:

سوائے یہودی اور عیسائی عورتوں کے، جنہیں اس آیت کے نزول کے بعد نکاح کی اجازت دی گئی: "الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ مُحْصِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَحْدَانٍ وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" (سورۃ المائدہ: ۵)

ترجمہ:

اس لیے مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ

- 1 - اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان کا کافر سے نکاح جائز تھا۔
- 2 - پیغمبر ﷺ کی بیٹیوں کا نکاح اللہ کے دشمن ابولہب کے بیٹوں سے اسلام کے ابتدائی ایام میں ہوا تھا کہ اس وقت تک جائز تھا۔
- 3 - جب نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت کا علی اعلان اظہار فرمایا تو ابولہب غصے میں آگیا اس نے اور اس کی بیوی نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق دیں۔

4 - طلاق ہمبستری سے پہلے تھی، اور یہ خدا کی طرف سے اپنے نبی کو دیا گیا ایک اور اعزاز تھا کہ ان کی بیٹیوں کو کنواری حالت میں ابو لہب کے بیٹوں کے نکاح سے خارج کر دیا۔

5 - صدر اسلام میں مسلمان کا کافر سے نکاح ایک عام مسئلہ تھا، لیکن بعد میں سوائے اہل کتاب کی عورتوں کے ممنوع قرار دیا گیا۔

ابو لہب کون ہے؟

ابو لہب کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ: ابو لہب کا تعلق بعثت سے پہلے تک نبی کریم ﷺ سے معمول کے مطابق اور اچھا تھا، لیکن آپ ﷺ کی بعثت کے بعد اور اسلام کے آغاز میں وہ اس دشمنی سے مشہور ہو گیا، کیونکہ ایک طرف تو بنی ہاشم پر ان کے بھائی کی قیادت عبدالمطلب کے بعد جس نے سنجیدگی سے پیغمبر کی حمایت بھی کی تھی، اسے مہنگی پڑی، دوسری طرف آباء و اجداد کے دین میں تعصب پیغمبر ﷺ کا سخت ترین دشمنوں میں سے بننے کا سبب بنا۔

جب پیغمبر ﷺ نے خدا کے حکم سے اپنے رشتہ داروں میں دعوت کا آغاز کیا، تب سے ابو لہب نے اپنی دشمنی کی بنیاد رکھ لی اور نبی کریم ﷺ کا مذاق اڑانا شروع کیا، اور کہا کہ اپنے آباء و اجداد کے دین کی حفاظت کے لیے مجھے محمد ﷺ کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے۔

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ: ایک دن ذوالعجاز کے بازار میں (مکہ کے بازاروں میں سے ہے) ہم نے ایک نوجوان کو دیکھا کہہ رہا تھا: "ایہا الناس! قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" اور ایک آدمی نے اس کے پیچھے اس کے ٹانگ پر پتھر مار کر زخمی کر دیا تھا، اور کہتا تھا: "ایہا الناس! اِنَّہ کذاب" اے لوگو! یہ جھوٹا ہے، اس کی بات پر یقین نہ کرو، میں نے پوچھا: یہ شخص کون ہے؟ لوگوں نے کہا: محمد (ﷺ) جو خود کو نبی کہتا ہے، اور یہ اس کا چچا ابو لہب ہے جو اسے جھٹلاتا ہے۔

سخت ہلاکت

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد ابو لہب (عذبہ) بیماری کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکا، لیکن اپنی جگہ رسول خدا کے ایک اور دشمن "عاص بن ہشام بن

مغیرہ کو" بھیجا، چونکہ اس کی بیماری متعدی تھی، لوگ اسے طاعون کی طرح سمجھتے تھے، اس لیے جب وہ بیمار ہوا تو اس کی عبادت میں جانے کی جرات نہیں کرتے تھے کہ کہیں یہ بیماری ان کو نہ لگ جائے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ: اس بیماری کے پھلنے کے خوف کی وجہ سے اس کے اپنے گھر والوں نے اسے بیماری اور موت سے نمٹنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا، ابو لہب کی موت کے بعد اس کی لاش تین رات تک گھر میں پڑی رہی، اس کے بیٹے بھی اس کی لاش کے قریب جانے سے ڈرتے تھے، اس کے جسم کی بدبو اور تعفن لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور علاقے کی ہوا میں مل رہی تھی، آخر قریش کا ایک شخص ابو لہب کے بیٹوں کے پاس آیا اور ان سے کہا: تمہیں شرم نہیں آتی، کیوں اپنے باپ کی لاش نہیں اٹھاتے؟ اس کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

انہوں نے کہا: ہمیں ڈر ہے کہ ہمیں بھی یہ مرض لاحق نہ ہو جائے: اس نے کہا میں تمہاری مدد کرونگا۔

ایک روایت کے مطابق اس کے بچوں نے چند حبشیوں کو کچھ رقم دی اور ابو لہب کی لاش کو گھسیٹ کر اس کے گھر کے باہر لے گئے، اور اس کے جسم پر دور سے پانی چھڑکا اس کے جسم کو ہاتھ لگائے بغیر لکڑی کے ایک تختے پر رکھا اور مکہ کے دور دراز علاقے میں لے گئے اور ایک کھائی میں اس کی لاش پھینک دی، اور اس کے جسم پر اتنی مٹی، اور پتھر ڈال دیے، کہ لاش ان پتھروں اور مٹی کے نیچے چھپ گئی۔

سبحان اللہ! خدا کے غضب کے مقابلے میں نہ دولت کام آئے گی اور نہ سرکاری عہدے، واضح رہے کہ ابو لہب کی دنیاوی اشرافیت آخرت کی رسوائی پر ختم ہوئی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ: ابو لہب کو جہاں ناکامی ہوئی اس کے علاوہ اس کے بچوں نے وہی دین قبول کیا جس کی مخالفت میں اس نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی، پہلے مرحلے میں اس کی بیٹی دُرّہ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور مسلمان ہو گئیں، پھر فتح مکہ کے (اٹھویں ہجری) دوران اس کے دو بیٹے عتبہ و معتب نامی عباس بن عبدالمطلب کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور بیعت کی۔

سورة مسد سے حاصل شدہ عبرتیں اور اسباق

- 1 - اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے جو کہ ابو لہب کی ہلاکت کے منہ میں جانے اور اس کے مکر اور چالوں کا جو حال ہوا جو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف استعمال کرتا تھا۔
 - 2 - جو بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، نزول عذاب کے وقت اس کا مال و اولاد اور مقام و عہدہ اس کو عذاب سے نہیں بچا سکتا، اگر وہ غضب الہی کے راستے پر چلتا ہو، اور اللہ کی خوشی اور رضا کا سبب بننے والے کام چھوڑ دے۔
 - 3 - شرک اور کفر کی موجودگی میں رشتہ داری کا کوئی فائدہ نہیں، جیسا کہ ابو لہب آپ ﷺ کا چچا تھا، لیکن اس کا ٹھکانہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔
 - 4 - یہ سورت اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤمنوں کو ستانا حرام ہے۔
 - 5 - اس سورت میں رب کی حیران کن نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ سورت اللہ تعالیٰ نے اس وقت نازل فرمائی جب ابو لہب اور اس کی بیوی زندہ تھی، ابھی ہلاک نہیں ہوئے تھے، اور انہیں اس سخت اور درد ناک عذاب سے آگاہ کیا جو ان کا منتظر تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے، پس وہی ہوا جس کی اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی تھی، کیونکہ صرف وہی عالم ہے جو علم غیب کو جانتا ہے۔
- یاد رہے کہ ابو لہب اور اس کی بیوی مر چکے ہیں، اور ان کی ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں، لیکن ان آیات کو اسی طرح پڑھا جائیگا تاکہ ابو لہب کی طرح کے لوگوں اور اس کے پیروکاروں کے لیے عبرت کا باعث بنے اور اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب ان پر بڑھتا جائے۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30) سورة الاخلاص

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی، اس کی چار (۴) آیات ہیں

وجہ تسمیہ:

سورہ اخلاص مکہ میں سورۃ الناس کے بعد نازل ہوئی، اس کے بہت سے نام ہیں، ان تمام ناموں میں سے "اخلاص" بہت مشہور ہے، کیونکہ یہ خالص توحید اور خدا کی ذات کی تنزیہ اور تقدیس کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور یہ سورہ خالص ترین توحیدی عقائد پر مشتمل ہے، یہ مبارک سورہ انسان کو شرک اور جہنم کی آگ سے نجات دیتی ہے، اسی لیے اسے توحید اور اخلاص کی سورت کہا جاتا ہے، اسی طرح اس سورت کا "اخلاص" کے نام سے شہرت پانا اس وجہ سے ہے کہ یہ مختصر نام اس سورت کے معانی کے ساتھ بہت مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ یہ سورت لوگوں کو اللہ کی مخلصانہ عبادت کا معیار سکھاتی ہے۔

یوں کہنا چاہیے کہ الاخلاص صرف سورت کا نام نہیں، بلکہ اس سورت کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خالص توحید اور یکتا پرستی کی تعلیم ہے۔

قرآن کریم کی دیگر سورتوں میں عموماً اس میں سے کسی ایک لفظ کو اس کا نام بنایا گیا ہے، لیکن اس سورت میں کہیں بھی لفظ "اخلاص" نہیں آیا، اور اس لفظ کو معنی کے لحاظ سے اس کا نام قرار دیا گیا ہے، کہ ہر شخص اس کو سمجھے اور اس پر ایمان لائے، اور شرک سے نجات پائے۔

سورہ اخلاص کے دیگر نام

سورہ اخلاص کے دیگر نام یہ ہیں:

- 1 - سورہ "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" اس عبارت سے سورہ شروع ہونے کی وجہ سے اس نام سے جانی جاتی ہے، عام مسلمانوں کی زبان میں یہی نام استعمال ہوتا ہے۔

2 - "سورہ نجات" کیونکہ یہ سورت دنیا میں کفر سے اور آخرت میں آگ سے بچاتی ہے۔

3 - "سورہ ولایت" کیونکہ جو بھی اللہ کو وحدانیت سے پہچانتا ہے وہ اللہ کے ماننے والوں میں سے ہے، اور اللہ کے سوا کسی کو اپنا ولی نہیں بناتا۔

4 - "سورہ تفرید" اور "سورہ تجرید" کیونکہ اس سورت میں خدا کی سلبی صفات کی طرف جو کہ جلال کی صفات ہیں اشارہ ہوا ہے۔

5 - "سورہ توحید" کیونکہ خدا کی وحدانیت کا ثبوت اس سورہ میں موجود ہے۔

6 - "سورہ معرفت" اس لیے کہ اس سورت میں ان صفات الہی کا تعارف ہے کہ اللہ کی پہچان ان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

7 - "سورہ صمد" اس لفظ کے اس سورت کی دوسری آیت میں موجود ہونے کی وجہ سے جو خدا کے اسماء و صفات میں سے ہے، اس سورت نے اس نام سے شہرت پائی، خدا کی یہ صفت اس سورت کے علاوہ قرآن میں کہیں بھی نہیں آئی۔

8 - "سورہ اساس" اس سورت میں توحید الہی کی مکمل شمولیت اور اسے احاطہ کرنے کی وجہ سے جو دین کی بنیاد ہے، اور عقیدے کے ارکان اور عیسائیوں کی تثلیث، یہود اور مشرکوں کی باتوں کا رد ہے، جو اللہ کے ساتھ بتوں اور لوگوں سے مدد مانگتے ہیں، اور اولاد اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس سورت کا مشہور ترین نام وہی "اخلاص" ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ سورت اللہ کے خالص توحید کے بارے میں ہے، اور دوسری طرف یہ بندے کو شرک یا جہنم کی آگ سے نجات دلاتی ہے۔

اور یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان کی جائے کہ: توحید کفر اور ایمان کے درمیان حد ہے، اور ایمان کے عظیم قلعے میں داخل ہونا توحید کے اقرار کے بغیر ممکن نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا پہلا پیغام کلمہ توحید تھا: "قولوا لا اله الا الله تفلحو" توحید کا شعار: "لا اله الا الله" تین حروف

(الف، لام اور ها) پر مشتمل ہے، یہ ایک ایسا ذکر ہے جس کے کرنے پر ہونٹ بھی نہیں ہلتے۔

محترم قارئین:

سورہ اخلاص جیسا کہ ہم نے کہا، بنیادی طور پر یہ سورت چار آیات پر مشتمل ہے، اور اس میں ایجاز اور اعجاز کا کمال ہے، اور اللہ کی صفات جلال اور کمال کو بیان کرتی ہے، اور ان کی وضاحت کرتی ہے، اسے نقص اور عیب کی صفات سے پاک قرار دیتی ہے، پہلی آیت خدا کی وحدانیت کو ثابت کرتی ہے، اور کثرت و تعدد کی نفی کرتی ہے، وہ کہتی ہے: "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" اور دوسری آیت اللہ کے کمال اور قدرت کی تصدیق کرتی ہے، اور اس سے نا کامی اور بے بسی کی نفی کرتی ہے، "اللَّهُ الصَّمَدُ" اور تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے ازلی وجود اور بقاء کے ساتھ ساتھ اس سے اولاد اور نسل کی بھی نفی کرتی ہے، "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ" اور چوتھی آیت نے اس کی عظمت و جلال کو ثابت کیا ہے، اور اس کے ساتھ امثال، شریک اور نظیر کی نفی کی ہے، "وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ" پس یہ بات واضح ہے کہ یہ سورت خدا کے کمال اور جلال کی صفات کو ثابت کرتی ہے، اور بہترین انداز میں اسے عیوب اور نقائص سے پاک قرار دیتی ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس نے "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" پڑھی وہ ایسا ہے جیسا کہ ایک تہائی قرآن پڑھا (امام احمد اور نسائی نے اسے ابی بن کعب سے مرفوعاً روایت کیا ہے) علماء نے اس حدیث کی تشریح میں کہا ہے: چونکہ یہ سورہ علم و معرفت پر مشتمل ہے، اور علوم قرآن کی تین قسمیں ہیں: توحید، احکام اور قصص۔

چونکہ سورت توحید پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے قرآن کا ایک تہائی ہے، اور کہتے ہیں کہ: یعنی قرآن کے تیسرے حصے کا ثواب ہے، جو اسے پڑھے گا اسے تہائی قرآن کا ثواب ملے گا۔

مفسر قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سورت میں رب تعالیٰ کے ناموں میں سے دو نام ایسے ہیں، جو قرآن کی کسی دوسری سورت میں مذکور نہیں ہیں، اور وہ دو نام یہ ہیں: "احد" اور "صمد"۔

سورہ اخلاص کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد:

"سورہ اخلاص" مکی سورتوں میں سے ایک ہے، اور اس میں ایک (۱) رکوع، چار (۴) آیات، سترہ (۱۷) الفاظ، انچاس (۴۹) حروف اور دس نقطے ہیں۔

(قرآن کریم کی سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کی آراء مختلف ہیں اس بحث کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورہ اخلاص کا سورہ مسد کے ساتھ ربط و تعلق

چونکہ خدا تعالیٰ نے سورہ مسد (الہب) میں اہل توحید کے دشمنوں کی مذمت فرمائی ہے، جبکہ سورہ اخلاص میں توحید بیان کی۔

سورہ اخلاص کا خلاصہ

اس مبارک سورہ کے نزول کے بارے میں جو روایات بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ خدا اور دین کے بارے میں کس قسم کے عقائد اور نظریات رکھتے تھے۔

مشرک بت پرست لکڑی، پتھر، سونے، چاندی اور دیگر مختلف چیزوں سے بنے خداؤں کی عبادت کرتے تھے، جن کی شکل و صورت اور جسم تھا، ان میں نر اور مادہ خداؤں کی ایک نسل تھی، ان کے عقیدے کے مطابق تمام مرد خداؤں کی بیویاں تھیں، اور تمام خواتین خداؤں کے مرد شوہر تھے، اسی طرح سے اس خرافی عقیدے کے مطابق ان خداؤں کو کھانے پینے کی ضرورت بھی تھی، جو ان کے پرستار انہیں فراہم کرتے تھے، مشرکین کے بیشتر کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا ایک انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ان کے پاس جو بت تھے وہ ان کے خیال میں خدا کے مظہر تھے، اگرچہ عیسائیوں نے توحید پرست ہونے کا دعویٰ کیا تھا، لیکن ان کے خدا کا کم از کم ایک بیٹا تھا، اور روح القدس کو بھی باپ اور بیٹے کی خدائی میں شریک ہونے کا اعزاز حاصل تھا، ان کے خیال میں حتیٰ کہ خدا کی ماں اور ساس بھی تھی، یہودیوں کا بھی دعویٰ تھا کہ وہ صرف ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں، لیکن ان کا خدا مادیت اور انسانی خصوصیات سے خالی نہیں تھا، وہ چلتا تھا، انسانی شکل میں نمودار ہوتا تھا، اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ کشتی لڑتا تھا، اور اس کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام عزیر تھا۔

اس کے علاوہ مجوسیوں کا مذہبی گروہ آگ کا پرستار تھا، جبکہ صابی ستارہ پرست تھے، ایسے میں جب لوگوں کو ایک ہی خدا کی عبادت اور بندگی کے لیے بلایا گیا جس کا کوئی شریک نہیں ہے، تو ان کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہوئے، کہ ان خداؤں کو چھوڑ کر صرف اس کی عبادت کرو، یہ کیسا خدا ہے؟ ان سوالات کا پیدا ہونا ایک فطری اور لازمی امر تھا، یہ قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ جس نے ان تمام سوالوں کے جوابات چند الفاظ میں دئیے، خدا کے وجود کا اتنا واضح تصور پیش کیا کہ تمام مشرکانہ تصورات کو جڑ سے اکھاڑ دیا، اور انسانی صفات میں سے کسی صفت کا خدا کی ذات سے آلودہ ہونے کا امکان باقی نہیں چھوڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اس سورہ کے اعجاز اور اس کے خوبصورت الفاظ پر توجہ دیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اس سورت کے چار مختصر اور خوبصورت آیات میں توحید اور توحید کے بنیادی اصولوں کا اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کی تمام وسیع جہتیں گہرائی تک شامل ہے۔

توحید میں اخلاص، خوبصورتی، زیب و زینت، آرائش اور معبودوں کی پرستش ہر قسم کے شرک سے اس کی وضاحت کرتی ہے۔

اگر کوئی چاہتا ہے کہ اللہ پر ایمان اور اس پر یقین کو مختصر ترین اور خوبصورت الفاظ میں بیان کرے اور توحید کے تمام گہرے اور قطعی جہتوں کا چند مختصر اور واضح جملوں میں اظہار کرے، تو اسے چاہیے کہ اس سورت کی تلاوت کرے، اس سورت میں قرآن مجید کا ایک تہائی حصہ توحید اور توحید کی وضاحت کے لیے مختص ہے۔

قرآن کریم میں جو بھی مضامین اس موضوع کے بارے میں بیان کیے گئے ہیں، اس سورت کے مختصر الفاظ اور آیات میں اسے مکمل سمویا گیا ہے۔

مجموعی طور پر سورہ اخلاص کا مواد خدا کی پانچ صفات پر مرکوز ہے:

(۱) خدا تعالیٰ ایک ہی ہے، (۲) صمد ہے، (۳) نہ کسی سے پیدا ہوا (۴) اور نہ کوئی اس سے پیدا ہوا، (۵) نہ اس کا کوئی برابر یا شریک ہے، یعنی: خدا معبودوں میں سے ایک نہیں، بلکہ اکیلا معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس کی الوہیت اور ربوبیت میں کسی کو شریک نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ صمد ہے نیاز اور

خود کفیل ہے، وہ کسی بھی چیز میں کسی دوسرے کا محتاج اور ضرورت مند نہیں ہے۔

کوئی بھی خیال جو عیب، کمی، خامی ضرورت اور کمزوری کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے وہ غلط اور ناقص خیال ہے، اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے کامل ہے، خدا خالق ہے اسے مخلوق سے تشبیہ مت دیں، مخلوق کو اپنی نسل کی بقا کے لیے "جننے" کی ضرورت ہے، اگر نہیں جنتا تو فنا ہو جائے گا، مخلوق کو دوسرے نے پیدا کیا ہے، دوسرے سے جنتا گیا ہے، اس کے وجود کو ایک خالق کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس نقطہ نظر سے نہ سوچو کہ مخلوق نے تمہیں القا کیا ہے، ایسا نہ ہو کہ تمہاری سوچ اس معیار پر مبنی ہو جو مخلوق پر لاگو ہوتے ہیں، کسی سے جنتا اور کسی کو جنتا یہ مخلوق کی خصوصیات میں سے ہیں۔

مخلوق اپنی بقا کے لیے ان خصوصیات کے محتاج ہیں، اللہ محتاج نہیں ہے، یہ بھی ایک صحیح تصور ہے اللہ کے بارے میں۔

سورہ اخلاص کا سبب نزول (شان نزول)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ خیر کے یہودیوں کے چند لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ ﷺ سے کہا: اے ابو القاسم! خدائے بزرگ و برتر نے فرشتوں کو نور سے آدم کو بوسیدہ مٹی سے، شیطان کو آگ کے شعلے سے آسمان کو دھوئیں سے، اور زمین کو پانی کی جھاگ سے بنایا، اب ہمیں بتاؤ تمہارا خدا کس چیز سے بنا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ جبرائیل تشریف لائے اور کہا کہ اے محمد ﷺ ان سے کہو: "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝"، یعنی: کہدو! اللہ ایک ہے، وہ خدا ہے جس کو تمام ضرورت مند تلاش کرتے ہیں، وہ کبھی پیدا نہیں ہوا تھا، اور نہ کسی نے اسے جنتا، اس کا کبھی کوئی مشابہ اور مثل نہیں ہے۔

عامر بن طفیل نے نبی کریم ﷺ سے کہا: اے محمد ﷺ تم ہمیں کس چیز کی طرف بلاتے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی طرف، عامر نے کہا: بہت خوب! ہمیں اپنے اس خدا کی نوعیت بتاؤ کہ سونے سے بنا ہے، چاندی سے بنا ہے یا لوہے سے اس کے بعد یہ سورت نازل ہوئی۔

ضحاک، قتادہ اور مقاتل کہتے ہیں کہ بہت سے یہودی علماء رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، اور کہا: "اے محمد! اپنے رب کی نوعیت کے بارے میں ہمیں بتائیے ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں، بلند مرتبہ اعلیٰ رب نے اپنی صفات اور فطرت کو تورات میں نازل فرمایا ہے، آپ فرمائیے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ کونسی جنس سے ہے؟ کیا وہ سونا یا پیتل یا سیسہ یا لوہے یا چاندی سے بنا ہے؟ اور وہ کیا چیز کھاتا پیتا ہے، اور اس نے کائنات کس سے وراثت میں لی ہے، اس کے بعد کون اس کا وارث بنے گا؟" اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل فرمائی۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک گروہ جس میں سات پادری شامل تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے کہنے لگے کہ: ہمیں بتائیے کہ آپ کا خدا کیسا ہے، اور کس چیز سے بنایا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا رب کسی چیز سے نہیں بنا ہے، وہ تمام اشیاء سے الگ ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی:

ان روایات کے مجموعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف لوگ رسول اللہ ﷺ سے رب کی نوعیت اور کیفیت کے بارے میں پوچھتے رہے ہیں جس کی عبادت اور بندگی کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دیتے رہے، اور ہر مرتبہ اللہ کے حکم سے انہیں یہی سورت پڑھ کر سنائی سب سے پہلے مشرکین مکہ نے یہ سوال رسول اللہ ﷺ سے کیا اور جواب میں ان پر وہی سورت نازل ہوئی، اس کے بعد مدینہ میں کبھی یہودیوں نے کبھی عیسائیوں نے اور کبھی دوسرے عربوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسے سوالات کیے، اور ہر بار اس سورت کو ان کی سماعتوں تک پہنچانے کا رب العزت کی طرف سے اشارہ کیا گیا۔

پس حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت اصل میں مکی ہے، لیکن اس کے مواد کے بارے میں غور سے یہ محسوس ہوتا ہے یہ سورت مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی، اس وقت جب اللہ کی ذات اور صفات کے بارے میں قرآن کریم میں تفصیلی آیات نازل نہیں ہوئی تھیں، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دعوت خدا سن کر لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کونسا خدا ہے اور کیسا ہے؟ یہ محمد لوگوں کو جس کی عبادت اور بندگی کی طرف بلاتا ہے، مکہ کے ابتدائی دور میں اس سورت کے نازل ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب بلال کے آقا امیہ بن خلف نے بلال کو گرم

ریت پر لٹایا اور ان کے سینے پر ایک بڑا پتھر رکھا تو بلا لُ احَد، احَد پکارتا تھا، یہ احَد کا لفظ اسی سورت سے لیا گیا تھا۔

سورہ اخلاص کی فضیلت

سورہ اخلاص کی فضیلت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثُ الْقُرْآنِ"، "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! سورہ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے" (رواہ البخاری)

1 - جو بھی اس سورت کے مفہیم پر ایمان لائے اور درست عقیدہ رکھے اور خدا کا جو تعارف اس میں ہے اس کا اقرار کرے، وہ ایک مخلص مؤمن بن جائے گا۔

2 - سورہ اخلاص کے مندرجات پر ایمان دوزخ سے اہل توحید کی رہائی اور خلاصی کا سبب بنے گا۔

3 - جو کوئی بھی اس سورت میں بیان کردہ اللہ کے اسماء و صفات کو سمجھے، اور ان کی حقیقتوں اور معانی پر ایمان لائے وہ ہر قسم کے نفاق اور گمراہی سے آزاد ہو جائے گا، اور نیت و عمل میں مخلص ہوگا۔

سورہ اخلاص تلاوت کرنے میں ایک تہائی قرآن کے برابر ثواب ہے۔ ابو سعید خدریؓ سے ایک حدیث مروی ہے:

"أَنَّ رَجُلًا سَمِعَ رَجُلًا يَقْرَأُ: قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ يَرُدُّهَا. فَلَمَّا أَصْبَحَ جَاءَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ، وَكَانَ الرَّجُلُ يَتَقَالَّهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثُ الْقُرْآنِ" (بخاری: ۵۰۱۴)

"یعنی: ایک بندے نے سنا کہ ایک شخص سورہ اخلاص کی تلاوت کرتا اور دہراتا تھا، وہ اسے معمولی کام سمجھتا تھا، صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اور آپ ﷺ کو واقعہ سنایا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، بے شک سورہ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔"

اسی طرح ابو سعید خدریؓ دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: "قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَصْحَابِهِ أَيْعِزُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ فِي لَيْلَةٍ فَشَقَّ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ، وَقَالُوا أَيُّنَا يَطِيقُ ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ، فَقَالَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الصَّمَدُ ثُلُثُ الْقُرْآنِ" (بخاری: ۵۰۱۵)

"نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ: کیا تم میں سے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ قرآن کا ایک تہائی حصہ ایک رات میں پڑھا کرے؟ صحابہ کو یہ عمل بڑا مشکل معلوم ہوا، اور انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کون اس کی طاقت رکھتا ہے، نبی ﷺ نے اس پر فرمایا کہ: "الواحد الصمد" (یعنی: قل ہو اللہ احد) قرآن مجید کا ایک تہائی حصہ ہے۔"

اس لیے کہ پورا قرآن ان اصولوں کی وضاحت اور بیان ہے جو اس سورت میں مختصراً بیان کیے گئے ہیں، اور اس لیے بھی کہ شریعت کے عمومی اور کل اصول تین ہیں: توحید، حدود و احکام اور اعمال، یہ سورت اکیلے توحید اور حق تعالیٰ کی تقدیس کو بیان کرتی ہے۔

سورہ اخلاص کو دوسورتوں (ناس اور خلق) کے ساتھ ملا کر فجر اور مغرب اور سوتے وقت تین مرتبہ پڑھنا سنت ہے، ابو داؤد عبد اللہ بن حبیب سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کہو: میں نے کہا اے اللہ کے رسول کیا کہوں؟ فرمایا: "قل هو الله أحد، والبعوذتین حین تَمْسِي وَحِينَ تَصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَكْفِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" ترجمہ: ہر صبح و شام تین مرتبہ سورہ اخلاص اور معوذتین پڑھو، تمہارے لیے ہر چیز میں کافی ہوگا" (ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے)

سورہ اخلاص کی فضیلت میں مذکور تمام احادیث

قال رسول الله ﷺ: "يَا عَقِبَةُ أَلَا أَعْلَمُكَ سُورًا مَأْنَزَلَتْ فِي التَّوْرَةِ وَلَا فِي الزَّبُورِ وَلَا فِي الْإِنْجِيلِ وَلَا فِي الْفُرْقَانِ مِثْلَهُنَّ، لَا يَأْتِيَنَّ عَلَيْكَ إِلَّا قَرَأْتَهُنَّ فِيهَا، قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ وَقُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ". ترجمہ: عقبہ بن عامرؓ سے رسول اللہ ﷺ نے مخاطب ہو کر فرمایا: اے عقبہ، کیا میں تمہیں وہ سورتیں نہ سکھا دوں، جن کے مثل تورات، زبور، انجیل اور قرآن میں نازل نہیں ہوئی ہیں، اور تمہاری کوئی رات ایسے نہ گزرے کہ تم ان کہ نہ پڑھو، وہ سورتیں: "قل هو الله أحد اور قل"

أعوذ برب الفلق" اور "قل أعوذ برب الناس" (یہ روایت سلسلہ احادیث صحیحہ شماره: ۲۸۶۱) میں ہے۔

"عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ» تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ" ترجمہ: ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (سورہ اخلاص قرآن کے ایک تہائی کے برابر ہے)۔

"عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): «أَيَعِزُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ فِي لَيْلَةٍ ثُلُثَ الْقُرْآنِ؟ قَالُوا: وَكَيْفَ يَقْرَأُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ؟ قَالَ: (قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ) يَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ" (ابو داؤد)

ترجمہ: ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی رات کو ایک تہائی قرآن نہیں پڑھ سکتا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم میں سے کوئی ایک تہائی قرآن کیسے پڑھ سکتا ہے؟ فرمایا: "سورہ اخلاص قرآن کے ایک تہائی کے برابر ہے"۔

"وَفِي رَوَايَةٍ إِنَّ اللَّهَ جَزَأَ الْقُرْآنَ ثَلَاثَةَ أَجْزَاءٍ، فَجَعَلَ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ جُزْءًا مِنْ أَجْزَاءِ الْقُرْآنِ" ترجمہ: ایک اور روایت میں ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور سورہ اخلاص قرآن کریم کے تین حصوں میں سے ایک ہے۔

"وَعَنْهُ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): «احْشَدُوا فَإِنِّي سَأَقْرَأُ عَلَيْكُمْ ثُلُثَ الْقُرْآنِ» فَحَشَدَ مَنْ حَشَدَ ثُمَّ خَرَجَ نَبِيُّ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَرَأَ (قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ) ثُمَّ دَخَلَ فَقَالَ بَعْضُنَا لِبَعْضٍ: إِنِّي أَرَى هَذَا خَبَرٌ جَاءَهُ مِنَ السَّمَاءِ فَذَلِكَ الَّذِي أَدْخَلَهُ. ثُمَّ خَرَجَ نَبِيُّ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: إِنِّي قُلْتُ لَكُمْ سَأَقْرَأُ عَلَيْكُمْ ثُلُثَ الْقُرْآنِ إِلَّا إِنَّهَا تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ" ترجمہ: ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم سب اکٹھے ہو جاؤ، کیونکہ میں تم سب کو تہائی قرآن پڑھ کر سنانے والا ہوں، "چنانچہ آپ ﷺ کی اس پکار پر جو بھی پہنچ سکا جمع ہو گیا، پھر نبی اکرم ﷺ باہر تشریف لائے، سورہ "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" پڑھی اور (حجرہ شریفہ میں) واپس چلے گئے، تو بعض صحابہ نے باہم سرگوشیاں کرتے ہوئے کہا: رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ: میں عنقریب تمہیں تہائی قرآن پڑھ کر سناؤں گا، میرا خیال یہ ہے کہ

ایسا اس وجہ سے ہوا ہے کہ آسمان سے کوئی خبر (کوئی اطلاع) آگئی ہے، پھر نبی اکرم ﷺ کمرے سے باہر نکلے اور فرمایا: "میں نے کہا تھا میں تمہیں تہائی قرآن پڑھ کر سناؤں گا تو سن لو یہ سورت "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" تہائی قرآن کے برابر ہے۔"

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ: حضور ﷺ نے ایک آدمی کو فوجی دستے کے کمانڈر کے طور پر متعین کر دیا، وہ شخص اپنے ساتھیوں کے لیے نماز کی امامت کراتے تھے، اور سورہ اخلاص کے ساتھ اپنی تلاوت ختم کرتے تھے، جب وہ لوگ واپس آئے تو موضوع نبی کریم ﷺ کے سامنے رکھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس نے کہا: سورہ اخلاص میں اللہ کی صفات کا بیان ہے، میں اسے پڑھنا پسند کرتا ہوں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اس سے کہو کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔"

دوسری روایت میں آیا ہے کہ فرمایا: "چونکہ تم اللہ کی صفات پسند کرتے ہو اس لیے جنتی ہو۔"

"عن معاذ بن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلى الله عليه وسلم): «مَنْ قَرَأَ: قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ عَشْرَ مَرَّاتٍ بَنِيَ اللَّهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ، وَفِي رَوَايَةٍ: قَصْرًا» ترجمہ: معاذ بن انس نے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص دس مرتبہ "قل هو الله احد" پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا، اور دوسری روایت میں ہے کہ: اس کے لیے جنت میں ایک "محل" بنائے گا۔"

معلوماتی ملاحظہ

عالم اسلام کے مشہور مفسر امام فخر الرازی فرماتے ہیں: سورہ اخلاص خدا تعالیٰ کے بارے میں ہے، جیسا کہ سورہ کوثر نبی ﷺ کے بارے میں ہے، کیونکہ مشرکین کا نبی ﷺ پر طعنہ یہ تھا کہ: انہوں نے کہا کہ محمد ﷺ "ابتر" ہے، آپ کے بعد کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے، ان کی نظر میں بیٹے کا نہ ہونا عیب تھا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا ایک عیب اور نقص تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر طعن کو سورہ کوثر میں رد کر دیا، اپنے حق میں کیے گئے طعن کو اس سورت میں رد فرمایا اس بنا پر یہاں فرمایا: "قل" کہو: تا کہ اپنے آپ سے اس طعن لعن دور کر دے، جب کہ سورہ کوثر میں قل نہیں کہا، بلکہ خود ہی براہ راست اپنے

نبی سے اس طعن اور عیب کو رد کر دیا۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "«لَا أَحَدٌ صَبَرَ عَلَى أَدَى سَمْعِهِ، مِنْ اللَّهِ؛ إِنَّهُمْ يَجْعَلُونَ لَهُ وَلَدًا، وَهُوَ يَرْزُقُهُمْ وَيَعْفِيهِمْ»" ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی صبر کرنے والا نہیں ہے کہ جو تکلیف دہ بات سنے اور وہ یہ کہ انہوں نے اللہ کا بیٹا قرار دیدیا، اس کے باوجود وہ اللہ انہیں رزق اور عافیت دیتا ہے۔

مجموعی طور پر سورہ اخلاص سے عقیدہ توحید اور یکتا پرستی کا اثبات ہوتا ہے، جس طرح سورہ کا فرون عقیدہ توحید اور خدا کے علاوہ کی عبادت کے درمیان کسی بھی قسم کے سمجھوتہ اور یکسانیت کو رد کرتی ہے۔"

سورہ اخلاص سے حاصل شدہ اسباق

- 1 - اللہ تعالیٰ کو اس کے ناموں اور صفات سے جاننا۔
- 2 - عقیدہ توحید اور نبوت پر استحکام اور تاکید۔
- 3 - اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کو باطل قرار دینا۔
- 4 - اس خدائے واحد لا شریک کی عبادت کا واجب ہونا، صرف وہی الوہیت والا ہے، اس کے سوا کسی کے پاس یہ صفت نہیں ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة الاخلاص

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝

سورة الاخلاص کا تفسیر و ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝	کہہ دے وہ اللہ ایک ہے
اللَّهُ الصَّمَدُ ۝	اللہ ہی بے نیاز ہے
لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُولَدْ ۝	نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا
وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝	اور اس کا کوئی ہمسر نہیں

1 - سورہ اخلاص نے خدا کو اپنی ذات میں اکیلا قرار دیا ہے، "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ"۔

2 - خدا کو مخلوق کی تمام ضروریات پورا کرنے کے واحد منبع کے طور پر متعارف کرایا ہے "اللَّهُ الصَّمَدُ"۔

3 - کسی کا حصہ ہونا اور دوسری اشیاء سے وجود میں آنے کی تردید "لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُولَدْ"۔

4 - اسے کسی بھی قسم کے شریک رکھنے سے پاک قرار دیا ہے، "وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ"۔

ملاحظہ

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ سورہ اخلاص چار "۴" آیات پر مشتمل ہے، سب سے پہلی آیت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ثابت اور اس سے شرک کی نفی کرنے میں ہے، دوسری آیت خدا کے کمال کو ثابت کرنے اور اس کی

ذات سے نقص اور عاجزی کی نفی میں ہے، تیسری آیت اللہ تعالیٰ کی ابدیت کو ثابت کرنے اور اس کی ہمیشگی اور اس سے بیوی بچوں کی نفی کے بارے میں ہے، چوتھی آیت بلند مرتبہ خالق کی عظمت اور شان کے بارے میں اور اس سے کسی قسم کی تشبیہ اور مثل کی نفی کے بارے میں ہے۔

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

احد: ایک، اکیلا، "الصَّهْدُ" ایسے اعلیٰ مقام و مرتبہ والا ہے جو مخلوق کی تمام ضرورتوں اور کاموں میں مسلسل توجہ دیتا ہے، جو بے مثال کمال اور خصوصیات سے بھرپور ہے۔

"صَمَدَہ" اس کا قصد کیا، اور اس پر اعتماد کیا، "لَمْ يَلِدْ" (ولد): کسی کو نہیں جنا، "لَمْ يُولَدْ": کسی سے نہیں جنا، "كُفُوًا": (کفء): اس جیسا، اس کے مقابل، اس کی طرح، تشبیہ اور نظیر، یعنی: خدا جیسا کوئی نہیں ہے، اور کوئی اس کے مشابہ، برابر، اور ساجھی نہیں ہے، (شوری: ۱۱، فرقان)

سورہ مبارکہ کی آیات کی تفسیر اور بیان

اس سورت میں خدا کی ذات کی وحدانیت اور اس کی طرف ہمارے وجود کی تمام ضروریات میں ہمارا رجوع اور یہ کہ اس کی ذات اور صفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں ہے، اور یہ قرآنی توحید، صرف قرآن ہی کے لیے مخصوص ہے، اور اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات (اصولی، فروغی اور اخلاقی) کی اسی کے مطابق منصوبہ بندی کی گئی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ سورت مکہ اور مدینہ دونوں میں نازل ہوئی ہو، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کے سبب نزول میں جو روایات آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ○	کہہ دے وہ اللہ ایک ہے

(قل: ہوا اللہ...) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دلجمعی کے ساتھ تیاری کی اور اس اہم اور ضروری معاملے کو تندہی سے شروع کیا، اور لوگوں کو شرک اور شکوک و شبہات سے پاک خالص توحید کی طرف بلایا اور انہیں یہ تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے، یعنی: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے شجرہ نسب کی تفصیل پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ کیسا ہے؟ انہیں بتاؤ: جس خدا کی میں

عبادت کرتا ہوں اور تمہیں اس کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں، وہ اکیلا ہے، ایک ہے، اس کا کوئی شریک اور مثال نہیں ہے، یعنی اس کی پاک ذات میں کسی قسم کا تعدد اور تکثر نہیں، اور شرک کی کوئی گنجائش نہیں ہے، وہ بغیر شریک کے ہے، نہ اس کی ذات میں، نہ صفات میں اور نہ افعال میں کوئی شریک ہے، عسائیوں کے تصور تثلیث (باپ، بیٹا اور روح القدس) کی طرح نہیں، بلکہ وہ اکیلا اور یگانہ ہے۔

اور مشرکین کی رائے کے برعکس جو خداؤں کی کثرت پر یقین رکھتے ہیں، وہ اکیلا ہے۔

آیت میں "هُوَ" کی ضمیر بات کی عظمت اور گہرائی کو ظاہر کرتی ہے: تاکہ مخاطب کھلی آنکھوں اور دل کے کانوں سے اس پر توجہ دے، اور اس کا مرجع، مکمل کمال اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، لفظ "احد" عدد اور گنتی کی نفی کرتا ہے، یعنی خدا کی ذات پاک کے علاوہ کوئی نہیں جو کائنات کو تھامے اور کائنات کو چلائے، اللہ تعالیٰ اپنی اعلیٰ صفات، کمال اور صمدیت کی انتہا میں ہے۔

"اللہ"، "الہ" کے اصل سے بمعنی معبود کے ہے، خدا کی ذات کا نام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے دیگر نام جیسے: رحمان، رحیم، خالق اور قادر اس کی صفات اور افعال کی دلیل ہیں۔

سورہ اخلاص کے شروع میں خدا اپنے آپ کو "اللہ" کہتا ہے، اور پھر اپنی صفت "احد" بیان کرتا ہے، اللہ کی وحدانیت کی صفت لفظ "احد" کے ساتھ، جس میں مبالغے کا معنی واحد سے زیادہ پایا جاتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی وحدانیت حقیقت بسیط ہے، اس میں کسی امتزاج کا کوئی راستہ نہیں ہے، اس وجہ سے واحد کی صفت، یعنی واحد کے لیے مرکب لفظ جیسے واحد قوم، واحد امت کا استعمال ہوتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا کی ذات جو اللہ سے موسوم ہے، ایسے معبود کے معنی میں ہے کہ بندے اس کے فہم سے عاجز اور حیران ہوں، کہ اس کی وحدت بسیط ہے، اس ذات کی وحدت کے بسیط ہونے کا معنی یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کا عقلی طور پر کوئی ثانی ہو، کیونکہ وحدت بسیط میں کمال مطلق کی ضرورت ہے، اور کمال مطلق میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی، کہ پھر اس میں دوسرا آجائے اور وہ اس کے وجود کا سبب بنے۔

اللہ ہی بے نیاز ہے

اللَّهُ الصَّمَدُ ۝۲

اور وہ "اللہ الصمد" ہے، صمد: وہ ہے جس کی طرف لوگ اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں کیوں وہ ان کو پورا کرنے پر قادر ہے۔
"صمد" کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز ذات، آثار اور صفات میں اس کی محتاج ہے، اور وہ اللہ منتہی المقاصد ہے۔

مفسر آلوسی (۱۲۱۷-۱۲۷۰ ق) اپنی تفسیر "روح المعانی فی تفسیر القرآن" میں تفسیر کرتے ہیں کہ: "صمد" وہ رب جس سے اوپر کوئی نہیں ہے، دوسرے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور لوگ اپنی ضروریات اور معاملات کے حل و فصل کے لیے اس کے پاس پناہ لیتے ہیں۔

"صمد": صمود کے مادہ سے ہے، اس کا مطلب ہے کسی چیز کا ایسا بھر جانا کہ اس میں گنجائش ہی باقی نہ رہے، خدا صمد ہے، یعنی وہ بے نیازی سے بھرپور ہے، خدا تعالیٰ کی ذات کو بے نیازی اور غنی نے گھیر رکھا ہے، اور اس میں کم سے کم حاجت کا بھی کوئی راستہ نہیں۔

"صمد" مفسرین کے مطابق دو معنی رکھتا ہے:

اول: بمعنی سخت کے ہے، ناقابل تسخیر اور نہ تبدیل ہونے والا۔

دوم: بمعنی پناہ اور لوٹنے کی جگہ جو دوسروں کو درکار ہے، اور وہ لوگوں سے بے نیاز ہے درحقیقت دونوں معنی کامل کمال کے ساتھ بیان کیے جاسکتے ہیں کہ اس میں کسی تبدیلی یا تغیر کی ضرورت نہیں ہے، وہ جو چاہے کر سکے اور وہ قادر مطلق ہے، اس لیے اس کے علاوہ دوسرے اس کے محتاج ہیں، اور ان کا قائم رہنا اس کی ذات پر منحصر ہے، پس خدا کے وجود کا تصور انسان کے جیسے کہ: کھائے، پیئے اور پہنے جیسا کہ بعض مذاہب نے اس طرح کہا ہے باطل ہے، اور خدا کی ذات اور صفات کو انسان کی ذات اور صفات کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں: "صمد" وہ رب اور مالک ہے جو اپنی بادشاہت میں کمال کو پہنچ گیا ہو، ایسا قابل عزت کہ شان میں کمال کو پہنچا ہو، ایسا عظیم ہے جو اپنی عظمت میں کمال کو پہنچا ہو، ایسا حلیم کہ اپنی حلم اور بردباری میں کمال کو پہنچا ہو، ایسا غنی جو اپنی غنا میں کمال کو پہنچا ہو، ایسا حکیم جو اپنی حکمت میں کمال کو پہنچا ہو، "صمد" ایک ایسی صفت ہے جس کا اس کے سوا کوئی مستحق نہیں، نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

زجاج کہتے ہیں: "صمد" وہ رب اور حاکم ہے جس کی حاکمیت ہو اور اس سے اوپر کوئی رب اور حاکم نہ ہو۔

مجموعی طور پر یہ کہنا چاہیے کہ: "صَمَدِيَّت" رب تعالیٰ کی ہر چیز سے بے نیازی ہر چیز سے اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اولاد اور ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے۔

مشرکین کو معلوم ہونا چاہیے کہ: وہ اس بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ محض وہم و گمان کے سوا کچھ نہیں ہے، اور خالق کی ذات پاک ہے ہر قسم کے بہتان اور غیر منصفانہ تقابل اور برابری سے قرآن کی بہت سی آیات ہیں جو اس سورت کی تصدیق کرتی ہیں: "بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ اَلَّذِيْ يَكُوْنُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةً ۚ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱" (انعام: ۱۰۱) ترجمہ: وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسی ہوگی، جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں، اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز پر خوب عالم ہے۔

"اللہ الصمد" کے بارے میں تمام مفسرین کی تفسیر

ذیل میں دیگر مفسرین کی تشریحات سے لفظ "اللہ الصمد" کے بارے میں محترم قارئین کے لیے مزید وضاحت کرنا چاہتا ہوں:

علی کرمہ اللہ وجہہ، عکرمہ اور کعب احبار کہتے ہیں: "صمد وہ ذات ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابو وائل بن شقیق بن سلمہ: "ایک سردار جس کی سیادت مکمل ہو اور عروج و انتہا کو پہنچ چکی ہو۔"

ابن عباسؓ کا دوسرا قول: "صمد وہ ہے جو اپنے سیادت میں، اپنی شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے حلم و برد و باری میں، رواداری، علم اور حکمت میں کامل ہو۔"

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: صمد وہ سب سے بے نیاز ہو، اور سب اس کے محتاج ہوں، عکرمہ کا دوسرے قول ہے کہ: وہ ذات ہے جس سے نہ کوئی چیز نکلی ہو، اور نہ نکلتی ہو" وہ جو نہ کھاتا اور نہ پیتا ہو" اس کے ہم معنی اقوال شعبی اور محمد بن کعب القرظی سے بھی منقول ہیں۔

مفسر سدی کہتے ہیں: مطلوب چیزیں حاصل کرنے کے لیے لوگ جس کا قصد کریں، اور مصائب میں مدد کے لیے جس کی طرف رجوع کریں۔

سعید بن جبیر نے کہا: "وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو۔"

ربیع بن انسؓ نے فرمایا: "جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو"، مقاتل بن حیان نے کہا ہے: "وہ جو بے عیب ہو"، ابن کیسان نے کہا: "وہ جس کی صفت سے کوئی دوسرا متصف نہ ہو" حسن بصری اور قتادہ نے کہا: "وہ جو باقی رہنے والا اور لا زوال ہو" اس سے ملتے جلتے اقوال مجاہد، معمر، مرة الہمدانی سے بھی منقول ہیں۔

مرة الہمدانی کا ایک اور قول یہ ہے کہ: صمد وہ ہے جو مرضی کے مطابق جو چاہے فیصلہ کرے، اور جو کام چاہے کرے، اور اس کے حکم اور فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو، ابراہیم نخعی کہتے ہیں: "وہ جس سے لوگ

اپنی حاجتوں کے لیے رجوع کریں۔

ابو بکر الانباری: اہل لغت میں اختلاف نہیں ہے کہ: "صمد اس سردار کو کہتے ہیں جس سے بالاتر کوئی سردار نہ ہو، جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور اپنے معاملات میں رجوع کریں۔"

الزجاج کا قول بھی اسی کے قریب ہے، وہ کہتے ہیں: "صمد وہ ہے جس پر سرداری ختم ہوگئی ہو، اور ہر کوئی اپنی ضرورت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا ہو۔ (ازتفہیم القرآن)

لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُولَدْ ۝	نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جناگیا

یعنی: اس سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا، اور نہ وہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے، کیونکہ کوئی بھی اس کی مجانست اور مشارکت نہیں رکھتا کہ اس نے اپنی جنس سے بیوی بنالی ہو، -والعباد باللہ- کہ اس سے دو بیٹے پیدا ہوئے ہوں، نیز ولادت فنا کی علامت ہے، کیونکہ پیدائش اور تولید اس لیے ہوتی ہے کہ کسی چیز کی جنس اس کے والدین کے فنا ہونے کے بعد باقی رہے، جبکہ ماضی اور مستقبل میں خدا کا کوئی باپ نہیں ہے کہ اس کی طرف نسبت کی جائے، اور کوئی اولاد بھی نہیں ہے کہ اس کی طرف نسبت کی جائے۔

خدا تعالیٰ اپنی ذات کے بارے میں کہتا ہے: ایسا تصور کرنا باطل ہے، کہ اللہ جنتا ہے، اور جنتا جاتا ہے، بلکہ اس کا وجود ہمیشہ سے ہے اور رہے گا، نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہا، تمام موجودات اس کی ہے، اور اس کی ذات ازلی اور ابدی ہے۔

قتادہ کہتے ہیں کہ عرب کے مشرکوں نے کہا: فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، یہودیوں نے کہا: عزیر خدا کا بیٹا ہے، اور عیسائیوں نے کہا: مسیح خدا کا بیٹا ہے، تو خدا تعالیٰ نے ان سب کی تردید کی، اور فرمایا: "لَمْ يَلِدْ" وَلَمْ يُولَدْ" نہ اس نے کسی کو جنتا ہے، اور نہ ہی خود کسی سے جنتا گیا ہے"

مخلوقات کے ساتھ خدا کا تعلق پیدائش نہیں، تخلیق کا ہے، وہ تمام موجودات کو پیدا فرماتا ہے، یعنی عدم سے وجود میں لاتا ہے، نا کہ وہ خود جنے، کیونکہ بچہ والدین کے جنس سے ہوتا ہے، درحقیقت ان کے وجود کا حصہ ہوتا ہے، جبکہ کوئی بھی چیز خدا کی جنس سے یا اس کے حصے سے نہیں ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝	اور اس کا کوئی ہمسر نہیں

یعنی: کوئی اس کے برابر، اس جیسا اور اس کی شریک نہیں ہے، کسی بھی چیز میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے،

اس آیت مبارکہ میں: "احد" کی قید سے عقیدہ ثنویت کی تردید ہے، نیز یہ ان لوگوں کے قول کی تردید کرتا ہے جو کہتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کوئی اور خالق ہے، کیونکہ اگر دوسرا خالق ہوتا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ ضرورتوں اور حاجات میں یکتا مرجع و مقصود نہ ہوتا۔

"تفہیم القرآن" کے مفسر لکھتے ہیں کہ: اصل میں لفظ کفو استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں نظیر، مشابہ، مماثل، ہم مرتبہ، مساوی، ہماری زبان میں نکاح کے معاملہ میں بھی لفظ کفو کا استعمال ہوتا ہے، اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی معاشرتی حیثیت سے برابر کا جوڑ ہوں، پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے، نہ کبھی تھا، نہ کبھی ہو سکتا ہے، جو اللہ کے مانند، یا اس کا ہم مرتبہ ہو، یا جو اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اس سے کسی درجہ میں بھی مشابہت رکھتا ہو۔

آیت کریمہ: "وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ" سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ: نہ ذات

میں، نہ صفات اور نہ افعال میں کوئی چیز نہ کوئی آدمی اللہ کے مثابہ ہے، اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے کہ دنیا کے امور میں اس کا شریک ہوسکے۔

مفسر ابن کثیر کہتے ہیں کہ: یعنی وہ ہر چیز کا خالق مالک ہے، پھر اس کی مخلوق اور ملکیت میں سے اس کی برابری اور ہمسری کرنے والا کون ہوگا؟ وہ تمام عیوب اور نقصان سے پاک ہے، ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے، مجھے گالیاں دیتا ہے اور اسے یہ بھی لائق نہ تھا۔

وہ کہتا ہے کہ: جس طرح اولاً اللہ نے مجھے پیدا کیا ایسے ہی پھر نہیں لوٹا ئے گا، حالانکہ پہلی مرتبہ کی پیدائش دوسری مرتبہ کی پیدائش سے کچھ آسان تو نہ تھی، جب میں اس پر قادر ہوں تو اس پر کیوں نہیں؟ اور اس کا مجھے گالیاں دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ کی اولاد ہے حالانکہ میں اکیلا ہوں، میں ایک ہی ہوں، میں صمد ہوں، نہ میری اولاد ہے، نہ میرے ماں باپ ہیں، نہ مجھ جیسا کوئی ہے۔

بعض مسلم محققین نے شرک کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں، جن کی خدا نے سورہ اخلاص میں نفی کی ہے۔

پہلا اور دوسرا: شرک خدا کی ذات کثرت اور دو ہونے کا شرک ہے، جس کے بارے میں خدا نے فرمایا: "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ"، تیسرا اور چوتھا تبدیلیاں اور نقائص ہیں، جن کی خدا نے آیت "اللہ الصمد" کے ساتھ نفی کی، پانچواں اور چھٹا معاملوں اور ناقص ہونے کی علت جس کی اللہ نے آیت "لم یلد ولم یولد" کے ساتھ نفی کی، ساتواں اور آٹھواں امثال اور اضداد ہیں جن کی نفی اللہ تعالیٰ نے "ولم یکن لہ کفواحد" کے ساتھ کی، لہذا خدا کی وحدانیت کا تصور، تنہا، ازلی اور ابدی ذات کے لیے کیا جاسکتا ہے۔

سورۃ الاخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف الحمد للہ اور سورہ اخلاص تین مرتبہ پڑھنے سے پورا قرآن پاک ختم کرنے کا ثواب ملتا ہے، تو پورا قرآن ختم کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ صرف ان سورتوں کی تلاوت کا ثواب پورے قرآن پاک کی تلاوت کے برابر ہے۔

اس کے جواب میں ان محترم دوستوں کو مطلع کرنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر یہ نہیں فرمایا کہ تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھنے پر قرآن ختم کرنے کا ثواب ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ: سورہ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَيُّعِزُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ فِي لَيْلَةٍ ثُلُثَ الْقُرْآنِ؟ قَالُوا: وَكَيْفَ يَقْرَأُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ؟ قَالَ: (قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ) يَعِدِلْ ثُلُثَ الْقُرْآنِ. وَفِي رِوَايَةٍ: إِنَّ اللَّهَ جَزَأَ الْقُرْآنَ ثَلَاثَةَ أَجْزَاءٍ، فَجَعَلَ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ جُزْءًا مِنْ أَجْزَاءِ الْقُرْآنِ. (صحیح مسلم)."۔

ترجمہ: "کیا تم میں سے کوئی ایک تہائی قرآن نہیں پڑھ سکتا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم میں سے کوئی ایک تہائی قرآن کیسے پڑھ سکتا ہے؟ فرمایا: "سورہ اخلاص قرآن کے ایک تہائی کے برابر ہے۔"

"وَفِي رِوَايَةٍ: إِنَّ اللَّهَ جَزَأَ الْقُرْآنَ ثَلَاثَةَ أَجْزَاءٍ، فَجَعَلَ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ جُزْءًا مِنْ أَجْزَاءِ الْقُرْآنِ" (صحیح مسلم) ترجمہ: ایک اور روایت میں ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور سورہ اخلاص قرآن کریم کے تین حصوں میں سے ایک ہے۔

علمائے اسلام نے کہا ہے کہ: اس لیے کہ پورا قرآن کریم ان اصولوں کی وضاحت اور بیان ہے جو اس سورت میں مختصراً ذکر کیے گئے ہیں، اور اس لیے بھی کہ اسلامی قانون کے عمومی اور کلی اصول تین چیزیں ہیں: توحید، حدود و احکام اور اعمال کا بیان، اور یہ سورت ہی صرف خدا کی توحید اور اس کے تقدیس کی ذمہ داری لیتی ہے۔ (انوار القرآن)

لیکن ممکن ہے کوئی کہے: اگر سورہ اخلاص کی تلاوت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، تو پھر اس کی تین بار تلاوت کرنے سے پورے قرآن کا ثواب ملنا چاہیے، اس لیے دوسری سورتوں کی تلاوت کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہوگی!

اس بارے میں سوال اور اس کا جواب ملاحظہ کریں:

سوال: اگر سورہ اخلاص کی تین بار تلاوت قرآن کی تلاوت کے برابر ہے، تو کیا اگر کوئی مسلمان قرآن کی تلاوت چھوڑ دے اور صرف اسی سورت کی تلاوت کرے تو وہ گنہگار ہوگا؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: "الدين النصيحة" یعنی: دین خیر خواہی کا نام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! کن کے لیے نصیحت ہے؟ فرمایا: "لله ولكتابه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم" اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسولوں کے لیے، مسلم حکمرانوں کے لیے، اور ان کے عام لوگوں کے لیے۔

خدا کی کتاب کے لیے خیر خواہی: اس کی تلاوت کرنے اور اس کی آیات پر غور و فکر کرنے اور اس کے مواعظ سے نصیحت لینے اور خدا کے احکام کی تعمیل کرنے اور اس کے منع کردہ چیزوں سے بچنے اور اس کی حدود سے تجاوز نہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کریم کی دوسرے سورتوں کو پڑھے بغیر صرف سورہ اخلاص کو پڑھنا خدا کی کتاب کی خیر خواہی کے مطابق نہیں، اور جو شخص باقی قرآن چھوڑ کر صرف اس سورت کو پڑھتا ہے وہ نصیحت حاصل نہیں کر سکتا اور اپنا ایمان نہیں بڑھا سکتا، اور حلال و حرام کے احکام سے، اور واجب، مسنون، مکروہ سے واقفیت حاصل نہیں کر سکے گا، قرآنی آداب و اخلاق سے مزین نہیں ہو سکتا، ان معاملات میں ایک مسلمان کو کوتاہی کرنا قرآن کی تلاوت ترک کرنے کی سزاء کے لیے کافی ہے، (یعنی جو شخص قرآن کی تلاوت کو ترک کر دے گا، اور ان چیزوں سے محروم رہے، وہ خود کو ملامت کا مستحق ٹھہرائے گا) اور پیغمبرؐ باوجود اس کے کہ اس سورت کی فضیلت کو جانتے تھے کہ قرآن کریم کی ایک تہائی کے برابر ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم سے زیادہ نیکی کے حریص تھے، بلاشبہ اجر و ثواب کمانے میں ہم سے زیادہ حریص اور اس کا شوق رکھتے تھے، مگر وہ صرف اس سورت کی تلاوت کو کافی نہیں سمجھتے تھے، وہ صرف اس سورت کی تلاوت پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ قرآن کریم کی دوسرے سورتوں کی بھی تلاوت کرتے تھے، اور اس پر مداومت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (احزاب: ۲۱) ترجمہ: "یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور طرز عمل تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے" (فتاویٰ اللجنة الدائمة: ۲۹/۶-۳۰)

شیخ عبد الرزاق عقیقی، شیخ عبد اللہ بن غدیان، جیسا کہ افتا کے مستقل لجنہ کے فتویٰ میں مذکور ہے: کہ رسول اللہ ﷺ صرف سورہ اخلاص کے پڑھنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، اور آپ ﷺ کبھی اپنے صحابہ کو یہ نہیں فرمایا کہ

قرآن پاک کی تلاوت اور ختم کرنے کے بجائے صرف تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھیں، ہمیں بھی سیرت اور سنت نبوی ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کی تابع داری کرنی چاہیے اور قرآن کریم کی مختلف سورتوں کی تلاوت سے (جس میں سے ہر ایک خطبات، نصحیتوں اور شرعی قواعد و احکام پر مشتمل ہے) خود کو محروم نہ کریں، تاکہ خدائے بزرگ و برتر ہمارے دلوں کو نور ہدایت سے بھر دے، اور خدا کی آیات کو جان کر اس کا سیدھا راستہ ہم پالیں اور اس پر چلیں ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "يَقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ إِذَا دَخَلَ الْجُمُعَةَ اقْرَأْ وَارْقُ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَتَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرُؤُهَا" ترجمہ: صاحب قرآن سے کہا جائے گا: پڑھتا اور چڑھتا جا، اور ویسے ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے ساتھ پڑھ، پس تیری منزل وہ ہوگی جہاں تیری آخری آیت ختم ہوگی "امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے اور (صحیح سنن ابی داود)

لہذا جو شخص قرآن کی زیادہ سورتیں یاد کر کے تلاوت کرے گا، قیامت کے دن اس کا درجہ بلند ہوگا، لیکن جو صرف ایک سورت کے یاد کرنے اور تلاوت کرنے پر اکتفا کرے گا وہ اس فضل سے محروم ہوگا، اس کے علاوہ بہت سے قرآنی علوم سے بھی محروم رہے گا۔

ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الْأُتْرَجَةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ، وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الثَّيْبَةِ لَا رِيحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ، وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الرَّيْحَانَةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ، وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِي لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الْحُنْظَلَةِ، لَيْسَ لَهَا رِيحٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ۔" صحیح بخاری و مسلم۔

"اس مؤمن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہو سنگترے جیسی ہے، اس مؤمن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا کھجور جیسی ہے جس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی، لیکن مزہ میٹھا ہوتا ہے، اور منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہو، ریحانہ (پھول) جیسی ہے، جس کی خوشبو تو اچھی ہوتی ہے، لیکن مزہ کڑوا ہوتا ہے۔"

لہذا جو شخص خدا کی کتاب کی زیادہ تلاوت کرتا ہے، اس کے علم و معرفت میں خدا کے شریعت کے بارے میں اضافہ ہوتا ہے اس کے اعمال

میں بھی اضافہ ہوتا ہے، اور ہدایت کے قریب تر ہوجاتا ہے۔

ایک اہم نکتہ جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ (جزاء) اور (جزاء) میں فرق ہے، "جزاء": یعنی وہ انعام جو اللہ تعالیٰ اس کی عبادت اور اطاعت کی بنا پر دیتا ہے، اور "جزاء": کسی چیز کا دوسرے کی جگہ کافی ہونا، اور اس سے بے نیاز ہوجانا۔

یہ ٹھیک ہے کہ سورہ اخلاص کی تلاوت کا ثواب قرآن کے ایک تہائی کے برابر ہے، (جزاء قراءۃ ثلث القرآن)

لیکن یہ ایک تہائی قرآن کے پڑھنے کے قائم مقام نہیں ہوتا اور اس کی تلاوت کی ضرورت کو ختم نہیں کرتا (لا تجزئ عن ثلث القرآن)۔

لہذا مثال کے طور پر اگر کوئی بندہ نذر مانے کہ قرآن کا ایک تہائی تلاوت کرے، تو وہ صرف سورہ اخلاص کی تلاوت سے اپنی نذر پوری نہیں کرسکتا، کیونکہ سورہ اخلاص ثواب اور بدلے میں ایک تہائی قرآن کے برابر ہے، نہ کہ اجزاء اور تلاوت کے اعتبار سے۔

یا مثلاً جو شخص اپنی نماز میں تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھتا ہے تو اس کے تین مرتبہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کی جگہ نہیں لیتی حالانکہ اسے پورا قرآن پڑھنے کا ثواب ملتا ہے، لیکن پھر بھی اس پر نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، اس لیے کی سورہ اخلاص نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

سورہ اخلاص کی فضیلت کو سمجھنے کے لیے ایک اور سادہ سی مثال

صحیح احادیث میں سورہ اخلاص کی جوفضیلت بیان ہوئی ہے اس کو سمجھنے کے لیے ایک اور سادہ مثال یہ ہے کہ مسجدالحرام میں نماز پڑھنے کا اجر و ثواب دوسری مساجد کے مقابلے میں ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، تو کیا کوئی اس حدیث کا مطلب یہ لے سکتا ہے کہ: دسیوں سال تک نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں؟ کیونکہ مسجدالحرام میں ایک نماز کا پڑھنا ایک لاکھ نماز پڑھنے کے برابر ہے، تو پھر اگر ایک نماز مسجدالحرام میں پڑھی جائے تو اور نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

حالانکہ اس حدیث سے کوئی بھی اس طرح کا مفہوم نہیں لے سکتا، بلکہ اس طرح سمجھے گا کہ مسجد الحرام میں نماز پڑھنے کا ثواب بہت زیادہ ہے، لہذا وہ کوشش کرے گا کہ اس میں نماز پڑھے، لیکن اپنی نمازیں ترک نہیں کریں گے۔

سورہ اخلاص کی تلاوت بھی ایسی ہی ہے، یعنی: کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ: سورہ اخلاص کی تین بار تلاوت کرنا پورے قرآن کی تلاوت کی ضرورت کو ختم کر دیتا ہے، اس لیے کہ اس کی ہر بار تلاوت سے ایک تہائی قرآن کا ثواب مل جاتا ہے، بلکہ اس کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اس چھوٹی سی سورت کی تلاوت کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اس کی تلاوت میں رغبت رکھے اور ہر رات اس کی تلاوت کرے تاکہ اسے زیادہ اجر و ثواب ملے، یقیناً اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہے کہ آسان سی عبادت ہمارے لیے قیمتی بنائی ہے - واللہ الحمد -

لہذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ قرآن اور اس کی سورتوں کی تلاوت اور حفظ کرنے میں کوشش اور جدوجہد کرے، سستی اور کاہلی سے پرہیز کرے، اگر فرض کیا جائے کہ تمام مسلمان قرآن کی بجائے صرف تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ لیں تو اس صورت میں قرآن کریم مہجور (متروک) ہوگا، یقیناً شارع حکیم اور پیغمبر ﷺ کا مقصد قرآن کو ترک کرنا ہر گز نہیں تھا۔ اور نبی کریم ﷺ قیامت کے دن اپنی امت کے بارے میں قرآن کو چھوڑنے کی شکایت کریں گے: "وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۝۳۰" (فرقان: ۳۰)

ترجمہ: "اور رسول کہے گا اے میرے رب! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑا ہوا رکھا"

سورہ اخلاص سے علاج

اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا قرآن کریم بیماریوں کے علاج کا کار گرنسخہ سمجھا جاتا ہے، قرآن عظیم وحی الہی، دین، عقیدہ اور توحید کی کتاب ہے، اور معاشرتی امراض کے علاج کا ایک مکمل نسخہ ہے، حکمت، بشارت، تبلیغ اور ہدایت اور مجموعی طور پر یہ حیات اور زندگی کی کتاب ہے، اور یہ دنیا و آخرت کے کمالات اور اعلیٰ انسانی اور روحانی معراج کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

قرآن عظیم انسانی معاشروں کو بچانے اور زندگیوں کی اصلاح کے لیے ایک بے مثال اور شفا بخش نسخہ ہے، اور یہ سب سے مستحکم راستے کی

طرف رہنمائی کرتا ہے، "إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ" (سورہ اسراء آیت: ۹) ترجمہ: "یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے"

اگر قرآن گذشتہ ۱۶ صدیوں کی کتاب ہے، تو یہ اس دور اور آنے والے دور کی کتاب بھی ہے، اور اس کا احترام یہ ہے کہ اس کے احکام اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔

قرآن ان لوگوں کے لیے شفاء ہے جو ایمان لائے ہوں اور ظالمین میں سے نہ ہوں، یقیناً سننے والے کے ایمان کی سطح بھی قرآن کریم سے سکون حاصل کرنے کی مقدار میں بہت کار آمد ہے، جبکہ اس پر عدم ایمان الٹا نتیجہ دیتا ہے: "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ" (سورہ انفال: ۲) ترجمہ: "مؤمن تو وہ ہیں جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔"

اور دوسری طرف جو لوگ خدا کو نہیں مانتے انہیں آیات سننے سے کوئی فائدہ اور سکون نہیں ملے گا اور ایمان میں اضافہ بھی نہیں ہوگا، "وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ إِيمَانًا؟ فَأَمَّا الَّذِينَ أَمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ" (سورہ توبہ: ۱۲۴) ترجمہ: "اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو بعض منافق (استہزا کرتے ہیں اور) پوچھتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کیا ہے؟ سو جو ایمان لانے والے ہیں ان کا تو ایمان زیادہ کیا اور وہ خوش ہوتے ہیں۔"

سورہ اخلاص اور معوذتین (فلق، ناس)، فاتحہ اور دیگر قرآنی سورتوں کا بیماروں پر پڑھنا دعاؤں میں سے ایک ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے، اور صحابہ کرام نے جب یہ کام کیا تو آپؐ نے ان کی تصدیق کی، بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری کے دوران جس کی وجہ سے آپؐ رحلت فرما گئے سورہ اخلاص اور معوذتین کی اپنے اوپر تلاوت فرماتے، حضرت بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری بڑھ جاتی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورتیں نہیں پڑھ سکتے تھے تو میں پڑھ کر آپ پر دم کر لیتی، اور ان کے دست مبارک کو ان کے جسم پر پھیر لیتی، معمر کہتے ہیں کہ: میں نے امام زہری سے پوچھا کہ نبی صلی

اللہ علیہ وسلم کس طرح دم کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں پر پھونک مارتے اور پھر اپنے ہاتھوں کو چہرے پر ملتے تھے، (بخاری (5735)، (2276) مسلم (2192)۔

امام بخاریؒ ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب عرب کے ایک قبیلہ کے پاس پڑاؤ ڈالا، انہوں نے اصحاب کرام کی مہمان نوازی نہیں کی، اسی دور ان قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، انہوں نے اصحاب کرام سے کہا: تمہارے پاس کوئی دوا یا دم کرنے والا ہے؟ کہا کہ: تم لوگوں نے ہماری میزبانی نہیں کی، جب تک تم لوگ ہمارے لیے کوئی اجرت مقرر نہیں کرو گے تو ہم دم نہیں کریں گے، تو پھر انہوں نے اجرت کے طور پر کئی بکریاں مقرر کیں، تو صحابہ میں سے ایک نے سورہ فاتحہ پڑھ کر لعاب دہن کے ساتھ بیمار پر پھونک دیا تو وہ تندرست ہو گیا، تو انہوں نے اس کے بدلے بکریاں دیں، اصحاب کرام نے کہا: ہم اسے استعمال نہیں کریں گے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھیں، جب یہ صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: آپ ہنسے اور فرمایا: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ دم ہے؟ بکریاں لے لو اور مجھے بھی اس میں حصہ دو، (بخاری: ۵۷۳۶، مسلم: ۲۲۰۱)

پہلی حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کی حالت میں اپنے اوپر کچھ سورتیں پڑھتے تھے، اور دوسری سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے عمل کی تصدیق کی۔

رقی کیا ہے؟

رقی، رقیہ کی جمع ہے، اور اس کا مطلب ہے شفاء اور صحت حاصل کرنے کے لیے کسی چیز پر پڑھنا اور اس پر دم کرنا، اس سے فرق نہیں پڑتا کہ قرآن کریم سے ہو یا رسول اللہ ﷺ کی مسنون دعاؤں سے، عوف بن مالک سے روایت ہے انہوں نے کہا: "كُنَّا نَرُقِّي فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ تَرَى فِي ذَلِكَ فَقَالَ اَعْرِضُوا عَلَيَّ رُقَاكُمْ لَا بَأْسَ بِالرُقَى مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ شِرْكٌ" (صحيح مسلم: ۲۲۰۰)

ترجمہ: "زمانہ جاہلیت میں ہم دم کیا کرتے تھے، اور ہم نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ آپ اسے کیسے دیکھتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اپنے دم بیان کرو، جب تک اس میں شرک نہ ہو کوئی حرج نہیں۔"

انس بن مالک سے روایت ہے انہوں نے کہا: "رَخَّصَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الرُّقِيَّةِ مِنَ الْعَيْنِ وَالْحُمَةِ وَالنَّمْلَةِ" (صحيح مسلم: ۲۱۹۶) ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے نظر بد، زہریلے ڈنگ اور جلد پر نکلنے والے دانوں میں دم کرنے کی اجازت دی۔"

"الْعَيْن" سے مراد وہ ہے جو خدا کے حکم سے اپنی آنکھوں سے کسی کو نقصان پہنچائے، "الْحُمَةُ" زہر ہے، وہ تمام چیزیں جن میں زہر ہو، جیسے: سانپ، بچھو وغیرہ یا ان کے جیسے کے لیے دم کی اجازت دی گئی ہے، "النَّمْلَةُ" ایسا زخم جو پہلو سے نکلتا ہے۔

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ اسْتَطَاعَ أَنْ يَنْفَعَ أَخَاهُ فَلْيَفْعَلْ" (صحيح مسلم: ۲۱۹۹) ترجمہ: "جو کوئی بھی اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکتا ہے تو وہ کرے"

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ: "كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ إِنْسَانٌ مَسَحَهُ بِمِيمِنِهِ ثُمَّ قَالَ أَذْهَبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ أَنْتَ الشَّافِي لَا شِفَاءَ إِلَّا بِشِفَاؤِكَ شِفَاءً لَا يَغَادِرُ سَقَمًا" (صحيح بخاری: ۵۷۴۳) (صحيح مسلم: ۲۱۹۱)

ترجمہ: "جب ہم میں سے کوئی نبی ﷺ کو اپنے درد کی شکایت کرتا تو آپؐ اس پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرتے اور یہ دعا پڑھتے: اے اللہ! لوگوں کے پالنے والے! تکلیف کو دور کر دے اسے شفا دے دے تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفاء کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفاء دے کہ کسی قسم کی بیماری نہ رہ جائے۔"

اس کے شروط

دم کے صحیح اور درست ہونے کے لیے کچھ شروط ضروری ہیں:

سب سے پہلے: اسے یہ یقین نہیں رکھنا چاہیے کہ وہ دم اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اسے فائدہ دے گا، اگر اسے یقین ہو کہ خدا کی اجازت کے بغیر یہ بذات خود اسے فائدہ پہنچائے گا تو یہ حرام ہے، بلکہ یہ شرک ہے، اسے یقین ہونا چاہیے کہ وہ دم خدا کی اجازت کے بغیر کوئی

فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

دوسری بات یہ کہ: کسی ایسی چیز کے ساتھ نہ ہو جو شریعت کے خلاف ہو، جیسے کہ دعا کا مواد خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے درخواست یا جنات یا اس سے ملتی جلتی چیزوں سے درخواست ہو، اگر ایسا ہو تو حرام ہے، بلکہ شرک ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ: اس کا ایک واضح تصور اور مفہوم ہو، اگر یہ طلسم یا جادو کی قسم کا ہو تو اس صورت میں جائز نہیں ہے، امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ آدمی دم کرسکتا ہے؟ اور اس کے ذریعے سے دعا مانگ سکتا ہے؟ امام نے فرمایا: اگر کلام پاک کے ساتھ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

ممنوع رقیہ:

تمام وہ تعویذ جن میں مذکورہ بالا شرائط نہ ہوں جیسا کہ تعویذ کرنے والا یا جس کے لیے تعویذ کیا جاتا ہے اس کا یہ عقیدہ ہو کہ یہ تعویذ بذات خود فائدہ پہنچاتا ہے اور اثر کرتا ہے یا مشرکانہ الفاظ اور کفریہ وسیلوں کے ساتھ اور بدعی الفاظ یا اس جیسے ہوں یا سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ کے ساتھ یا جادو جیسی چیزوں کے ساتھ ہو تو حرام اور ممنوع ہے۔

رقیہ سے علاج بہتر ہے یا ڈاکٹر کے پاس جانا

سب سے پہلے: سنت نبوی ﷺ میں بیماری کے مداوا اور علاج کی ترغیب دی گئی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تداووا فإن الله عز وجل لم يضع داءً إلا وضع له دواءً غير داء واحد اللهم" (امام احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ)۔

ترجمہ: "یعنی اپنے مریضوں کا علاج کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی تکلیف یا بیماری نہیں رکھی ہے سوائے اس کے کہ اس نے اس کا علاج بھی رکھا ہے، سوائے ایک درد کے اور وہ ہے بڑھاپا۔"

امام احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ: "تداووا عباد الله، فإن الله عز وجل لم يزل داءً ألا أنزل معه شفاءً إلا الموت والهرم" ترجمہ: یعنی: "اے خدا کے بندو! اپنی بیماریوں کا علاج کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نازل نہیں کی، مگر یہ کہ اس کے ساتھ شفاء بھی بھیجی ہے، سوائے موت اور بڑھاپے کے"

اور پھر امام احمد کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: "فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يُزَلْ دَاءُ الْأَنْزَلِ لَهُ شِفَاءٌ، عَلَيْهِ مَنْ عَلَيْهِ، وَجْهَهُ مَنْ جَهِلَهُ" یعنی: "اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں بھیجی ہے مگر یہ اس کے لیے شفاء بھی بھیجی ہے، بعض نے اس علاج کو سمجھا ہے اور بعض نے نہیں سمجھا ہے"

دوسری بات یہ ہے کہ: کائنات میں خدا تعالیٰ کا نظام ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کے انجام دہی کے لیے ایک سبب رکھا ہے۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی سبب کے کسی چیز کو نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ خود اسباب بھی تو خدا کی مخلوقات میں سے ہیں، یہ لازم ہے کہ خود سبب کو بھی اللہ تعالیٰ تخلیق کر لے،

اس بنا پر جو شخص رزق چاہتا ہے اسے اس کے لیے اسباب مہیا کرنا ہوں گے، اور اس کے اسباب بھی حلال رزق تلاش کرنے کی کوشش ہے، جب بھی کوئی شخص کو کوشش کرے گا تو اللہ اپنے اصولوں کے مطابق اسے رزق دے گا، جب وہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بیماری کے علاج کے لیے ایک ذریعہ رکھا ہے، جب تک بیمار اس ذریعہ کو استعمال نہ کرے اس کی بیماری ٹھیک نہیں ہوگی۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون اس بات پر مبنی ہے، کہ جب تک حرکت نہ ہو نتیجہ نہیں آئے گا۔

البتہ یہ امر لازمی نہیں ہے، یعنی ہر گز ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص اسباب اختیار نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی مطلوبہ نتائج پر قادر نہیں ہے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مریم بنت عمران محراب میں عبادت کرتی تھیں، رزق اور روزی حاصل کرنے کی کوشش کیے بغیر، اللہ تعالیٰ اس کا رزق و روزی پہنچاتا تھا۔

"فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكَ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (سورہ آل عمران: ۳۷)

ترجمہ: "پس اس کے رب نے اسے اچھی قبولیت کے ساتھ قبول کیا اور اچھے نشوونما کے ساتھ اس کی پرورش کی اور اس کا کفیل زکریا کو بنا دیا، جب کبھی زکریا اس کے پاس عبادت خانے میں داخل ہوتا، اس کے پاس

کوئی نہ کھانے کی چیز پاتا، کہا اے مریم! یہ تیرے لیے کہاں سے ہے؟ اس نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے، بے شک اللہ جسے چاہتا ہے کسی حساب کے بغیر رزق دیتا ہے"

اس لیے اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ صرف ارادہ کرے اور وہ کام ہو جائے: "بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ" (سورہ بقرہ: ۱۱۷)

ترجمہ: "آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اور جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے صرف یہی کہتا ہے کہ ہو جاؤ تو وہ ہو جاتا ہے"

اس کے باوجود اللہ نے ایسا فیصلہ کیا ہے کہ اگر اس کا بندہ جدوجہد اور کوشش نہ کرے تو مطلوبہ نتیجہ اسے نہیں دے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔

لیکن بعض اوقات اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کے مطابق ایسا فیصلہ کرتا ہے کہ اگرچہ انسان نے اسباب اختیار کیے ہوں لیکن پھر بھی اپنے مقصود پر نہیں پہنچ سکے، یہ موقع ہے کہ کہتے ہیں: خدا کی حکمت عام رواج کے خلاف قائم ہو گئی۔

مثال کے طور پر ایک شخص بیمار ہے، اسے چاہیے کہ اپنی بیماری کے علاج کے لیے مروجہ طریقے استعمال کرے، یہ نہیں کہ وہ گھر میں بیٹھے اور کوئی کام نہ کرے، کیونکہ اس کی شفا یا بی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو اسباب مہیا کیے ہیں (مثلاً: ڈاکٹر، دوا، دعا وغیرہ) اسے استعمال کرے، بعد اس کے ایک بیمار شخص اپنی بیماری کے علاج کے لیے تمام ضروری اور جائز ذرائع استعمال کرتا ہے، اس کی کوششوں کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اگر اللہ چاہے تو ان اسباب کو اس کے شفاء کا ذریعہ بنا دیتا ہے، اور اس کی بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے۔

اگر اللہ نے نہیں چاہا، اگرچہ اس نے اسباب کا استعمال کیا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہماری مرضی کے خلاف تھی، اس لیے نتیجہ وہی نکلے گا جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، کیونکہ اللہ کی حکمت اسی پر قرار پاتی ہے، چونکہ ہم اللہ کے ارادے کو نہیں جانتے، کیونکہ ہمارا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے، پس ہمیں یہ منفی سوچ نہیں رکھنا چاہیے کہ اگر اللہ نے چاہا تو بہتر ہو جائیں گے، اگر نہیں چاہا تو ہم ٹھیک نہیں ہوں گے، اس لیے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، یا ہم کچھ بھی نہ کریں، ضروری اور جائز اسباب کو

استعمال نہ کریں کیونکہ ہمیں معلوم نہیں، جانتے نہیں کہ خدا نے کیا چاہا ہے، شاید اگر ہم اسباب استعمال کرتے تو اللہ تعالیٰ ہمیں شفاء دے دیتا۔

اس لیے چونکہ کائنات میں اسباب اور مسببات کا نظام قائم ہے، اگر کوئی حرکت وقوع پذیر نہ ہو تو برکت بھی حاصل نہیں ہوگی، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کچھ اور چاہے۔

حسن اختتام

یہ سورت عقیدہ توحید اور اسلام میں یکتا پرستی کو ثابت کرتی ہے، اور اس کی وضاحت کرتی ہے، جس طرح سورہ کافروں عقیدہ توحید او شرک کے عقیدہ کے درمیان ہر قسم کی یکسانیت اور سمجھوتے کی نفی کرتی ہے، دونوں سورتوں میں سے ہر ایک الگ الگ طریقے سے یکتا پرستی اور توحید کی حقیقت کا جائزہ لیتی ہے، اور اس کو بیان کرتی ہے، پیغمبر ﷺ صبح کی نماز میں اس کی تلاوت سے اپنے دن کا آغاز فرماتے تھے، اس آغاز کا اپنا ایک خاص مطلب تھا۔

امام غزالی "جواہر القرآن" میں فرماتے ہیں: قرآن میں "خدا شناسی" "آخرت کو جاننا اور سمجھنا" "سیدھے راستے کا جاننا" ضروری ہے، جن کا نام "معارف سہ گانہ" ہے، تمام چیزیں ان کے تابع ہیں، اور سورہ اخلاص بھی ان میں شامل ہے، یعنی: "خدا شناسی" ہے۔

اے ہمارے پروردگار! ہمیں توحید کے خالص چشمے سے سیراب کر، اور ہمیں شرک سے محفوظ رکھ۔

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جزء - (30)

سورة الفلق

سورة الفلق مدینہ میں نازل ہوئی اس کی پانچ (5) آیتیں ہیں

وجه تسمیہ:

اس سورت کا نام "الفلق" اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کا آغاز اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے: "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" سورہ "فلق" مکی ہے یا مدنی، اس میں مفسرین کا اختلاف ہے، مفسرین کا کہنا ہے کہ: نہ صرف سورت کا متن "مدنی" ہے، بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ یہ سورہ مدینہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے۔

مفسرین اس سورت کے مدنی ہونے کے بارے میں جو دلائل دیئے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس سورہ میں "حسد" کے بارے میں بحث کی گئی ہے: اور یہ منحوس صفت طاقت اور مراعات حاصل کرنے کے مراحل میں سے ایک آفت ہے، نہ کہ کمزوری اور عاجزی اور مراعات سے محروم ہونے کی، مکی دور میں نبی کریم ﷺ کسی کے حسد کو بھڑکانے کی حالت میں نہیں تھے، مکہ میں مسلمان اپنے مشکل دن اور حالات گزار رہے تھے، کیونکہ ان دنوں وہ آرام اور سکون سے محروم تھے، البتہ مسلمان جب مدینہ میں تھے تو ان کی حالت بدل گئی، اور جزئی طور پر بہتری آئی۔

لیکن حسن، عطاء، عکرمہ اور جابر کے نزدیک سورہ "فلق" اور سورہ "ناس" کو مکی سمجھا جاتا ہے، اکثر علماء کی یہی رائے ہے، لیکن ابن عباس، قتادہ اور دوسرے گروہ کی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے، ابن کثیر کا یہی قول ہے، اور بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔

مرحوم شیخ علی صابونی اپنی تفسیر "صفوة التفسیر" میں لکھتے ہیں کہ: سورہ فلک مکہ میں نازل ہوئی اور انسان کو اللہ کی پناہ مانگنے کا درس دیتی ہے، اور خدا کی مخلوقات، اور رات کی تاریکی سے بھی اللہ کی پناہ مانگے، کیونکہ رات کے اندھیرے میں لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں اور جرائم پیشہ افراد بھی رات کے وقت سرگرم رہتے ہیں۔

سورہ فلق انسان کو یہ بھی سکھاتی ہے کہ وہ ہر حسد کرنے والے اور جادوگر کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے، یہ سورت ان دو معوذتین میں سے ایک ہے جن کو پڑھ کر رسول اللہ ﷺ اپنے آپ کو خدا کی حفاظت قرار دیتے تھے۔

"تفہیم القرآن" کے مفسر لکھتے ہیں: اگرچہ سورہ فلق اور ناس قرآن کریم کی آخری سورتیں اصل میں دو الگ الگ سورتیں ہیں، اور مصحف میں الگ الگ ناموں کے ساتھ شامل ہیں، لیکن ان کے درمیان اتنا گہرا تعلق ہے اور ان کے موضوعات کا ایک دوسرے سے اس قدر مناسبت ہے کہ دونوں کا مشترکہ نام بھی معوذتین (وہ دو سورتیں جن کے ذریعے پناہ مانگی جاتی ہے) کے نام سے ہے، امام بیہقی "دلائل النبوة" میں لکھتے ہیں کہ: یہ دونوں سورتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں ہیں، اس لیے ان دونوں کا مشترکہ نام معوذتین ہے۔

سورة الفلق کا سورة الاخلاص سے ربطہ

سورة الاخلاص میں الوہیت کے متعلق بحث کی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کو اس چیز سے منزہ اور پاک قرار دیا ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے، سورہ فلق اور ناس بیان کرتی ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں ان لوگوں سے جو توحید اور توحید کی راہ میں رکاوٹ بننے والے ہیں اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، دونوں کا آغاز استعاذہ سے ہوتا ہے، اسی طرح سورة الفلق اندھیری رات کے شر، جادوگروں، غیبت کرنے والوں، فتنہ بازوں اور حسد کرنے والوں سے اور سورہ ناس شیطانوں، جنوں اور انسانوں کے شر اور فریب کاری سے ہمیں حق تعالیٰ کی پناہ میں رکھتی ہیں۔

سورہ فلق انسان کو مخلوق کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کا طریقہ سکھاتی ہے، تاکہ مختلف مخلوقات کے شر سے اور رات کی پھیلی ہوئی تاریکی، چالوں، جھوٹ جادوگری، فریب، چالاکیوں، بیہودہ باتوں، فتنہ انگیز باتیں کرنے والے، سازشیں کرنے والے، تہمت لگانے والے جو میاں بیوی کے درمیان جدائی کا باعث بنتے ہیں اور حسد کرنے والوں کی برائی سے جو بہت زیادہ رشک کرتے ہیں، اور خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو جو دوسروں کو حاصل ہیں برباد کرنا چاہتے ہیں کہ شر سے محفوظ رہیں۔

سورة الفلق کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورة الفلق کا ایک (۱) رکوع، پانچ (۵) آیتیں، تیس (۲۳) الفاظ، (تہتر) (۴۳) حروف اور پینتالیس (۳۵) نقطے ہیں۔

(یادر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة فلق کی آیات کی تقسیم

آیت: (۱) استعاذہ اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کی ذمہ داری کا اظہار کرتی ہے، آیات مبارکہ "۲ تا ۵" میں ان چیزوں کا بیان ہے کہ عام طور پر انسان کے لیے ان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنا ضروری ہے، اس کے ساتھ ساتھ جن برائیوں کی طرف اس سورت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ قیامت کے آنے تک موجود ہوں گی۔

سورة الفلق کی فضیلت

قرآن کریم کی تمام سورتوں کے اپنے اپنے خاص فضائل ہیں کہ ان کے پڑھنے تلاوت کرنے اور ان کے معانی و مفہیم میں غور و فکر کرنے، ان میں موجود رہنما اصولوں پر عمل کرنے سے انسان کو دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

بس ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قرآن کریم ہم انسانوں کے لیے زندگی کا لائحہ عمل اور عمل کی کتاب ہے، جس کی تلاوت فکر و ایمان کی ابتدا ہے اور قرآن کے مشمولات پر عمل کرنے کا ذریعہ ہے، اور نیک لوگوں کو تمام اعمال صالحہ کا اجر عظیم بھی یہاں سے اور انہی شرائط سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قرآن کی سورتوں کی تلاوت انسان کے ایمان اور عقیدہ کو تقویت پہنچا کر، دل کی پاکیزگی میں اضافہ کرے، گناہوں میں تخفیف کرے، انسانوں کی عبادت کو افضل اور بہتر بنا کر مسلمان کو کمال اور ترقی کے اعلیٰ درجے پر پہنچا دیتی ہے۔

لہذا یہ بھی ذہن نشین رہے کہ، قرآن کریم کی سورتوں کی تلاوت، خاص طور پر جب تلاوت آیات مبارکہ کے معانی اور مفہیم پر غور و فکر کے ساتھ ہو، تو بہت سی ذہنی اور روحانی بیماریوں کا علاج کرتی ہے،

انسان کے غم اور پریشانی کو کم کرتی ہے، آنکھوں کی روشنی کو تیز کرتی ہے، یاد رکھیں کہ قرآن عظیم انسان کی تنہائی کا ساتھی ہے، یہ انسانی زندگی کو بابرکت بناتا ہے اور دعا کی قبولیت کو یقینی بناتا ہے، قرآن کی سورتوں کی تلاوت سے گھر صاف ہوتا ہے، عذاب سے نجات ملتی ہے اور انسان کے لیے دوسری نعمتیں اور برکتیں لاتا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ قرائت کا کمال کے درجہ تک پہنچنا، اسی طرح غور و فکر اور عمل کی منزل تک پہنچنا، یہ ثواب کے کمال اور رضائے الہی کے حصول اور بہتر نعمتیں حاصل کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

ایک اور نکتہ جو میں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن پڑھنے کو کاروبار کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے، کہ کونسی سورت ہے جس کو پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے، جس کو ہمیشہ پڑھنے سے دوسری سورتوں کے پڑھنے سے ہم محروم رہیں۔

قرآن ایک مجموعہ ہے جو اکٹھا ہونا چاہیے اور انسان ان سب سورتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کرسکتا ہے۔

دوسری سورتوں کی طرح سورہ فلق کی بھی فضیلتیں ہیں جیسا کہ سورہ فلق اور سورہ ناس کی فضیلت کے بارے میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ: "كَانَ إِذَا اشْتَكَى يَقْرَأُ عَلَى نَفْسِهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَيَنْفُثُ، فَلَمَّا اشْتَدَّ وَجَعُهُ كُنْتُ أَقْرَأُ عَلَيْهِ وَأَمْسَحُ بِبِدْنِ رَجَاءَ بَرَكْتِهَا" ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار پڑتے تو معوذات کی سورتیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے، پھر جب آپؐ کی تکلیف بڑھ گئی تو میں ان سورتوں کو پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو برکت کی امید سے آپ کے جسم مبارک پر پھیرتی تھی۔"

حضرت بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں: جن لمحوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدید ہوجاتی تھی، میں سورہ "فلق" اور سورہ "ناس" پڑھتی تھی اور برکت کی امید سے آپ کے جسم پر ہاتھ پھیرتی تھی۔

عقبہ بن عامرؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عَنْ عَقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلى الله عليه وسلم): «أَلَمْ تَرَ آيَاتِ أَنْزَلَتْ اللَّيْلَةَ لَمْ يَرِ مِثْلُهُنَّ (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) وَ (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ) ترجمہ: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جو آیتیں آج مجھ پر نازل کی گئی ہیں ان جیسی (آیتیں) کبھی دیکھی تک نہیں گئیں؟" اور وہ سورۃ الناس اور سورۃ الفلق ہے۔"

اسی طرح عقبہ بن عامر فرماتے ہیں: "بَيْنَا أَنَا أَسِيرٌ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ (صلى الله عليه وسلم) بَيْنَ الْجُحْفَةِ وَالْأَبْوَاءِ إِذْ غَشِيَتْنا رِيحٌ وَظُلُمَتُ شَدِيدَةٌ فَجَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ (صلى الله عليه وسلم) يَتَعَوَّذُ بِ (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) وَ (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ) وَيَقُولُ: "يَا عَقْبَةُ تَعَوَّذْ بِهَما فَمَا تَعَوَّذَ مَتَعَوَّذَ بِمَثَلِهِما" قَالَ: وَسَمِعْتُهُ يُؤَمِّمُاهُمَا فِي الصَّلَاةِ" ترجمہ: "ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابواء اور جحفہ کے درمیان سفر کر رہا تھا کہ اندھی اور اندھیرے نے ہمیں گھیر لیا، نبی کریم ﷺ نے سورة الناس اور سورة الفلق سے دم کرنا شروع کیا، اور فرمایا: اے عقبہ! ان کے ساتھ (خود کو) دم کرو، کیونکہ ان سورتوں کی طرح کسی دم کرنے والے نے دم نہیں کیا"

راوی مزید اضافہ کرتے ہیں: "آپ نماز کی امامت فرما رہے تھے، میں نے سنا کہ نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھیں۔"

نیز ایک اور حدیث میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اقْرَأْ يَا جَابِرُ فَقُلْتُ: وَمَاذَا أَقْرَأُ يَا أَبِي أَنْتَ وَأُمِّي يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ: اقْرَأْ (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) وَ (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ) فَقَرَأْتُهُمَا فَقَالَ: اقْرَأْ بِهَما وَلَنْ تَقْرَأَ بِمَثَلِهِما" ترجمہ: "پڑھ اے جابر! میں نے پوچھا کیا پڑھوں، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اے اللہ کے رسول؟ فرمایا: "سورہ فلق اور سورہ ناس" میں نے ان دونوں سورتوں کو پڑھ لیا، آپ نے فرمایا: ان دونوں سورتوں کو پڑھ لو، ان کی طرح ہر گز نہیں پڑھ سکو گے"

عقبہ بن عامرؓ ایک اور حدیث میں سورہ فلق کی فضیلت کے بارے میں کہتے ہیں: "قلت: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَقْرَأْنِي إِمَّا مِنْ سُورَةِ (هُود)، وَإِمَّا مِنْ سُورَةِ (يُوسُف)، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلى الله عليه وسلم): «يَا عَقْبَةُ بْنُ عَامِرٍ، إِنَّكَ لَنْ تَقْرَأَ سُورَةَ أَحَبِّ إِلَى اللَّهِ، وَلَا أَبْلَغَ عِنْدَهُ مِنْ أَنْ تَقْرَأَ: (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ)، فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ لَا تَفُوتَكَ فِي صَلَاةٍ فَافْعَلْ." ترجمہ: میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! چند آیتیں سورہ ہود اور سورہ یوسف سے مجھے پڑھا دیں، آپ نے فرمایا: اے عقبہ: ہمارے رب کو سورہ فلق سے زیادہ پیاری اور فصیح کوئی سورت نہیں جو تم پڑھ سکتے ہو، کوشش کرو کہ نماز میں اسے پڑھنا تجھ سے رہ نہ جائے۔"

معوذتین کی فضیلت

ترمذی اور بیہقی میں ابوسعید خدریؓ سے معوذتین کی فضیلت کے بارے میں مروی حدیث ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنوں اور انسانوں کی آنکھوں کے شر سے رب العزت کی پناہ مانگتے تھے، معوذتین کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ان دو سورتوں کی تلاوت کی، اور اس سلسلے میں پڑھی جانے والی دوسری دعاؤں کو چھوڑ دیا۔"

امام مالک مؤطا میں حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پریشان ہوتے تو معوذتین پڑھتے تھے، اور خود کو دم فرماتے، اس کام کو تین بار دہراتے، اور جب ان کی تکلیف شدید ہوجاتی تو میں ان کے لیے معوذتین پڑھتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برکت کی حصول کی امید سے اپنے ہاتھ جسم پر پھیرتے یعنی: خود کو دم فرماتے تھے۔"

اسی طرح عقبہ بن عامر سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھوں۔"

اسی طرح ان سے مروی دوسری روایت میں ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: جب بھی سوئیں اور جب بھی بیدار ہو تو معوذتین پڑھیں۔"

ابن کثیر نے اس معنی میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں اور کہا ہے: عقبہ سے مروی حدیث کے بہت زیادہ طرق ہیں جو کہ حد تواتر کو پہنچ جاتے ہیں، اس لیے یہ حدیث بہت سے محققین کی نظر میں یقین کے لیے مفید ہے۔"

ہذا دوسری حدیث میں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یا عقبہ ألا أعلمک سوراً ما أنزلت فی التوراة ولا فی الزبور ولا فی الإنجیل ولا فی الفرقان مثلہن، لا یأتین علیک إلا قرأتہن فیہا، "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" و "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" و "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن عامر کو مخاطب کر کے فرمایا: اے عقبہ کیا میں تمہیں کچھ سورتیں نہ سکھاؤں جو ان جیسی تورات، انجیل، زبور اور قرآن میں نازل نہیں ہوئیں، تجھ پر کوئی ایسی رات نہ گزرے مگر یہ کہ تو انہیں پڑھے، وہ "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" اور "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ"

اور "قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" ہیں۔ (یہ روایت سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ میں حدیث نمبر ۲۸۶۱ میں ہے)

معوذتین کا سبب نزول:

"قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" کے بارے میں کئی احادیث مفسرین نے ذکر کی ہیں: لیکن یہاں اختصار کے لیے (بیہقی اور بخاری و مسلم) کی دو حدیثوں پر اکتفا کریں گے۔

حضرت بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں: نبی کریم ﷺ پر جادو کیا گیا، اس طرح کہ آپ کوئی کام نہیں کیے ہوتے، آپ کو ایسا لگتا تھا کہ آپ وہ کام کر چکے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن آپ ﷺ نے حق تعالیٰ سے بہت زیادہ دعا کی، پھر فرمایا: "کیا تم جانتے ہو ہمارے عظیم رب نے مجھے میرے علاج کا طریقہ بتایا؟ دو آدمی میرے پاس آئے، ان میں سے ایک میرے سر ہانے اور دوسرا پاؤں کے پاس بیٹھ گیا، پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا: اس آدمی کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا: اس پر جادو کیا گیا ہے، پوچھا: کس نے جادو کیا ہے؟ کہا: لبید بن اعصم نے، اس نے پوچھا: کس چیز کے ذریعہ جادو کیا؟ کہا: کنگھی کے ذریعہ، کتان کے ریشے اور کھجور کے پھولوں کے چھلکے سے، پوچھا کہاں ہیں وہ؟ کہا: ذروان کے کنویں میں، راوی کہتے ہیں کہ: پھر آپ ﷺ کنویں کی طرف نکل پڑے، اور واپسی کے بعد عائشہؓ سے کہنے لگے: "وہاں کے کھجور شیطان کے سروں کی طرح تھے" عائشہؓ نے پوچھا: آپ نے انہیں کنویں سے باہر نکالا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "جی ہاں، مجھے تو رب نے شفاء عطا کی، لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس سے لوگوں کو نقصان پہنچے پھر اس کنویں کو مٹی سے بھر دیا۔"

بیہقی "دلائل النبوة" میں کلبی کے توسط سے ابی صالح اور ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: جب نبی کریم ﷺ نے رات گزار کر صبح کر لی تو عمار بن یاسر کو چند لوگوں کے ساتھ وہاں بھیج دیا، جب وہ کنویں پر گئے تو انہوں نے کنویں کا پانی مہندی کے پانی جیسا پایا، انہوں نے کنویں کا پانی نکالا اور پتھر کو اٹھایا، اس تعویذ کو باہر لاکر جلادیا، اس میں ایک ڈورتھی جس میں گیارہ (۱۱) گرہیں بندھی ہوئی تھیں، پھر یہ دو سورتیں نازل ہوئیں، نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سورتوں کو پڑھنا شروع کیا، ایک آیت پڑھتے تو ایک گرہ کھل جاتی (اس حدیث کو بیہقی نے کلبی سے روایت کیا ہے) اسی طرح معوذتین کے سبب نزول کے بارے میں

بخاری اور مسلم میں بی بی عائشہؓ سے مندرجہ ذیل روایات کی گئی ہیں:
 "لبید بن اعصم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس طرح جادو کیا کہ
 اس نے کھجور کے پھول کے چھلکے اور کنگھی کرتے وقت رسول خدا
 کے سر سے گرے ہوئے بال، اور کنگھی کے دانت اور ایک دھاگہ لیا،
 جس میں "۱۱" گرہیں بندھی تھیں، سوئی سے گرہیں مضبوط کی گئی تھیں،
 کھجور کے چھلکے میں ڈالی اور دم کی گئی تھیں۔

یہ وہ وقت تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر معوذتین نازل ہوئیں تو
 آپؐ نے ان کی تلاوت شروع کر دی، گویا کہ ہر آیت کی تلاوت پر ایک گرہ
 کھل جاتی، اور اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان گرہوں کے کھلنے
 سے ایک قسم کی راحت اور سکون محسوس کرتے تھے، یہاں تک کہ
 آخری گرہ کھل گئی، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کھڑے
 ہوئے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قید سے رہا ہو گئے ہوں۔

جبریلؑ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دعا پڑھتے اور دم کرتے تھے اور
 کہتے: "باسم اللہ ارقیک، من کل شیء یؤذیک، من شر حاسد و عین و اللہ یشفیك" ترجمہ: "اللہ
 کے نام سے میں تمہیں دم کرتا ہوں ہر تکلیف دہ چیز سے، ہر ذی روح اور
 ہر حاسد کی آنکھ کے شر سے، اللہ تمہیں شفاء دے، اللہ کے نام کے ساتھ
 تمہیں دم کرتا ہوں۔"

منقولہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو
 کا اثر ہلکا سا سر درد تھا، یہ وہی تصور کا معنی ہے جو ایک حدیث
 میں آیا ہے۔

واضح رہے کہ بعض اوقات تخیل بیداری میں بھی ہوتا ہے اور نیند میں بھی،
 اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ سحر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
 خصوصیات اور عقلی صلاحیتوں پر کوئی اثر نہیں ہوا، جیسا کہ سحر لبید بن
 اعصم کا نبوت اور وحی سے متعلق معاملات میں کوئی اثر نہیں تھا، کیونکہ
 اللہ تعالیٰ نے انہیں معصوم اور ایسے کسی عیب، یا کسی قسم کی فکری
 الجھن، یا اعصابی اضطراب سے محفوظ رکھا، جیسا کہ فرماتا ہے: "وَاللّٰهُ
 یَعْصِیْكَ مِنَ النَّاسِ" (سورہ مائدہ: ۶۷) ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تم کو لوگوں کے شر
 سے بچائے گا۔"

تفسیر "فی ضلال القرآن" کے مفسر نے اس سورت کی مختصر تشریح میں

کہا ہے کہ یہ سورہ اور اس کی بعد والی سورہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی اور ہدایت ہے پہلے اپنے نبی کے لیے، اور پھر تمام مؤمنوں کے لیے۔

جو ان کو راستہ دکھاتی ہے اور ان کی رہنمائی کرتی ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں، اور اس کی پناہ گاہ میں پناہ لے لیں، اور ہر خوفناک چیز سے، خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ، خواہ معلوم ہو یا نامعلوم، خواہ کم ہو یا زیادہ، خواہ وہ جزوی ہو یا کلی، گویا اللہ اپنی حفاظت اور پناہ کی جگہ ان کے لیے کھول دیتا ہے، اور اپنی پناہ گاہ کی پناہ کو ان کے لیے وسیع بنا دیتا ہے، اور ان سے شفقت و مہربانی، پیار اور محبت سے کہتا ہے: یہاں آؤ، حفاظت اور مدد کی جگہ پر آؤ، امن والی جگہ پر آؤ، ایسی جگہ جہاں تم محفوظ رہو گے اور سکون پاؤ گے، آجاؤ میں بہتر جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو اور تمہارے دشمن ہیں اور تمہارے ارد گرد خوف و ہراس ہے، صرف یہاں، جی ہاں! یہاں محفوظ سکون، امن اور سلامتی و صحت ہے، اس لیے اس ہدایت اور رہنمائی کے ساتھ دونوں سورتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

سورہ فلق کا مرکزی محور اور مشتملات

سورۃ الفلق میں تعلیمی اور تربیتی مشتملات ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا رب پہلے مرحلے میں رسول اللہ ﷺ کو اور دوسرے مرحلے میں تمام مسلمانوں کو یہ سکھاتا ہے کہ تمام اشرار کے شر سے بچنے کا واحد راستہ خدا کی پناہ لینا ہے، سورت یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے رب کی حفاظت میں پناہ لیں، اور اس کی مخلوقات کے شر سے اس کی جلال و عظمت میں پناہ مانگیں، اور رات کے شر سے جب اندھیرا چھا جاتا ہے، دہشت اور خوف روحوں کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے، گناہ اور برائیاں پھیل جاتی ہیں، یہ سورت ان معوذتین میں سے ایک ہے جس سے رسول اللہ ﷺ خود کو دم کرتے تھے، جس سے ہم انسانوں کو صرف رب عظیم کی پناہ لینے کا درس ملتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شیطانی مخلوق کے شر سے محفوظ پناہ گاہ ہے، اور یقین رکھیں کہ اس کی پناہ میں انسان مکمل تحفظ اور سکون محسوس کرتا ہے۔

نیز اس سورت میں ہم انسانوں کے لیے واضح ہدایت ہے کہ اپنی زندگیوں (بشمول اپنی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی) اپنی اولاد، مال و دولت کو خدا کی حفاظت میں رکھیں اور ہمیں اطمینان ہونا چاہیے کہ حق

تعالیٰ کی پناہ میں انسان ہر شر والی چیز کے شر سے محفوظ رہے گا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس سورت کا مرکزی اور اصلی محور پناہ مانگنا اور رب عظیم سے چمٹے رہنا ہے، ہر چیز کے شر سے، خواہ چاہے ظاہر ہو یا پوشیدہ، خواہ وہ معلوم ہو یا نا معلوم، خواہ کم ہو یا زیادہ، خواہ جزوی ہو یا کلی، یہ ایک تعمیری اور نصیحت آموز سبق ہے، ایک مفید سبق اور درس ہے لوگوں کے لیے حفاظت ہے ان میں سے ایک کو دوسرے سے، نفسیاتی امراض سے بچانے کے لیے، اور انہیں زہریلی اور مہلک چیزوں کے شر سے اور رات کے شر سے جب اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس میں خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے، خاص طور پر صحراؤں اور غاروں میں خوف پیدا ہو جاتا ہے، سورت کا نام بھی رب عظیم کی پناہ لینے پر دلالت کرتا ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث (۴۹۷۶) میں آیا ہے کہ: "عن أبي بن كعب قال: سألت رسول الله عن البعوذتين فقال قيل لي فقلت. فنحن نقول كما قال رسول الله " ترجمہ: "ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے معوذتین (یعنی سورہ ناس اور فلق) کے بارے میں پوچھا: (ابی بن کعب نے یہ سوال اس وقت پوچھا جب انہیں یہ خبر ملی کہ ابن مسعود اپنے مصحف میں یہ دو سورتیں نہیں لکھتے تھے، جیسا کہ وہ سمجھتا ہے یہ دونوں سورتیں قرآن پاک کی نہیں ہیں) اس نے کہا: "مجھ سے جو کچھ کہا گیا، تو میں نے کہا"، یعنی: یہ دو سورتیں وحی کی گئی ہیں، اور میں نے کہا یہ وحی سے ہے، اور ہم وہی کہہ رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

چنانچہ عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ان دو سورتوں کو اپنے پاس موجود قرآن میں درج نہیں کیا تھا، ان کا خیال یہ تھا کہ یہ دونوں سورتیں نماز کی دعائیں ہیں، جو شر اور برائیوں کو دفع کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہیں، اور قرآن میں سے نہیں ہیں، اس لیے اسے قرآن میں درج نہیں کرنا چاہیے، لیکن پھر صحابہ کرامؓ نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ قرآن میں سے ہیں، تو عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنا قول بدل کر اپنے مصحف میں یہ سورتیں لکھیں۔

فیض الباری شرح مختصر صحیح البخاری، تالیف عبدالرحیم فیروز ہروی حدیث شمارہ: (۹۷۶) کی تشریح میں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة الفلق

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثِ فِي الْعُقَدِ ۝۴
وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝۵

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱	کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی
مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲	ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی
وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝۳	اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے (۳)
وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثِ فِي الْعُقَدِ ۝۴	اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے
وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝۵	اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

أَعُوذُ (عوذ) میں پناہ مانگتا ہوں، میں پناہ چاہتا ہوں، "الْفَلَقِ" صبح کی وہ روشنی جو رات کی تاریکی کو پہاڑ کر پردے کی طرح ایک طرف ہٹا دیتی ہے، (انعام: ۹۵، "فَالِقُ الْخُبِّ وَالنَّوْثِ" ۝ اور "فَالِقُ الْإِصْبَاحِ" ۝۹۶)

"مَا خَلَقَ" جو کچھ اس نے پیدا کیا، "غَاسِقٍ" (غسق بہت ہی اندھیری رات، رات کے واقعات، (اسراء: ۷۸) "وَقَبَ": اس نے ڈھانپ لیا، وہ پلٹا، گھیر لیا، داخل ہوا۔

"النَّفَّاثِ" (نفث) جمع نفاثہ، فوت کرنے والے، دم کرنے والے، جادو، منتر کرنے والے چغل خوری کرنے والے، فساد کرنے والے، فسادی مبالغہ کے لیے ہے نہ کہ تانیث کے لیے، جیسے "بَصِيرَةٌ" سورہ قیامہ کی آیت: (۱۴)

"العُقَدِ" جمع عقدة، گرہیں، معاملات، حاسِدِ: حسد کرنے والے تنگ نظر، برے منہ والا (فرقان)

تفسیر

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱	کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی

"أَعُوذُ" پناہ مانگتا ہوں، کہو: اس رب کی پناہ مانگتا ہوں جو بیچ اور گٹھلی اور صبح کو پہاڑتا ہے، "الْفَلَقِ" صبح ہے، کیونکہ رات اس سے نکلتی اور پھوٹتی ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ: "الْفَلَقِ" یعنی: صبح، جیسا کہ کہا ہے: "فَالِقُ الْإِصْبَاحِ" (مختصر: ۳/۶۹۳) اور عرب کے محاوروں میں لکھا ہے: "هُوَ أَبِينِ مِنْ فَلَاقِ الصَّبْحِ": وہ صبح کی روشنی سے زیادہ واضح ہے۔

مفسرین نے کہا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو صبح کے وقت رب کی پناہ لینے کا جو حکم دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ضرورتوں اور حاجات کو دور کرنے کے ساتھ رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی اور نور کا چمکنا ایک محاورہ اور ضرب المثل بن گیا ہے کہ: اندھیری رات کے آخر میں روشنی ہے، پس جس طرح انسان صبح کا انتظار کرتا ہے، اسی طرح خوف زدہ شخص نجات کا انتظار کرتا ہے۔

"عُوذُ" کا مصدر لفظ "أَعُوذُ" واحد متکلم اس کے مضارع سے ہے، اس کا معنی ہے: خود کی حفاظت کرنا، اور برائی سے بچانا، اس رب کی پناہ لیتے ہوئے جو اس برائی کو دور کر سکتا ہے، اور لفظ "فلق" فا کے فتح اور "ل" کے سکون کے ساتھ، بمعنی پہاڑ نے اور الگ کرنے کے ہیں، جب یہ لفظ دو فتح کے ساتھ آئے تو مفعول کے معنی میں ہوگا، اور اکثر یہ لفظ صبح کے وقت کے لیے استعمال ہوتا ہے، "فلق" یعنی وہ لمحہ جب روشنی اندھیرے کا گریبان چاک کر کے چمکتی ہے۔

اس بنا پر "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" کا معنی کچھ یوں ہے: کہو کہ میں اس عظمت

والے رب کی پناہ مانگتا ہوں جو اسے پھیلا تا اور پھاڑتا ہے، یہ تفسیر اس لیے موزوں ہے کہ برائی سے مانگنے کا مسئلہ جو بذات خود نیکی کا پردہ اور اس کی راہ میں رکاوٹ ہے، کسی سے پوشیدہ نہیں، صبح اس لیے کہ جب سحر نمودار ہوتی ہے تو رات کا سیاہ پردہ پھٹ جاتا ہے، یہ اصطلاح صبح کے طلوع کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

بعض نے اس سے مراد مخلوق، یعنی دنیا کی تمام مخلوقات سمجھا ہے، کیونکہ وجود کی تخلیق کے ساتھ عدم کا پردہ پھٹا ہے، اور وجود کا نور ظاہر ہوا، ہر دن اور ہر گھڑی وجود تخلیق ہوکر اور ظہور پا کر باہر آتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ: لفظ "فلق" کے معنی وہ چیز ہے جو عدم کے چھپانے سے خلقت کے ذریعے نکلتی ہے، کیونکہ تخلیق اور ایجاد عدم کا پھٹ جانا اور موجود کو عالم وجود میں لانا ہے۔

نتیجہ: فلق کا رب اور مخلوق کا رب ایک ہی ہے۔

ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی	مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲

اور "شَرِّ مَا خَلَقَ" میں یہ کہنا چاہیے کہ: برائی مخلوق کی طرف سے ہے، نہ کہ خالق کی طرف سے یا کہ تخلیق کی وجہ سے۔

یعنی: ہر مخلوق کے شر سے، خواہ انسان ہو، جن ہو، یا حیوانات ہوں، یا دیگر مخلوقات جن میں کوئی برائی ہے، یعنی: انہوں نے شر پیدا کرنے والے کے شر سے پناہ لی۔

"ما خلق" والی عبارت سے یہ سوچنا نہیں چاہیے کہ تمام مخلوقات شر ہیں یا اپنے ساتھ شر رکھتے ہیں، اس عبادت کا آنا اس کی استغراقیت اور کلیت کی دلیل نہیں ہے۔

"شَرِّ" شر یہ خیر کے مقابلے میں ہے، لیکن لفظ "شر" بعض مقامات پر "أَفْعُلُ" تفضیل ہے، اور دوسرے مقامات پر مصدر کی صورت میں آتا ہے، یہاں پر مصدری معنی مراد لیا گیا ہے، محض مصیبت اور برائی، یہاں پر "شر" کا لفظ "ما" کے ساتھ متصل ہے، اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ ہر مخلوق

سے کوئی نہ کوئی شر رونما ہو سکتا ہے، جس کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہوگا، شر کا وجود صرف زمین پر نہیں ہے، بلکہ تمام "شرور" برائیاں نسبتی ہیں، ان کے نسبتی ہونے کا معنی یہ ہے کہ ممکن ہے کسی کے لیے برا ہو اور کسی دوسرے کے لیے اچھا، لہذا ہر برائی میں اچھائی چھپی ہوتی ہے، اور روئے زمین پر مطلق شر موجود نہیں ہے۔

البتہ خیر سے متعلق یہ بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ خیر مطلق موجود ہے، تمام خیر کی چیزوں میں سرفہرست وہ خیر ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے تعین کیا ہے، اور وہ بھی نعمتوں کی صورت میں جیسے: ہدایت اور قرآن کی نعمت جیسا خیر وغیرہ (نقل از تفسیر جامع تیسواں پارہ قرآن کریم تالیف و تحقیق: گروہ علمی فرہنگی مجموعہ موحدین)

ان تمام شرور میں سے سورہ مبارکہ فلق میں تین شر سے بحث کی گئی ہے:

1 - اندھیرے میں پوشیدہ شر: "وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ"۔

2 - ناپاک زبانوں کا شر: "وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ"۔

3 - حسد اور منفی رویے: "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ"۔

اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے (۳)	وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝۳

اور رات کے شر سے: جب وہ پوری طرح آکر دنیا کو اپنے اندھیرے کی لپیٹ میں لے لے، یعنی: میں اس رات کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، جب لوگوں کا نیند احاطہ کرتی ہے، اور بہت سی روہیں اور موذی جانور پھیلتے اور منتشر ہوتے ہیں، "غاسق" لغت میں بمعنی اچھلنے اور کودنے کے ہیں، اور "غاسق" کا مطلب ہے رات کا آغاز، جو اندھیرے کو ساتھ لاتا ہے، جیسا کہ سورہ اسراء آیت: "۷۸" میں آتا ہے: "أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ" مفسرین لکھتے ہیں: "غاسق" ہر اندھیرے والی مخلوق جو اپنے ساتھ روحانی تاریکی لاتی ہے، اور اسے پھیلاتی ہے، کیونکہ شریر لوگ رات کی تاریکی کو حملہ کرنے اور سازش کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس لیے ہم رات کی تاریکی میں ہونے والے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

"وقب" کا معنی پہاڑ میں ایک سوراخ بھی ہے، جہاں سے پانی نیچے آتا ہے، اس آیت میں زیادہ تر اس سے مراد ہے رات اور جو کچھ اس میں ہے، وہ رات جو آتی ہے اور دنیا کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اس وقت رات خود بخود خوفناک اور ڈراؤنی ہوتی ہے، یہ رات انسان کے دل کے اندر یہ محسوس کراتی ہے کہ شاید کوئی چیز چھپی ہوئی ہوگی یا کوئی ناگہانی واقعہ رونما ہو گا ہر اس نوعیت اور قسم کے جو خیال میں نہیں آتا ہے، جیسے کہ: کوئی درندہ اور شکاری جب وہ حملہ کرتا ہے، وہ شیطان جس کی تاریکی مدد کرتی ہے تا کہ وہ کوشش کرے اور دلوں میں وسوسے ڈالے، اور خواہشات، تنہائی اور اندھیرے میں بیدار کرتی اور ابھارتی ہے، اور تمام مرئی اور پوشیدہ چیزوں سے جو حرکت اور حملہ کرتی ہیں، اور رات اس وقت آکر دنیا کو ڈھانپ لیتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ "غَاسِقٍ" سے اندھیری رات اور "وقب" کا مطلب: آنا، اور ڈھانپنا ہے، اس لیے "وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ" عام ترجمہ ہے کہ: میں صبح کے رب کی پناہ لیتا ہوں، "اور رات کی تاریکی سے جب وہ چھا جائے" یعنی اس طرح میں فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس رات کی تاریکی سے جب وہ پلٹ جاتی اور اس کی تاریکی افق میں پھیل جاتی ہے۔

امام فخر رازی فرماتے ہیں: جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ اندھیری رات کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنا اس لیے ہے کہ: رات کے وقت درندے اور موذی حشرات الارض اپنے بلوں سے نکلتے ہیں، چور، ڈاکو اور شریر لوگ فساد اور برائی کے لیے نکلتے ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سے خطرات ہیں جو رات میں پوشیدہ ہوتے ہیں، (تفسیر کبیر: ۳۱ / ۱۹۰)۔

علامہ سعدی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس برائی سے جو رات میں ہوتی ہے جب نیند لوگوں کو ڈھانپ لیتی ہے، اور بہت سے نقصان دہ اور موذی جانور پھیلتے اور بکھرتے ہیں"، کیونکہ شیاطین لوگوں کے گھروں میں رات گزارتے ہیں، "بسم اللہ" پڑھنا، اللہ کا ذکر کرنا اور خاص طور پر سورہ بقرہ اور آیت الکرسی کا پڑھنا انہیں گھر سے باہر نکال دیتا ہے، صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اندھیرا چھا جائے تو بچوں کا خیال رکھا کرو، کیونکہ شیاطین لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں کثرت سے داخل ہوتے ہیں،" (متفق علیہ)

اور فرمایا: "اِذَا كَانَ جَنَحُ اللَّيْلِ، أَوْ أَمْسَيْتُمْ، فَكُفُّوا صَبْيَانَكُمْ، فَإِنَّ الشَّيَاطِينَ تَنْتَشِرُ حِينَئِذٍ، فَإِذَا ذَهَبَ سَاعَةٌ مِنَ اللَّيْلِ فَخَلُّوهُمْ، وَأَغْلِقُوا الْأَبْوَابَ، وَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَفْتَحُ بَابًا مَغْلَقًا" ترجمہ: یعنی جب رات تاریک ہو جائے یا شام کا وقت ہو جائے تو اپنے بچوں کو روک لو کیونکہ اس وقت شیاطین پھیل جاتے ہیں، پھر جب رات کی ایک گھڑی گزر جائے تو انہیں چھوڑ دو اور دروازے بند کرو اور اس وقت اللہ کا نام لو کیونکہ شیاطین بند دروازوں کو نہیں کھولتے" (بخاری: ۳۳۰۴)

محترم قارئین:

اگر چہ "شَرِّ مَا خَلَقَ" تمام برائیوں کو شامل ہے، لیکن تین برائیوں کے نام ان کی اہمیت کی وجہ سے الگ سے ذکر کیے گئے ہیں: "غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ - النَّفُّثَاتِ فِي الْعُقَدِ - مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ" پناہ مانگنا ہر حال میں لازم ہے، خواہ وہاں خطرہ ہو: "مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ" یا اسے کمال حاصل ہو رہا ہو: "فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" (نحل: ۹۸) ترجمہ: "پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو"

سورہ فلق میں ہم تین بیرونی برائیوں سے ایک الہی صفت میں پناہ لیتے ہیں، (غَاسِقٍ، نَفُّثَاتٍ اور حَاسِدٍ کے شر سے "بِرَبِّ الْفَلَقِ" کی صفت سے پناہ مانگتے ہیں) جبکہ سورہ ناس میں اس کے برعکس ہے، ایک اندرونی خطرے کے مقابلے میں ہم تین الہی صفات میں پناہ لیتے ہیں، (دل کے برے وسوسے سے "بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ اور اِلٰهِ النَّاسِ" والی صفت کے ساتھ پناہ مانگتے ہیں۔

انسان رات کے اندھیرے سے کیوں ڈرتے ہیں؟

آپ لوگوں نے محسوس کیا ہوگا کہ جب رات آتی ہے تو ایک قسم کا انجانا سا خوف تمہارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، علماء نے جس طرح سے اس شعبے میں تحقیقات کی ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان رات کے اندھیرے سے زیادہ ڈرتا ہے، اور انسانی جسم رات کو زیادہ چوکنا اور حساس رہتا ہے یہ صفت اسے اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملی ہے۔

محققین نے اپنی تحقیق میں یہ معلوم کیا کہ جو لوگ رات بھر اکیلے رہتے ہیں ، یہاں تک کہ کسی روشن کمرے میں بھی ہوں وہ خوفناک تصاویر اور آوازوں سے زیادہ ڈرتے ہیں ، انسانی جسم رات کے وقت اپنی حالت بدلتا ہے اور اپنے اردگرد کے واقعات سے زیادہ آگاہ ہو جاتا ہے ، یہ کیفیت انسان میں خوف و ہراس کا باعث بنتی ہے۔

یہ محققین اپنی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ: انسان رات کے وقت ممکنہ دہشت آمیز واقعات کی علامت پر زیادہ ردعمل ظاہر کرتا ہے۔

اور گربوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے	وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴

اور میں جادوگر عورتوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، یعنی: وہ عورتیں جو گربوں میں پھونکتی ہیں، جو اپنے جادو کے لیے گربوں میں دم کرنے سے مدد لیتی ہیں، اور اس پر جادو کرتی ہیں، اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو گربوں میں تھوک کر (پھونک کر) دوسروں پر جادو کرتی ہیں۔

جہاں تک اس آیت مبارکہ میں خواتین جادوگروں کا ذکر کیا گیا ہے نہ کہ مردوں کا، تو پھر صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں جادو کا زیادہ رواج تھا، اس بنا پر قرآن عظیم نے مردوں کی نسبت عورتوں پر زیادہ زور دیا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ: "نَفَّاثَاتِ" اگر صیغہ مبالغہ کے وزن پر لیا جائے تو اس صورت میں کہہ سکتے ہیں (اور) صبح کی رب کی پناہ لیتا ہوں "بہت سے جادوگروں کے شر سے" کہ اس صورت میں مرد اور عورتیں دونوں کو شامل ہوگا،

"النَّفَّاثَاتِ": جمع نفاثہ، پھونکنے والیاں، اس سے مراد فساد پیشہ چغل خور ہیں، (ملاحظہ فرمائیں: جزء عم طبارہ، جزء عم شیخ محمد عبده) یہ مبالغہ کا صیغہ ہے جو مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

گرہ میں پھونکنے کا لفظ جادو کے لیے استعارہ ہے (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن) جادو گر ڈور باندھ کر گربوں پر تھوک کے ساتھ پھونک مار کر دم کرتے ہیں، اور پھر گرہیں کھول کر عوام کو دکھاتے ہیں فلاں مرد اور

فلاں عورت کے میاں بیوی کا شادی کا باہمی بندھن کھل گیا ہے، یعنی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں۔

کچھ خواتین اپنی خوبصورتی اور بول چال میں نرمی کی وجہ سے مردوں کے فیصلوں میں اثر انداز ہوتی ہیں اور "نفاثات" کی مثال بن سکتی ہیں۔

نمام اور چغل خور اپنے آپ کو ہمدرد اور محبت کرنے والے کے روپ میں ظاہر کرتے ہیں، ان کے سامنے، اور اس سے وہ بندھنوں اور رشتوں کو منقطع کرتے ہیں، لہذا جادوگر اور چغل خور بھی ایسا ہی ہیں۔

"نفاثات" کی مثالوں میں سے ایک جادو اور سحر ہے، اس لیے اس کی تعلیم اور اس پر عمل کرنا حرام ہے،

"العُقْدِ" (عُقْد) یہاں عُقْدہ کی جمع ہے، بمعنی گرہ کے ہیں، اس سے رشتے، انسانی روابطہ جیسے: میاں بیوی کا رشتہ، دوستی کا رابطہ اور دیگر روابطہ مراد ہیں، اور عُقْد میں نفث، یعنی گرہوں میں پھونکنا، اور شرعی و قرآنی بصیرت اور اصطلاح میں کسی مقصد تک پہنچنے کے لیے منصوبہ بندی کرنا، لیکن بہترین معنی جسے بیان کیا جاسکتا ہے، وہ سازش ہے: لیکن نفاثات صیغہ جمع مؤنث سالم کیوں آیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نفاثات والے روحوں والے ہیں، اور روحيں (نفوس) مؤنث مجازی ہے، اس لیے روحوں سے مطابقت رکھتی ہے، تو ان نفوس کے مصداق مرد اور عورت دونوں ہو سکتے ہیں۔

نفث: پھونکنا منہ کے لعاب کے ساتھ، یا اکیلے پھونکنا ہے، ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ: ان سے مراد لبید بن اعصم یہودی کی عورتیں تھیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا تھا۔

اور حسد کرنے والے کے شر سے
جب وہ حسد کرے

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَهُ ۝

اور اس شخص کے شر سے جو نعمتوں سے حسد کرتا ہے، اور ان کے زوال کی خواہش کرتا ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے: حسد وہ ہے جو دوسروں کی نعمتوں کو برباد کرنے کی خواہش کرتا ہے، یعنی: برا چاہنے والا (بقرہ: ۱۰۹، نساء: ۵۴، اور سورہ فتح: ۱۵) لہذا حسود کی چال کو ختم کرنے اور اس کے مکرو فریب سے محفوظ رہنے کے لیے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے، نظر بد بھی حسد کی ایک قسم ہے، کیونکہ بری نظر وہی لگاتا ہے جو حسود اور بد جنس اور خبیث النفس ہو، تو بالخصوص اور عام

طور پر خدا کی پناہ مانگنی چاہیے، اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جادو ایک حقیقت ہے اور نقصان دہ ہے، اس سے ڈرنا چاہیے اور جادوگروں کے جادو سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

اس سورت میں ہمارا رب العزت اپنے بندوں کو عمومی طور پر حکم دیتا ہے، کہ انسان خود کو تمام شیطانی مخلوق کے شر اور مصائب سے بچائے، پھر اسی سورت کی تیسری، چوتھی اور پانچویں آیت میں برائیوں کے تین اہم ذرائع کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ: اندھیری رات، چغل خور سازشی اور حسد کرنے والے بدخواہ۔

"وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ" حاسدوں کے شر سے رب العظیم کی پناہ لینا، یعنی: جب حسد کرنے والا شخص اپنا حسد ظاہر کر کے اس کے مطابق عمل کرتا ہے، کیونکہ جو شخص اپنا حسد ظاہر نہیں کرتا اور اسے چھپاتا ہے تو اس سے اس شخص (یعنی محسود) کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، لیکن وہ ایسا کر کے اور اپنے اس حسد کے ساتھ خود کو نقصان پہنچاتا ہے خواہ وہ دوسروں کو ملنے والی بھلائیوں پر افسوس کرتا یا تکلیف اٹھاتا ہو، یا ان کو ملنے والی خوشی سے متاثر ہوتا اور ہمیشہ غمگین رہتا ہو، حسد کرنے والے کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ زندگی بھر اپنے دن رات حسد اور غم میں گزارتا ہے، خوشی اور مسرت اس کے چہرے پر کبھی نظر نہیں آتی، وہ اپنی زندگی غم زدہ لوگوں کی طرح اداسی میں گزارتا ہے، یہاں تک کہ اس کی خوشی کے لمحات بھی غم اور اداسی میں گزرتے ہیں۔

حاسد: حسد کے مادہ سے ہے، جس کا مطلب ہے دوسروں کی نعمتوں کے زوال کی تمنا کرنا، یعنی: کوئی شخص، خواہ مرد ہو یا عورت کسی نعمت سے نوازا گیا ہو، چونکہ یہ دوسروں کے لیے ناقابل برداشت کیفیت ہے، کیونکہ اس کے پاس وہ نعمت نہیں ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے کہ اس یہ نعمت سے محروم کرے اور اس سے چھین لے، اس حالت کو حسد کہتے ہیں۔

حاسد: یعنی وہ شخص جس کے وجود میں یہ صفت ہو، جب تک یہ صفت اس کے اندر ہے، نقصان اسی کو پہنچے گا، لیکن جب وہ اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دے، اور کوئی ایسا کام کر دے جس سے دوسرے سے رحمت کے ظہور سے محروم ہو جائیں، پھر انسان کو ایسے لوگوں سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے جن کو وہ نہیں جانتا۔

علماء نے کہا ہے: اس مقصد کے لیے رب تعالیٰ نے حسد اور حاسد کے مرض پر اس لیے تاکید فرمائی ہے اور اس سورہ میں اس کا خاص اسلوب سے ذکر فرمایا ہے کہ: حسد انسان، جانوروں اور دوسری چیزوں کو نقصان پہنچاتا ہے ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "المؤمن يغبط، والمنافق يحسد" ترجمہ: "اہل ایمان رشک کرتے ہیں، اور منافق حسد کرتے ہیں۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حسد پہلا اور سب سے بڑا گناہ ہے جس کی وجہ سے ہمارے عظیم رب کی پہلی نافرمانی آسمانوں اور زمین میں ہوئی: کیونکہ جنت میں ابلیس آدم سے حسد کرتا تھا اور زمین پر قابیل ہابیل سے حسد کرتا تھا، پس حاسد منفور اور مطرود ہے۔

علماء کرام نے بھی یہ کہا ہے کہ: جادو، آنکھ کا شر، اور حسد وغیرہ اس طرح کی چیزیں بذات خود کوئی اثر نہیں رکھتیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے عمل اور اثر سے موثر ہوتی ہیں، لہذا اثر صرف ظاہری طور پر ان چیزوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں اثر پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، جیسا کہ ہاروت اور ماروت کے جادو کے بارے میں فرمایا ہیں: "وَمَا هُمْ بِضَآرِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ" (سورہ بقرہ: ۱۰۲) ترجمہ: "اور وہ اس کے ساتھ ہر گز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے، مگر اللہ کے اذن کے ساتھ۔"

لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ ان چیزوں کے ذاتی طور پر اثر کا نہ ہونا اور وبائی امراض مثلاً طاعون اور تپ دق کے ذاتی اثر نہ ہونے کے باوجود شرعاً ان سے حتی الامکان بچنا ضروری ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر بد سے اور کوڑھ کے بیمار سے دور رہنے کا حکم دیا ہے، اسی طرح عمرؓ نے اپنے چچا کے ساتھ طاعون کی بیماری کے وقت ایسا ہی کیا تھا اور صحابہ کرام نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ علماء نے دم اور دعا کا سہارا لینا جائز قرار دیا ہے، کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی تو جبرئیل نے ان کے لیے دعا فرمائی اور دم کیا، جیسا کہ گزرا۔

حدیث شریف میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے تمام دردوں سے شفا یابی کے لیے ہمیں یہ دعا سکھائی: "بسم اللہ الکریم، أعوذ باللہ العظیم من شر کل عرق نعار ومن شر حر النار" ترجمہ: میں بڑے اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اور عظمت والے اللہ کے واسطے سے ہر بھڑکتی رگ اور آگ کی گرمی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔"

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ: جو شخص کسی بیمار کی عیادت کرے تو اس پر سات مرتبہ پڑھے: "أسأل اللہ العظیم، رب العرش العظیم أن یشفیک" ترجمہ: "میں عظمت والے اللہ سے جو عرش عظیم کا مالک ہے، سوال کرتا ہوں کہ وہ تمہیں شفاء عطا فرمائے۔ آمین:

حدیث شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس کے سر ہانے بیٹھ کر یہ دعا پڑھتے: "أذهب البأس رب الناس، اشف أنت الشافی، لا شافی إلا أنت" ترجمہ: "اے سب انسانوں کے پالنے والے! تو تکلیف کو دور فرما کر شفاء عطا فرما، تو ہی شفاء دینے والا ہے، تیری شفاء کے علاوہ اور کوئی شفاء نہیں، ایسی شفاء کہ بیماری ذرہ بھی باقی نہ رہ جائے۔"

حضرت ابن عباسؓ سے مروی حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حسینؓ کو تعویذ دیتے تھے، (یعنی ان کے لیے اللہ سے پناہ مانگتے تھے) اور فرماتے تھے: "أعید کما بکلمات اللہ التامة من کل شیطان وهامة، ومن کل عین لامة" ترجمہ: "میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیتا ہوں ہوں تمام جن و آسیب سے اور ہر بری نظر سے۔"

حدیث شریف میں حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی سے یہ بھی مروی ہے کہ: ایک دن مجھے شدید درد ہوا اس درد کی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں تقریباً ختم ہو گیا تھا، میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنا دایاں ہاتھ اس درد کی جگہ پر رکھو اور سات بار کہو: "بسم اللہ، أعوذ بعزة اللہ وقدرته من شر ما أجد وأحاذر"، ترجمہ: "میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس تکلیف کے شر سے جو میں محسوس کرتا ہوں اور جس سے ڈرتا ہوں" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا عظمت والے رب نے مجھے شفا بخشی۔

خیر اور شر

لفظ "خیر" (خ ی ر) کے لغوی مادہ سے ہے، ہر اس چیز کے معنی میں ہے جس میں فائدہ، اچھائی اور بھلائی ہو، اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جیسے: مال، علم نافع وغیرہ، کہتے ہیں کہ: خیر شر کے مقابلے میں ہے؛ اور اس میں ایک قسم کی فضیلت اور برتری ہے (لسان العرب، جلد ۴، صفحہ ۲۶۴؛ کتاب العین، جلد ۴، صفحہ ۲۶۴) معجم المصطلحات: جلد ۲، صفحہ ۶۶ میں خیر کے بارے میں لکھتے ہیں: "الخیر: ما فیہ نفع وصلاح، وهو ضد الشر، فالبال خیر، والخیل خیر، والعلم النافع خیر، وفي التنزيل العزيز: بِیَدِکَ الْخَیْرِ ۝ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" (آل عمران آیت: ۲۶)

وقوله تعالى: "فَقَالَ اِنِّیْ اَحَبُّتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ" (سورہ ص: ۳۲)

جو شخص قیامت پر یقین رکھتا ہے اس کے نقطہ نظر سے خیر اور شر کی تعریف اور تشریح یہ ہے کہ جو چیز انسانی ارتقا کا سبب بنتی ہے اور اسے خدا کی طرف لے جاتی ہے وہ خیر ہے، اور جو کچھ بھی تنزلی، پستی اور اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب ہو وہ برائی ہے، ہر کمال اچھائی اور ہر نقص شر ہے۔

راغب اصفہانی خیر اور شر کے بارے میں لکھتے ہیں: **خیر**: لغت میں وہ چیز ہے جس میں ہر کوئی دلچسپی رکھتا ہو،

دوسری طرف، شر: وہ چیز ہے جس سے ہر کوئی نفرت کرتا ہو: "الخیر ما یرغب فیہ الكل، کالعقل مثلاً والعدال والفضل والشیء النافع و ضده الشر" (راغب اصفہانی، مفردات، صفحہ ۱۹۰) "الشر الذی یرغب عنه الكل، کہا ان الخیر هو الذی یرغب فیہ الكل" (راغب اصفہانی، مفردات، صفحہ: ۱۵۷)

قرآن عظیم سورۃ البقرۃ آیت: "۲۱۶" میں کہتا ہے: "وَعَسٰی اَنْ تَکْرَهُوا شَیْئًا وَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۝ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوا شَیْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ۝ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (سورۃ البقرہ آیت: ۲۱۶)

ترجمہ: "اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز نا پسند کرو اور وہ تمہارے لیے

بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے "

محترم قارئین:

خیر اور شر ہماری زندگی میں واقع ہونے والے اتفاقات اور واقعات میں سے ہیں، جو ظاہری طور پر محسوس نہیں ہوتے، لیکن ممکن ہے کسی چیز میں ظاہری اچھائی ہو، جب کہ اس کا باطن شر یا اس کے برعکس ہو۔

اسی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر چیز میں برائی کا احتمال ہوتا ہے، حتیٰ کہ علم، صدقہ، شخصیات اور عبادت جیسے کمالات میں آفت ہوتی ہے، علم کی آفت: غرور ہے، احسان کی آفت: احسان جتنا ہے، عبادت کی آفت: تکبر، خود غرضی، غرور ہے، شجاعت کی آفت: ظلم اور تجاوز، یعنی: بے باکی، بے پرواہی، جرأت، ہمت، بہادری، دلیر اور نڈر ہونا ہے۔

خطرے کے تین اصول ہیں: دشمن کے حملے کی تیاری، حملے کے لیے موزوں مواقع جیسے اندھیرا، بلوں اور کمزور مقامات کی موجودگی۔

ہمارا رب ہم انسانوں کو یہ سکھاتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ خیر اور شر کو سمجھنے میں زیادہ غور و فکر کرے، اور اشیاء کی ظاہری حالت پر اپنا دل خوش نہ کرے، اپنی زندگی کے تمام معاملات اور حالات میں ہمیں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ صرف وہی ہے جو ہر چیز کے اچھے اور برے کو جانتا ہے اور وہ اپنے بندے کے لیے خیر کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

یہ مبارک آیت ہم انسانوں کو سکھاتی اور رہنمائی کرتی ہے کہ: ہمیں کسی چھوٹی نیکی پر اتنا غرور نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اپنی حیثیت کم کر دیں، یا ہمیں کسی برائی یا پریشانی سے زیادہ غمگین اور متاثر نہیں ہونا چاہیے، ہمیں دونوں حالتوں میں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے، اور پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ اچھائی اور برائی اللہ کی طرف سے ہے، یہ فطری بات ہے کہ وہ بہتر سمجھتا ہے اور ہم چیزوں کے نتائج سے بے خبر ہیں۔

ملاحظہ:

بنیادی طور پر، شر خیر کے مخالف ہے، اور جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا: خیر ہم انسانوں کے معاملے میں ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو ہمارے وجود اور ہماری مرضی سے ہم آہنگ ہو اور اور یہی ہمارے حقیقی ارتقاء کا سبب ہو۔

اور شر وہ چیز ہے جو ہماری خواہش سے موافق اور ہم آہنگ ہو کر ہماری اصل پسماندگی اور تنزلی کا باعث بنتی ہے۔

علماء خیر اور شر کو تین طرح تقسیم کرتے ہیں

- 1 - مطلق خیر: جس میں کوئی برائی نہ ہو، جیسا کہ ہمارا رب جو کہ مطلق خیر ہے۔
- 2 - مطلق برائی: وہ چیز جس میں کوئی مثبت پہلو نہ ہو، ایسی چیز اس دنیا میں ہرگز وجود نہیں رکھتی۔
- 3 - وہ نسبی اچھائی اور برائی جو مندرجہ بالا دو قسموں کے درمیان ہے، خیر اور شر (نیکی اور بدی) اللہ کی طرف سے ہے۔

(ا) مطلق خیر

(ب) مطلق شر

(ت) نسبی خیر اور شر

مطلق خیر وہ ہے جس کا کوئی منفی پہلو نہ ہو،

مطلق شر اس کے برعکس ہے، یعنی: اس میں کوئی مثبت پہلو نہ ہو،

اور نسبی خیر اور شر ان دونوں کے درمیان ہے، ایک موحد اور خدا پرست کے نقطہ نظر سے ان اقسام کی دو طرح کے امکانات ہوتے ہیں: ایک محض نیکی، اور دوسری وہ جس کا خیر زیادہ ہو، لیکن جو خالص برائی یا اس کے برائی خیر سے زیادہ ہو، ہمارے رب عظیم کی طرف سے اس کا وجود ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہمارا پروردگار حکیم ہے، اور حکیم ذات سے برے کام سرزد نہیں ہوتے۔

فلسفیوں اور سائنس دانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ شر آخری تجزیہ میں برائی عدم کی طرف لوٹتی ہے، اور اس سے جو وجود پیدا ہوتا ہے وہ عدم ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا خالق ہے، خواہ خیر ہو یا شر، صرف اللہ ہی ہے جو پیدا فرماتا ہے، جب تک ارادہ نہ کرے نہ کوئی خیر ہم تک پہنچے گا اور نہ کوئی شر، پس رب ہی تمام چیزوں کا خالق ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: "قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۲" (سورہ رعد: ۱۶) ترجمہ: "کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔"

اچھائی اور برائی دونوں اللہ کی تخلیق ہیں، تاہم خدا تعالیٰ شر اور فساد سے راضی نہیں ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: "إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۝" (سورہ زمر: ۷)

ترجمہ: "اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے، اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا، اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کریگا۔"

یعنی: اگر تم کفر کرتے ہو تو جان لو کہ خدا کو تمہاری ضرورت نہیں ہے، یعنی خدا تعالیٰ کو تمہارے ایمان اور عمل کی ضرورت نہیں ہے، جبکہ تم اس کے محتاج ہو، کیونکہ تم ہی کفر اور ایمان سے فائدہ اٹھانے والے ہو، "لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا،" اس لیے وہ کفر کا حکم بھی نہیں دیتا، حالانکہ ہر چیز اس کی مرضی کے مطابق ہے، تمہاری مرضی اور چاہت نافذ العمل نہیں ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ خود چاہے، لہذا عظمت والے رب کی مشیت کچھ ہے، اور اس کی مہربانی، محبت اور حکم کچھ اور ہے، "اور اگر تم شکر ادا کرو" ایمان، عبادت اور عمل صالح کے ساتھ" تو اسے تمہارے لیے پسند کرے گا" اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لیے شکر گزاری کو پسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ: شکر دنیا اور آخرت میں ان کی سعادت اور خوشبختی کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ نیکی پیدا کرتا ہے اور جو اس سے مانگتا ہے اس سے خوش ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ شر کو پیدا فرماتا ہے: لیکن وہ اس سے راضی نہیں ہوتا جو اسے مانگتا ہے۔

لہذا یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ شر کا خالق ہے، لیکن رب تعالیٰ کے اعمال شر نہیں ہیں، دوسرے لفظوں میں، شر خدا کے اعمال سے جاری نہیں ہوا اور وہ برائی کا ارتکاب نہیں کرتا، بلکہ اس کے بندے اس کا ارتکاب کرتے ہیں، یعنی اپنے اعمال سے اسے حاصل کرتے ہیں، چونکہ خدا تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ انسان آزمائش کے میدان میں آزمائے جائیں اور ان کو یہ اختیار ہو کہ خیر یا شر کا راستہ اپنا لیں، ممکن ہے کہ کچھ لوگ اپنی مرضی سے شر کا راستہ اپنا لیں، ممکن ہے کہ کچھ لوگ اپنی مرضی سے شر کا راستہ مانگیں تو یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ان کے لیے وہ عمل (برائی) پیدا کرتا ہے، لیکن وہی لوگ ہیں جو شر اور برائی کماتے ہیں، اور اللہ ان کے عمل سے راضی نہیں ہوتا، لیکن اس کا طریقہ انسانوں کے آزاد ہونے پر اس بات

کا متقاضی ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے اچھائی اور برائی پیدا کرے تاکہ وہ انتخاب کرنے میں آزاد ہوں۔

اور یہ کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ" علامہ البانی نے کتاب "صفة الصلاة" میں اس کی وضاحت کی ہے: کہ برائی اور شر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیے جاتے، کیونکہ برائی اس کے اعمال میں سے نہیں ہے، بلکہ اس کے سارے کام خیر ہی ہیں، کیونکہ اس کے کام عدل، فضل اور حکمت کے گرد گھومتے ہیں، وہ خیر ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے، شر اس لیے شر ہے کہ اس کا انتساب عظمت والے رب کی طرف سے منقطع ہے۔

ابن قیمؒ کہتے ہیں: اچھائی اور برائی کا حقیقی خالق خدا ہے، برائی خدا کے بعض مخلوقات میں ہوتی ہے نہ کہ اس کی تخلیق اور عمل میں، اس لیے وہ اس ظلم سے پاک اور منزہ ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر غلط جگہ پر رکھی جائے، ہمارا عظمت والا رب چیزوں کو اس کی اصلی جگہ کے علاوہ کہیں نہیں رکھتا جو کہ سراسر خیر ہے۔

شر: کسی چیز کو اس کے مقام کے علاوہ کسی غلط جگہ پر رکھنا، پس جبکہ اپنی درست جگہ پر رکھنا شر نہیں ہے معلوم ہوا کہ برائی اللہ کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی، چنانچہ اگر کوئی شک میں مبتلا ہو کر کہے کہ کیوں ہمارے رب نے کوئی ایسی چیز بنائی جس میں شر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: شر کا پیدا کرنا اور تخلیق کا عمل نیکی ہے، شر نہیں، کیونکہ تخلیق اور عمل اس کے اختیار میں ہیں۔

اس کی طرف شر منسوب کرنا ناممکن ہے، جو شر اور برائیاں مخلوق میں ہیں وہ اس کی طرف منسوب کیے بغیر پہچانی جاتی ہیں۔

اس کی طرف منسوب اعمال اور تخلیقات خالص نیکی ہیں، اس اہم مسئلے کی تحقیق مکمل طور پر ابن قیم کی کتاب "شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحكمة والتعلیل" میں موجود ہے، (صفحہ ۱۷۸-۲۰۶) پر رجوع فرمائیں۔

محترم قارئین

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ: شر کبھی خدا کی طرف

سے پیدا نہیں ہوتا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات کے وقت فرمایا: "لبيك وسعديك والخير كله بيدك والشر ليس إليك" تو پھر ہم کیوں کہتے ہیں کہ تمام خیر اور شر اللہ کی طرف سے ہے؟

اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا خالق ہے، خواہ خیر ہو یا شر، صرف اللہ ہی ہے جو پیدا فرماتا ہے، جب تک ارادہ نہ کرے نہ کوئی خیر ہم تک پہنچے گا اور نہ کوئی شر، پس رب ہی تمام چیزوں کا خالق ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: "قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" (سورہ رعد: ۱۶) ترجمہ: "کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔"

اچھائی اور برائی دونوں اللہ کی تخلیق ہیں، تاہم خدا تعالیٰ شر اور فساد سے راضی نہیں ہے، جیسا کہ فرماتا ہے "إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۝ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۝ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۝" (سورہ زمر: ۷)

ترجمہ: "اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے، اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا، اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کریگا۔"

حسد

علماء اخلاق نے حسد کی تعریف یوں کی ہے: حسادت، کس کے لیے ایسی نعمت سے محروم ہونے کی آرزو ہونے کی آرزو کرنا جو اس کے لیے اچھی ہو، حسود چاہتا ہے کہ نعمت دوسرے بندے سے چھین جائے، چاہے وہ نعمت حسد کرنے والے کو ملے یا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مختلف مخلوقات پیدا کی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو کچھ خاص خصوصیات عطا کی ہیں، اور بعض کو دوسروں سے زیادہ کامل بنایا ہے، مثال کے طور پر اس نے بے جان اشیاء کو وجود بخشا ہے، لیکن کسی جاندار کی نشوونما ترقی، غذائیت یا زندگی کی جہتوں میں سے کوئی جہت نہیں دی ہے۔

جب کہ پودوں کو غذائیت ملتی ہے، وہ بڑھتے بھی ہیں، لیکن ان میں کوئی ارادی حرکت نہیں ہوتی، جانور پودوں کی خصوصیات کے علاوہ اپنا دفاع کرتے ہیں اور ان میں حرکت بھی ہوتی ہے، اور وہ فطری طور پر گھر بنانے کا کام بھی کرتے ہیں، لیکن سب سے بہترین اور کامل اشرف

مخلوقات قرآن کی تعبیر کے مطابق اس دنیا میں انسان ہے، جس کی انفرادی طور پر ایسی خصوصیات ہیں جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں کہ انسانی وجود کی جہتوں کو دو جسمانی اور روحانی جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، کہ پوری انسانی زندگی کا خلاصہ ان دو جہتوں سے نمٹنے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے سے ہے۔

انسانی روح کی خصوصیات میں سے ایک خود سے محبت ہے، یعنی وہ اپنے لیے ہر وہ چیز چاہتا ہے جو اچھی اور خوشگوار ہو، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ دوسروں سے لیا جائے تاکہ وہ اسے ملے۔

عام طور پر اس معنی کو مادی معاملات میں استعمال کیا جاتا ہے، خوراک، لباس، مکان، بیوی، اولاد، رتبہ، دولت، لقب اور شہرت جیسی چیزوں میں اور مختصر یہ کہ وہ چیزیں جو نفسانی جہتوں اور مادی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن روحانی معاملات میں رشک کرنا مطلوب ہے، روحانی اور الہی پہلوؤں میں حسد کرنا نہیں ہے، بلکہ خدا سے اس مقام کے حصول کے لیے رشک کرنا اور تمنا کرنا ہے، بغیر اس کے کہ دوسرے سے وہ چیز لینا چاہے، کبھی بھی یہ نہ سنا گیا نہ دیکھا گیا کہ انبیاء ایک دوسرے سے حسد کرتے ہوں، اولیاء ایک دوسرے سے یا دوسروں سے حسد کرتے ہوں، لیکن جتنی روحانیت اور معنویت کم ہوتی ہے حسادت اور مضبوط ہوتی اور بڑھ جاتی ہے، اگر اس بیماری کو جڑ سے نہ اکھاڑا جائے اسے نظر انداز کیا جائے تو دن بہ دن جڑ پکڑتی ہے، اور اپنے مالک کے قول و فعل میں بہت ساری ایسی بیماریوں کا سرچشمہ بن جاتی ہے، کہ اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

حسد کی بیماری کا علاج

حسد دل کی ایک مہلک بیماری ہے، جو برے اور خبیث باطن رکھنے والے لوگوں سے پیدا ہوتی ہے، وہ لوگ جو دوسروں کی بھلائی، خوشی اور خوشحالی دیکھنا برداشت نہیں کرتے، خیر جس کے پاس ہے اس کے لیے نہیں چاہتے، صرف اپنے لیے چاہتے ہیں، لہذا ایسے لوگ جو دوسروں کی خوشحالی اور نعمتیں برداشت نہیں کرتے، جب دوسروں کو خوشحال دیکھتے ہیں تو ناپسند کرتے ہیں، ایسے لوگ حسد کرنے والوں میں سے ہیں، اگرچہ دوسروں کی نعمتوں کے زوال کی تمنا اور خواہش نہیں کی ہو، حسد کی خطرناک اور مہلک بیماری کا علاج درج ذیل چیزوں سے کیا جاتا ہے:

اول: یہ کہ حسد کرنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نعمت ہمارے عظیم رب کا فضل، کرم اور مہربانی ہے، رب العزت کا فرمان ہے: "أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ؟" (سورہ نساء: ۵۴) ترجمہ: "یا وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے"

یہ ہمارا عظیم رب ہے جس نے لوگوں کو ہر طرح کی نعمتیں اور اچھی چیزیں عطا کی ہیں، حسادت کا مطلب تقدیر الہی سے مطمئن نہ ہونا ہے، جب بھی مؤمن کو یہ معلوم ہو جائے گا، وہ اس فطرت اور مزاج سے چھٹکارا حاصل کر لے گا۔

دوسرا: ایک مسلمان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حسادت سے جو چیز وہ حاصل کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا ہے، اور اس کی نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں، اس لیے ہم کہتے ہیں: "الْحَسَدُ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ" ترجمہ: "حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے"

سوم: حسد کرنے والوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ حسد سے سوائے غم اور تکلیف کے کچھ نہیں بڑھتا، بندوں پر رب کی رحمتیں جتنی زیادہ ہوتی ہیں، اتنا ہی حاسد حسرت محسوس کرتا ہے۔

چوتھا: حاسد کو یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ اس کا حسد اس شخص تک خدا کا فضل پہنچنے سے نہیں روک سکے گا، تو پھر اس کو جاننا چاہیے کہ اس کے حسد کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

پانچواں: حسد کرنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب بھی اسے حسد آتا ہے تو وہ اپنے مفادات اور خاص مفادات کو بھول جاتا ہے، آپ ایک حسود شخص کو دیکھتے ہیں جو دوسروں کے حالات، جائیداد، اولاد، علم وغیرہ کے بارے میں مسلسل تلاش اور دوسروں کی حیثیت کی جستجو اور پیچھا کرنے میں لگا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جو انسان کو حسد سے بچنے میں مدد دیتی ہیں، اس موضوع پر غور و فکر کرنے سے اسے پہچانا جاسکتا ہے، (شیخ ابن عثمین، مجموع دروس فتاوی الحرم المکی: ۳۶۴-۳/۳۶۳) اور (مجموع الفتاوی: ۱۲۹-۱۰/۱۱۱) شیخ الاسلام ابن تیمہ رحمہ اللہ۔

حسد کے خلاف جدوجہد

"حسادت" یعنی: دوسروں کی نعمتوں کے زوال کی خواہش کرنا ایک بُری صفت ہے، اس لیے کہ یہ شیطان کی صفت میں سے ہے، حسد کرنے والا انسان ماضی اور حال کے بدترین انسانوں میں سے ہے، کیونکہ حسادت: خدا کی تقدیر اور تقسیم پر اعتراض کرنا ہے۔

ایک مسلمان کو چاہیے کہ عظمت والے رب کی تقدیر اور تقسیم پر راضی ہو کر حسادت کو خود سے دور کرے، اور جو کچھ اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ اپنے بھائی کے لیے پسند نہ کرے، جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "لَا يَوْمٌ مِنْ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يَحِبُّ لِنَفْسِهِ" (بخاری: ۱۳) اور مسلم (۴۵) ترجمہ: "تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔"

مسلمان بھائی کی بھلائی چاہنے اور اس سے تکلیف دور کرنے سے انسان حسد کرنے سے بچ جاتا ہے، ایسا کرنے والا حسد کرنے والوں میں شمار نہیں ہوتا، ایک مسلمان کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے زیادہ کی امید رکھنی چاہیے، ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر کی پناہ مانگے، اپنے اور اپنے اہل و عیال سے حسد کو دور رکھے، ہمارے رب العزت نے سورہ فلق میں اپنے نبی کو ہدایت کی ہے کہ حسد کرنے والے کے شر سے خدا کی پناہ مانگے جب وہ حسد کرنے لگے۔

حسد سے نجات کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صدقہ دے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرے، خاص طور پر جب کوئی شخص مال و دولت حاصل کرتے اور اس کے پاس کوئی ضرورت مند ہو جو اس کی طرف دیکھے، تو اس کے لیے مناسب ہے کہ ان کی مدد کرے، تاکہ ان کی آنکھیں بھر جائیں جو اس کی طرف امید لگائے دیکھ رہی ہیں، (شیخ صالح فوزان۔ کتاب الدعوة۔ فتاویٰ 68/1، 69)

کیا واقعی پیغمبر اسلام پر جادو کیا گیا تھا؟

روایات اور احادیث نبوی کے مطابق بشمول (صحیحین میں موجود احادیث کے) جو اس مسئلے کی تائید کرتی ہیں: ہم کہہ سکتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا، لیکن اس سحر اور جادو نے آپ کے مقام

نبوت، شرعی مسائل اور وحی الہی کے معاملات پر کوئی اثر نہیں ڈالا، جادو کا اثر آپؐ پر اتنا نہیں تھا کہ اس سے وحی اور عبادت سے متعلق معاملات میں کوئی خلل واقع ہوا ہو۔

روایت کے مطابق جادو کا اثر اس حد تک محدود تھا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال ہوتا تھا کہ کچھ کام کیا ہے، جو آپؐ نے نہیں کیا ہوتا تھا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ اس سحر اور جادو کو ایک شخص جس کا نام لبید بن اعصم یہودی تھا، اس نے کیا تھا۔ (بخاری: ۶۳۹۱ اور مسلم حدیث نمبر ۲۱۸۹)

ہمارے عظمت والا رب نے آپؐ کو اس سے نجات دی، اور آپؐ پر وحی بھیجی اور معوذتین (فلق، ناس) کے ساتھ دم کیے گئے، (بخاری: ۵۷۳۵ اور مسلم ۲۱۹۲)

بعض لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا، وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مان لیں کہ نبی ﷺ پر جادو ہوا تھا تو ان ظالموں کے قول کی تصدیق لازم آتی ہے جو کہتے تھے: "إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا" (سورہ فرقان: ۸) ترجمہ: "تم تو بس ایسے آدمی کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کیا ہوا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جادو ہونا ہرگز ان ظالموں کے باتوں کی تائید نہیں ہے، جنہوں نے نبی کریمؐ کو سحرزدہ آدمی کہا، کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو ان الفاظ کے ساتھ جادو کیا گیا ہے، جو ان پر نازل ہوتے تھے، جو کچھ آپؐ پر نازل ہوتا تھا ان کے خیال میں دھوکے جیسے سحرزدہ لوگوں کی طرح غیر متعلق اور بے ربطہ الفاظ تھے، لیکن قطعی حکم یہ ہے کہ: جو سحر نبی ﷺ پر ہوا تھا وہ وحی اور عبادت میں سے کسی بھی چیز پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔

محترم قارئین:

جادوگر اور ساحر کافر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "بَدَّ فَرْقٍ مِّنْ

الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ۝ كَتَبَ اللَّهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَاتِبُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ ١٠١ ۝ وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۝ (بقرہ: ۱۰۲-۱۰۱)

ترجمہ: "تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے ، جنہیں کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، جیسے وہ نہیں جانتے، اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھتے تھے۔"

اس آیت میں ہمارے عظیم رب نے واضح طور پر جادو کو شیاطین کا کام قرار دیا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے جنوں جیسے عفریت اور دوسرے شیاطین کو سلیمان کے ماتحت رکھا تھا، اور اس وقت شیاطین جادو کا کام انجام دیتے تھے، اہل کتاب جو انتہائی کفر اور گمراہی میں زندگی گزار رہے تھے، انہوں نے جادو کو سلیمان کی طرف منسوب کیا، اور کہا کہ: جادو سلیمان کا کام ہے، لیکن چونکہ جادو کفر ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سلیمان کو جادو سے محفوظ رکھا تھا، اور اس کی برائت کا اعلان کیا، فرمایا: "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ" (سورة البقرة: ۱۰۲) "سلیمان جادو کے مرتکب نہیں ہوئے"، کیونکہ جادو کفر ہے، اور کفر انبیاء کی طرف سے ناممکن ہے۔"

پس یہ آیت دلیل ہے کہ جادوگر کافر ہے، اور فرماتے ہیں: "وَلَكِنَّ الشَّيْطَانُ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۝" (سورة بقرہ: ۱۰۲) ترجمہ: "اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔"

اس جملے میں اللہ تعالیٰ نے شیطانوں کو کافر کہا، کیونکہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جادو کا سکھانا بھی کفر ہے۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ قَالُوا: مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: الشِّرْكُ بِاللَّهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَأَكْلُ الرِّبَا وَالتَّوَلَّى يَوْمَ الرَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ (بخاری)" ترجمہ: "سات تباہ کن گناہوں سے بچو، پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سے ہیں؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک، جادو، جس جان کا قتل اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اسے ناحق قتل کرنا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، لڑائی کے وقت دشمن کو پشت دکھانا

(بھاگ جانا) اور پاک دامن، بے خبر مؤمن عورتوں پر الزام تراشی کرنا۔"

سورہ بقرہ کی ان آیات کے علاوہ جو جادو کے کفر اور جادو کی تعلیم و تعلم کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں، دوسرے مختلف مقامات پر بھی جادوگر کے کفر کو ثابت کیا گیا ہے، اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے سحر کو شرک کے بعد قرار بڑا گناہ دیا ہے، اور خدا کے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ان اعمال کے ارتکاب سے ڈرانے کے لیے مختلف قسم کے جادو کا ذکر کیا ہے۔

امام نووی کہتے ہیں: جادو کرنا ایک حرام عمل اور علماء کے اجماع کے مطابق کبیرہ گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے سحر کو سات مہلک گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کو ہلاک کرتے ہیں، جادو کی بعض اقسام کو کفر، اور بعض اقسام کو کفر نہیں سمجھا جاتا، لیکن بہر صورت یہ بہت بڑا گناہ ہے، اگر سحر اور جادو میں کفر یہ کلام شامل ہو تو یہ کفر ہے، ورنہ یہ کفر نہیں بلکہ کبیرہ گناہ ہے، لیکن اس کا سیکھنا اور سکھانا حرام ہے، (فتح الباری: ۱۰/۲۲۴) سحر کے احکام کے بارے میں مزید معلومات کے لیے فتویٰ کی طرف رجوع کریں۔

علماء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ: کسی بیمار کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ نجومی کے پاس جائے جو غیب جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور لوگوں کو اس طرح اپنے پاس بلاتے ہیں، اور ان کی قسمت کا حال یا بیماریاں بتاتے ہیں، اسی طرح کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جو خبریں کابنوں کی طرف سے ملتی ہیں ان کی تصدیق کرے، کیونکہ وہ لوگ شک اور اندازے سے غیب کی باتیں کرتے ہیں، یا جنوں کو حاضر کر کے ان سے مدد مانگتے ہیں، ان کا کام کفر اور گمراہی ہے، کیونکہ یہ غیبی خبروں کا دعویٰ کرتے ہیں۔

امام مسلم (رحمۃ اللہ) اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ أَتَى عَرَافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ فَصَدَّقَهُ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ يَوْمًا" ترجمہ: "جو شخص کسی غیب کی خبریں سنانے والے کے پاس آئے (عراف وہ ہے جو کسی گم شدہ یا چوری شدہ مال کی نشاندہی کرے) اور اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھے تو چالیس راتوں تک اس شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی۔"

حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: "مَنْ أَتَى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"، ترجمہ: "جو شخص کسی نجومی یا کاهن کے پاس آیا اور پھر اس کی باتوں کی تصدیق کی تو اس نے اس دین کے ساتھ کفر کیا جو محمد ﷺ پر اتارا گیا ہے" (ابو داؤد: ۳۹۰۴)۔

عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لیس منا من تطیر أو تطیر له، أو تکهن أو تکهن له، أو سحر له، و مَنْ أَتَى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ" ترجمہ: جو فال نکالے یا جس کے لیے فال نکالا جائے، جو کہانت کا پیشہ اختیار کرے یا جو کاهن کے پاس جائے یا جادو کرے یا کروائے، وہ ہم میں سے نہیں، جو کاهن کے پاس گیا اور اس کی بات کی تصدیق کی، اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے کفر کیا" (بزار نے قوی سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے)۔

ان احادیث میں کاهن اور جادوگر کے کافر ہونے کی دلیل موجود ہے، کیونکہ وہ علم غیب جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، جب کہ یہ (عقیدہ اور عمل) کفر شمار ہوگا، کیونکہ ساحر اور کاهن جنات سے مدد لیے بغیر اور ان کی عبادت کیے بغیر اپنے مقصد کو نہیں پہنچ سکتے، جبکہ ایسا کرنا کفر اور شرک ہے، پاک اور منزہ رب پر، اور اس کی تصدیق کرنے والا بھی کفر اور شرک میں پڑ جاتا ہے، اور اس پر عقیدہ رکھنے والا بھی ان کی طرح ہوگا، اور جو شخص ان کاموں میں مشغول ہوگا، اور ان سے سحر اور جادو سیکھے گا، یقیناً اللہ اور اس کا رسول اس سے بیزار ہوں گے۔

جادو کی اقسام

جادو ایک شیطانی عمل ہے، اس سے مراد شیطانی تعویذ میں دم کرنا، اور پھونکنا ہے، جو مسحور کے جسم کو متاثر کرتا ہے، اور قتل یا بیماری کا سبب بنتا ہے، یا میاں بیوی اور دوستوں میں تفرقہ ڈالتا ہے، اور تمام تاثیرات خدا کی مرضی اور تقدیر سے ہوتے ہیں، جیسا کہ عظمت والا رب فرماتا ہے: "وَمَا هُمْ بِضَآرِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا يَأْذِنُ اللَّهُ" (سورة البقرہ آیت : ۱۰۲) ترجمہ: اور وہ اس کے ساتھ ہر گز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے مگر اللہ کے اذن کے ساتھ۔"

اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں اور مؤمن بندوں کو حکم دیتا ہے کہ جادوگر کے شر سے صبح کے رب کی پناہ مانگیں، جادو کی ایک قسم تخیلی جادو ہے، جس میں دیکھنے والے کو کچھ نہ کچھ نظر آتا ہے، اگرچہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: "سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ" (سورة الاعراف: ۱۱۶) اور فرماتا ہے: "فَإِذَا جِئَالُھُمْ وَعَصِيھُمْ یَحْیِلْ اِلَیْھِمْ سَحَرِھُمْ اَنْھَا تَسْعٰی" (سورة طہ: ۶۶) ترجمہ: "(جب انہوں نے چیزیں ڈالیں) یکایک ان کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں اُن کے جادو کے زور سے موسیٰؑ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں" یہ وہی جادوئی طریقہ تھا جسے صوفی نما چالبازوں نے رائج کیا۔

سحر کی اقسام

علماء جادو کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں:

پہلا: گرہ لگانا اور پھونک مار کر دم کرنا، یعنی: وہ جادو اور منتر جو جادوگر استعمال کرتے ہیں (نقصان پہنچانے کیلئے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ" (سورة بقرہ: ۱۰۲) ترجمہ: "اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا، لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔"

دوسرا: ایسی دوائیوں کے ساتھ جو جادو شدہ شخص کے جسم، دماغ، قوت ارادی اور خواہشات کو متاثر کرتی ہے یہ وہی چیز ہے جسے وہ خود "عطف": محبت پیدا کرنا، اور "صرف": نفرت بڑھانا، کہتے ہیں، "عطف" یہ ہے کہ کسی شخص کو اس کے بیوی یا کسی دوسری عورت کا اتنا چاہنے والا اور دل دار بنالیتے ہیں کہ وہ جانور کی طرح اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ جس طرح وہ چاہے اس پر حکمرانی کرے، اور "صرف" اس کے برعکس ہے، جو سحر زدہ کے جسم پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ اسے کمزور کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ فنا ہو جاتا ہے اور ہر چیز کو اس کی حقیقت کے خلاف تصور کرتا ہے۔

جادوگر کے کفر میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو جاتا ہے، اور بعض کہتے ہیں وہ کافر نہیں ہوتا، لیکن جادو کی جو اقسام ہم نے بیان کی ہیں، ان کے مطابق جادوگر کا حکم واضح ہو جاتا ہے کہ

جو شخص شیطانوں کی مدد سے جادو کرتا ہے وہ کافر ہوجاتا ہے، اور جو کوئی دوا سے جادو کرتا ہے وہ کافر نہیں ہوتا، بلکہ گنہگار ہوجاتا ہے۔

سحر سے بچنے کا جوابی اقدام

جادو، حسد، نظر بد وغیرہ سے نمٹنے کا طریقہ ہے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہیں، صبح و شام ذکر کرنا اور وقت پر نماز پڑھنا، نیز گناہوں سے بچنا، خاص طور پر کبیرہ گناہوں سے، کیونکہ ہر شخص کی نگرانی دو فرشتے کرتے ہیں، اگر کوئی شخص ذکر الہی کو نظر انداز کر کے گناہ کرے تو وہ اس کا دفاع نہیں کریں گے، اس لیے اسے شیطان جادو، وغیرہ ایذا پہنچا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ" ○ "إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ" ○ "وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ" ○ "وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُونِهِ مِنْ وَالٍ" ○ (سورہ الرعد: ۱۱)

ترجمہ: "اس کے لیے اس کے آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، یہاں تک کہ وہ اسے بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لے تو اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مددگار نہیں۔"

لہذا یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر انسان کے لیے ہر حال میں فرشتے مقرر کیے گئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی حفاظت کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں، فرشتے انسانوں کو جنات کے ضرر سے بچاتے ہیں، اور وہ خدا کے حکم کے مطابق اس کے معاملات کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن جب مقدر کا معاملہ آجائے تو ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔

یہ محافظ فرشتے ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں، اور اسے ہر سمت اور پہلو سے اپنی نگرانی میں رکھتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے اس کی نافرمانی کی طرف پلٹنا یہ عزت سے ذلت کی طرف جانا ہے، جو کوئی بھی خدا کی اطاعت کو چھوڑ کر گناہ کی طرف پلٹتا ہے تو وہ خدا کے حکم سے فرشتوں کی نگرانی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس لیے شیاطین، جادو، حسد، بری نظر اس پر اثر انداز ہوسکتی ہیں۔

لیکن جادو کے خاتمے کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ لازماً شیاطین کی طرف رجوع کر لے، کیونکہ جادوگروں اور کاهنوں کے ذریعہ شیاطین کی طرف رجوع کرنا حرام ہے، لہذا سحر کو باطل کرنے کے لیے دعا، دن اور رات کے اذکار، قرآن کی تلاوت، نماز اور شرعی دم درود کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور گناہوں کو چھوڑنا چاہیے۔

جادوگر، نجومی اور کابن کے پاس جانا

جادو بنیادی طور پر ایک شیطانی علم ہے، جو خارق العادہ، غیر معمولی چیزوں سے مشابہت رکھتا ہے، لیکن وہ خود کوئی خارق العادہ چیز نہیں ہے، کیونکہ اول تو یہ سیکھا جاتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جادوگر اور اس جادوئی عمل کا ارتکاب کرنے والا وہ آخری شخص نہیں ہے جو شیطانی توجہ اور تلقین کے ساتھ عادت کے راستوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہا ہو، بلکہ دوسرے لوگ بھی اس کا علم حاصل کر کے اس کی طرح کا عمل کر سکتے ہیں، اور جادو گروہ شخص ہے جو اس شیطانی علم کے ماتحت رہ کر الہامات، توجہات اور شیطانی منتروں کے ذریعہ غیر معمولی چیزوں کے مشابہ کام کرتا ہے، کیونکہ یہ شیطانی اعمال اس اعتبار، معجزات اور وقار کے درجے سے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو عطا کی ہیں فرق رکھتا ہے۔

جادوگروں، نجومیوں، کابنوں اور ان جیسے لوگوں کے پاس جانا جائز نہیں ہے، اور ان سے سوال کرنا اور ان کی بات کی تصدیق کرنا بھی جائز نہیں ہے، اور ان سے تیل اور دیگر اشیاء سے ان سے علاج کروانا بھی جائز نہیں ہے، پیغمبر ﷺ نے ان کے پاس جانے، پوچھنے اور اس کی تصدیق کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لیے بھی کہ وہ علم غیب کا دعویٰ کرتے ہیں، اور لوگوں سے جھوٹ بولتے ہیں، اور عقیدے سے انحراف کی طرف بلاتے ہیں۔

ایک (صحیح) حدیث آپ ﷺ سے روایت ہوئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو کوئی جادوگر کے پاس جائے اور اس سے کچھ پوچھے اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہیں ہوگی۔"

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص کسی جادوگر یا کابن کے پاس جائے اور اس کی بات کی تصدیق کرے تو اس نے محمد (ﷺ) پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس کا انکار کیا۔"

اور دوسری جگہ فرمایا ہے: "جو شخص جادو کرتا ہے، یا اس کے لیے جادو کا عمل انجام پائے، یا بدشگونی کرتا ہے، یا اس کے لیے بدشگونی ہوئی ہے، یا کہانت کرے، یا اس کے لیے کہانت کی جائے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

اس بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جس علاج کو حلال قرار دیا ہے وہ شرعی رقیہ (تعویذ) اور دوائیاں ہیں، جو اچھے عقیدے والے اور نیک سیرت لوگوں کے ہاں جائز ہیں، اور وہ بھی اتنا ہو کہ کفایت کر جائے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہو جائے (واللہ ولی التوفیق)، (شیخ عبدالعزیز بن باز)

جادو اور ٹونے کا عمومی حکم

جادو کے کام اور سحر کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے جس کی حرمت قرآن و سنت سے ثابت ہے، اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، حتیٰ کہ جادو اور سحر میں بعض ایسے افعال ہوتے ہیں جو کہ کفر کا سبب بن جاتے ہیں۔

جادو میں عام طور پر مشرکانہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جنات اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی ہے، کیونکہ یہ اعمال اس وقت کام دیتے ہیں جب جادو کرنے والا خباثت اور ناپاکی میں قوی، فعلی اور اعتقادی طور پر شیطانوں کے مشابہ ہو، حدیث نبوی کے مطابق، کابھوں اور جادوگروں کی بہت سی باتیں محض جھوٹ ہیں، جو جادوگر کے پاس جاتا ہے اور اس سے کچھ پوچھتا ہے، حدیث مبارکہ میں ہے کہ اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہ ہونے کی وعید ہے۔

مفتی محمد شفیع عثمانیؒ تفسیر معارف القرآن: ۱/۲۷۹ میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: "وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ" (سورہ بقرہ: ۱۰۲)

اگر جادو میں کفر یہ الفاظ استعمال ہو جائیں جیسے شیاطین سے مدد طلب کرنا، تو یہ سحر اور جادو (بالاجماع) کفر ہے، اگر ساحر ایسا تعویذ لکھتا ہے جس میں شیاطین سے مدد طلب کی گئی ہو، تو وہ جادو کے حکم میں ہے اور حرام ہے، اگر کسی شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ جادوگر امور میں تصرف رکھتا ہے تو یہ عقیدہ کفر ہے، اور مذکورہ شخص کافر ہے، اس کی بیوی اس سے جدا ہو جاتی ہے، اسے فوراً توبہ کر کے تجدید ایمان کرنی

چاہیے (ردالمختار: ۵/۱۰۵؛ فتح الملہم: ۲/۵۸۰؛ المدر المختار: ۶/۳۳۷) فصلنامہ
ندائے اسلام، شمارہ: ۳۵، ۳۴)

شریعت میں جادوگر کی سزا

ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی) اور جمہور علماء بھی
ساحر کے کفر پر اتفاق رکھتے ہیں، کہ اسے قتل کرنا چاہیے اور اس سے توبہ
نہیں کروائی جائے گی، جب اس کا ساحر ہونا اس کے اپنے اعتراف سے
یا دو مسلمانوں کی گواہی سے ثابت ہو جائے تو اسے قتل کیا جائے اور اس
کی توبہ قبول نہ کی جائے، کیونکہ ممکن ہے اس کی توبہ ظاہری یا
چالبازی ہو، اور ساحر زندیق ہے، اور زندیق کی توبہ قابل قبول نہیں ہے،
اس لیے کہ قابل اعتماد نہیں ہے کہ اس کی توبہ دل سے ہو، اسے قتل کرنا
چاہیے۔

کیونکہ پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں: "حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيْفِ" (ترمذی نے سنن میں
۵/۱۵۶، اور طبرانی الکبیر: ۲/۱۶۱ میں اور بیہقی السنن الکبریٰ: ۸/۱۳۶
میں، ان سب نے یہ حدیث جندبؓ سے روایت کی ہے)
یہ حدیث مرفوعاً اور موقوفاً صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ جادوگروں
کی حد تلوار کے ساتھ اسے مارنا ہے، اور توبہ کے بارے کچھ نہیں
کہا گیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ: ساحر سے وضاحت مانگی جائے، اگر اس کا
جادو کفر نہیں ہے تو اسے اس عمل سے باز رکھا جائے، لیکن یہ فتویٰ
درست نہیں ہے، کیونکہ ہر قسم کے جادو کا تعلق شیطانوں کے تعاون سے
اور کفر و شرک کے ذریعے ہوتا ہے، اور یہ خالص کفر ہے، ہوسکتا ہے کہ
جن علماء نے ایسا فتویٰ دیا ہے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ شیطانوں کے تعاون
اور کفر و شرک کے علاوہ جادو کا کوئی اور طریقہ بھی ہے۔

خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد تمام
گورنروں کو حکم دیا کہ وہ مرد اور عورت جادوگروں کو قتل کر دیں، اور
توبہ کرانے کا حکم جاری نہیں کیا، راوی کہتا ہے کہ: ہم نے خلیفۃ المسلمین
کے حکم کے مطابق تین لوگوں کو قتل کیا، (مسند امام احمد: ۱/۱۹۰، سنن
ابی داؤد: ۳/۱۶۵، سنن بیہقی: ۸/۱۳۸)۔

حضرت عمرؓ نے مہاجرین اور انصار کی موجودگی میں یہ حکم جاری کیا:
کسی نے بھی مخالفت نہیں کی، اسی طرح ام المؤمنین حفصہؓ حضرت عمرؓ
کی پیاری بیٹی آپؓ کی زوجہ محترمہ نے اپنی لونڈی کو جادو کرنے
پر قتل کروادیا، (مؤطا امام مالک ۲ / 871، مصنف عبدالرزاق صنعانی 10
/ 181، 180، و سنن بیہقی 136/8 / بہ روایت عبد اللہ بن عمر)۔

جندب بن عبد اللہ، ابو جندب بن کعب ازدی نے، جو جلیل القدر صحابہ میں سے تھے، خلیفہ کی مجلس میں ایک جادوگر نے کو تلوار سے قتل کر دیا: (بخاری: ۲/۲۲۲ نے عبد الرحمن بن یزید سے اور الطبرانی فی الکبیر: ۲/۱۷۷، ابی عثمان مہدی سے اور سیر اعلام النبلاء للذہبی ۱۷۶/۳، ۱۷۷) ان روایات کی بناء پر امام احمد فرماتے ہیں: ساحر کا قتل اصحاب رسولؐ میں سے تین سے (حضرت عمرؓ ان کی بیٹی حفصہ اور جندب) صحیح روایت کے ساتھ ثابت ہے، یہ روایات ساحر کے قتل کرنے کی دلیل ہیں بغیر توبہ کے، بلکہ ساحر کے قتل کرنے میں جلد سے جلد عملی اقدامات کیے جائیں، تاکہ مسلمان اس کے شر سے محفوظ رہیں۔

چغل خوری

چغل خور کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو ایک کی باتیں سن کر دوسرے شخص یا افراد تک پہنچاتا ہے، جس کے نتیجے میں دو فرد یا افراد کے درمیان دوستی ختم اور رابطے منقطع ہو جاتے ہیں، جب کہ ہمارے رب نے مسلمانوں کے درمیان مل جل کر رہنے اور رابطے کا حکم دیا ہے، لیکن چغل خور شخص لوگوں کے رابطے منقطع کرنے اور تعلقات ختم کرنے کا سبب بنتا ہے، لہذا ہمارا رب فرماتا ہے: "وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُؤْصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ" ○ أولئك لهم اللعنة ولهم سوء الدار ○ (سورہ رعد آیت: ۲۵) ترجمہ: "اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو کاٹ دیتے ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور انہی کے لیے اس گھر کی خرابی ہے۔"

ایک دوسری آیت میں ایسے لوگوں سے نمٹنے کے طریقے کے بارے میں جن کی بے حیائی کسی نہ کسی طرح ظاہر ہوتی ہے فرماتا ہے: "إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ" ○ (سورہ حجرات: ۶) ترجمہ: "اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو، پھر جو تم نے کیا اس پر پشیمان ہو جاؤ" اور ان گناہوں میں سے ایک جس کی کبیرہ گناہ کی تصدیق قرآن میں عذاب کی وعید اور خبر سے ہوتی ہے وہ چغلی ہے، نیز کئی الفاظ چغلی سے مترادف اور ملتے جلتے ہیں، جیسے: نمیم، ممامہ، سعایت و قنات۔

ہمارے عظمت والا رب سورہ مبارکہ رعد میں فرماتے ہیں: "وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۚ" (سورۃ الرعد: ۲۵)۔

ترجمہ: "اور اس چیز کو کاٹ دیتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملا یا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور انہی کے لیے اس گھر کی خرابی ہے۔"

واضح ہے کہ تمام بمعنی چغل خور کے ہے، اور وہ جس نے کسی سے کسی کے بارے میں کوئی بات سنی اور اس تک پہنچا دی، تو اس نے کاٹ دیا اس چیز کو جسے اللہ نے ملانے کا حکم فرمایا اور زمین میں فساد برباد کیا، کیونکہ مؤمنین کے درمیان محبت و الفت پیدا کرنے اور ان کے اتحاد کو مضبوط کرنے کی بجائے، نفرت، تفرقہ اور دشمنی کو جنم دیا ہے، تو اس کے لیے خدا کی لعنت اور آخرت کا عذاب ہے۔

چغلی کی وجوہات

اخلاقیات کے ماہرین نے اس برائی کے کئی اسباب اور عوامل بیان کیے ہیں، جن کی وجہ سے انسان چغلی کرتا ہے، ذیل میں اس کے کچھ اسباب و عوامل کا ذکر کرتا ہوں!

حسد اور بغض

بعض اوقات کسی دوسرے شخص سے اس کی حیثیت، دولت اور کردار کی وجہ سے حسد ہو جاتا ہے تو وہ اس شخص کو ہر ممکن طور پر تکلیف دینے اور اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لیے وہ چغلی کرتا ہے یعنی اس بندے نے کسی کے بارے میں کوئی بات کی تو وہ بات اس تک پہنچادی تاکہ ان دونوں میں تعلقات خراب ہوں یا یہ شخص جس نے بات کی ہے ذلیل ہو جائے اسی لیے روایات میں حسد کو ایمان اور اعمال صالحہ کو تباہ کرنے والا اور دنیا و آخرت میں انسان کو امن و سکون سے محروم کرنے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

زبان کی آفات میں سے ایک اور آفت جو اخلاقی برائیوں میں سے شمار ہوتی ہے، اور لوگوں کو راہ خدا سے دور رکھتی ہے وہ چغل خوری ہے، قرآن کریم چغلی کی مذمت میں فرماتا ہے: "وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۚ" (سورہ

ہمزہ: ۱) ترجمہ: بڑی ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے اور پھر فرماتا ہے: "هَمَزٌ مَّشَاءٌ بَنِيْمٌ ۝۱۱" (سورہ قلم

آیت: ۱۱) ترجمہ: "اس شخص کی پیروی نہ کریں، جو بہت زیادہ عیب تلاش کرنے والا چغل خور ہے۔"

اور سورہ قلم آیت: ۱۳ میں فرماتا ہے: "عُتِلَّ بَعْدَ ذَلِكَ زَنِيمٌ" ترجمہ: "سخت مزاج، اس کے علاوہ بدنام ہے" (چغل خور، نفرت انگیز، متشدد اور بدنام ہے) قرآن کریم نے چغل خور کو لفظ "زَنِيمٌ" کے لفظ سے ذکر کیا ہے، یعنی وہ شخص جس کا نسب واضح نہ ہو، یہ اس گناہ کے عظیم ہونے کا ثبوت ہے۔

چغل خور کا انجام قرآن کی نظر میں

قرآن کریم ان لوگوں کو جو چغل خوری کر کے نفرت اور دشمنی کی آگ کو لوگوں کے درمیان بھڑکاتے ہیں خبردار کرتا ہے، اور انہیں جہنم کے عذاب سے ڈراتا ہے، جیسا کہ ابو لہب کی بیویوں میں سے ایک ام جمیل کے متعلق فرماتا ہے: "وَأَمْرَأَتُهُ ۖ خَمَّالَةَ الْخَطَبِ" اس کی بیوی : ابو لہب کی وہ لکڑی اٹھانے والی اور آگ بھڑکانے والی بھی جہنمی ہے (سورہ مسد آیت: ۶)

ام جمیل، حرب کی بیٹی، ابو سفیان کی بہن اور معاویہ کی پھوپھی، ابو لہب کی بیویوں میں سے تھی، جو رسول اللہ ﷺ کے سخت دشمنوں میں شمار ہوتی تھی۔

بہر حال چونکہ خود ابو لہب آگ بھڑکانے والا تھا، اس کی بیوی بھی فتنہ انگیز تھی، اس راستے میں بہت کوشاں ہوتی تھی، جتنی اس میں طاقت اور استطاعت تھی وہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کی خبریں لے کر مشرکوں اور بت پرستوں تک پہنچاتی تھی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے برا بھلا کہا، اور اسے آگ کا مستحق قرار دیا، اور جس نے بھی چغل خوری کی اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

چغل خوری کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بعض لوگوں کی باتیں دوسروں کے سامنے اس نیت سے بیان کرتا ہے کہ ان میں فتنہ و فساد پیدا کیا جائے، جیسے کسی کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ: فلاں نے تجھے ایسے ویسے کہا، تاکہ اس طرح سے لوگوں میں دشمنی پیدا ہو، چغلی کبیرہ گناہوں میں سے ہے، صحیحین میں عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے، اور فرمایا: "أَمَّا إِلَهُمَا لَيَعَذَّبَانِ وَمَا يَعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَمْشِي بِالنِّمِيسَةِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ لَا يَسْتَنْزِعُهُ مِنَ الْبَوْلِ، قَالَ:

فَدَعَا بِعَسِيبٍ رَطْبٍ فَشَقَّهُ بِأُثْنَيْنِ، ثُمَّ غَرَسَ عَلَى هَذَا وَاحِدًا وَعَلَى هَذَا وَاحِدًا"

ترجمہ: "ان کو عذاب ہو رہا ہے، اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا ہے، صرف یہ کہ ان میں سے ایک آدمی پیشاپ سے نہیں بچتا تھا، اور دوسرا شخص چغل خوری کیا کرتا تھا، پھر آپ ﷺ نے کھجور کی ایک ہری ٹہنی لی، اس کے دو ٹکڑے کر کے دونوں قبروں پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا، لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "لَعَلَّهُ أَنْ يَخَفُّ عَنْهُمَا مَالٌ يَبْسَا" امید ہے کہ جب تک یہ ٹہنیاں

خشک نہیں ہوتیں ان کا عذاب ہلکا ہو" (بخاری: ۲۱۸ اور مسلم: ۲۹۲) نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَاتٌ" (بخاری: ۶۰۵۶ اور مسلم: ۱۰۵) ترجمہ: "چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" لہذا مؤمن کو چغل خوری سے اجتناب کرنا چاہیے، چغل خور کے لیے چغلی کے نقصانات میں وہ تمام سزائیں اور تنبیہات ہیں جو اوپر حدیث میں بیان کی گئی ہیں، معاشرے کے لیے چغل خوری کا نقصان یہ ہے کہ یہ لوگوں کے درمیان تفرقہ اور نفرت کا باعث بنتی ہے، اور ان میں فتنہ و فساد کا سبب بنتی ہے۔

دین اسلام میں جن گناہوں کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے ان میں سے ایک چغل خوری ہے جو اس قدر قبیح ہے کہ اس کے مرتکب کو ملت اسلامیہ میں بدترین لوگوں میں جانا جاتا ہے۔

سورہ مبارکہ فلق سے حاصل شدہ اسباق

1- اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کو ہمیشہ ورد زبان بنانا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا ہر اس ڈراؤنی چیز سے کہ پوشیدہ ہونے کی وجہ سے انسان اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکتا ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ واضح طور پر بیان کیا جانا چاہیے کہ: اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے بغیر اپنی اور معاشرے کی اصلاح ممکن نہیں۔

2- کیونکہ برے لوگ (شیاطین) انسان کے دل اور دماغ پر حملہ کرتے ہیں، ہمیں ایسی طاقت کی پناہ لینی چاہیے جو تالے اور رکاوٹوں کو توڑتی ہے۔

3- جادو کی گرہ پر پھونکنا حرام ہے، جو کہ سحر ہے اور ہر قسم کا سحر کفر ہے، اور ساحر کی حد تلوار سے گردن کاٹنا ہے۔

4- حسد قطعاً حرام ہے، اور یہ ایک خطرناک بیماری ہے کہ جس نے ابن آدم کو اپنے بھائی قتل کرنے پر مجبور کر دیا، اور یوسفؑ کے بھائیوں کو دھوکے اور فریب پر مجبور کر دیا۔

5 - غبطہ (رشک کرنا) حسد نہیں ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو چیزوں میں حسد نہیں ہے، جب غبطہ (رشک کرنا) مقصود ہو۔

سورہ مبارکہ کے اختتام میں یہ ذکر کرنا چاہیے کہ سورہ فلق میں؛ انسان چار خصلتوں سے اللہ کی پناہ لیتا ہے۔

1 - ہر اس چیز کے شر سے جو اللہ نے پیدا کی ہے۔
2 - ہر اس چیز کے شر سے جو رات کی تاریکی میں یا اندھیرے میں رونما ہو۔

3 - گرہوں میں جادو کرنے والوں کی برائی سے۔

4 - ہر حسد کرنے والے کے شر سے۔

یہ چار خصلتیں ان چیزوں میں سے ہیں جن سے انسان ڈرتا ہے۔
 اے رب! اپنے دین کو شیطانی سوچ رکھنے والوں سے بچا،

آمین یا رب العلمین

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ جزء - (30) سورة الناس

سورة الناس مکہ میں نازل ہوئی، اس کی چھ (۶) آیتیں ہیں۔

وجه تسمیہ:

اس سورہ کو اس لیے "سورة الناس" کہا جاتا ہے کہ آیت مبارکہ: "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" سے اس کا آغاز ہوا ہے، اس کے علاوہ اس میں لفظ "ناس" پانچ (۵) مرتبہ دہرایا گیا ہے۔

سورة الناس کی آیات ، الفاظ اور حروف کی تعداد

سورہ "ناس" مکی سورتوں میں سے ایک ہے، اس کا ایک (۱) رکوع، چھ (۶) آیتیں، بیس (۲۰) الفاظ، اکیاسی (۸۱) حروف اور پچیس (۲۵) نقطے ہیں۔

(یاد رہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

قرآن شریف میں ترتیب کے لحاظ سے سورة الناس قرآن کریم کی آخری سورت ہے، اور قرآن کی ترتیب سورہ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا شکر، حمد ثناء اور مدد طلب کرنا شامل ہے، جبکہ معوذتین میں مدد طلب کرنا اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنا ہے بیان ہوا ہے۔

متعدد مفسرین نے سورة "الناس اور فلق" کو معوذتین کا نام دیا ہے، جیسا کہ دونوں سورتوں کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتوں کی بحث ایک ہی ہے کہ دونوں میں شر سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے، اگر ہم سورت کے مندرجات پر تھوڑی سے توجہ دیں تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہوگا کہ سورة الناس سورة الفلق کی تفسیر ہے، سورة الفلق میں گریہوں پر پھونکنے والوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے، جبکہ سورة الناس ان کے بارے میں ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

دنیا کی آفات سے پناہ مانگنے کا ذکر سورة الفلق میں ہے، اور سورة الناس میں آخرت کی آفات سے پناہ مانگنے کی تاکید کی گئی ہے، سورة

الفلق میں لفظ "شر" کا مفہوم بیان ہوا ہے، جس میں مصائب اور اسباب کا ذکر ہے، سورة الناس میں ایسی چیز سے پناہ مانگی گئی ہے جو تمام گناہوں کا سبب ہے، یعنی شیطان کے وسوسے اور اس کے اثرات، چونکہ آخرت کا نقصان زیادہ سخت ہے، چنانچہ اسی پر تاکید کرتے ہوئے اس سورت پر قرآن کریم کا اختتام ہوا۔

سورة الناس کی آیات کی مجموعی تقسیم

پہلی آیت سے تیسری آیت تک، انسان کا اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا اظہار ہے، سورت کی آیت "۴" سے آخر تک یعنی آیت "۶" تک ان برائیوں کا بیان ہے جن سے بچنے کے لیے لازم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے، وہ شرور اور برائیاں جو دو گروہوں یعنی: انسانوں اور جنوں کی طرف سے ظاہر ہوتی ہیں، سورة فلق میں جن برائیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ عام تھیں، لیکن یہاں انسانوں اور جنوں کے دو گروہ سے یہ صادر ہوتی ہیں۔

سورة الناس کا عمومی خلاصہ

اس سورت کا مجموعی خلاصہ ایک حقیقی اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ: ہوشیار اور بیدار رہو کہ انسان ہمیشہ شیطانی فتنوں کا شکار رہتا ہے، اور شیاطین جن و انس مسلسل دل میں اثر ڈالنے اور گھسنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، انسان کا مقام علمی لحاظ سے جتنا اونچا ہوگا اور معاشرے میں اس کی حیثیت جتنی زیادہ ہوگی، اسے راہ راست سے ہٹانے کے لیے شیطانی وسوسے اتنے ہی زیادہ شدید ہوں گے۔

لہذا اس سورت میں پیغمبر ﷺ کو عالم انسانی کے لیے مثال، رہبر اور رہنما کے طور پر تمام فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پناہ مانگنی چاہیے وسوسے ڈالنے خناس کے شر سے "الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ" اس اللہ کی جو لوگوں کا پروردگار اور معبود ہے۔

اس دور میں شیطان کا تحرک اور منصوبہ بندی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی سرگرمیاں اور منصوبے خفیہ طور پر انجام دیتا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شیطان انسان کے کانوں میں باتیں ڈالتا ہے اور اس کے دماغ میں ایسے خیالات پیدا کرتا ہے کہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کا اپنا منصوبہ اور

نظریہ ہے اور اس کے اندر سے جوش مارا ہے، اور یہی فتنہ اور گمراہی کا باعث بنتا ہے رہنمائی کی آڑ میں۔

انسان کو چاہیے کہ شیاطین کو اپنی طرح اپنے لباس میں دیکھنے کی امید نہ رکھے، بلکہ وہ لوگوں پر غلبہ پانے کے لیے ہمیشہ حق اور باطل کو خلط ملط کر دیتے ہیں، لہذا سورہ الناس کی عمومی بحث کا ایک حصہ انسان کی تعلیم و تربیت ہے، کہ یہ سورہ انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ: انسان ہمیشہ شیطانی وسوسوں کا شکار رہتا ہے، اور شیاطین جن و انس انسان کے دل و جان میں گھر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انسان کو زندگی بھر چوکنا اور بیدار رہنا چاہیے، اور کبھی بھی شیطان سے لڑنے کا طریقہ نہیں بھولنا چاہیے۔

علماء کہتے ہیں کہ شیطان کا عمومی مقصد لوگوں کو راہ راست سے ہٹانا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُورَةُ النَّاسِ

سورة الناس کا ترجمہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں
مَلِكِ النَّاسِ ۝۲	لوگوں کے بادشاہ کی
إِلَهِ النَّاسِ ۝۳	لوگوں کے معبود کی
مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝۴	اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے
الَّذِي يُوسِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝۵	جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶	(خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں سے

لغات اور اصطلاحات کی تشریح

"الناس": لوگ، "ملک" سردار اور رہنما، حاکم، اختیار کا مالک، "الہ" معبود، حاکم، وہ جو دلوں پر حاوی ہے، "الوسواس" وسوسہ ڈالنے والا، موسوس، "الخناس" (تکویر: ۱۰ - الخنس)

"یوسوس": وسوسہ ڈالتا ہے، وہ آہستہ اور نرمی سے بولتا ہے، "الجنة": جنوں کا گروہ۔

محترم قارئین

اس بابرکت سورہ میں شیاطین، جنوں اور انسانوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے، امام احمد نسائی اور ابن حبان نے ابوذرؓ سے روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، فرمایا: ابوذر! کیا تم نے نماز پڑھی ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو، اس کے بعد میں

نے نماز پڑھی اور آکر بیٹھ گیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یا اباذر، تعوذ باللہ من شر شیاطین الإنس والجن"، "اے ابوذر! انسان اور جن شیاطین کے شر سے خدا کی پناہ مانگو" میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا انسان شیاطین بھی ہوتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔

سورة الناس کی تفسیر

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں

آپ کہہ دیجئے کہ میں لوگوں کے رب کی، مالک کی اور لوگوں کے (حقیقی) حاکم کی پناہ مانگتا ہوں، کہو اے نبی! میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی، میں التجا کرتا ہوں اور بھروسہ کرتا ہوں، کیونکہ اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ پناہ مانگی جائے اور التجا کی جائے لفظ "قل" میں مخاطب نبی کریم ﷺ ہے جو کہ پیشوا اور مثال ہے، اور اس مبارک اور اعلیٰ درجے کی قدوہ کی پیروی کرتے ہوئے تمام مؤمنوں کو یہ کہنا چاہیے اور ایسی پناہ میں جانا چاہیے، مفسر شیخ ناصر الدین عبد اللہ بیضاوی کہتے ہیں: پچھلی سورت میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا جسمانی نقصان سے تھا، جبکہ اس سورت میں اس کی پناہ ان نقصانات سے ہے جو انسانی روحوں پر آتے ہیں، اور خاص کر بشر کے لیے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن عظیم میں لفظ "قل" (۳۰۰) سے زیادہ مرتبہ آیا ہے، جن میں سے اکثر اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ کو مخالفین یا موافقین کے جواب میں حکم ہے، مفسرین کہتے ہیں: اگرچہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا رب ہے، لیکن انسان کی تعظیم کے طور پر اسے خاص طور پر ذکر کیا ہے، کیونکہ اس نے کائنات کی تمام مخلوقات کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور ان کو حکمت و علم سے آراستہ کیا، اپنے مقدس فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز کیا، پس وہ خدا کی سب سے افضل مخلوق ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ: "قل" اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نبی ﷺ وحی کے امین ہیں، اور اپنے پاس سے کچھ نہیں کہتے۔

اس کے علاوہ لفظ "قل" سے معلوم ہوتا ہے کہ خطرات اتنے شدید ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو پناہ لینے کا حکم دیتا ہے، اور "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" کے جملے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر برائی کا مقابلہ ممکن نہیں، آیت مبارکہ "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" کا مواد اس حقیقت کو ظاہر

کرتا ہے کہ؛ گنہگاروں کو اپنی زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کا رب ہے نہ کہ صرف اہل ایمان کا۔

اس کے علاوہ یہ جملہ: "قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ" ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جب نبی اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتے ہیں تو ہمارا فرض صاف ظاہر ہے، واضح ہے کہ: انسان خود خدا کی تربیت کے تابع ہو کر، "رب الناس" اس کی سلطنت اور حکومت قبول کرے۔

یہ بھی جان لو کہ: کافر لوگ اپنی طاقت، آبادی، قومیت یا اپنی دولت میں پناہ لے کر فخر محسوس کرتے ہیں، لیکن جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے عظیم رب جو مالک، خدا اور بادشاہ ہے کی پناہ میں رہتے ہیں۔

مَلِكِ النَّاسِ ۲۰	لوگوں کے بادشاہ کی

اور میں پناہ مانگتا ہو لوگوں کے "بادشاہ" کی، یعنی: اس ہستی کی جس کی کامل بادشاہت ہے، مکمل حاکمیت، بے مثال اور لا محدود غلبہ ہے، وہ حکمرانوں سمیت تمام مخلوقات کا مالک ہے، اور ان پر مکمل مالکیت رکھتا ہے، وہ ان پر حکومت کرتا ہے، اور ان کے کاموں کا انتظام کرتا ہے، عزت و ذلت اس کے ہاتھ میں ہے، اور وہی فقر اور بے نیازی دیتا ہے۔

اِلٰهِ النَّاسِ ۳۰	لوگوں کے معبود کی

"اور میں لوگوں کے معبود کی پناہ مانگتا ہوں، اور چونکہ مالک (حاکم) کبھی معبود ہوتا ہے اور کبھی نہیں، اس لیے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ الوہیت اور معبودیت اسی کا خاصہ ہے، اس کے ساتھ کوئی بھی شراکت نہیں رکھتا، "اِلٰهِ النَّاسِ": انسان کی عزت کے اظہار کے لیے اور اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے خدائے انسانیت نے تین بار "الناس" کو دہرایا ہے، صرف ضمیر پر اکتفا نہیں کیا ہے، اور اسے دہرانا اچھا ہے۔

مفسر ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: یہ تین صفات رب ذوالجلال کی صفات میں سے ہیں: "ربوبیہ"، "مالکیت"، "الوہیت" پس خدا تعالیٰ تمام چیزوں کا مالک اور شہنشاہ ہے، تمام چیزیں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں، اسی کی

ملکیت میں ہیں، اس لحاظ سے پناہ مانگنے والے کو حکم دیتا ہے کہ ایسی ہستی کی پناہ مانگے جس میں یہ تین صفات ہوں (مختصر: ۶۹۶/۳)

توجہ فرمائیں: سب سے پہلی چیز جو انسان کو محسوس ہوئی ہے وہ اس کی نشوونما، تکمیل اور پرورش ہے، "يَرْبِّي النَّاسَ" سیاست، منصوبہ بندی اور حکومت کے بعد، "مَلِكِ النَّاسِ" جیسے ہی اس کی نشوونما میں اضافہ ہوتا ہے پھر عبادت اور پرستش ہے، اور "إِلَهِ النَّاسِ" کا جملہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسان کو کسی ایسی ذات کی پناہ لینی چاہیے جو اندر کے رازوں اور آزمائشوں کو جانتا ہو، "يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ" (سورہ غافر: ۱۹)

ترجمہ: وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو (باتیں) سینوں میں پوشیدہ ہیں (ان کو بھی)

اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے	مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝

میں اس کی پناہ لیتا ہوں جس کا ذکر کیا گیا ہے، "وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے کہ شیطان" خناس" ہے، "خناس" (خنوس) سے بمعنی چھپ جانا اور پیچھے ہٹنا ہے، شیطان خود بھی مخفی ہے اور اس کا کام بھی خفیہ ہے، اگر اس کا فتنہ اور وسوسہ ظاہر ہو تو لوگوں پر غالب نہیں ہو سکتا تھا، لیکن وہ خوبصورت انداز میں ظاہر ہو جاتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ شیطان انسان کے دل پر نگاہ رکھتا ہے، جب انسان اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور جب انسان اللہ کو بھول جاتا ہے تو شیطان اس کا دل پکڑ لیتا ہے، اور اس میں وسوسے ڈالتا ہے۔ (حافظ موصلی سے روایت ہے)

اب جبکہ شیطان خناس ہے، اپنے شیطانی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ اس قدر آتا جاتا ہے کہ جب تک کہ اس کا منصوبہ کامیاب نہ ہو جائے، اس لیے ہمیں بھی اپنی زندگی میں اللہ کو بہت یاد کرنا چاہیے۔

قرآن عظیم میں انسان پر کئی بار تنقید کی گئی ہے، اور جیسے ہی اس سے خطرات دور ہو جاتے ہیں تو اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا وہ

ہمیں جانتا ہی نہیں، قرآن عظیم سورہ (یونس: ۱۱) میں فرماتا ہے: "وَلَوْ يُعِجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقَضَىٰ إِلَيْهِمْ أَجْلَهُمْ ۖ فَتَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ" ۝۱۱

ترجمہ: "اور اگر خدا لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلب خیر میں جلدی کرتے ہیں، تو ان کی (عمر کی) میعاد پوری ہو چکی ہوتی، سوان لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں انہیں ہم چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بہکے رہیں۔"

اس مبارک آیت کے مفہوم کی طرح سورہ کہف میں آیت "۵۸" اور سورہ فاطر کی آیت "۴۵" میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ جلدی لوگوں کو ان کے اعمال کی سزا دے گا تو وہ سب ہلاک ہو جائیں گے، اختیار جو کہ فرض کی بنیاد ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور اطاعت ایک ہنگامی پہلو اختیار کرے گی۔

ممکن ہے کہ "اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ" کا معنی یہ ہو کہ خدا کی سنت نیکی پہنچانے میں تیز رفتاری سے اور شر پہنچانے میں مہلت کے ساتھ ہو، اور اس جملے کا معنی یہ ہو کہ خدا تعالیٰ خیر پہنچانے میں جلدی کرتا ہے۔

جب کہ وہ "يَرْبِّ النَّاسِ" لوگوں کا رب ہے تو ہمیں دوسروں کے تربیتی طریقوں کو نہیں اپنا نا چاہیے، اب جب کہ وہ "مَلِكِ النَّاسِ" لوگوں کا بادشاہ ہے، تو ہم خود کو دوسروں کا غلام نہ بنائیں، اور جب وہ "إِلَهِ النَّاسِ" لوگوں کا معبود ہے، تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس کے علاوہ کسی سے وابستہ نہ ہوں، یہ سوچ اور ایمان فتنوں سے بہترین پناہ کا ذریعہ ہے۔

وہ جو لوگوں کے سینے، دل اور روح میں وسوسہ ڈالتا ہے وہ انسانوں سمیت جنوں اور شیاطین میں سے ہو سکتا ہے، ہاں، امیدیں اور وعدے، آج اور کل کرتے رہنا فتنے کے طریقوں میں سے ہیں۔

"الوسواس": وسوسے سے مراد پوشیدہ، آہستہ اور دھیمی آواز ہے، امام قرطبی نے کہا: شیطان کا وسوسہ یہ ہے کہ لوگوں کو خفیہ باتوں سے اپنی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے، ایسا وسوسہ کہ آواز سننے بغیر دل تک پہنچ جاتا ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۲۰/۶۲۳)۔

"الخناس": خناس، خنوس کے مادہ سے ہے، جنوں اور انسانوں سے پیدا ہوتا ہے، انسانوں کو دھوکہ دینے اور سازش کرنے کے لیے آجاتا ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کا مددگار نہ ہو تو انہیں تباہ کر کے آزمائش میں ڈال دے گا، اگر کوئی شخص خدا کو مدد کے لیے پکارتا ہے تو شیطان خناس فوراً بھاگ جاتا ہے، اور خود کو ایک اور موقع کے لیے تیار کرتا ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ: "وسواس" یعنی: وسوسہ کرنے والا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ فتنے کی حالت میں رہتا ہے، وہ نہ تھکتا ہے اور نہ ہی سست ہوتا ہے، جسے کہتے ہیں: وہ انتھک ہے، اور "خناس" یعنی: وہ دشمن جو اسے پیچھے ہٹاتے ہو وہ چھپتا دکھائی دیتا ہے، اور جب آپ یہ خیال کرتے ہو کہ وہ چھپا ہوا ہے، وہ دوبارہ آتا ہے، جیسے آپ کسی کو ایک دروازے سے نکالتے ہو تو وہ دوسرے دروازے سے تمہارے پاس واپس آجاتا ہے، چونکہ "خناس" کے اصل معنی: جمع ہونا اور پیچھے ہٹنا ہے، یہ اس سے کنایہ ہے کہ جب تم اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہو اور تم اللہ کا نام لیتے ہو، اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہو، تو شیطان بھاگ جاتا ہے، جب لمحہ بھر کے لیے لاپرواہی اور غفلت برتتے ہو تو شیطان دوبارہ ظاہر ہوتا ہے، درحقیقت وہ مسلسل غائب اور حاضر رہتا ہے، داخل ہوتا اور نکلتا ہے، پیچھے ہٹتا اور حملہ کرتا ہے، لہذا شیطان کے لیے "خناس" عموماً چھپانے کے معنی میں آتا ہے، درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ کہو، میں شیطان کے فتنے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، جو خدا کے نام سے بھاگتا ہے اور چھپ جاتا ہے، شیاطین ہمیشہ لوگوں کی لاپرواہی کا فائدہ اٹھاتے ہیں، جیسے ہی انسان غافل ہو جاتا ہے وہ حاضر ہو جاتے ہیں، اور جیسے ہی انسان چوکنا ہو جاتا ہے اللہ کی پناہ لیتا ہے اور آیات الہی کو یاد کرتا ہے، تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ حضور الہی کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے۔

لہذا انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ جوڑے رکھے اور فریب کاروں اور چالوں کے مقابلے میں ضروری سہولتوں کے ساتھ ہمہ وقت تیار رکھے غافل نہ رہے اور بیدار رہے، تاکہ فتنہ انگیزوں کی چال میں نہ پھنس جائے، ورنہ یہ مخلوق یا ناپاک مخلوقات کے ذریعہ یا خاص طور پر انسان صفت وسوسہ ڈالنے والوں کے ساتھ حملہ کر کے اسے تباہ کر دے گی۔

"خناس" دھوکے باز جھوٹا دوست اور ساتھی، بے وفا غدار دوست، زمانے کے خونخوار، ظلم کی طرف رہنمائی کرنے والا، بدعنوان اور بد معاشوں کا کام ہے جو مختلف طریقوں سے لوگوں کو تکلیف پہنچاتے اور دھوکہ دیتے ہیں، اور چالیں، جھوٹ، شیعبدہ بازی، فریب، مکر اور بیہودہ باتوں اور طرح طرح کے سماجی، مالی، انسانی، نسلی، قومی اور مذہبی حقوق کو روند دیتے ہیں، اور وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ جھوٹ اور فتنوں کی چھتری تلے سب کچھ برباد کر دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے دل میں دو گھر ہوتے ہیں، ایک میں فرشتہ اور دوسرے میں شیطان رہتا ہے (فرشتے اسے اچھے کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اور شیطان برے کام کی) چنانچہ جب بھی بندہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے، شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جیسے ہی اللہ کے ذکر سے غفلت برتتا ہے تو وہ انسان کے دل پر قبضہ کر کے اس میں برے وسوسے ڈال دیتا ہے (رواہ ابویعلیٰ عن انس مرفوعہ، مظہری)

الَّذِي يُوسِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝	جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے

لفظ "وسواس" کا آیت مبارکہ میں بمعنی موجود اور وسوسہ ڈالنے والے کے ہے، وسوسہ، خطرات اور ناجائز خیالات کے معنی میں بھی ہے، لیکن یہاں پر وسوسہ ڈالنے والے کے معنی میں ہے۔

باوجود اس کے کہ وہ کہتا ہے: "مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ" یہ شیطان کے کام کے بارے میں کہتا ہے، اس کی تاکید اگلی آیت میں کی گئی "الَّذِي يُوسِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ"، اور "یوسوس" فعل مضارع ہے۔

فعل مضارع عمل کے تسلسل اور اسرار کے لیے آتا ہے، مطلب یہ کہ وہ ہر وقت انسانوں کے وسوسے میں مشغول رہتا ہے، اور لوگوں کے دلوں میں گھس جاتا ہے، یعنی ممکن ہے کہ ظاہری طور پر آپ اسے نہ دیکھ سکیں، اور اس کی موجودگی کو جسمانی طور پر محسوس نہ کریں، لیکن وہ انسانوں کے اندر اپنے فتنوں اور کج رویوں میں مصروف رہتا ہے، یاد رہے کہ "الَّذِي يُوسِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ" کے جملے میں مذکور تسلط کی یہ شکل انسانی سینے پر ایسی نہیں ہے کہ اس سے فرار کی کوئی صورت نہ ہو، کیونکہ قرآن کریم سورہ اعراف کی آیت ۲۰۱ میں

ارشاد فرماتا ہے: "إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ" ترجمہ: "جو لوگ پرہیز گار ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں اور دل کی آنکھیں کھول کر) دیکھنے لگتے ہیں"

یہاں یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ وسوسہ برے عمل کا نقطہ آغاز ہے، اور جب یہ کسی غافل یا خالی الذہن شخص کو متاثر کرتا ہے تو پہلے اس کے دل میں ایک بری خواہش پیدا کرتا ہے، مزید وسوسہ ڈالنے کے بعد اس خواہش کو بری نیت اور ارادہ میں تبدیل کرتا ہے، پھر جب وسوسہ مزید بڑھ جاتا ہے، تو وہ ارادہ اور نیت ایک پختہ عزم میں بدل جاتا ہے، اور پھر آخری مرحلہ برا عمل ہے، اس لحاظ سے وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے خدا کی پناہ لینے کا مفہوم اور تصور یہ ہے کہ عظیم المرتبہ خدا برائی کو اس کے آغاز میں ہی مٹا دیتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۲	(خواہ وہ جنات سے (بو) یا انسانوں سے

اس آیت مبارکہ میں وسواس کا بیان ہے، یعنی: وسوسہ ڈالنے والا کبھی جنوں میں سے ہوتا ہے، اور کبھی انسانوں میں سے، شیطان جن (جیسا کہ ذکر ہوا) لوگوں کے دل، دماغ میں وسوسہ ڈالتا ہے، لیکن انسی شیطان کا وسوسہ لوگوں کے دلوں میں ایسا ہوتا ہے کہ وہ انسان کے سامنے خود کو ایک مشفق اور نصیحت کرنے والے کی صورت میں پیش کرتا ہے، اس کی باتیں خیر خواہی اور نصیحت کی صورت میں ہوتی ہیں، وہی بات انسان کے دل میں اترتی ہے جسے جنی شیطان اپنے وسوسے سے اس کے دل میں ڈالتا ہے، ایک قول کے مطابق: ابلیس جس طرح انسانوں کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اسی طرح جنوں میں بھی وسوسہ ڈالتا ہے، "مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" کا عمومی نتیجہ اور فہم یہ ہے کہ خدا نے اپنے رسول کو جنی اور انسی شیاطین سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے، اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ شیطان جنی کا تو وسوسہ ڈالنا واضح ہے، کہ وہ خفیہ طور پر انسان کے دل میں باتیں ڈال دیتا ہے، لیکن شیاطین الانس تو ظاہراً سامنے آکر باتیں کرتا ہے، اس کا وسوسہ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان الانس بھی سامنے زیادہ بولتے ہیں، جس سے سننے والے کے دل میں شک و تردد پیدا ہوتا ہے وہ صراحت کے ساتھ نہیں کہتے۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام اپنی کتاب "الفوائد فی مشکلات القرآن" میں کہتے

ہیں: شیاطین الانس کے وسوسہ سے مراد خود انسانی نفس کا وسوسہ ہے، کیونکہ جس طرح شیطان انسان کے دل میں برے کام کرنے کی خواہش ڈالتا ہے، اسی طرح انسان کا نفس بھی برے کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ اپنے نفس کے شر سے پناہ مانگیں، حدیث میں یہ ہے کہ: "اللهم انی اعوذ بک من شر نفسی وشر الشیطان وشرکہ" یعنی: "اے اللہ! میں اپنے نفس کے شر، شیطان اور اس کے شرک سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

ہم یہاں اضافہ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیات کے مطابق ابلیس جنوں کے خاندان سے ہے اور جنات ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمارے حواس سے پوشیدہ ہے۔

اس لیے شیطان ایک جن ہے، اور یہ کہ شیطان کے سپاہی جنات ہیں یہ ایک فطری مسئلہ ہے، جب کہ اس مبارک سورت میں خدائے بزرگ و برتر ہم سے اس قسم کے شیطان کے بارے میں بات کر رہا ہے جو انسانی جنس میں سے ہے، فرماتا ہے: "مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شیطان کے قابو میں آجائے تو وہ درحقیقت شیطانوں میں سے ایک شیطان ہو جائے گا، اب شیطان کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے سپاہی اس کی اپنی جنس کے ہوں یا جنات کی جنس سے، گویا اس کے پاس جنوں کا لشکر ہے، یا یہاں تک کہ وہ کچھ لوگوں کو اپنے راستے میں لاسکتا ہے، اور انہیں خلفشار کے طور پر استعمال کرسکتا ہے، چنانچہ ہمیں اپنے ارد گرد کے انحرافی عوامل اور خلفشار سے پناہ مانگنی چاہیے چاہے وہ ہماری اپنی ذات سے ہوں یا ایسی مخلوقات کی شکل میں جنہیں ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن ان کے وسوسوں کو اپنی روح میں محسوس کرتے ہیں۔

شیطان کو انسان پر مسلط کرنے کی وجہ

مفسرین اپنی تفسیروں میں شیطان کو انسان پر مسلط کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اللہ کی طرف سے شیطان کو انسان پر مسلط کرنا اس لیے ہے کہ لوگ اس کے ساتھ مقابلہ کریں، اور آزمائے جائیں، لیکن وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی پناہ دی ہے، وہ

شیطان کے شر سے محفوظ ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: "وہ شخص تم میں سے نہیں ہے جس کا ساتھی اور ہمنشین شیاطین میں سے متعین کیا گیا ہو، صحابہ نے عرض کیا: کیا آپ بھی یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! حتیٰ کہ میں بھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ سبحان و تعالیٰ نے مجھے میرے ساتھی شیطان پر غالب کیا ہے، چنانچہ وہ شیطان میرے تابع (یا مسلمان ہو گیا ہے) اس لیے وہ مجھے خیر کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا۔

حضرت انسؓ سے مروی حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ مسجد میں متعطف تھے کہ رات کے وقت صفیہ ام المؤمنین آپ ﷺ سے ملاقات کے لیے تشریف لائیں، اور آپ ﷺ ان کے ساتھ مسجد سے باہر تشریف لے گئے تاکہ انہیں گھر تک لے جائیں، اسی دوران انصار میں سے دو آدمی آپ ﷺ کے پاس سے گزرے، جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو تیز تیز چلنے لگے تاکہ جلدی گزر جائیں، تو آپ ﷺ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: ٹھہر جاؤ! یہ عورت جو میرے ساتھ ہے، صفیہ حی کی بیٹی اور میری بیوی ہے۔"

ان دونوں نے کہا: سبحان اللہ، یا رسول اللہ! کیا ہم نے آپ ﷺ کے بارے برا گمان کیا تھا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إن الشيطان يجري من ابن آدم مجرى الدم وإنى خشيت أن يقذف في قلبك ما شئت. أو قال: شرا" ترجمہ: "شیطان ابن آدم (انسان) کے بدن میں اس طرح دوڑتا ہے جس طرح خون رگوں میں گردش کرتا ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ تمہارے دل میں کچھ (یا کہا: کوئی شر) نہ ڈال دے"

نیز حدیث شریف میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک شیطان ابن آدم کے دل پر اپنا لگام لگا رکھتا ہے، پس اگر وہ اللہ کو یاد کرے گا تو پلٹ جائے گا، اور اگر اللہ کا ذکر بھول جائے گا تو اس کے دل کو نگل جائے گا، پس یہ ہے وہ "وسواس خناس"۔

اسی طرح ابی تمیہ سے مروی حدیث شریف میں آیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ کی سوار پھسل گئی، تو میں نے کہا: (لعنت ہو شیطان پر) نامراد ہو شیطان! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا مت کہو کہ: نامراد ہو شیطان! کیونکہ جب تم یہ کہو گے تو وہ خود کو بڑا محسوس کرے گا اور کہے گا: میں نے

اسے اپنی طاقت سے قابو کیا، لیکن اگر تم کہو: بسم اللہ: خدا کے نام پر! اس صورت میں شیطان خود کو چھوٹا محسوس کرتا ہے، اور اس قدر

کچلا جاتا ہے کہ وہ مکھی کی طرح ہوجاتا ہے۔"

ابن عباسؓ کہتے ہیں: "جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے دل میں وسوسا ہوتے ہیں، جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو شیطان واپس چلا جاتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت ہوجائے تو وسوسہ ڈالتا ہے۔"

سورة ناس میں خدا تعالیٰ کی تین صفات

سورة ناس میں خدا تعالیٰ کی تین عظیم صفات میں سے (ربوبیت، مالکیت اور الوہیت) بیان کی گئی ہیں، ان سب کا تعلق براہ راست انسان کی تعلیم اور اسے وسوسوں کے حملے سے بچانے سے ہے۔

البتہ خدا کی پناہ لینے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان صرف اپنی زبان سے کہے، بلکہ اپنی فکر، عقیدہ اور عمل کے ساتھ بھی شیطانی طریقوں سے، برے افکار اور پروپیگنڈے سے خدا کی پناہ لے، بری مجالس اور شیطانی حلقوں سے کنارہ کش ہوجائے، اور رحمانی افکار اور تبلیغ کی راہ پر گامزن رہے، ورنہ جس شخص نے عملاً خود کو ان فتنوں کے طوفان سے دوچار کیا ہو وہ صرف اس سورت کو پڑھنے، اور ان الفاظ کے ادا کرنے سے کبھی بھی ان فتنوں سے نہیں بچ سکتا۔

"رب الناس" کہہ کر، انسان رب کی ربوبیت کو تسلیم کرتا ہے، اور خود کو اس کی سرپرستی میں رکھتا ہے۔

"ملک الناس" کہہ کر اپنے آپ کو اس کی ملکیت سمجھتا ہے، اور اس کے حکم کا غلام بن جاتا ہے۔

اور "الہ الناس" کہہ کر اس کی عبادت کی راہ میں قدم رکھتا ہے، اور اس کے علاوہ دوسروں کی عبادت سے پرہیز کرتا ہے، بلاشبہ جو شخص ان تینوں صفات پر یقین رکھتا ہے اور خود کو ان تینوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے وہ فتنہ انگیزوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔

در حقیقت یہ تین صفات تین اہم تعلیمی اسباق، تین روک تھام کے پروگرام اور فتنہ انگیزوں کے شر سے بچانے کے تین اہم ذرائع ہیں، گویا انسان کے لیے ان خطرات کے تحفظ کی ضمانت ہیں۔

اس سورت میں قابل بحث موضوعات

اس سورت میں قابل بحث موضوعات استعاذہ اور اللہ کی پناہ مانگنا۔

استغاثہ کی اقسام

استغاثہ کی دو قسمیں ہیں:

الف: اسباب اور چیزوں میں استغاثہ۔

اسباب کی دنیا میں استغاثہ کا مطلب یہ ہے کہ مثال کے طور پر انسان ایک مشکل میں ہوتا ہے، تو اس حالت میں وہ ایسی مخلوق سے مدد مانگتا ہے جو مدد کرنے کی طاقت اور وسائل رکھتی ہے، یہ مدد اچھائی کرنے اور بُرائی سے بچنے دونوں معاملات میں مانگی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَتَعَاوُزُوا عَلَى الْيَدِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوُزُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ" ترجمہ: "اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو" (سورہ مائدہ: ۲)۔

اسباب اور وسائل سے اوپر مدد طلب کرنا

ما فوق الاسباب مدد مانگنا یہ ہے کہ انسان کسی کام کے کرنے پر قادر نہ ہو، اس لیے ایک مؤمن آدمی اللہ سے مدد مانگتا ہے، جیسے پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم اسباب میں ایک لشکر تیار کیا اور جنگ بندی کی تیاری کی، لیکن ان کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے آپ نے بارگاہ الہی سے اپنے لشکر کی فتح و نصرت کے لیے مدد طلب کی۔

"إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالْفِ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝" (سورة الانفال: ۹) ترجمہ: "جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کر لی کہ بے شک میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں، جو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں"

صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین پر نظر ڈالی جن کی تعداد ایک ہزار تھی، اور آپ کے ساتھی ۳۱۳ تھے، تو آپ نے قبلے کی طرف منہ کر کے ہاتھ پھیلائے اور اپنے رب کو پکارا: "اللَّهُمَّ أَنْجِزْ لِي مَا وَعَدْتَنِي اللَّهُمَّ آتِ مَا وَعَدْتَنِي اللَّهُمَّ إِنَّ تَهْلِكَ هَذِهِ الْعَصَابَةُ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدُ فِي الْأَرْضِ (حدیث شمارہ: ۴۶۸۷ صحیح مسلم) ترجمہ: "اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے مجھے وہ عطا فرما، اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں تیری بندگی نہیں ہوگی۔"

امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک سائبان کے نیچے تشریف فرماتھے، فرمایا: اے خدا! میں چاہتا ہوں کہ تو اپنا وعدہ پورا کر، خدایا: اگر مومنوں کا یہ گروہ یہاں سے فناء ہوگیا تو روئے زمین پر کوئی اور تیرے اکیلے کی عبادت نہیں کرے گا، اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے اپنے رب سے بہت اصرار کیا، کافی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زرہ پہن کر باہر نکلے جب کہ آپؐ فرما رہے تھے، "سَيَهْزُمُ الْجَمْعُ وَيُولُونِ الدُّبْرَةَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَذْهَى وَأَمْرٌ ۝"

یعنی: ان کی جماعت عنقریب شکست کھا جائے گی، اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، لیکن ان کا مقررہ وقت قیامت ہے، اور روز جزا اس سے بھی بڑی اور کڑوی آفت ہوگی۔

امام طبرانی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک منافق تھا جو لوگوں کو اذیت پہنچاتا تھا، کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمیں منافق کے خلاف مدد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانا چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: استغاثہ مجھ سے کرنا جائز نہیں ہے، جا کر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو (وروی الطبرانی یاسنادہ عن عبادۃ بن الصامت أنه کان فی زمان النبی - صلی اللہ علیہ وسلم - منافق یؤذی المؤمنین، فقال بعضهم فقوموا بنا نستغیث

برسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم - من هذا المنافق، فقال النبی - صلی اللہ علیہ وسلم: (إنه لا يستغاث بي، وإنما يستغاث بالله)

استعاذہ (پناہ مانگنا)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ ہمیشہ اللہ کی پناہ مانگے، (فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ)، (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ)

لہذا ایک مسلمان پناہ مانگتے وقت کہتا ہے: "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم"، اللہ کے پیغمبر بھی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں: "قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ" (سورہ بقرہ: ۶۷) ترجمہ: "میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں سے ہوجاؤں"، "وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ" (سورہ دخان: ۲۶) ترجمہ: اور بے شک میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ پکڑتا ہوں، اس سے کہ تم مجھے سنگسار کردو"، "مَعَاذَ اللَّهِ" (سورہ یوسف: ۲۳) ترجمہ: "اللہ کی پناہ"، "قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۝ وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝۲۳" (سورہ اعراف: ۲۳) ترجمہ: "انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں سے ہوجائیں گے، ابراہیم علیہ السلام جو کہ انبیاء کرام کے باپ ہیں وہ بھی ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ کے دربار سے رجوع کرتے تھے، "رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيداً لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ" (سورہ البائدہ/۱۱۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بارگاہ الہی میں دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوهُ عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ" (سورہ یونس: ۶۸)

مشرکین قریش کی پناہ مانگنے کی عادت

پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے کے زمانے میں ایسے لوگ تھے:

1 - جنات کی پناہ لیتے تھے: "وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ

فَزَادُوهُمْ رَهَقًا" (سورة الجن/8) ترجمہ: اور یہ کہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے تو انہوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا۔

2 - بعض مشرکوں نے نیک لوگوں کے مجسموں کی پناہ لی، جیسے: لات، منات، ببل وغیرہ۔

3 - حبشہ کے بعض مشرکین نے درختوں کی پناہ لی، اسے باعث برکت سمجھتے تھے، "فعن أبي واقد الليثي قال: «خرجنا مع رسول الله (صلى الله عليه وسلم) إلى حنين ونحن حدثاء عهد بكفر، وللمشركين سدرة (بیری کا درخت) يعكفون عندها وينوطون بها أسلحتهم، يقال لها ذات أنواط، فمررنا بسدرة، فقلنا: يا رسول الله صلى الله عليه وسلم اجعل لنا ذات أنواط كما لهم ذات أنواط، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الله أكبر، إنها السنن، قلتم والذي نفسي بيده كما قالت بنو إسرائيل لموسى: اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمُ آلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ (سورة الأعراف: 138)، لتركن سنن من كان قبلكم" (سنن الترمذی تحت شماره (2180) اور اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

4 - بعض نے موتیوں، لٹھیوں، دھاگو، تاروں وغیرہ کی پناہ لی اور نظر بد سے بچنے کے لیے ان چیزوں کا استعمال کیا۔

5 - یہ تمام اسباق اس لیے ہیں کہ انسان مشکلات کے وقت اللہ کی پناہ لے، بی بی مریم جو ایک موحده اور یکتا پرست بیٹی تھی، فرشتے سے ملاقات کے وقت اسے نہیں پہنچاتی اور کہتی ہے: "قَالَتُ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِنَّ كُنْتُ تَقِيًّا" (سورة مریم: ۱۸)

ترجمہ: "مریم بولیں کہ اگر تم پرہیزگار ہو تو میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کی بارگاہ میں پناہ لینے کی بجائے دوسروں کی پناہ لیں؟

جی ہاں! ایسے لوگ ہیں جو قرآنی عقیدہ نہیں رکھتے، ان کے دلوں میں توحید جاگزیں نہیں ہوا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم خود مشرکین کے بارے میں کہتا ہے کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کی پناہ لیتے تھے، قرآن کریم کی آیات جنات کی زبانی ہمارے لیے اس طرح بیان کرتا ہے: "وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا" (سورة الجن)

ترجمہ: "اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے (اس سے) ان کی سرکشی اور بڑھ گئی تھی۔"

وہ خود بیان کرتے ہیں کہ یہ اشخاص جو جنوں کی پناہ لیتے تھے، ان کی پریشانی میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے تھے۔

ہمارے زمانے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو قسمت کا حال بتانے والے نجومیوں کے پاس جاتے اور ان کی پناہ لیتے ہیں، یا یہ کہ یہ جادوگر اور نجومی ان کو دوسروں کی پناہ دیتے ہیں جیسے: جنات کی اور ان کے تعویذوں میں جنات کے نام لکھتے ہیں، اور شیطان بھی جنات میں سے تھا، "إِلَّا ابْلِيسَ" (سورة البقرة: ۲۴) "وَكَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ" (سورة كهف: ۵۰)

اس لیے وہ ایک نئے انداز میں ان لوگوں کے افعال کو دہراتے ہیں جن کا ذکر قرآن نے برائی سے کیا ہے۔

آج بھی ایسے لوگ ہیں جو اشخاص کی پناہ لیتے ہیں، آپ پورا قرآن پڑھیں، قرآن کے کسی صفحے میں نہیں ہے کہ کسی پیغمبر نے کسی فرشتے کی پناہ لی ہو، یا کسی پیغمبر نے اپنے پچھلے کسی پیغمبر کی پناہ لی ہو، یا قرآن کی کوئی آیت حکم دیتی ہو کہ اپنی مشکلات میں کسی شخص کی پناہ لے لو، لیکن بد قسمتی سے آج بہت لوگ ایسے ہیں جو اولیاء اللہ کی پناہ لیتے ہیں، یہ درست ہے کہ یہ لوگ عظیم ہستیاں ہیں، لیکن مصیبت کے وقت ان کی پناہ لینا جائز نہیں، تمام انبیاء نے ہمیشہ خدا کی بارگاہ میں پناہ مانگی ہے، اگر ہم درد و تکلیف میں پناہ گاہ چاہتے ہیں تو صرف بارگاہ الہی سے رجوع کر کے انبیاء کی طرح "ربنا" کہیں گے۔

انسان کے دو دشمن، انس اور جن، اور ان کا مقابلہ کرنا

علماء کہتے ہیں کہ: انسان کا دشمن دوسرا انسان یا انسان کا دشمن شیطان ہوسکتا ہے، ہمارے عظیم رب نے ہمیں دشمن سے لڑنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے حسن سلوک، برداشت، ترک انتقام اور حوصلہ جیسے نکات اختیار کرنے کی نصیحت کی ہے۔

اور اگر اس حکمت عملی سے دشمن نہ رکے تو پھر جہاد اور قتال کا حکم فرمایا ہے، لیکن شیطان کی دشمنی کے مقابلہ کے لیے صرف استعاذہ اور اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس موضوع کے بارے میں قرآن کی تین آیات لکھی ہیں، جن میں ان دو دشمنوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، کہ وہ انسانی دشمن ہیں اور ان سے دفاع کے لیے اچھے کردار، عدم انتقام کے ساتھ ساتھ حسن سلوک کی طرف رہنمائی کی ہے، اور شیطان دشمن کے مقابلے میں استعاذہ کی تلقین کی ہے۔

ابن کثیر کہتے ہیں: پورے قرآن میں یہی تین آیتیں اس موضوع کے بارے میں آئی ہیں، ایک تو یہ ہے: "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ" (سورہ اعراف: ۱۹۹) ترجمہ: "(ای محمد) عفو اختیار کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کرلو"

پھر شیطان دشمن کے مقابلے میں کہا: "وَأَمَّا يُزْغَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" (سورہ اعراف: ۲۰۰)

اور اس کا نتیجہ خدا کی پناہ مانگنا ہے، دوسری آیت میں انسانی دشمن کے علاج کے لیے فرمایا: "ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" (سورہ مؤمنوں: ۹۶) یعنی: برائی کو اچھائی کے ذریعہ دفع کریں، پھر شیطان دشمن کے مقابلے میں فرمایا: "وَقُلْ رَبِّ اعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ ۝۹۰ وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ۝۹۱" (سورہ المؤمنون: ۹۷، ۹۸) ترجمہ: "اور تو کہہ اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسے سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آوجود ہوں۔"

تیسری آیت میں انسانی دشمن سے دفاع کے لیے فرمایا: "ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ" (سورہ فصلت: ۳۴) ترجمہ: تم برائی

کو اچھائی سے دور کرو، اگر آپ لوگ ایسا کرو گے تو دیکھو گے تمہارا دشمن تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔

پھر شیطان دشمن کے مقابلے میں فرمایا: "وَأَمَّا يُنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۝ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۳۱" (سورہ فصلت: ۳۶)

یہ وہی الفاظ ہیں جو سورہ اعراف میں شیطان دشمن کو دور کرنے کے لیے آئے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ اس سے مقابلہ کرنے کے لیے استعاذہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، (ابن کثیر)۔

ان تینوں آیات میں دشمنان انسانی کے ساتھ عفو و درگزر اور حسن سلوک بتایا گیا ہے، کیونکہ فطرتاً انسان ایسے ہی ہیں، اچھے سلوک اور احسان سے شکست کھا جاتے ہیں، اور جو اپنی صلاحیتیں کھو چکے ہیں اور صرف شر النفس ہیں، ان کا علاج دوسری آیات میں جہاد و قتال کے ساتھ بتایا گیا ہے، کیونکہ وہ کھلے دشمن ہیں، ان کا کھلے عام مقابلہ کیا جاتا ہے، اس لیے ان کی طاقت کو شیطان ملعون کے برعکس جو کہ فطری طور پر برا ہے، اس پر عفو و درگزر کا کوئی اثر نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ اپنے شر سے باز نہ آجائے، اور نہ ہی اس کا مقابلہ جہاد سے کیا جاسکتا ہے، یہ دونوں قسم کے نرم اور گرم حرب صرف انسان دشمن کے خلاف استعمال کیے جاسکتے ہیں، شیطان کے خلاف استعمال نہیں کیے جاسکتے، لہذا اس کا علاج صرف خدا سے پناہ مانگنے اور ذکر الہی میں مصروف رہنے سے ہی ممکن ہے، کہ پورے قرآن میں اس کی تلقین کی گئی ہے، اسی پر قرآن کریم کا اختتام ہوا ہے۔

شیطان کو "خناس" کیوں کہا گیا؟

اہل لغت لفظ "خناس" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "خناس" صیغہ مبالغہ ہے "خنوس" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جمع ہونے اور پیچھے ہٹنے کے معنی ہے، اس لیے "خناس" شیطان کا لقب پڑ گیا کہ جب اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

علماء کہتے ہیں کہ: شیطان کو اس لیے "خناس" کا لقب دیا گیا کہ وہ ہمیشہ انسان کو وسوسہ کرتا رہتا ہے، اور جیسے ہی انسان اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو جائے تو وہ خود کو چھپا لیتا ہے، اور جیسے ہی انسان

اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو شیطان واپس حاضر ہو کر اپنی "خناسی" میں مصروف ہو جاتا ہے۔

خناسوں کا گروہ

اس بارے میں کہ "وسواس خناس" صرف ایک گروہ یا متعین افراد و اشخاص ہیں، یا کہ صرف انسانوں میں "خناس" موجود ہے، یا یہ گروہ جنات میں بھی سرگرم ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا چاہیے کہ خناسوں کا گروہ صرف ایک گروہ یا ایک لباس میں موجود نہیں ہے، خناس جنوں اور انسانوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ہر لباس ہر جماعت اور ہر گروہ میں پائے جاتے ہیں، اس گروہ کا مختلف اجتماعات میں اور مختلف لباسوں اور عناصر میں تقسیم ہونے کی حد ہم انسانوں کو سکھاتی ہے کہ ہم ان کی سازشوں اور پروپیگنڈے سے ہوشیار رہیں اور ان سب سے خدا کی پناہ مانگیں۔

شیطان اور انسان پر اس کا تسلط

انسان کے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے عظیم رب نے ایسی مخلوق کیوں پیدا کی جو ابتداء پیدائش سے ہی انسان سے دشمنی رکھتی ہے، اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اس کے وجود کو ختم کیوں نہیں کرتا؟

اس سوال کے جواب میں قرآن کریم سورہ اعراف کی آیت "۲۷" میں بہت خوبصورت جواب دیتے ہوئے کہتا ہے، اگر کوئی کہے خدا نے رحمن و رحیم نے کیسے ایک دشمن کو اس طاقت سے انسان پر غلبہ دیا، ایک ایسا دشمن جس کی طاقت کا کوئی توازن نہیں اور وہ جہاں چاہیے جاسکتا ہے بغیر اس کے اس کی موجودگی کا کوئی احساس کرے، حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق انسان کے جسم کے اندر رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے شیاطین کو بے ایمان افراد کا سر پرست بنایا ہے، "إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ" ○۲۷ "یعنی: ان کو ہرگز ان لوگوں کے دل اور روح میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے جو اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، یا دوسرے لفظوں میں مذکورہ بالا عبارت اس فہم کو واضح کرتی ہے کہ: پہلا قدم انسان اٹھاتا ہے اور شیطان کو خود پر مسلط ہونے کی

اجازت یا موقع دیتا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ شیطان کو داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے، اور انسان کے اس اقدام کے بعد شیطان داخل ہونے کا ذریعہ تلاش کرتا ہے، کہ خود کو انسانی روح کی حدوں تک پہنچنا دے اور اس پر پوری طرح قبضہ کر لے۔

اس لیے جو لوگ شیطان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے، تو شیطان ایسے افراد پر غلبہ پانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ہمارا عظیم رب اس بارے میں فرماتا ہے: "إِنَّمَا سُلْطَنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ" (سورہ نحل: ۱۰۰) ترجمہ: "شیطان ان لوگوں پر غلبہ رکھتا ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں، اور اس کو اپنا ولی بنا کر اس کی عبادت کرتے ہیں"

اسی طرح سورہ حجر: "۴۲" میں اس موضوع کو دوبارہ بیان فرماتے ہیں: "إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَايِبِينَ" ترجمہ: "تم میرے بندوں پر حکمرانی نہیں کر سکو گے سوائے ان گمراہوں کے جو تیری پیروی کرتے ہیں"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں شیطان اور اس کے چیلے نظر نہیں آتے، لیکن باشعور اور بیدار لوگ جانتے ہیں کہ اگر وہ شیطان خناس کے وسوسوں سے لڑیں تو اس کے اثر و رسوخ کو روک سکتے ہیں۔

گمراہوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی

لغت میں "توبہ" اور "توب" بمعنی پلٹنے اور واپس ہونے کے ہیں۔ راغبؒ اپنی "مفردات" میں لکھتے ہیں کہ: "توب" کا معنی ہے گناہ کو سب سے خوبصورت انداز میں چھوڑنا اور یہ معذرت کرنے کی بہترین شکل ہے، کیونکہ معذرت کرنے کی تین قسمیں ہیں:

یا معذرت خواہ شخص کہے: میں نے فلان کام نہیں کیا، یا کہے: میں نے وہ کام کیا ہے، لیکن اس کام کے کرنے سے میرا مقصد ایسا ویسا تھا، یا وہ کہتا ہے: میں نے ایسا کیا، لیکن میں نے برا کیا، اور میں اسے دوبارہ نہیں دہراؤں گا، آخری قسم کو شریعت میں توبہ کہا جاتا ہے۔

توبہ عربی لفظ ہے، جس کا معنی ہے گزرے ہوئے عمل پر پشیمان ہونا، اور ترک گناہ کا عزم کرنا، اور اعمال کی تلافی کرنا۔

محترم قارئین

جیسا کہ توبہ کے لفظی اور اصطلاحی مفہوم سے سمجھا جاسکتا ہے، توبہ دراصل دل کی ندامت ہے، یہ پچھتاوا اور پشیمانی نہ صرف دل کا ارادہ اور عزم ہے، بلکہ یہ عزم اور ارادہ انسان کے عمل میں بھی ظاہر ہونا چاہیے، اور واضح کرنا چاہیے کہ اس معاملے میں سب سے اہم عمل فرائض کو انجام دینا اور محرمات کو چھوڑنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارا عظیم رب اس شخص کی توبہ قبول کرتا ہے جو دل کی گہرائیوں سے اپنے برے عمل پر پشیمان ہو اور اس کی تلافی کا عزم کرے، قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی گہرائیوں سے توبہ کرتے ہیں، اور اپنے عمل کی اصلاح کرتے ہیں، اللہ کی طرف سے ان کی توبہ قبول کی جائے گی، "إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا" (سورہ بقرہ آیت: ۱۶۰)

اس صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے، توبہ قبول نہ کرنا یہ خدا کے مقصد کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا۔

ہمارے عظیم رب نے توبہ کا دروازہ قیامت تک کھلا رکھا ہے، اگر اللہ نہ کرے توبہ کے دروازے بند ہو جائیں تو تکامل کا محرک ختم ہو جائے گا، انسان کو تباہی، مصائب اور آخر کار زوال اور عظیم مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا، توبہ کے سوا انسان کی نجات کے لیے کوئی راستہ نہیں بچے گا۔

لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو ان تمام تر غیبات اور دعوئوں کے باوجود اپنی جہالت پر اڑے ہوئے ہیں، اور گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور وہ نہ صرف اپنے خالق کا انکار کرتے ہیں، بلکہ اپنی تمام شیطانی چالوں اور برائیوں کے ساتھ دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں، اور برے انداز سے شرک کی تبلیغ کرتے ہیں۔

اللہ رب العزت سورہ نساء آیات: (۴۸ اور ۱۱۶) میں فرماتے ہیں: "إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ۝"

ترجمہ: "یقیناً خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے، اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے، اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان بندھا" اور پھر فرماتے ہیں: "إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝"

ترجمہ: "یقیناً خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے گا بخشش دیگا، اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ راستے سے دور ہو جا پڑا"

مشرکین اور گمراہ لوگ دین اور اس کی خدمت کرنے والوں کے ساتھ دشمنی کو اپنی ذمہ داری بنا چکے ہیں ان کے منصوبوں میں فتنہ، بغض اور دشمنی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، سب سے پہلے وہ دوسروں کو ستانے اور غیبت کرنے کے بجائے خود پر ظلم کرتے ہیں۔

اسلام کے مقدس دین کی ہدایت اور احکامات میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اور پیشین گوئی کی گئی ہے کہ: ایسے لوگوں کی توبہ جو آیات اور احادیث نبوی میں تحریف کرتے ہیں، اور دینی عقائد کا انکار کرتے ہیں اور دین میں بدعت ایجاد کرتے ہیں، یا ان تمام لوگوں کی توبہ جو لوگوں کو گمراہ کرنے کا سبب بنتے ہیں قبول نہیں ہوتی۔

اس قسم کے لوگوں کے ساتھ خدا کا فضل شامل نہیں ہوتا اور فرعون کی طرح جہالت میں غرق اور خدا کے غضب میں گرفتار ہوتے ہیں۔

لیکن محترم قاری! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گناہ جس قدر بھی ہو توبہ سے معاف ہو جاتا ہے، عمومی اور جامع معافی قرآن کریم کی

ایک آیت کا اہم پیغام ہے: "قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ۝۱۰ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝۱۱" (زمر آیت: ۵۳)

ترجمہ: "کہہ دے اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی؟ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتا ہے، بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔"

مگر وہ لوگ جو یا تو حق کو نہیں سمجھتے اور اپنی جہالت اور کج روی کا شکار ہیں، یا جان بوجھ کر گمراہ ہیں، اور اپنی زبان و قلم سے دوسروں کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں، ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، اور آخر کار اس دنیا میں شرمندہ ہوں گے، اور آخرت میں جہنم میں ہوں گے اور ان پر خدا کی لعنت ہوگی۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا، قرآن کریم مشرکین اور شرک کفر اور الحاد کی تبلیغ کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ خدا تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے، لیکن شرک کے گناہ کو معاف نہیں کرتا۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۝۱۰" (سورہ نساء: ۱۱۶) ترجمہ:

"بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے"

متعدد علماء کرام کی رائے ہے کہ: توبہ کی آیات کے الفاظ میں عمومی مفہوم دیکھا جاسکتا ہے، ایک اصطلاح کے مطابق یہ تمام انسانوں کی حالت کو شامل ہے، اور شرک کو بھی احاطہ کرتی ہے، اور کہتے ہیں کہ اس حکم میں شرک بھی شامل ہے، جیسا کہ کہتا ہے: "وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ

التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِہٖ" (سورہ شوری: ۲۵)

اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت اور دیگر آیات جن میں توبہ کے احکام شامل ہیں، ان میں شرک کے بھی معافی کا ذکر ہے، توبہ کے نتیجے میں، شرک کو معاف نہ کرنے کا مطلب اس کی توبہ قبول نہ کرنا نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ بعض گناہ بغیر توبہ کے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے نتیجے میں، نیک اعمال کرنے اور کبیرہ گناہوں کو ترک کرنے جیسے

طریقوں سے انہیں معاف کیا جائے گا، لیکن شرک کبھی بھی اس خصوصی رحمت کے دائرے میں شامل نہیں ہوتا، کیونکہ شرک پر رحمت الہی کے نزول کا کوئی راستہ نہیں، البتہ توبہ کی روشنی میں معاف ہونا ایک فطری امر ہے، وہ لوگ جو اسلام کی ابتداء میں دین اسلام کی طرف راغب ہوتے تھے، تو نبی ﷺ ان کا اسلام قبول کرتے تھے، حالانکہ پہلے وہ مشرک ہوتے تھے، اس لیے توبہ اور گناہ سے واپسی تمام گناہوں کو دھو ڈالے گی، حتیٰ کہ شرک کو بھی۔

فرعون کی توبہ کیوں قبول نہ ہوئی

فرعون کی توبہ اس لیے قبول نہ ہوئی، کیونکہ فرعون کا ایمان ہنگامی حالات اور مجبوری کے تحت تھا، یعنی جب فرعون ایک ایسی حالت میں پہنچ گیا، جہاں سے نکلنا ناممکن تھا، اور دوسری طرف اس کے پاس اس سے فرار کا کوئی راستہ نہ تھا، اور اس کی موت یقینی تھی، لہذا اس کی توبہ اور پشیمانی اس کے کسی کام نہ آئی یہ ان تمام مجرموں، گنہگاروں اور گمراہوں کے حال اور قسمت کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان یا توبہ انہیں ہنگامی حالت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

قرآن عظیم ایک خاص خوبصورتی کے ساتھ بیان فرماتا ہے: "حَتَّىٰ إِذَا أَذْرَكَهُ الْعَرْقُ ۝ قَالَ أَمُنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُوءَا إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝" (سورہ یونس آیت: ۹۰)

ترجمہ: "یہاں تک کہ جب اس کو غرق (کے عذاب) نے آپکڑا تو کہنے لگا میں ایمان لایا کہ جس (خدا) پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔"

اس لیے خدا نے اسے مخاطب کر کے فرمایا: "الَّذِي وَقَدَّ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝۹۱"

ترجمہ: "(جواب ملا) کہ اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مفسد بنا رہا"

محترم قارئین:

یہ حکم فرعون کے لیے نہیں ہے، تو بہ قبول کرنے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ توبہ موت آنے سے پہلے کی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کہتا ہے: "وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ اللَّهَ" (سورہ نساء: ۱۸)

ترجمہ: "اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) برے کام کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آجود ہو۔"

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عبادات میں شریعت کی بنیاد نقل پر ہے نہ کہ عقل پر، لیکن اس میں سادہ اور قابل فہم منطقی بات یہ ہے کہ بندے کے اختیار میں ہے، اگر اس نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا ہے اور واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور کوئی اچھا موقع نہیں ہے تو بے بسی سے آخری موقع پر توبہ کا انتخاب کرتا ہے، تو اس صورت میں منطقی بات بھی ایسی ہے کہ توبہ قبول نہ ہے۔

ایسی منطق اللہ تعالیٰ کی رضا اور ارادہ کے سامنے باوجود تمام گناہوں کے ممکن ہے معافی کے مستحق قرار پائے، (ان شاء اللہ تعالیٰ) البتہ یہ آیت ان آیات کے معانی سے متصادم نہیں ہے جو کہتی ہیں کہ آخری سانس تک توبہ قبول ہے۔

کیونکہ اس سے مراد وہ لمحات ہیں کہ اس نے ابھی تک موت کی قطعی نشانیاں نہیں دیکھی ہیں، یعنی عالم برزخ کو نہیں دیکھا ہے۔

اے پروردگار! ہمیں سچے توبہ کرنے والوں میں سے بنا اور گمراہ ہونے سے بچا۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں حاضر و ناظر سمجھتا ہے اسے کبھی کفر نہیں کرنا چاہیے اور برائی اور فساد کا پرچار نہیں کرنا چاہیے، خدا کی ذات اس تمام فتنہ و فساد سے پاک ہے جو وہ دیکھتے ہیں، اور اس سلسلے میں مجرموں کو سب سے پہلے نقصان پہنچے گا اور اس سے پہلے کہ ان کو نقصان پہنچے، اچھے اعمال و افعال کی طرف رجوع کریں اس کا بہترین طریقہ اور اس قرآنی آیت کی مثال کے طور پر ہم انسانوں کے لیے اب عمل کرنا ممکن نہیں رہا، یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم پوری ایمانداری کے ساتھ دعا

کریں اور اظہار کریں: "قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝۲۳" (سورہ اعراف: ۲۳)

ترجمہ: "دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہوجائیں گے۔"

شیطان خبیث

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِنَّا فِي الْأَرْضِ حَلَلًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝۱۶۸"

ترجمہ: "اے لوگو! ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں حلال، پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"

ماہر لسانیات کی اکثریت کا خیال ہے کہ "شیطان" عربی لفظ ہے، اور "شطن" کے مادہ سے مشتق ہے، "شطن" دور ہونے کے معنی میں ہے، اور سرکشی کرنے والا متمرّد چاہے انسان ہو یا جن یا جانور شیطان کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے، لیکن "شاطن" بہ معنی خبیث کے ہے، اور ابلیس اس کی اولاد (خاندان) اور اعوان (مددگاروں) کو سرکشی، عصیان اور خباثت، اور وسوسہ ڈالنے کی وجہ سے شیطان خبیث کہا گیا ہے۔

یہ لفظ قرآن پاک میں شیطان کے ساتھ تعاون کرنے والوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے، "وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ ۖ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ" (سورہ بقرہ: ۱۴) (اور جب منافق اپنے شیاطین کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں)

یا جیسا کہ قرآن کریم سورہ انعام آیت نمبر "۱۱۲" میں فرماتا ہے: "وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَاطِئِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ" (اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا)

"الشیطان"، الشیاطین" اور "شیطانا" قرآن عظیم کی مختلف سورتوں میں اس کا ذکر "۹۰" سے زیادہ مرتبہ آیا ہے، تمام مواقع میں

شیطان انسان کا دشمن اور برا چاہنے والے کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔

روایات میں مذکور ہے کہ: شیطان طنزیہ انداز میں کہتا ہے: پروردگار! تیرے بندے تجھ سے محبت کرتے ہیں، لیکن تیری نافرمانی بھی کرتے ہیں، اور اس کے برعکس مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور میری اطاعت کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ بدلے میں جواب دیا جائے گا: میں ان کی اس اطاعت کو جو تیری کرتے ہیں معاف کروں گا، اس دشمنی کی وجہ سے جو تیرے ساتھ رکھتے ہیں، اور میں ان کا ایمان قبول کرتا ہوں، اگر چہ انہوں نے میری اطاعت نہیں کی اس محبت کی وجہ سے جو وہ مجھ سے رکھتے ہیں۔

قرآن میں بعض شیطانی بری صفات

پہلی صفت: جو قرآن عظیم میں شیطان کے لیے بیان کی گئی ہے وہ درحقیقت انسان اور اس کی اولاد سے شیطان کی شدید دشمنی ہے، (إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ) "یقیناً شیطان کی دشمنی انسان کے لیے عیاں ہے" (سورہ یوسف: ۵)

دوسری صفت: جو کہ قرآن کریم میں شیطان کی بیان کی گئی ہے: وہ بہکاوہ، اور شیطان کی گمراہ کن سازش ہے، (قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا غُيُوبَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝۸۲) "شیطان نے کہا: قسم ہے تیری عزت کی! کہ میں ضرور بالضرور ان سب کو گمراہ کردوں گا" (سورہ ص آیت: ۸۲)

تیسری صفت: قرآن کریم میں جو شیطان کی بیان ہوئی ہے وہ تکبر اور غرور کی سب سے بری اور بدترین صفت ہے: "يَعْدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۝ وَمَا يَعْدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝۱۲۰" (شیطان ان سے جھوٹے وعدے کرتا ہے، خواہشات میں انہیں مشغول رکھتا ہے، انہیں دھوکہ اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں دیتا) (نساء: ۱۲۰)

اسی طرح : سورہ ابراہیم: (۲۲) (حشر: ۱۷-۱۶) (اسراء: ۶۴-۶۵)، (انفال: ۴۸) ملاحظہ کریں قرآن میں شیطان کا ایک نام "غرور" بھی بیان ہوا ہے

"غُرور" لفظ "غُرور" کا صیغہ مبالغہ ہے، اور دراصل اس کا اصلی معنی کوئی شخص یا کوئی ایسی چیز ہے جو بہت چالاک اور دھوکے باز ہو، "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُمُ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۝" (سورہ فاطر: ۵) "اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو کہیں دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور کہیں وہ دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا نہ دے جائے" (سورہ فاطر آیت: ۵)۔ اسی طرح سورہ لقمان آیت: "۳۳" میں۔

"يُنَادُوهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۚ ۝ قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنَّكُمْ فَتَنْتُمُ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۝" ترجمہ: "وہ انہیں آواز دیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں اور لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈالا اور تم انتظار کرتے رہے اور تم نے شک کیا اور (جھوٹی) آرزوں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آگیا اور اس دغا باز نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا۔"

اگر ہم آدم علیہ السلام کے واقعہ میں شیطان کی چالوں اور فریبوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شیطان ماهر نفسیات کے طور پر اور انسانی جسم میں موجود دو طاقتور خواہشات پر ہاتھ رکھ کر (ایک ہمیشہ رہنے کی خواہش اور دوسری طاقت کی خواہش) اس نے اس سے جھوٹا وعدہ کیا اور اس کے غور فکر کے مرکز کو نشانہ بنایا، "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوَائِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَتَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ۝ ۲۰ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لِنَاصِحٍ ۝ ۲۱" (سورہ اعراف: ۲۱-۲۲) ترجمہ: پھر شیطان نے ان دونوں کے لیے وسوسہ ڈالا، تاکہ ان کے لیے ظاہر کرے جو کچھ ان کی شرم گاہوں میں سے ان سے چھپایا گیا تھا اور اس نے کہا تم دونوں کے رب نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا، مگر اس لیے کہ کہیں تم دونوں فرشتے بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والو نہیں سے ہو جاؤ۔"

"فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا دُمُّ هَلْ أَتُكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبُلَىٰ ۝ ۲۰" (سورہ طہ: ۱۲۰) ترجمہ: پس شیطان نے اس کے دل میں خیال ڈالا، کہنے لگا اے

آدم! کیا میں تجھے دائمی زندگی کا درخت اور ایسی بادشاہی بتاؤں جو پرانی نہ ہو؟"

اور اس طرح خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "فَدَلَّهَا بِغُرُورٍ... وَتَادِيَهَا رَبُّهَا لَمْ يَأْتِهَا عَنْ تِلْكَ الشَّجَرَةِ وَأَقْلَلْ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝٢٢" (سورہ اعراف: 22) ترجمہ: "پس اس نے دونوں کو دھوکے سے نیچے اتار لیا.... اور ان دونوں کو ان کے رب نے آواز دی کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا اور تم دونوں سے نہیں کھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔"

چوتھی صفت: شیطان کی قرآن میں یہ ہے کہ شیطان نے انسانوں کے اعمال کو انسانوں کی نظروں میں خوبصورت اور مزین دکھایا ہے، اس طرح سے وہ انسانوں کو راہ راست اور حق کے راستے سے بھٹکانا اور منحرف کرنا چاہتا ہے: "وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ۝٢٣" (سورہ نمل: 24)۔

ترجمہ: "اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیے ہیں، پس انہیں اصل راستے سے روک دیا ہے، پس وہ ہدایت نہیں پائے۔"

پانچویں صفت: شیطان کی قرآن میں یہ ہے کہ: شیطان ہمیشہ لوگوں کو فحش اور گناہ کا حکم دیتا ہے: "الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۝٢٤ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۝٢٥ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝٢٦" (سورہ بقرہ: 268)۔ ترجمہ: "شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ وعدہ دیتا ہے تم کو اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ تعالیٰ بہت کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے۔"

چھٹی صفت: شیطان کی قرآن میں یہ ہے کہ: باوجود اس کے کہ شیطان مکار اور دھوکے باز ہے، لیکن اس کا مکر اور حیلہ کمزور ہے: "إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا" (سورہ نساء: 76) ترجمہ: "بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے۔"

ساتویں صفت: شیطان کی قرآن مجید میں یہ ہے کہ: شیطان بھولنے کا سبب بن جاتا ہے: "فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ" وَمَا أُنْذِرُهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ " (سورہ کہف: 63) ترجمہ: "بے شک میں مچھلی بھول گیا اور مجھے وہ نہیں بھلائی مگر شیطان نے۔"

"فَأَنسَهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ" (سورہ یوسف: 42) ترجمہ: لیکن شیطان نے ان کا اپنے آقاسے ذکر کرنا بھلادیا۔"

آٹھویں صفت: شیطان کی قرآن کریم میں یہ ہے کہ: شیطان کی اولاد اور اس کی نسل کی پیدائش ہے: "أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ" بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا " (سورہ کہف: 50) ترجمہ: "کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سواء دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے۔"

نویں صفت: خود کو خیرخواہ کے طور پر پیش کرنا: شیطان کی چالوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان کے خیالات میں گھس جاتا ہے اور اس طرح خود کو انسانوں کے لیے خیرخواہ ظاہر کرتا ہے، مثال کے طور پر، شیطان کی چال آدم علیہ السلام کے بارے میں تھی: "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوَائِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ" ٢٠ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لِنَاصِحٍ ٢١ " (سورہ اعراف: 21-22) ترجمہ: پھر شیطان نے ان دونوں کے لیے وسوسہ ڈالا، تاکہ ان کے لیے ظاہر کرے جو کچھ ان کی شرم گاہوں میں سے ان سے چھپایا گیا تھا اور اس نے کہا تم دونوں کے رب نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا، مگر اس لیے کہ کہیں تم دونوں فرشتے بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والو نہیں سے ہو جاؤ۔"

"وسوسلہ" جملے میں حرف "لام" کے مطابق جو عموماً فائدے کے لیے آتا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اپنے وسوسے میں آدم کے لیے مہربانی اور دوستی کا روپ اپنایا تھا، جب کہ جملہ "وسوسالیہ" میں ایسا کوئی معنی نہیں ہے، اس کا صرف کسی کے دل میں "مخفی طور پر داخل" ہونا ہے۔

محتر قارئین:

دشمن پر بھروسہ کرنا اور اس کی مسکراہٹوں ، وعدوں اور حمایتوں کی جال میں پھنس جانا بھی ایک اور بڑی مصیبت ہے جس سے لوگوں کو ہوشیار رہنا چاہیے ، دشمن کو اس کی نشانیوں سے پہچاننا چاہیے ، چاہے جس شکل میں بھی ہو ، اور لوگوں کو اس کے رویے سے آگاہ کیا جائے ، جو کبھی کبھی دوستی اور مدد کی ظاہری شکل کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔

اے پروردگار ! ہمیں شیطان مردود اور خبیث کے شر سے محفوظ رکھ ، اے اللہ ! ہم شیطان کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں ۔

شیطان سے نمٹنے میں قرآن کریم کی ہدایت و رہنمائی

جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں ، قرآن کریم نے متعدد آیات میں شیطان کو انسان کا واضح دشمن قرار دیا ہے اور فرمایا: "إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ" ترجمہ: شیطان انسان کا صریح دشمن ہے " ایک اور تنبیہ میں فرماتا ہے: اے ابن آدم ! شیطان تمہیں دھوکہ نہ دے ، جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکال دیا۔

قرآن عظیم انسان کو خبردار کرتا ہے ، اور انسان کو ہمیشہ خطرے سے آگاہ کرتا ، اور فرماتا ہے: جو شخص خدا کی بجائے شیطان کو اپنا ولی اور سرپرست منتخب کرے گا وہ صریح اور عظیم نقصان کا مرتکب ہوگا۔

نیز شیطان کے پیروکاروں میں بارے قرآن کہتا ہے: "میں ضرور تجھ سے اور تیری پیروی کرنے والے بندوں سے جہنم کو بھر دوں گا"۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام قرآنی تنبیہات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور شیطان خبیث کی خطرناک عزائم کے بارے میں انبیاء اور علماء کی تمام تنبیہات کے باوجود لوگ ان تنبیہات سے غافل کیوں ہیں؟ اس کے جواب یہ ہو سکتا ہے کہ انسانوں کی اس غفلت کا خلاصہ درج ذیل عوامل میں کیا جاسکتا ہے :

پہلا عامل: انسانوں میں شیطان کا اثر اس قدر پوشیدہ اور خفیہ منصوبہ بندی کی تحت ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اس نے خود ہی فیصلہ کیا ہے ، اور وہ کسی کی دشمنی محسوس نہیں کرتا۔

دوسرا عامل: اس خطرناک دشمن کی پیروی کے فوری نتائج ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر لوگ جو شیطان اور نفس امارہ کی پیروی کرتے ہیں ، اتنی جلدی نہیں کہ انسان اس کا کڑوا ذائقہ چکھ کر اس کا مقابلہ کر سکے ۔

تیسرا عامل: انتہا پسندی ہے ، جس کے نتیجے میں لوگ مزاحمت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں ،

چوتھا عامل: حیرت انگیز تنوع اور لچک ہے ، جو شیطان میں موجود ہے ، انسانوں پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں سے ایک شیطان کی منصوبہ ہیں ۔

یاد رہے کہ قرآن عظیم میں شیطان کو انسان کا واضح دشمن قرار دیا گیا ہے۔

رب تعالیٰ نے شیطان کو وسوسے کی اجازت کیوں دی ؟

اس سے پہلے کہ میں سوال کا جواب دوں ، ذرا سا پیچھے جا کر واقعہ کا قرآن عظیم کے نقطہ نظر سے مختصرًا شروع سے آغاز کرتا ہوں ، جب شیطان نافرمانی کی وجہ سے دربار الہی سے دھتکارا گیا ، تو اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی ، اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خاص مدت تک کے لیے اسے مہلت دی ، تو شیطان نے مہلت پانے کی بعد کھاکہ : وہ بنی آدم کو فتنے میں ڈالے گا ، اور ان کو برے کاموں پر مجبور کرے گا ، قرآن مجید نے سورہ حجر کی آیت : (36 تا 40) اس بارے میں کہتا ہے : "قَالَ رَبِّ

فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝ قَالَ رَبِّ مِمَّا آغْوَيْتَنِي لِأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا أُغْوِيَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝" ترجمہ: "(اس نے) کہا کہ پروردگار مجھے اس دن تک مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) زندہ کئے جائیں گے ، فرمایا: تجھے مہلت دی جاتی ہے وقت مقرر (یعنی قیامت) کے دن تک ، (اس نے) کہا پروردگار جیسا تو نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لیے (گناہوں) کو آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا ، ہاں! ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں (ان پر قابو پانا مشکل ہے)۔"

سوال کے جواب میں یہ کھا جاسکتا ہے : کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے اختیار اور انتخاب کی آزادی دی، تاکہ انسان اچھائی اور برائی کے انتخاب میں آزاد ہو، وہ چاہے تو انبیاء کے راستے پر چل کر ابدی سعادت حاصل کر سکے، اور اگر چاہے تو اور اپنے آپ کو خدا اور پیغمبر سے دور کر کے گناہ اور برائی کی طرف پلٹ سکتا ہے۔

اس دوران اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور مقدس کتابیں بھیج کر انسان کو نیکی اور سعادت کی طرف دعوت دی تو انسان کو شر اور برائیوں کی طرف دعوت دینے والی قوت کا ہونا بھی ضرورت تھی، تاکہ انسان کی آزادی، اختیار اور انتخاب میں ضائع نہ ہو، اور وہ دورا ہے پر کھڑے ہو کہ، درست راستے کا انتخاب کر کے اپنا کمال ثابت کرے، مطلب یہ کہ یہ امتحان اور انتخاب بندے کی ضرورت ہے۔

لہذا شیطان کے وسوسے نہ صرف ایمان والوں کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں، بلکہ یہ ان کے تکامل اور ترقی کا سبب بنتے ہیں، اور شیطان کے وسوسوں کے باوجود خدا کی راہ کا انتخاب بہت قیمتی ہے، ایمان والے شیطان کے فتنوں سے لڑ کر کمال کے اعلیٰ درجے پر پہنچ جاتے ہیں، بنیادی طور پر دشمن کی موجودگی انسان کو زیادہ تیار اور مضبوط بناتی ہے، اور اسے اپنے تمام امکانات کو بروئے کار لانے اور اپنے عزم پر ثابت قدم رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان لیں کہ شیطان کے وسوسے زبردستی کی حد تک نہیں ہیں، اور شیطان کبھی بھی کسی شخص کو گناہ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کو اس بات کی اجازت ہے، اس کا کام صرف وسوسہ ڈالنا ہے، ایک مؤمن شخص کے لیے اس کا مقابلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا، جب وہ اس سے چند بار مقابلہ کر لے، جیسا کہ قرآن عظیم نے اس معاملے کو سورہ نحل آیت: "99 تا 100" میں اپنی خاص خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے: "إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝۹۹ إِمَّا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ۝۱۰۰" ترجمہ: بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کا ان لوگوں پر کوئی غلبہ نہیں جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، ان کا غلبہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور جو اس کی وجہ سے شریک بنانے والے ہیں۔"

اس کے علاوہ ایک اور جگہ قرآن کریم شیطان کی بات نقل کرتا ہے کہ قیامت کے دن ان لوگوں کے جواب میں کہے گا جو اپنی گمراہی کا ذمہ دار شیطان کو ٹھہرا تے ہیں " وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۚ فَلَا تَلُمُونِي وَلَوْلُمَّاءِ أَنْفُسُكُمْ ۚ " (سورہ ابراہیم : 22) ترجمہ: " اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا تو تم نے فوراً میرا کہنا مان لیا، اب مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔"

مختصر یہ کہ شیطان کا وسوسہ اجباری اور الزامی نہیں ہے، یہ فتنہ مؤمنوں کی ترقی اور ارتقا کا باعث بھی ہے۔

آخر میں دعا کرتا ہوں

اے رب! ہمیں شیطان مردود کے وسوسوں سے، اس کے شیطانی، خبیثانہ اور ابلیسانہ کاموں سے، اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے مکار شیطان کے فریب سے: "الَّذِي يُوسِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۚ" اور خناس کی فتنہ انگیزی کے شر سے اپنے حفظ و امان میں رکھ۔

اے رب! ہم شیطان خبیث کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں، اور بلند آواز سے اعلان کرتے ہیں: "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝۵" ترجمہ: کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی، اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے (۳) اور گروہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے (۴) اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے (۵)۔

اے رب! تو رحمان، رحیم اور کریم ہے، اپنے گنہگار بندوں سے اپنے فضل اور رحمت نہ روک۔

شیطان کے وسوسے کو دور کرنا

درحقیقت فتنہ ایک خطرناک بیماری ہے، اور یہ انسانوں کے لیے شیطان کی چالوں میں سے ایک ہے، کہ شیطان اپنے وسوسوں سے لوگوں کو مشکل میں ڈالنا چاہتا ہے، اس لیے خدانے اپنے نبی کو اس فتنہ سے

خدا کی پناہ لینے کا حکم دیا اور اس معاملے پر مکمل سورت نازل فرمائی: "قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ إِلَهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۝۴ الْخَنَّاسِ ۝۵ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝۶ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۷"۔

شیطان لوگوں کو آزماتا ہے، اور مؤمنوں کے معاملے میں سخت ہے، وسوسہ کا علاج دو چیزوں سے ہوتا ہے:

1۔ مؤمن کو چاہیے کہ اس وسوسے کی طرف توجہ نہ کرے، بلکہ عزم کے ساتھ اسے دفع کرے، کیونکہ وسوسہ شیطان کی طرف سے ہے، اور اسے نقصان نہیں پہنچاتا۔

2۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جائے تو شیطان اس سے دور رہے گا، اس لیے کہ شیطان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ" یعنی جب کوئی شخص اپنے رب کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے تو شیطان اس کے پاس آتا ہے اور اسے آزماتا ہے، جب بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے تو شیطان اس سے دور رہتا ہے، سائل اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ دو کام کریں:

(ا) وسوسہ پر توجہ نہ کریں اور اس سے متاثر نہ ہوں تو اللہ کے حکم سے وسوسہ دور ہو جائے گا، کیونکہ جب بندہ اس کی طرف توجہ کرتا ہے یا اس پر دھیان دیتا ہے تو وسوسہ اضافہ ہوتا ہے اور شیطان انسان پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ کے ذکر اور قرآن عظیم کی تلاوت میں کثرت سے مشغول رہے اور شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے، آیت الکرسی اور معوذتین (سورہ فلق اور ناس) کی تلاوت کرے اور مسلسل پڑھے، اس عمل کے ساتھ اللہ کی حکم سے وسوسہ دور ہو جائے گا۔

شیطان کا مکر بہت کمزور ہے

مندرجہ بالا پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ شیطان کی طاقت مضبوط اور اس سے لڑنا بہت مشکل اور بھاری ہے، اس خیال سے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ترجمہ:

"بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے" (سورہ نساء : 76)۔

سورہ نحل میں جہاں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے مدد مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جن مؤمنوں نے خدا پر بھروسہ کیا ہے، یعنی: خدا کی پناہ مانگی ہے ان پر شیطان کا تسلط نہیں ہوگا، جیسا کہ فرماتا ہے: "فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" ○۹۸
 إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ○۹۹ إِمَّا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ○۱۰۰ سورہ نحل " 98 تا 100)۔

ترجمہ: اور جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو، بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کا ان لوگوں پر کوئی غلبہ نہیں جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، ان کا غلبہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور جو اس کی وجہ سے شریک بنانے والے ہیں۔

استعاذہ کے مسائل اور اس کے شرعی احکام کی تفصیل گزر چکی ہے ملاحظہ کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کا آغاز سورہ مبارکہ فاتحہ سے کیا ہے، کہ حمد و ثناء کے بعد اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سے مدد طلب کرنا اور صراط مستقیم پر چلنا، مدد الہی اور صراط مستقیم ایسی دو چیزیں ہیں کہ ان میں انسان کے دین اور دنیا کی کامیابی پوشیدہ ہے، لیکن ان دونوں چیزوں کو حاصل کرنے اور پھر ان کو استعمال کرنے میں شیطان کے مکر و فریب اور وسوسے کی جال قدم قدم پر بچھا ہوا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اس جال کے منصوبے کو پاش پاش کرنے پر ختم کیا جو کہ استعاذہ ہے۔

محترم قارئین :

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر پہ جاتے، دونوں ہتھیلیاں ملا کر سورہ اخلاص اور معوذتین پڑھتے، پھر ہاتھ کے دونوں ہتھیلیوں سے سر، چہرہ اور جسم کے دیگر حصوں کو مسح کرتے، اور اسی طرح تینوں سورتوں کو تین بار پڑھتے۔

(اہل سنن کی روایت کی مطابق) اللہم اجعلنا من المخلصين في أعمالنا وادفع عنا أذى شياطين الإنس والجن وأبعد عنا شر الموسوسين وقنا عذاب جهنم ولا تفضحنا يوم العرض والدين.

«سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ» 180، وَ سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ» 181، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ» 182" ترجمہ: پاک ہے تیرا رب، عزت کا رب، ان باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں، اور سلام ان پر جو بھیجے گئے، اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم.

اللہم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم إنک حمید مجید. وبارک علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم إنک حمید مجید.

سبحانک اللہم وبحمدک أشهد أن لا إله إلا أنت أستغفرک وأتوب إليك. اللہم اجعل القرآن حجة لنا ولا تجعله حجة علينا برحمتک یا أرحم الراحمين.

یا الہا! ہم سے اپنے کلام کا ترجمہ اور تفسیر قبول فرما اور اسے ہمارے نیک اعمال میں شمار فرما، قرآن کو ہماری زندگیوں کا رہنما بنا۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

ومن الله التوفيق

مآخذ پر ایک نظر

1 - تفسیر صفوة التفاسیر:

تألیف محمد علی صابونی (مولود ۱۹۳۰ء) یہ تفسیر ۱۳۹۹ھ میں لکھی گئی ، اس تفسیر کو مرتب کرنے میں مصنف نے تفسیر کی اہم ترین اور معتبر کتب سے استفادہ کیا ہے۔ جیسے: تفسیر طبری، کشاف، قرطبی، آلوسی، ابن کثیر، البحر المحیط وغیرہ۔

2 - تفسیر انوار القرآن:

تألیف عبدالرؤف مخلص ہروی۔ "تفسیر انوار القرآن" تین تفسیروں سے منتخب کی گئی ہے: فتح القدیر شوکانی، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر المنیر وحبہ الزحیلی۔ سال اشاعت: ۱۳۸۹ھ۔ مقام اشاعت: احمد جام۔ افغانستان۔

3 - تفسیر المیسر:

تألیف: دکتور عایض بن عبداللہ القرنی (یکم جنوری 1959م)۔ پبلشرز: شیخ الاسلام احمد جام، طبع: ۱۳۹۵ھ۔

4 - تفسیر کابلی:

تفسیر کابلی مفسر: شیخ الإسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ علیہ، مترجم: شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ علیہ، ترجمہ دری/فارسی: افغانستان کے علماء کی ایک جماعت۔

5 - تفسیر معالم التنزیل - بغوی:

تفسیر البغوی تألیف حسین بن مسعود بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) یہ تفسیر عربی زبان میں لکھی گئی ہے، اور تفسیر الکشف والبیان ثعلبی سے بہت متاثر ہے۔

6 - تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر:

تألیف: ابن جوزی ابوالفرج عبدالرحمن بن علی (۵۱۰ھ، ۱۱۱۶ء-۱۲ رمضان ۵۹۲ھ) "زاد المسیر فی علم التفسیر" جو "زاد المسیر" سے مشہور ہے، ابن جوزی کی تفسیر ہے جو کہ: عظیم تفسیر المغنی فی تفسیر القرآن کا خلاصہ ہے

7 - البحر المحیط فی التفسیر القرآن: ابو حیان الأندلسی:

تألیف: محمد بن یوسف بن علی بن حیان نفری غرناطی (۶۵۴ھ، ۷۴۵ھ) ابو حیان غرناطی کے نام سے مشہور ہے۔ تفسیر "البحر المحیط" عربی زبان میں ہے۔ انہوں نے ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق اور ترکیب و بیان کے فرق پر خصوصی توجہ دی ہے۔

8 - تفسیر القرآن الکریم - ابن کثیر:

تفسیر القرآن العظیم: تألیف عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) ابن کثیر کے نام سے معروف ہے۔ یہ آٹھویں صدی کے ممتاز علماء اور محققین میں سے ایک ہیں۔ (جلال الدین سیوطی، عظیم قرآن دان اور مفسر فرماتے ہیں: ابن کثیر کی ایسی تفسیر ہے کہ جس کے انداز اور طرز پر کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی ہے)۔

9 - تفسیر بیضاوی:

یا "أنوار التنزیل وأسرار التأویل"، جو "تفسیر بیضاوی" سے مشہور ہے، تألیف شیخ ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بیضاوی (متوفی سال ۷۹۱ھ) یہ تفسیر ساتویں صدی میں عربی میں لکھی گئی، اور (۱۴۱۸ھ یا ۱۹۹۸ء) میں دار إحياء التراث العربی - بیروت - لبنان سے شائع ہو چکی ہے۔

10 - تفسیر الجلالین:

جلال الدین محلی اور ان کے شاگرد جلال الدین سیوطی (جلال الدین محلی کی وفات ۸۶۴ھ اور وفات جلال الدین سیوطی کی وفات سال ۹۱۱ھ) (اشاعت کا سال ۱۴۱۶ھ یا ۱۹۹۶ء -

ناشر: مؤسسة النور المطبوعات، محل نشر: بیروت-لبنان) یہ تفسیر 10 ویں صدی میں عربی میں لکھی گئی تھی، اور یہ ان چند تفسیروں میں سے ایک ہے جو متعدد علماء نے لکھی ہے -

11 - تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن - تفسیر طبری:

علامہ أبو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری متولد (۲۲۴ھ وفات ۳۱۰ھ) بغداد میں یا (۸۳۹ء - ۹۲۳ء) (4 صدی ہجری، ناشر: دار المعرفة، مقام اشاعت: بیروت) شیخ طبری تیسری صدی کے مشہور محدث، فقیہ، مفسر اور مؤرخ میں سے ایک ہیں۔

12 - تفسیر ابن جزی التسهیل لعلوم التنزیل:

تألیف: محمد بن احمد بن جزی غرناطی الکلبی جُزّی سے مشہور (متوفی ۷۴۱ھ) (ناشر: شركة دار الأرقم بن أبي الأرقم، بیروت-لبنان) یہ اسلامی مغرب کی سب سے مکمل اور اپنے وقت میں سب سے مفید اور زیادہ پڑھی جانی والی تفسیروں میں سے ہے۔

13 - تفسیر ابو السعود:

"تفسیر إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم" تألیف: مفسر شیخ ابو السعود محمد بن محمد بن مصطفی عمادی (متوفی ۹۸۲ھ) یہ ترک نژاد علماء میں سے ہیں۔ (مقام اشاعت: مكتبة الرياض الحديثه بالرياض)۔

14 - تفسیر فی ظلال القرآن:

تأليف: سيد بن قطب بن ابراهيم شاذلي (متوفى سال ١٣٨٧ هـ).
سال اشاعت: ١٤٠٨ هـ ق يا ١٩٨٨ء. ناشر: دار الشروق، مكان نشر:
بيروت - لبنان

15 - تفسير الجامع لاحكام القرآن-تفسير القرطبي:

مؤلف كا نام: اندلس (اسپانيا) كے مشهور عالم اور محقق علامه ابو عبد الله محمد بن احمد بن بكر بن فرح القرطبي (متوفى ٦٧١ هـ) ان كى اس تفسير كے لكهنے كا بنيادى مقصد قرآن كريم سے احكام اور فقہى مسائل اخذ كرنا ہے ۔

16 - تفسير معارف القرآن:

مولف: حضرت علامه مفتى محمد شفيع عثمانى ديوبندى، مترجم شيخ الحديث حضرت مولانا محمد يوسف حسين پور۔

17 - تفسير خازن:

تفسير كا نام: "الباب التأويل في معاني التنزيل (تفسير الخازن)" تأليف: علاء الدين على بن محمد بغدادى الخازن كے نام سے مشهور ہے اور (متولد ٦٧٨ هـ و متوفى ٧٤١ هـ) ۔

18 - روح المعاني (الوسى):

تفسير "روح المعاني في تفسير القرآن العظيم" یہ محمود أفندى آلوسى كى تأليف ہے۔ (١٢١٧ - ١٢٧٠ هـ) سال نشر: 01 جنورى ٢٠٠٧ء مقام اشاعت:
ادارة الطباعة المنيرية تصوير دار إحياء التراث العربى۔

19 - جلال الدين سيوطى:

"الاتقان في علوم القرآن" تفسير الدر المنثور في التفسير بالمأثور "مؤلف: حافظ جلال الدين عبد الرحمن بن ابى بكر سيوطى شافعى۔ (١٤٤٥ء - ١٥٠٥ء)
مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف ١٤٢٦ هـ المدينة المنورة

20 - زجاج: "تفسير معاني القرآن في التفسير":

مؤلف: الزجاج أو أبو إسحاق الزجاج أو أبو إسحاق إبراهيم بن محمد بن السرى بن سهل الزجاج البغدادى۔ (٢٤١ هـ ، ٣١١ هـ / ٨٥٥ء ، ٩٢٣ء)۔

21 - تفسير ابن عطية:

تفسير كا مكمل نام: "المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز ابن عطية" مؤلف: أبو محمد عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمن بن تمام بن عطية الأندلسى المحاربى (المتوفى: ٥٤٢ هـ) سال اشاعت: ١٤٢٢ هـ - ٢٠٠١ هـ، دار ابن حزم۔

22 - تفسیر قتادة:

أبو الخطاب قتادة بن دعامة بن عكابة الدوسي بَصْرِي (س ٦١هـ - س ١١٨هـ ، س ٦٨٠هـ - س ٧٣٦هـ). وہ تابعین میں سے تھے، جنہیں لغت، عرب کی تاریخ، نسب کی پہچان، حدیث، عربی شاعری اور تفسیر کے علوم پر دسترس حاصل تھی، اور ساتھ ہی حافظ بھی تھے۔ وہ بصرہ اور عراق میں رہتے تھے، لیکن نابینا تھے۔ امام احمد بن حنبل اس کے بارے میں فرماتے ہیں: وہ بصرہ میں سب سے زیادہ مضبوط حافظ رکھتے تھے، اور وہ جو کچھ سنتے تھے اسے حفظ کر لیتے تھے، میں نے ایک مرتبہ انہیں جابر کی کتاب پڑھ کر سنائی تو انہوں نے اسے حفظ کر لیا۔ ان کا حافظہ پوری تاریخ میں ضرب المثل تھی۔ ان کا انتقال عراق میں طاعون سے ہوا۔

23 - تفسیر کشاف کو تفسیر زمخشری کہا جاتا ہے۔

"تفسیر الکشاف عن حقایق التنزیل و عیون الاقوال فی وجوہ التأویل" تفسیر کشاف سے مشہور ہے۔ مؤلف: جارا اللہ زمخشری (۲۷ رجب س ۴۶۷ھ - ۹ ذی الحجہ س ۵۳۸ھ) (ہ)

یہ تفسیر پہلی بار ۱۸۵۶ میں کلکتہ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی، پھر ۱۲۹۱ میں مصر کے بولاق میں اور پھر ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، اور ۱۳۱۸ میں قاہرہ میں شائع ہوئی۔ مقام طباعت: پبلشرز دار احیاء التراث العربی۔

24 - تفسیر ابن کثیر:

مؤلف: ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب طبری، جو جریر طبری کے نام سے مشہور ہے، متولد: س ۲۲۴ھ، وفات: س ۳۱۰ھ بغداد (۲۱۸ - ۳۱۰ ہجری شمسی۔ تاریخ طبری علم، تاریخ اور تفسیر کے باپ سے مشہور ہے۔ ساتویں طباعت: س ۱۴۰۲ھ - س ۱۹۸۱ء - محل طبع: دار القرآن الکریم، بیروت - لبنان۔

25 - مفسر صاوی المالکی:

"حاشیة الصاوی علی تفسیر الجلالین فی التفسیر القرآن الکریم" مؤلف: احمد بن محمد صاوی (س ۱۱۷۵ھ - س ۱۲۴۱ھ)۔ سال اور مقام اشاعت: بالمطبعة العامرة الشرفية سنة ۱۳۱۸ هجرية۔

26 - سعید حوی:

حَوّی، سعید، حَوّی، سعید، مفسر "الاساس فی التفسیر" (گیارہ جلد؛ قاہرہ ۱۴۰۵)، جو کہ حوی کے سب سے اہم اور با اثر کاموں میں سے ایک ہے۔

سال اشاعت: ۱۴۲۴ھ یا ۲۰۰۳ء، مقام اشاعت: قاہرہ - مصر موسسہ دار السلام

27 - تفسیر کبیر فخر رازی:

تفسیر فخر رازی جس کو تفسیر کبیر کہاجاتا ہے، شیخ الاسلام فخرالدین رازی (۵۴۴ھ - ۶۰۶ھ) تفسیر کبیر فخر رازی کی سب سے اہم اور جامع تصنیف ہے، اور عربی زبان میں قرآن مجید کی متعدد اہم اور ممتاز تفسیروں میں سے ایک ہے۔

28 - تفسیر سدی کبیر:

تفسیر سدی کبیر "ابومحمد اسماعیل بن عبدالرحمان"، کی تصنیف ہے، جو سدی کبیر کے نام سے مشہور ہے، جن کا انتقال ۱۲۸ھ میں ہوا، حجاز کے تھے، جبکہ کوفہ میں رہتے تھے۔ وہ عظیم مفسر اور تاریخ کے ایک قابل مصنف تھے خاص طور پر ابتدائی اسلام کے غزوات (جنگوں) کے بارے میں، ان کی تفسیر "تفسیر کبیر" کے نام سے مشہور ہے جو کہ ان کے بعد لکھی گئی تفسیروں کا بھرپور ماخذ ہے۔ "جلال الدین سیوطی" "خلیلی" سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: سدی اپنی تفسیر کو ابن مسعود اور ابن عباس کی اسناد سے ذکر کرتا ہے۔ "ثوری" اور "شعبہ" جیسے بزرگوں نے ان سے روایت کیا ہے۔

29 - تفسیر البحر الوجیز فی تفسیر کتاب العزیز:

مؤلف: ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عبدالرحمن بن غالب محارب، جو ابن عطیہ اندلسی (۴۸۱ھ - ۵۴۱ھ) کے نام سے مشہور ہیں۔

30 - تفسیر فرقان:

تألیف: شیخ بہاء الدین حسینی

31 - کتاب حاشیہ محیی الدین شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی:

مصنف: شیخ زادہ، محمد بن مصطفیٰ

زبان: عربی

ناشر: دارالکتب العلمیہ

دوسرے مصنفین: مصنف: بیضاوی، عبداللہ بن عمر - مصحح: شاہین، محمد

عبدالقادر - مصنف: شیخ زادہ، محمد بن مصطفیٰ۔

32 - تفسیر گلشاہی:

مؤلف: دکتور اناطواق آخوند گلشاہی۔ موضوع: قرآن کریم کا مکمل ترجمہ اور تفسیر۔

33 - کتاب حاشیہ محیی الدین شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی:

مصنف: شیخ زادہ، محمد بن مصطفیٰ

زبان: عربی

34 - تفسیر مجاہد:

تفسیر مجاہد، اثر ابوالحجاج مجاہد (21 - متوفی ۱۰۲ یا ۱۰۳ یا ۱۰۴ یا ۱۰۵ ھ) جابر یا جبیر مکی مخزومی کا شمار قرآنی علوم کے مفسرین اور علماء میں ہوتا ہے۔

35 - فیض الباری شرح صحیح البخاری:

داکتر عبد الرحیم فیروز ہروی، سال طبع: 26 Jan 2016.

36 - صحیح مسلم - و صحیح البخاری:

جمع کرنے والا: مسلم بن حجاج نیشاپوری جو کہ امام مسلم کے نام سے مشہور ہیں، اور ۲۶۱ھ میں وفات پائی۔ اور صحیح البخاری کو جمع کرنے والا: حافظ ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ بخاری (۱۹۴ھ - ۲۵۶ھ)

37 - تفسیر نور دکتور مصطفیٰ خرمدل:

تفسیر نور کا مکمل نام: "ترجمہ معانی قرآن" تالیف: دکتور مصطفیٰ خرمدل کردستانی: (متولد سال: ۱۳۱۵ھ، وفات: ۱۳۹۹ھ)۔

38 - مفردات الفاظ القرآن:

راغب اصفہانی کا (خیر الدین زرکلی نے اپنی کتاب "الأعلام" میں کہا: وہ اصفہان کے تھے لیکن بغداد میں رہتے تھے، ایک مشہور ادیب تھے، اور ۵۰۲ھ میں وفات پائی۔ امام فخر الدین رازی اپنی کتاب "تأسیس التقدیس" میں علم اصول میں ذکر کرتے ہیں کہ راغب ائمہ اہل سنت میں سے تھے، اور غزالی کے ہم عصر تھے۔ (بغیة الوعاة 2 / 297، وأساس التقدیس صفحہ 7)۔

39 - تفسیر اور بیان کلمات قرآن کریم:

شیخ حسنین محمد مخلوف (۷۵۱ھ - ۸۱۲ھ)، اسباب نزول، علامہ جلال الدین سیوطی، ترجمہ: از عبدالکریم ارشد فاریابی۔ (پبلشرز شیخ الاسلام احمد جام)

ایمیل

saidafghani@hotmail.com

ادرس

Aminuddin Saidi

Wittelsbacher Strasse 34

Brühl 50321

Germany

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library